کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی

بنام قوت وحیات

کلیم

آئے گا نہ جانے لب زمانہ اپنا
آ گے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
منظور شدہ سررشتۂ تعلیم گورنمنٹ میسور

ششماہی چندہ تین روپے دس آنے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳ | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۱

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کوہ نور الیکٹرک برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم اکبر منزل ۱۰ ایگ روڈ قرول باغ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

کچھ "کلیم" کے متعلق

"کلیم" اب دُوسرے سال میں قدم رکھ رہا ہے، نہیں معلوم برادرانِ وطن کی اِس باب میں کیا رائے ہے، لیکن اتنا ضرور کہا جائے گا کہ اِس کوشش میں کوئی دقیقہ کبھی فرو گزاشت نہیں کیا گیا کہ "کلیم" محض ایک ادبی رسالہ بن کر نہ رہ جائے۔ اور آخر میں یہ نہ کہنا پڑے کہ اس نے اپنی قوم کی کوئی ذہنی خدمت نہیں کی۔

یہ ظاہر ہے کہ مُلک میں ذہنی انقلاب مُنھیں افراد کے قلم پیدا کر سکتے ہیں جو خود بھی انقلابی ذہنیّت کے حامل ہوں، اور اپنی قومی زندگی کے ہر نازک سے نازک اور باریک سے باریک پہلو پر غور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

لیکن افسوس کے ساتھ اِس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہنوز ہندوستان میں ایسے اربابِ قلم بہت ہی کم ہیں جو مندرجۂ بالا معیار پر پُورے اُتر سکتے ہوں — ہمارے مُلک میں جو اچھے لکھنے والے ہیں، بدقسمتی سے تقریباً سب کے سب مذہبیات و ادبیات ہی کی جانب مایل رہتے ہیں، اور ابھی تک اُنھوں نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اُن کے قلم کا مقصد کیا ہونا چاہیے، اور مُلک میں اِس وقت کس فضا کے پیدا کرنے سے زندگی کی لہر دوڑ سکتی ہے۔

"کلیم" کے اوراق میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہی رونا رویا جا چکا ہے، اور آج بھی یہ حرفِ شکایت محض اس لئے زبان پر لایا گیا ہے کہ شاید ہمارے ادیب اب بھی اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے کی طرف مائل ہو جائیں۔

"کلیم" کی اشاعت اب تک محدود ہے، ہر چند اس قلیل مُدّت میں اُس نے جو مقبولیت و اشاعت حاصل کر لی ہے وہ ایک نوعمر پرچے کی حیثیت سے بہت زیادہ اُمید افزا ہے، پھر بھی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ رسالہ اب تک برابر نقصان سے چل رہا ہے — لیکن اِسے تاجرانہ نُقطۂ نظر سے نہیں نکالا گیا ہے اس لئے ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔

"کلیم" کی توسیعِ اشاعت سے خاص مُدّعا یہ ہے کہ اِس کے ذریعے سے جن خیالات کی اشاعت کی جاتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ افراد تک پہونچ سکیں، اور اُسی کے ساتھ اِس کی ملی حالت اِتنی اور صرف اتنی درست ہو جائے کہ اِس کے آمد و خرچ کا حساب برابر ہو جائے۔

لیکن اشاعت میں توسیع ہو تو کیونکر؟ یہ امر تو مُلک کے اربابِ علم و ادب کے ذوق پر مبنی ہے — اور مُلک کے اربابِ علم و ادب کے ذوق کا جو عالم ہے، وہ ظاہر ہے۔

بہر حال یہ ایک ضروری بات تھی، جو کہہ دی گئی — رہا یہ کہ اِس کا اثر کیا ہوگا؟ یہ نہ دریافت فرمائیے۔

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

لیکن "کلیم" میری "روح" کی آواز ہے، اِس لئے جب تک رُوح کی

جوشؔ ملیح آبادی

آواز باقی ہے کلیم بھی برابر جاری رہے گا۔

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے — وہی زمین، وُہی آسمان باقی ہے
جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم — مگر وفا کی وُہی آن بان باقی ہے
وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مُدت سے — یہاں جفا پہ وفا کا گُمان باقی ہے

تمدن کی ظالمانہ مسخرگی

ہم فطرت سے اِس قدر دُور ہو چکے ہیں، اور روز بروز اِس سُرعت کے ساتھ دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ سوچ کر دل پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی ہے کہ آخر انسانیت فطرت دشمنی کی کس منزل پر جا کر دم لینے والی ہے۔

یہ سچ ہے کہ بدقسمتی سے انسان اب تمدن کے اِس نُقطے پر آ چکا ہے کہ کامل طور سے فطری زندگی بسر کرنا تقریباً مُحال ہو چکا ہے۔ لیکن نوعِ انسانی کے ہمدردوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مُسلسل اِس کی سعی کرتے رہیں کہ اِن حالات میں جس قدر بھی ممکن ہے، انسان فطری سادگی اختیار کر کے فطرت سے قریب تر رہنے کی جانب مائل ہو جائے۔

"فطرت کی طرف واپس چلو" کی آوازیں ہمیشہ لگاتے رہنا چاہیئے —— کیونکہ تہذیب و تمدن کے رسُوم اور تکلفات کے آداب کو گھٹانا، اور اُن میں ہر امکانی سادگی و بےتکلفی پیدا کرنے کی دُھن میں سرگرداں رہنا ابنِ آدم کے خدمتگزاروں کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

عصرِ حاضر کے تمدن کی بدولت افراد کی زندگی اِس قدر مصنوعی ہو چکی ہے کہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ خود یہ افراد، قانونِ فطرت کے مطابق نہیں، بلکہ مشینوں کی مصنوعی گری کے ذریعے سے پیدا کئے گئے ہیں اور "اطفالِ فطرت" ہونے کے عوض فرزندانِ صناعت ہیں۔

مصنوعی مکان، مصنوعی لباس، مصنوعی غذا، مصنوعی پانی، مصنوعی روشنی، اور مصنوعی ہوا نے اِس طرح ہمارا محاصرہ کر لیا ہے کہ ہم فطرت کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

ہمارا اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، ہلنا جُلنا، کھانا پینا، غرضکہ زندگی کا ہر کام اِس قدر بناوٹی، اور غیر فطری ہو گیا ہے کہ ہم یہ بھُول چکے ہیں کہ حقیقی زندگی بسر کی کیونکر جا سکتی ہے۔

اِس بات پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے کہ تمدن و تہذیب کے شدائد اور آداب و رسُوم کے مظالم اب اِس قدر ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئے ہیں کہ آدمی کو سانس تک لینا دشوار ہو چکا ہے۔

اور اِس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ اِن نامراد آداب و رسُوم نے یہاں تک اِستیلا حاصل کر لیا ہے کہ انسان کے فطری وظائف کے ساتھ ساتھ خود اُس کی فطرت کو بھی پا بزنجیر بنا دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر محبت کو لیجیے۔ ظاہر ہے کہ محبت، نوعِ انسانی کا وہ سب سے بڑا، اور سب سے قوی جذبہ ہے۔ جس کے سامنے تمام جذبات سربسجود نظر آتے ہیں۔

لیکن تہذیب اب اِس قدر شوخ چشم ہو چلی ہے کہ وہ انسان کے اِس قوی ترین جذبے پر بھی حکمرانی کے خواب دیکھنے لگی ہے۔

دُور کیوں جائیے، اپنے بادشاہ سلامت ہی کے معاملے کو دیکھیے۔

بادشاہ سلامت ایک عورت سے، بربنائے محبت، شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کی اِس تمنا پر، تہذیب جامے سے باہر ہو گئی۔ آداب و رسُوم کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا، اور معاملے نے یہاں تک طول کھینچا کہ بادشاہ کو تاج و تخت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

اِس سلسلے میں رسم و رواج اور قانون و دفعات کے نام سے ایسے ایسے شاہانہ سُوال اُٹھائے گئے تھے کہ یا تو اُن پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یا پھر یہ دل میں آتا ہے کہ اِتنے قہقہے مارو کہ پسلیاں دُکھنے لگیں۔

ظاہر ہے کہ ازدواج و محبت، ایک ایسی ذاتی، اور پرائیویٹ چیز ہے، جس سے پبلک کیسی، محبت یا شادی کرنے والے کے والدین کو بھی کچھ سروکار نہ رکھنا چاہیئے۔ مگر ہر پھٹے میں پاؤں دینے، اور ہر دفتر میں نام لکھانے والی شریر سوسائٹی نے اِس خالص شخصی و ذاتی معاملے میں بھی اپنے

قوانین و آداب کھُوُلش کر دم لیا۔

سوسائٹی بھی کتنی تقاوت آمیز شرارت کا نام ہے!

آج تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ بادشاہ کو فلاں سے شادی کرنا، اور فلاں سے نہ کرنا چاہئیے۔ لیکن اگر لیلائے تہذیب کی زُلفیں خدانخواستہ اِسی طرح درازسے درازتر ہوتی چلی گئیں تو ایک زمانہ وہ بھی آنے والا ہے جب یہ سوال اُٹھایا جائے گا کہ بادشاہ کونسے پھل کھائے۔ اور کونسے نہ کھائے۔ بادشاہ، بستر پر کس کروٹ سے سوئے، اور کس کروٹ سے نہ سوئے۔ بادشاہ گھر سے نکلتے وقت پہلے داہنا پاؤں اُٹھائے کہ بایاں ــــ اور بادشاہ سرِ راہ کس چیز کو دیکھے اور کس چیز کے دیکھتے ہی فوراً دونوں آنکھیں زور سے بند کرلے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی ایک زبردست شاہی ضابطہ وضع کیا جائے گا جس کی سختی کے ساتھ نگرانی رکھی جائے گی کہ بادشاہ اگر اثنائے غسل میں برابر "دِل ڈَن" "دِل ڈن" ( ) نہ پکارتا رہے گا تو اُسے فوراً تخت سے اُتار دیا جائے گا۔

(دیکھئے کیا کیا مزے آنے والے ہیں)

اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی عبرت آمیز لطف سے خالی نہ ہوگا کہ شاہی آداب و رُسوم نے اِس بات کی تو بڑی خندہ پیشانی سے اجازت دے دی تھی کہ بادشاہ اگر چاہے تو اُس عورت سے تمام عمر تعلقات رکھ سکتا ہے۔ مگر جہاں تک شادی کا تعلق ہے، اِس کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ شاہی رسُوم و آداب کے تقدّس کی نظر میں بادشاہ اُس عورت سے زندگی بھر کے لئے ناجائز تعلقات تو رکھ سکتا تھا مگر جائز طریقے سے بیوی نہیں بنا سکتا تھا۔ یعنی ناجائز تعلقات سے شاہی وقار میں کوئی فرق نہیں آسکتا تھا۔ البتہ جائز تعلقات سے طنطنۂ شاہی کا پرچم سرنگوں ہوجاتا۔

برین عقل و دانش بباید گریست!

تاج و تخت سے دست بردار ہوجانا کوئی معمولی دل گُردے کا کام نہیں۔ دست بردار شاہنشاہ کی خدمت میں دُنیا کے تمام اہلِ دل اور فطرت پرست افراد کو مبارکباد دینا چاہئیے کہ اُنھوں نے جھوٹے رسم و رواج کے خلاف ایک ایسا شاندار احتجاج کیا ہے، جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔

بادشاہ کی حیثیت اُن کی عزت، محض ایک رسمی عزت تھی، لیکن اب اُن کے کیرکٹر نے اُن کی ذات میں وہ حقیقی عزت پیدا کردی کہ صدیاں گزرجائیں گی، لیکن اُن کی عظمت تازہ گری ہوئی شبنم کی طرح ہمیشہ تابناک و تر و تازہ ہی رہیگی۔

زمانہ سب سے زیادہ محبت کی داستانوں کو دُوہراتا رہتا ہے چنانچہ جب قریب و دُور کے مُلکوں کی تنہائی راتیں حُسن و عشق کی داستانیں چھیڑیں گی۔ اُس وقت اِس بیسویں صدی کی داستانِ محبت کو سُنکر دردمند دل دھڑکنے لگیں گے۔ اور ایک مرد کی اتنی زبردست قربانی کا تصوّر، عورتوں کے دلوں کو مرد کی عظمت و وفاداری کے تسلیم کرنے پر مجبور کردے گا۔

عقل کی باتیں

جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں تو وہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے، اور جب قدرت کو یہ منظور ہوتا ہے کہ کوئی جماعت بد سے بدتر ہوجائے تو پھر افراد کی ذہنیت یہ ہوجاتی ہے کہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا تو درکنار، وہ عقل کی باتوں سے دُور بھاگنے لگتے ہیں، اور جو شامتِ اعمال سے اُنھیں عقل کی باتیں سُنانے کی جرأت کرتا ہے، اُس کے دشمن ہوجاتے ہیں، اور جو طبیب کہ اُن کے واسطے دوا طیار کرتا ہے، وہ حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ اُس کی سند ضبط کرلی جائے۔

ہندوستان، "جنت نشان" ماشاء اللہ آج کل اِسی منصبِ جلیل پر فائز ہے ــــ ہندو ہو کہ مُسلم، ایک کو بھی عقل کی کوئی بات نہیں بھاتی۔ ہندو تو کبھی کبھی بھُولے سے ایک آدھ عقل کی بات چلتے چلاتے سُن بھی لیتا ہے۔ مگر اللہ سلامت رکھے مسلمان کو، یہ میاں جی تو اتنے دشمنِ عقل ہوچکے ہیں کہ عاقلانہ کلمات کو برداشت ہی نہیں فرماسکتے۔ اِن کا تو خیر سے یہ حال ہے کہ اِدھر عقل کی بات سُنی، اُدھر فوراً مشتعل ہوگئے اور کاٹنے کے لئے دوڑ پڑے۔

معاشری معاملہ ہو کہ معاشی، مذہبی مسئلہ ہو کہ سیاسی، غرضکہ زندگی کے تمام قابلِ توجہ، عظیم و اہم مسائل کے متعلق ہندیوں کے گودام میں بہت پہلے سے بنے بنائے، اور ڈھلے ڈھلائے احکام و اصول کے انبار لگے ہوئے

ہیں، اور وہ ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ ترمیم و تنسیخ کیسی، اُن میں معمولی سی اصلاح بھی کفر سے بدتر سمجھی جاتی ہے۔

جہلار کا ذکر نہیں، بڑے بڑے پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے کہ جس صحبت میں جائیے، یہی سُننے میں آتا ہے کہ "ہمارے بزرگوں کی اس معاملے میں یہ رائے ہے" اور ہمارے پیشوا، اس مسئلے کے متعلق پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے ہیں" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ!

گو یا ہندوستان کے "ہمارے بزرگ" اور "ہمارے پیشوا" حیات کے تمام مسائل کو قیامت تک کے واسطے پہلے ہی سے طے فرما گئے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس وقت تک یہ تمام "بزرگ" و "پیشوا" مرنے سے انکار فرماتے رہے جب تک کہ زندگی کے تمام پیچیدہ عقدوں کو بہ تمام و کمال سُلجھا کر اُنھوں نے یہ اطمینان نہیں کر لیا کہ اب قیامت کے واسطے کوئی ایک بھی ایسا مسئلہ باقی نہیں رہا ہے جس کے طے کرنے کی ہمارے اخلاف کو زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔

اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے "بزرگ" و "پیشوا" عجیب وغریب انسان تھے، اور وہ ایک ایسا عظیم کارنامہ چھوڑ گئے ہیں جو دیوتاؤں سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر مذاہب، آسمان سے نازل ہوئے ہیں، اور مذاہب کی شریعت، خدا کی تصنیف ہے تو ہم ہر قدم پر یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہ خدائی شریعت بھی ہر زمانے اور ہر عہد میں ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی ہے، مگر رحمت ہو خدا کی، ہندیوں کے "بزرگوں" اور "پیشواؤں" پر کہ وہ ہر مسئلے کا ایک ایسا ابدی فیصلہ کر چکے ہیں جو قیامت تک تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کی اس اندھیر نگری میں کس کے سامنے سر پھوڑا جائے۔ اور کس اللہ کے بندے کو یہ موٹی سی بات سمجھائی جائے کہ بابا، عالم کے ہر خشک و تر، اور دنیا کے ہر ذی رُوح و غیر ذی رُوح وجود کی طرح انسان بھی ہر آن، ہر ساعت، ہر لمحہ اور ہر نفس برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس کُرے میں پل بھر کے لئے بھی سکون نہیں۔ بلکہ ایک مسلسل حرکت اور ایک پیہم تغیر انقلاب ہے۔ جو ازل سے کارفرمائی کر رہا ہے، اور ابد تک سرگرم کار رہیگا،

جب یہ عالم ہے تو ایک ہر آن بدلنے والی مخلوق کے لئے کوئی ایسا ضابطہ وضع ہی نہیں کیا جا سکتا جو قیامت تک اُسی کا ساتھ دے سکتا ہو؟

چلتی ہوئی ریل کا چلتی ہوئی روشنی ہی ساتھ دے سکتی ہے۔ قایم و ساکن روشنی اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی؟

یہاں تک لکھنے کو تو لکھ گیا، اب اس کے آگے کیا لکھوں۔ تصوّر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ قدامت پرستی اور اوہام نوازی کے ماتھے پر لانبی اور گہری شکنیں پڑ رہی ہیں ——— اور مُقلدینِ کرام کے چہروں پر ایک ایسی تُرشی آگئی ہے کہ اگر اُن کے خشونت آمیز خال وخد کو نچوڑ دیا جائے تو کتنے لیموں کا عرق شرم سے آب آب ہو کر رہ جائے۔

لیکن میں سچّی بات کہوں گا، اور دُنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گا۔

ہاں تو جب یہ ایک حقیقتِ مُسلّمہ ہے کہ ایک ہر آن بدلنے والی مخلوق کے واسطے ایک ایسا قانون وضع ہی نہیں کیا جا سکتا، جو ہر زمانے، ہر صدی، اور ارتقاء کی ہر منزل میں ساتھ دے سکتا ہو، تو للہ خود اپنے پر اور اپنی آئندہ نسلوں پر رحم کرو، اور اپنے "بزرگوں" اور "پیشواؤں" کے، صدیوں پیشتر کے وضع کردہ احکام و اصول سے نجات حاصل کر کے، عصرِ حاضر کے مقتضیات و ضروریات پر غائر نگاہ ڈالو، اور اپنی جسمانی و ذہنی توانائی کی خاطر ایک ایسا شائستہ، معقول، اور تندرست ضابطۂ حیات مُرتّب کرو جو اس بیسویں صدی میں تمہارے کام آسکے۔

اگر تم نے وقت کی یہ سب سے ضروری بات نہ سُنی تو یاد رکھو تم یونہی زمانے کی شکایتیں، اور تقدیر کے شکوے کرتے کرتے مرجاؤگے۔ اور تمہاری موت ایک ایسی بدنام موت ہوگی جو ہمیشہ خودکشی کرنے والوں کے حصّے میں آیا کرتی ہے۔

زمانے کی شکایتیں کرنے، اور روزگار کو پانی پی پی کر کوسنے والو، لگے ہاتھوں یہ بھی سُن لو کہ زمانہ کبھی اچھا یا بُرا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ یہ افراد ہیں جو زمانے کو اچھا یا بُرا کہا کرتے ہیں ——— جو لوگ خود اچھے ہوتے ہیں وہ زمانے کو اچھا اور جو خود بُرے ہوتے ہیں، وہ زمانے کو بُرا کہتے ہیں۔

اچھے وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے عہد کی نبض دیکھنا اور اپنے عصر کے قلب کی ضربیں شمار کرنا آتا ہے ـــــ اور بُرے وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں زمانے کو گالیاں دینے کے علاوہ، اِن دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں آتی۔

ایک بار پھر سُنو، اور غور سے سُنو کہ تمہارے دماغوں پر تقلید و اوہام کی برف جمی ہوئی ہے۔ تمہاری ذہنی فضا میں بوسیدہ روایات کا غلیظ دھواں گُھٹا ہوا ہے۔ اور تمہارے نفوس کے گرد، قدامت پرستی کی کائی سے ڈھکی ہوئی سربفلک دیواریں کھڑی ہوئی ہیں ـــــ

اب بھی سویرا ہے، خدا کے واسطے چونکو، اُبھرو، اُٹھو اور پھُریری لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ تقلید و اوہام کی برف کو آزاد اندیشی کے تیشے سے کاٹ ڈالو، روایات کے دھوئیں کو صحیح تفکر کی تُند ہواؤں میں اُڑا دو۔ اور قدامت پرستی کی دیواروں کو روشن خیالی کی توپوں سے مسمار کر ڈالو۔

یاد رکھو جب تک کسی قوم کا ذہن، تندرست، قوی اور جوان نہیں ہوتا، اور جب تک کسی جماعت کی عقل، کُھلی ہوئی ہوا میں سانس نہیں لے سکتی اُس وقت تک اُس کے سر پر زندگی کا آفتاب نہیں چمک سکتا۔ اور اگر چمکتا ہے تو جب تک کسی قوم یا جماعت میں اِس کی ضَوفشانیوں اور حیات بخش قوتوں کے قبول کرنے اور اُن سے استفادہ کرنے کی اہلیت موجود نہ ہو، بیکار ثابت ہوتا ہے۔ جیسے کسی پتھریلی اور چٹیل زمین پر دانہ پھینکنا خود اُس دانے کے ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

کھرے کھوٹے کی پہچان

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ رُوئے شود ہر کہ درو غش باشد

اِنھیں صفحات پر، اِس سُرخی کے ساتھ نہ سہی، مگر اِس موضوع پر پہلے بھی تھوڑا بہت لکھا جا چکا ہے، اور بحکم ضرورت آج نسبتہً کسی حد تک تفصیل سے لکھا جائے گا۔

ہمارے شعراء نہ تو ادیب ہی معلوم ہوتے ہیں، نہ شاعر ـــــ شاعر، جس مُلک، اور جس قوم کا بھی ہو، شائستہ ترین انسان ہوا کرتا ہے ـــــ میرا مُدّعا یہ ہے کہ شاعر اپنی فطرت کی رُو سے بہترین انسان ہونے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

لیکن یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہمارے "شعراء" اِس کے بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں۔

کیا ہندوستان کے "شعراء" کی تخلیق کے وقت، قدرت کی خوش مذاقی مفلوج، اور سُنّتِ الٰہی معطّل ہو چکی تھی؟

جس قوم کے شاعر کی سیرت کا مطالعہ کیجیے، شروع سے آخر تک آپ کو شرافت، خلوص، لطافت، بلند ہمتی، عالی ظرفی، پاکیزگی، محبت، اور خوش خُلقی کے سوا کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ ملے گی، جس سے آپ کے جمالیاتی احساس کو ٹھیس لگ سکے۔

لیکن اس ہندوستان میں اُلٹی گنگا بہتی ہے ـــــ یہاں کا "شاعر" چڑچڑا، بدخُلق، لاف زن، کینہ پرور، بدگمان، غیر مخلص، پست ہمّت، سرد مہر، اور احسان فراموش ہوتا ہے ـــــ یہ ذرا ذرا سی بات پر بازاری آدمیوں کی طرح رُوٹھ جاتا ہے، مشاعروں میں اگر ترتیبِ نشست و غزلخوانی کے سلسلے میں اِسے کوئی ادنیٰ سی بات بھی ناگوار گزرتی ہے تو یہ بھری محفل میں چیخنے لگتا ہے۔ محفل سے باہر نکل جاتا ہے، اور منانے والوں کے حلقے میں ایک مست ہاتی کی طرح غصّے میں پیٹ ہلاتا نظر آتا ہے ـــــ یہ اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی "انسان" نظر نہیں آتا۔ اُس وقت بھی "شاعر" ہی رہنے پر مُصر رہتا ہے ـــــ بات کرتا ہے تو بڑے ٹھسّے سے، داد دیتا ہے تو بڑے غرور کے ساتھ، اُٹھتا ہے تو جسم کی ایک خاص مصنوعی صلابت سے، بیٹھتا ہے تو ایک مخصوص دھج سے۔ اور چلتا ہے تو ایسے بناوٹی وقار کے ساتھ، گویا خدا اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے ـــــ احسان فراموش اتنے پرلے درجے کا ہوتا ہے کہ آپ تمام عمر اِس پر احسان کرتے رہیں، لیکن ایک دن بھی آپ نے اِس کے لہک لہک کر غزل پڑھنے پر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوّت سے "واہ، واہ" کے نعرے نہ مارے، تو بس اُسی وقت آپ کے تمام احسانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ آپ سے نفرت کرنے لگتا ہے ـــــ

اِس پر صحیح اور بے لاگ تنقید، یا اعتراض کرنا تو بڑی بات ہے۔
اگر اس کے "بلاغت نظام" کلام پر بُھولے سے آپ نے کسی دوسرے کی
بے لاگ تنقید بھی شائع کر دی تو بس یہ دو دو گز اُچھلنے لگتا ہے، اِس کے
مُنہ سے جھاگ اُڑنے لگتا ہے، یہ اوباش اونٹوں کی طرح بلبلاتا ہے، اور
بدعلین گھوڑوں کی طرح ہنہنا کر ٹاپیں مارنے لگتا ہے۔

اِس کی، اور سانپ کی خاصیت ایک ہوتی ہے، یعنی اِدھر کسی کا
پاؤں دھوکے سے اُس کی دُم پر پڑا، اُدھر فوراً ہی اُس نے مُڑ کر کاٹ لیا۔

چنانچہ میرے ساتھ بھی آج کل یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے ــــ "کلیم" کی
کسی اشاعت میں اِسی قبیل کے "شاعروں" میں سے ایک "شاعر" صاحب کے
کلام پر میں نے اپنے ایک فاضل دوست کی بے لاگ اور صحیح تنقید شائع
کر دی تھی۔ بس تنقید کا شائع ہونا تھا کہ قیامت برپا ہو گئی۔ بگل بجنے لگا،
طبلِ جنگ پر تواتر سے چوبیں ماری گئیں، اور میرے خلاف اُس انتقام گزیدہ
"شاعر" نے اپنے چھوٹے سے قلیل الاشاعت پرچے کی زمین پر پاؤں مار مار
کر اعتراضات کی گرد اُڑانا شروع کر دی۔

غور تو فرمائیے تنقید کیا کوئی گالی ہے جس کا گالی ہی میں جواب دیا
جانا چاہئے؟

شاعر تو بڑی بلند چیز ہے، معمولی سنجیدہ افراد تک گالی کا بھی جواب
نہیں دیتے ــــ لیکن ہمارا "شاعر" محض تنقید پر گالیاں دینے لگتا ہے۔

اور دوسری نہایت تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارا مُلک ایسے افراد کو بھی
شاعر تسلیم کرنے میں ذرّہ برابر پس و پیش نہیں کرتا۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا شُعراء کے نفوس ایسے ہی ہوتے ہیں؟

اور لُطف کی بات یہ ہے کہ بعض احباب مجھ سے اصرار کر رہے ہیں کہ
میں اُن "شاعر" صاحب کے "مُنقدانہ اعتراضات" کا جواب دوں!

جس کے جواب میں صرف اِس قدر عرض کروں گا کہ یہ بیچارے "شاعر"
صاحب کیا ہیں میں تو کسی سنجیدہ ادیب اور حقیقی شاعر کے اعتراضوں کا بھی
جواب نہیں دوں گا۔

اگر میری شاعری اتنی کمزور ہے کہ جو "سرخاب صاحب اکبر آبادی"
یا جو "جہاز صاحب ہاپوڑی" "تنقید کی روشنی میں" یا "تنقیص کے اندھیرے
میں" میرے خلاف لکھنا شروع کر دیں، وہ بجائے گردشِ قلم مٹا کر رکھ دیں۔ تو
پھر میرے واسطے بہترین بات یہ ہوگی کہ میں شاعری چھوڑ چھاڑ کر کسی ریلوے
کے گودام میں کلرکی کرنے لگوں۔ یا کسی نائی نگر میں سر مونڈنے کی دوکان کھول لوں۔

اور اگر میری شاعری اِتنی قوی ہے کہ جو اُس سے ٹکرائیگا، خود اُس
کا ہی سر پھٹ جائے گا تو پھر مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ میں لنگڑے لُولے، ادھ کچّے
اور نابالغ اعتراضات کا جواب دے کر اپنی توہین کروں؟

میرا مقصود اس سے یہ ہے کہ اگر میری شاعری کمزور ہے، تو کمزور شئے
کی حفاظت کرنا حماقت کے سوا اور ہو کیا سکتا۔ اور اگر قوی ہے، تو قوی شئے
کی حمایت کرنا تحصیلِ حاصل ہے ــــ اس لئے دونوں حالتوں میں اعتراضات
کا جواب دینا ایک مہمل سی بات ٹھہرتا ہے ــــ

خیر، یہ تو ایک جُملۂ معترضہ تھا ــــ ذکر تو یہ ہو رہا تھا کہ ہندوستان
کا "شاعر" بہت ہی پست ذہنیت رکھتا ہے۔ اور اُسی کے ساتھ اِس بات
پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ شاعر، جو رسیدگی و ثقافت [illegible]
کے نقطۂ کمال پر جلوہ گر ہوتا ہے، اُس سے کوئی رکیک، یا بازاری حرکت
ہو کیونکر سکتی ہے؟

کیا کبھی سُننے میں آیا ہے کہ کسی ہرن نے درندوں کی طرح کسی جانور کو
پھاڑ کھایا ہو؟ اور اگر آپ کے سامنے کوئی ہرن، درندوں کی طرح حملہ
کرنے لگے تو کیا آپ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں گے کہ یا تو یہ قدرت کا کوئی
ناقابلِ فہم کرشمہ ہے، یا پھر معاملہ یہ ہے کہ کسی غیر شاعر نے حقیقی شاعر کا رُوپ
بھر لیا ہے، تاکہ بیت سے شاگرد بنا کر، اور اُجرت کی غزلیں کہہ کر اپنا پیٹ
بھر سکے۔

مجھے یہ سطریں لکھتے ہوئے تکلیف سی محسوس ہو رہی ہے، کیونکہ اِس
معاملے میں اتفاق سے میری ذات کا بھی عنصر شامل ہے، ممکن ہے کسی کو یہ
خیال ہو کہ "کلیم" کے صفحات کو، جو پبلک کی ملک ہیں، میں اپنے ذاتی معاملے
سے آلودہ کر رہا ہوں ــــ مگر یقین فرمائیے، میرا ضمیر اِس آلائش سے قطعی
پاک ہے ــــ اپنے ذاتی معاملے کو تو میں نے محض مثالاً بیان کیا ہے۔

میری اِس تمام خامہ فرسائی کا مدّعا اور مقصد صرف اِس قدر ہے کہ اپنے اربابِ وطن کو یہ سمجھا دوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوستانی، اشیاء و افراد کی صحیح قدر و قیمت اور اُن میں تفریق و امتیاز کا اپنے میں سلیقہ پیدا کریں — اور خصوصیت کے ساتھ ہماری ادبی دُنیا کو اب یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ ادیب کیا ہوتا ہے، اور شاعر کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ

مِل گئی جس کو گانٹھ ہلدی کی
وہ سمجھتا ہے میں ہوں پنساری

کا زمانہ باقی نہیں رہا ہے۔

یہ سچ ہے، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے، لیکن یہ اُس سے بھی زیادہ سچ ہے کہ ہر موزوں طبع، شاعر نہیں ہوا کرتا۔ خواہ وہ دس ہزار دیوانوں کا مصنّف ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ وہ فی منٹ پچاس ہزار شعر ہی کیوں نہ کہتا ہو۔ اور خواہ تمام دنیا کے ناپختہ امارد کا وہ اُستاد ہی کیوں نہ ہو۔ اِس لئے ہندوستان کی ادبی فضا کو صاف کرنے اور گمراہیوں کے مٹانے کی خاطر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے "شعراء" کی فطرت و سیرت کا غائر مطالعہ کرکے یہ بہت جلد معلوم کر لیں کہ اِن میں کتنے حقیقی شاعر ہیں اور کتنے مصنوعی۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اتنی طوالت کی کیا ضرورت ہے، تمام شعراء کا کلام ہمارے سامنے ہے، ہم اُن کے کلام کا غائر مطالعہ کرکے اُن کے باب میں حقیقی و مصنوعی شاعر ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں اِس کے جواب میں عرض کروں گا کہ یہ کام نہایت ہی خطرناک ہے۔ اور اِس عہد میں خطرناک تر ہو چکا ہے ——— آپ کو معلوم ہے کہ اِس زمانے میں ہر روز کتنے جھُوٹے سِکّے ڈھالے، اور کتنے جھُوٹے نگینے تراشے جاتے ہیں۔ اور وہ اصل کی ایسی کامیاب نقل ہوتے ہیں کہ کھوٹے کھرے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ——— آج کل مصنوعی شعراء کا بھی بالکل یہی حال ہے، اِن حضرات نے برسوں کی مسلسل مشق و مزاولت سے اِس قدر استعداد بہم پہنچائی ہے کہ دوسروں کی اعلیٰ شاعری کو سامنے رکھکر اُس کی ایسی نقل اُتار لیتے ہیں کہ بعض اوقات تو خواص تک کو تھوڑی دیر کے لئے یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ وہ حقیقی شاعر ہیں۔

اِس لئے سب سے زیادہ محفوظ اور بے خطا طریقہ یہی ہے کہ تمام مشہور شعراء کی زندگی، فطرت، سیرت اور عادات و اطوار کا غائر مطالعہ کیا جائے، اور اُسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ اُن کی ابتدائی زندگی کن مشاغل میں گزری ہے۔ اُس عہد کے اہم واقعات کیا ہیں، نیز سوسائٹی، وطن، ہمسایوں، کی اُن کے کردار کے متعلق کیا رائے ہے؟ اور جب یہ تحقیقات مکمل ہو جائے تو مُلک اپنا فیصلہ سُنا دے کہ فلاں سچا شاعر ہے، اور فلاں جھُوٹا۔

آپ شاید اِس مشورے کو ایک ادبی تفریح، یا شاعرانہ مشغلہ سمجھتے ہونگے حالانکہ یہ اِس قدر ضروری کام ہے کہ اگر انجام پا گیا، تو دراصل اِس عہد کا ایک نہایت ہی درخشاں کارنامہ ثابت ہو گا۔

آپ ممکن ہے دریافت فرمائیں کہ اِس سے فائدہ کیا ہو گا۔ سُنیئے، اِس وقت سرسری طور سے اِس کے جو فوائد میرے ذہن میں آرہے ہیں، اُنھیں عرض کیئے دیتا ہوں۔

(۱) ادبی دُنیا کو کھوٹے کھرے کی معرفت حاصل ہو جائے گی جس سے مُلک کی ادبی ذہنی زندگی پر نہایت مُفید اثر پڑے گا۔

(۲) جو نوعمر کہ مصنوعی شعراء کی اِس وقت تقلید کر رہے ہیں۔ وہ اپنی غلطی سے آگاہ ہو کر راہِ راست پر آجائیں گے، اور اُن کا ادبی دماغی مستقبل خطروں سے محفوظ ہو کر صحیح راستہ پر گامزن ہو جائے گا۔

(۳) اِن جھُوٹے شعراء کے جو بے شمار شاگرد ہیں، وہ ذہنی گمراہی، اور فیس کی فرمائشوں کے بارے بچ جائیں گے (واضح رہے کہ جھُوٹا شاعر، شاگرد بنانے کا بہت ہی سخت حریص ہوا کرتا ہے، اور فرطِ بُزدلی سے اکثر شاگردوں ہی کے کاندھے پر رکھکر بندوق چھوڑتا ہے)

(۴) رسائل و اخبارات کا راستہ صاف ہو جائے گا۔

(۵) نیندیں حرام کرنے والے اور ادبی انجمنوں پر فضول کرائے وغیرہ کا بار ڈالنے والے مشاعروں کا تن و توش گھٹ جائے گا۔

(۶) اور سب سے بڑا فائدہ یہ پہونچے گا کہ اِن جھُوٹے شاعروں کے جھُوٹے لٹریچر سے، خصوصیت کے ساتھ تعلیم یافتوں اور نوجوانوں کو جو سیاسی، ادبی، ذہنی، اور معاشرتی نقصان مُدّتِ دراز سے پہونچتا چلا آرہا ہے، اُس کا سدِّباب ہو جائے گا۔

مسائلِ حیات

(دینیات)

جوشؔ ملیح آبادی

(۱) کون مدعی ہے، اور کون یہ قطعیت کے ساتھ ثابت کر سکتا ہے کہ یہ دنیا ایک قادرِ مطلق خالق کے بغیر عالمِ وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھی؟

(۲) کہیں خود خدا ایک ایسی ہستی کی مخلوق و پیداوار تو نہیں، جس نے سب سے پہلے اس کا تصور قائم کیا تھا؟

کیا ہمیں درحقیقت خدا کی احتیاج ہے؟ —— یا معاملہ یہ ہے کہ ہم اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم اُس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے؟

(۳) اگر ریاکار اربابِ مذہب ڈھنڈورا نہ پیٹتے، تو کیا یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ خدا کبھی انسانیت کا مددگار رہا ہے؟

کیا اربابِ دین کی دنیا پرستی نے خدا کو نیستی کی زمین سے کھود کر باہر نہیں نکالا ہے؟ اُسے اسرارِ فطرت سے غذا ہم نہیں پہونچائی ہے؟ اور تخیلات کی تمام ممکن الحصول بلندیوں کا خلعت اُسے نہیں پہنا رکھا ہے؟

(۴) لیکن آخر کس مصلحت کی بنا پر یہ ریاکار، خدا کو اُس کے گوشۂ خلوت سے کھینچ کر باہر نکال لائے ہیں، اور اُس کے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ تو خدا ہے؟ کیا ان حضرات کے اِس طرح کان میں پھونک دینے سے پیشتر وہ خدا نہ تھا؟

کیا انسان کی فطرت ہی کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ خدا کی خوشامد کرے، اور خدا کے ذمّے یہ فرض ہے کہ وہ اِن بیہودہ خوشامدوں کو برداشت کرتا رہے؟

لیکن خدا کے اسمار و صفات مقرر کر کے آخر اُسے تنگ کیوں کیا جائے؟

کیا یہ ہمارے اور خدا دونوں کے واسطے بہتر نہ ہوگا کہ ہم اُس کی تعریف ~~Definition~~ سے باز رہیں۔ اور اُن تعینّات میں اُسے محدود کر کے جو ہمارے اوہام کو خوش آئند معلوم ہوتے ہیں، اُس لامحدود قوت کی قطع و بُرید نہ کریں؟

کیونکہ جب ہم خدا کی تعریف ~~Definition~~ کے سلسلے میں، اُس کے اسمار و صفات کے حدود مقرر کرتے ہیں،

تو جو باتیں کہ ہم نے اُس کی تعریف میں شامل نہیں کی ہیں، کیا اُن کی رُو سے ہم خدا کو مباحثوں اور مناظروں کی آماجگاہ نہیں بنا دیتے؟ اور کیا ہم اِس کا دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے جو کچھ بھی اُس کی تعریف بیان کی ہے، وہ اُس تمام مجموعی تعریف سے بھی کچھ زیادہ ہے؟

اِن حالات میں اُس ذاتِ مطلق کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "صرف اتنا یا اُس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا" کتنی ہولناک حماقت کا ارتکاب کرنا ہے۔

(۵) اگر خدا کوئی ایسی شئے ہے جو اب تک ہمارے احاطۂ علم میں نہیں آتی ہے، تو آؤ "خدا" کہنے کے عوض ہم اُسے "نامعلوم شئے" کے نام سے پکارنا شروع

کر دیں ـــــ کیونکہ "خدا" کا لفظ کیا اس قدر کافی غلط طور سے استعمال نہیں کیا جا چکا ہے کہ اب اُسے بدل دینا ہی قرینِ مصلحت ہے۔

(۶) خدا کو (۱) "ایک آفاقی و عالمگیر قوت" تسلیم کرنا، اُس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ (۲) "دو پاؤں، اور متعدد ہاتھ رکھنے والی ایک شخصیت" ہے ان دونوں میں ہمارے ذہن و شعور کے واسطے کونسا عقیدہ کم اذیت رساں ہو سکتا ہے؟

(۷) یہ بات درجۂ حمق تک لغو ہے کہ ہم ایک ایسے شخصی خدا کے باب میں مباحثہ کریں، جو تشخص کے ساتھ ساتھ بے پایانی کی بھی نمایندگی کر سکتا ہے۔

لیکن آج بھی کتنے ہیں جو اسی عقیدے کے قائم رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔

(۸) کیا بیل کا خدا اُس کے نزدیک ایک ایسا عظیم الجثہ جانور نہیں ہے کہ اُس کے سینگ اُن تمام جانوروں میں جو اُس نے اب تک دیکھے ہیں، سب سے زیادہ لانبے، اور اُس کا کوہان سب سے زیادہ اونچا واقع ہوا ہے؟

(۹) شخصی خدا کی صرف وُہی تسبیح خوانی کرتے ہیں جنھیں اُس سے نفع پہونچا ہے ـــ کیا بہت سے محض اُس کے نام نکیئے کے بھروسے پر زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں؟ اور یہ اس سے بھی زیادہ حیرتناک بات ہے کہ شخصی خدا کی نفع رسانی کے معتقدین اس سے ہمیشہ لاعلم رہتے ہیں کہ انھیں کس کی ذات سے درحقیقت نفع پہونچتا ہے۔

(۱۰) کہا جاتا ہے کہ اکثر خدا ہمیں دوسروں کے ذریعے سے نفع نقصان پہونچایا کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو فرمانروا اپنی ذمہ داریوں کا بار دوسروں پر ڈال کر خود کو تمام ذمہ داریوں سے بچانے کا خوگر ہوتا ہے اُس سے بالعموم نفرت کی جاتی ہے۔

لیکن حیرت ہے کہ ہمارا خدا آئے دن یہی کیا کرتا ہے اور پھر بھی ہم سے کہا جاتا ہے کہ وہ "خدائے عدل پرور" ہے۔ اُس کے سامنے سربسجود ہو جاؤ!

(۱۱) ایسے خدا کے وجود سے کیا فائدہ جس کی غذا اور حفاظت کا انتظام ہم خود کرتے ہوں، حالانکہ اُس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ وہ خود "محافظِ کائنات" ہے؟

کیا ہم اس سرخی کے ساتھ بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر آئے دن چسپاں نہیں کیا کرتے کہ "خدا کے نام کی حفاظت کرو" اور "خدا" کی مدد کون کرتا ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر ہم خدا کی مدد نہ کرتے رہیں تو وہ فنا ہو جائیگا اور دنیا سے اُس کا نام مٹ کر رہ جائیگا؟

(۱۲) اگر خدا "قادرِ مطلق" ہے تو کیا ہم زندگی کے ہر قدم پر اُس سے غلط فائدہ نہیں اُٹھاتے، اور اُس کی اہانت نہیں کرتے ہیں؟

(۱۳) یہ ماہر دینیات آخر "خدا جمیل ہے" "خدا جمیل ہے" کی رٹ کیوں لگایا کرتے ہیں؟ کیا انھیں یہ خوف ہے کہ اگر وہ اُس کے جمال کا آوازہ بلند نہ کرتے رہینگے تو ہمیں اُس کی ذات سے جو دلچسپی ہے، وہ بہت جلد ضائع ہو جائیگی؟

یا یہ بات ہے کہ ہم اُس کی شکل دیکھ کر اُس کی معرفت حاصل کرنے سے غالبًا مایوس ہیں؟

(۱۴) خدا کا عقیدہ ہمیں عقدۂ کائنات کے وا کرنے میں تو مدد دیتا ہے لیکن خود اُس کی ذات کا عقدہ اس اعتقاد سے حل نہیں ہوتا۔

(۱۵) خارجی اشیا کی پرستش "بت پرستی" ہے، اور "بے شکلی" کی پرستش "حدودِ شکل" کے اندر ناممکن ہے۔

تم کس مسلک کے پیرو ہو؟

(۱۶) ایک ہاتھا پائی کرتی ہوئی نامراد دنیا کو مرغوں کی طرح لڑتے ہوئے دیکھنا ایک دہشتناک مسرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اور علی الخصوص اُس عالم میں جب ہم ایک ایسے وجودِ مطلق کے قائل ہیں جس کی بابت یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ ایک آن میں اس تمام فتنہ و فساد کو ختم کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔

(۱۷) جب ہم دردمندِ انسانیت اور دیگر حیوانات پر نظر ڈالتے ہیں، اور یہ دیکھتے ہیں کہ قوی ہمیشہ کمزور کو لقمہ بنا لیا کرتا ہے، تو اُس وقت کیا ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور نہیں ہو جاتے کہ یہ دنیا ایک عادل اور شفیق باپ کا ایک غیر عادلانہ اور سفاکانہ کھیل ہے؟

(۱۸) ایسا باپ یقینًا ایک ظالم باپ ہے جو آسمانوں پر بیٹھا ہوا اپنے زمین پر بسنے والے بچوں کی دردمندیوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

(۱۹) وہ لازمی طور پر کس قدر احمق منیجر ہوگا جو خوبصورتی کو بدصورتی، اور بدصورتی کو خوبصورتی کے حوالے کیا کرتا ہی۔

جو کوّے کی چونچ میں انگور دیتا ہی، اور انگور کی بیل کو بھینسوں سے چروا تا ہی۔

اور اس بد ذوقی کا آئے دن مشاہدہ کرنے کے باوجود، یہ ایک حیرتناک بات ہی کہ ہم آج تک ایک دوسرے سے نہایت متجسّسانہ انداز میں دریافت کیا کرتے ہیں، کہ "ہم اِس قدر بدنصیب و کم بخت کیوں واقع ہوئے ہیں"؟

(۲۰) بیشتر آسمانی کتابیں تکرار ہیں مقدس و قدیم نام نہاد مسودات و الہامات کی جن میں کہیں کہیں تھوڑی بہت عقلِ عامّہ کی جھلک بھی پائی جاتی ہی۔ اور یہ تھوڑی بہت عقلِ عامّہ کی جھلک ہی ہی جو اربابِ فراست کو ان کی جانب متوجہ کر سکتی ہی۔

(۲۱) ہماری ادعیہ و اوراد کی کتابیں، دنیدارانہ خوشامدوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔

(۲۲) جب ہم سے یہ کہا جاتا ہی کہ وہ قادرِ مطلق جو سب سے زیادہ سنجیدہ و خود دار ہی۔ اپنے ان خوشامدیوں کی بکواس کو، جو خود اُس کے منھ پر اُس کی خوشامدیں کیا کرتے ہیں، خاموشی و صبر کے ساتھ برداشت کر لیتا ہی، تو ہمیں یہ ایک اچھا خاصہ مسخرا معلوم ہوتا ہی، اور ہم قہقہے مارتے مارتے بیدم ہو جاتے ہیں۔

(۲۳) کیا تم خدا کے بالکل متصل ہوکر ابدیت حاصل کرنے کے آرزومند ہو، تو پھر اُس کی خوشامد کرنا کیوں نہیں ترک کر دیتے، کیونکہ کوئی صاحبِ ذکاوت ہستی خوشامدیوں کی دل سے عزت نہیں کر سکتی۔

(۲۴) کسی کو اِس غرض سے کچھ معاوضہ نہ دو کہ وہ خدا کے سامنے تمھارے مقاصد کی وکالت کریگا۔ ورنہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تم خدا کو ایک ایسا عالم الغیب احمق سمجھتے ہو جو بآسانی دھوکا کھا سکتا ہے۔

(۲۵) اپنے محبوب دوستوں اور عزیزوں کی محبت کو خدا کی محبت پر قربان کر دینا صرف احمقانہ فعل ہی نہیں، بلکہ مجرمانہ ارتکاب بھی ہی۔

کیونکہ محیطِ کُل اور حاضر و ناظر خدا ان سب کے اندر موجود نہیں ہی؟

(۲۶) سچی محبت کا رشتہ صرف ہمرتبہ ہستیوں ہی میں قائم ہو سکتا ہی، اور جب تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارا خدا تمھارے ہی مثل ہی تو کیا تم اُس کی عزت افزائی کرتے ہو؟

(۲۷) کیا توبہ سے نامۂ اعمال دُھل جاتا ہی؟ اگر ایسا ہی تو آؤ روز گناہ کریں، اور روز توبہ کر لیا کریں۔

(۲۸) اگر حکم خدا کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو قتل کے جرم میں سولی کیوں دی جائے؟

خدا کے لیئے بتاؤ قاتل کو قتل کا اشارہ کیا خدا ہی نہیں کرتا؟ اور اگر ایسا ہی ہی تو یہ عجیب انصاف ہی کہ جرم تو اور کسی کا ہوا اور سزا پائے کوئی اور۔

(۲۹) جرائم کے باب میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ یا (۱) کیا خدا پر فاعلِ حقیقی کی حیثیت سے ہر فردِ جرم لگا دی جائے (۲)، یا یہ اعتقاد قائم کیا جائے کہ خدا جو کچھ کرتا ہی وہ مخلوق کی بھلائی ہی کے لیئے کرتا ہی؟

(۳۰) شیطان بڑے مزے کرتا ہی —— وہ انسان کے سامنے ترغیبات پیش کرتا ہی، اور یہ امر انسان پر چھوڑ دیتا ہی کہ اُس کے پیش کردہ ترغیبات کے قبول کر لینے کی خاطر وہ ایسے اخلاقی اصول مرتب کرے کہ کوئی اُسے بُرا نہ کہہ سکے۔

انسان کس کی تقلید کرتا ہی —— خدائے بزرگ و برتر کی، یا شیطانِ ملعون و مردود کی؟

تم جواب دینے سے جھجھکتے کیوں ہو؟

(۳۱) جنت کیوں تعمیر کی گئی ہی؟ اِس لئے کہ انسان اِس لالچ میں اچھے کام کرے، اور کیا عقلِ عامہ Common Sense کی اصطلاح میں اسے رشوت کے نام سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ہی؟

(۳۲) دوزخ وہ مقام ہی جہاں کوئی بھی جانا نہیں چاہتا، لیکن بہت سے لوگوں کو اُس میں جانا پڑتا ہی —— اگر دوزخ، خود آزاری و اذیت کے اندر موجود نہیں ہی تو پھر کہاں پائی جا سکتی ہی؟

(۳۳) ہماری عصری زندگی (Modern Life) پرلغوترین خیالات میں سے ایک خیالِ باطل، اور بدترین وہم پرستی کی شکلوں میں سے ایک شکل موہوم "رُوحانیت" کے نام سے آج بھی حکمرانی کررہی ہے۔

کیا اِس بھولے بھالے انسان کو جس کا تخیل اِس قدر تہی داماں واقع ہوا ہے کہ وہ "رُوحانیت" کی سی چیزوں پر اِس زمانے میں بھی اعتقاد رکھتا ہے، کوئی عادل قوّت ابدی سزا دینے کی جرأت کرسکیگی؟

(۳۴) اگر تمام آدمیوں کا جنت میں بھی وہی پیشہ رہیگا جو اِس زمین پر ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ جنّت کو ایک دوسری جنگ کا منہ دیکھنا پڑیگا۔

(۳۵) ایک حبشی، اگر وہ "رُوحانی" آدمی واقع ہوا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہوگا کہ موٹے موٹے ہونٹوں والی ننگی دھڑنگی سیاہ فام عورتیں تیز دھوپ میں اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں، اور کالے کالے "جنٹلمین" کسی مرے ہوئے ڈھور کا کچا گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھارہے ہیں۔ اور گوشت کھاکر بغیر ہاتھ منھ دھوئے ایک مسرّت آمیز تھکن کے ساتھ پتھروں پر سر رکھے خرّاٹے لے رہے ہیں۔

(۳۶) اگر دُنیا کا خلق کرنا خُدا کی خوشی کا باعث ہے، تو اِس دُنیا سے لطف اٹھانا ہمارے خوشی کا باعث ہونا چاہیئے۔ ہم خُدا کی خوشی سے تطابق کیوں نہ پیدا کریں؟

(۳۷) اگر واعظین کی ناکیں، ہاتھیوں کی سونڈوں کے برابر ہوتیں تو دوسروں کے معاملات میں اپنی سونڈوں کو داخل کرنے میں اُنھیں کیسا مزا آتا۔

(۳۸) اربابِ مذہب کی تاویلیں اور موشگافیاں دراصل پٹّیں یا افتادہ پارسایانہ سازشوں کے جال ہیں، جو ہمارے صحیح عقائد پر اِس لئے ڈالے جاتے ہیں کہ ہم حقائق کو بھول جائیں۔

کیا ہم بیچارے ٹھگے جانے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟

(۳۹) مجھے تمھارے سامنے نہایت بیباکی کے ساتھ اِس کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ اگر میں اچھی سیرت کے بیدینوں کے لشکرِ عظیم کے اندر گھر جاؤں تو مجھ پر کوئی خوف طاری نہ ہوگا۔ لیکن اگر صرف چند نام نہاد اور ریاکار دینداروں کے حلقے میں میرا گزر ہو جائے تو میں اُن کی گنجان داڑھیوں اور آتشِ مکر سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اِس قدر دہشت زدہ ہو جاؤں گا کہ میری سانس رُک جائیگی۔

سچ کہنا کون خطرناک ہے۔ ایماندار بیدین، یا بے ایمان دیندار؟

(۴۰) نجات یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں اطمینان وسکون محسوس کرے، اور یہ سمجھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اچھا ہو رہا ہے ـــــ

کیا نجات کی خاطر عزلت گزینی اختیار کرنا کاروبارِ حیات سے بھاگنا اور ایک بزدلانہ پیشہ اختیار کرنا نہیں ہے۔

کیا نجات کے رنگروٹ، خطرناک قسم کے بزدل نہیں ہیں، ایسے بزدل، جنھیں اِس دُنیا میں اچھا روزگار ملنے کی کوئی امید نہیں ہوتی؟

(۴۱) کیا انسان کا خُدا سے وہی تعلق ہے جو غلام کا آقا سے ہوتا ہے، اور خُدا، انسان کو صرف اِس لئے کھلاتا پلاتا ہے کہ وہ اُس کے خدمت سے لطف اندوز ہوتا رہے۔؟

کیا ہم اپنے تمام افعال وخدمات کو اِس مرحمت کے معاوضے میں خُدا ہی کے روبرو پیش کرتے رہیں کہ اُس نے ہمیں کچھ دن زندہ رہنے کے لئے چھوڑ رکھا ہے؟

(۴۲) کیا خُدا کی سی سب سے زیادہ نمایاں ہستی کے لئے کسی کو یہ کہتے پھرنے کی ضرورت ہے کہ دیکھو وہ اِس قدر عظیم، اور دیکھو وہ اِس قدر بلند مرتبہ ہے؟ ـــ

کیا یہ بات بالکل ایسی ہی احمقانہ نہیں ہے کہ آفتاب پوری تابانی کے ساتھ آسمان پر موجود ہو اور لوگ اُس کی طرف اُنگلیاں اٹھا اٹھاکر چیخیں مارتے پھرے کہ دیکھو یہ آفتاب نکلا ہوا ہے، اور دیکھو یہ کس قدر روشن اور کس قدر گرم ہے؟

خُدا کے لئے بتاؤ کیا ہمارے راہنما، ہادی، اور اوتار اِسی قسم کے نعرے نہیں مارتے رہتے ہیں ـــ اور کیا تم نہیں سُنتے ہو کہ وہ اِس کا اعلان کررہے ہیں کہ وہ براہِ راست خُدا کے پاس سے آئے ہیں؟

کیا مجھے بتایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ تمام ہنگامہ خود بینی نہیں ہے تو

پھر اسے اور کیا کہتے ہیں ؟

(۴۳) اگر تمھیں صرف پرُوپگنڈا کرنے کا گرُ آ جائے تو تم خُدا کو معزول کر کے خود اُس کے تخت پر بیٹھ سکتے ہو۔ بہت سے افراد اِس کاروبار میں کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔

پرُوپگنڈا ایک ایسی بلا کی چیز ہے کہ غریب انسان تو کیا، وہ خود خُدا کو بھی بے دست و پا بنا دے سکتا ہے۔

(۴۴) ہم میں سے وہ لوگ جو خُدا کو ثابت کرنے کی بوکھلاہٹ میں اُس کی تعریف "نیچر" سے کرتے ہیں، صرف اُس کی اہانت ہی نہیں، بلکہ اُس کے ساتھ شدید ناانصافی بھی کرتے ہیں۔

خُدا کے متعلق ہمارا تصوّر و تخیُّل یہ ہے کہ وہ رحیم، پاک، بلند، اور اُن تمام صفاتِ حسنہ کا مجموعہ ہے جو انسانی ادراک میں آ سکتے ہیں۔

لیکن نیچر ایسی شہادتیں جمع کیا کرتی ہے جس سے خالق کی سیرت کا دامن داغدار نظر آنے لگتا ہے۔ نیچر، غیر معقول، بداخلاق، اور ہر قدم پر ظالم واقع ہوئی ہے۔

کیا ہمارے سامنے صرف دو ہی راستے کھُلے ہوئے ہیں، یعنی (۱) یا تو ایک بے نیچر خُدا پر ایمان لائیں (۲) یا ایک بے خُدا نیچر پر؟

(۴۵) اگر اِس دُنیا کا درحقیقت کوئی خُدا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی علم ہے کہ اِس عالمِ کون و فساد میں کیا کیا ہنگامے مچے ہوئے ہیں، اور پھر بھی وہ اِن تمام نامطبوع باتوں کو برداشت کر رہا ہے۔ تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اگر اور کسی وجہ سے نہ سہی، صرف اپنی خودداری اور اپنی رحمت ہی کی خاطر خُدا اِس دُنیا کو آنِ واحد میں تباہ کر کے اپنے بندوں کو مصائبِ حیات سے آزادی دلا دے۔

(۴۶) کیا یہ بات خُدا کے نوٹس میں ابھی تک نہیں لائی گئی ہے کہ اُس کے نام سے کیا کیا ناجائز فائدے اُٹھائے جا رہے ہیں۔ کتنے "دیندار" ہیں جو اپنی ناپاک عباؤں کے متعلق یہ مشہور کرتے پھر رہے ہیں کہ یہ عبائیں خُدا کے خاص درزیوں نے اُن کے واسطے طیار کی ہیں، جنھیں فرشتے طبقِ زر میں رکھ کر اُن کے پاس لائے تھے۔ کتنے پیرانِ پارسا ہیں جو چند الہامی حروف بڑبڑا کر دوسروں کی جیبوں پر چھاپے مار رہے ہیں ــــ کتنے خانقاہ نشین ہیں جو اُس کا نام لے لے کر سنگین اور دہشتناک جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں ــــ

اور کیا آسمانی حکومت کے کسی مخبر نے بارگاہِ ایزدی تک یہ خبر ابھی تک نہیں پہونچائی ہے کہ اُس کے مقدّس و برگزیدہ اربابِ مذاہب خود اُس کو اپنے دکان کا بورڈ بنائے ہوئے ہیں، اُس کا مول تول کر رہے ہیں۔ اُس کی خرید و فروخت ہو رہی ہے، اُسے چیلنج کیا جا رہا ہے، اُس کی اہانت ہو رہی ہے، اور داڑھیوں کے سائے میں اُسے نیلام پر چڑھا کر بولیاں بولی جا رہی ہیں؟

(۴۷) آؤ خُدا کے نیلام کی بولیاں سُنیں:-

نیلام کرنے والا۔ (اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) "حضرات، اب ذرا اِدھر متوجہ ہوں، اب سے بڑھیا مال پیش کیا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ خُدائے ذوالجلال والاکرام ہے، یہ انسان کو مار اور جِلا سکتا ہے، اگر یہ آپ کے گھر میں موجود ہو تو پھر مفلسی، مایوسی، محرومی، معذوری، مجبوری، اور موت تک آپ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتی،

ہاں حضرات متوجہ ہوں، سرکاری بولی ایک ہزار ــــ ایک ہزار ــــ سرکاری بولی ایک ہزار ــــ

کیا؟ دوسو؟ اچھا، دوسو۔ خدائے بزرگ و برتر۔ دوسو روپے، دوسو روپے۔ اچھا ــــ تین سو، تین سو، ــــ ہُوں، پانسو، پانسو، دیکھئے جناب اِتنی جلیل القدر دولت صرف پانسو میں جا رہی ہے، بڑھیئے بڑھیئے۔ اچھا ــــ اچھا، ساڑھے پانسو، ساڑھے پانسو ایک ــــ ساڑھے پانسو دو ــــ بولیئے، بولیئے، جلد بولیئے مال بہت سستا چھوٹ رہا ہے، ــــ ساڑھے پانسو، ایک ساڑھے پانسو دو ــــ اور . . . .
. . . ساڑھے . . . . . . پانسو . . . . روپے . . . . تین !!

اَسفَلُ السّافِلِین !!

زندگی

دیوانہ مصطفےٰ آبادی

کاروانِ حیات ـــــ زندگی کی پیچیدہ اور بل کھاتی ہوئی راہوں بل کھاتا اور بھٹکتا چلا جا رہا تھا، مسافر کا دل ولولوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور ہر موڑ پر اُس کو ان کے پورا کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا جاتا تھا،

زندگی نے شہرت سے کہا

"کوئی طرزِ نو بتاؤ جس سے میں نام و نمود حاصل کروں"

شہرت نے جواب دیا

"غلام ملک میں اگر نام و نمود حاصل کرنے کی تمنا ہی تو پرستارِ وطن ہو جاؤ۔ ملک اور اہلِ ملک کی آزادی کے لیئے سرفروشانہ میدانِ کارزار میں کود پڑو اور اُس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ غیروں کے قدم اس مقدس زمین سے نہ اکھڑ جائیں یا تم اپنی جان قربان نہ کر دو، بس شعبِ آزادی بن جاؤ پھر میں تمھارے قدموں پر پڑی ہونگی اور تم ٹھکرا رہے ہوگے"!

زندگی نے محبت سے التجا کی

"مجھے محبت ہی اک پیکرِ رنگین جمال سے، میں اُس کی محبت کس طرح حاصل کروں"

محبت نے کہا

"محبت سے محبت کرو، محبت تمھاری ہو جائیگی، محبت سے محبت کرنا اپنے وطن سے پریم کرنا ہی اور وطن کا پریم تمھیں تمام دُنیا میں ممتاز بنا دے گا۔ تمام عالم کی محبت اُس وقت تم اپنے گرد رقصاں پاؤ گے"!

زندگی نے مڑ کر دیکھا، کوئی دراز ریش مُعمّر لیکن جواں ہمت جواں مرد اس کا تعاقب کر رہا تھا اس کے شریانوں میں گرم خون دوڑ رہا تھا اور چہرہ گلنار بنا ہوا تھا۔

زندگی نے بڑھاپے سے تمنا کی

"آہ تجھ سے اپنی جوانی بدل لوں کہ یہ ایک ڈھلتی پھرتی دھوپ چھاؤں ہے"

بڑھاپے نے جوانی پر طنز کیا

اس جوانی سے اپنے بڑھاپے کو بدل لوں جس میں نہ خون ہی نہ جوش، نہ حُبِّ وطن، جو مجھ سے بھی آہستہ خرام ہی۔ نہ اس کے دماغ میں لوچ ہی اور نہ جسم میں لچک، جو عیش و عشرت کے گہواروں میں پلی اور دُنیا اور اپنے ملک سے بیخبر رہ کر جوان ہوئی، جوانی کو بدنام کرنے اور شرمانے کے لیئے اور ابھی تک غفلت کے جھولے میں پڑی ہوس کاریوں کی لوریاں سن کر خوش ہو رہی ہی! آ صرف ڈھانچے بدل لیں میں اپنے تجربات کے ساتھ اپنی عقل کو جلو میں لیئے ایک جوان قالب میں سما جاؤں اور بلند ہمتی کیساتھ یہ ہم تیرے اور تیری نسل کے لیئے سر کر ڈالوں جس کا تجھے خیال بھی نہیں ہوتا۔ تو اپنی پستی کو لے کر بڑھاپے کی آغوش میں پناہ لے"!

زندگی نے لڑکھڑاتے ہوئے امید کا دامن تھام لیا

امید نے اسے اشیرباد دی

"نیا سال ہی اور اس کا آغاز، اے غلام ہندوستان کے مردِ نامراد مایوس نہ ہو، اپنی جماعت کو منظم کر ڈال لیکن اپنی غرض کی کسی تکمیل کیلئے نہیں بلکہ ایک عظیم الشان مقصد کی خاطر ـــ آزادی کے لیئے لڑتا رہ، اِس پُرسکون و بیکار زندگی کو علم و عمل کی روشنی دکھا، اگر دُنیا کی نہیں تو اپنے وطن ہی کی حالتِ زار کا مطالعہ کر۔

ایک نیا مذہب ایجاد کر، محبت، اخوت، اتحاد جس کی بنیادیں ہوں، عالمگیر محبت کے مذہب پر ایمان لے آ، اور اس مذہب کے سائے سے بھی دُور بھاگ جو مولویوں کی دراز ریشوں اور اُن کے ہوس و نفس کے کیڑے لگی ہوئی عباؤں میں پرورش پاتا ہے، اور جس کے گھناؤنے پن نے اُس کی عظمت کی جڑیں پہلی ہی ہلا ڈالی ہیں"۔

زندگی نے نصیحتوں کو گوشِ ہوش سے سُنا اور آنکھ جھپکتے ہی کامرانی و کامیابی کے ہمالیہ پر جا پہنچی جس کی بلند چوٹی پر آزادی کا سُنہری پرچم طلائی کرنوں میں جگمگاتا لہرا رہا

نغمۂ انقلاب

نہاں ہیں جنّتیں دل میں قیامت کے جواں ہم ہیں
جسے دُنیا سمجھتی ہے حیاتِ جاوداں ہم ہیں

امینِ رنگ و بو ہیں جانِ جانِ گلستاں ہم ہیں
زمانہ جس کو کہتا ہے بہارِ بے خزاں ہم ہیں

زمیں ہیں آسماں ہیں دہر ہم ہیں لامکاں ہم ہیں
جہاں جاؤ جدھر دیکھو نہاں ہم ہیں عیاں ہم ہیں

اجل کے ہم نفس ہیں زندگی کے رازداں ہم ہیں
برابر جو بدلتا جائے وہ رنگِ جہاں ہم ہیں

ازل سے گرم رکھا ہے ہمیں نے سینۂ ہستی
دلوں میں اضطرابِ سوزِ غم ہائے نہاں ہم ہیں

یہ سب سوز و گداز و رونقِ محفل ہمیں سے ہے
کہ شمعِ انجمن پروانۂ آتش بجاں ہم ہیں

یہ بے تابی یہ بربادی نہیں بے مصلحت ورنہ
ہر اک ذرہ ہے منزل، وہ غبارِ کارواں ہم ہیں

ہمیں سے ملّتیں اُبھریں ہمیں سے انقلاب آئے
زمیں کی منزلیں ہیں گردشِ ہفت آسماں ہم ہیں

بھری ہیں سینے میں چنگاریاں جوشِ نہانی سے
ستارے جس کی چھینٹیں ہیں وہ دریائے رواں ہم ہیں

کروروں صبحِ نو آغوش میں غلطاں و پیچاں ہیں
زمانے میں سوادِ شام کا اٹھتا دھواں ہم ہیں

نہیں اُٹھتے ہیں جب تک نظمِ ہستی بھی جبھی تک ہے
فنا میں اور بقا میں ہے جو پردہ درمیاں ہم ہیں

ہماری بے خودی ہے پردہ دارِ دورِ مستقبل
جہاں کی رزمگہ میں قسمتوں کے رازداں ہم ہیں

غضب یہ خامشی ہے قہر یہ ہنگامہ آرائی
ہر اک موجِ نفس اک حشر ہے وہ بے زباں ہم ہیں

زمانہ ہو گیا ساقی کہ مستی ہے نہ ہشیاری
اب اس کا ذکر ہی کیا کون ہیں کیا ہیں کہاں ہم ہیں

اُترتے جا رہے ہیں دردِ ہستی بڑھتا جاتا ہے
مثالِ نشترِ غم قلبِ انساں میں رواں ہم ہیں

حریفوں کی کبھی ہم سے نگاہیں مل نہیں سکتیں
چھپکتی ہی نہیں جو وہ نگاہِ جاں ستاں ہم ہیں

یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے ہمارے نالۂ دل کا
جسے کہتے ہیں برقِ جلوۂ حُسنِ تپاں ہم ہیں

ہمیں ہیں آ کے اکثر کھو گئے ہیں حُسن کے جلوے
سرِ راہِ محبت کارواں در کارواں ہم ہیں

جسے مٹنا نہیں آیا جسے گھٹنا نہیں آیا
وہی نام و نشانِ رنگینیٔ باغِ جہاں ہم ہیں

سبکسارانِ ساحل موج کے بل پر اُچھلتے تھے
منائیں خیریت اپنی کہ بحرِ بے کراں ہم ہیں

اُبھرتے ہیں جو اہلِ دولت و ثروت اُبھرنے دے
اُڑا دیں ٹھوکروں سے اُن کے سر۔ وہ آسماں ہم ہیں

ہمیں ہیں خندۂ گُل مُسکراہٹ بھی ہیں غنچوں کی
چمن تھا منتظر جس کا وہ برقِ آشیاں ہم ہیں

اُگلتی ہے زمیں لعل و جواہر کی طرح ہم کو
جبینِ چرخ پر جو کوندتی ہیں بجلیاں ہم ہیں

نگاہِ گرم کی چنگاریاں دھوکا نہ دیں تجھ کو
جسے رونا نہیں آیا وہ چشمِ خونچکاں ہم ہیں

نہ پایا جس کو دوزخ نے وہ کیفِ سوزِ پنہاں ہیں
جسے جنت ترستی ہے وہ دردِ شادماں ہم ہیں

نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے ہم کو اہلِ دولت نے
دو عالم جھک چکے ہیں جس پہ وہ جنسِ گراں ہم ہیں

ہمیں ہیں جانِ آبادی ہمیں ہیں شانِ بربادی
زمیں ہم ہیں زمیں پر آسماں پر آسماں ہم ہیں

گریں جو ٹوٹ کر تو خاک کر دیں خرمنِ ہستی
جو دُنیا میں لگا دے آگ وہ برقِ تپاں ہم ہیں

یہ ہے موجِ فنا یا غفلتیں ہیں سننے والوں کی
پیامِ مرگ ہے جو سربسر وہ داستاں ہم ہیں

نہ وہ گردش زمیں کی ہے نہ وہ رنگ آسمانوں کا
فضائے عالمِ ایجاد کا بدلا سماں ہم ہیں

نظر میں کامیابی کامرانوں کی نہیں جچتی
جہاں کو رشک ہے جس پر وہ سعیٔ رائیگاں ہم ہیں

کسی سے کس طرح کہیئے کہ خود ہم پر نہیں کھُلتا
حیاتِ جاوداں ہم ہیں کہ مرگِ ناگہاں ہم ہیں

اسے گلچیں سے پوچھو یہ دلِ صیاد سے پوچھو
گلستاں کی خزاں ہیں یا بہارِ بےخزاں ہم ہیں

اُلٹ دیتے ہیں تدبیریں پلٹ دیتے ہیں تقدیریں
مفر جس سے نہیں وہ انقلابِ بےاماں ہم ہیں

مٹا دیں گے ہر اک مذہب ہر اک طبقہ ہر اک فرقہ
یقیں جانو وہی ایماں شکن وہم و گماں ہم ہیں

جو خود مُردہ ہیں وہ مُردوں کے وارث ہو نہیں سکتے
بھری دُنیا میں ناموسِ کہن کے پاسباں ہم ہیں

ہمارے دم قدم سے ہے یہ سب ہنگامۂ ہستی
یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے کہ بےنام و نشاں ہم ہیں

ہمارا فاتحانہ قبضہ ہوگا جاہ و دولت پر
جو اُٹھ کر دن دہاڑے لوٹ لے وہ کارواں ہم ہیں

کمر میں زور کس بل بازوؤں میں آگ سینے میں
بوقتِ رزم آرائی بلائے ناگہاں ہم ہیں

مٹانے والے مٹ جاتے ہیں موجوں کے تھپیڑوں سے
تلاطم خیزیٔ بحرِ حیاتِ بےکراں ہم ہیں

رگیں سختی کی ڈھیلی پڑ گئی ہیں کھینچ کر ہم کو
نہ جو زِہ ہو سکی دستِ ستم سے وہ کماں ہم ہیں

سرِ میداں جھپک جاتی ہیں آنکھیں جس سے دشمن کی
وہی برقِ فنا۔ تیر و سناں۔ تیغِ رواں ہم ہیں

زمانے نے ابھی وہ حشر سامانی نہیں دیکھی
زمیں گردوں سے ٹکرا جائیگی وہ آندھیاں ہم ہیں

جو ہیں اہلِ حکومت۔ اہلِ ثروت۔ اہلِ سرمایہ
مٹا دیں گے اُنھیں ہم مالکِ کون و مکاں ہم ہیں

رگوں میں بجلیاں، دل میں تڑپ سینوں میں انگارے
حیاتِ شعلہ ساماں۔ اضطرابِ جاوداں ہم ہیں

ہر آوازِ جرس پر آملیں گے قافلے والے
تجھے معلوم بھی ہے کارواں در کارواں ہم ہیں

ستاروں کی بھی آنکھیں سنتے سنتے لگ گئیں آخر
فسانہ در فسانہ داستاں در داستاں ہم ہیں

یہ گرمی برقِ ایمن میں نہ خورشیدِ قیامت میں
ارے کن بیقراروں کے شرارِ سوزِ جاں ہم ہیں

خبر تجھ کو نہیں غافل وہ دُنیا رشکِ جنت ہے
گذر پیغمبروں کا بھی نہیں ممکن وہاں ہم ہیں

ازل سے چشمِ انجم منتظر تھی جس کی دُنیا میں
اسی بیداریٔ نوعِ بشر کی داستاں ہم ہیں

ہمیں پر اب نگاہِ مضطرب اُٹھتی ہے عالم کی
کہ اس بےچین دُنیا کے لیئے دارالاماں ہم ہیں

فراقؔ اکثر اُڑایا تار تار، بنائے بد جس نے
وہی شوریدہ سر۔ وارفتہ دل۔ آشفتہ جاں ہم ہیں

فراق گورکھپوری

گرفتارِ بلا

سید احسن ایم۔ اے (علیگ)

نوجوان مسٹر ڈی۔ فیک اسسٹنٹ سپروائزر موون شائننگ انشورنس کمپنی آف پوگنڈا نے اپنے ہونے والے خسر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ”گڈ مارننگ۔ انکل“۔

سلام کا جواب دینے کے بعد بڑے میاں نے ہونہار داماد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مسٹر ڈی فیک فی الحقیقت پہلے صرف فخرالدین تھے مگر اب میراثِ خلیل، ترک کرنے کے بعد آغوشِ تثلیث، میں پناہ گزیں تھے اس لئے تبدیلیِ مذہب کے ساتھ نام میں بھی ارتقا لازمی تھا چنانچہ پہلے وہ اگر دستخط محض ایف۔ ڈین فرماتے تھے تو اب نام کو پھیر کر ڈی۔ فیک کرنے لگے تھے۔ انکے بیٹھنے کے بعد بڑے میاں نے اخبار ایک طرف رکھدیا اور چشمہ کو بھی آنکھوں سے اوپر چڑھا کر پیشانی پر لگا لیا اور اپنے آیندہ داماد کی طرف متوجہ ہوئے جو دراصل اس وقت منگنی اور اس کے بعد بیاہ کا مسئلہ طے کرنے تشریف لائے تھے۔

”تو مسٹر فیک اس وقت آپ کو کیا مل رہا ہے؟“

”فی الحال تو کمپنی مجکو سو روپیہ دے رہی ہے مگر آیندہ ——“

”آیندہ کا سوال نہیں“۔ مسٹر فیک کے خسر جن کو تین دامادوں کے خسر ہونے کا تجربہ تھا بات کاٹ کر بولے۔ ”اس وقت تو آپ کی حالت کچھ زیادہ امید افزا نہیں“۔

”لیکن مس لوئی کی محبت سے میں امید کرتا ہوں کہ ہم دونوں اس آمدنی میں آسانی سے گزارا کر لینگے“ مسٹر فیک بولے

”خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن موجودہ آمدنی کچھ معقول نہیں“۔

”آپ کو معلوم نہیں ہماری ملاقات کیسے ہوئی ——“ مسٹر فیک نے خسر صاحب کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”مگر آپ کی دیگر آمدنی کے بھی کچھ ذرائع ہیں؟“ جہاں دیدہ خسر نے پھر سوال کیا۔

”مجھے امید ہے کہ آیندہ میں کچھ حاصل کر سکوں گا۔ تاہم مس لوئی سے مجھے امید ہے ——“ ہونہار داماد نے جواب دیا

”یہ تو ٹھیک ہے۔ پر وہ ذرائع بھی تو معلوم ہوں؟“

”میں فرصت کے اوقات میں مفید ذرائع سے اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکوں گا“ مسٹر فیک بولے۔

”مثلاً“ بڑے میاں سے دریافت کیا۔

”میں فرنچ پڑھا سکتا ہوں۔ اور ترجمہ بھی کر سکتا ہوں۔ اسکے علاوہ کچھ پروف ریڈنگ بھی آتی ہے۔ مسٹر فیک نے تسلی آمیز جواب دیا۔

”آپ ایک دن میں کتنا ترجمہ کر سکینگے“؟ خسر صاحب نے میز پر سے پنسل اٹھا کر اور ہاتھ میں گھماتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں صحیح طور پر تو نہیں بتا سکتا۔ البتہ آج کل ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ دس روپیہ فی جزو کے حساب سے کر رہا ہوں“

نیک نے کہا۔

"اس کتاب کے کتنے جزو ہیں"

"میرا خیال ہے تقریباً ایک درجن" مسٹر نیک بولے

"اچھا تو اس کے تقریباً ایک سو بیس روپے ہوئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟"

"فی الحال تو کسی اور چیز کا خیال نہیں"

"اس کا کیا مطلب! ۔ مستقبل کا حال معلوم نہیں اور پھر آپ شادی کرنے چلے ہیں۔ صاحبزادے ابھی تم کو شادی کی اونچ نیچ کا پتہ نہیں۔ اس میں لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ اور پھر شادی کے بعد بچوں کی بھرمار ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ مصیبت" مستقبل کے خسر بولے

"لیکن بچوں کی جلدی کیا ہے" امیدوار داما نے کہا۔

"مگر یہ چیز تو نیچرل ہے" پدرانہ شفقت کا اظہار کرتے ہوئے بڑے میاں نے فرمایا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ دونوں شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو کچھ وقت دیتا ہوں۔ آپ اس عرصہ میں اپنی آمدنی بڑھانے کی سبیل کیجئے۔ اسکے بعد"

فرطِ مسرت سے بیتاب ہوکر مسٹر نیک نے اٹھکر بہت ہی گرمجوشی سے اپنے تجربہ کار خسر سے ہاتھ ملایا اور تھینک یو کہہ کر رخصت ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں لوئی (مسٹر نیک کی منسوبہ) کو بھی اس رضامندی کی خبر معلوم ہوگئی اور وہ بھی خوشی سے پھولے نہ سمائی کیونکہ دونوں میں معاملات پہلے سے طے ہی تھے۔ صرف بڑے میاں کی رضامندی کی دیر تھی۔ اور وہ بھی جلد ہی تیار ہوگئے تھے کیونکہ اچھے شوہروں کی اس کساد بازاری کے زمانے میں ایک بارہ سو روپیہ سالانہ کی آمدنی والے داماد کا مل جانا بہت بڑی نعمت تھی۔

اب مسٹر نیک کا معمول ہوگیا کہ ہر دوسرے تیسرے دن انکل کی خدمت میں حاضر ہوں اور اس طریقہ سے کسی اور کا بھی نیاز حاصل کرلیں۔

اکثر اوقات ان کی بغل میں ایک دو فرینچ کی کتابیں اور کچھ بے وقت ریڈنگ کے کاغذات بھی ہوتے تھے۔ خسر صاحب پر داماد کی محنت اور جفاکشی کا بعض اوقات اچھا رنگ جم جاتا تھا اور "پاپا" کی اجازت سے اکثر مس لوئی مسٹر نیک کے ساتھ تھوڑی دور بھی چلی جاتی تھیں۔ دو ایک مرتبہ "ریگل" سینما کی بھی سیر ہوئی جہاں صرف ۲۵ روپیہ تین گھنٹہ کی تفریح میں خرچ ہوئے۔ جتنا جتنا شادی کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا طرفین میں تیاری کی جھلک پائی جاتی تھی۔

مسٹر نیک نے تیس روپیہ ماہوار پر ایک فلیٹ کرایہ پر لے لیا جس میں دو کمرے مع باتھ روم تھے۔ اور شہر کے بہترین فرنیچر مرچنٹ کے یہاں سے ایک مختصر ڈرائنگ روم کے سٹ کا انتظام کیا گیا۔ بجلی والے کے یہاں سے مختلف رنگوں کے شیڈ کے لیمپ خریدے گئے جس میں خصوصی طور پر سُرخ رنگ کے شیڈ حجلۂ عروسی کے لئے پسند ہوئے۔ ایک قدآدم آئینہ۔ چاء کا ایک سلور سٹ۔ اور کچھ نفیس کپڑے جو اس موقعہ کے لئے موزوں تھے مہیا کئے گئے۔ اپنا ذاتی باورچی خانہ قائم کرنے کے لئے کچھ پکانے کے برتن بھی خریدے گئے جس میں چچی جان (خورشید احسن صاحبہ) کی پسند کو زیادہ دخل تھا۔ اسسٹنٹ سپروائزر (مسٹر نیک) کے لئے یہ دن بڑی محنت کے تھے۔ سامان کے مہیا کرنے میں دفتر کے دو ایک بابو اور چپراسیوں نے بھی مدد دی تھی۔ اس انتظام کے انہاک میں مسٹر نیک اپنی ذرائع آمدنی میں وسعت پیدا کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہ کرسکے اور اس وقت وہ حق بجانب بھی تھے۔ شادی کے بعد جب سکون ہوجائیگا اس وقت کافی وقت ملا کرے گا" وہ اکثر سوچا کرتے تھے۔ اور یہ خیال تھا کہ وہ انتہائی کفایت شعارانہ زندگی بسر کرینگے اور شادی کے کچھ دنوں بعد ایک سستے مکان میں اٹھ جانے کا بھی خیال تھا۔ اس وقت لوئی کی پسند پر یہ کمرے لے لئے گئے تھے۔ بالآخر مکان آراستہ ہوگیا۔ ایک کمرے میں پردہ ڈال کر اسی کے

دونوں حصوں کو ڈرائنگ اور ڈرائنگ روم بنایا گیا۔ دوسرا کمرہ سونے کا تجویز ہوا جس میں بھی دو حصے زنانہ اور مردانہ (بہ طرز تہذیب جدید) کر لئے گئے تھے۔ سبز ساٹن کی توشک، اسپر سُرخ رنگ کی گوٹ کا لحاف، نفیس چھپر کھٹ جس پر ہری جالی کی مسہری لگی ہوئی تھی اور سُرخ شیڈ والا لیمپ سرہانے رکھا ہوا تھا۔ یہ چند چیزیں زنانہ حصے کی خصوصیات تھیں۔ تکیوں پر دونوں کے دستخط نفیس طریقے پر کڑھے ہوئے تھے اور اس ترکیب سے ملائے گئے تھے کہ بادی النظر میں دونوں ایک معلوم ہوتے تھے۔ مردانہ حصے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل پر ٹوائلٹ کا نفیس سامان رکھا ہوا تھا، اس حصے کی تیاری میں انتہائی سادگی سے کام لیا گیا تھا۔

مراسم شادی سے فرصت پاکر دونوں میاں بیوی خوش و خرم رہنے لگے۔ مسٹر فنیک کو نئے سامان کے استعمال میں انتہا درجے کی خوشی حاصل ہوتی تھی اور بیوی کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا دیکھکر وہ انتہائی گرمجوشی سے استقبال فرماتے۔ اور اس کے ساتھ کھانے میں لطف دوبالا ہو جاتا۔ اکثر اوقات اخراجات کی زیادتی کا خیال آتا تو وہ اس کو فوراً اپنے دماغ سے دور کرنے کی فکر کرتے اور کہتے کہ اب بہت ہی جلد مجکو کام ملنے لگے گا اس میں آمدنی بڑھ جائیگی اور اس طرح مجھے امید ہے کہ میرے اخراجات نہایت ہی اطمینان سے پورے ہونگے۔ اور مستقبل کے خطرات سے متاثر ہو کر وہ حال کے لطف میں بدمزگی پیدا کرنا نہ چاہتے تھے۔ شام کے وقت اکثر اوقات جب وہ مسز فنیک (سابق مس لوئی) کے ساتھ بیٹھ کر کرائے کی ٹیکسی میں مال روڈ پر سیر کو لے جاتے تو جگہ جگہ ان کے دفتر کے لوگ ملتے اور یہ ان پر ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر سلام کا جواب دیتے ہوئے نکل جاتے۔ وہ لوگ بیدل یا سائیکل پر ہوتے لیکن مسٹر فنیک کے لئے یہ بات تھوڑی دیر کے لئے مسکن تھی کہ اپنے ہم جنسوں کے مقابلے میں وہ ایک اچھی سواری پر تھے۔ چند ماہ اسی بے فکری اور لطف سے کٹ گئے۔ دفتر میں مسٹر فنیک کو وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ اور بس یہ جلدی ہوتی کہ کب شام ہو اور کس طرح گھر پہونچیں۔ ابھی اپنے اقتصادی پروگرام، پر مسٹر فنیک نے عمل شروع نہیں کیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد مسز فنیک اتفاقیہ طور پر بیمار ہو گئیں پہلے تو زکام ہوا۔ اپ ٹو ڈیٹ مسٹر فنیک کو یہ شبہہ ہوا کہ کہیں باورچی خانے کے برتنوں کی باقاعدہ صفائی نہ ہونے کے باعث تو یہ شکایت پیدا نہیں ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی اس امر کا تذکرہ کیا گیا مگر انھوں نے اس جانب سے تمام شبہات دور کر دیئے۔ کچھ کمروں میں ہوا کے رخ پر بھی غور کیا گیا اور پڑوس میں رہنے والے ایک ہیلتھ افسر صاحب کی مدد سے کھڑکیوں اور روشندانوں کے کھولنے اور بند کرنے کے اوقات مقرر ہو کر ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جانے کی تجویز ہوئی لیکن بیماری میں کمی نہ ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد پتہ چل گیا کہ مسٹر اور مسز فنیک کا نخل امید بار آور ہونے والا تھا۔ اگرچہ یہ خبر غیر متوقع تھی لیکن اتنی جلد "پاپا" اور "ماما" بننے کے خیال نے دونوں کے دلوں کو تسکین دی۔

ایک روز باتوں باتوں میں لوئی نے اپنے شوہر کے کان میں یہ بات ڈالدی کہ خلاف وعدہ اس نے اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ نہیں کیا بلکہ اخراجات میں زیادتی تھی۔ چنانچہ تجویز ہوا کہ آیندہ سے اخراجات میں احتیاط کی جائے۔

ایک روز دفتر کی واپسی پر مسٹر فنیک اپنے ایک بیرسٹر دوست کے پاس اس غرض سے گئے کہ وہ ان کے ایک پرونوٹ کی ضمانت کرلیں تاکہ اس طریقے سے کچھ روپیہ کا انتظام کرکے مسٹر فنیک اپنے آیندہ (دگر ناگہانی) اخراجات کو پورا کرسکیں۔ "شادی کرنا اور اس کے بعد دنیا کی آبادی بڑھانا بھی بہت مہنگی چیزیں ہیں۔ اور میں تو کبھی اس بار سے

سبکدوش ہو ہی نہ سکا۔" فاضل بیرسٹر نے مسٹر فیک کو قائل کرتے ہوئے کہا۔ لاکھ مسٹر فیک نے بیرسٹر صاحب کی دلیلوں کو رد کرنا چاہا مگر بیرسٹر آخر بیرسٹر تھا۔ مسٹر فیک اپنا سا منہ لے کر خالی ہاتھ واپس آئے۔ گھر پہونچکر ان کو یہ مژدہ روح فرسا سنایا گیا کہ دو آدمی ان کو دو تین دفعہ دریافت کرتے ہوئے آئے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ بارک کے گورے تو نہیں تھے۔" مگر جب ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ گورے نہیں تھے بلکہ سیاہ فام لوگ تھے تو انکو خیال آیا کہ شاید دو آدمی پرسوں دفتر میں اپنی زندگی کا بیمہ کرانے آئے تھے وہی ہونگے مگر اس پر بھی جب نوکر نے یہ کہا کہ وہ تو درزی معلوم ہوتے تھے کیونکہ ایک کے ہاتھ میں ناپنے کا فیتہ تھا اور دوسرے کے کوٹ کے کالر پر دو تین سوئیاں لگی ہوئی تھیں تو مسٹر فیک جھلا کر بولے "آتے ہی اس پیغام کو سنا دینے کی کیا ضرورت تھی۔ چلو جاؤ میرے لئے چار تیار کر کے لاؤ۔ لو یہ 'جام' ڈبہ۔ توسوں پر مکھن بھی لگا کر لانا۔"

ملازم کے باہر جانے کے بعد لوئی نے آہستہ سے کہا

ڈیر ہم کب تک اس فضول خرچی سے گزر کرینگے؟"

"کچھ پروا کی بات نہیں، میں نے اکسٹرا ورک کا انتظام کر لیا ہے۔ مسٹر فیک نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔

لیکن قرض کیونکر ادا ہو گا؟" لوئی نے دریافت کیا۔

"قرض، اس کے لئے تو میں نے ایک بڑی رقم کا انتظام کیا ہے جس سے وہ ادا ہو جائیگا۔" مسٹر فیک نے اطمینان کے لہجے میں جواب دیا۔

"مگر اس سے تو مزید بار ہو جائے گا ــــ مسز فیک جملہ پورا بھی نہ کرنے پائی تھیں کہ مسٹر فیک بولے "مگر اس وقت ان فضول باتوں کے ذکر کا کیا موقعہ ہے۔ اس وقت میں 'جام' نیا ڈبہ لایا ہوں، تم ذرا اسے چکھ کر تو دیکھو۔"

اتنے میں ملازم نے آکر کہا کہ چار تیار ہے۔ مسز اور مسٹر فیک نے ڈائننگ روم میں جا کر چار نوش کی۔

دوسرے دن صبح ہونے کے بعد پھر مسز فیک نے قرض کا ذکر چھیڑا۔ اور اس مرتبہ اس نے اپنے شوہر سے باوضاحت کہا۔

"جنس والے بنئے کو دو مہینے سے کچھ نہیں دیا گیا۔ قصائی کا تقاضا الگ ہے۔ درزی کل شام کو دو دفعہ چکر لگا گیا تھا۔ اور اپنے داموں کا سختی سے تقاضا کر رہا تھا۔"

"بس یہی ہے یا اور کچھ ہے؟" مسٹر فیک نے دریافت کیا "یہ رقم تو کل ہی ادا ہو جائے گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس وقت باہر چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟۔ اگر تم پیدل نہ چل سکو تو کہو کہ گاڑی منگوا لوں۔"

مسٹر فیک کی ضد پر مسز فیک تیار ہو گئیں اور اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے کچھ خریداری ہوئی اور اس کے بعد میڈن ریسٹورنٹ میں لنچ ہوا جس کا بل ساڑھے سات روپیہ ادا کیا گیا۔ بل ادا کرنے کے وقت مسز فیک نے سوچا کہ اتنے داموں میں گھر پر کئی وقت اطمینان سے کھایا جا سکتا تھا۔

مہینے گزرتے گئے اور وہ وقت ابتلا نزدیک تر آتا گیا تیاریوں کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک جھولا ہونا چاہیے۔ بچہ کے لئے کپڑے چاہیئے وغیرہ۔

بزاز اور درزی نے کپڑے دینے اور سینے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے پچھلے بلوں کی صفائی اب تک نہیں ہوئی تھی بالآخر جس وقت کا دھڑکا تھا وہ آ پہونچا۔ مسٹر فیک کو ایک نرس کا انتظام کرنا تھا اور جس وقت وہ اپنی نوزائیدہ بچی کو گود میں لئے ہوئے ٹہل رہے تھے اس وقت بھی دروازہ پر دستک ہوئی اور انھیں اپنے قرض خواہوں کو سمجھانا پڑ رہا تھا۔ اخراجات کو پورا کرنے اور پچھلے مطالبات کو ادا کرنے کے لئے ان کو مزید روپیہ کی ضرورت لاحق تھی۔ مگر روپیہ کی فراہمی کیسے ہو۔ اور کہاں سے ہو؟ کہیں سے ترجمہ کے لئے کام ملا بھی تھا مگر

"گریۂ طفل" سکونِ قلب و دماغ کو رفو چکر کرنے کے لئے کافی تھا۔ اِس مصیبت میں مبتلا ہو کر سوا ایک تدبیر کے اسکو کچھ اور نہ سوجھا کہ وہ اپنے خسر سے مدد چاہے۔

بڑے میاں جو ان باتوں کو پہلے سے خوب جانتے تھے ترش ہو کر بولے۔

"میرے لئے تم ہی تو اکیلے نہیں ہو جس کی مدد کروں۔ خیر یہ آخری موقعہ ہے اس کے بعد تم مجھ سے بالکل امید نہ رکھنا۔

زچہ کے لئے ہلکی اور مقوی غذاؤں کا انتظام کرنا۔ بچہ کے لئے دودھ کی فکر۔ اور نرس کی فیس ادا کرنی تھی۔ جوں توں کرکے خسر صاحب نے ان اخراجات کو اپنے ذمہ لیا۔

خدا کا شکر تھا کہ مسز فنیک جلد ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور ہر ایک کام کو خود انجام دینے لگیں۔ خسر صاحب اکثر داماد کو لکچر سناتے تھے اور ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں یہ بھی فرمایا

"بچہ کی پیدائش سے تم کو کافی سبق مل گیا ہوگا۔ اگر عقلمند ہو گئے تو آیندہ ۔۔۔"

کچھ عرصہ تک فنیک فیملی قرض اور محبت کی فراوانی پر گزر کرتی رہی۔ لیکن "دیوالیہ" آخر کب تک رکتا۔ اسکو ایک دن نکلنا ہی تھا اور قرض داروں کو دروازے پر دستک دیتا چھوڑ کر وہ نکل گیا اور اب مسٹر فنیک تھے اور قرض خواہوں کی بھیانک شکلیں اور گھر کا سامان تھا جو نیلام ہو رہا تھا۔ مسز فنیک کو مع بچہ کے اس کے والد لے گئے تھے سامان نیلام ہونے سے مسٹر فنیک کا کچھ قرض ادا ہو سکا۔ بعد میں قرض دار بھی صبر کرکے بیٹھ گئے۔ ساتھ ساتھ ملازمت بھی جاتی رہی۔

کچھ دنوں کے بعد مسٹر فنیک کے متعلق معلوم ہوا کہ ایک لوکل اخبار میں انھوں نے پروف ریڈری قبول کرلی ہے اور شب کے گیارہ بجے تک کام کرتے ہیں۔ خسر نے انکو بیوی سے صرف اتوار کے دن ملنے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی تنہائی میں نہیں۔ بعد ملاقات لوگ ان کو دروازے کے باہر رخصت کر جاتے ہیں۔

مسلکِ سالک

تو اپنی التجا کا خود جوابِ التجا ہو جا — اگر یہ ہو نہیں سکتا تو پھر بے مدعا ہو جا

دو عالم کی ہے آبادی تری تخریب میں مضمر — مٹا کر اپنی ہستی کو دو عالم کا خدا ہو جا

خدا ہے ابتدا تیری خدا ہے انتہا تیری — تو اپنی ابتدا ہو جا تو اپنی انتہا ہو جا

سکوں کے طالب و خواہاں سکوں ہی موت ہے تیری — بقا کی آرزو گر ہے سکوں ناآشنا ہو جا

رہیگا مائلِ پستی تو کب تک عرش کی حامل — پر پرواز پیدا کرکے سدرہ آشنا ہو جا

جلا کر خانہائے کہنہ و فرسودۂ عالم — جہاں میں اپنے ہاتھوں تختۂ مشقِ جفا ہو جا

رکن الدین سالک ننجنگڈھ میسور

حمید نظامی (مدیر رسالہ ساربان)

اکثر احباب کا خیال ہے کہ محبت دنیا کا بہترین جذبہ ہے وہ محبت کے بغیر کائنات کو ایک اجڑے ہوئے چمن کی مانند تصور کرتے ہیں میں نے کئی دوستوں کو کسی غریب پر محض اس لئے پھبتیاں کستے دیکھا ہے کہ وہ کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر کیوں نہیں؟ محبت کے بغیر تصویر ہستی کو ایک بے رنگ سا خاکہ سمجھا جاتا ہے اگرچہ ایسے دل جلے بھی موجود ہیں جو محبت کو حماقت کے مترادف گردانتے ہیں مگر دنیا میں اکثریت انھیں خوش فہم لوگوں کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات نا مکمل تھی خدا نے محبت کو پیدا کیا اور اسکی تکمیل ہوگئی۔

محبت بھی کئی طرح کی ہوتی ہے مجھے حقیقت و مجاز کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں نہ میں عرفان و وجدان کا قائل ہوں روحانی محبت کا نام میں نے بعض دفعہ سنا ضرور ہے مگر اسکا وجود کہیں نہیں دیکھا۔ سچی محبت کے متعلق بھی بارہا افسانوں میں پڑھا ہے۔ شاید ماں کی محبت اس پاک جذبہ کی بہترین مظہر ہو مگر میں والدین کی محبت پر قلم اٹھانا ایک بہت بڑی جسارت سمجھتا ہوں میرا دیانتدارانہ عقیدہ ہے کہ ماں کی محبت ایک اصول فطرت کے تابع ہے اور جذبۂ محبت کو بذات خود اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں! والدین کی محبت خواہ کسی قدر بے لوث اور مخلصانہ کیوں نہ ہو کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ یہ عین قانون قدرت ہے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور ابتدائے آفرینش سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے بلکہ جب تک یہ نظام کائنات قائم ہے ایسا ہی ہوتا رہیگا۔ اگر خود غرض انسان کا کوئی بس چلتا تو وہ یقیناً والدین کی پاک محبت کو بھی نفسانیت اور غرض مندی سے ملوث کر دیتا!

بھائیوں سے محبت کا کم از کم میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک بھائی سے دلبستگی ہو سکتی ہے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ دو بھائیوں کے مابین موانست پیدا ہو۔ لیکن میں اُنکے ربط یا تعلق کو محبت کا نام دینے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ آپ کو ایک ہستی سے محض اسلئے محبت ہو کہ وہ اور آپ ایک ہی چھت کے نیچے پیدا ہوئے تھے۔ محبت کسی مکانی یا زمانی اصول اور قانون کی پابند نہیں کہتے ہیں خون ضرور جوش مارتا ہے لیکن تجربہ یہ ہے کہ خون عموماً سفید ہو جایا کرتا ہے آپ کے بھائی کے لئے لازم نہیں کہ وہ آپ کا دوست بھی ہو۔ دوست سے میری مراد اس لفظ کا موجودہ مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ میں دوست ایسی شخصیت کو سمجھتا ہوں جس سے آپ کو صحیح معنوں میں محبت ہو۔ (خسانہ از افسانہ خیزد) والی بات ہو رہی ہے دوستی کے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر میں بھائی اور

دوست کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بھائی کے لئے لازم نہیں کہ وہ آپ کا خیرخواہ بھی ہو کوئی شرط نہیں کہ اُسے آپ سے محبت ہو آپ اُسے بھائی سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ بہرحال آپ کا بھائی ہے اگر اُسے آپ سے الفت ہے تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہے۔ لیکن اگر وہ آپکی جان کا دشمن ہے تب بھی دُنیا اُسے آپکا بھائی ہی کہے گی۔ کیونکہ آپکی بدقسمتی سے اتفاق ایسا ہوا کہ وہ اور آپ ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے اس کے برعکس ایک دوست کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ اُسے آپ سے محبت ہو۔ دوستی کا موجودہ معیار یہ ہے کہ ایک شخص سے آپ کے ذرا خوشگوار تعلقات ہیں تو وہ آپ کا دوست سمجھا جاتا ہے۔ کسی ہم جماعت سے کوئی کتاب مستعار لے آتے ہیں تو یہ دوستی کی علامت سمجھی جائے گی اور اگر کبھی آپ کسی کو اپنے ہمراہ سینما لے گئے تو پھر وہ آپ کے مستند دوست ٹھہرے لیکن دوست کا جو بلند مفہوم میرے ذہن میں ہے اُسے ان لغویات سے قطعًا کوئی تعلق نہیں۔

دوستی ایک نہایت مقدس رشتہ ہے بہتر ہوگا کہ میں ’ہے‘ کی بجائے ہونا چاہئے استعمال کروں۔ کیوں کہ دنیا میں ہر چیز مل سکتی ہے۔ مگر دوست نہیں مل سکتا۔ آپ ہوا میں پرواز کرسکتے ہیں۔ آپ کے جہاز سمندر کے سینے کو چیر سکتے ہیں جوئے شیر کا لانا کوئی شکل امر نہیں مگر یہ ناممکن اور قطعًا ناممکن ہے کہ آپ اس کائنات میں دوستی کا وجود ثابت کرسکیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق انسان کو بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ زیرِ چرخ کہن نہیں ہے۔ لیکن اسی محبت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ایک دوست کو دوست سے ہونی چاہئے اور محبت کا اصلی معیار بھی یہی ہے وہ کسوٹی ہے جس پر دنیا کی محبت پرکھی جاتی ہے اور کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ محبت ہمیشہ ملمع ثابت ہوتی ہے یہاں آکر محبت بے نقاب ہوتی ہے اور نقاب اُٹھ جانے کے بعد ہمیں ایک نہایت تلخ حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے:

ایک دوست سے محبت کی بنیاد ایثار پر ہونی چاہئے دولت کا ایثار نہیں۔ وقت کی قربانی اتنی اہم نہیں صحت اور عزت و توقیر کی متاع بھی اتنی گرانبہا نہیں کہ دوستی کے معبد میں اسکی نذر دی جاسکے اپنی ہستی کا ایثار ہی دوستی کی اولین شرط ہے۔ اپنے آپکو دوست میں جذب کردینا محبت کا پہلا قرینہ ہے۔ دوست کی اغراض کو اپنی اغراض پر مقدم رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہونا چاہئے۔ اپنی اغراض کا تصور ہی دوستی کے آئینہ کو مکدر کر دینے کے لئے کافی ہے محبت کو اسقدر بے غرضانہ ہونا چاہئے کہ فرشتے بھی رشک کریں۔ دوست سے کسی منفعت کی امید جذبۂ دوستی کی توہین ہے۔ اپنی ہر چیز راہِ دوست میں لٹادو مگر اُس سے کسی قسم کی توقع نہ رکھو۔

لیکن انسان فطرت کی اس ستم ظریفی پر خون کے آنسو روتا ہے کہ دوستی کا معیار تو اس قدر بلند رکھا لیکن اُس کے ساتھ ہی اُسے علائق کی اسقدر پیچیدہ زنجیروں میں جکڑ دیا کہ وہ دوستی کے حصول کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے کہ کوئی عنقا کو دیکھ پائے۔ ممکن ہے کہ کسی خوش نصیب کو ہُما کا سایہ نصیب ہوجائے مگر دوستی؟ اس نیلے آسمان کی چھت کے نیچے اسے ڈھونڈنا گھاس کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ کیونکہ سوئی کا وجود تو ہوتا ہے شاید کوئی مستقل مزاج انسان ایک ایک تنکا الگ کرکے اُسے نکال لے مگر عمرِ نوح بھی حاصل ہو تو دوستی کو ڈھونڈھتے پھریئے کہیں گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آئیگا۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ عمرِ عزیز کو اختر شماری میں گزار دیجئے۔ یا کسی سمندر کے کنارے بیٹھے لہریں گننے کا شغل اختیار فرمائیے۔ صحت بھی ٹھیک رہیگی۔ جنت الحمقا میں بسنے والوں کا خیال ہے کہ اگر ہمیں کسی شخص سے سچی محبت ہوگی تو یقینًا وہ اُسکا جواب دیگا۔ ایک خوش فہم انگریزی شاعر نے بھی یہی بات کہی ہے کہ خدا نے محبت کے پاکیزہ جذبہ کو اسلئے

پیدا نہیں کیا کہ یہ دنیا میں ضائع کیا جائے۔ مگر اُسکا یہ عقیدہ ایک شاعرانہ خیال آرائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ محبت کو حقیقت سے قطعًا کوئی تعلق نہیں اور اُسکے جواب کی توقع رکھنا تو بالکل ایسے ہی ہے کہ آپ جلتی آگ میں نوٹوں کا بنڈل پھینک کر یہ انتظار فرمائیں کہ کہیں سے پہونچتے پہونچتے فرشتۂ رحمت آپ کے کوٹ کی اندرونی جیب میں اس سے دگنی قیمت کے نوٹ ڈال دے گا۔

کسی شخص سے والہانہ محبت کیجئے اُسکی اغراض کو اپنی اغراض پر مقدم رکھئے اسکے مفاد پر اپنے مفاد قربان کیجئے اُسکی بہبود کی خاطر اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کیجئے۔ مگر میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو ایک نہایت سرد مہرانہ جواب ملیگا ممکن ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے آپکو محبت کا جواب محبت سے دیا جائے ممکن ہے کہ آپ اس ماحول سے متاثر ہوکر ایک تخیلاتی جنت تعمیر کرلیں اور سمجھیں کہ میں دنیا کا ایک خوش قسمت انسان ہوں مگر تخیلات کی جنت کی پائیداری تارعنکبوت ایسی نہیں۔ خیالات کا یہ قلعہ تھوڑے عرصہ بعد دھڑام سے نیچے آپڑیگا اور پھر وہی حقیقت کی تلخ کامیاں ہونگی اور آپ کا اسیر محبت دل!

ان حالات میں کسی سے محبت کیوں کی جائے۔ کسی کو دوست کیوں سمجھا جائے۔ کسی کی خاطر راتوں کو تارے کیوں گنیں۔ جب آپ کسی کے جذبات کی قدر کرتے ہیں ~~تو آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں~~ تو آپ کے جذبات کی قدر بھی کی جانی چاہئے ورنہ ایسے دوست پر لعنت بھیجئے یہ دوستی نہیں ہوگی جذبات کی غلامی ہوگی عاشق اور دوست میں یہی فرق ہے کہ عاشق کا وہ معاملہ ہوگا کہ ؎

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں + انکا یہ حکم دیکھ میرے فرش پر نہ رینگ

اور وہ اُس آرڈیننس کے باوجود فرش پر رینگنے یا بوٹ کی ٹو چاٹنے کو (بشرطیکہ محبوب بوٹ پہنتا ہو پوٹھوہاری جوتا نہیں) دنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھے گا لیکن ایک دوست کسی صورت میں بھی یہ ذلت گوارہ نہیں کرسکتا۔ دوستی کی اساس مساوات پر استوار ہے دوست کی محبت کا جواب محبت اور صرف محبت سے دیا جاسکتا ہے۔ ایک دوست دوست سے روٹھ سکتا ہے اُسے ڈانٹ ڈپٹ سکتا ہے اُسے اُس کی برائیوں اور کمزوریوں پر مطعون کرسکتا ہے بیچارے ستیہ گرہی عاشق کو یہ باتیں کہاں نصیب؟ اگر دوست کا حال بھی اُسی کا سا ہے تو وہ دوست نہیں، غلام ہے، بزدل ہے، بے غیرت ہے، بےحس ہے، جس شخص کو تمھارے حسیات کی پروا نہیں اُس شخص کے تصور کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ دنیا کی خود غرض ترین چیز کیا ہے تو میں بلا کسی غور و فکر کے کہدوں گا 'دوست'، وہ دنیا کا خود غرض ترین انسان ہی نہیں بلکہ صفحۂ ہستی پر سب سے فریبی اور ریاکار شخصیت ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جس سے کسی قسم کے نفع کی امید موہوم ہے اُسکی فطرت مسخ ہوچکی ہے اُسکے جسم کے ریشے ریشے میں دوست آزاری سرایت کرچکی ہے۔ محبت اب بھی دنیا کا پاکیزہ ترین جذبہ ہے لیکن "دوستی" دنیا کا مکروہ ترین جذبہ ہے کیونکہ اسکی بنیاد خود غرضی بے وفائی اور نفس پرستی پر ہے یہ ایک سنہری جال ہے۔ جس میں پھنسنے والا پرند تھوڑے عرصہ کے بعد رہا ضرور ہوجاتا ہے مگر اسکی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہوجاتی ہے وہ موت چاہتا ہے مگر مر نہیں سکتا۔ موجودہ دنیا کے خود غرض دوست کی قابلِ نفرت محبت قاتل ترین زہر ہے جو گھلا گھلا کر انسان کا خاتمہ کرتا ہے دوستی دنیا کا حسین ترین فریب ہے یہ وہ پھندا ہے جو ہر لحظہ تنگ تر ہوتا چلا جاتا ہے مگر ہم اسے محسوس نہیں کرسکتے۔ علائق کی زنجیروں کو توڑ ڈالو تخیل کی جنت کو ویران کردو۔ خیالی قلعوں کو مسمار کر ڈالو اور حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرو۔ ہر فریب ہر دھوکے اور ہر کلیے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرو۔ دوستی اور محبت کا فتنہ تمھاری توجہ کا سب سے زیادہ محتاج ہے دشمنوں کی تعداد بڑھاتے چلے جاؤ مگر دوستی کی فہرست کو ہمیشہ سفید ہی رہنے دو اور اگر اس پر کوئی نام ہے تو اُسے فورًا کاٹ ڈالو ورنہ سخت گیر فطرت مرور زمانہ کے ساتھ اس نام کو خود بخود مٹا دے گی پھر تمھارے دل میں ایک یاد ایک کسک۔ ایک حسرت رہ جائے گی۔ اور بس۔

ہماری زبان

سید رضا قاسم مختار

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، کہ اُردو ہمارے مُلک کی متفقہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبے میں بولی جاتی ہے۔ بہار، پنجاب، صوبۂ متحدہ اور حیدر آباد دکن میں تو ہندو اور مسلمان دونوں کی مادری زبان اُردو ہی ہے۔ اور ہر گھر میں رائج ہے۔ کچھ دِنوں قبل زبانِ اردو صوبۂ بہار میں اس قدر رائج ہوئی اور کچھ ایسی پھُولی پھلی کہ دلّی اور لکھنؤ کے بعد صوبۂ بہار اردو علم ادب کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ یہاں کا بچّہ بچّہ زبانِ اردو سے ایک خاص دلچسپی رکھتا تھا، ہندو اور مسلمان دونوں اس کے فریفتہ اور شیدائی بن گئے۔ قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ دلّی اور لکھنؤ کے فدائے سخن اور نامی شعراء یہاں آنے لگے اور آآکر بس گئے۔ شعر و سخن کا ہر گھر میں چرچا اور ذوق تھا، لیکن آج وہی اُردو زبان ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نظروں میں ذِلّت کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہے۔ بے ضرورت انگریزی زبان کے ناتراشیدہ الفاظ بولے اور لکھّے جارہے ہیں اور اس کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے، اردو زبان کی بیکسی اور بیچارگی قابل افسوس اور عبرت انگیز ہے، اپنی مادری زبان سے ہماری یہ غفلت شعاری ہمارے قومی افلاس اور نکبت کی کھُلی ہوئی نشانی ہے۔

ہمارے صوبے کے ہندو بھائی تو اس سے علیحدہ ہو ہی چکے، اور سیاسیات کی بنا پر خواہ مخواہ اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اس سے اس قدر بیزار ہو گئے کہ نفرت اور کراہت کرنے لگے، اُردو کے فصیح الفاظ، پاکیزہ روزمرّہ اور محاورات کو ترک کرکے جو خود ان کی اور ان کے بزرگوں کی زبان پر جاری رہ چکے ہیں، موٹے موٹے غیر مانوس بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں، اور صرف اسی پر بس نہیں کرتے، بلکہ زبانِ اردو کو مٹانے کی سعی میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ ہماری مادری زبان پر یہ ایک نازک وقت آپڑا ہے۔ اس وقت ہماری بے پروائی اور غفلت کا لازمی نتیجہ ہماری زبان کی تباہی اور بربادی ہے۔ افسوس! ہمارے صوبۂ بہار میں اُردو زبان کو مٹانے کے لئے طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کی جارہی ہیں، اور ہم خاموش منھ دیکھ رہے ہیں، نہیں بلکہ اِس جرم میں خود شریک ہیں، اس وقت ہمارا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ ہم اپنی متحدہ قوّت عمل میں لائیں اور زبانِ اُردو کی بقائے حیات اور ترقی کے لئے جو جو تدبیریں ممکن ہوں اُن پر کاربند ہوجائیں اور جس طرح ہوسکے اپنی زبان کو تباہی اور بربادی سے بچالیں، اس کام کو انجام دینے کے لئے اس ناچیز کی رائے میں تین باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ زبانِ اردو کی لطافت اور پاکیزگی جس کو ہمارے نااندیش اور ناتجربہ کار تعلیم یافتہ نوجوان دوسری زبان کے الفاظ کو خواہ مخواہ بے محل اور بغیر ضرورت لکھکر مٹا رہے اور اِس طرح اپنی زبان کی صورت بگاڑ رہے ہیں۔ اس کی نہایت سختی سے روک تھام کی جائے۔ دوم زبانِ اردو کی وسعت زیادہ کی جائے،

اور اس کو جامع بنانے کے لئے تمام علوم اور شاعرانہ خیالات کو ترجمے کے ذریعے سے اُردو میں لانے کی سعی کی جائے، اس کام کو دارالترجمہ حیدرآباد دکن نہایت حُسن و خوبی سے انجام دے رہا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان اس کام میں شریک ہونا اپنا فرض قرار دیں۔ یہ اہم کام ایک دن کا نہیں ہے اور نہ اس کو ایک شخص انجام دے سکتا ہے۔ قوم کی ناداری اس کام میں رُکاوٹیں پیدا کرتی ہے، لیکن کہاں تک، ہماری لگاتار جانفشانیاں ایک نہ ایک دن آخر کامیاب ہوکر رہیں گی، سوم ہمارا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ ہم روزانہ کے کاروبار اور بیوپار میں جہاں تک ممکن ہو اپنی زبان کو رواج دیں، غرض ہماری اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے یہ مجمل شاہراہیں ہیں، جن کی وضاحت اوپر کی ترتیب سے آگے آتی ہیں۔

۱۔ لطافتِ زبان

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کئی زبانوں کی آمیزش سے بنی ہے۔ لیکن جن الفاظ کو خواہ وہ کسی زبان کے ہوں اُردو نے اپنا بنا لیا ہے، وہ فصیح مانے جاتے ہیں، اسی کا نام ٹکسالی زبان ہے جس کو پرکھنے کے لئے دہلی اور لکھنؤ کی زبان مستند مانی جاتی ہے۔ روزمرّہ اور محاورات اُردو زبان کے خاص ہیں، جن کو شاید دوسری زبان سے تعلق نہیں ہے۔ اُردو نے اپنے زمانۂ طفولیت میں بھاشا، فارسی اور عربی زبان کے الفاظ سے پرورش پائی۔ ابتدا میں ان زبانوں سے اُردو جس قدر الفاظ لے سکی، اُن کو لے لیا، یہاں تک کہ بالکل مملو ہو گئی اور ان زبانوں کے الفاظ کی اب اس میں گنجائش باقی نہیں رہی۔ ہمارے شعرا نے فارسی شاعری کو اپنا ماخذ قرار دیا، اور کل خیالات، تشبیہ اور استعاروں کا اُردو میں کچھ ایسا چربہ اُتارا کہ وہ مالا مال ہو گئی۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ زمانے نے پلٹا کھایا اور حکومت بدلی۔ انگریزی عملداری کا دَور دورہ شروع ہوا اور اس طرح نئی زبان کا ایک گراں بہا خزانہ ہاتھ آگیا۔ انگریزی زبان کے الفاظ اُردو میں نہایت تیزی سے داخل ہونا شروع ہوئے۔ اور اُس نے ہزاروں الفاظ کو اپنا لیا۔ اور جس لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اُن کو اپنا بناتی چلی۔ اس طرح اصلِ ارتقا نے اپنا کام جاری رکھا۔ الفاظ بننا شروع ہوئے جس لفظ کی ثقالت زبان کو گراں گزری اُس پر اُس نے پورا تصرّف کیا اور کچھ اس طرح کی تراش خراش کی کہ اُن کی صورت بالکل نئی ہو گئی مثلاً لالٹین، رپٹ۔ کارتوس۔ ٹنکلاٹ، چھینٹ، گدام، بوتل، لوتام وغیرہ اور جہاں ضرورت نہیں پائی گئی، ایک ذرا سا تغیر و بدل کرکے داخل زبان کرلیا، مثلاً گون، پتلون، واسکوٹ۔ توس بسکٹ، کونین، ڈپٹی، میل۔ کالج۔ ڈگری۔ انجن۔ آرڈر۔ وغیرہ۔ لیکن زیادہ تر الفاظ اس طرح کے ہیں کہ اُن میں کوئی تصرف نہیں پایا جاتا ہے، مثلاً اپیل۔ اسکول ہائیکورٹ، گراموفون۔ پولس۔ کمپنی۔ کرکیٹ۔ مل۔ کارڈ۔ ناول۔ ڈراما۔ پبلک وغیرہ غرض اس طرح کے ہزاروں الفاظ ہیں جو اُردو میں داخل ہوکر جزوِ زبان بن گئے۔ اُن کا لکھنا یا بولنا فصحا کے نزدیک جائز ہے، لیکن اس بنا پر بہن کو سسٹر، باپ کو فادر، چھُری کو نائف، بیوی کو وائف، نسیم سحری کو مورننگ بریز۔ مخمل کو ولوٹ، بلبل کو نائٹینگل۔ بادل کو کلاوڈ۔ وقت کو ٹائم، شبنم کو ڈیو۔ ناک کو نوز، گلاب کو روز وغیرہ لکھنا یا بولنا محض غلط اور غیر فصیح ہی نہیں بلکہ اپنی زبان پر ظلم کرنا ہے۔ یہ ایک طرح کی بدعت ہے جس کی بدمزگی کی تاب زبان کی لطافت و فصاحت نہیں لاسکتی ؎

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے
اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرزِ نظر ہے

موجودہ زمانے میں نوجوان تعلیم یافتہ جن کی مادری زبان اردو ہے، اخبار، رسالے اور ناولوں میں بے ضرورت انگریزی الفاظ بھرے جاتے ہیں جن کو پڑھ کر گھِن آتی ہے۔ زبان کی پاکیزگی مٹ رہی ہے اور غلاظت بڑھتی جاتی ہے، اُن کا یہ خیال کہ اس سے زبان کی وسعت ہوگی اور اُردو ترقی کرے گی غلط ہے، وہ ایک ترقیٔ معکوس کر رہے ہیں۔ گویا گھڑی کی سُوئی اُلٹی گھمائی جا رہی ہے، جس سے آئے دن زبان کی لطافت مکدّر ہو رہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب دوسری زبان کے الفاظ کے مرادف اُردو میں خود فصیح الفاظ موجود ہیں تو غیر مانوس دوسری زبان کے الفاظ کا بار ہماری زبان نہیں اُٹھا سکتی۔ اور نہ وہ ہضم ہوسکتے ہیں۔ انگریزی تو ایک اجنبی زبان ہے۔ فارسی اور عربی کہ جن سے اُردو بنی ہے اُن کے غیر مانوس الفاظ کانوں کو گراں گزرتے ہیں اور فصحا اور ادبا بغیر ضرورت اس طرح کے الفاظ کا استعمال ناجائز

سمجھتے ہیں۔ یہاں پرکسی عربی داں شاعر کا ایک مصرعہ ملاحظہ ہو ع

یہ کالے کالے بادل جو تیں جو ہیں برستے

جناب نے سمجھا کہ یہ "جو" کیا چیز ہے؟ معروف غلہ نہیں بلکہ کھلی ہوئی فضائے آسمانی مراد ہے۔ خیر یہاں پر تو شاعر نے عربی کو شاید اپنی مادری زبان سمجھ کر ایک غیر مانوس لفظ تحریر فرمایا ہے۔ لیکن اُردو جو ہماری مادری زبان ہے اُس کی فصاحت "جو میں جو" کے تنافر سے نمایاں ہے۔ غرض اس طرح کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ جن کو نظر انداز کرتا ہوں۔ جب عربی اور فارسی زبان کے غیر مانوس الفاظ کا یہ حال ہے کہ زبان کی فصاحت اُن کی تاب نہیں لاسکتی تو انگریزی جو ایک اجنبی زبان ہے اُس کے الفاظ کو جس کی زبان کو مطلق ضرورت نہیں ہے استعمال کرنا کسی طرح جائز و ممدوح نہیں ہے جس طرح دنیا کی کل چیزیں اصول ارتقا پر کاربند ہیں۔ اُسی طرح زبان بھی اُس کی محکوم ہے جس اصول نے انگریزی زبان کے الفاظ کو توڑ موڑ کر لالٹین، کارتوس۔ بوتل وغیرہ بنالیا اور ایک نامعلوم طریقے سے یہ نئے الفاظ جزو زبان بن گئے وہ اس وقت بھی اپنا کام کررہا ہے جس لفظ کی زبان کو ضرورت ہوگی وہ خود بخود اپنالے گی۔ یہ کام میرے یا آپ کے بس کا نہیں ہے۔

جناب نے شاید سُنا ہو، بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا جن کو قدرت نے مذاقِ سلیم عطا نہیں کیا ہے۔ یہ قول کہ زبان اپنی ہے جس طرح چاہیں بول سکتے ہیں۔ اس میں کسی کا اجارہ کیا۔ اگر چلنے کو واک کرنا، باتیں کرنے کو ٹوک کرنا، آنکھ سے دیکھنے کو چشم سے دیکھنا اور کان سے سُننے کو اَذن سے سُننا کسی نے لکھدیا تو تمہارا کیا، اس سے زبان میں کونسی خرابی آگئی۔ جو صاحب اس خیال کے ہیں اُن کو جاننا چاہیئے کہ دنیا کی ہر چیز میں ایک قانون اور نظم کارفرما ہے۔ اگر نظم اور ضابطہ نہ ہو تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے۔ اسی طرح زبان بھی اپنے قانون و نظم کی محکوم ہے جس کی پابندی لازم ہے اگر قوم کا ہر فرد ایک شترِ بے مہار کی طرح زبان کو پامال کرتا ہوا جدھر چاہے نکل جائے، جس طرح چاہے بولے یا لکھے۔ تو اُس کی زبان میں کوئی نظم یا اصول قایم نہیں رہ سکتا۔ اُس کا دفترِ علم و ادب پریشان اور تباہ ہوجائے گا۔ اور وہ قوم جس کی زبان میں کوئی اصول نہ ہو دنیا میں ہرگز ترقی نہیں کرسکتی۔ زبان کی تباہی قوم کی بربادی ہے جس طرح سیاسیات میں طائف الملوکی مُلک کے بربادی کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے، اسی طرح کسی قوم کی زبان کا بے اصول ہوجانا اور اُس کے شیرازے کا بکھر جانا اُس کی ہلاکت اور بربادی کی خبر دیتا ہے ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

اب التماس یہ ہے کہ ہمارا یہ ایک اہم قومی فرض ہونا چاہیئے کہ ناپاک صحافت جس میں دوسری زبان کے غیر مانوس الفاظ کی بے ضرورت آمیزش کی جارہی ہے اُس کی روک تمام سختی سے کی جائے، اور قوم کے ہر فرد کو لازم ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کی لطافت اور پاکیزگی کو باقی رکھنے میں سرگرم اور کوشاں نظر آئے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری زبان کا نظم عمل اتحاد سے مستحکم ہوجائے گا اور ہر شہر اور ہر مقام کی اُردو میں جو ایک مغائرت ہوتی چلی جارہی ہے اور روزمرّہ اور محاورات کے اختلافات کی ایک پُرآشوب خلیج پیدا ہورہی ہے وہ بہت جلد فنا ہوجائے گی جس سے اُردو علم ادب کی ترقی ہوگی۔

۲۔ زبان کی وسعت

دوسری بات جو اردو علم ادب کی ترقی کے لئے نہایت اہم اور قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ زبان کو وسیع کیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہماری زبان نے محض شاعروں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے اُس کا خزانہ دنیا کے تمام علوم و فنون سے خالی ہے عشق و محبت کے جذبات، ہجر و فراق کی بیتابیاں، رقابت کے شکوے، حسن کی دل فریبیاں وغیرہ اس کی جولاں گاہیں۔ اس طرح کے نازک خیالات سے اُردو کا خزانہ لبریز و مملو ہے اور اُن کو ادا کرنے کے لئے اس کے پاس کافی الفاظ موجود ہیں۔ اس میدان میں دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ہماری اُردو سے بازی نہیں لے جاسکتی۔ لیکن علوم اور فنون پر نظر ڈالئے تو اُس کا خزانہ بالکل بے مایہ اور خالی نظر آتا ہے۔ اُردو شعراء کے ہزاروں دیوان موجود ہیں اور غزلیات سے ہمارے علم ادب کا بوسیدہ دفتر بھرا پڑا ہے۔ لیکن ریاضیات، طبعیّات، فلکیات، علم حیوانات و نباتات، علم الابدان، فلسفہ، کیمیا اور منطق وغیرہ پر مشکل سے جناب کو اُردو میں کوئی کتاب نظر آئے گی۔

اور اِکا دُکا جو کتابیں ہیں اُن کی قدر دانی کا یہ عالم ہے کہ اُن کا نام تک کوئی نہیں جانتا، پڑھنا اور مولف کی جان فشانیوں کی داد دینا تو ایک بڑی بات ہے۔

یہ تو اُردو نثر کا حال ہے، اب شاعری پر جو لے دے کر اردو زبان کی مایۂ ناز کائنات ہے، نظر ڈالئے تو اس کا پہلو دوسری مہذب زبانوں کی شاعری سے دبتا نظر آتا ہے، واقعات نگاری کی سحر بیانیاں، مناظرِ فطرت کے دل فریب سماں، مشاہدات اور جذبات کی زندہ تصویریں، اردو شاعری میں بقدرِ چاشنی پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے شعرا، پرانی شاعری کے پامال اندازِ بیان کو خیرباد کہہ کر جدید طرزِ سخن کی طرف بہت جلد توجہ فرمائیں۔ دوسری زبانوں کی شاعری کو اپنا ماخذ قرار دیں جس سے اردو شاعری کے مُرجھائے ہوئے لالہ زار میں جان آجائے۔ اور طرح طرح کے جدید خیالات کی گُل کاریوں سے اردو شاعری کا چمنِ نو بہار رکھل جائے۔

اِس میں شک نہیں کہ ہماری موجودہ شاعری نے اپنا اندازِ بیان بدلا ہے اور شدہ شدہ اس رنگ پر مشق جاری ہے، لیکن زیادہ تر شعرا اب تک غزل گوئی اور ہجر و فراق کی بے تابیوں کو بیان کرنے میں سرگرم ہیں۔ ہمارے شعرا کا یہ فرض ہے کہ وہ بہت جلد جدید طرزِ سخن پر کاربند ہو کر اپنی زبان کو ترقی دیں، جس طرح قدیم اردو شعرا نے فارسی شاعری کا اردو میں ایک دلفریب چربا اُتارا ہے اِسی طرح موجودہ شاعروں کا یہ فرض ہونا چاہئیے کہ وہ یورپ، روس، جاپان وغیرہ کی شاعری کو اپنا ماخذ قرار دیں۔ جدید خیالات اور جذبات کو جو اُن کا ایک بے بہا خزانہ ہے اپنی زبان میں اس حُسن و خوبی سے لے آئیں کہ سرقہ نہ معلوم ہو اور ہماری اردو شاعری مالا مال ہو جائے۔

ہماری نادار اُردو، دنیا کی مہذب زبانوں میں شمار نہیں کی جاتی اس لئے کہ اِس کا خزانہ علوم و فنون کی لازوال دولت سے خالی ہے اور اسی وجہ سے اُردو اب تک ایک جامع زبان نہیں بن سکی ہے۔ اُس کے پاس نہ کافی الفاظ ہیں اور نہ وہ اصطلاحات ہیں جو ہر طرح کے علوم و فنون کو بیان کرسکیں۔ اس لئے تمام علوم کو اپنی مادری زبان میں لانے کے لئے نئے نئے الفاظ کا بنانا اور اصطلاحات کو وضع کرنا جس سے زبان کی وسعت ہو مقدم اور لازمی ہے۔ اس کام کو انجمن ترقیِ اُردو زیر سرپرستی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے نہایت خوبی سے انجام دے رہی ہے۔ اور ممدوح کی ذات قابلِ فخر و آفرین ہے، لیکن ہمارے صوبے کا جس کی مادری زبان اُردو ہے یہ فرض ہونا چاہئیے کہ وہ ہاتھ بٹائے، اس لئے کہ یہ کام ایک دن یا ایک شخص کا نہیں ہے۔ یہ سچ ہے لیکن ہمیں دو دشواریاں لاحق ہیں، اول تو اپنی مادری زبان سے قوم کی غفلت اور بے پروائی ہے، ہماری غفلت شعاری اس سے اور کیا زیادہ ہوسکتی ہے کہ بہت سے ہمارے گریجویٹ چند سطریں صحیح اُردو نہیں لکھ سکتے ہیں، اور اُن کی شرمناک غلطیاں غجا بط، غلطا غلطا اور اور رط، تک دیکھنے میں آتی ہیں۔ دوم ہماری قوم کی ناداری ہے، یہ کچھ نہیں ہونے دیتی۔ جو لوگ صاحبِ علم اور ہونہار ہیں وہ اپنی دال روٹی کی خیر منانے میں سرگرم ہیں۔ اُن کو اتنی مہلت کہاں جو اِن باتوں کی طرف توجہ فرمائیں۔ گزارش ہے کہ زندگی کی غائت اور غرض محض دولت حاصل کرنا نہیں ہے۔ اگر یہ حضرات چاہیں تو فرصت کی گھڑیوں میں اپنی مادری زبان کی خدمت کو نہایت خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔

ہم کو مایوس نہ ہونا چاہئیے، ہمارے صوبے کے تعلیم یافتہ حضرات میں اپنی مادری زبان سے اب اُنس پیدا ہو چلا ہے اور آئے دن اُن کا ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ اِس وقت ماشاء اللہ صوبۂ بہار میں اچھے اچھے اہلِ قلم موجود ہیں، لیکن اردو کو ایک جامع زبان بنانے کے لئے اتحادِ عمل اور لگاتار کاوشوں کی اشد ضرورت ہے۔ جب بڑے سمندروں میں ننھے ننھے ناچیز کیڑے اپنے فطری اتحادِ عمل اور لگاتار محنت سے مرجان کا ایک عظیم الشان جزیرہ بنا لیتے ہیں تو کیا ہماری قوم کے افراد باہم مل کر اپنی مادری زبان کو ایک جامع زبان نہیں بنا سکتے؟ صوبۂ بنگال کی سبق آموز مثال ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے اگر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اردو زبان کی خدمت کو اپنا ایک قومی فرض سمجھ لیں اور جس علم سے اُن کو ذوق اور دلچسپی ہو اُس پر مستقل کتابیں لکھنا شروع کر دیں تو تمام علوم کا ایک بحرِ ذخار جو ہماری نظروں کے سامنے لہریں لے رہا ہے، وہ قلم بند ہو کر ہماری مادری زبان میں آجائے گا اور اُردو ایک جامع زبان بن کر رہے گی۔

پنجاب اُردو زبان کی ترقی میں سرگرم نظر آتا ہے اور اس سے بہت زیادہ حیدر آباد دکن ہے، اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ مُلکہٗ کی اُردو زبان پر

خاص توجہ اور امدادِ شاہانہ قابلِ صد آفرین ہے۔ زبانِ اُردو جس سرزمین پر پیدا ہوئی اور جس آب و ہوا میں اس کا زمانۂ طفولیت گزرا اب وہیں پروان چڑھ رہی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ دنیا کی مہذب زبانوں میں اُس کا شمار ہو جائے گا۔ اُردو جو صوبۂ بہار کی مادری زبان ہے ہم پر بھی اپنا حق رکھتی ہے اور ہر طرح ہماری امداد اور توجہ کی سزاوار ہے۔ لیکن ہمارا صوبہ اپنی زبان کو ترقی دینے میں نہایت سرد مہری سے کام لے رہا ہے۔ بہار میں اس وقت تک صرف دو یا تین رسالے جاری ہوئے ہیں، اور اُن کی قدر افزائی کا یہ عالم ہے کہ جب تک ادبِ لطیف اور مزاحیہ مضامین کی چاشنی نہ ہو کوئی خریدار نظر نہیں آتا ہے۔ ناظرین کو خوش کرنے کے لئے ادارے کو ناچار مذاقِ سلیم سے تجاوز کرنا پڑتا ہے۔ جو کسی طرح ممدوح نہیں ہے۔ ہمارے صوبے میں اعلیٰ درجے کے اُردو اخبار اور مہذب علمی رسالوں کا جاری ہونا اور اُن کا پُرجوش خیر مقدم اور مالی امداد زبان کی ترقی کے لئے اہم اور ضروری ہے۔

دوسری باتیں جو اِس ناچیز کے ذہن میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ صوبۂ بہار میں ایک بڑے پیمانے پر اُردو کا دار التالیف قایم کیا جائے جس میں چنے ہوئے ادیب اور چوٹی کے لکھنے والے ماہرین مقرر کئے جائیں۔ یونیورسٹی میں زبان دانی کے علاوہ اور علوم کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کی کامیاب تحریک کی جائے۔ ہمارا دار التالیف کل علوم پر نصاب کی کتابیں تیار کرے اور اس کے علاوہ مستقل کتابیں لکھی جائیں، دار التالیف کا اپنا پریس ہو، کتابوں کا بہترین ایڈیشن نکالا جائے۔ اور پبلک میں اُس کی کافی اشاعت کی جائے، تاکہ قوم کی تعلیم اور ترقی ہو۔ لیکن اِن کاموں کے لئے ایک بڑے سرمائے کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے صوبے کے وزیرِ تعلیم عزیز الملت مسٹر سید عبد العزیز اور دیگر سربر آوردہ و ممتاز ہستیوں کی خاص توجہ، قوم کی امداد اور سرمایہ داروں کی سرپرستی سے بہت جلد فراہم ہو سکتا ہے۔ خدا کرے میری یہ تحریک تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اُتر آئے۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوں، اور اِن خیالات کو واقعات کر دکھائیں۔

۳۔ زبان کو رواج دینا

زبانِ اُردو کو اپنے روزانہ کے کاروبار اور بیوپار میں جہاں تک ممکن ہو رواج دینا ہمارا فرض ہونا چاہئے۔ اپنی زبان کو ترقی دینے کا یہ آسان ترین طریقہ ہے جس پر قوم کا ہر فرد کاربند ہو سکتا ہے۔ ہمارے صوبے کے باشندوں کو جن کی مادری زبان اُردو ہے، خوابِ غفلت سے اب بیدار ہونا چاہئے، اور دیکھنا چاہئے کہ اور قومیں اپنی زبان کو کس طرح رواج دے رہی ہیں اور اُن کو اپنی زبان کا کس قدر لحاظ اور پاس ہے۔ اُردو زبان کو روزانہ کے کاروبار میں جاری رکھنا ہمارا قومی فرض ہے۔ اور اس کے بڑے فائدے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

جناب کو معلوم ہے کہ امرا اور رؤسائے عظام کے یہاں سے سال میں ہزاروں روپے کے آرڈر انگریزی زبان میں جایا کرتے ہیں، ان کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ یہ کل فرمائشیں اپنی زبانِ اُردو میں جایا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں چیزوں کے موصول ہونے میں ایک ذرا تاخیرِ وقت اور غلطی ہو سکتی ہے، لیکن آخر کہاں تک، جب دوکانداروں اور تاجروں کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ آئے دن آڈر اُردو زبان میں آتے ہیں تو اُن کو اس زبان کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اس لئے چار و ناچار کوئی نہ کوئی اُردو داں ملازم رکھنا پڑے گا، اور آئندہ نئے ملازمین کو مقرر کرنے میں اُردو جاننے کی شرط لازم قرار پائے گی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ خود مالکانِ کارخانہ اردو زبان کا جاننا اپنے لئے ضروری خیال کریں گے۔ ممکن ہے شروع میں دو چار روپے کے ناچیز آرڈروں کا کوئی خیال نہ کیا جائے، لیکن جب بڑے بڑے آرڈر ہزار دو ہزار کے موصول ہوا کریں گے تو یہ بات امکان سے باہر ہے کہ تاجر اُس کا کوئی خیال نہ کرے، اس کا دل اس بات کی تاب نہیں لا سکتا کہ محض زبان کی دشواری کی وجہ سے وہ ہزاروں روپے کا تاوان اور خسارہ اٹھائے۔

دوسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ ہم کو وہ تدبیریں اختیار کرنی لازم ہیں کہ حکومت ہماری زبان کی ضرورت کو محسوس کرے۔ اس کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں کہ عدالتوں میں اردو رائج کی جائے۔ خدا اس تحریک کو جلد کامیاب کرے، اور صوبۂ بہار کی کل عدالتوں میں اردو عدالتی زبان قرار پائے لیکن فی الحال ڈاک خانہ ایک ایسا محکمہ ہے۔ جہاں زبان کی کوئی قید نہیں ہے، مگر اس کا ہم کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے ہیں۔ ہماری نادانی اور غفلت کا یہ حال ہے

کہ خطوط تو اُردو میں لکھے جاتے ہیں، لیکن لفافے پر جو پتہ ہوتا ہے وہ خواہ مخواہ انگریزی حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اگر جناب کو یہ خوف ہے کہ خط ضائع جائیگا تو صرف ڈاک خانہ کا نام رومن میں تحریر فرمائیے۔ باقی اور پتہ اُردو میں لکھکر اپنی زبان کو کام میں لائیے۔ بر مکان یا بتوسط کی جگہ خدا کے لئے آئندہ کیئر آف نہ تحریر فرمائیے گا۔ خیر یہ تو روزانہ کے خطوط لفافے اور کارڈ کا ذکر تھا۔ رجسٹری شدہ خطوط، منی آرڈر، بمیہ وغیرہ جس کی ذمہ داریاں ڈاک خانہ خود لیتا ہے، اُن کے تو ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں پر پورا پتہ اپنی زبانِ اُردو میں تحریر فرماکر مادری زبان کی عزت افزائی کیجئے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ شدہ شدہ حکومت زبانِ اُردو کی ضرورت کو محسوس کرے گی جس سے ہماری قوم کو فائدہ ہوگا۔ ایک بات اور عرض کرنی ہے، ہمارے زمینداروں کو جن کی مادری زبان اُردو ہے لازم ہے کہ وہ اُردو داں پٹواری اور کارندے مقرر کیا کریں اور جس قدر سررشتے کے کاغذات مثلاً جمع خرچ بسیاہا۔ ترج۔ واصلباقی رسیدات وغیرہ ہیں وہ کُل اُردو میں لکھی جائیں۔ اُس کا دوہرا فائدہ یہ ہے کہ اوّل تو جناب خود حساب کتاب مُلاحظہ فرماکر سمجھ لیں گے۔ دوم اپنی زبان کی ترویج ہوگی۔ غرض اِس طرح زبانِ اُردو کی تخم ریزیاں آئندہ بار آور ہوں گی۔ اور قوم آئندہ فائدے اُٹھائے گی۔

خدا کرے میری یہ ناچیز تحریک ایک کامیاب پیغامِ عمل ثابت ہو اور قوم کا ہر فرد بہت جلد اِس پر کاربند ہو جائے ؏

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

انتظار کے دن

صبا ادب سے یہ کہنا کہ ہیں بہار کے دن
شراب سُرخ کی راتیں ہیں لالہ زار کے دن

زمانہ رقص میں ہے، روزگار نغمہ سرا
مگر خموش ہیں اِس تیرہ روزگار کے دن

ترے خیال میں گریاں ہیں تیری یاد میں گُم
یہ ماہتاب کی راتیں یہ آبشار کے دن

فرازِ کوہ سے پھوٹے ہیں نوع بنوع چشمے
پھریں گے اب بھی نہ کیا چشمِ اشکبار کے دن

تجھے خبر ہو تو کیوں کر کہ کن بلاؤں میں
گزر رہے ہیں ترے شاعرِ بہار کے دن

خدا گواہ کہ کاٹے سے اب نہیں کٹتیں
یہ انتظار کی راتیں یہ انتظار کے دن

جوشؔ

داروغہ صاحب

خواجہ احمد عبّاس

"داروغہ صاحب!" ایک کانسٹبل نے ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟"

"حضور، اس آزاد کے بچّے نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تک تو اس نے اپنے ساتھیوں کے نام بتائے نہیں ہیں۔ کہئے تو ایک مرتبہ اور کوشش کر دیکھیں۔"

"اچھا۔ ایک آدھ گھنٹے میں حاضر کرو۔"

کانسٹبل سلام کر کے چلا گیا۔ داروغہ صاحب نے پانوں کی ڈبیا کھولی، ایک پان کھایا اور سوچ میں پڑ گئے۔ اس آزاد نے اُن کا آرام حرام کر رکھا تھا۔ رات دن یہی فکر رہتی تھی کہ اس سے کس طرح اس کے ساتھیوں کے نام کا اقبال کرایا جائے۔ مگر تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پہلے معمولی طرح سے پوچھا، پھر معافی اور انعام کا لالچ دلایا، اس پر بھی اُس کی زبان نہ کھلی تو تھوڑی بہت مرمّت کی گئی۔ آخر تنگ آ کر اور سختی کی، جوتوں سے پٹوایا۔ کال کوٹھری میں بند کیا، اُلٹا لٹکوایا۔ مگر وہاں ایک "نہیں" کے علاوہ دوسرا جواب نہ تھا۔ داروغہ صاحب اپنے رعب اور دبدبے کے لئے صوبے بھر میں مشہور تھے۔ ملزموں کی زبان کھلوانے کی ان کو وہ ترکیبیں یاد تھیں کہ دُور دُور کے تھانیدار ان سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ سخت سے سخت مجرم اُن کے نام سے کانپتا تھا۔ مگر یہ آزاد عجیب سخت جان تھا۔ جب اس پر تمام مجرب نسخے بیکار ثابت ہوئے تو داروغہ صاحب نے اپنے ترکش کا آخری تیر استعمال کیا، جو اُس کی طرح تعلیم یافتہ سیاسی قیدیوں کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ چند دس نمبر کے بدمعاشوں کو بُلا کر اُن کو کچھ خفیہ ہدایات اور چند بوتلیں ٹھرّے کی دی گئیں، اور جب اُن پر خوب نشہ چڑھ گیا تو برائے نام اُن کا چالان کر کے اُن کو بھی آزاد کے ساتھ حوالات میں بند کر دیا۔ رات بھر میں اُنھوں نے آزاد کو مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ مگر ہر گھنٹے کے بعد جب پہرہ دار نے پوچھا "کیوں، اب بھی اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتلائے گا؟" تو یہی جواب ملا کہ "مرنے سے پہلے تو نہیں۔"

آزاد کی اس ضد کو کیسے توڑا جائے؟ رات دن یہ سوال داروغہ صاحب کے دماغ میں گردش کرتا تھا۔ دیکھنے میں کمبخت دُبلا پتلا، کمزور سا نوجوان تھا، مگر اس کے خلاف الزام اتنا سنگین تھا اور حکّام بالا اس کو جیل بھیجنے پر اس قدر تُلے ہوئے تھے کہ داروغہ صاحب کی سخت بدنامی ہوتی اگر اس سے اقبال نہ کرایا جاتا۔ کئی مہینے سے اس کے خلاف رپورٹیں آ رہی تھیں کہ وہ اور اُس کے ساتھی کسانوں میں بغاوت پھیلا رہے ہیں۔ چند روز پہلے اطلاع ملی کہ رام گڑھ گاؤں میں جہاں وہ رہتا تھا، کسانوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس میں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے لگان ادا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ پولس نے کافی نگرانی رکھی اور تفتیش کی، مگر اس کانفرنس کے اصل وقت کی اطلاع نہ ملی۔ کئی دن کی کوشش کے بعد ایک رات کو مخبر نے رپورٹ دی کہ اس وقت آزاد کے مکان پر کسانوں کے تمام سرغنہ جمع ہیں۔ اور کانفرنس ہو رہی ہے۔ پولیس نے فوراً چھاپہ مارا، مگر کسی طرح وقت سے

کچھ پہلے ہی آزاد کے ساتھیوں کو اس دھاوے کی اطلاع مل گئی اور وہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے دیوار پھاند کر نکل گئے۔ جب داروغہ صاحب اپنے جوانوں کو لے کر پہنچے تو سوائے آزاد مکان میں اور کوئی نہ تھا۔ دانت پیس کر رہ گئے۔ خیر تلاشی لی تو کافی کارآمد کاغذات ملے۔ لگان ادا نہ کرنے کی تحریک کے متعلق مکمل تجاویز موجود تھیں، جن کو پڑھ کر حکومت آسانی سے اس تحریک کو شروع ہونے سے پہلے ہی کچل سکتی تھی۔ لیکن آزاد کے علاوہ دوسرے سرگرہوں کے ناموں کی فہرست نہ مل سکی جس کے بغیر آزاد پر سازش کا جرم ثابت کرنا ناممکن تھا۔ داروغہ صاحب نے اچھی طرح ایک ایک کونہ ٹٹول مارا، لیکن کوئی ایسا کاغذ نہ ملا جس سے باقی ماندہ شورش پسندوں کو پکڑا جا سکے۔ ملتا بھی کہاں سے جس ضروری کاغذ کی اُن کو تلاش تھی وہ تو آزاد اُن کی آہٹ سُنتے ہی کھا چکا تھا!

افسرانِ بالا کے ایما پر داروغہ صاحب نے آزاد کو گرفتار کر لیا اور اُس کی زبان کھلوانے کے لئے اپنی تمام مشہور ترکیبوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اِن نسخوں کے بیکار ثابت ہونے سے وہ پریشان ہو گئے تھے۔

اب کونسی ترکیب کروں؟ یہی سوچتے سوچتے داروغہ صاحب اونگھ گئے۔ آج بیوی نے کافی "مُرغن" کھانا پکایا تھا۔ اس پر گرمی کا موسم۔ دوپہر کا وقت۔ ایک سپاہی پنکھا کھینچ رہا تھا۔ خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ نیند آ ہی گئی۔

کچھ آہٹ محسوس ہوئی تو داروغہ صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے کے سب دروازے بند ہونے کی وجہ سے خاصا اندھیرا تھا۔ کچھ نیند کا نشہ بھی سوار تھا۔ دھندلا دھندلا سا نظر آتا تھا۔ مگر داروغہ صاحب پہچان گئے کہ جس کا انتظار کر رہے تھے وہ موجود ہے۔ آزاد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور سپاہی رسّی پکڑے ساتھ تھا۔ اِس کے ذہین چہرے پر پچھلے سات دن کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا اثر نظر آتا تھا مگر وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ آزاد کی مستقل مزاجی اور ضد سے زیادہ جو چیز داروغہ صاحب کو پریشان کرتی اور غصہ دلاتی تھی وہ اس کی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ جس میں اعتمادِ نفس کے ساتھ داروغہ صاحب کی حرکتوں پر اظہارِ حقارت بھی تھا، تلوار سے زیادہ تیز اور آگ سے زیادہ جھلسانے والی تھی۔ آزاد کو پھر مسکراتے دیکھ کر داروغہ صاحب کے مزاج کا پارہ آسمان پر پہونچ گیا۔ سپاہی سے چیخ کر کہا۔

"دیکھتا کیا ہے، مار اس کو جب تک یہ اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتائے"

سپاہی نے سوت کی رسّی کو جو اُس کے ہاتھ میں تھی دُوہرا کر کے کوڑا سا بنایا اور ایک قدم پیچھے ہٹا، تاکہ آزاد کی پیٹھ پر پورے زور سے مار پڑ سکے۔

آزاد برابر مسکرا رہا تھا اور اُس کی نظر داروغہ صاحب پر گڑی ہوئی تھی، داروغہ صاحب کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ اُن کو خوف کے بجائے رحم اور حقارت سے دیکھ رہا ہے۔

سپاہی نے رسّی کے کوڑے کو آزمائشی طور سے ہلایا، اپنے ہاتھ اور آزاد کی کمر کے درمیان فاصلے کا اندازہ کیا اور پوری طاقت سے مارا۔

داروغہ صاحب کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ معلوم ہوتا تھا کوڑا بجائے آزاد کے اُن کی کمر پر پڑا۔

آزاد کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

سپاہی سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہا۔ دھڑا دھڑ، دھڑا دھڑ، دھڑا دھڑ، وہ آزاد کی کمر پر برابر کوڑے چلا رہا تھا۔

داروغہ صاحب تکلیف سے چیخ رہے تھے۔ گو سپاہی آزاد کی کمر پر وار کر رہا تھا، مگر ہر بار چوٹ اُن کی کمر پر پڑتی تھی۔

اور آزاد اب بھی مسکرا رہا تھا گویا داروغہ صاحب کی تکلیف پر ہنس رہا ہے۔ سپاہی نے یہ دیکھ کر کہ آزاد پر اُس کی مار کا کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا ہے۔ اور زیادہ طاقت سے کوڑا چلانا شروع کر دیا۔

داروغہ صاحب تکلیف سے چیختے رہے، مگر کسی نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ اُن کی کمر کوڑوں کی مسلسل بوچھاڑ سے پھوڑے کی طرح دُکھ رہی تھی۔

سپاہی نے ایک بھرپور ہاتھ آزاد کی کمر پر چلایا تو داروغہ صاحب سے بالکل برداشت نہ ہوا۔ معلوم ہوتا تھا اگر ایک کوڑا بھی اور اُن کی کمر پر پڑا تو اُن کی جان نکل جائے گی۔

"بس۔ بس" داروغہ صاحب بے تحاشہ چیخے۔ "بند کرو۔ بند کرو" یہ کہہ کر اُنھوں نے کرسی سے اُٹھنا چاہا تو آنکھ کھل گئی۔

کمرہ خالی تھا۔ تو کیا میں نے خواب دیکھا ہے؟ اُنھوں نے سوچا۔ لیکن اُنکا تمام جسم پسینے سے شرابور تھا اور کمر میں چوٹ کی تکلیف سے سخت درد ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اُن کی کمر پر کس نے وار کیا۔

پریشان ہوکر داروغہ صاحب نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ اُن کی چھوٹی لڑکی کھڑی اُن کی کمر تھپک رہی تھی۔ باپ کی گھبراہٹ دیکھ کر بچی کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔

برآمدے میں قدموں کی آہٹ ہوئی اور سپاہی آزاد کو لئے ہوئے داخل ہوا۔ وہ کمبخت اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"کیا حکم ہے، حضور؟" سپاہی نے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

داروغہ صاحب نے ایک ہاتھ سے اپنی کمر کو ٹٹولا۔ دوسرے سے پسینہ صاف کیا، تاکہ پریشانی ظاہر نہ ہو۔ مگر آواز قابو میں نہ تھی۔

"ک.....ک.....کیا ہے؟.....ک.....ک.....کون ہے؟"

صوبے کا سب سے زیادہ رعب دار داروغہ ایک معمولی مجرم کے سامنے ہکلا رہا تھا۔ "ہاں.....یہ آزاد صاحب.....ان.....ان.....کو.....ان کو رہا کردو۔ سازش کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔"

آزاد داروغہ صاحب کی بوکھلاہٹ دیکھ کر مسکرایا گویا وہ اُس اصل وجہ سے واقف تھا۔ داروغہ صاحب نے اپنی بچی کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُن کی کمر پھر تھپک رہی تھی۔ گویا اُن کو ایک اچھے کام کی داد دے رہی ہو۔ سپاہی کچھ دیر تو مبہوت کھڑا رہا۔ اُس کو شبہ تھا کہ داروغہ صاحب کے دماغ پر گرمی کا اثر ہوگیا ہے۔ مگر افسر کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اُس نے آزاد کی ہتھکڑی کھول دی۔ اور دونوں باہر چلے گئے۔

اُس دن سے داروغہ صاحب کے رُعب کا خاتمہ ہوگیا۔ اب ان کا شمار صوبے بھر کے سب سے زیادہ ناکارہ افسروں میں ہوتا ہے۔

ممتا اور محبّت

راہ میں اک غریب عورت کے — عشق نے بڑھ کے تیر مار دیا

ایک رہرو نے اُس کے سینے میں — جذبۂ دلبری اُبھار دیا

قلبِ نازک کو آرزو واحد میں — شوق نے مژدۂ بہار دیا

عشق نے حُسن کی نگاہوں کو — جلوۂ تیغِ آبدار دیا

اور عورت نے ایک لوچ کے ساتھ

طِفل کو گود سے اُتار دیا

جوش

جہالت سے جنگ

اپیل از رہنمائے ثقافتِ عالم

(نکولس ریورچ)

Nicholas Reuorich

~~~~~~~~

تمام کُرۂ ارض کے باشندوں کو جہالت کے فنا کر دینے کے لئے مُتحد ہو جانا چاہئے، کوئی قوم اس پر فخر نہیں کر سکتی کہ وہ حسبِ مُراد تعلیم یافتہ ہے۔ اور کسی فرد میں اتنی کافی طاقت نہیں ہے کہ وہ تنہا جہالت پر فتح حاصل کر سکے۔

علم و بصیرت کو آفاقی و عالم گیر (Universal) ہونا چاہئے۔ اور تمام نوعِ انسانی کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ کامل تعاون کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت میں پوری سرگرمی کے ساتھ جد و جہد کرے۔

مراسلت و خبر رسانی کے وسائل اِس وقت لامحدود صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اِس بنار پر مبادلۂ آرا کے ذریعے سے علم کی اشاعت کا کاروبار آسانی کے ساتھ جاری رکھا جا سکتا ہے۔

کسی کو اس وہم میں گرفتار ہو کر سُست عزم نہ ہونا چاہیئے، کہ بعض مقامات پر نشرِ عُلوم کا کام اِس سے پیشتر ہو چکا ہے۔

عُلوم اس قدر وُسعت و سُرعت کے ساتھ پھیلتے اور پھیلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ تازہ بتازہ اسالیبِ اشاعت اختیار کرنے کی ضرورت ہر وقت دامنگیر رہتی ہے۔

ایسے محروم نمو پتھریلے دماغ کتنے ہولناک ہوتے ہیں، جن میں علوم کے نَو بہ نَو کار ہائے نمایاں کے جذب کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی، رسائٹی کا یہ اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ ایسے پتھریلے دماغوں پر تیشے چلا چلا کر انھیں اس قابل بنا دے کہ وہ علم کے تخم قبول کرنے لگیں۔

کوئی مُنکرِ بصیرت کبھی ایک صحیح سائنس داں نہیں بن سکتا۔ سائنس، آزاد، ایماندار، اور بے خوف چیز ہے۔ یہ پلک جھپکاتے ہی تبدیلیاں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور مسائلِ عالم کی تاریکیوں کو ایک آن میں تابناک بنا سکتا ہے۔

سائنس، دلفریب، حسین، اور لامحدود شے کا نام ہے۔

سائنس (علم) تعصُّب، اوہام، اور امتناع کو ایک لمحے کے واسطے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ حقیر سرگرمیوں میں بھی عظیم چیزیں حاصل کر سکتا ہے۔

سائنسدانوں سے پُوچھئے کہ کتنے بار ایسا ہوا ہے کہ معمولی سی معمولی تحقیقات کے سلسلے میں کتنے حیرتناک اور غیر معمولی انکشافات ہو چکے ہیں۔

سائنسدانوں کے دل روشن اور آنکھیں کھُلی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ زمین کے نیچے اور آسمان کے اوپر مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔
~~~~~~~~

اُن لوگوں کا جادۂ فکر، جو مسلسل تحقیقات میں عمریں صرف کرتے ہیں، دراصل جادۂ مستقبل ہے جس پر آئندہ نسلیں فخر کے ساتھ گامزن ہوں گی۔

حقیقت میں جہالت کے فنا کر دینے کا مسئلہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے، اور یہ وہ شے ہے جسے کوئی طاقت مسخ یا فنا نہیں کر سکتی۔

لیکن بدشکل و مکروہ جہالت سے نبرد آزمائی کوئی بچوں کا کھیل نہیں، اس لئے کہ اس کے خدّام کی فہرست حیرتناک طور پر طویل واقع ہوئی ہے۔ اس کے جھنڈے کے نیچے صرف ننگے، بھوکے، یا وحشی و نیم وحشی انسانوں ہی کا مجمع نہیں رہتا، بلکہ بڑے بڑے اُمرا، بڑے بڑے تاجر، اور بڑے بڑے سلاطین اس کی چھاؤں میں جشن مناتے ہوئے ملتے ہیں۔

جہالت تمام ممالکِ عالم کی کمینگاہوں میں چھپی ہوئی ہے، اور متعدد لباسوں میں جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ اس کے رُوپ بھرنے کے لباسوں میں بعض تو اس ترکیب سے مُنقّش کئے گئے ہیں کہ اُن پر خلعتِ علم و فضل کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

اس چالاک جہالت کے مٹانے کے لئے بڑی ہمت اور شدید صبر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جہالت سے دست و گریباں ہونا ایک ہنگامۂ عظیم، اور ایک غوغائے عام سے نبرد آزمائی کرنا ہے۔

ہمارے دَور سے پانسو برس پیشتر مشرق سے یہ مبارک الفاظ سُنائی دئے تھے کہ "جہالت، بدترین جرم ہے۔"

اور اُس کے بعد مسیحیت کی پہلی صدی کے عظیم خلوت نشینوں نے بھی یہ آوازہ بلند کیا تھا کہ "جہالت، جہنم سے بدتر ہے۔"

اس میں شک کی کیا گنجائش نکل سکتی ہے کہ برادرکشی کے تمام ہولناک بُخارات اسی جہالت کے غارسے اُٹھا کرتے ہیں۔ اور جہالت ہی کے ناپاک چشمے سے وہ تمام دروغ بافیاں، وہ تمام تاریکیاں اور وہ تمام مذہبی اوہام پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن سے دنیا کے منحوس ترین اور سفاکانہ جرائم کا صدُور ہوتا ہے۔

علمی سندیں حاصل کر لینے، اور تمام درسیات پر حادی ہو جانے کے بعد بھی لوگ جاہل ہی کے جاہل رہتے ہیں، اور بعض تو ناخواندہ افراد سے بھی پست حالت میں نظر آتے ہیں —— بات یہ ہے کہ جس طرح جلتے ہوئے لقموں کے نگل لینے سے جسم کو کوئی غذا نہیں پہونچتی۔ اسی طرح خواندہ ہونے سے کوئی شخص تعلیم یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم ایک فطری خوراک ہے۔ لیکن دنیا کی تمام خوراکوں کی حیثیت سے یہ ایک خوراک مفید بھی ہو سکتی ہے اور مُضر بھی۔ صحت کو بگاڑ بھی سکتی اور بنا بھی سکتی ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ ثقافت (education) کو بھی نہ اختیار کیا جائے۔ تو مقصدِ تعلیم فوت ہو جاتا ہے۔ کیا دنیا کو نہیں معلوم کہ تعلیم یافتہ اسی کو کہہ سکتے ہیں جو "پڑھا" بھی ہو، اور "کڑھا" بھی۔

تعلیم یافتگی اور ثقافت (culture) یا یوں کہئے کہ پڑھائی اور کڑھائی لازم و ملزوم چیزیں ہیں، اور یہ دونوں ایک دوسرے کے اجزائے لاینفک ہیں۔

تعلیم، جب ثقافت سے مل جاتی ہے، تو اُس میں ایک ایسی نظر پیدا ہو جاتی ہے جو ٹھوس چیزوں کے آرپار جا سکتی ہے۔ اور ایک ایسا دل معرضِ وجود میں آجاتا ہے جس میں لامحدود واقفیت قبول کر لینے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، اور یہ وہ تابناک بھٹی ہے جو وقوف و آگاہی کو ہر آن نیا کُندن اور تازہ جوانی بخشتی رہتی ہے، اور اسی کی نرم آنچ میں انسان کا جوہرِ خاص کھرے سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

کامل ایمانداری، اور بے نہایت مشقّت کے ساتھ علم حاصل کرنے سے انسان میں ایک ایسا شرف و مجد آجاتا ہے کہ وہ تعصّب، تنگ نظری، وہم پرستی، فرقہ داری، اور نفرت سے کلیتہً پاک ہو کر خدمتِ نوعِ انسانی کے مفہوم کو سمجھنے لگتا ہے۔

ایک صحیح معنی میں صاحبِ فضل و کمال انسان کی آنکھیں کھُلی ہوتی ہیں، اور آزادخیالی اُس کے سب سے بڑے مقدّس فرائض میں داخل ہوتی ہے۔

زندگی کے ہر رطب و یابس کی طرح انسان کی آنکھ اور اُس کے خیالات کو بھی تعلیم یافتہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ تعلیم یافتگی کی یہ نہایت باریک و لطیف نوعیت صرف ثقافت کے ذریعے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

تعلیم کے بالکل ابتدائی دَور ہی سے انجذاب و قبول، اور انُق

نظر کی توسیع کو بنیادی اصول کے طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ——— میرا مدّعا یہ ہے کہ بچپن ہی سے بچوں میں یہ خیال پیدا کرنا تعلیم کی اوّلین شرط ہے کہ وہ اپنے خیالات کو معبود نہ بنانے پائیں۔ بلکہ ہر نئے خیال کے استقبال کے لئے اُن کے دماغ کو کھُلا رہنا چاہیئے۔ اور اُن میں اِس قدر رواداری ہونا چاہیئے کہ وہ مخالف خیالات پر بھڑک نہ اُٹھیں۔ بلکہ اُس کے تمام پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کرکے کوئی معقول فیصلہ کرسکیں۔

علم کو روایتی زنجیروں سے آزاد رکھنے کی شدید ضرورت ہے ——

علم مسرّت و عشرت کا راستہ ہے، اور مسرّت و عشرت صرف مکمل عقل ہی کا دوسرا نام ہے۔

عقل کی تکمیل سے بڑھ کر کوئی عیاشی اِس کرۂ ارض پر موجود نہیں۔

صرف اربابِ علم و ثقافت اور شعراء ہی لفظِ الہام القا کے معنی سمجھ سکتے ہیں، یہ صرف اُنھیں کو معلوم ہے کہ اشراق کِسے کہتے ہیں، اور اشراق کیونکر نو بہ نو اشکال و اسرار اور تازہ بتازہ قوتوں کے چہروں سے نقاب اُٹھاتا رہتا ہے۔

زمانۂ قدیم سے یہ احساس چلا آرہا ہے کہ خیال ایک عظیم قوت ہے، اور صدیوں سے لوگوں کو اِس کا علم ہے کہ خیال، ایک قابلِ انتقال شے بھی ہے لیکن یہ اِس قدر قدیم مسئلہ اب کہیں جا کر اہلِ دُنیا کے دماغوں تک پہونچ سکا ہے۔

ہم سب اِس کے گواہ ہیں کہ ابھی کچھ ہی دن پیشتر دُنیا کے جُہلا "میگنا ٹزم" (مقناطیسی کشش) اور "ہپنا ٹزم" (قوّتِ نوم آور) کو لایعنی اور مہمل کہا کرتے تھے، اور یہ گمراہیاں اِس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ ایک ہی قوّت کو متعدد ناموں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ردّ و قبول کیا جاتا تھا۔

مسمریزم کو تو مردود و مضحکہ خیز قرار دیا جاتا تھا، لیکن اِسی مسمریزی قوّت کو "ہپنا ٹزم" کے لقب سے وابستہ کرکے کسی حد تک زندہ رہنے کا حق دے دیا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انجن، گراموفون اور نظریۂ انتقالِ خیال وغیرہ کا بھی دنیا کے جہلا جی کھول کر مذاق اُڑا چکے ہیں۔

دنیا کے تمام شہدائے علوم کی فہرست کون مرتب کرسکتا ہے۔ کیا ہمیں یاد نہیں ہے کہ ریاضی کے زبردست ماہر "سوفی" کی کتاب پر کس قدر اعتراضات وارد کئے گئے تھے۔ اور اُس کے معتقدین کو کیونکر یونیورسٹی سے خارج کردیا گیا تھا۔

علم الاجسام کی ماہرہ "پالو" کے نام پر دنیا فخر کرسکتی ہے۔ لیکن اُس کے اُس بین الاقوامی کارنامے پر بھی جسے "نوبل پرائز" مل چکا ہے۔ اکثر "علماء" کے حلقے میں حقارت کے ساتھ شانے ہلائے جاتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ثقافت کے بغیر دُنیا کی کوئی سندِ فضل، کوئی قبائے علم، اور کوئی فنی کلاہ، انسان کے دل سے رشک و حسد اور معاندانہ نکتہ چینی کے جراثیم نہیں نکال سکتی۔

جہالت سے جنگ کرنا پھر بھی آسان ہے۔ مگر جاہلانہ رشک و حسد کی گنہگاریوں اور روسیاہیوں کا مقابلہ کوئی آسان چیز نہیں۔ کیونکہ اِس جاہلانہ رشک و حسد کی جلو میں دس دس سروں والے نفرت کے دیوتا بیس بیس ہاتھوں والے رقابت کے ابلیس، اور چالیس چالیس ٹانگوں والے تاریکی و جہل کے بھوت ہوا کرتے ہیں دنیا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ راستی (Truth) کا ہر انکار، جہالت ہے، اور ایسی جہالت جو متعدّی ہوتی ہے۔ راستی سے جنگ کرنا فضا کو زہر بنانے سے بدتر ہے۔ لیکن اِس سے بھی خوفناک یہ چیز ہے کہ کوئی علمبردار راستی و حق اُس سے یکایک منحرف ہوکر تصوّف اور اوہام کی وادیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہو۔

تاریکی کی طرف یہ پسپائی کس درجہ شرمناک جنون ہے!

ایسے کافرانِ علم و ثقافت اور مُرتدانِ حق و راستی کا خم ٹھوک کر مقابلہ کرنا چاہیئے، ورنہ وہ سوسائٹی میں ایک ایسا فتنہ برپا کردیں گے کہ خدّامِ علم کی راہ میں نئے نئے کانٹے اُگنے لگیں گے۔

میں پھر کہوں گا اور بار بار کہوں گا کہ ہر اُس شخص کو جس کے نزدیک تعلیم و ثقافت کھوکھلے الفاظ نہیں ہیں۔ اپنے اپنے دائرے میں، جہاں تک بن پڑے، جہالت سے مسلسل جنگ جاری رکھنا چاہیئے۔

کسی کو یہ کہنے کی جُرأت نہ دلانا چاہیئے کہ وہ جہالت سے نہیں لڑسکتا۔ کیونکہ اُس کا یہ قول سراسر جھوٹ پر مبنی ہوگا۔

افسوس کہ علانیہ اور پوشیدہ جہالت ہر خطۂ ارض میں گھر کئے ہوئے ہے، اور اپنی تمام پیدا و پنہاں شرارتوں کے ساتھ نوعِ انسانی پر غرّاتی رہتی ہے۔

کیا انسانیت اِس مکروہ درندے کو ہلاک کرنے سے ڈرتی ہے؟

اِس عہد میں جب کہ تعلیم یافتہ جہالت، گرجتی ہوئی توپوں اور زہریلی

افیم کی پینک

(بہ اجازت اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب براڈکاسٹنگ اسٹیشن دہلی)

ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جن بزرگ کی کتھا میں آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں اُن کا نام مجھے کیا کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ گاؤں بھر اُنھیں "تمہارے صاحب" کہتا تھا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ "تمہارے صاحب" اُن کا تکیہ کلام تھا۔ اور اُنھوں نے اُسے بات کی ٹیکن بنالیا تھا۔ جہاں زبان رُکی اور اس کا سہارا لیا اسی لئے ان کا یہی نام پڑگیا تھا۔ ہاں ان کا تھوڑا سا حلیہ سُن لیجئے۔ تھوڑا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اختصار منظور ہے۔ بلکہ اُن کا حلیہ تھا ہی ذرا سا۔ ٹھنگنا قد، اکہرا بدن، دُبلا چہرہ، سانولا رنگ، خشخشی ڈاڑھی، سر پر پٹے، اللہ اللہ خیر سلا۔ کپڑے بھی واجبی ہی واجبی پہنتے تھے۔ نیچا کُرتا۔ اونچا پاجامہ یا کبھی لُنگی۔ سر پر رُومال لپٹا ہوا، آنکھوں میں سُرمہ روز لگاتے تھے۔ اور سر میں تیل چوتھے دن ڈالا کرتے تھے۔

"تمہارے صاحب" ایک بگڑے ہوئے زمیندار تھے۔ کسی زمانے میں قریب کے ایک گاؤں میں اُن کی دو ڈھائی سو بیگھے زمین تھی جو مقدمہ بازی میں ٹھکانے لگ گئی۔ اُس وقت سے وہ ہمارے گھر میں کچھ عزیز اور کچھ نوکر کی طرح رہتے تھے۔ کام وہ صرف دو ہی کرتے تھے ایک تو گھر کے بڑے بوڑھوں کو حُقّہ بھر کر پلانا دوسرے بازار سے سَودا سُلف لانا۔ سودا چُکانے میں اُن کی انوکھی عادت یہ تھی کہ ہمیشہ دوکاندار کی سی کہتے تھے۔ مثلاً خربوزے والا آیا ہے اور زنانی ڈیوڑھی میں اُس سے بھاؤ چُکایا جارہا ہے، یہ بھی وہاں موجود ہیں۔ بیچنے والا سیر کے چار پیسے مانگ رہا ہے۔ خریدنے والے دو پیسے کہہ رہے ہیں، ان حضرت کا فیصلہ یہ ہوتا تھا "نہیں ہمارے صاحب یہ خربوزے تو چار ہی پیسے سیر کے ہیں"۔ اور جو کسی نے کہا کہ تم کیوں بیچ میں بولتے ہو تو بھولے پن سے فرماتے تھے "واہ تمہارے صاحب وہ تو آپ ہی چار پیسے سیر کہہ رہا ہے، ہم نے کہا تو کیا بُرا کیا؟"

اِن کی سادگی کا ایک اور ثبوت۔ لوگ اِس بات کو جانتے تھے کہ آپس کے رشتے اِن کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ سچ پُوچھئے تو ہمارے خاندانوں کے رشتے ہوتے ہی اِس قدر پیچیدہ ہیں کہ اَسّی برس کی بڑھیوں کے سوا جس کسی سے پُوچھ بیٹھئے، اُسے سلیٹ پنسل سنبھالنی پڑتی ہے۔ اور پھر بھی نتیجہ اکثر صفر ہی نکلتا ہے۔ مگر "تمہارے صاحب" اوروں سے بڑھے ہوئے تھے۔ کبھی پھپھی کی ساس کو نانی، کبھی بیوی کے بہنوئی کو نندوئی، غرض اٹکل پچّو رشتے بتادیا کرتے تھے۔ ہم سب بچّے اُن کے پیچھے پڑ کر طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے اور اُن کے جواب سُن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ایک بار اُن سے پوچھا کہ فلاں درزی کے سگے دادا کی سگی پوتی اُس کی کون ہوئی۔ پہلے تو اُنھوں نے اُس درزی کے دادا کا نام، اُس کی ولدیت، سکونت اور عمر کی تصدیق کی پھر پوتی کا نام اور عمر پوچھی۔ یہ سب چھان بین کرنے کے بعد فرماتے ہیں "بھئی کسی کے گھر کا حال ہمیں کیا معلوم، اُسی سے پوچھو"

شادی اُنھوں نے کم عمری میں کرلی تھی، بیوی تعداد میں ایک ہی تھیں،

مگر قدر ایں اُن سے چوگنی اور پھر تیز مزاج۔ اس لئے یہ اُن سے بہت ڈرتے تھے، آدمی بڑی محبت کے تھے۔ بال بچے تھے نہیں اور بیوی سے محبت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے محبت کا جذبہ اور جانوروں کی طرف منتقل ہو گیا تھا، بکریاں، مرغیاں، طوطے، مینا، تیتر، بٹیر، غرض بیسیوں جانور پال رکھے تھے، اور ان سے بہت مانوس تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے، اور نہیں ہے تو ہونا چاہیئے، کہ انسان کو جس جانور سے زیادہ سابقہ رہے اُس کی روحِ حیوانی اُسی جانور کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھئے تو "تمہارے صاحب" کی رُوح چڑیا خانے سے کم نہ ہوگی جس میں بھانت بھانت کے پکھیرو اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوں گے۔

"تمہارے صاحب" کی رقتِ قلب اور بھولے پن، اور مسکینی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ افیم کا شغل کرتے تھے۔ دن میں دو وقت، دوپہر کو اور رات کو، گھُلا کرتی تھی اور ہمارے پیرو دو ایک بے فکروں کے ساتھ افیم کی چسکیاں لیتے تھے اور حُقّے کے دم لگاتے تھے۔ مگر ان کے ساتھی ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ آس پاس کے کسی گاؤں میں "جو شخص کہ اس چیز کے قابل نظر آیا" اُسے اپنے یہاں بُلا کر چند روز اپنے پاس سے افیم پلاتے تھے اور جب وہ پکا ہو جائے تو اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس افیم آتی کہاں سے ہے۔ اس لئے کہ خریدتے ہوئے اُنھیں کسی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُن سے پوچھئے تو مُسکرا کر چُپ ہو رہتے تھے۔ اور اگر کوئی بہت اصرار کرے تو ایک قطعہ پڑھ دیتے تھے جو ٹھیک یاد نہیں رہا۔ کچھ اس سے ملتا جلتا تھا۔

اے کہ جاپان کے خزانے سے — چینیوں کو نسیم دیتا ہے
دوستوں کو کرے گا کب محروم — دشمنوں کی خبر جو لیتا ہے

اِس تعارف کے بعد میں آپ کو "تمہارے صاحب" کی ایک روز کی گفتگو سناتا ہوں جو میرا اصل مقصود ہے۔ اس سے آپ کو اُن کی سیرت کا اور زیادہ اندازہ ہو جائے گا۔ اور اگر آپ بھی "مختصر قصّۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتے ہیں" تو آپ کو بڑی عبرت اور بصیرت حاصل ہو گی۔ "ہوا یہ کہ ایک دن "تمہارے صاحب" میٹھے ٹکڑے زیادہ کھا گئے فصل تھی ملیریا کی معدہ جو خراب ہوا تو جاڑے بخار نے آدبایا فصلی بخار کی بے چینی تو آپ جانتے ہیں، اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ یہ بیماری کے بڑے کچے تھے۔ سمجھے کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔ لوگوں کو پکارنے لگے کہ میرے پاس آکر میری آخری وصیّت سُن لو۔ گھر کے بڑوں نے اُسے بخار کی بڑ سمجھ کر کچھ توجہ نہیں کی۔ البتہ بچے آکر جمع ہو گئے۔ مگر اُن کو اُنھوں نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ کچھ دیر کے بعد ہمارے ایک عزیز دوسرے گاؤں سے آئے۔ بیمار کی یہ حالت دیکھ کر اُن کو ترس آیا، اور اُن کے پاس بیٹھ گئے۔ "تمہارے صاحب" تو یہ موقع خدا سے چاہتے تھے۔ اُس دردناک لہجے میں جو افیمیوں کے لئے مخصوص ہے۔ اُنھوں نے اپنی کہانی شروع کر دی۔ ہم لوگ دروازے کے پیچھے چُھپے ہوئے سُن رہے تھے۔ مجھے جو کچھ یاد رہ گیا ہے کچھ اُن کے کچھ اپنے الفاظ میں سُنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

"سُنو تمہارے صاحب، میں آج تم سے وہ باتیں کہتا ہوں جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کی۔ میری عمر کچھ کم ساٹھ برس کی ہوئی، اگر لقریہ تک زندہ رہتا تو ساٹھ برس کا ہو جاتا۔ جوانی میں مجھ پر وہ مصیبت پڑی جس نے میری ساری زندگی کو برباد کر دیا۔ میرا گھر پاس کے ایک گاؤں میں تھا جس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ بزرگوں کے وقت سے گاؤں میں ہماری ایک پٹی چلی آتی تھی۔ والد کے مرنے کے بعد اس کا مالک میں ہوا۔ چین سے اور آبرو سے بسر ہو رہی تھی۔ اتفاق کی بات، گاؤں کے نمبردار سے مجھ سے ایک معاملے میں دشمنی ہو گئی۔ وہ اپنے زمانے کا مشہور جعل ساز تھا۔ اُس نے مجھے دق کرنے کے لئے ایک جعلی دستاویز بنا رکھی، اور اپنے ایک ہٹّو سے مجھ پر قرضے کی نالش کرا دی۔ یہ امید اُسے بھی نہ ہوگی کہ ڈگری ہو جائے۔ مگر ڈگری ہوئی اور ہائی کورٹ تک بحال رہی۔ میری زمین اور گھر سب کچھ چھن گیا۔ اور میں روٹیوں کو محتاج ہو گیا۔ خدا بھلا کرے اس ڈیوڑھی کا جس نے مجھے پناہ دی اور اس طرح رکھا جیسے اپنوں کو رکھتے ہیں۔ مگر کیا میرے دل سے ان ناگہانی مصیبتوں کا غم خصوصاً زمین کے چھن جانے کا داغ مٹ گیا؟ تم بھی زمیندار کے بیٹے ہو اور زمین کی قدر جانتے ہو۔ اس دنیا میں تمہارے صاحب یہاں کسی چیز کو دم بھر قرار نہیں اگر کوئی چیز سینکڑوں ہزاروں سال باقی رہتی ہے تو وہ زمین ہی ہے۔ اسی پر ہم پیدا ہوتے ہیں، اسی پر جیتے ہیں اور اسی میں دفن ہوتے ہیں۔ زمین کی جو محبت انسان کے اور وہ بھی زمیندار کے

دل میں ہوتی ہے اس کی تھاہ نہیں ہے۔ مدت تک میرا یہ حال رہا کہ ہر وقت اپنی زمین کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی اور اسے یاد کرکے تڑپتا تھا۔ نمبردار سے اور اس کے پٹھو سے بدلا لینے کی تدبیریں ہر وقت سوچا کرتا تھا۔ مگر لڑائی بھڑائی سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہے اور طاقت بھی مجھ میں ان لوگوں سے کچھ کم تھی۔ اس لئے خود کچھ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ یہی صورت سمجھ میں آتی تھی کہ ان پر آسمان پھٹ پڑے یا بجلی گر پڑے، مگر یہ اپنے اختیار کی بات نہ تھی۔

دوسرا ہوتا تو تمہارے صاحب اس غم میں کھانا پینا چھوٹ جاتا۔ میں بہت صبر سے کام لیتا تھا۔ گاؤں میں رہ کر دل بہلانے اور غم غلط کرنے کی جو تدبیریں ہوسکتی تھیں وہ کرتا تھا۔ مگر دل کی کلی کسی طرح نہ کھلتی تھی۔ پیر خاکسار شاہ صاحب جب یہاں تشریف لائے، تو میں اُن کا مرید ہوگیا اور ان سے اپنا دردِ دل بیان کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مولا سے لَو لگاؤ۔ اور دنیا کا خیال چھوڑ دو۔ نماز روزے کی تاکید کے علاوہ اُنھوں نے چلّہ کھینچنے اور پیر کے نام کا ورد کرنے کی ہدایت کی۔ تھوڑے دن میں نے اِن سب باتوں کی پابندی کی۔ مگر کچھ کام نہ چلا۔ نماز تو خیر میں پڑھتا ہی تھا، مگر روزہ مجھے کبھی راس نہیں آیا۔ جب کبھی روزہ رکھا دن چڑھے سے معدے میں کچھ عجیب کھُرچن سی ہونے لگتی تھی، اور شام تک بڑھتی جاتی تھی۔ وظیفے میں یہ مشکل تھی کہ پیر کا نام خاکسار شاہ تھا، اس کی رٹ لگانے سے مٹی کا اور اس سے زمین کا خیال آتا اور میرا زخم ہرا ہوجاتا۔ پیر جی سے عرض کیا تو وہ بہت خفا ہوئے اور مجھے مردود، شیطان کہہ کر نکال دیا۔

ایک بار تمہارے صاحب تحصیل میں ایک قُرق امین صاحب آئے جو شاعر تھے۔ انھوں نے مجھے یہ رائے دی کہ تم شعر کہا کرو۔ پھر دیکھنا کہ زمین شعر کے سوا تم ہر زمین کو بھُول جاتے ہو یا نہیں۔ شاعری کا مادّہ تو مجھ میں ہمیشہ سے تھا۔ چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے کہ تم ہر بات میں شاعری کرتے ہو، مگر موزوں شعر کبھی نہیں کہا تھا۔ اب جو کہنا شروع کیا تو بڑے جھگڑے پڑ گئے۔ لوگوں نے عجیب عجیب الزام لگائے، کہنے لگے تمہارے صاحب، فلاں شعر جو ہے وہ سرقہ ہے، ایک شاعر اِسی مضمون کو اُنھیں لفظوں میں کہہ گیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ تمہارے صاحب میں اس کے لئے کیا کرتا؟ شرارت اُس شاعر کی ہے جس نے مجھے پھنسانے کے لئے پہلے ہی سے یہ مضمون کہہ دیا، اور پھر اُنھیں لفظوں میں! غرض اِن باتوں سے تنگ آکر شاعری کو بھی

سلام کیا۔ اب ایک ہی چیز رہ گئی تھی، یعنی عشق۔ سو اس کو بھی میں نے کر دیکھا۔ صبح شام پنگھٹ پر جاتا تھا اور گاؤں کی چھبیلیوں کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھا کرتا تھا، جیسا کہ قاعدہ ہے، کبھی آہ سرد بھرتا، کبھی سسکتا۔ کبھی آنسو بہاتا، کبھی جگر تھام کر بیٹھ جاتا۔ مگر تمہارے صاحب اِن نیک بختوں کا عمل بالکل قاعدے کے خلاف تھا۔ اُنھیں چاہئے تھا کہ مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتیں، تیغ ابرو سے گھائل کرتیں، برقِ تبسم سے جَلاتیں۔ لبِ جاں بخش سے جِلاتیں۔ مگر وہ تو مجھے دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتی تھیں اور پانی کے چھینٹوں سے بھگو دیتی تھیں۔ خیر اس میں بھی ایک خاص لُطف آتا تھا، اگرچہ جاڑے میں ذرا تکلیف ہوتی تھی۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہا میری طبیعت تھوڑی بہت بہلی رہی۔ مگر تقدیر کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ میری شادی کردی گئی، اور وہ جو آئیں تو اُنھوں نے عشق کی قطعی ممانعت کردی۔ چلئے چھُٹی ہوئی۔

اب میرا تمہارے صاحب پھر وہی حال ہو گیا۔ کھوئی ہوئی زمین کا غم دل میں نشتر کی طرح چبھنے لگا۔ دشمنوں سے بدلا لینے کا خیال کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ عرصے سے اس گاؤں کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب پھر ادھر کے چکر ہونے لگے۔ اپنی زمینوں کو دُور سے دیکھتا اور دیکھ دیکھ کر کُڑھتا تھا۔ اگر یہ وحشت چند سال اور رہتی تو خدا جانے میرا کیا انجام ہوتا۔ خدا کو کچھ اچھا ہی کرنا منظور تھا کہ ایک باکمال جوگی ادھر آنکلا۔ میں تو ایسے لوگوں کی تلاش ہی میں تھا، فوراً اُس کی خدمت میں پہنچا۔ اس نے میرا حال سُنکر کہا "بابا تیرا دُکھ بڑا بھاری ہے، اس کو جیون سنکٹ کہتے ہیں۔ یہ بیماری اِس طرح ہوتی ہے کہ یہ جیون، یہ سنسار، انسان کے لئے سانپ کے مُنھ کی چھچھوندر ہوجاتا ہے، جسے نگلے بنے نہ اُگلے۔ جب کسی آدمی کی یا کسی قوم کی تن من کی طاقت گھٹ جاتی ہے اور دنیا کا بوجھ نہیں گھٹتا تو نہ زندگی اُس کے سنبھالے سنبھلتی ہے اور نہ چھوڑے چھوڑی جاتی ہے۔ اُس کا علاج یا تو یہ ہے کہ اپنے میں یا تو اتنی شکتی پیدا کی جائے کہ جیون چیلا بن کر ہمارے آگے ڈنڈوت کرے یا پھر اُسے مایا کہہ کر چھوڑ دیا جائے۔ اور اپنے لئے دھیان گیان کا ایک مندر بنا لیا جائے جس میں ہم بھُول کو گیان سمجھتے ہوئے، نیند کو شانتی جانتے ہوئے ہنسی خوشی دُنیا سے چلے جائیں۔ یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں، تو نہ تو شانتی رکھتا ہے اور نہ گیان کے

قابل ہے۔ اس لئے میں تجھے ایک گُنکا دیتا ہوں جس کے کھانے سے تو دم بھر میں اپنی زمین کیا ساری زمین کو بھول جائے، اور اس دنیا کے جھمیلوں سے چھُوٹ کر من کی دنیا کی سیر کرے گا اور آپ ہی آپ مزے لے گا" یہ کہہ کر اس نے مجھے کالے رنگ کی چھوٹی سی گولی دی۔ یہ تمہارے صاحب، وہی چیز تھی، جو افیم کہلاتی ہے۔ مبارک تھی وہ گھڑی جب میں نے "درد کی دوا پائی، اور دِلا دوا پایا" اُس روز سے آج تک مجھے کبھی زمین کی فکر نے یا بدلے کے خیال نے نہیں ستایا کبھی کبھار ذرا سی بےچینی ہوتی ہے، مگر جہاں افیم حلق سے اُتری، جی میں آرام کی ہلکی ہلکی لہریں اُٹھنے لگیں، چین کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نرم نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ جھُولا جھُلا رہا ہے۔ پھر زمین سے آسمان تک خاموشی، سکون، امن وامان چھا گیا۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں صلح آشتی بس گئی، اور رُوح بےخودی کے آغوش میں پہونچ کر بےخبری کا لطف اُٹھانے لگی۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت آن پہونچا ہے۔ اور روز روز کے سونے جاگنے، ڈوبنے اُچھلنے سے نجات پا کر میں ابدی نیند کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں۔ اس لئے میں نے اپنی کہانی سُنادی کہ تم اُسے اور ہندوستانی بھائیوں تک پہونچا دو۔ اور اُنھیں وہ نسخہ بتادو جس نے میرے سارے دُکھ، درد، کو دُور کردیا، اور میری زندگی کی مشکل کو دُور کر دیا۔ جس شخص نے تمہارے صاحب ایک بار بھی اس نعمت کا مزا چکھ لیا وہ اُسے نہیں بھُول سکتا۔ کیا خُوب کہا ہے کسی نے ؎

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی پینک کہ رات دن
اُونگھا کریں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے۔

مُڑی ہوئی پتّی

اک فتنۂ زمانہ بصد نازِ بےپناہ — موجِ رواں کی شان سے طے کر رہی ہے راہ
ہر ایک پیچ وخم پہ مجُھے دیکھتی ہوئی — مُڑ مُڑ کے ہر قدم پہ مجھے دیکھتی ہوئی

چہرے پر ایک گرد سی گویا اُڑی ہُوئی
پتّی ہوائے تُند کی رَو پر مُڑی ہُوئی

جوشؔ

شاید کام پڑے

ایک معزول مُعتمد کے پاس — بیٹھے دیکھا جو آج یاروں کو
میں نے کہتے سُنا بہ لحنِ خموش — اُن کے عالم فریب اشاروں کو

"پھر اگر بر سرِ عمل آنا
بھُول جانا نہ خاکساروں کو!"

جوشؔ

کلیمِ عجم پر ایک نظر اور ہم

کنور محمد اعظم علی خاں خسروی
سکرٹری انجمن تنقید الادب، جے پور

"کلیم" بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۶ء میں جناب آثر لکھنوی کا ایک تنقیدی مضمون "کلیمِ عجم پر ایک نظر" کے عنوان سے دیکھنے میں آیا۔ چونکہ مضمون میں ایک لحاظ سے ایک خاص اہمیت ہے، اِس لئے ہم نے اسے دلچسپی سے پڑھا۔ ہمارے خیال میں اس مضمون کی نوعیت ہمیں اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ایک دوسری ایسی مزید رائے بھی ہونی چاہئیے جس سے اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ اِس لئے ہم بھی اربابِ علم اور اصحابِ ذوق کی نظروں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

جنابِ آثر حسبِ ذیل عبارت "کلیم عجم" سے اقتباس فرماتے ہیں۔

"۱۹۱۹ء سے شعر کہتے وقت میں ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہوں جہاں ظواہر اور رسمیات کی گنجائش نہیں۔ جہاں ایک محیطِ سرور و نور میں میری رُوح اور دماغ سرخوش ہوتے ہیں۔ جہاں حُسن بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ مگر معصوم اور ازلی؛ اور جہاں محبت بے حدّ و غایت ہوتی ہے، مگر بے لوث اور ابدی۔"

اب بعض اوقات بغیر فکر بھی شعر دماغ پر نازل ہوجاتا ہے، آسودگیٔ خلوت، شورشِ محفل، لوگوں کا ہجوم، رباب و سرود کی آوازیں، ریل کی کھڑکھڑاہٹ، موٹروں اور تانگوں کی سماعت خراش رفتار میرے شعر کہنے میں حارج نہیں ہوتی، اب میں چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور دورانِ گفتگو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں، اب میرے لئے شعر کہنا اور باتیں کرنا برابر ہے، البتہ جب کثرتِ افکار سے دل پریشان اور دماغ پراگندہ ہوتا ہے تو مجھ سے شعر نہیں کہا جاسکتا۔۔۔۔۔۔"

"کسی مصرعہ کو دو چار بار ذہن میں گردش دی اور خاموش بیٹھ گیا۔ دو منٹ کے بعد سانچے میں ڈھلے ڈھلائے شعر کاغذ پر برسنے لگتے ہیں، جن پر نظرِ ثانی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر نظرِ ثانی کرتا ہوں تو شعر میں وہ اُلوہیت و بداہت نہیں رہتی جو دماغ سے نکلے ہوئے شعر میں ہوتی ہے۔"

"بس یہ سمجھ لیجئے کہ دماغ مجسّم شعر اور طبیعت یکسر شاعری بن کر رہ گئی ہے۔ اِدھر کسی بحر کا کوئی مصرعہ دماغ میں گونجا اُدھر قلم سے اشعار برسنے لگے، اِدھر نظم کے لئے کوئی موضوع یا عنوان سامنے آیا اُدھر نظم کا موزوں خاکہ کھنچنے لگا۔ بعض اوقات تو قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے اور بندہ لکھ رہا ہے۔"

ہم نے اِس عبارت کو غور سے پڑھا اور بڑی دیر تک سوچا کہ فرض کیجئے، کہ "کلیم عجم" کوئی ایسی تصنیف ہے جس کو سر اسحٰق نیوٹن، سر جان ڈریپر اور مسٹر ایڈیسن کی تصانیف کے ہم پلّہ کہا جاسکتا ہے، مگر جب یہ نظر آتا ہے کہ اِن بزرگوں نے اپنی تصانیف کے متعلق جو علمی اکتشافات کے دفتر ہیں کہیں بھی اس قسم کا خیال ظاہر نہیں، جیسا کہ جنابِ سیماب نے کیا ہے تو ہماری تمام سنجیدگی ایک ایسے جذبے سے بدل جاتی ہے جس کا نام رکھنے کے لئے زبان کے ہزاروں لفظوں میں سے ہر ایک لفظ ہمیں قانون کی زد میں آنے سے دھمکاتا ہے۔ مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "کلیم عجم" نہ کوئی "شعلۂ طور" ہے، نہ "باقیات"

نہ "سرودِ زندگی" ہے نہ "میکدہ" تو ان خیالات پر جو "کلیم عجم" سے نذرِ ناظرین کئے گئے ہیں، ایسا کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جس کا مفہوم نہ کہنے سے ادا ہوتا ہے۔

ہم نے تمام مثنوی میر حسن پڑھی، کلیاتِ میر نظر سے گزرا۔ میر انیس کے مراثی دیکھے۔ فسانۂ سرشار کا مطالعہ کیا اور بالِ جبریل کا بھی حرف حرف چاٹ ڈالا۔ مگر خدا جانے ان مصنفوں کے دماغ میں کیا خلل تھا کہ ان تصنیفات کے متعلق انھوں نے کوئی ایسی رائے نہیں دی جس سے ناظرین یہ سمجھ سکیں کہ ان مجموعوں کے لکھتے وقت اُن کے مصنفوں پر وحی نازل ہوئی یا نہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں ان تصانیف میں سے کسی ایک کا بھی مصنف ہوتا تو یہ ہرگز نہ کہتا کہ "خدا بول رہا ہے، اور بندہ لکھ رہا ہے" بلکہ یہ کہنے پر مجبور رہتا کہ میں بندوں کی طرف وحی نازل کر رہا ہوں۔

خیر یہ تو اُن تاثرات کا اثرِ بازگشت تھا جو "کلیم عجم" کی فضا سے پیدا ہوا، اب اصل حقیقت ملاحظہ فرمائیے۔

جنابِ آثر نے "کلیم" میں ارشاد فرمایا ہے کہ "......اُن کے شعر اُنھیں کے مقرر کردہ معیار پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں" مگر معلوم نہیں کیوں جنابِ آثر نے اس حسین معیار سے بے اعتنائی فرمائی۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ جنابِ آثر کی اس فردگزاشت کو پورا کریں، اور جنابِ آثر کی طرف سے معافی چاہتے ہیں کہ ناظرین کو اس معیار پر جانچنے کے انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔

مضمون کو شروع کرتے ہوئے جنابِ آثر "کلیم عجم" سے حسبِ ذیل دو شعروں کا اقتباس فرماتے ہیں ؎

عروسِ فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب تیرا
زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہی تو
حدوث کی خفتہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا

جنابِ آثر کا خیال ہے کہ پہلے شعر میں لفظِ فطرت کا مفہوم "نیچر یا مناظرِ قدرت" ہے۔ اس فیصلے میں "بظاہر" یا "کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ جنابِ آثر کے اس خیال سے بھی ہمیں اتفاق نہیں کہ "عروسِ فطرت" کی ترکیب میں استعارے کو دخل ہے۔ کیونکہ ہمیں تو "عروسِ فطرت" میں اضافتِ تشبیہی معلوم ہوتی ہے۔

اب رہا یہ امر کہ "عروسِ فطرت" سے مُراد خدا اور خدا کو "عروس" یا کسی ایسی چیز سے استعارہ نہیں کیا جا سکتا جو نسائیت کی طرف منسوب ہو تو اس قسم کی دقت نگاری بظاہر موضوعِ زیرِ بحث سے کچھ تعلق نہیں رکھتی۔

اِس لئے پہلے شعر کے متعلق بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بجائے خود بہ لحاظ حُسنِ بندش و اسلوبِ بیان ایک اچھا شعر ہے۔ مگر یہ کہ وہ کسی مسلسل غزل سے ربط رکھنے کی استعداد بھی رکھتا ہے یا نہیں، اس فیصلے کا انتظار کیجئے۔

دوسرے شعر کے متعلق جو کچھ حضرتِ آثر نے ارشاد فرمایا ہے ہم اُس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جنابِ سیماب کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت ماورائے حدوث کوئی چیز ہے۔ اِس رائے سے بہ اعتبارِ حقیقت ہرگز اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ دنیا کے بڑے بڑے فلسفی دلائلِ قاطعہ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ وجودِ مطلق جو خالقِ ارض وسما ہے فطرت کی سی بے انتہا صفات کا حامل ہے۔ اُس وجودِ مُطلق سے قطع نظر کرکے فطرت کو کوئی ایسا مستقل وجود ماننا جو عالمِ حدوث سے الگ تھلگ ہو لغو ہے۔ فطرت نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہو سکتی ہے۔ مگر زوال سے نہیں بچ سکتی۔ اس لئے اگرچہ یہ خیال صحیح ہے کہ "حدوث کی خفتہ کاریوں میں" فطرت کا خواب تقسیم ہو گیا ہے۔ یعنی فطرت بجائے خود غیر ذی جسد ہونے کی وجہ سے نیند کی استعداد نہیں رکھتی۔ مگر یہ بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ فطرت کی تعریف میں یہ کہنا کہ فطرت سوتی نہیں ہے، کہاں تک نکتہ سنجی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بات بالکل ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ ہمالیہ یا افریقہ نہیں سوتا۔

اِس لئے مذاقِ سلیم رہنمائی کرتا ہے کہ صرف یہی بات نہیں کہ جنابِ سیماب کا دوسرا شعر کسی خاص معنی کا حامل نہیں ہے، بلکہ "انقلاب" کی صنعتِ اِہمال کا اچھا خاصہ نمونہ ہے۔

ہمارے خیالات کا سلسلہ ابھی تک کچھ ایسا تھا کہ ہم یہ فیصلہ نہیں کر چکے تھے کہ ہم اپنے محسوسات کو اہلِ ملک کے سامنے پیش کریں یا نہیں کہ اسی لیت و لعل میں ستمبر کا مہینہ آگیا اور حضرتِ جوش نے اس مہینے کا "کلیم" بھی گھبرا کر ہمارے پاس روانہ کر دیا، اور ہم نے بھی نہایت بوکھلاہٹ کے ساتھ اُسے کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ آخر صفحہ ۲۷۹ تک بھی نظر پہنچی۔ اور محمد صادق صاحب ضیا بی اے کا ایک مضمون "نظر بر آثر" بھی دیکھنے میں آیا۔

ہمیں چونکہ سنجیدہ تنقیدی مضامین سے فی الجملہ دلچسپی ہے۔ اس لئے ہم نے اس مضمون کو بھی دیکھا اور ضیا رصاحب نے حضرتِ سیماب کی جانب داری میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُسے سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ غالباً ہم اس کوشش میں ناکامیاب رہے۔ کیوں؟ سنئے:

ضیا رصاحب کا پہلا جواب یہ بالکل نہیں بتاتا کہ آیا وہ دونوں شعر جن پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ فی الواقع قابلِ نکتہ چینی ہیں بھی یا نہیں۔ "اثرصاحب کو ابھی تک یہ نہیں معلوم"، "اثرصاحب اِس کے عادی ہیں"، "مگر اُنھیں کون سمجھائے؟" وغیرہ وغیرہ کے سوا اس جواب میں اور کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ اثرصاحب کی عبارت سے جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں اُس کا مفہوم یہ ہے کہ "عروسِ فطرت" کے مسمیٰ کو قرینۂ کلام سے خدا کا مسمیٰ نہیں کہا جاسکتا۔ عُرفاً و شرعاً۔ اور شعر بحیثیتِ مجموعی بے معنیٰ ہے"۔ جنابِ ضیا ر کو چاہیئے تھا کہ وہ حریف کے مقابلے میں جیّد استدلال سے یہ ثابت کرتے کہ "عروس فطرت" بہ لحاظِ بلاغت درست ہے اور دوسرے شعر کے معنی بیان فرما دیتے۔ مگر چونکہ آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس کے علاوہ بعض جزئی باتوں کی طرف خواہ مخواہ ایسی توجہ فرمائی ہے کہ اس سے تو نہ فرمانا اچھا تھا۔

ضیا رصاحب کا یہ ارشاد کہ "فطرت کسی طرح ذاتِ الہٰی سے الگ نہیں کی جاسکتی۔ فطرتِ محض اور چیز ہے اور مناظرِ فطری اور چیز ہیں" جنابِ اثر ہی کی کچھ نہ کچھ تائید کرتا ہے۔

رہا یہ امر کہ "جس طرح شمع، لو، روشنی ایک ہی چیز کے مختلف حصّے اور نام ہیں اور جس طرح لالٹین، شمع، فانوس، چراغ اور لیمپ سے صرف "روشنی" مراد ہوتی ہے، بالکل اسی طرح فطرت، قدرت اور الوہیت کہہ کر خدا سے مراد لیتے ہیں"۔ بالکل خارج از موضوع چیز ہے۔ کیونکہ بحث یہ نہیں ہے کہ کسی جزو پر کُل کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں یا لازم کہہ کر ملزوم مراد لے سکتے ہیں یا نہیں۔ بلکہ اثرصاحب تو یہ فرماتے ہیں کہ سیماب صاحب کی نظم میں "عروسِ فطرت" کا استعمال بہ لحاظِ محل قابلِ نظر ہے اور اس کا جواب جنابِ ضیا کے یہاں کچھ نہیں ملتا۔ جنابِ ضیا شعر کو شعر کے محل سے ہٹاکر کہیں کا کہیں کھینچے لئے جاتے ہیں جس سے انوکھی انوکھی بحثیں پیدا ہونے کا امکان ہے اور جن کو شعر و شاعری سے کوئی واسطہ نہیں۔ مثلاً فطرت کا خدا سے الگ نہ ہونا یا "لَایَنَامُ وَلَایَمُوت" فطرت کی شان ہونا، غلط بحث کی تمہید ہی نہیں بلکہ جان ہے۔ کیونکہ قانونِ فطرت تو یہ ہے کہ "فاطرِ السمٰوٰتِ والارض" اس لئے فاطر کے افعال و صفات کو فطرت کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ یہ بحث پیدا ہو جائے گی کہ "فطرت" عینِ فاطر ہے یا غیرِ فاطر۔ دوسرے لفظوں میں جنابِ ضیا ر اس معرکۃ الآرا مسئلہ کو چھیڑ بیٹھے کہ صفاتِ باری عینِ ذات ہیں یا غیرِ ذات؟ سبحان اللہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔

ہمیں اُمید ہے کہ جنابِ ضیا ر اور ناظرین ہمارے اختلاف کو مخالفت نہ سمجھیں گے۔ اور ہمارا یہ مفہوم آسانی سے سمجھ لیں گے کہ شعر کے متعلق صرف وہی بحثیں اُٹھائی جائیں۔ جن کا شعر سے شعر کی حد تک تعلق ہو۔

اُوپر کے دونوں شعروں کے متعلق ہم اپنا بیان یہ کہے بغیر ختم نہیں کرسکتے کہ یہ دونوں شعر اُس مقررہ معیار پر پورے نہیں اُترتے جو اگست کے "کلیم" میں جنابِ اثر نے مقرر فرمایا تھا، اور جس کے لئے ناظرین کو انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ کیونکہ پہلا شعر فطرت کی تعریف میں ہے اور دوسرا بے معنی سا۔ اس لئے اس کے متعلق یہ کہنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ "خدا کا بولا ہوا" ہو سکتا ہے۔ اور ایک یہ بھی بات ہے کہ جب حضرتِ رب العزت اپنی نسبت مستند اور معتبر طریقہ پر لَاتَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْم فرما چکے ہیں تو غیر مستند طور پر کسی "شاعرِ اعظم" سے فطرت کے متعلق یہ کیوں ارشاد فرمانے لگے کہ وہ بھی لازوال، غیر فانی اور بے احتیاج ہے۔ تیسرا شعر ہے

جلال و جبروت نے لگا دی ہے مہرِ حیرت زبان و لب پر
جبال و صحرا کے ذہن میں ہے اشارہ انقلاب تیرا

بحیثیت فرد ہونے کے بجائے خود قابلِ تعریف اور ایک نازک سے مضمون کا امین ہے۔ حضرتِ اثر کو معلوم نہیں کس وجہ سے یہ التباس ہو گیا ہے کہ پہلے شعر کے لفظ "عروسِ فطرت" میں سے صرف "عروس" کو وہ شعر کا مخاطب سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ "عروسِ فطرت" کی ترکیب میں صرف "فطرت" ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے کیونکہ اساتذۂ بیان کا یہ فیصلہ ہے کہ مشبّہ اور مشبّہ بہ کے ذکر میں ہمیشہ مقصود مشبّہ ہوا کرتا ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ "جلال و جبروت" مرعوب کرسکتے ہیں یا متحیر، یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔ ہمارے خیال میں "جلال و جبروت" کے مشاہدے سے تحیر یا رُعب کا احساس صاحبِ مشاہدہ کی حیثیت پر موقوف ہے،

ممکن ہے کہ "جلال و جبروت" کے نظارے سے ایک شخص مرعوب ہو اور دوسرا متحیر۔

افسوس کہ حضرتِ ضیاؔ نے اپنے تیسرے جواب میں بھی کوئی قابلِ اعتنا بات ارشاد نہیں فرمائی۔ اس لئے آپ کے جواب کو ہم تبرکاً و تیمناً جواب سمجھے لیتے ہیں۔ لیکن ضیاؔ صاحب سے ہم اتنا ضرور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ناقد کے مقابلے میں اوچھے ہتھیار کبھی کام نہیں دیا کرتے۔

شعر کی تعریف تو ہم نے کر دی، مگر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ کس طرح ہم ناظرین کے ذہن تک یہ امر منتقل کر سکیں کہ یہ شعر "خدا کا بولا ہوا" سا ہے۔ ناظرین خود کوئی پہلو نکال لیں۔ چوتھے شعر ؎

غمِ عذاب و ثواب کیسا؟ یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں
نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عذاب تیرا

میں "غمِ عذاب و ثواب" کی ترکیب پر جنابِ آثرؔ کو اعتراض ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ "غمِ عذاب" ہو سکتا ہے، لیکن "غمِ ثواب" نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خیال میں "غمِ ثواب" کی اضافت بھی درست ہے، اس اضافت کو ایک صورت سے تخصیصی اور ایک لحاظ سے توضیحی اور بیانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر صورت میں "غمِ ثواب" کے معنی وہ "غم" ہوگا جس کا تعلق ثواب کے حاصل ہونے یا نہ ہونے سے ہو، یعنی غم، اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ ثواب حاصل ہو، اور ثواب کے حاصل ہونے کا بھی غم ہو سکتا ہے۔

مگر ہماری نظر اس شعر کے ایک دقیق پہلو پر دو وجہ یا وجوہ سے رُکتی ہے،

(۱) علمائے معانی نے یہ طے کیا ہے کہ بغیر تذکرۂ اسم ایرادِ ضمیر کوئی قابلِ ستائش چیز نہیں ہے، اور اگر کلام میں اسم کا سرے سے ذکر ہی نہ کیا جائے اور صرف ضمیر ہی سے کام لیا جائے تو ایسا بیان بعض اوقات مُہملیت کی حد میں جا پڑتا ہے۔

مرقومہ شعروں میں کہیں اسم "خدا" یا اس کا کوئی مترادف لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے، اس لئے چوتھے شعر میں "تیری" کی ضمیر سے "خدا" مراد لے لینا خلافِ بلاغت ہے۔

(۲) چونکہ غزل کے عنوان میں لفظ "فطرت" استعمال کیا گیا ہے اس لئے "تیری" کا مرجع بالبداہت "فطرت" ہی سمجھ میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے مضمون میں دو سُقم ہیں، اوّل یہ کہ "فطرت" چونکہ ذوی العقول میں سے نہیں ہے، اس لئے اُس کو "عذاب و ثواب" سے کیا تعلق؟ دوسرے "عذاب و ثواب" وہ خصوصیات ہیں جو عُرفِ شرع میں جنابِ ربُّ العزّت کی طرف منسوب ہیں "فطرت" بیچاری کو اس میں کیا دخل ہے؟۔

ع "نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عذاب تیرا" پر جنابِ آثرؔ کی گرفت نہایت معقول ہے اور بلاشبہ حضرتِ سیمابؔ ادائے مفہوم میں ناکامیاب رہے ہیں۔

حضرتِ آثرؔ کی اصلاح ؎ عذاب ہو یا ثواب دونوں تری عطا کردہ نعمتیں ہیں۔
نہ مجھکو قابو ترے کرم پر نہ میرے بس میں عتاب تیرا ؛ ہمیں کچھ کہنے پر مجبور نہیں کرتی۔

اب رہی حضرتِ ضیاؔ کی معذرت۔ تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اُس پر توجہ کرنے کی سفارش کرتی ہو۔ بلکہ اگر خوردہ گیر ناظرین کا ڈر نہ ہوتا تو ہم تو یہ بھی نہیں کہنا چاہتے تھے کہ کوئی چیز مابعد ہستی واقع ہونے کی وجہ سے نعمت کی حد سے ہی خارج ہو جاتی ہے۔

اس نظریئے میں سب سے بڑی خرابی اور قابلِ اختلاف عُنصر یہ ہے کہ ہماری نہایت ہی مقبول و مرغوب شے "قلاقند" (اور وہ بھی "نیکا" کی دوکان کی) نعمت نہیں ٹھیرتی۔ ناصاحب! یہ بات تو محقق طوسی بھی نہیں مانے گا۔

اب رہا معیارِ مقررہ پر پورا اُترنا تو اُس کے متعلق ہم ایک صلح کل مسلک عرض کئے دیتے ہیں کہ اگر کوئی "شاعرِ اعظم" یہ سمجھتا رہے کہ اُس کو ہر شعر خدا کراتا ہے تو اِس سے ہمارا کیا نقصان ہے۔ ہم اور تمام عالم اچھے شعر کو تحسیناً الہامی ہی کہیں گے۔ اور ایسے اشعار کو جو "بڑے الہامی ہی" ہوں کسی کے بھی کہنے سے الہامی نہ مانیں گے۔ پانچویں شعر ؎

ترے جلال و جمال ہی سے ہے اعتدالِ مزاجِ عالم + کبھی غضب بے پناہ تیرا کبھی کرم بے حساب تیرا

میں حضرتِ آثرؔ کی رائے قابلِ اتفاق ہے : "بے پناہ غضب" اور "بے حساب کرم" سے "مزاجِ عالم" کے "اعتدال" کو کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔

اب رہا جنابِ ضیاؔ کا دونوں مصرعوں میں ربط پیدا فرما دینا، تو ماشاءاللہ آپ نے "علامہ" کی طرفداری میں ایک اصول سے کام لیا ہے۔ اور مُدلّل حمایت فرمائی ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ جنابِ ضیاؔ نے مصرعۂ ثانی میں لفظ "کبھی" کو معلوم نہیں حضرتِ سیمابؔ کا نہیں سمجھا ہے یا خدا جانے اور کس وجہ سے نظر انداز فرما دیا ہے۔ ہم تو بحیثیت "ناظرِ کلیم" ہونے کے جنابِ سیمابؔ کے مصرعۂ ثانی کا یہ مطلب سمجھے ہیں کہ خدا کے "غضب بے پناہ" اور "کرمِ بےحساب" میں بے قیدِ بُعدِ زمانی کا ذکر ہے، یعنی اگر اُس نے ۱۸۵۷ء میں اپنا "غضب بے پناہ" نازل فرمایا اور ۱۹۳۶ء میں اپنا "کرمِ بےحساب" ظاہر کیا تو غریب ۱۸۵۷ء والوں پر تو جو کچھ گزرنا تھی گزر چکی، البتہ ۱۹۳۶ء والے فائدے میں رہے۔ ہمارا منشا یہ ہے کہ اس مصرعے میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو یہ ثابت کرتا ہو کہ جس وقت "غضب بے پناہ" نازل ہوتا ہے اُسی وقت کرمِ بےحساب بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایسا لفظ موجود ہوتا تو "اعتدالِ مزاجِ عالم" پر اعتراض جب نہ ہو سکتا۔ ہمیں اُمید ہے کہ جنابِ ضیاؔ مصرعۂ ثانی کے دونوں "کبھی" پر غور فرما کر دونوں مصرعوں میں ربط اور مفہوم میں صداقت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس کا ہم پہلے ہی نیازمندانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مردِ مُضحک

اسرائیل احمد خان

یہ ایک عجیب پُر دہشت دانت پیسنے کی سی آواز تھی جو تاریکی سی سُنائی دی۔ ناممکن تھا کہ کوئی شخص اُسے سنتا اور بے اختیار پیچھے نہ ہٹ جاتا! مگر، بالکل خلافِ توقع، بچہ آواز ہی کی سمت آگے بڑھا! پُر ہَوْل تاریکی اور لاعلاج خاموشی جس روح کے لیئے عذابِ جان بنجائے وہ شاید ہی آواز کو جو اِس مُہرِ سکوت کو توڑے "خوش آمدی" کہنے کے لیے تیار ہوجائیگی! خندۂ صبحِ قیامت ہی سہی!

جو شے اک خطرہ معلوم ہوئی تھی وہ نجات کا سامان ثابت ہوئی! یہاں آخرکار اک ذی روح وجود موجود تھا، جو جیتا بھی تھا اور جاگتا بھی! — اگرچہ وہ محض ایک بھیڑیا تھا!

بچے نے مزید پیشقدمی کی۔ اک دیوار کے گوشے پر وہ رُکا اور پسِ دیوار اُس فضائی تنویر میں جو برف و بحر کے انعکاس سے پیدا تھی اس نے ایک چیز دیکھی جو نہ معلوم کوئی جھونپڑی تھی یا گاڑی! . . . . .

. . . ہاں، اس میں پہیئے بھی لگے تھے اور بظاہر گاڑی ہی تھی۔ اچھا، اس میں چھت بھی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کا مسکن بھی ہے! چھت میں ایک چمنی تھی جس میں سے دُھواں نکل رہا تھا۔ پیچھے کی طرف اک دروازہ تھا جس کے کواڑ میں اک مربع شکل کا رَوزن سا کٹا ہوا تھا۔ اس میں سے ہوکر اندرونی آگ کی روشنی آرہی تھی۔

بچہ قریب آیا۔ جو چیز خفا ہوئی تھی وہ اب غضبناک ہوئی! اُس کی غُراہٹ اک گرج میں تبدیل ہوگئی! حیوانی خبث و خیز سے اک آہنی زنجیر کا جھٹکا اور جھنکار سنائی دی! گاڑی کے دروازے کے نیچے بچے نے دیکھا کہ دو قطاریں سفید تیز دانتوں کی نمودار ہوئیں!

مگر ساتھ ہی دروازے والے دریچے سے اک انسانی سر نکلا۔ جس نے کہا "چُپ، چُپ"! اور معًا خاموشی چھاگئی!

"کوئی ہے وہاں؟"

"جی!" بچے نے تائید کی۔

"کون ہے؟" سر نکالے ہوئے آدمی نے مکرر سوال کیا۔

"میں ہوں"! جواب دیا گیا۔

"تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" مزید استفسار ہُوا۔

"میں اک بہت ہی تھکا ہارا لڑکا ہوں!"

"تمھیں معلوم ہے یہ کون وقت ہے؟!"

"مجھے کیا خبر! — میرے ہاتھ پاؤں برف ہورہے ہیں۔ اور ہوش و حواس گم!"

"تم وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

"میں بہت بھوکا اور مدد کا طالب ہوں!"

"اُمراء کی طرح ہر شخص شکم پروری اور تن آسانی کا مقدور نہیں رکھتا! — چلے جاؤ"!

گاڑی پر سے جواب کریا اور اس کے ساتھ وہ سر پیچھے کی طرف اندر سَرک گیا۔ کھڑکی بند ہوگئی!

بچے نے سر نیچے ڈال لیا! گود کی بچی کو سنبھالا، اک اور منزل
کرنے کا عزم بالجزم کرلیا! اُس نے ابتدائی چند قدم اُٹھا بھی لیئے۔
لیکن اِس اثناء میں، گاڑی کے اندر کھڑکی بند ہو جانیکے
بعد دروازہ کھُلا، اور ایک پائیدان نیچے لٹک پڑا! ساتھ ہی اک غصے
کی آواز آئی: اَیں! تم آتے نہیں ہو؟!
بچہ رُکا، اور "آؤ آؤ" کی پھر تکرار ہوئی! گاڑی والے آدمی
نے کہا: "یہ کون عجیب ہستی ہے جو باوجود تشنۂ دستگیری ہونے کے میرے
پیشکشِ خدمت کو قبول نہیں کرتی"!
بچہ، جس نے وہ "چلے جاؤ!" والا کا سا جواب بھی سُنا تھا
اور پھر بیک وقت یہ "آؤ آؤ" کی دعوتِ شیرین بھی، اس طرفہ طرزِ عمل پر
مبہوت رہ گیا!
"میں تمھیں سے کہتا ہوں، ننھے شیطان! چلے آؤ، چلے آؤ!"
بچہ پُر اُمید ہو کر پاس آیا۔ مذبذب انداز میں اُس نے
پہلے سیڑھی پر قدم رکھا۔ مگر معاً گاڑی کے زیرین حصے سے
اک تند غرغش سنائی دی! بچہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ خوفناک جبڑے
پھر نمایاں ہوئے!
"اس پر ہائیں ہائیں!" کی تنبیہ ہوئی، اور برافروختہ
درندے کا مزاج پھر سکون پر آ گیا۔
"ہاں ہاں! چڑھ آؤ!" اک ہمت آموز آواز اور آئی۔
بچہ بدشواری تمام اوپر چڑھا۔ گود کا وزن بُری طرح
حارج ہو رہا تھا! اندر کسی قندیل کی روشنی نہ تھی۔ صرف آگ کا مدھم
اُجالا تھا، چولھے پر کوئی کھانے کی چیز پک رہی تھی۔ جس کی بھاپ
کی خوشبو بڑی جان نواز محسوس ہوئی! دیواروں پر چاروں
طرف بھانت بھانت کی چیزیں لٹکی نظر آتی تھیں جن میں بعض بالکل
عجیب و نامانوس قسم کی تھیں۔ اور جن کا مصرف اور ضرورت بچے
کے فہم سے بالاتر تھی! ظروف میں مطبخ اور معمل کیمیاوی ہر دو کے
استعمال کی چیزیں تھیں۔ گاڑی کے اندر ہر شئے مبہم و موہوم نظر
آتی تھی! تاہم ہمارے ننھے نو وارد کی مشتاق و متجسس نگاہوں نے
چھت پر کی بخط جلی لکھی ہوئی اتنی تحریر دیکھ لی:

ارسس فلاسفر!

قصہ یہ ہے کہ یہ وہی ارسس اور ہوموہ کی سفری سکونت گاہ تھی! ارسس
تو یہی بڈھا تھا جو اِس وقت بچے سے مخاطب تھا۔ اور ہوموہ وہ تھا جس نے
بچے کی آہٹ اور آمد پر اپنے حیوانی غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا تھا! ع
بچے نے صاحب خانہ کے پورے سراپا کا مطالعہ کیا۔ وہ اک
دراز قامت، منحنی، کہن سال شخص تھا۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو اس کا سر
گاڑی کی چھت سے مَس ہو جاتا تھا!
بچہ اندر داخل ہُوا۔ بڈھے نے کہا: "اپنی گٹھری اُتار کر رکھ دو"
بچے نے بڑی سُبکدستی سے اُس زندہ گٹھری کو صندوق پر رکھا!
"بڑے محتاط واقع ہوئے ہو!" بڈھا بولا، "کمال ہی کر دیا! اگر جواہرات
کی صندوقچی بھی تو ہوتی اُسے بھی رکھنے میں شاید کوئی اِتنی نزاکت سے
کام نہ لیتا! ...... تمھیں یہ خوف تو نہ تھا کہ اگر ذرا جھٹکا لگا تو ان خستہ
و بوسیدہ چیتھڑوں میں ایک چاک اور ہو جائیگا!"
بچے نے ارادۃً اِس ساری تنقید و تقریر کو نظر انداز کر دیا۔ بڈھے
کی زبان پر پھر کلمات کی آمد شروع ہوئی:
"کس بلا کے آوارہ گرد ہو تم کہ رات کی اِس ساعت میں کوئے
شب گردی کر رہے ہو! اُو ہُو، تم ہو کون؟ .... مگر نہیں نہیں، تم یہ
زحمت ابھی نہ اُٹھاؤ! پہلے ذرا آگ تاپ لو! تم بالکل یخ ہو رہے ہو!
اُفوہ! تمھارے کپڑے کتنے تر بتر ہیں! اُتارو انھیں مردے آدمی! بچ گئے بچہ
نہیں تو فالج گرنے میں کوئی کسر رہی نہ تھی! کم از کم اس مرتبہ تو تمھارے

ع یہ حوالہ قارئینِ کلیم کی سمجھ میں نہ آئیگا! "مردِ مضحک" کی اشاعت
بصفحاتِ کلیم، کے متعلق اک مضحک حقیقت یہ ہے کہ اُس کا بابِ اول بوجوہ خاص
حذف کر دیا گیا تھا! یہاں اِس تلمیح کا مشارٌالیہ اسی حصہ کا اک بیان ہے!
ارسس اک مردم بیزار فلسفی ہے۔ اور ہوموہ اس کا رفیق و ہمراز بھیڑیا ہے
اور ہمدرد ہمجان! ہوموہ اے حضرت گرگ
داد داب تم کو ہمارا ہو تمھارا ہم کو! ---- مترجم

ہاتھ پاؤں قابلِ استعمال رہ گیئے! شکر کرو!"

بڈھے نے بچے کو خود اٹھا کر آگ کے پاس بٹھا دیا "نارِبہشت" تھی جس سے بچہ سنک رہا تھا، اور جو اُس کے جسمِ جامد کے اندر از سرِ نو حرارتِ حیات نفوذ کر رہی تھی!

اک بڑی گرم قمیص بڈھے نے کھونٹی پر سے اُتاری اور بچے کو دی۔ بچے نے اسے پہن لیا۔ جس کے اوپر بڈھے نے اک اور جیکٹ اُڑھا دی بچے کو اک اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا جس کی اُس نے تعمیل کی۔ پھر بڈھے نے اس تمہید کے ساتھ کہ "ہاں تم بھوکے ہو، کچھ کھا لو" سخت روٹی کی اک قاش مع چھری کانٹے کے بچے کے حوالے کی۔ بچے نے تھوڑا تامل کیا۔ مگر بالآخر گاڑی کے اندرونی حصے کی عجیب فضا (جس کے مطالعے میں وہ مستغرق تھا) کی جاذبیت پر گرسنگی کی شدت غالب آئی۔ اور اس نے کھانا شروع کیا۔

بچہ کھا نہیں رہا تھا، نگل رہا تھا! وہ گھبرا گھبرا کر نوالے بناتا اور براہِ راست انھیں حلق میں منتقل کر دیتا!

"ذرا دیکھ بھال کے! ذرا ہوئے ہوئے"! بڈھے کی چاشنیٔ سخن نے لقمہ دیا۔ ایسی وحشیانہ بلانوشی سے نہ کھاؤ، ورنہ فاقہ کشی سے بھی زیادہ اندیشناک کوئی صورت پیدا ہو جائیگی! کبھی تم نے اُمراء کو خاصہ تناول فرماتے ہوئے شاید نہیں دیکھا ہ؟ میں اُن کے الوانِ نعمت اور اُن کے فنِ نقل کا عینی شاہد رہا ہوں! واقعہ یہ ہی کہ اُن کے کھانے کے پُرتکلف انداز پر "کھانے" کے ثقیل لفظ کا اطلاق ہو نہیں سکتا! اب تم ذرا اپنا "ٹھوسنا" بھی دیکھو!

لیکن بچہ اپنے عملِ تغذیہ میں ایسا بطرح منہمک تھا کہ دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو رہا تھا! اس درجہ خلوئے معدہ میں کانوں کی سماعت بھلا کہاں باقی رہتی ہی کہ آدمی کچھ سُن بھی سکے!!..... چنانچہ بڈھے کی تنبیہ سب نذرِ تغافل ہو گئی۔ اِس وقت صرف غذا اور آگ بچے کا مایۂ حیات تھیں جن سے لطف اندوز ہونے میں اُس کی ہستی کا سارا شعور جذب ہو رہا تھا!

یکبارگی رونے کی اک ننھی سی آواز آئی!

"ایں، یہ کیا! کیا تم روتے ہو؟ یہ کیوں!" بڈھے کے مسلسل منکشفانہ سوالات تھے۔

بچے نے مُڑ کر دیکھا۔ یہ اس کی آواز نہ ہو سکتی تھی، اس لیئے کہ اس کا منھ نوالے سے اٹا ہوا تھا!

اتنے میں پھر چلانے کی آواز سنائی دی!

معاً بڈھے کی توجہ صندوق کی طرف منعطف ہوئی۔ "اچھا! یہ تمہارا بنڈل چلا رہا ہی!"

وہ بولا، "یہ عجیب بجتا ہوا پارسل ہی! کیا آسیب اس میں چھپا لائے ہو؟"

بڈھے نے کپڑا ہٹایا تو اک ننھے بچے کا سر نمودار ہوا! منھ کھلا ہوا تھا، اور حلق ننھے نعروں کا مخرج بنا ہوا تھا!

"اچھا، یہ بات؟!...... کوئی سپاہی ہی یہاں؟ ذرا ادھر تو آنا! ...... یہ لو، یہ اک اور شگوفہ! نہ معلوم یہ سلسلہ کب ختم ہوگا!..... ابے او چھوٹے! یہ کیا بلا میری جھونپڑی میں لے آیا ہی! لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃ!

بچہ قطعاً دم بخود و مبہوت رہا! بڈھے کا سلسلۂ تکلم پھر جاری ہو گیا!

"خوب، یہ لڑکی ہی! اُوہ، وہ پیشاب میں نہا گئی ہی!"

بڈھے نے بچی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اور پھر ایک گرم اور خشک اور صاف کپڑا نکالا۔ بچی کے بدن سے اس کے چیتھڑے الگ کیے اور نئے کپڑے میں اسے لپیٹا۔ اس عاجلانہ تبدیلِ لباس پر بچی کو ناگواری کا احساس ہوا، اور زور سے اک چیخ مار کر اُس نے صدائے احتجاج بلند کی! پیری نے تھپک کر کم سنی کے غصے کو ٹھنڈا کیا!

اب بڈھا اک شیشی اور اک اسفنج کا ٹکڑا لے آیا۔ چولھے پر سے دودھ لے کر اُسے شیشی میں بھرا، پھر اسفنج کو شیشی کے گلے میں فٹ کیا، بعد ازاں شیشی کی بیرونی سطح کو بچی کے رُخسار سے مَس کر کے اطمینان کیا کہ دودھ زیادہ گرم تو نہیں ہی۔ ان سارے مراتب کے بعد اس نے اسفنج کو بچی کے منھ میں دیدیا

شیشی منھ سے لگتے ہی بچی جلدی جلدی پینے لگی! نہ معلوم یہ معصوم و یتیم جان کب سے اپنی ماں کے سینے کی سیرابی سے محروم تھی۔ اُس نے ایسے اوپر نیچے گھونٹ لیئے کہ اُسے اُچھو ہو گیا!

"معلوم ہوتا ہی تم اپنے کو مار دو گی! تم بھی اپنے رفیق ہی کی طرح بیٹیو ہو!" شیشی کو بچی کے منہ سے ہٹاتے ہوئے بڈھے نے کہا۔

تھوڑی دیر میں بچی کی کھانسی دَب گئی، اور مصنوعی رضاعت کا عمل پھر شروع ہوا۔ بچے نے ننھی کی اس دلیرانہ شیر نوشی سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اُس کے تماشے میں وہ ایسا محو ہوا کہ اپنی پُرخوری بھول گیا! وہ اب شکم سیر بھی ہو گیا تھا۔ لیکن یہ نظارہ اُس کے لیے غذائے روح کا سامان بنا! بچی کے گلے سے دودھ اُتر رہا تھا، اور بچے کی آنکھوں سے اک قلبی اطمینان مترشح ہو رہا تھا! اسی اثناء میں بچی کی نظر مہربان بڈھے پر پڑی اور شکریہ کے اک معصومانہ تاثر سے وہ آبدیدہ ہوگیا!

بچے نے بڈھے کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ بڈھے نے سیر چشمی سے کہا: "تم کھاؤ، تمھارا کھانا مقدم ہی۔ یہ کھانا اتنا نہیں کہ میں بھی شرکت کر سکوں" مگر بچے نے اصرار کیا، اور دو طرفہ تکلفات کا رَدّوبدل دیر تک جاری رہا۔ آخر بڈھے نے اپنی ضیافت میں "گرستانی ستم میرسدؔ" کی شان پیدا کرتے ہوئے کہا "کھاتے ہو تو کھاؤ، ورنہ تم دونوں کو ابھی گاڑی سے باہر کر دونگا"!

ناچار بچے نے اپنے جذباتِ فیاضی و قربانی کو تہ کر کے رکھ دیا، اور بقیہ کھانا خود ہی چند ہاتھوں میں صاف کر گیا۔

ارجسس کا مکان طوفانِ برف و باد کے مقابلے کے لیے پوری طرح مامون و مصئون نہ تھا۔ خاص طور پر ایک کھڑکی کے شیشے ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ ایک گوشے میں سَرد ہوا کی یورش کا نشانہ بن گیا تھا۔ اِس وقت بھی گاڑی کے مکین اس کے اِس نقص کی قباحت کو محسوس کر رہے تھے۔

بچی بڈھے کی گود میں پڑی ہوئی ایسے مزے سے دودھ پی رہی تھی کہ گویا وہ ماں کے سینے پر ہو! لیکن بڈھے نے اب دودھ کی شیشی ہٹا لی اور کہا "اب بس کرو! کھانے کا دوسرا وقت بھی آئیگا! اُوہ، کم بخت سب سونگھ گئی"!

بڈھے نے صندوق کھولا، اور بھیڑ کی ایک پوستین نکالی، جسے، یاد ہوگا کہ، وہ اپنی ذاتی جلدِ بدن کہا کرتا تھا! بچی کو گود میں لیئے لیئے اُس نے اِس کھال کو صندوق پر بچھایا۔ اور اِس تمام نشست و برخاست میں اُس نے اپنی حرکات و سکنات میں ایسا توازن قائم رکھا کہ بچی ذرا بھی کل دھوئی! جب بستر درست ہوگیا تو اُس نے بچی کو آہستہ سے اُس پر لٹا دیا۔ پہلو میں تھوڑے ہی فاصلے پر آگ جل رہی تھی جس کا اک نہایت نرم گرم سینک بستر کو لگ رہا تھا۔

"میں پیاسا ہوں!، اگر تھوڑا پانی عنایت ہو جائے؟" بچہ بولا۔

برتن میں گھونٹ دودھ کی باقی تھی۔ بڈھے نے اُس کی طرف اشارہ کیا اجازت پاکر بچے نے برتن کو منہ سے لگایا ہی تھا کہ اُس کی نظر بچی کے ہونٹوں پر پڑی جو کچھ لرزش میں تھے۔ بچے نے فوراً دودھ پینا موقوف کر دیا۔ بچی کی شیشی اٹھالی اور دودھ اس میں ڈال دیا، جس سے وہ لبالب بھر گئی۔ کاک اور سفنج فٹ کیا اور شیشی کو بچی کے منہ میں لگا دیا۔

خود بچے نے بجائے دودھ کے اک دوسرے برتن میں رکھے ہوئے تھوڑے پانی سے پیاس بجھائی۔ آگ کی قربت کی وجہ سے یہ پانی شیر گرم ہوگیا تھا۔ گرداگرد کی برفستانی فضا اور زمہریری ہوا میں پانی کے اس غیر متوقع درجۂ حرارت کو دیکھ کر بچے نے اپنے دل میں اک معنی خیز تمثیل کہی

"اے پانی! تو جو اپنی صفائی میں اتنا مصفا معلوم ہوتا ہی،
دنیا کے ریاکار و ظاہر دار دوستوں کی طرح ہی جو اوپر سے
گرم جوش ہوتی ہیں اور تہ (دل) میں سرد مہر،"

(۶)

بچے کی گود میں چند ریزے روٹی کے ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ اُس نے اُن کو بھی چُن لیا اور سب کا ایک لقمہ کر گیا!

"اچھا، اب کھانا ختم ہوا، کچھ باتیں بھی ہونی چاہئیں!" بڈھے نے آخر بچے کو چیلنج دیا، "زبان تنہا کھانوں کے مزے لینے ہی کے لیے نہیں ہے اس کا کام کچھ "چاشنیٔ سخن" بھی ہی! ہماری زبان کو اب اپنا دوسرا کام بھی کرنا چاہیئے۔ اور بسم اللہ اس طرح ہو کہ میں کچھ سوال کرتا ہوں، تم اُن کے صاف صاف جواب دیتے چلے جاؤ! اچھا، میرا پہلا سوال یہ ہی کہ:

"تم کون ہو؟"

"میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں" بچے کا جواب تھا۔

"اس کے کیا معنی ہیں؟"

اسی شام کو میرے رفیقوں نے مجھ سے بیوفائی کی اور مجھے تن تنہا چھوڑ دیا!"

"اچھا مجھیں اپنا نام معلوم ہے؟ تم کس قدر بے مصرف اور ناکارہ آدمی تھے کہ تمھارے رشتہ دار تم سے اس درجہ بیزار تھے کہ اس طرح تم سے پیچھا چھڑا لیا"

"میرے کوئی رشتہ دار نہیں ہیں، جناب!"

"اب مجھے اتنا پاگل تو نہ بناؤ! بہت ہی حرفوں کے بنے معلوم ہوتے ہو! تمھارے رشتہ دار نہیں ہیں؟ کم از کم ایک بہن تو تمھارے پاس ہی موجود ہے!"

"یہ میری بہن نہیں ہے حضرت!"

"ایں؟!..... پھر یہ کون لڑکی ہے؟"

"معلوم نہیں کون ہے، مجھے تو رستے میں پڑی ملی!"

"پڑی ملی؟"

"جی پڑی ہوئی!"

"اچھا کہاں؟... سچ سچ بتانا، ورنہ تم دونوں کو ابھی نکال باہر کر دوں گا!"

"ایک مردہ عورت کے سینے پر، جو برف میں دبی ہوئی تھی!"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"کوئی ایک گھنٹہ ہوا۔"

"کس مقام پر؟"

"یہاں سے کوئی ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔"

ارسس کے چشم و ابرو پر وہ نقشہ پیدا ہوا جو کسی فیلسوف کے خط و خال پر اُس وقت نمودار ہوا کرتا ہے جب کہ احیاناً وہ کسی قلبی جذبے سے متاثر ہو جاتا ہے!

"یہ جگہ کس سمت میں ہوگی؟" بڈھے نے آخری فیصلہ کن استفسار کیا

"سمندر کی طرف!"

بڈھے نے پشت کی کھڑکی کھولی، اور اس موقعے کا تعین و تخمینہ کرنا چاہا۔ مگر دھواں دھار برفباری کے اعادے سے سارا منظر بھر ناقابلِ مشاہدہ ہو گیا تھا! بڈھے نے کھڑکی بند کر لی۔

اب اُس کی توجہ کو بچے نے پھر منعطف کرنا شروع کیا۔ اُس نے اُس کے واسطے اک چھوٹا سا نرم و گرم بستر مع ایک تکیئے کے بڑی لذت و دلچسپی سے تیار کیا اور بچی کو اُس پر لٹا دیا جو اب بھی سو رہی تھی۔ بچے کو بھی ننھی کے پہلو میں لیٹ جانیکا حکم ہوا جس کی تعمیل کی گئی۔

اس انتظام سے فارغ ہو کر ارسس نے اک گرم کپڑے کی پٹی کھونٹی سے اُتاری، اور اُسے اپنی کمر میں باندھ لیا۔ اس پٹی میں اک بڑی جیب سی تھی، جس کے اندر غالباً آلات کی ایک ڈبیہ اور بعض مقویات کی شیشیاں تھیں! اس کے بعد ارسس نے اک دھندلی اندھی سی لالٹین جلائی، اور بچے سے مخاطب ہو کر کہا:

"میں تھوڑی دیر کے لیئے باہر جاتا ہوں۔ ڈرنا مت! جلدی لوٹ آؤنگا!.... اچھا، اب تم سو جاؤ!"

بڈھے نے پائیدان سے اُتر کر ہومو کو آواز دی، جس نے فوراً اس کا جواب اک محبت ریز غرّاہٹ سے دیا۔ بڈھے نے چلتے ہوئے کہا

"بچو! تم میرا کھانا تو سب کھا گئے، اب بولو سو گئے ہو نا؟"

"جی نہیں جناب!" بچے کی بیدار آواز اندر سے آئی۔

"اچھا، اگر بچی پھر روئے تو باقی دودھ بھی اُسے دیدینا!"

اس گفتگو کے بعد گاڑی کے اندر لیٹے ہوئے بچے کو انسانی چاپ اور حیوانی رفتار کی مخلوط آواز سنائی دی، جو تھوڑی دور جا کر گم ہو گئی!

دونوں بچے گہری نیند میں پہنچ گئے!

(۷)

بیداری اور اک عجیب مکان کی قیدِ تنہائی!

رات گزر گئی۔ صبح کاذب صبح صادق سے، اور صبح صادق روزِ روشن سے بدل گئی۔ بچے کی نیند کم و بیش اُچٹتی ہوئی سی رہی تھی۔ آخر اک تیز شعاع کھڑکی کے شیشے سے آئی اور بچے کی آنکھوں کا چراغ ٹمٹمایا! بچوں کی نیند صرف رفع تکان ہی نہیں کرتی، رفع افکار بھی کر ڈالتی ہے! وہ اعضا شکنی ہی کو دور نہیں کرتی، لوحِ دماغ کو بھی دھو ڈالتی ہے! چنانچہ ہمارے ننھے ہیرو کے گزشتہ واردات و تجربات کے سارے نقوش حافظے کی

محو ہو چکے ہیں۔ وہ اک خود فراموشی اور نیم خوابی کی حالت میں گاڑی کے اندر پڑا ہوا ہی اور اُس کی پُر اسرار فضا میں مبہوت ہو ہو کر اُس کے در و دیوار کو تک رہا ہی! اس پر تحیّر نظارہ میں وہ چھت کے کتبے ـــ ارشس فلاسفر ـــ کو دیکھ کر اور بھی غرقِ حیرت ہو گیا! وہ چونکہ ناخواندہ تھا اس لیے اس تحریر کی قرات و تعبیر سے قاصر رہا، تاہم اپنی فطری فراست سے اُس نے اتنا اندازہ ضرور کر لیا کہ تمام نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ میں چھت کے وسط کے یہ دو مختصر کلمات، قلب کی حیثیت رکھتے ہیں!

یکبارگی کسی قفل کے شکم میں کنجی کی گردش کی آواز بچے کو سنائی دی۔ وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ ارشس واپس ہوا تھا! ہمزاد ہوموبھی ہمرکاب تھا!

ہوموگاڑی میں داخل ہوا اور صندوق پر لیٹے ہوئے نئے مکینوں کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اُس نے اُن کی بُو سونگھی اور پھر کچھ متامل ہو کر اندر آ گیا۔ بچہ فوراً پوستین پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا، اور سوتی ہوئی بچی کے آگے سینہ سپر ہو کر ڈٹ گیا! مگر اک حیوان کے متعلق اک انجان انسان کی یہ اک بے محل بدگمانی تھی!

ارشس نے بجھی ہوئی لالٹین کھونٹی پر ٹانگ دی، اور کمر سے پیٹی کھول کر الماری میں رکھ دی۔ اُس کی آنکھیں اک خاص جذباتی انفعال کی آئینہ دار تھیں! اُس کے اعماقِ قلب میں کوئی چیز متموّج نظر آتی تھی! آخر حسبِ عادت اُس کے واردات دل و دماغ اک سیلابِ الفاظ بن کر بہ نکلے:

"واقعی مُردہ! مثلِ جمادات کے مُردہ!! اور بلاشبہ خوش قسمت!!! ..... مجھے ڈھونڈھنے میں بہت دِقت اٹھانی پڑی۔ مصائبِ مقدّرہ کے مخفی ہاتھ نے اُسے دو فیٹ گہرے برف کے نیچے دفن کر دیا تھا! اگر ہومو نہ ہوتا تو ابھی میں وہیں سرگرداں پھرتا ہوتا۔ ہومو نے کولمبس کی سی اکتشافی بصیرت کا ثبوت دیا! اُس نے اپنے آلۂ شامہ سے بحری قطب نما کا سا کام لیا! .... اُف! اس کی نعش کیسی برف ہو رہی تھی! میں نے اُسے ہاتھ لگایا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بستہ پتھر کی سِل سے وہ مَس ہوا ہو!

...... خیر جو ہوا سو ہوا، میری جھونپڑی اک چھوٹے سے کُنبے سے بس گئی!"

ہومو چولھے کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ بچی کا ہاتھ صندوق سے لٹکا پاکر وہ اسے چاٹنے لگا، اور ایسی نرمی اور آہستگی سے کہ بچی کو نیند میں مطلق خبر نہ ہوئی۔ ارشس نے ہومو کی اس کارروائی کو دیکھ پایا اور خوش ہو کر بولا:

"شاباش ہوموشاباش! بس میں باپ ہونگا اور تم چچا! تھوڑی دیر آگ فلسفیانہ احتیاط سے مرتب کر کے، اور ہومو کی طرف ایک دفعہ اور متوجہ ہو کے، "ہاں ہاں! بس گود لینے کی تجویز اب طے شدہ ہی! ہومو برضا و رغبت تیار ہی!"

اس راز و نیاز کی گفتگو مابینِ حیوانِ ناطق و حیوانِ مطلق پر ارشس نے بچے کے منھ پر کچھ ہنسی دیکھی۔ اُس نے شوخی کش سنجیدگی سے پوچھا:

"کیا تم ان باتوں کی ہنسی اڑاتے ہو؟"

"نہیں!" بچے نے اظہار برا ءت کیا۔

"پھر کیوں ہنستے ہو؟"

"میں نہیں ہنستا!"

"اچھا، آئندہ سے ہنسی کا کوئی موقع نہیں! خبردار رہو!"

"میں پہلے بھی نہیں ہنسا تھا جناب!"

"مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ تم یقیناً ہنس رہے ہو"! بچے کا منھ بغور دیکھ کر

"حضرت! میں مطلق نہیں ہنس رہا ہوں!"

دفعتہً ارشس کے دل میں اک خاص خیال القا ہوا۔ عاجلانہ قدم بڑھا کر وہ بچے کے نزدیک آیا، اور ترحّم آمیز انداز میں اُس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا!

"یہ کام تمھارے ساتھ کس نے کیا؟"! اُس نے پوچھا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"یعنی تمھارے چہرے پر یہ ہنسی کا نقشہ کب سے اور کس کے ہاتھوں بنا دیا گیا ہی"! بُڈھے نے وضاحت کی۔

"میں تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہوں"! بچے نے متحیرانہ کہا۔

ارشس کے منھ سے زیر لب آواز میں یہ الفاظ نکلے:

"میں سمجھتا تھا اب یہ کارروائیاں قصۂ ماضی ہو چکی ہیں۔ مگر نہیں!"

اُس نے صندوق پر رکھی ہوئی اک کتاب آہستہ اٹھائی،

جو بطور تکیئے کے بستر پر رکھ دی گئی تھی۔ ارسٹس نے تھوڑی دیر اس کتاب کی ورق گردانی کی، اور سرسری طور سے دو تین مقامات کا مطالعہ کر کے اپنی یکسوئی و اطمینانِ دلی کا اظہار کیا۔ اُس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے:

ہم کو اس معاملے میں زیادہ درپے کاوش ہونے کی ضرورت نہیں (بچے کی طرف دیکھ کر) اچھا بچہ! ہنسے جاؤ! تمھارا کیا قصور ہے!"

اِس لمحے میں بچی جاگ اُٹھی، اور اک ننھی سی چیخ مار کر اپنا صبح کا سلام کیا! ارسٹس نے فوراً دودھ کی شیشی کا "مصنوعی سینہ و پستان" اس کے منھ میں دیدیا!

اب آفتاب بلند ہو چکا تھا۔ اُس کی سرخ کرنیں کھڑکی کے ٹوٹے کانچ میں سے ہوکر اندر آنے لگیں۔ بچی کے چہرے سے جب وہ مس ہوئیں تو اُس کا منھ از خود سورج کی طرف پھر گیا! قرصِ آفتاب دونوں آنکھوں کے آئینوں میں منعکس نظر آتی۔ مگر آنکھوں کے غلّے بالکل غیر متحرک رہے! پپوٹے بھی ساکن رہے!

"تم سمجھے؟" ارسٹس نے بچے سے کہا، "اس کی آنکھیں جاتی رہی ہیں!"

افسوس!　وہ بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو کچھ یاں نہ تھا ایک فقط دیکھنا!

تلاشِ مسرت

گلوں کی بو میں فضائے بہار میں دیکھا
ہر ایک دشت ہر اک کوہسار میں دیکھا
ریاضِ حُسن کی رنگین کوپلوں میں کبھی
کبھی کسی کے دلِ بیقرار میں دیکھا
سوادِ شام کی زرین صباحتوں میں کبھی
تجھے کبھی سحرِ حسن بار میں دیکھا
رو پہلے چاند کی معصوم ننھی کرنوں میں
حسین تاروں کی روشن قطار میں دیکھا
غرض کہ سارے زمانے میں کی تلاش تری
بساطِ دہر کے ہر تار تار میں دیکھا

مگر ملی نہ مجھے ہاں، وہ زندگی نہ ملی
تلاش جس کی تھی مجھ کو وہی خوشی نہ ملی

میں نا اُمیدی کے لے کر اُلٹے آئی ہوں
میں تجھ سے حالِ دلِ زار کہنے آئی ہوں
الٰہی! میرے لیے کیا یہاں خوشی ہی نہیں؟
تو کیا میں غم ہی کے دریا میں بہنے آئی ہوں؟
گماں یہ ہے کہ تقدیر میں نہیں ہے خوشی
خیال یہ ہے کہ دکھ درد سہنے آئی ہوں

تو کیا زمانے میں اک میں ہی وہ نرالی ہوں؟
کہ رنج و غم سے بھری ہوں خوشی سے خالی ہوں

الٰہی! مجھ کو خوشی کی مسرتیں دیدے
عزیز ہوں جو تجھے بھی وہ نعمتیں دیدے
مری نظر میں خوشی زندگی کا مقصد ہے
حصولِ مقصدِ ہستی کی قوتیں دیدے
اگر ہے غم ہی مقدر تو پھر زراہِ کرم
خوشی سے غم کو بدل دیں وہ ہمتیں دیدے

ملے جو خار بھی مجھ کو تو پھول ہو جائے
الٰہی! میری تمنا قبول ہو جائے

(از گوہر اقبال حور زبیری صاحبہ نائب ایڈیٹر خاتون مشرق)

گم کردۂ راہِ عاشقی

فصلِ گل تھی اور صحرا مست تھا مدہوش تھا
ایک چشمہ تھا جسے بہنے کا اپنے ہوش تھا

خاک کے بستر پہ سبزہ نیند میں کھویا ہوا
سبز چادر میں حسین جیسے کوئی سویا ہوا

تھا بلندی پر تکبر سرو قد اشجار کو
چپ لگی تھی فکرِ کاوش میں زبانِ خار کو

پھول تھے اپنی جوانی کے غرورِ ہوش میں
زندگی خاموش تھی اس عالمِ خاموش میں

اس کا سناٹا نہ تھا فطرت کے لب پر آہ تھی
اِس فضا میں ایک زاہد کی عبادت گاہ تھی

اِس قدر تھی آرزوئے دیدِ ربانی جسے
وجہِ تخریبِ نظر تھی شکلِ انسانی جسے

سربسجدہ فکرِ انجام جبین سائی میں تھا
اُس کا گم گشتہ خدا جنگل کی تنہائی میں تھا

خامشی پر چہچہوں کے تیر برساتا ہوا
ایک طائر آنکلتا تھا کبھی گاتا ہوا

جس کا نغمہ شغلِ زاہد میں خلل انداز تھا
اُس کی اگلی زندگی کی بازگشت آواز تھا

یاد آتی تھی بہارِ آشیاں بھولی ہوئی
ذہن کر دیتا تھا حاضر داستاں بھولی ہوئی

چھین لی اک بے خبر نے بیخبر کی زندگی
وہم پر قربان کر دی مشتِ پر کی زندگی

چپ ہوا طائر فضائے دشت تھرانے لگی
گوشِ نامحرم میں اک آوازِ غیب آنے لگی

دور ہے تجھ سے بہت امیدگاہِ عاشقی
کس اندھیرے میں ہے اے گم کردہ راہِ عاشقی

اک نفس اُس کا مقدس تھا ریاضت سے تری
اُس کی اک چہکار بہتر تھی عبادت سے تری

تیرا سجدہ عرش کا پایہ ہلا سکتا نہیں
تو مجھے او بے نیازِ درد پا سکتا نہیں

نجم آفندی اکبرآبادی

ایک مکالمہ

جوش ملیح آبادی

صغیر ——جب دیکھیے آپ ہندو مسلم اتحاد ہی کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔

کبیر —— تو کیا ہندو مسلم نفاق کے خواب دیکھا کروں؟

صغیر آپ تو شدت کے ساتھ جذباتی قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں آپ ہندو کو نہیں پہچانتے۔ ہندو مسلم اتحاد ایک خواب ہے، جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

کبیر آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں؟ اس زمانے میں جو ہندو مسلم کشاکش ہے، اس پر نہ جائیے، اُن کی بنیاد سخت کھوکھلی ہے۔ اور یہ ابر غلیظ بہت جلد چھٹ جائیگا۔ کل ہی ہندو مسلم شیر و شکر تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور دو شریف بھائیوں کی طرح دوش بدوش زندگی بسر کرتے تھے۔

آج اِن میں جو آویزش نظر آرہی ہے، اُس کے علم سے آپ بھی واقف ہیں، اور میں بھی —— اِس کے علاوہ جب قدرت دو گروہوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے، تو ابتدا میں اُن کے درمیان اِس نوع کی آویزشیں شروع ہو جاتی ہیں۔

میں تو اس جنگ کو مستقل صلح کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں —کیا آپ نے نہیں سُنا؟

خانہ جنگی، غسل صحت ہے علیل اقوام کا: ہندو مسلم نزاع کو فالِ بد نہ سمجھیے، اس لیے کہ میرا تو اعتقاد ہے کہ:۔

خاک پر بہتے ہی دونوں کا لہو مل جائیگا۔

صغیر جناب کو ہندو کا تجربہ نہیں ہے۔ میں کامل بارہ سال تک کورٹ آف وارڈس کے سلسلے میں ان حضرات کا تجربہ کر چکا ہوں، اِن ہنود کے عادات و خصائل سے میں بخوبی واقف ہوں۔ خدا کی پناہ۔ اِن کا تعصب اور اِن کی ہٹ دھرمی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

کبیر کیا مسلمان متعصب اور ہٹ دھرم نہیں ہے؟

صغیر ہرگز نہیں —مسلمان، ایک شریف اور بھولی قوم ہے۔

کبیر بھولی ممکن ہے بعض حیثیتوں سے ہو، مگر کیا کوئی شریف قوم متعصب بد معاملہ، بد دیانت، حاسد، عیب جُو، دروغ گو، اور وطن دشمن ہو سکتی ہے۔ اور کیا شرفا، ایک دوسرے کی غیبت کیا کرتے ہیں؟

صغیر یُوں تو ہر قوم میں اچھے بُرے افراد ہوتے ہیں، مگر ہندو تو اونٹ ہے، جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

کبیر یہ آپ کس بنیاد پر فرماتے ہیں؟

صغیر میں اِس بُنیاد پر کہتا ہوں کہ اوّل تو ہندو کا مذہب، جیسے وہ نہایت قدیم فلسفہ کہکر اپنا جی خوش کیا کرتا تھا، سخت بے بنیاد اور مبنی بر اوہام مذہب ہے دوسرے ہزاروں برس کی غلامی نے اس کی ذہنیت کو شرمناک حد تک پست کر دیا ہے۔ تیسرے روپے پیسے پر جان دینے کے باعث یہ اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اس میں آدمیت اور بالخصوص انسانی ہمدردی باقی ہی نہیں رہی ہے۔

یہ زندگی کی ہر معاملت میں ڈنڈی مار دینے ہی کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہے

کبیر جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، کہ اگر اسے حرف بحرف صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم ہندو سے نفرت کرنے لگیں؟ — اگر ہمارا کوئی بھائی علیل ہے، تو ہم اس کی دوا کرینگے، یا اس کی دشمنی پر کمر باندھ لیں گے؟

صغیر جناب میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی پست ذہنیت والی قوم کسی قوم سے شریفانہ اور عادلانہ برتاؤ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔

کبیر میں اس کے جواب میں پھر یہی عرض کروں گا کہ اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو آپ اصلاح کی کوشش کریں۔

کیا ہمارے اظہارِ نفرت سے ہندو کے امراض کا ازالہ ہو جائیگا؟

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی غور کیجئے کہ معائب کی دوڑ میں مسلمان ہندو سے پیچھے ہیں کہ آگے یا برابر؟ ہندو نے ہزاروں برس کی غلامی سے جو معائب اپنے گرد وپیش جمع کر لیے ہیں، کیا وہ تمام معائب مسلمان نے صرف ڈیڑھ سو برس کی غلامی میں اپنی سرشت میں داخل نہیں کر لیئے ہیں؟ وہ کون سا غلامانہ عیب ہے جو ہندو میں ہے، اور مسلمان میں نہیں؟

جب حمام میں دونوں ہی ننگے ہیں، تو ایک ننگے کو دوسرے سے یہ کہنے کا کہاں سے حق پہونچتا ہے کہ دیکھو او بے حیا تو ننگا ہے؟

صغیر بھائی صاحب! ہندو ہمیں "ملچھ" یعنی ناپاک سمجھتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ کھانا پینا کیسا، اگر ان کے کھانے پر ہماری پرچھائیں بھی پڑ جائے تو وہ اس کھانے کو نجس سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔

کبیر اپنے سے ہندوؤں کی اس چھوت چھات کو آپ قومی منافرت کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ اس باب میں ان کا برتاؤ کس قدر سخت ہے۔ یہ لاکھوں ہریجن آخر کس کے مارے ہوئے ہیں؟ — ہریجنوں کا رونا کیا رویا جائے، خود اپنے گھروں میں ان کا یہ برتاؤ ہے کہ بھائی، بھائی کو، بیوی، میاں کو، اور باپ بیٹے کو ناپاک سمجھتا اور ایک دوسرے کے ساتھ کھانے پینے کو حرام جانتا ہے۔

اگر ہندو کا برتاؤ اپنے ہم مذہبوں، اور اپنے اہل خاندان کے ساتھ کچھ اور ہوتا، اور آپ کے ساتھ کچھ اور، تو بیشک آپ کو یہ کہنے کا حق تھا کہ ہندو ہم سے ازراہِ تعصب وعناد چھوت کا برتاؤ کرتا ہے مگر وہاں تو: —

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری کا معاملہ ہے۔

آپ اس چھوت چھات کو دیکھ کر یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہندوؤں کی یہ روش نہایت ہی مذموم ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکال سکتے کہ ان کا یہ برتاؤ آپ کی دشمنی پر مبنی ہے۔

صغیر بھائی صاحب! آپ کو دفاترِ سرکاری کا حال نہیں معلوم کہ ہندوؤں نے وہاں مسلمانوں کے خلاف کیا قیامت برپا کر رکھی ہے — وہاں مسلمانوں کو ایک ایک کر کے نکالا جاتا ہے، اور چھانٹ چھانٹ کے ہندوؤں کو بھرا جاتا ہے۔

کبیر مجھے سرکاری دفاتر کا بطورِ خود کوئی تجربہ نہیں، ہاں مسلمانوں سے یہ شکایت بارہا سُن چکا ہوں کہ ہندو ان کی عافیت تنگ کیے رہتے ہیں۔

اگر صورتِ حال یہی ہے جو آپ نے بیان فرمائی ہے، اور میں بھی بارہا سُن چکا ہوں تو میں افسوس کے ساتھ ہندوؤں کی اس زیادتی کو مانونگا، اور انھیں ایک بھائی کی طرح مشورہ دونگا کہ وہ اس ظالمانہ، اور اس کے ساتھ ساتھ غیر عاقلانہ برتاؤ سے باز آئیں۔

مگر برادرِ من، یقین رکھیئے کہ یہ صرف ضد کی بات ہے، اور یہ ضد فریقین کے غلط برتاؤ، نیز زمانۂ حاضر کی پوشیدہ پالیسی کی پیداوار ہے، جو زیادہ مدت تک زندہ نہیں رہ سکتی۔

صغیر "فریقین کے غلط برتاؤ" سے آپ کا کیا مقصد ہے؟

کبیر میرا مقصد یہ ہے کہ اس وقت بعض امور میں مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ہٹ دھرمی کر رہے ہیں، اور بعض میں ہندو مسلمانوں سے غیر منصفانہ برتاؤ کر رہے ہیں۔

صغیر مسلمان کس بات میں ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔؟

کبیر پہلے ہندوؤں کی ہٹ دھرمی سُن لیجئے، پھر مسلمانوں کی ہٹ دھرمی بتاؤں گا۔

ایک ہٹ دھرمی تو ہندوؤں کی یہی ہے کہ وہ سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے ہیں۔

دوسری ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی اور
مقدس یادگار یعنی اردو زبان کو نیست و نابود کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔
تیسری یہ ہے کہ ہر بڑے شہر میں گوروں کی خاطر ہزاروں گائیں روز
ذبح کی جاتی ہیں، جس پر ہندو چوں نہیں کرتے، لیکن اگر بقرعید کے موقع پر
ایک گائے بھی مسلمان ذبح کر دیتے ہیں، تو اُس کے جلتوں ہندو سینکڑوں
مسلمانوں کو ذبح کر ڈالنے پر تُل جاتے ہیں۔

صغیر مرحبا، آپ نے کس قدر صفائی کے ساتھ امر حق کو ظاہر کر دیا۔ مجھے
نہیں معلوم تھا کہ آپ ہندوؤں کو اس قدر سمجھتے ہیں؟

کبیر مگر مجھ سے یہ بھی پوچھیئے کہ میں مسلمانوں کو کس قدر سمجھتا ہوں صاحب۔ بھائی
بُرا ماننے کی شرط نہیں ہے۔ اب ذرا مسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں بھی سن لیجئے۔

صغیر مسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں!

کبیر جی ہاں مسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں۔

صغیر سنایئے جناب۔

کبیر پہلی ہٹ دھرمی تو مسلمانوں کی یہ ہے کہ وہ بقرعید کے موقع پر
محض ہندو آزاری کی خاطر گائے ذبح کرتے ہیں۔
حالانکہ اسلام انھیں ہرگز گائے کی قربانی پر مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ اگر اسلام
کی روح کا غائر مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان حالات
میں اور ہندوستان کے سے ملک کے اندر گائے کی قربانی قطعاً نامناسب ہے۔
دوسری ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ قربانی کی گائے کو آراستہ کر کے ڈھول
تاشوں کے ساتھ گلیوں گلیوں پھراتے ہیں تاکہ ہندوؤں کے دل مجروح
ہوں، اور اُن کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو۔
تیسری ہٹ دھرمی یہ ہے کہ ہندوستان میں کئی پشتوں کے گذر جانے کے
باوجود، اور ہندو خون کے مخلوط ہو جانے کے باوصف وہ ہندوستان کو
اب تک اپنا وطن نہیں سمجھتے، اُن کا دل اسلامی ممالک کے طواف کرتا رہتا ہے
وہ ترکوں، عربوں، ایرانیوں اور افغانیوں سے جس قدر محبت رکھتے ہیں
اُس کی آدھی محبت بھی اپنے ہندوستانی بھائیوں سے نہیں کرتے، حالانکہ
ترک و عرب وغیرہ انھیں منہ بھی نہیں لگاتے، اور انھوں نے آج تک
اُن کی ایک موقع پر بھی کوئی مدد نہیں کی پھر بھی یہ انھیں کے پیچھے دوڑا کرتے ہیں
چوتھی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ مسجدوں کے سامنے ہندوؤں کو باجا
بجانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور اس کی یہ مہمل و مفسدانہ وجہ بیان کرتے ہیں
کہ باجے کی آواز سے ہماری نمازوں میں خلل واقع ہوتا ہے۔
حالانکہ کثرت سے ایسی مسجدیں ہیں جو ریلوے اسٹیشنوں اور شہروں کے
گنجان و پُرشور بازاروں کے اندر واقع ہوئی ہیں، جن کے آگے پیچھے، اور دائیں
بائیں انجنوں کی سیٹیاں شور کرتی ہیں، گھڑ گھڑاتی، اور ٹرام کاریں گھڑ گھڑاتی
رہتی ہیں، لیکن ان تمام غیر موسیقیانہ اور روح فرسا ہنگاموں سے ان کی نماز
میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اور خلل واقع ہوتا ہے تو صرف ہندوؤں کے
باجوں سے، جو موسیقی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور جن کی آواز خضوع و خشوع میں
اضافہ کر سکتی ہے۔
پانچویں ہٹ دھرمی یہ ہے کہ مسجد کے سامنے سے اگر مسلمانوں کی
شادی کا کوئی جلوس باجا بجاتا ہوا نکل جائے تو اُس سے نماز میں قطعی کوئی
خلل واقع نہیں ہوتا، لیکن اگر بدقسمتی سے ہندوؤں کا کوئی جلوس باجا بجاتا
ہوا گزرے تو ان کی نمازیں فاسد اور ان کے وضو شکست ہو جاتے ہیں۔

صغیر اس چوتھی ہٹ دھرمی کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

کبیر دور کیوں جایئے، کل ہی کی شادی کے باجوں کو یاد کیجئے،
آپ میرے ساتھ تھے کہ نہیں؟

صغیر ہاں تھا۔

کبیر تو کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ عین مسجد کے دروازے کے سامنے
باجہ بج رہا تھا۔ اور مؤذن مغرب کی اذان کہنے کے لیے کانوں میں انگلیاں
دیئے اس انتظار میں کھڑا تھا کہ باجا رُکے تو میں اذان کہوں؟

صغیر جناب، کانگریس بڑی قومی جماعت بنتی ہے گزشتہ سال
میں لکھنؤ آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں خود شریک تھا، اور ہر طرف
آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کانگریس کے پنڈال یا پنڈال کے گردو پیش
کی دوکانوں پر کہیں کوئی بورڈ اردو میں ہے کہ نہیں۔ مگر مجھے ہندی کے
علاوہ اردو کا ایک حرف بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں

کہ ہندو دراصل ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے، اور ہماری زبان ہماری معاشرت اور ہمارے وجود کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

کبیر کانگریس میں اردو کے بائیکاٹ کی شکایت میں نے بھی سنی ہے۔ اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ اکثر ہندو وہی چاہتے ہیں جو آپ نے فرمایا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ہندو جو ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے اور مسلمانوں کے فنا کر دینے پر تلے ہوئے ہیں نہایت ہی قابلِ ملامت ہیں۔ صرف قابلِ ملامت ہی نہیں سخت غیر دانشمند بھی واقع ہوئے ہیں۔

لیکن صغیر صاحب! جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ محض وقتی جنون، اور ہنگامی اشتعال انگیزیوں کے نتائج ہیں، فضا بدلتے ہی یہ تمام امور خواب و خیال ہو کر رہ جائینگے۔

کیا آپ کو نہیں کہ بعض عاقبت نااندیش مسلمان بھی ہندوستان میں دوبارہ مغل شاہنشاہی قائم کرنے کے خواب دیکھتے، اور اس ملک میں کسی "پاکستان" کے واسطے کوئی گوشہ ڈھونڈھتے پھر رہے ہیں؟ حالانکہ اگر غور سے دیکھئے تو دونوں غلطی پر ہیں۔

مسلمان جب اس ملک کے شاہنشاہ، اور ان کی جبروت کا پرچم تمام ہندوستان پر لہرا رہا تھا۔ اُس وقت تو ہندوؤں کو، جو ان کی خوف زدہ رعایا میں سے تھے، فنا نہ کر سکے، تو اب اس محکومی و ناطاقتی کے زمانے میں کیا خاک فنا کر سکیں گے۔

اور ہندو جب کہ ان کے بڑے رجواڑے برسرِ اقتدار تھے، اور ان کے راجپوتوں کی مونچھوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں مٹھی بھر مسلمانوں کو مغلوب نہ کر سکے، تو اب یہ سات کروڑ مسلمانوں کو کس برتے پر فنا کر سکینگے؟

صغیر جناب کی اس ہی گفتگو کے اندر میرا جواب مضمر ہے جس طرح کل مٹھی بھر مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا آج بھی وہ ایسا ہی کر سکتے ہیں۔

کبیر اول تو اس کا جواب مغل سلطنت کے ختم ہو جانے ہی میں پوشیدہ ہے۔

دوسرے اب نہ ہندوستان کے وہ سیاسی حالات ہیں، اور نہ مسلمانوں میں وہ دم ہی باقی ہے کہ بادشاہی کا خواب دیکھ سکیں۔

صغیر کیوں نہیں مسلمانوں میں آج بھی ایمان کی وہ آگ ہے جو تمام عالم کو خاکستر کر سکتی ہے۔

کبیر ایمان؟ اور ایمان کی آگ؟ اور پھر ہندوستانی مسلمانوں میں آپ جاگ رہے ہیں کہ سوتے ہیں؟ یہ آئے دن عدالتوں میں جھوٹے حلف اٹھانے والے، یہ عبائیں زیب و دوش کر کے مالِ وقف ہضم کرنے والے یہ آپس میں ایک دوسرے کی جان و آبرو لینے والے، یہ ڈاڑھیوں کی آڑ میں شکار کھیلنے والے، یہ شب براتوں میں آتش بازیاں چھوڑنے والے، یہ محرم میں تابوت نکال کر چھاتیاں پیٹنے والے، یہ سڑکوں پر مدحِ صحابہ کے نعرے لگانے والے، یہ بازوؤں پر تعویذ باندھنے والے، یہ فاتحہ کا نان و حلوے کھانے قبروں پر سجدے کرنے، غیر اللہ سے استعانت طلب کرنے اور عرسوں میں ناچنے والے مسلمان صاحب ایمان ہیں؟ اگر ایمان یہی ہے تو پھر خدارا بتلائیے کفر کسے کہتے ہیں۔

کیا یہی ایمان ناشناس نازک اندام ملکِ ہندوستان پر دوبارہ اپنا پرچم اڑائینگے؟

ایں خیال است و محال است و جنوں!

صغیر دیکھئے میں پھر آپ سے کہتا ہوں آپ مسلمانوں کو اس قدر ٹھنڈا نہ سمجھیں، اور ہندوؤں سے اس قدر خوش اعتقادی نہ رکھیں۔ ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔

کبیر مسلمانوں کو ٹھنڈا نہ سمجھوں کیونکر ٹھنڈا نہ سمجھوں، میں تو جس مسلمان کے سینے پر ہاتھ رکھتا ہوں برف کا سا چپکا لگتا ہے۔ آپ دھوئیں دیکھ کر مسلمان کو آگ سمجھتے ہیں، بھائی صاحب یہ آگ کا نہیں، برف کا دھواں ہے۔ رہی یہ بات کہ میں ہندوؤں سے خوش اعتقادی نہ رکھوں لیکن یہ تو بتائیے کہ میری کس بات پر آپ کو خوش اعتقادی کا گمان ہوا؟

خیر خوش اعتقادی کی بحث کو تو جانے دیجئے، میں مانے لیتا ہوں کہ ہندو بُرے، اور اُس سے زیادہ بُرے ہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں لیکن خدا کے واسطے یہ تو سوچئے کہ کرنا کیا چاہیئے

نظری باتوں سے کام نہیں چلیگا، اب ذرا عملی پہلو پر بھی نگاہ ڈالیئے

سُنیئے اور ہم سب پر رحم کھاکر غور سے سُنیئے :۔

ایک طرف حکومت ہی، دوسری طرف ہندو۔ دیکھنا یہ ہو کہ اخوتؐ محبتؐ کا امکان کس سے ہی؟ خیال رکھیگا کہ میں "امکان" پر زور دے رہا ہوں۔

کیا کوئی حکومت، محکومیت سے مصالحت کرکے اپنی ہستی کو موت کے منھ سے بچا بھی سکتی ہی؟

اور کیا کوئی حکومت، محکومیت سے رشتۂ اخوت قائم کرکے زندہ بھی رہ سکتی ہی؟ تو کیا آپ حکومت کو اس قدر احمق سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی محبت میں خودکشی کرلیگی، اپنا گلا خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ ڈالیگی؟

اور جب حکومت سے مصالحت و اخوت کا کوئی امکان ہی نہیں ہی تو آئیے ہندو کی طرف ــــ

ہندو اس کرۂ ارض پر سب سے بُرا سہی، مگر وہ آپ ہی کے ساتھ ایک ہی کشتی پر سوار ہی، مانا کہ اپنے غلط عقائد و عادات کی بنا پر وہ آج آپ کی دشمنی پر کمر باندھے ہوئے ہی، مگر کل عقل آتے ہی، وہ خود اپنے زندہ رہنے کی خاطر اس پر مجبور ہو جائے گا کہ آپ سے رشتۂ اخوت قائم کرلے، اور آپکے دوش بدوش جنگِ آزادی میں آپ کا ہاتھ بٹانے لگے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ یعنی ایک طرف تو صلح و آشتی کا "امکان" ہی نہیں ہی، اور دوسری طرف "امکان" موجود ہی۔

ان حالات میں عقلمند کیا کریگا "ناممکن" کا تعاقب کریگا، یا "ممکن" کا؟ "عدم امکان" کی جانب مایل ہوگا، یا "امکان" کی طرف؟

صاحب ایک بار نہیں، لاکھ بار مان لیا کہ ہندو بُرا ہی، بُرا ہی، بُرا ہی، لیکن کیا کیا جائے، اخوت کا امکان ہی تو اس سے ــــ اور جب یہ حالت ہی تو پھر اُس بُرے کو اچھا، اُس مریض کو تندرست اور اُس دشمن کو دوست بنانے کی فکر کیوں نہ کی جائے؟ ممکن ہے یہ بُرا اچھا ہو جائے اور کل ہمارے دوش بدوش سعی کرکے ہندوستان کے آزاد کرانے میں ہمارا "دست و بازو" بن جائے۔

صغیر کیوں صاحب آپ اِدھر کیوں نہیں آتے کہ تمام مسلمان منظم ہو کر ہندو کا مقابلہ کریں؟

کبیر اس کے دونوں رُخ سخت خطرناک ہیں۔

صغیر خطرناک؟

کبیر جی ہاں خطرناک، اور سخت خطرناک، آپنے یہ دوہا سنا ہی۔

آؤ سکھی چوسر کھیلیں اپنے پی کے سنگ
جیتی تو پی ملینگے، ہاری تو پی کے سنگ

جس طرح "پی" کے ساتھ چوسر کھیلنے میں جیتنے اور ہارنے، ہر حالت میں نفع ہی، جیتنے پر تو "پی" مل جائینگے یعنی "پی" قبضے میں آجائینگے، اور ہارنے میں "پی" کے ساتھ رہنا ہوگا یعنی "پی" کا قبضہ ہوجائیگا۔

اسی طرح ہم نے اگر ہندو سے جنگ کی تو ہر حالت میں ہم خسارے ہی میں رہینگے۔

فرض کیجئے آپ ہندو پر غالب آگئے۔ تو کیا ہندو پر غالب آجانے سے آپ شاہنشاہ اورنگ زیب بن جائینگے، رہینگے وہی غلام کے غلام، بلکہ ایک ہاتھ ٹوٹ جانے سے ملک اور بھی کمزور ہوجائیگا اور آزادی محض ایک وہمِ باطل ہوکر رہ جائیگی۔

اور اگر ہندو آپ پر غالب آگئے تو تمام متذکرۂ بالا ملکی خسارہ ہوں کے دوش بدوش آپ دُہرے غلام بن کر رہ جائینگے؟

کبھی اس پر بھی للہ غور کیا کیجئے کہ کیا طوفان زدہ کشتی پر بیٹھکر لڑنے والے کبھی ساحل تک پہونچ سکتے ہیں؟

صغیر آپ بہت پیچیدہ باتیں کر رہے ہیں اور منطقی استدلال سے مجھے خاموش کردینا چاہتے ہیں، اچھا اب تو میں جاتا ہوں، کل انشاءاللہ ملونگا

کبیر نہیں بھائی صاحب، ذرا ور ٹھہر جائیے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں اکثر مجھے چھیڑا کرتے ہیں، میں چاہتا ہوں، آج حجت تمام کردوں، صرف ایک بات اور سُن لیجئے۔ ٹکڑے ٹکڑے کرکے بات کرنے میں بات کا مزا بھی جاتا ہی اور مفہوم بھی مبہم ہوکر رہ جاتا ہی کیا آپ مسلمان ہیں؟

صغیر (داڑھی پر ہاتھ پھیرکر) الحمدللہ

کبیر آپ کو اسلام، اور اسلامی ممالک سے محبت ہی؟

صغیر — یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے، اگر میرا خون اور میری ہڈیاں کام آئیں تو بھی میں دریغ نہیں کر سکتا۔ شہادت کا مرتبہ۔ اللہ اکبر۔

کبیر — اگر آپ سیاسیات حاضرہ و گزشتہ سے واقف نہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی ممالک کی تسخیر کے لئے کتنے بڑے بڑے جال بچھائے گئے ہیں، اور اسلام کو دنیا سے فنا کر دینے کی کیا کیا کوششیں کی جا رہی ہیں۔

صغیر — (ٹھنڈی سانس بھر کر) جی ہاں مجھے تھوڑا بہت تو علم ہے۔

کبیر — شاید آپ کو یہ معلوم نہیں اس لئے میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائیگا آپ کا اسلام، اور آپ کے اسلامی ممالک ہمیشہ خطرے ہی میں رہیں گے۔

صغیر — کیا واقعی ایسا ہے؟

کبیر — جی ہاں ایسا ہی ہے، میں واقعات اور اعداد و شمار سے اس کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ ہندوستان کی محکومی، اسلام اور اسلامی ممالک کے حق میں زہر اور زہر ہلاہل ہے۔

صغیر — تو پھر کیا کیا جائے۔

کبیر — اپنے دین و مذہب، اور اپنے مکے مدینے کی خاطر ہندو سے مصالحت کر لیجئے۔

ایک حدیث میں ہے کہ مومن جب دو مصیبتوں کے درمیان ہو تو ان میں جو ہلکی مصیبت ہو اُسے اختیار کر لے۔ میں ہندو کو کسی طرح ہرگز ہرگز برا نہیں سمجھتا مجھے ہندو کی شرافت و عقل پر اعتماد ہے کہ وہ مسلمانوں سے کبھی نہیں بگاڑیگا لیکن چونکہ آپ اُسے بُرا اور بہت بُرا سمجھتے ہیں، اس لئے آپکے نقطۂ نگاہ سے آپ دو مصیبتوں کے درمیان ہیں یعنی:-

(۱) محکومی

(۲) اور ہندو

اس لئے آپ کو ان دونوں میں سے ایک مصیبت سے نجات حاصل کرنا اور ایک سے مصالحت کرنا ہے۔

محکومی کے متعلق میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آپکے اسلام کے حق میں زہر ہے، اس لیے بڑی مصیبت ہے آپ کو اس بڑی مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہیے۔ اب رہی دوسری لیکن چھوٹی مصیبت یعنی ہندو اس سے آپ کو عقل اور حدیث دونوں کی رو سے مصالحت کر لینا چاہیئے جی چاہے، یا نہ چاہے، آپ اسے کڑوی دوا سمجھ کر ہی پی جائیں، اور اگر تندرستی کے آثار نہ پیدا ہونے لگیں تو سر بازار میری تشہیر کیجئے گا، اور اگر مر گیا تو میری قبر کو کھود کر پھینک دیجئے گا۔

شاعر سے خطاب

سید محمود حسن

ہر قوم کے ادبی نشو و نما کا راز اس کی تمدنی اور سیاسی ترقی میں مضمر ہے۔ صدیاں گذر جاتی ہیں مگر ایک قوم پر جمود اور بے حسی کا عالم طاری رہتا ہے۔ اس وقت کہ جب احساسِ پستی کے بعد قوم بیدار ہوتی ہے تو قوم کے ہر فرد پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اُس کے دل و دماغ میں جو انسانی جذبات سوتے رہتے ہیں وہ بیک وقت جاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت قوم کے ان مجموعی جذبات کا ترجمان حقیقی شاعر کہلاتا ہے۔ مناظرِ فطرت اور جذباتِ انسانی کی ترجمانی حقیقی شاعری کا جوہر ہے۔ قومی ادب، قومی سیرت کے خصوصیات کا آئینہ اور قومی زندگی کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ سچی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشوں اور جذبات کی مکمل تصویر ہو اور شدتِ احساس و خلوص سے لبریز ہو۔ اگر یہ باتیں شاعری میں موجود ہیں تو وہ فطری شاعری ہے ورنہ ایک مصنوعی اور بے جان چیز۔

دورِ جدید کے شاعر جو علم بردارِ انسانیت ہیں دیکھیں کہ ایک خاموش حشر، ایک خوابیدہ انقلاب معصوم اور بے کس انسانوں کی شکل میں شاعرِ حقیقی کی راہ دیکھ رہا ہے جو اُن کے جذباتِ پوشیدہ کی چلتی پھرتی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دے جو ان کے ہیجان اور انتشار کے پُرشور دریا کو سکون کی راہ پر لگا دے۔ یہ انسانی دل کی پکار ہے جو شاعرِ حقیقی کو پیامِ عمل دیتی ہے۔ اگر تو شاعر ہے تو فطرت کی آواز کو بھی سن لیگا۔ سُن! کہ فطرت تجھے مشاہدے کی دعوت دیتی ہے۔ اُتر جا دل کی گہرائیوں میں، جذب ہو جا فطرت کی نیرنگیوں میں اور پھر دنیا والوں کے لیئے اپنے قلم کا ایک رنگین نقش چھوڑ جا۔

اے شاعر! عظمتِ دلکشی قلعہ و شمشیر کو نہیں بلکہ لہلہاتے ہوئے باغ اور سبزہ زار کو بخشی گئی ہے۔ تو اس عالمِ فانی سے پرے تخیلات اور نغمہ کی بستی میں گم ہو جا، ہاں! تو اپنے جذبات سے اسرار و معانی کی گرہ کھول اور بھول جا ہمیشہ کے لیئے زمانہ کے رسم و رواج کو، اس دنیا کے حُسن کو، سیاست اور لوگوں کے تمسخر کو، اس لیئے کہ زمانہ کا ہر اُٹھتا ہوا قدم اپنے پیچھے لوگوں کے لیئے حسرت و یاس کی نشانی چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن فطرت کی آغوش میں پھول کھلتے ہیں مُرجھاتے ہیں، مُرجھاتے ہیں، اور کھلتے ہیں، جانور کلیلیں کرتے ہیں۔ فضا کے سمندر میں انسانی تخیئل کے بلبلے ٹوٹتے اور بنتے ہیں، پھر اسی طرح فطرت کی نیرنگیوں کے ساتھ مسرت اور شادمانی کو ابدی زندگی میسر ہو جاتی ہے۔

دنیا شر و فساد سے بھری ہوئی ہے لیکن فوراً ہی تقلید میں پیچھے بھی ہو لیتی ہے۔ تجھے ایسے برتتا ہے۔ عرصہ تک جاہل اور بداخلاق لوگوں کے درمیان سے ہو کر گذرنا ہے۔ مگر نہ گھبرا کہ اس پردۂ دنیا میں

سبزہ زار کے فرشتے نے اپنے سب سے محبوب پھول کو محفوظ رکھ چھوڑا ہے اور وہ صرف تیرے ہی حصے میں آئیگا اور یہی پھول اپنی پیاری خوشبو سے تجھے مسحور کر لیگا۔ اِس وقت تیرے سابق کرم فرما تیری نظموں کے سامنے ٹہر نہ سکیں گے۔ شرم و عقیدت سے تیرے بلند خیالات کے سامنے سر جھکا دینگے۔ یہ ہے تیرا انعام

جب تخیلات حقیقت کی کروٹ لینگے، جب یہ ساری دنیا جاذب نظر ہو جائیگی، جس وقت دنیا کے گوشے گوشے سے مسرت و شادمانی کی بارش ہونے لگے گی اور تمام عالم تیرے لطیف جذبے سے بھر جائیگا اُس وقت تیرے قبضۂ قدرت میں کائنات کی تمام چیزیں ہونگی۔ زمین کی وسعت تیری تفریح کے لیئے صحن گل گشت اور رہنے کے لیئے جاگیر بن جائیگی سمندر بغیر کسی خدشے کے تیرے سفر کرنے کے لیئے موجود ہوگا۔ دریا، پہاڑ اور جنگل تیری ملکیت ہوں گے اِس دنیا میں تیرا سب کچھ ہوگا جب کہ دوسرے محض عارضی باشندے ہونگے۔ تو بحر و بر کا حق دار اور ساری آسمانی فضا میں تخیل کے پر لگا کر اُڑنے والا ہوگا۔ عالم کی تمام اشیاء تیرے سامنے ہونگی۔ تیری نظروں کے سامنے مادّی پردے اٹھے ہونگے اور اُس وقت تیری دوربین آنکھیں قدرت کے بہترین مناظر دیکھیں گی۔ تو وہ جگہ دیکھیگا جہاں برف گرتی ہے جہاں سے صاف شفاف پانی کے جھرنے نکلتے ہیں، جہاں پرندے سریلے راگ گاتے ہیں، جہاں دن اور رات شمالی روشنی کے جھلملاتے ہوئے ہفت رنگی کرنوں میں ملتے نظر آتے ہیں۔ جہاں نیلے آسمان پر بادل منڈلاتے اور ایک سہانی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ جہاں آسمان اور زمین کے دامن کہرے اور دھوئیں سے لپٹے ہوتے ہیں۔ جہاں آسمان پر تارے چمکتے ہوتے ہیں جہاں فردوسی مسرتیں ہیں یا جہاں خطرات اور خوف کی بری شکلیں ہیں، وہاں حسن بھی ہے، وہاں نور کی بارش ہوتی ہے اور یہ سب تیرے لیئے ہے اگر تو تمام دنیا کا چکر لگا ڈالے تو دیکھے گا کہ دنیا کی تمام نیرنگیاں اور ہماہمی، دنیا کی تمام چیزیں بیکار محض اور نکمی نہیں بلکہ کھلی ہوئی حقیقتیں ہیں۔

شعرائے کرام سے

ہمت بڑھی تو شکوۂ اغیار کر دیا
اور حوصلہ بڑھا گلۂ یار کر دیا

ہجر و وصال کی ہی کشاکش میں دم گھٹا
پائے تلاش تھا بھی تو بیکار کر دیا

معشوق کو نہ دیکھا تو یوں جاں بحق ہوئے
اپنا جنازہ آپ سے طیار کر دیا

زلفیں تراش گئیں رہے لیکن اسیر زلف
الفت کی ئے نے یوں تمھیں سرشار کر دیا

دل سستے دام بیچ کے دردِ جگر لیا
دنیائے عاشقی کو بھی بازار کر دیا

جس کو چھپایا تم نے "خطِ تو" کے ذکر سے
رسوا اسی کو پھر سر بازار کر دیا

مایوسیوں ہی کا ہمیں دیتے رہے سبق
تم نے تو ساری قوم کو بیکار کر دیا

شاہ مقبول احمد کاشف پھلواروی
(کلکتہ)

رفتارِ وقت

کانگریس کا پچاسواں اجلاس

ادارۂ کلیم

ہندوستان میں اس مہینے کا سب سے اہم واقعہ انڈین نیشنل کانگریس کا پچاسواں اجلاس تھا، جو بمبئی کے ایک گاؤں فیض پور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کو کئی لحاظ سے خصوصیت حاصل تھی۔ اول تو یہ پچاسواں اجلاس تھا۔ اگرچہ کانگریس کو قائم ہوئے پچھلے سال پچاس سال ہو چکے تھے، اور اس کی گولڈن جوبلی بھی منائی جا چکی تھی۔ لیکن اس پچاس سال کے عرصہ میں کل ۴۹ اجلاس ہوئے تھے، کیونکہ سورت کے اختلافات کے بعد ایک سال اجلاس منعقد نہ ہو سکا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اجلاس کانگریس کا گولڈن جوبلی اجلاس تھا۔

دوسرے یہ کہ کانگریس اب تک بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہوئی تھی۔ جو حضرات کانگریس کے سالانہ اجلاس میں کبھی شریک ہوئے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ کانگریس کے اجلاس کے لئے کتنا زبردست اہتمام کیا جاتا ہے اور لوگ کس کثرت سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس لئے اب تک یہ خیال تھا کہ صرف بڑے بڑے شہر اس اجلاس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ادھر کچھ عرصہ سے کانگریس نے دیہات کی طرف خاص توجہ کی ہے، اور دیہات سُدھار کا کام پورے زور شور سے اُٹھایا ہے۔ جس کی دیکھا دیکھی حکومت کو بھی اس طرف توجہ کرنی پڑی ہے۔ اسی رجحان کا یہ نتیجہ تھا کہ کانگریس کا یہ پچاسواں اجلاس ایک گاؤں میں منعقد کرانے کیا گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری طرح کامیاب رہا۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا کوئی صدر مسلسل دوسری بار بھی منتخب ہوا ہو۔ پنڈت جواہرلال نہرو کی زبردست شخصیت اُن کی اَن تھک قوتِ عمل، اور اُن کے روشن اور واضح تفکر نے کانگریسی حلقوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ اس وقت کانگریس کی صدارت کے لئے کوئی اُن سے بہتر صدر نہیں مل سکتا۔ لہٰذا کانگریس نے بالاتفاق رائے انھیں پھر موقع دیا کہ وہ اپنے اس پروگرام کی تکمیل کر سکیں جو اُنھوں نے شروع کر دیا تھا۔

موقع اور حالات کی نزاکت بھی کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے جدید اصلاحات کا نفاذ ہونے والا ہے جس میں پہلی مرتبہ دیسی ریاستیں بھی برطانوی ہند کے دوش بدوش کھڑی ہوں گی۔ ان اصلاحات کے ماتحت انتخابات شروع ہو چکے ہیں، اور اُن کی چہل پہل عین شباب پر ہے۔ اس موقع پر کانگریس کا رویہ ملک کے مستقبل کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کانگریس کے انتخابات میں براہِ راست حصہ لینا، اصلاحات کے ماتحت عہدے قبول کرنا یا نہ کرنا۔ اصلاحات کے کامیاب کرنے یا ناکام کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں ہماری آئندہ سیاست پر بڑی حد تک اثر انداز ہوں گی، اور انہی مسائل پر غور کرنے اور اُنہیں طے کرنے کے لئے کانگریس کا یہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔

کانگریس کے اس اجلاس میں تقریباً ایک لاکھ افراد شریک ہوئے۔ جن میں سے بیشتر دیہات کے باشندے تھے اور کل ۲۱ قراردادیں منظور ہوئیں۔ ان میں جو خاص اہمیت رکھتی ہیں ان کا ہم ذیل میں تذکرہ کریں گے۔

پہلے دن کے اجلاس میں صدر کی جانب سے پانچ قراردادیں پیش ہوئیں۔ جو حسبِ ذیل مسائل سے متعلق تھیں۔

(۱) تمام عالم کی امن کانفرنس۔ (۲) برما (۳) اسپین (۴) علاقہ جات مستثنیٰ (۵) ارضی و سماوی آفات۔ ان کے علاوہ دو قراردادیں اور منظور

ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم "خطرۂ جنگ" کے متعلق تھی۔ اس قرارداد کی رُو سے کانگریس نے جنگ کی مذمت کی، اور جنگ ہونے کی صورت میں ہندوستان کے روّیہ کو واضح کیا۔ اِس کے بعد حکومت کی سرحدی پالیسی پر اظہار ناراضگی کیا گیا اور اسے ملک کی آزادی کے منافی بتایا گیا۔

دوسرے دن کے اجلاس میں صدر کی جانب سے نظربندوں کے متعلق یہ قرارداد پیش ہوکر منظور ہوئی کہ تمام نظربندوں کو فی الفور رہا کر دیا جائے۔ اور اُن میں خودکشی کے واقعات جو کثرت سے ہو رہے ہیں ان کی باضابطہ تحقیقات کی جائے۔ اس کے بعد اُن ہندوستانیوں کے ساتھ جو بدلیسوں میں آباد ہیں اور اُن لوگوں کے ساتھ جو کالونی کے حادثوں میں کام آئے۔ اور بنگال ناگپور ریلوے کے ہڑتالیوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا۔

اس کے بعد شہری حقوق کے دبائے جانے پر اظہار ناراضگی اور اُن کی آزادی کی حمایت کی گئی۔ پھر آئندہ اصلاحات کے ناقابلِ قبول ہونے اور دستوری اسمبلی کے طلب کئے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر یہ طے کیا گیا کہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو جبکہ اصلاحات نافذ ہوں گی۔ تمام مُلک میں ہڑتال کرکے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ چونکہ شاہی دربار کرنے سے حکومت ہند کا مقصد ملوکیت کو تقویت پہنچانا ہے اس لئے اس دربار کا بائیکاٹ کیا جائے۔ پھر انتخابات کے بعد کانگریس کا روّیہ طے کرنے کے لئے (خصوصاً عہدوں کے قبول کرنے کے سلسلہ میں) یہ قرار پایا کہ ایک کنونشن کیا جائے جس میں ان مسائل پر غور و بحث ہوسکے۔ اور آخری رائے قایم کی جائے۔ اس دوران میں یہ طے ہوا کہ انتخابات میں کانگریسیوں کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی جائے کہ وہ صرف کانگریسیوں کو ووٹ دیں۔ آخر میں یہ طے پایا کہ کانگریس کا آئندہ اجلاس بار دولی میں منعقد ہو اور زمانہ کا تعین آل انڈیا کانگریس کمیٹی کرے۔

مذکورۂ بالاسطور میں ہم نے کانگریس کے سب سے اہم ریزولیوشن کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ دیہی حالات کے متعلق تھا اس کی رُو سے کانگریس نے یہ طے کیا کہ

(۱) لگان اور مالگزاری دونوں میں موجودہ حالات اور اقتصادی مشکلات کے مطابق ترمیم اور تخفیف ہونا چاہیئے۔

(۲) وہ زمینیں جن میں بہت کم پیدا وار ہوتی ہے لگان یا مالگزاری سے مستثنیٰ کر دی جائیں۔

(۳) زرعی پیداوار پر بھی انکم ٹیکس کے انداز پر لگان تشخیص کیا جائے۔ یعنی جتنی آمدنی ہو اتنا ہی لگان لیا جائے۔

(۴) آبیانہ میں بھی کافی تخفیف کی جائے۔

(۵) تمام زمیندارانہ مطالبے اور بیگار بند کر دی جائے، اور لگان کے علاوہ ہر مطالبہ غیر قانونی قرار دیا جائے۔

(۶) دائمی پٹے موروثی حقوق کے ساتھ دئے جائیں۔

(۷) زراعت کو امدادِ باہمی کے اصولوں پر چلانے کی کوشش کی جائے۔

جو کل تھی وہی آج بھی بے دردی ہے
جو کل تھی وہی آج بھی [illegible] بے بسی ہے
ہمارا تھا کل آج ہے [illegible]
نگینہ تھا کل آج [illegible] ہے

[illegible] آبادی

ذاتی خط و کتابت

چونکہ تمام ڈاک دفتر میں کھولی جاتی ہے، اس لئے جو حضرات یہ چاہتے ہوں کہ اُن کے خطوط دفتر میں نہ کھولے جائیں۔ بلکہ براہِ راست مجھے پہونچ جائیں وہ لفافے پر لفظ

ذاتی یا نجی

لکھ دیا کریں۔

جوش ملیح آبادی

نقد و نظر

ادارۂ کلیم

سالنامہ ادبِ لطیف

رسالہ ادبِ لطیف لاہور کا سالنامہ ہمیں بغرض ریویو موصول ہوا ہے، یہ سالنامہ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور لاہوری رسائل کے اکثر سالناموں کی طرح نہایت آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ فہرستِ مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہندرِ اولین" کے علاوہ سالنامہ ۶۷ مضامین پر مشتمل ہے جن میں سے ۳۸ نظمیں یا غزلیں وغیرہ ہیں، باقی ۲۹ میں ایک مزاحیہ مضمون، دو اچھے ڈرامے۔ دو مختصر تخئیلی مضامین اور گیارہ افسانے ہیں۔ جو سالنامے کے بیشتر صفحات پر حاوی ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۳ مقالے ہیں جن میں سے ۶ تاریخی اور تحقیقی ۳ ادبی۔ ایک سیاسی اور تین تذکرہ یا فنِ تذکرہ سے متعلق ہیں۔ یہ تجزیہ ہم نے اس لئے ذرا تفصیل سے پیش کیا کہ اس سے ہمارے مدیروں مضمون نگاروں اور خریداروں کے ذوق اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

مقالے عموماً مختصر ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود۔ علومِ اسلامی کی ابتدا۔ شعرا اور تصوف۔ ڈیڑھ سو برس پہلے کی ادبی صحبتیں۔ مشرق پر مغرب کی یلغار۔ تیموری بادشاہوں کے امورِ خاصہ۔ دنیائے تذکرہ۔ عالم اسلامی میں شفاخانوں کی ابتدا۔ اور مقصدِ ادب پڑھنے کے قابل ہیں۔

بہرحال اپنی نوعیت کے لحاظ سے ادبِ لطیف کا سالنامہ پوری طرح کامیاب ہے۔ اور اس سے ترتیب دینے والوں کے نہایت ستھرے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ سالنامہ متعدد تصاویر سے بھی مزیّن ہے جن میں پنجاب کے مشہور آرٹسٹ عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کی "دیوی داسی"، مسٹر رام لال کی "آخری منزل" اور جناب قادری کی "شیو کا رقص" خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سالنامہ کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذکورۂ بالا محاسن کے ہوتے ہوئے یہ کسی طرح گراں نہیں ہے۔

بہارستان

یہ رسالہ جالندھر سے اخترؔ وارثی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے اور اس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے جس میں اغراض و مقاصد کے سلسلے میں محترم مدیر تحریر فرماتے ہیں کہ "بہارستان کا اجرا اردو کی موجودہ الوقت ضروریات کی تکمیل اور اس کے آئندہ تحفظ و بقا کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو اردو کی ترقی و ترویج، نشر و اشاعت اور حفاظت و صیانت کے لئے اپنے مجوزہ اصولِ کار و طریقِ عمل کے مطابق نہایت تن دہی سے کام کرے گا اور میری دلی خواہش یہ ہے کہ اس کے مطابق اور افسانوں۔ نظموں اور تصویروں کا معیار نہایت بلند اور پاکیزہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ معیارِ مضامین کے علاوہ صحت زبان اور صحت الفاظ کا خاص خیال رکھا جائے۔ تاکہ یہ رسالہ اردو زبان کی بہتر سے بہتر خدمت انجام دے سکے۔"

ہم بھی آمین کہتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس زبردست مقصد کو کس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے؟ اور بلند آہنگ دعوؤں سے قطع نظر عمل میں بھی سچ مچ ہمیشہ اسی خیال کو پیش نظر رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق کسی قسم کا اظہار رائے کرنا ابھی قبل از وقت ہے۔

زیرِ نظر رسالے میں متعدد مقالے، افسانے اور ڈرامہ ہیں، جن کا معیار اچھا ہے۔ اور حصّۂ نظم میں مولانا غلام رسول مہرؔ، عبدالمجید سالکؔ، محمد دین تاثیرؔ، اخترؔ شیرانی۔ اور مولانا حسرتؔ موہانی جیسے مشہور شعرا کے نام نظر آتے ہیں۔

بہرحال آثار اچھے ہیں۔ کاش اسے استقامت حاصل ہو، اور یہ برابر ترقی کرتا رہے۔

رسالہ کلیم دہلی

فہرست مضامین ۳۶ء

الف

مارچ — شاعر

مئی — مشاہیر کے دستخط

(۴۲) حسن ریاض

مئی — تم پھر اسی طرح سو جاؤ

جون — بیکسی میں عشق کا پیغام

جولائی — بیچاری کا چمن سے ڈالی اُچاٹ کر لگئی

(خ)

(۴۳) خسروی جے پوری

اکتوبر — دعوائے قوتِ تخلیق

(د)

(۴۴) دیوانہ مصطفےٰ آبادی

فروری — نغمۂ بیداری

جون — ہندوستانی

جولائی — باغی

(ر)

(۴۵) رضا نقوی — جون — رواداری (نظم)

(۴۶) رضی عظیم آبادی — ستمبر — نوجوان سے

(۴۶-۱) رزمی صدیقی — دسمبر — نالۂ بیباک

(۴۶-ب) رام گوپال دھیاورگی — مئی — حسن

(س)

(۴۷) سہیل عظیم آبادی

نومبر — ملوکیت اور عیسائیت کے مظالم

(۴۸) سردار علی جعفری

نومبر — حقیقت (ڈرامہ)

(۴۹) (سید) سجاد ظہیر بار ایٹ لا

اکتوبر — ترقی پسند مصنفین کی تحریک

(۵۰) ساغر نظامی

فروری — تجدید شوق

اکتوبر — گزرجا

(۵۱) سرسوتی

جولائی — آزادی کی شمع

(۵۲) سیفی پلیح آبادی

جون — شمع (نظم)

(۵۳) سعد منیر کانپوری

دسمبر — ماں کی قربانی

(۵۴) سیماب اکبر آبادی

جنوری — رباعی - غزل مسلسل

(ش)

(۵۵) شریف پریمی

ستمبر — دو خط اُن کے نام

(۵۶) شیو پرشاد متر ایم اے بی ایل

اگست — جاپان کی بلیک ڈریگن سوسائٹی

(۵۷) شیو فرید آبادی

اگست — شاعرانہ بصیرت

ستمبر — سکوتِ صحرا

اکتوبر — راکھی

(ض)

(۵۸) ضیا صاحب بی اے ایل ایل بی

ستمبر — نظر بر اثر

(۵۶) ضیاء الدین سلہری

ستمبر — دعا

(۵۷) ضیاء الاسلام بجنوری

جولائی — اسٹیشن کا حادثہ (نظم)

(ظ)

(۵۸) ظفر علی خاں

فروری — ہلالستان (نظم)

(ع)

(۵۹) محمد عسکری لکھنوی

مارچ — آئینۂ تخیلات

اپریل — ″

(۶۰) عبدالحق صاحب سکرڑی

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

(۶۱) علی عباس حسینی

اگست — گونگا بہری

(۶۲) عبدالعلیم ہاشمی غازی پوری

اگست — مطالعہ

ستمبر — انسانی عظمت و شوکت کی پائیداری

(۶۳) عبداللہ مصری

اگست — غلط فہمی

نومبر — دنیا سازی

(۶۴) عرش ملسیانی

مارچ — عرضِ حقیقت

اگست — نالۂ مجروح (نظم)

(۶۵) عبدالرؤف عشرت لکھنوی

جون — اپنی زبان کی کتھا

نومبر — شاہی دربار

(۶۶) (مولانا) عظیم برنی

جون — فرانس کا شاہکار

(۶۷) عبدالرحیم شبلی

فروری — ہندوستان کا افلاس

جون — ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری

اکتوبر ہندوستان کے مسائلِ آبادی

(۶۸) عبداللہ خاں

مئی نعرۂ انقلاب (نظم)

(۶۹) عظیم بیگ چغتائی

نومبر یہ کس کی تصویر ہے؟

(۷۰) (حکیم) عبدالوالی

مئی صنعت وحیات

اکتوبر حکیم عبدالوالی صاحب کا ایک مکتوب

(۷۱) عطاء اللہ پالوی

مئی بال جبریل پر دو نظریں

جولائی میرانیس و فردوسی پر مرزا صاحب کی رائے

دسمبر نقد بر نقد

(غ)

(۷۲) غلام سرور ایم اے پی ایچ ڈی

جولائی اقوال حکیمانہ

اکتوبر "

دسمبر انقلاب مشروطیت ایران

(۷۳) (خواجہ) غلام السیدین

فروری حالی کی مصلحانہ شاعری

(ف)

(۷۴) فرید جعفری مچھلی شہری

جنوری دنیا کا پہلا افسانۂ محبت

اپریل سماج کی قتیل

دسمبر پریم کی جیت

(۷۵) فہیم بیگ چغتائی

اگست برہا کی آگ

(۷۶) فضل اثر آگرہ

مارچ اچھوت

(ق)

(۷۷) قمر جلال آبادی

جولائی پیغام

نومبر فغانِ صبحگاہی (نظم)

(ک)

(۷۸) کوثر چاندپوری

ستمبر شاہانِ مغلیہ کی شاعری

(۷۹) (سر) کیلاش نرائن ہکسر

اگست غمی اور غیف

(۸۰) کشن پرشاد کول

فروری انقلاب روس

نومبر کمیونسٹ ڈاکو

(۸۱) کرشن سہائے وحشی

اپریل بسنت رُت اور شاعر

" نوحہ

جولائی لڑکی اور طوطا (نظم)

(۸۲) کیفی چڑیاکوٹی

جولائی طوطا اور کوا

(گ)

(۸۳) گوردھن داس بھوانی

مارچ دُکھیا ماں

نومبر امتحان

(۸۴) (میجر) گرہم پول

اگست ابی سینیا کی پامالی

(ل)

(۸۵) ل احمد اکبرآبادی

جنوری نیا شوالہ

اپریل پریم کا جوگ

" حیات

مئی دنیا کا قدیم ترین افسانہ

جون کردار وگفتار

جولائی گُلدم

اگست جینے کی قیمت

(م)

(۸۶) (سید) معشوق حسین اطہر

مارچ بال جبریل پر ایک نظر

(۸۷) مکیش اکبرآبادی

فروری افکار

مارچ برقِ رہگذر۔ انتقام

مئی حسن وعشق

اگست اقتضائے فطرت (نظم)

دسمبر دوقمنجر۔ فریبِ جلوہ (نظم)

(۸۸) مانی جائسی

جنوری دنیا سے بیزاری

اپریل دالکوست

(۸۹) محی الدین صاحب محمود

نومبر تاجِ زریں (نظم)

(۹۰) (سید) محمود بریلوی

دسمبر مسلمان یورپ میں

(۹۱) مسعود حسین رضوی ادیب

نومبر میر کا ایک شعر اور حشویات

(۹۲) (سید) محمود مورخ بی اے

اکتوبر جاپان کا یورپ کو چیلنج

دسمبر چین اور جاپانی ملوکیت

(۹۳) (حکیم) محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی

نومبر اُردو

(۹۴) مجنون گورکھپوری

مارچ مرجھائے ہوئے پھول

(۹۵) محمد احمد تاثیر

مئی محبت کا گیت

(۹۶) (سید) مطلبی فریدآبادی

فروری ہندوستان میں جذبۂ قربانی کی موت

مارچ کس کو ہے کس کی جستجو؟

" آخری ملاقات

(۹۷) (سید) مرتضیٰ احسن بلگرامی بی اے

دسمبر حکیم قاآنی کے مذہب اور اخلاق پر ایک نظر

(۹۸) متین الدین ایڈوکیٹ

مارچ کلامِ متین

اپریل ذوقِ عصیاں

(۹۹) مخمور اکبرآبادی

فروری رازِ حُسن

جولائی کیفیاتِ مخمور

(۱۰۰) محمود اسرائیلی

اپریل نگاہِ شوق (نظم)

(۱۰۱) (پروفیسر) محمد مجیب بی اے (آکسن)

مئی چند ڈراموں پر تنقید

(۱۰۲) آ[illegible]

فروری، مارچ، اپریل [illegible] اردو

اکتوبر حُسن و عشق

نومبر نگاہِ اولیں

(۱۰۲) (خواجہ) مسعود علی ذوقی

جنوری شام

(۱۰۳) مصلح الدین اسیر

مارچ کسی عالمگیر مذہب کی اشاعت میں

(۱۰۴) مجید امجد جھنگ ــ مارچ ــ حُسن

(ن)

(۱۰۵) نیاز فتحپوری

اپریل ذرّہ

(۱۰۶) ناصر لکھنوی

جولائی تہذیبِ نو (نظم)

(۱۰۷) (ڈاکٹر) نجم الدین جعفری

جنوری دیہات کا کنواں

(و)

(۱۰۸) وشوامتر عادل

دسمبر مُدّت کے بعد (نظم)

(۱۰۹) وجاہت حسین صاحب سندیلوی

دسمبر محبت کی بھول بھلیاں (افسانہ)

(۱۱۰) ولیم ہیزلٹ (ترجمہ عبدالعلیم ہاشمی غازی پوری

دسمبر عام فہم طرزِ تحریر

(ی)

(۱۱۱) یحییٰ نقوی

مئی شباب کی بغاوت

(۱۱۲) (حکیم) محمد یوسف حسن

فروری ہندو مسلم اتحاد

جوش ملیح آبادی

جنوری صحیفۂ نو۔ اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت۔ مسائلِ حیات۔ غزل گوئی۔ بدحواسیاں۔ نعرۂ شباب۔

فروری قومیت کا تخیل اور ہندو مسلمان۔ ادبِ لطیف۔ ایک تقابل۔ مسائلِ حیات۔ احساس۔ بگلبانگِ نوشانوش۔ موتی یا شبنم

مارچ سعیِ لاحاصل۔ انیسِ خلوت ہے۔ بے بہا آنسو۔ علم کی تشنگی۔ ہندوستانی پردہ۔ ترے بغیر۔ مسائلِ حیات۔

اپریل انقلاب کی آواز۔ خدا ہوجا۔ آجا۔ مسائلِ حیات۔ آبگینہ۔ اللہ کرے۔ آدم و حوا کی تصویر۔ ساغرِ ہندوستان۔ غزورِ ادب۔

مئی خاتونِ مغرب۔ ساقی۔ کوہستانِ دکن کی عورت۔ مسائلِ حیات۔ سیاہ فام۔

جون۔ آدمی دسے لے خدا۔ ڈاکٹر انصاری کی موت۔ طوفانِ شہر۔

جولائی۔ مرا بندہ جس وقت بیدار ہوگا۔ برسات ہے برسات۔ مرے آگے۔

اگست۔ خرابات۔ جادو بیانی۔ پرانی تصویر۔ ناآشنا ہاں ان۔ مسائلِ حیات۔ دو تابوت۔ اگر قدم نہ محبت کا دریا تک ہو۔

ستمبر۔ ساون کے مہینے۔ خاتونِ مشرق۔ ساقی۔

اکتوبر۔ جنونِ آرزو۔ شاعر اور لیڈر۔ مسائلِ حیات۔ تحسینِ ناشناس۔ امیر تکبر سے۔ شاعر کی بخششیں۔

نومبر۔ مشاہدات۔ ترانۂ بہار۔ تعظیم نہ کر۔ خونی ہنیڈ۔ شمع و پروانہ۔ تحسین کے پھول۔ نقاد

دسمبر۔ چادر کی بھیک۔ افسردہ صبح۔ غزل گوئی۔ ناصح مشفق سے خطاب۔ مقامِ شیخ۔ روحِ استبداد کا فرمان۔

پکچر ہاؤس

چار ہزار روپیہ آپ کو یکمشت حاصل ہو جائے یا یکسال تک چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا رہے تو پھر آپ کس خوش قسمت سمجھینگے - یہ ہو سکتا ہے اور اگر آپ امرت کیمیکل کمپنی کے اس کمپیٹیشن میں شامل ہو جائیں تو یہ ناممکن نہیں ہے کہ پہلا انعام آپ ہی کو مل جائے معمہ سادہ ہے۔ آپ اس کو آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔ اس قیمتی موقع کو ضائع نہ کریں اور آج ہی اس کو حل کر کے اپنا داخلہ جلدی بھیجدیں۔

(۱) ۴۰۰۰ - چار ہزار روپیہ یکمشت یا چار سو روپیہ ماہوار بارہ مہینہ تک اس معمہ کو بالکل صحیح حل کرنے والے کو دیا جائے گا۔

(۲) ۱۵۰۰ - ڈیڑھ ہزار روپیہ رنرزاپ یعنی اس معمہ کا ⅔ اور ⅓ صحیح حل کرنے والوں کو دیا جائے گا۔

(۳) ۵۰۰ - پانچسو روپیہ سپیشل پرائزوں میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ ڈیڑھ سو روپیہ، سو روپیہ اور پچاس روپیہ بالترتیب تین ایسے اشخاص کو دیا جائے گا جن کے بالکل صحیح، ⅔ صحیح اور ⅓ صحیح حل دوسروں سے پہلے وصول ہونگے اور دو سو روپیہ اس شخص کو دیا جائے گا جس کے داخلوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

ایڈیشنل پرائز اوپر کے نقد انعامات کے ساتھ ہر بالکل صحیح حل کرنے والے کو ولیسٹ اینڈ کی ایک ایک رسٹ واچ۔ ہر ⅔ صحیح حل کرنے والے کو "پارکر" کا ایک ایک فونٹین پن اور ہر ⅓ صحیح حل کرنے والے کو دوسرے میکر کا ایک ایک فونٹین پن دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہر ایسے شخص کو جس کے نام سے بیس یا اس سے زیادہ سٹ ایک لفافہ میں موصول ہونگے ایک ایک قیمتی سنہری رسٹ واچ دی جائے گی اور ہر جیتنے والے کو "لال امرت" کی ایک ایک شیشی بھی پیش کی جائے گی۔

—— حل طلب معمہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔

(۱)

		۱۴
	۱۵	
۱۶		

(۲)

		۱۶
	۱۷	
۱۸		

(۳)

۹	۱۸	۱۸
۱۶	۱۹	۱۰
۲۰	۸	۱۷

طریقۂ حل اس سٹ کے تینوں مربع نقشوں میں جو خانے بھرے ہوئے ہیں ان کو اپنی حالت پر برقرار رکھتے ہوئے بقیہ خالی خانوں میں ایسے ہندسے لکھیں کہ ان کی ہر قطار کو اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں یا ایک کونے سے دوسرے کونے تک جوڑا جائے تو ہر طرف سے پہلے مربع کا حاصل جمع پینتالیس (۴۵) دوسرے کا اکاون (۵۱) اور تیسرے کا ستاون (۵۷) ہو۔ کسی ایک مربع میں کوئی ہندسہ ایکبار سے زیادہ استعمال نہ کیا جائے۔

قواعد وضوابط (۱) مندرجہ بالا تینوں مربعوں کا پورا سٹ ایک معمہ ہے اور فیس داخلہ فی سٹ ایک روپیہ ہے جو صرف منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے آنی چاہیے (۲) ہر شخص جتنے سٹ چاہے سادہ کاغذ کے الگ الگ ٹکڑے پر حل کر کے ایک ہی لفافہ میں اور ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتا ہے۔ چند اشخاص کے حل بھی ایک لفافہ میں اور ان کی فیس ایک ساتھ بھیجی جا سکتی ہے۔ ہر کاغذ پر سٹ کے نیچے اپنا نام اور پتہ لکھدیں (۳) حل کے ساتھ فیس داخلہ کا پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی رسید منسلک کرنا ضروری ہے (۴) صحیح حل وہی سمجھا جائے گا جو ہمارے سربمہر حل کے مطابق ہو جو امپیریل بنک لمیٹڈ دہلی میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ بالکل صحیح حل سے وہ سٹ مراد ہے جس کے تینوں مربعے صحیح ہوں۔ ⅔ صحیح وہ سٹ ہوگا جس کا کوئی دو مربعے صحیح ہوں اور ⅓ صحیح وہ سٹ ہوگا جس کا کوئی ایک مربعہ صحیح ہو (۵) کسی نقد انعام کے حقدار ایک سے زیادہ ہونگے تو اس کی رقم ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگی۔ رنرزاپ کا انعام ⅔ اور ⅓ صحیح میں دو مناسب حصوں میں تقسیم کیا جائے گا (۶) انعامات میں سے ایک شخص صرف ایک ایک حصہ پا سکیگا اور بڑا انعام جیتنے والا چھوٹے انعام کا حقدار نہیں ہوگا (۷) حل ۱۳ فروری ۳۷ء تک پہنچ جانا چاہیے (۸) اس کمپیٹیشن کے بارے میں منیجر کا ہر فیصلہ ناطق اور بہر صورت واجب التسلیم ہوگا (۹) کوئی ایسا شخص انعام کا حقدار نہیں ہوگا جو ان قواعد و شرائط کو پورا نہ کرتا ہو یا اس کے اندراجات مشکوک ہوں۔ فیس داخلہ کے طور پر یا اس کے ساتھ آئی ہوئی رقم کسی حالت میں واپس نہیں ہوگی۔ امرت کیمیکل کمپنی کا کوئی کارکن اس کمپیٹیشن میں شامل نہیں ہو سکتا (۱۰) داخلہ بند ہونے کے ایک ہفتہ کے بعد سربمہر صحیح حل اخباروں میں چھپوا دیا جائے گا۔ اور اس کے دو ہفتہ کے بعد نتیجہ یعنی انعام جیتنے والوں کا نام شائع کیا جائے گا۔ جو لوگ اپنے پتہ کا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ بھیجیں گے ان کو چھپا ہوا نتیجہ وقت مقررہ پر براہ راست روانہ کر دیا جائے گا۔ نتیجہ شائع ہونے سے پہلے اس کمپیٹیشن کے بارے میں خط یا ملاقات کے ذریعے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جائے گا —— حل اور فیس داخلہ بھیجنے کا پتہ:- کمپیٹیشن نمبر ۶ - امرت کیمیکل کمپنی - پوسٹ بکس ۲۷ - نئی دہلی

COMPETITION No. 6. AMRIT CHEMICAL CO.

POST BOX 27, NEW DELHI.

ٹریڈ مارک رجسٹرڈ

مَاءُ اللَّحم خاص الخاص

رجسٹری نمبر ۵۵۲۲

یونانی دوافروشوں کا بھلا ہو، چند بوتلیں اور چند ٹوٹے پھوٹے مرتبان رکھ کر ہر شخص ماء اللحم سہ آتشہ کا اعلان کرتا ہے، کوئی قانون نہیں جو اُن کو جھوٹ بولنے سے روک سکے، حکیم اجمل خاں مرحوم کا خدا بھلا کرے جنھوں نے ہندوستانی دواخانہ دہلی قائم کرکے طب یونانی کی حفاظت کی اور شخصی نفع کی لعنت جو لالچی دوافروشوں کا شیوہ ہو چکی تھی، اِس سے دواخانہ کو پاک رکھا۔

ہندوستانی دواخانہ

کی آمدنی طبیہ کالج دہلی پر صرف کی۔ آج ہم اس مرحوم کے نام لیوا اُن کی رُوح کو شرمندہ نہیں کرتے بلکہ اُن کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں، ماء اللحم کی ہر ایک بوتل اس کی تصدیق کرے گی۔ منگائیے اور استعمال کیجئے۔ سردی کا موسم اس کے استعمال کا صحیح وقت ہے۔ قیمت فی بوتل (۱۲ خوراک) پانچ رُوپے

ترکیب استعمال:۔ روزانہ صبح کے وقت پانچ تولہ ماء اللحم میں مصری ایک تولہ ملا کر پیا جائے۔

ملنے کا پتہ:۔ **ہندوستانی دواخانہ دہلی** پوسٹ بکس نمبر ۲۲

ویدک یونانی دواخانہ دہلی

دہلی میں ایک عظیم الشان دوائی خانہ ویدک یونانی دواخانہ لمیٹڈ بازار لال کنواں زینت محل میں زیر سرپرستی عالی جناب فخرِ خاندانِ شریفی شمس الحکما حکیم عبد الغنی صاحب رئیس اعظم دہلی جاری ہوا ہے۔ اِس دواخانہ کے متعلق بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دواخانہ دہلی کا سب سے ممتاز دواخانہ ہے جس کے ڈائریکٹرز کے مدِ نظر طب یونانی کا احیا، اور اِس تکلیف کو رفع کرنا مقصود ہے جو لوگوں کو صحیح اجزا سے تیار کردہ مرکب ادویات کے نہ ملنے کے باعث ہوتی ہے۔ یہ دواخانہ یونانی طب اور ویدک کے کامیاب اور مجرب نسخہ جات کا مخزن ہے۔ اور شاہی اطبا کے وہ خاص الخاص نسخے بھی اس میں تیار موجود رہتے ہیں جو صرف راجاؤں اور والیانِ ریاستوں کو ہی نصیب ہوتے تھے، پس یہ مجربات سالہا سال کی جانکاہ مشقتوں اور طبی تجربوں کے کامیاب نتیجے ہیں، جن کو جدید سائنٹفک طریقوں سے تیار کیا گیا ہے۔ برص، دق، نسوانی امراض، قوتِ باہ اور آتشک، سوزاک وغیرہ کے نہایت کامیاب نسخے موجود ہیں، جو تیسرے روز ہی اپنا جادو کا سا اثر کر دیتے ہیں۔

جتنے بڑے سرمایہ سے اس دواخانہ کو جاری کیا گیا ہے اُس کی نظیر دہلی میں کوئی دواخانہ پیش نہیں کر سکتا۔ یہ لوگوں کی خوش قسمتی ہے اور دواخانہ کو بھی اس پر بجا فخر و ناز ہے کہ عالی جناب حکیم عبد الغنی خاں صاحب جن کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اپنی زندگی میں اپنی بجائے باہر روانہ کیا کرتے تھے کافی سے زیادہ وقت اس دواخانہ کے مختلف شعبوں کی نگرانی میں صرف کر رہے ہیں، دواخانہ نے ایک سند یافتہ لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ اور باہر سے آنے والے مریضوں کی رہائش کا انتظام بھی اگر مریض آنے سے پیشتر اس امر کے متعلق اطلاع دیں تو حسب منشا کر دیا جاتا ہے۔ آج ہی حالاتِ مرض لکھکر روانہ کیجئے، اور دہلی کے اطبا کی مایۂ ناز ہستیوں حکیم عبد الغنی خانصاحب و حکیم ناصر الدین صاحب کے طبی لاثانی تجربوں سے فائدہ اٹھایئے

مینجر ویدک یونانی دواخانہ لمیٹڈ زینت محل دہلی

معاصرین کرام کی آرا

لاہور کے ہفتہ وار اخباروں میں دورِ جدید ممتاز حیثیت رکھتا ہے مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور مفید ہے۔ **معارف**

اس میں ایک ہفتہ وار اخبار کی تمام خصوصیات موجود ہیں ایڈیٹر صاحب پرچے کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ . . . . **جاتو**

ترتیب شگفتہ، مقالات پر فکر، رائے میں متانت دیانت مضامین عمدہ اور معلومات کا اچھا ذخیرہ ہوتے ہیں۔ **انجم**

اس کی خبروں کا انتخاب پنجاب کے ہفتہ وار اخباروں میں سب سے بہتر ہوتا ہے۔ **ہمدرد**

نہایت قابلیت سے ایڈیٹ کیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو مختلف اخباروں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے . . . . **مصباح**

لاہور سے آجکل جس قدر اخبارات شائع ہوتے ہیں، بعض بڑے چھوٹے ہفتہ وار اخباروں میں دورِ جدید ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے . . . . **مدیم**

دورِ جدید اردو کا بہترین ہفتہ وار اخبار ہے . . . . **دلچسپ**

لوگوں میں مقبولیت اور کسی پر اعتراض کرتے وقت نہایت شرافت کو مد نظر رکھتا ہے۔ **پیغام صلح**

بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ عام مذہبی دلچسپیوں اور مفید معلومات سے اس کا کوئی نمبر خالی نہیں ہوتا . . . . **شاہکار**

سالانہ قیمت پانچ روپے ۔ قیمت فی پرچہ ایک آنہ ۔ نمونہ مفت

مینجر دورِ جدید۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

بنامِ قوّت وحیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت نے دیا ہے مجھکو صدحیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے

منظور شدہ سررشتہ تعلیم
قیمت فی پرچہ نو آنے

دہلی

جلد ۳ — بابۃ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۷ء — نمبر ۲

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے گورد فیشن ہمدرد پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم رو ڈ قرول باغ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مُدیر

ہمہ دانی

ہماری یہ صدی، "ہمہ دانی" کی صدی ہے ——— ہم اتنے متعدد مسائل اور اِس قدر مختلف علوم میں اپنی دستگاہ کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ آخر کار اربابِ نظر کو پتا چل جاتا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں، اور ہماری نظر کس قدر وسیع واقع ہوئی ہے۔

یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ ہمارے علمی رجحانات جس قدر وسیع ہیں، اُسی وسعت کے ساتھ کھوکھلے، اور سطحی بھی ہیں۔

ہمیں اس کا تو شوق ضرور ہے کہ ہم ہر بحث میں، دنیا کے تمام نظری و عملی مسائل پر روشنی ڈال کر سامعین پر اپنے تبحّر کا سکہ بٹھا دیں۔ اور جس طرح حافظ شیرازی کا نام،

"گویند ذکرِ خیرش در خیلِ عشق بازاں"

کے سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ اُسی طرح ہمارا نام بھی "در خیلِ علم بازاں" لیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہم میں یہ ذوق پختہ کیسا، پیدا ہی نہیں ہوا ہے کہ جن مسائل پر ہم گفتگو کرتے ہیں، اُن پر درحقیقت حاوی بھی ہو جائیں۔

بات یہ ہے کہ سیاسی حالات کی ابتری، اور ذہنی ماحول کی تنگی کے باعث

ہم نے اب تک یہ فیصلہ ہی نہیں کیا ہے کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا بہتر ہے کہ گرمیٔ محفل، اور نمود و معاش کے واسطے ——— اور علم کی محض چند ابتدائی منزلیں طے کر کے خود فروشی کرتے پھرنا مناسب ہے، یا دراصل علوم میں کامل دستگاہ پیدا کرنا قرینِ دانشمندی ہے۔

ہماری علمی صحبتیں اکثر و بیشتر مضحکہ انگیز ہوا کرتی ہیں۔ ہمارے مذاکراتِ علمی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا ہے تو مقرر کی تقریر کو تمام و کمال سننے کے عوض، ہم میں سے ہر شخص اِس بات کے لئے بیتاب نظر آتا ہے کہ جلد سے جلد اُسے اپنی رائے کے اظہار کا موقع مل جائے، اور جب مقرر کی تقریر کسی قدر طویل ہونے لگتی ہے تو "معاف فرمایئے گا"، اور "قطعِ سخن تو ہوتا ہے" کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگتی ہیں۔

واضح رہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہو سکتا جس پر ہم اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکتے ہوں۔

ہم میں سے اکثر "اربابِ علم" کا ماخذ ہوتی ہیں، گھبرائے ہوئے ایڈیٹروں کی رائیں، اور بھٹکے ہوئے مقالہ نگاروں کی تنقیدیں، یا زیادہ سے زیادہ "انسائیکلو پیڈیا" کی جلدیں، ہم اُن تمام رایوں اور تمام تنقیدوں کو، جو مہنگے یا سستے رسالوں اور اخباروں سے گڑھی گڑھائی، اور ڈھلی ڈھلائی

بل جاتی ہیں، چُپ چاپ تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جب کسی علمی صحبت میں علم فروشی کا موقع بات آجاتا ہے تو ہم اُن تمام بنی بنائی مستعار رایوں اور تنقیدوں کو اپنے ذاتی "علمی تصورات" اور "حکیمانہ نظریات" کی شکل میں میزوں پر گھونسے مار مار کر اس دلولے اور طمطراق کے ساتھ پیش کرنے لگتے ہیں گویا ماورِ فضیلت کا خلفِ اکبر اپنی تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔

ہماری علمی صحبتوں میں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ اصلی موضوع سے رفتہ رفتہ اِس قدر ہٹتے چلے جاتے ہیں کہ آخری فقرہ ختم کرکے یہ پُوچھنا پڑتا ہے کہ ہم کس مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے ——— ایک صحبت میں تاریخ کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا۔ لیکن دو گھنٹے کی طویل مکالمت میں نفسِ تاریخ، یا مغزِ تاریخ، یا مقصدِ تاریخ پر کسی نے ایک فقرہ بھی زبان سے نہیں نکالا، البتہ اس قسم کے اُمور پر بحث کھل کر باتیں ہوتی رہیں کہ ہمایوں کس دن پیدا ہوا تھا، بیرم خاں دراز قد تھا کہ پستہ قامت، ہیمو بقال ڈاڑھی رکھتا تھا کہ منڈاتا تھا، اور سکندرِ اعظم کی ماں کا نام اُس کی دادی کو پسند تھا کہ نہیں؟

افسوس کہ ہماری "علمیت" میں عمق کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا، اس لئے ہم اپنے علم کو صرف ایک "کھلونا علم" تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ہم دوسروں کے خیالات و ملفوظات کے اُڑا لینے میں تو بہت شاطر ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ اُنھیں تفکر کی ترازو میں کیوں کر تولا، اور تدبر کی بھٹی میں کیونکر تپایا جا سکتا ہے۔

اربابِ نظر اِس حقیقت کو متعدد بار دُہرا چکے ہیں کہ صرف "پڑھ لینے" سے کوئی شخص تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا، اور جب تک کہ "پڑھا ہوا" انسان کافی طور سے "گڑھا ہوا" نہ بن جائے، اور اپنے "پڑھے ہوئے" کو ہضم کرکے جزوِ بدن نہ بنالے، اُس کا مرتبہ ایک "خواندہ جاہل" کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

یعنی علم جس وقت تک کہ صرف "معلوم" کی حد تک ہے، اُسے کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ جب وہ "معلوم" کی منزل سے گزر کر "محسوس" کے دائرے میں آجاتا ہے تو اُس وقت وہ دُنیا کی سب سے بڑی عزت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

ہم پر "ہمہ دانی" کا بھوت بھی کس قدر سوار ہے کہ اکثر و بیشتر افراد بغیر شرم محسوس کئے اِس بیسویں صدی میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں کہ سیاسیات، دینیات، ادبیات، نفسیات، معاشیات، طبعیات، مابعد طبعیات، اور خدا جانے کتنے دیگر "آت" سے لے کر شطرنج، چوسر، علم الید، موسیقی، عروض، پتنگ بازی، رمل، جفر، کشتی، اور گھوڑوں کی جراحی تک میں انھیں ایسی دستگاہِ کامل حاصل ہے کہ ملک میں اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اور اُس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک عجیب تماشہ ہے کہ ایسے اشتہاری عُلماء اپنی پُشت پر معتقدین کی ایسی بڑی بڑی جماعتیں رکھتے ہیں جو انھیں جامع العلوم کے نام سے پکارتی، اور اُن کے ہر دعوے پر سرِ تسلیم خم کر دیتی ہیں۔

حیرت، بالائے حیرت ہے کہ اب تک ہم میں موٹی موٹی باتوں تک کے سمجھنے کا سلیقہ نہیں پیدا ہوا ہے ——— معمولی سی بات ہے لیکن کسی کی اِس پر نظر ہی نہیں پڑتی کہ قدرت نے انسان کو اِس قدر مختصر زندگی دی ہے، اور اِس افسوسناک اختصار کے باوصف اُس کی زندگی کو اتنی مصروفیتوں، غفلتوں، ہیجانوں، بیماریوں، اور بیچارگیوں کا صید مستقل بنا رکھا ہے کہ دُنیا کے تمام عُلوم تو بڑی چیز ہیں، اُس غریب کو صرف ایک علم میں بھی کمال حاصل کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

کتنی پیش پا اُفتادہ بات ہے کہ اِس عظیم الشان کاروبارِ حیات میں ہمیں صرف ساٹھ برس جینے کا وقت دیا گیا ہے ——— اگر طفلی سے لے کر پیری، یا پیدائش سے لیکر موت تک انسانی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ صرف اُن لوگوں کو جو تمام حوادث سے محفوظ رہتے ہوئے عمرِ طبعی تک پہونچتے ہیں، کسی خاص علم و فن میں مہارت حاصل کرنے کا جو وقت ملتا ہے وہ کسی طرح آٹھ دس برس سے زیادہ نہیں ہوتا۔

یہ آٹھ دس برس بھی فیاضی کے ساتھ حساب لگا کر بتائے گئے ہیں۔ ورنہ مدتِ کار تو صرف پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اگر اِن آٹھ دس برسوں کو ہی تسلیم کر لیا جائے، تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اِس قلیل مُدت میں سیکھ ہی کیا سکتے ہیں۔ اور اِن حالات میں کسی کا "ہرفن مولا" کا دعویٰ کرنا ایک مضحکہ خیز بات کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

کسی کا قول ہے کہ جب ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جینا شروع کریں تو اُسی وقت ہمیں موت آ جاتی ہے۔

ہاں اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ ابتدائے شعور سے لے کر پیری تک اگر کوئی شخص "یک در گیر و محکم گیر" پر عمل پیرا ہو کر کسی ایک ہی علم و فن کی دُھن میں لگا رہے، اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو ہاتھ بھی نہ لگائے، اور اپنے فن کی وابستگی میں اُس کے دل پر ا۔

"از من بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

کی سی محویت طاری ہو جائے، تو زندگی کے آخری ایام میں بیشک اُسے اپنے فن کے اندر ایک ایسا درجہ حاصل ہو سکتا ہے، جسے کمال تو نہیں، البتہ مماثل کمال ضرور کہا جا سکتا ہے۔

"حاصل ہو سکتا ہے" میں نے جان بوجھ کر لکھا ہے، کیونکہ ان تمام شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں کی جا سکتی کہ ایسے شخص کو ہمیشہ کامیابی ہی ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ان تمام مراحل کے بعد بھی حصولِ مقصد میں ناکام رہ جائے۔ جس کی متعدد نظیریں تاریخ میں موجود ہیں۔

لیکن ان باتوں پر غور کرنے والے کتنے ہیں۔ یہاں تو ہمہ دانی کا ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ کوئی اپنی جرمنی کی "ڈاکٹری" پر اکڑ رہا ہے تو کوئی اپنی دیوبندی "دستار" پر اترا رہا ہے، اور کوئی ماہرالسنہ ہونے کے غرور میں زمین پر پاؤں نہیں رکھتا۔ لیکن اگر ان سب حضرات کا تجزیہ کیا جائے تو مشکل سے دو فیصدی تو آپ علم کے اندر کم و بیش کمر کمر تک ملیں گے، اور باقی اٹھانوے فیصدی گھٹنوں گھٹنوں بھی نہیں، بلکہ ٹخنوں ٹخنوں سے زیادہ نہ مل سکیں گے۔

ماہرالسنہ کو علمی حلقوں میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے، میں اُس کے شرف کا منکر نہیں، کیونکہ مختلف زبانیں جاننے کے باعث وہ متعدد اقوام کے افکار و خیالات سے بہرہ مند ہو سکتا ہے اور ممالکِ غیر کے سفر میں ہم اُسے ترجمان کی حیثیت سے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

لیکن حقائق و معارف کے دائرے میں صرف ماہرالسنہ ہونا کوئی قابلِ منزلت مقام نہیں سمجھا جا سکتا۔

فرض کیجئے ایک شیر سے ملتا جلتا جانور ہے جسے ہم "بلی" کہتے ہیں، اس باب میں ایک زبان کے افراد پر اس ہفت زبان کو یہ فضیلت ضرور حاصل ہے کہ وہ بلی کے سات ناموں سے واقف ہے۔

لیکن بلی کے سات ناموں سے واقف ہونے کے باعث کیا وہ اس حقیقت تک بھی پہونچ گیا ہے کہ بلی دراصل ہے کیا؟

یعنی کیا کسی شے کے متعدد ناموں سے آگاہ ہو کر کوئی شخص اُس شے کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو ماہرالسنہ صرف اپنے ذخیرۂ الفاظ پر تو جس قدر چاہے اترا لے، لیکن حقائق سنجی کے کوچے میں اُس کی کوئی پرستش نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی شخص تمام اشیاء کے اسماء جانتا ہے، لیکن حقیقت کسی ایک کی بھی نہیں جانتا، تو وہ اُس شخص کے سامنے نہایت پست درجہ رکھتا ہے، جو تمام اشیاء کے اسماء تو نہیں جانتا لیکن چند اشیاء کی حقیقت جان چکا ہے۔

ہمارے انہماکِ ہمہ دانی کے مرض کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے دو زیادہ قوی معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) اول تو یونیورسٹیوں کی قابلِ ماتم حد تک ناقص تعلیم و تربیت۔ (۲) دوسرے محکومی۔

شاید کہا جائے کہ "ہمہ دانی" کے مرض کو محکومی سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ چند لفظوں میں اس کی شرح کر دی جائے۔

بات یہ ہے کہ محکوم قوم ہر نوع کے حقیقی شرف و مجد سے کچھ تو خود محروم ہو جاتی ہے اور کچھ محروم کر دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم کا ہر فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بے عزت و حقیر ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ عزت خواہی انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور یہ وہ خواہش ہے جو اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ اس کرۂ ارضی پر نوعِ انسانی کا وجود قائم ہے۔ اس لئے محکوم افراد کو ایک طرف تو اپنی حقارت کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی عزت کی جائے۔

چنانچہ اس کشمکش میں پھنس کر وہ ہاتھ پاؤں ہلانا شروع کر دیتے ہیں، اور چونکہ انھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ محکومی میں وہ حقیقی عزت تو مل نہیں سکتی جس کے

حسن مثالی مرحوم:-

دل جسے محسوس کرتا تھا وہ عزت کیا ہوئی

کہہ گئے ہیں۔ اس لئے وہ ہر اس نمائشی اور جھوٹی عزت کی طرف دوڑنے لگتے ہیں جو انھیں قابلِ حصول معلوم ہوتی ہے۔

اس نمائشی عزت کی بہت سی راہیں ہیں۔ کوئی دولت جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی لیڈری کا پیشہ اختیار کرتا ہے، کوئی پیری مریدی کرنے لگتا ہے۔ کوئی غداری اور جاسوسی پر کمر باندھ لیتا ہے۔ کوئی عہدوں اور خطابوں کے پیچھے دوڑتا نظر آتا ہے اور جن سے یہ کچھ نہیں بن پڑتا وہ اپنے ہاتھوں پر مہمہ دانی کے بورڈ لٹکائے ممبروں پر خطبے دیتے نظر آتے ہیں۔

ان متذکرہ بالا شکلوں میں سے ہر شکل مخلوق سے ایک مطالبہ ہے کہ اگر تو میری حقیقی طور سے عزت نہیں کرتی۔ تو کمبخت اس جہت اور اس صورت سے تو میری عزت کر کہ میں یہ ہوں، اور میں وہ ہوں۔

جس قدر بھی غور کیجئے اس مرض کے دفع کرنے کی یہی صورت نظر آتی ہے کہ پہلے تو یونیورسٹیوں کی تعلیم و تربیت کو درست و تندرست کیا جائے تاکہ ہمارے ذہنی ماحول میں روشنی اور ہوا پہونچ سکے، دوسرے سیاسی ماحول کو جلد تر بدلنے کی ہر ممکن سعی کی جائے۔ تاکہ ہم خود اپنی زندگی کا ضابطہ مرتب کرنے کے قابل ہو جائیں۔

جس وقت یہ دونوں صورتیں پیدا کر لی جائیں گی اس وقت ہندوستان پر یہ راز افشا ہو جائے گا کہ "ناقصِ ہزار فن سے" کامل یک فن" کا مرتبہ زیادہ بلند اور زیادہ ارفع ہوتا ہے۔ اور اس وقت یہ حقیقت بھی کھل جائے گی کہ اگر قلم کی نوک سے پیشانیٔ روزگار پر کوئی لافانی نقش بنانا ہے تو یہ معرکۂ عظیم وہی اور صرف وہی ادیبِ اعظم سر کر سکتا ہے جو صبحِ زندگی کی پہلی کرن کے سونے سے لیکر شامِ زندگی کی آخری کرن کے نرمے تک ایک ہی صنفِ علم کی طرف رخ کئے برابر چلتا رہا ہو۔ جسے راستے کے درختوں کی خنک چھاؤں نے دم لینے پر ایک بار بھی مجبور نہ کیا ہو، اور جسے دوسرے شاخ در شاخ راستوں کے نظر فریب موڑ صراطِ مستقیم سے کبھی ایک قدم بھی نہ ہٹا سکے ہوں۔

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود لیک صنم بہ سجدہ در، سجدہ مشترک نخواست

(غالب)

ایک عبرتناک حادثہ

کوئی دس پندرہ روز گزرے کہ میں اپنے مشہور ادیب اور ملک کے حقیقی خیرخواہ دوست ل۔ احمد صاحب کے الیکشن کے سلسلے میں فرخ آباد گیا ہوا تھا، جو میرے آباء کا قدیم وطن ہے، وہاں میرے مخلص دوست محمود علی خاں صاحب نے، جو اپنے وطن فرخ آباد میں نہایت غیر معمولی طور سے ہر دلعزیز ہیں، میری ایک بزرگوار سے ملاقات کرائی، جن کا نام پنڈت سندرلال حسّا مشرا تھا ——— اور انھیں کی صحبت میں یہ بات طے پائی کہ پرسوں ایک ادبی اجتماع کیا جائے، اور پنڈت جی اس کی صدارت فرمائیں۔

چنانچہ جلسے کا انعقاد ہوا، اور جب میں وہاں پہونچا تو پنڈت جی کو موجود پایا ——— تھوڑی دیر کے بعد صدارت کی تحریک و تائید پر پنڈت جی نے صدارت قبول فرمالی۔ اور صدارتی تقریر شروع کر دی۔

ابھی پنڈت جی کو تقریر کرتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ آپ یکایک گر پڑے، لوگوں نے گھبرا کر آپ کو اٹھایا اور ایک طرف لٹا دیا ——— اور موصوف کو ہوش میں لانے کی مختلف تدبیریں کی جانے لگیں۔

اس موقعے پر میرے محترم دوست، اور ملک کے مشہور شاعر حضرت حکیم آزاد انصاری بھی تشریف فرما تھے، سب سے پہلے آپ کا خیال نبض پر گیا۔ چنانچہ آپ نے پنڈت جی کی نبض دیکھتے ہی فرمایا کہ نبضوں کا کہیں پتا نہیں چلتا۔

اتنے میں ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے، اور امتحان کے بعد اعلان کر دیا کہ سلسلۂ حیات منقطع ہو چکا ہے۔

یہ سنتے ہی حاضرینِ بزم پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ اور میرے قلب پر تو یہ اثر ہوا گویا بجلی گر گئی۔ اس کے بعد آپ کی لاش کو ایک تخت پر نہایت احترام کے ساتھ رکھکر بلا تفریق تمام ہندو مسلمان کاندھا دیتے ہوئے آپ کے مکان تک لے گئے۔ چونکہ کاندھا دینے والوں اور لاش کے ہمراہ

[illegible] والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے راستے میں جو مسلمان ملتا تھا وہ کلمہ پڑھتا ہوا لاش کے ہمراہ ہو لیتا تھا۔

مرحوم پنڈت جی عربی و فارسی کے بہت بڑے فاضل، اور ہماری قدیم تہذیب کے ایک بے مثال نمونہ تھے۔ پنڈت جی کو شاہنامہ فردوسی اور مثنوی مولانا رُومی پر جس قدر عبور حاصل تھا اُس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے، اور اُسی کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ میں بھی آپ کو نہایت اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔

اخلاق کا یہ عالم تھا کہ امیر ہو یا غریب، ہر آنے والے کو عزت واحترام کے ساتھ بٹھاتے تھے، اور چلتے وقت دُور تک پہنچانے جاتے تھے، اور اُسی کے ساتھ ساتھ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی آپ سے ملنے آئے، اور آپ اُس کی گھر باز و بید کی خاطر نہ جائیں۔

مرحوم کے اخلاق کا سب سے زیادہ سبق آموز اور لطیف پہلو یہ تھا کہ آپ اپنے چھوٹوں تک سے اِس قدر با احترام پیش آتے تھے کہ اُن کی تعظیم کے واسطے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

شعر وادب سے مرحوم کو اِس قدر ذوق تھا کہ ہر موضوع پر سینکڑوں شعر یاد تھے، اور حافظہ اس قدر اچھا تھا کہ جو کچھ پڑھا تھا، وہ تمام کا تمام اس پیرانہ سالی کے باوصف مستحضر تھا۔

افسوس کہ ہماری قدیم تہذیب و شرافت، اور ہمارے قدیم علم وادب کے نمونے ایک ایک کرکے اُٹھتے چلے جارہے ہیں، اور مغربی تہذیب کا دھارا اس قدر تیز بہہ رہا ہے جس سے ہم یہ اُمید ہی نہیں رکھ سکتے کہ ہماری آئندہ نسلیں ہمارے روایات کو برقرار رکھنا کیسا، اُنھیں حاصل بھی کر سکیں گی۔

نہیں معلوم ہم کدھر بہے چلے جارہے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری کشتی کس ساحل پر جاکر لگے گی، اور کیا معلوم کہ لگے گی بھی، یا کسی سیاسی بھنور ہی میں پھنس کر غرق ہو جائے گی۔

افسوس کہ پنڈت جی آج ہم میں نہیں ہیں۔ مگر انسان کی رُوح اگر فنا نہیں ہوتی، اور جسم سے جُدا ہونے کے بعد وہ سُن بھی سکتی ہے تو ہم پنڈت جی سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مرتا تو ہر شخص ہے، مگر آپ کی موت قابلِ فخر موت ہے۔ ایک ادیب و عالم کو یوں نہیں مرنا چاہیے ——— پنڈت جی، قدرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ کا سا فاضل آدمی بسترِ مرگ پر دم توڑے چنانچہ اُس نے آپ کی موت کے واسطے بساطِ ادب بچھا دی کہ ایک ادیب کے مرنے کے واسطے اِس سے بہتر اور کوئی مقام ہو ہی نہیں سکتا ———

اسی کے ساتھ ہم آپ کی خدمت میں یہ خبر بھی پہونچا دینا چاہتے ہیں کہ اگر آپ ہندو مسلم اتحاد بورڈ کے صدر تھے تو آپ کے جنازے میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ اور جس وقت آپ کا جنازہ لبِ دریا پہونچا تھا اُس وقت مسلمان، ہندوؤں سے بہت زیادہ تھے ——— آپ کے غم میں تمام اہلِ شہر نے مکمل ہڑتال کی تھی، اور ہندوؤں مسلمانوں سب کی دوکانیں بند تھیں۔ آپ کے انتقال نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک سچے ادیب اور شریف مزاج انسان کی زندگی و موت، مذہبی تعصبات سے بالاتر ہوتی ہے، اور اُس کی محبوبیت، فرقہ واریوں کی تمام ناپاک زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا کرتی ہے۔

کیا کوئی پڑھنے والا اِس سے کوئی سبق حاصل کرے گا؟

وہ مظالم جو روز ہوتے ہیں

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمارا شکار کا ذوق، صدہا بے گناہ جانوروں اور ہزاروں معصوم طائروں کو گولی سے نہ اُڑا دیتا ہو۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمارے معدے کی خاطر بکرے، مینڈھے، تیتر اور مرغ وغیرہ نہ حلال کئے جاتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہمارے پاؤں کے نیچے سینکڑوں کیڑے مکوڑے کچل کر نہ مر جاتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ درندے، اور سانپ، جانوروں اور انسانوں کو ہلاک نہ کرتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ریلیں، اور لاریاں، جانداروں کو نہ پیس ڈالتی ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ سواری اور بار برداری و کاشتکاری کے جانور اپنے مالکوں کی بے رحمیوں کے ہاتھوں کام کرتے کرتے دفعتاً اسی جگہ گر کر

نہ مر جاتے ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ مکڑیاں، مکھیوں کو، چھپکلیاں کیڑوں اور پتنگوں کو، اور بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نہ نگل جاتی ہوں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ غریبوں کو امرا نہ روند ڈالتے ہوں، اور

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ قوی انسان کمزور انسان کو قتل نہ کر ڈالتا ہو۔

یہ وہ مظالم ہیں جو اس آسمان کے نیچے ازل کے روز سے برابر ہو رہے ہیں، اور آج بھی بلا ناغہ روزانہ ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

ان میں سے دو ایک مظالم تو سوسائٹی، مذہب اور قانون کی نگاہ میں قابل سزا ہیں، اور باقی کثیر مظالم کو خود سوسائٹی، مذہب اور قانون نے سند جواز دے رکھی ہے۔

مکھی کو مکڑی کے جال میں پھڑپھڑاتے اور بھنبھناتے اگر ہم دیکھ بھی لیتے ہیں تو بھی کوئی پروا نہیں کرتے ——— سڑکوں پر قصاب بکروں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے کان پکڑے کھینچتا ہوا لے جاتا ہے۔ اور وہ ہر قدم پر چیختے چلاتے جاتے ہیں، مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ——— معصوم چڑیاں چہچہوں میں مصروف ہوتی ہیں کہ بندوق کا دھماکا ہوتا ہے اور وہ زمین پر گر کر پھڑپھڑانے لگتی ہیں، مگر کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔

آخر اس ہر روز ہلاک ہونے والی مخلوق کا خالق کون ہے؟ اور کیا وہ اس قدر کمزور ہے کہ اپنی مخلوق کو بچا نہیں سکتا؟

یا اس دنیا کے دو خالق ہیں ایک ناطاقتوں کا، اور ایک ——— طاقتوروں کا؟

اگر ایسا ہے تو کیا دونوں مساوی القوت ہیں؟ یا یہ ہے کہ ناطاقتوں کا خالق ناطاقت اور طاقتوروں کا خالق طاقتور ہے؟ یا یہ کہ ناطاقتوں اور طاقتوروں، دونوں کا خالق ایک ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اس کا کوئی جواب دیا جا سکتا ہے کہ آخر وہ خالق اپنی ناطاقت مخلوق کو، طاقتور مخلوق سے کیوں ہلاک کرا ڈالتا ہے۔

کیا در اصل وہ یہ چاہتا ہے کہ ناطاقت مخلوق باقی نہ رہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اُس نے ناطاقت مخلوق کو خلق ہی کیوں فرمایا!

یا یہ معاملہ ہے کہ اُس نے ناطاقت مخلوق کو صرف اسی لئے خلق فرمایا ہے کہ وہ طاقتور مخلوق کی غذا بن کر اُسے اور زیادہ طاقتور بناتی رہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ ناطاقت مخلوق کو جس وقت ہلاک کیا جاتا ہے تو اس وقت اُسے لطف آتا ہے، یا تکلیف پہونچتی ہے؟

ناطاقت مخلوق کے چیخنے تڑپنے اور زبان باہر نکال دینے سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے ہلاکت کے وقت سخت اذیت ہوتی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اذیت اُسے کس قصور اور کس خطا پر دی جاتی ہے!

کیا محض اس تنہا بنا پر کہ وہ کمزور ہے؟ اور اگر بنائے اذیت یہی ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ناطاقت مخلوق اپنی کمزوری کی خود ذمہ دار ہے، یا وہ پیدا ہی کمزور کی گئی ہے!

ظاہر ہے کہ کمزور مخلوق پر کمزور ہونے کی ذمہ داری کسی طور سے بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔

تو کیا قدرت کی بخشی ہوئی کمزوری کی سزا اس کی کمزور مخلوق کو ملنا چاہیئے؟ یعنی قصور کس کا ہو، اور سزا کسے ملے، یہی بات ہے نا!

پس ان حالات میں کس کی مجال ہے کہ اس عالم کون و فساد میں کوئی انصاف کا نام بھی زبان پر لا سکے۔

پس جو کچھ ہو رہا ہے، وہی انصاف ہے، اور جو کچھ اس سے بھی زیادہ ہوگا وہ اس سے بھی بڑا انصاف ہوگا۔

یہ چھوٹی موٹی روزمرّہ کی باتیں ہیں جو سیدھے سادے انداز میں سرسری طور سے لکھ دی گئی ہیں۔ مگر ارباب بصیرت کے لئے ان میں غور کرنے کی اتنی زبردست گنجائش ہے کہ اکثر انھیں کے ذریعے سے دنیا کے بڑے بڑے نظریات، و کلیات کو یکسر بدل دیا جا سکتا ہے۔

کاش کوئی غور کرے! کاش کوئی صاف اور غیر آلودہ عقل کے ساتھ غور کرے!

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

معلوم!

یہ میرے بچپن کے دوست ابرار حسن خاں آثر ملیح آبادی کی نظم ہے، جو برسوں کے بعد کبھی کبھی شعر کہنے کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کم مشقی کے بادصف قارئین اندازہ کریں گے کہ نظم میں چستی اور الفاظ میں ہم آہنگی کس قدر پائی جاتی ہے، کاش یہ کاہل انسان حرکت میں آجاتا! (مدیر)

نغمۂ بربط و گلبانگ ہزاراں معلوم　　تو نہیں ہے تو نشاطِ چمنستاں معلوم

حیف دلِ زندہ ہی پہلو میں نہ ہو گرم خروش　　التفات و کرم زہرہ جبیناں معلوم

ہر زیاں وہم ہے ہر سو ہے اک نقشِ فریب　　تلخیٔ کشمکشِ گردشِ دوراں معلوم

یہ زلیخا کی نگاہوں کا اثر ہے ورنہ　　گرم بازاریٔ حُسنِ مہ کنعاں معلوم

خُون میں جوشِ جنوں ہی نہ رہے تو ہمراز　　ساز و برگِ چمن و ابرِ بہاراں معلوم

موت کا نغمہ نہ گُونجے جو میانِ ظُلمات　　سازِ جاں پروریٔ چشمۂ حیواں معلوم

ایک اک سجدے میں صد عشوۂ حورانِ بہشت　　عصمتِ بندگیٔ زُہد فروشاں معلوم

زیست ہے پردۂ مرہم میں نمکداں بر کف　　رسمِ غمخواری و اَوضاعِ طبیباں معلوم

تو اگر حلقۂ رنداں میں نہ ہو گرم خروش　　جادوئے زمزمۂ بادہ فروشاں معلوم

ایک کروٹ ہے محبت کی ازل ہو کہ ابد　　وسعتِ دامنِ طولِ شبِ ہجراں معلوم

سب اثر گوشِ محبت کا ہے جادو ورنہ
گوہر افشانیٔ لعلِ لبِ جاناں معلوم

ابرار حسن خاں آثر ملیح آبادی

مسئلہ ارتقا سائنس کے نقطہ نظر سے

عبدالرحیم شبلی
بی۔کام

شبلی صاحب کا یہ نامعقولی اور نیم منقولی مقالہ اس کی دعوت دیتا ہے کہ ارباب سائنس اس کا جواب تحریر کریں۔

"کلیم"

اگرچہ میں اقتصادیات کا طالبعلم ہوں لیکن میرا علمی ذوق بعض اوقات مجھے ایسی باتوں کے مطالعے کی بھی ترغیب دیتا ہے جو بظاہر میرے حیطۂ عمل سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ اِس قسم کی ایک علمی جستجو میں نے مسئلہ ارتقاء کے متعلق کی تھی جس کو میں آسان اور غیر اصطلاحی الفاظ میں قلمبند کرتا ہوں۔ نظریہ ارتقاء کی تنقید کے سلسلے میں میں نے بعض اپنے ذاتی تاثرات پیش کئے ہیں جن کی صحت یا عدم صحت پرکھنے کے لئے میں اُن قارئین کی توجہ مبذول کرتا ہوں جن کو سائنس میں مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ میں انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ مسئلہ ارتقاء پر معاشی نقطۂ نظر سے بھی روشنی ڈالونگا۔

شبلی

نظریۂ ارتقا کن حالات میں مترتب ہوا

جب سے علم وحکمت نے انسان کے دماغ میں تابندگی پیدا کی ہے اُس کا ذہن اِس طرف راغب ہو رہا ہے کہ اُسے کس نے پیدا کیا۔ یا وہ کس طرح معرضِ ظہور میں آیا۔ خصوصاً اٹھارویں صدی کے آغاز میں کافی تذبذب اِس مسئلے کے متعلق پایا جاتا ہے اور اُنیسویں صدی کے آخر میں یہ تحقیقات اپنے عروج کو پہنچیں۔

اگرچہ اِسے فیصلہ کُن تحقیقات تو نہیں کہہ سکتے لیکن خیال آرائی کے لحاظ سے یہ یقیناً اِنسانی علم کا کمال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کو ہم زمانۂ تحقیقاتِ ارتقاء کہتے ہیں۔ کیونکہ اِس زمانہ میں قدیم تھیوریاں غلط ثابت کردی گئیں اور معاشرتی و سیاسی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی اتحاد کی داغ بیل ڈالی گئی۔

اینگلوسیکسن اپنے آپ کو خُدا کے محبوب سمجھتے تھے۔ رومیوں کا خیال تھا کہ حربی لحاظ سے اُن کا کوئی نظیر نہیں۔ فرانسیسیوں کا ایمان تھا کہ خدا نے اُن کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ افریقہ اور ایشیاء کے لوگوں کو یورپی لوگ بوجہ اُن کی رنگت کے "اچھوت" خیال کرتے تھے۔

اِن حالات میں ڈارون نے اعلان کیا کہ وہ سب انسانوں کی شکلو

میں بندر کی تمثیل نمایاں دکھتا ہے۔ جس نے حیوانی ارتقار کو مدِنظر رکھ کر ثابت کیا کہ انسان ایک ہی "مادہ و ماخذ" کا مرہونِ منت ہے۔ اور وہ مادہ و ماخذ وہی ہے جس نے بندروں، چیونٹیوں۔ گدھوں اور سانپوں کو ترویج دی۔

شاید آپ یہ فقرہ سن کر گھبرا جائیں اور آپ کے سر میں درد ہونے لگے کہ آپ بندر کی اولاد ہیں۔ لیکن ڈارون نے اِس نظریئے کی بناء "جذبات" پر نہیں بلکہ سائنٹفک تحقیق و تدقیق پر رکھی تھی۔

ڈارون کی تھیوری

چنانچہ اُس نے ۱۸۶۹ء میں ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "آغازِ انواع" اُس میں اُس نے بتایا کہ انسان شروع میں ایک جاندار مادے کی شکل میں پایا جاتا تھا جو بعد میں حیوانی صورت میں ظاہر ہوا جہاں سے وہ ترقی کرتا کرتا انسان بن گیا۔

پھر وہ لکھتا ہے کہ اِس جاندار مادّے[1] میں جو تغیرات بوجہ آب و ہوا۔ ماحول اور نشو و نما وغیرہ ہوئے وہ آئندہ نسلوں میں بصورتِ جرثیم منتقل ہو گئے۔ یہ تغیرات دو قسم کے تھے۔ مفید اور غیر مفید۔ اِن دونوں میں جنگ آزمائی ہوئی۔ اور آخر کار حیات کے لئے قدرت نے اُس تغیر کو چن لیا جو سب سے طاقتور ثابت ہوا اور جو "اصولِ بقائے اصلح[2]" کے مطابق بہترین تھا۔

"یہ منتخب شدہ تغیرات" اپنے طریق پر ارتقا پذیر ہوتے رہے حتّی کہ اُن میں سے ایک ایسی نسل پیدا ہو گئی جو اپنے آباء و اجداد سے بدیہی طور پر مختلف اور اپنے ماحول کے بالکل مطابق تھی۔ یہ اِس لئے کہ جو تغیرات جانداروں میں ماحول اور اردگرد کی فضا کے مطابق ہوئے وہ بقائے نسل کے اعضاء کے ذریعے سے منتقل ہوتے گئے اور اُن تغیرات میں سے بھی صرف وہی دائمی طور پر قائم رہے جو اصولِ بقائے اصلح کے مطابق بہترین تھے۔ حتّی کہ ایک ایسی نسل پیدا ہو گئی جو اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات کے عین مطابق تھی۔

موافقت میں ثبوت

ڈارون نے اپنی تھیوری ثابت کرنے کے لئے کئی ثبوت دئے۔ مثلاً

اُس نے کہا کہ اگر پرندوں کی سانس کی نالیوں کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو اُس سے معلوم ہوگا کہ وہ گلپھڑوں سے مشابہت رکھتی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کے آباؤ اجداد گلپھڑوں سے سانس لیا کرتے تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ پرندوں کے آباؤ اجداد رینگنے والے جانور تھے۔

پھر جغرافیائی شہادت یہ ہے کہ قدرت کے منتخب شدہ تغیرات ہر ماحول کے مطابق نہیں رہتے۔ بلکہ وہ مختلف حالات میں مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً مجمع الجزائر گیلہ پگوس کے بہت سے جزیروں میں بڑے کچھوے کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جوں جوں ماحول تغیر پذیر ہوتا ہے جاندار بھی اپنی شکل و صورت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پس اگر ابتدائی جاندار ماحول کے مطابق تغیر یافتہ ہو کر انسان کی صورت میں جلوہ گر ہو گئے ہیں تو یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔

مسئلہ ارتقار کے ثبوت میں ایک اور بات یہ ہے کہ جملہ جانداروں کے جسم اور اُن کی ساخت میں بعض مشترکہ باتیں پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سب کا ماخذ ایک ہی تھا۔ مثلاً مینڈک چھپکلی اور پرندوں کی ہڈیوں میں کافی مماثلت ہے۔ "وھیل مچھلی" کے سامنے کے اعضاء جو چپو کا کام دیتے ہیں۔ عام مچھلی کا چانہ۔ انسان کے ہاتھ۔ اور پرندوں کے بازو۔ یہ بظاہر سب مختلف کام کرتے ہیں۔ مثلاً مچھلی اُن سے محسوس کرتی ہے۔ انسان پکڑتا ہے اور پرندے اُڑتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب چیزیں ایک مشترکہ ذوی الاعضاء شکل کے آثار ہیں جن اعضاء کو استعمال کیا گیا وہ باقی رہ گئے لیکن جن اعضاء کو استعمال نہیں کیا گیا وہ یا تو ناکارہ ہو گئے ہیں اور یا بالکل مٹ گئے ہیں۔ مثلاً گھوڑے کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ٹانگیں بوجہ دوڑنے بھاگنے کے خوب ظاہر ہیں لیکن باقی ابتدائی عضو یا تو اتنے ظاہر نہیں اور یا بالکل ناپید ہو چکے ہیں۔

اِسی طرح انسان کی دُم غائب ہو چکی ہے اگرچہ پرانے ڈھانچوں سے اُس کے آثار رہتے ہیں۔ پس اعضاء کا اشتراک بھی ثابت کرتا ہے کہ تمام جانداروں کا مادہ و ماخذ ایک ہی تھا۔

اِس بات کا ثبوت کہ جاندار اپنے ماحول کے مطابق رہتے ہیں اور

---

[1] نخزمایہ Protoplasm

[2] Survival of the fittest

اگر اُن کا ماحول بدل دیا جائے تو اُن کو اپنی شکل بھی تبدیل کرنا پڑے گی ہمیں تیتروں اور کیڑوں کی انہی حالتوں کی مثال سے ملتا ہے۔ اکثر کیڑے جو ابھی کسی خاص صورت میں تبدیل نہیں ہوئے تھے پودوں کے زیرِ اثر سبز رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ تیتری بھی اُس رنگ کی ہو جاتی ہے جس رنگ کے ماحول میں وہ اُڑتی پھرتی ہے۔

ڈارون کے نزدیک ابتدا میں صرف جاندار مادّہ موجود تھا۔ جو ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنی شکل بدلتا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اُس میں تغیرات پیدا ہوتے گئے۔ اور اِن تغیرات میں جنگ ہوئی۔ جو تغیرات فاتح ہوئے وہ آہستہ آہستہ موجودہ جانداروں کی شکل میں نمودار ہوگئے۔ کیونکہ ماحول کا تقاضا یہی تھا۔

ڈارون کے پیشرو محققین کا نظریہ

ڈارون نے یہ نظریہ بیکمال تمام خود قائم نہیں کیا بلکہ اُسے اپنے پیشرو محققین سے بھی گرانقدر امداد ملی۔ مثلاً کویر Curvier ایک سائنسدان تھا جس نے ڈارون سے پہلے ریڑھ کی ہڈیوں والے جانوروں کے آثار مطالعہ کرکے نظریۂ ارتقاء کی بنیاد رکھی اور گھوڑے ہاتھی کے آثار چٹانوں سے کھود کر اُس نے اُن کے آبا و اجداد کو واحد ثابت کیا۔

اسی طرح بیر Baer نے Embryology جنینیات حیاتیات کے ذریعہ سے ثابت کیا کہ جاندار پہلے یک نسلی تھے پھر وہ متعدد النسل بن گئے۔ یہ نظریہ بھی ڈارون کے لئے کافی مفید ثابت ہوا۔

بیر کی وفات کے بعد Sohleiden و Schwann نے اپنا نظریۂ مسامات شائع کیا جس میں اُنھوں نے بتایا کہ نباتات اور حیوانات میں مساموں کے لحاظ سے مماثلت ہے اور ثابت کیا کہ جاندار ایک مسامی کی حالت سے متعدد المسامی کی حالت کو پہنچے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء کی مخالفت

ڈارون کی جب یہ تھیوری شائع ہوئی تو مسیحی یورپ میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا لیکن آہستہ آہستہ اکثر مذہبی علماء بھی اس کو صحیح تسلیم کرنے لگے حتی کہ اب اکثر پادری ایسے بھی ہیں جو بائبل کی اُس تعلیم کو جو نظریۂ ارتقاء سے متخالف ہے رد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اگرچہ کلیسا نے اِس تھیوری کو درست تسلیم کر لیا ہے لیکن ابھی سائنسدان خود بھی اِس کی صحت پر مجتمع نہیں ہیں بلکہ جدید نظریئے کی رُو سے ڈارون کی تھیوری غلط ثابت ہو چکی ہے۔

چنانچہ حال ہی میں مسٹر جارج نے اِس نظریئے کے خلاف رسالہ نائن ٹین سنچری اینڈ آفٹر میں لکھا تھا:۔

> "نظریہ ارتقاء کے بارے میں سب سے ضروری سوال یہ ہے کہ کیا اس کو سائنٹفک کہا جاتا ہے؟ جو چیز سائنٹفک ہوتی ہے اُس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے عام طور پر نظائر اعمال کو مشاہدہ۔ تجربہ، روایت عقل اور رُوحانیت کے ذریعے سے پرکھا جا سکتا ہے
>
> اگر یہ سچ ہے کہ انسان حیوان سے ترقی پذیر ہوا ہے تو آج بھی اِس کا مشاہدہ ہونا چاہیئے اور ہمارے سامنے کوئی متعین مثال ہونی چاہیئے کہ فلاں حیوان انسان بنا ہے۔ اِسی طرح اصول تجربہ اِس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے سامنے کوئی مثال ہو جس کو دیکھ کر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ اشرف المخلوقات نیچی ذات کی مخلوق سے پیدا ہوا ہے۔
>
> اگر نظریۂ ارتقاء روایت کے مطابق ہے تو ہمیں تاریخ سے اِس بات کا ثبوت ملنا چاہیئے کہ انسان آہستہ آہستہ اپنے تمام اشتغال میں تکمیل کے درجے تک پہنچا ہے
>
> پھر نظریئے کو عقل کے مطابق بنانے کے لئے ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دماغ کس طریق پر اور کن کن درجوں میں سے گذر کر بنا ہے۔
>
> یہاں تک روحانیت اور وجدان کا تعلق ہے چونکہ نظریۂ ارتقاء کا لازمی نتیجہ مادیت اور دہریت ہے

اِس لئے اِس نقطۂ نظر سے اِس نظریہ کا ثبوت ہی نہیں مل سکتا۔"

مسٹر بونر کے اِس استدلال کی تصدیق ڈاکٹر آسٹن کلارک مشہور ماہر علم الحیوانات مستمعہ سونین انسٹی ٹیوشن امریکہ نے بھی کی ہے جس کی وجہ سے سائنسدانوں کے طبقے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ سہ ماہی رسالہ ریویو آف بیالوجی میں ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:۔

"انسان بندر کا بھتیجا نہیں ہے۔ وہ ایک حادثہ ہے ایک فوق الفطرت کرشمہ۔ اور عملی طور پر وہ ایک خاص مخلوق ہے"

پھر وہ لکھتے ہیں۔

جہاں تک حیوانات کے بڑے فریق کا تعلق ہے حامیانِ تخلیق کی دلیل زیادہ قوی ہے۔ اِس بات کے لئے کوئی شہادت نہیں ہے کہ حیوانات کا بڑا فریق کسی دوسرے فریق سے پیدا ہو۔ اِس میں سے ہر ایک ایک جُدا اور خاص مخلوق ہے البتہ وہ باقی خلق کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے"

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں

انسان برف کے زمانے سے قبل ظاہر ہوا۔ اور وہ اچانک منصۂ شہود پر آیا وہ اسی شکل میں آیا جس شکل میں آج موجود ہے اُس وقت سے قبل بھی چل سکتا تھا۔ سوچ سکتا تھا اور اپنی مدافعت کر سکتا تھا"

ڈاکٹر صاحب کی رائے میں "گم شدہ حلقہائے زنجیر" کوئی نہیں ہے۔ اُن کی رائے میں "گم شدہ حلقہائے زنجیر" ایک غلط بیانی ہے

ارتقاء بند کیوں ہو گیا؟

جہاں تک میں نے اِس مسئلہ پر غور کیا ہے مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہم ڈارون کی تھیوری پر ایمان لائیں۔ میرے نزدیک جہاں ارتقاء کا مسئلہ اس لحاظ درست ہے کہ ہر شئے آہستہ آہستہ بڑھتی ہے وہاں یہ درست نہیں کہ کم درجے کے حیوانات ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ کم درجے کے حیوانات پہلے ظہور میں آئے لیکن اِس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ انسان بن گئے۔ کیونکہ اگر یہ درست ہوتا تو چھوٹے درجے کے حیوانات تو آج بھی موجود ہیں وہ انسان کیوں نہیں بن جاتے۔ دوسرے الفاظ میں اب ارتقاء کیوں بند ہو گیا ہے؟

انسان کا بچپن کیوں لمبا ہے

پھر سوال یہ ہے کہ اگر یہ درست ہے کہ ہم بندروں وغیرہ سے ترقی کرتے کرتے انسان بنے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے بچپن کا زمانہ اتنا کم نہیں ہے جتنا کہ بندروں وغیرہ کا ہوتا ہے؟

کیا وجہ ہے کہ انسان کو اپنے بچپن کی تکمیل کے لئے ایک لمبا زمانہ گذارنا پڑتا ہے اور پیدا ہوتے ہی حیوانوں کی طرح چلنے کے قابل نہیں ہو جاتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ چھ سات ماہ کے معاً بعد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور روزی کمانے کے لائق نہیں ہو جاتا کیا وجہ ہے کہ اُسے چودہ پندرہ برس تک اپنے ماں باپ کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے؟

الغرض سوال یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ یہ نیا تغیر انسان کے بارے میں ہوا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ تغیر ارتقاء کے اصول کے تحت نہیں ہوا؟ دوسرے بچپن کی طوالت اور اپنے پاؤں پر جلد کھڑا نہ ہونے کا نقص ارتقائی نہیں ہو سکتا۔ یہ تو نزولی ترقی ہے۔ کیونکہ یہ گویا انسان کے بارے میں کمی واقع ہوئی!

یہ دلائل تو درست ہو سکتے ہیں کہ چونکہ انسان کو موجودہ قسم کی خوراک کھانی تھی اس لئے اُس کے دانت بھی تبدیل ہو گئے یا چونکہ انسان کو ایک لمبے عرصے تک نشست کرنی تھی اس لئے اُس کی دُم غائب ہو گئی یا چونکہ انسان کو اپنی انگلیوں سے ایک مخصوص اور مختلف نوعیت کا کام لینا تھا۔ اس لئے اُن کی شکل حیوانوں کے پنجوں سے مختلف ہو گئی۔ لیکن اِس اعتراض کے استرداد کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے کہ انسان کا بچپن دوسرے حیوانوں کے بچپن سے طویل کیوں کر ہوا؟

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ انسان کا بچپن اس لئے طویل ہے کہ اسے تعلیم و تربیت حاصل کرنی تھی۔ لیکن یہ دلیل تو نظریۂ ارتقاء کے خلاف ہے موافق نہیں ہے۔ کیونکہ حامیانِ ارتقاء کی رُو سے چونکہ انسان نچ ذات کے جانداروں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اس لئے اُسے چاہیئے تھا کہ وہ علم و حکمت جانوروں کی نسبت جلد حاصل کرے لیکن ایسا نہیں ہوتا پس ثابت ہوا کہ ارتقاء نہیں ہوا بلکہ نزولی ترقی ہوئی ہے۔

ارتقاء کے سات مدارج

اصل میں بات یہ ہے کہ "انسان" حیوانوں کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ علیم و حلیم خدا کا پیدا کردہ کرشمہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُسے آہستہ آہستہ ترقی دی۔ لیکن وہ کسی جانور سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اِسی صورت میں پیدا ہوا جس صورت میں وہ آج موجود ہے۔ اُس کا بچپن بھی خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت سے طویل رکھا تاکہ وہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے اہل ہو سکے

قرآن مجید میں انسان کے ارتقا رکو بدیں الفاظ بیان فرمایا گیا ہے:-

(۱) ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ ؟ سے پیدا کیا۔

(۲) پھر ہم نے اُس کو ایک قرار مکین میں نطفہ بنا کر رکھا۔

(۳) اُس نطفے کو علقہ یعنی جاندار مادہ بنا کر رکھا۔

(۴) علقہ کو مضغہ یعنی گوشت کا لوتھڑا بنایا۔

(۵) مضغہ میں ہڈیاں پیدا کیں۔

(۶) اِن ہڈیوں پر گوشت اور چمڑا چڑھایا۔

(۷) اِس طرح پر ہم نے اُس کو ایک جُدا خلق بنایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے احسن الخالقین کو برکت دی۔ (سورۂ المومنون)

پس یہ ہیں سات منازل جس میں سے انسان گذر کر موجودہ صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اور اِس کے علاوہ مشاہدہ اور تجربہ یا عقل و روایت کسی بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ اور نہ کسی قسم کا ارتقا ثابت ہوتا ہے۔

پہلے عورت تھی یا مرد

اب سوال یہ ہے کہ شروع شروع میں انسان آیا کہاں سے؟ آیا خدا تعالیٰ نے عالمِ خیال کے مطابق کوئی مٹی کا پُتلا بنایا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی اور وہ انسان بن گیا۔ یا پہلے کوئی جوڑا پیدا کیا جس میں سے موجودہ نسلِ انسانی عالمِ وجود میں آئی؟ میرے خیال میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) شروع شروع میں عورت اور مرد کا ایک جوڑا یا زائد جوڑے پیدا کئے گئے۔ اور اُن سے نسلِ انسانی کی ترویج ہوئی۔

(۲) صرف ایک عورت پیدا کی گئی اور اُس میں سے ایک آدمی پیدا ہوا اور بعد کو اُن کے ملاپ سے موجودہ نسل ظاہر ہوئی۔

(۳) شروع میں صرف ایک آدمی تخلیق کیا گیا اور اُس میں سے ایک عورت پیدا ہوئی۔ جس کے بعد انسانی نسل بڑھنے لگی۔

جہاں تک پہلے احتمال کا تعلق ہے یہ تو ظاہر ہے کہ جب ایک جوڑے سے ہی کام چل سکتا ہے تو زیادہ جوڑوں کی ضرورت نہیں پس یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ شروع شروع میں صرف ایک جوڑا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اِس جوڑے میں سے عورت تھی یا مرد؟

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نطفہ مرد کی پیٹھ میں ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ عورت کے مخصوص حصہ میں داخل ہو کر اُس کے Ovum "انڈے" کو زرخیز کرتا ہے اور رحم میں جا کر ٹھہر جاتا ہے اور پھر وہاں سے بچے کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ نطفہ پیدا کرنے کی مشین انسان کے پاس ہے اور اُس کو زندگی دینے کا آلہ عورت کے پاس ہے۔

اگر ہمیں اِن دونوں میں سے "اہم ترین جزو" کا انتخاب کرنا پڑے تو ہماری نگاہ قدرتی طور پر مرد پر پڑیگی یعنی مرد ہی تخلیقِ انسانی کا مادہ و منبع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اُسی کا فیضان ہے کہ نسلِ انسانی کی ترویج ہوتی ہے۔

مرد نے بچہ کیونکر جنا

جب یہ ثابت ہو گیا کہ شروع میں نہ تو متعدد جوڑے تھے۔ نہ ایک جوڑا تھا نہ ایک عورت تھی۔ بلکہ ایک مرد تھا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ عورت کے بغیر بچے کیونکر پیدا ہوئے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ قدرت نے صرف مرد میں ہی ایسی خصوصیت رکھی ہو کہ شروع میں اُسے کسی عورت کی حاجت نہ رہی ہو مثلاً نطفہ کو قابلِ پیدائش بنانے کے لئے مرد میں ہی ایک رحم بھی بنا دیا گیا ہو اور وہی کام جو عورت کرتی ہے مرد کے ذریعے سے سر انجام پا گیا ہو۔ اور یہ کوئی بعید از قیاس بات بھی نہیں کیونکہ ہمارے مشاہدے میں ایسے جاندار آئے ہیں جو بظاہر تو مذکر ہوتے ہیں لیکن اُن میں تانیث کی صفت بھی پائی جاتی ہے ایسے جاندار کو "ہرمافروڈائٹ" hermaphrodite کہتے ہیں

یعنی ایسا جاندار جس میں تذکیر و تانیث کی دونوں صفات ہوں۔ چنانچہ ایسی صفات
سینڈکوں اور مچھلیوں میں پائی جاتی ہیں اور اس سے سائنس دانوں کو انکار نہیں۔

پس اگر دوسرے جانداروں میں تانیث کی صفت پائی جاتی ہے تو کوئی وجہ
نہیں کہ ہم اس حقیقت سے انکار کریں کہ قدرت نے شروع میں مرد میں ہی عورت
کی خصوصیات ودیعت کر دی ہوں۔ اس نظریئے کا حامی قرآن شریف بھی ہے چنانچہ
وہاں لکھا ہے

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ۔ یعنی تمہیں
ہم نے ایک جنس سے پیدا کیا اور اس میں سے اس کا زوج بنایا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پہلے "مرد" میں سے زوج کس طرح پیدا ہوا

اگر ہم پیدائش کے مختلف طریقوں کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا
کہ یا تو بچے مادہ کے جسم کے اندر ہی تیار ہو کر نکلتے ہیں اور یا وہ انڈوں کی شکل میں
نمودار ہو کر سورج کی گرمی سے یا مادہ کے سینے سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا طریق
تو چار ٹانگوں والے جانوروں مثلاً گھوڑوں گدھوں وغیرہ میں مروّج ہے۔ اور
دوسرا طریق پرندوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ بعض اوقات رحم کا کام بیرون جسم یا خارجی حالات
سے بھی ہو جاتا ہے یعنی بجائے بچے کے رحم میں تیار ہونے کے سینے یا گرمی پہنچانے سے
بھی بچہ نمودار ہو جاتا ہے۔

اغلب خیال یہ ہے کہ یہی طریق انسان کے بارے میں بھی ہوا۔ پہلے مرد کے
جسم میں ایک انڈا پیدا ہوا۔ جو بعد میں سورج کی گرمی سے یا کسی اور طریق سے
پھوٹا اور اس میں سے اس کا ساتھی یعنی عورت پیدا ہوئی۔

اس کا ثبوت ہمیں سائنس سے تو غالباً نہیں لیکن قرآن شریف سے ضرور
ملتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے

إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۔

یعنی (۱) ہم نے انسان کو لیسدار مٹی سے پیدا کیا۔ (۲) ہم نے اسے
ایک بجنے والی پکی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کسی لیسدار اور چکیلے مادے سے پیدا
ہوا جو کسی پکی ہوئی مٹی کی مانند کسی نتیے کے خول میں تھا۔ پس ظاہر ہے کہ انسان انڈے سے
پیدا ہوا۔

یہ انڈا مرد کے جسم میں کہاں سے آیا؟ اگر آپ سبزی چنے اور چند
گوشت کے ٹکڑے لیں اور ان کو ایک مٹکے میں بند کر کے رکھ دیں تو کچھ عرصے کے
بعد جب مادہ سڑ جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہیئت لیسدار نتیے کی
مانند ہو گئی ہے۔

پس اگر انسان نے شروع میں یہ چیزیں کھائیں تو کوئی وجہ نہیں
کہ اس کے پہلو میں نطفے کی سی نتیے پیدا نہ ہوئی ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں انسان کے اندر عورت والی خصوصیات
کیوں موجود نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب چونکہ ایک علیحدہ جنس اس مقصد
کے لئے تیار ہو گئی ہے اس لئے ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسان میں ایسا
تغیر ہو گیا کہ وہ اب اس خصوصیت کا حامل نہیں رہا۔

خلاصۂ سخن

الغرض خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ

(۱) انسان بندر سے پیدا نہیں ہوا بلکہ ایک علیحدہ ہستی ہے جو بہت سے مختلف
تغیرات میں سے گذر کر احسن الخالقین بنتا ہے۔

(۲) شروع میں صرف مرد موجود تھا جس کو خدا نے بنایا۔ اور جس میں
عورت والی یعنی رحم میں نطفے کی پرورش کرنے والی خصوصیات بھی موجود تھیں۔

(۳) سبزی اور گوشت وغیرہ کھانے کی وجہ سے اس میں نطفہ پیدا ہو جس
میں سے ایک نئی مخلوق بشکل عورت نمودار ہوئی اور وہ بعد کو اس کی زوج بنی۔

(۴) اب عورت اور مرد دو جُدا جُدا انواع ہیں جن کے علیحدہ علیحدہ
کام مقرر ہیں۔

مجھے چونکہ سائنس میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے میں بالخصوص
آخری حصہ مضمون کی طرف ان صاحبوں کی توجہ مبذول کرتا ہوں
جو اس علم کے ماہر ہیں۔

اصلاحِ زبان
کلیم کے ایک استفسار کا جواب

عبداللطیف لکچرار اخلاقیات
عثمانیہ کالج ورنگل (دکن)

رسالہ کلیم دہلی بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء میں ایک مضمون "کچھ زبان کے متعلق" جس کی سرخی تھی نظر سے گزرا چونکہ اس مضمون میں ناظرینِ کلیم سے عموماً اور جناب احسن مارہروی اور دتاتریہ صاحب کیفی اور مولوی عبدالستار صاحب صدیقی سے خصوصیت کے ساتھ خطاب ہے۔ اور اس باب میں اِن حضرات سے اظہارِ رائے کے متعلق لکھا گیا تھا کئی ماہ کے انتظار کے بعد جب کہ کوئی جواب میری نظر سے نہیں گزرا تو میں نے خیال کیا کہ یہ بحث زبان سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے کہ اصلاحِ زبان کا پہلو ملحوظ ہے اِس پر کچھ خامہ فرسائی کرنا مفید ہوگا۔

بعض بعض رسائل اِس طرف متوجہ نظر آتے ہیں اور اُن میں کوئی تنقیدی مضمون جب نظر سے گذر جاتا ہے تو اُن مباحث میں شرکت کو جی چاہتا ہے کہ تحقیق اور تنقید ہو کر بات چھن جائے تاکہ اس سے بہی خواہان اردو مستفید ہوں۔

کلیم کے استفسار کا خلاصہ یہ ہے (۱) کیا مہنّد الفاظ کو اُردو ہندی الفاظ کے زمرے میں داخل کیا جائے یا اُن کے ساتھ یہ رعایت ملحوظ رکھی جائے کہ فارسی عربی الفاظ کی طرح اِنھیں عطف و اضافت کی ترکیب کے ساتھ استعمال کیا جائے مثلاً محرم۔ مختار وغیرہ۔

(۲) فارسی اُردو الفاظ کی جمع جو بقاعدۂ عربی بنائی گئی ہے اُسے کہاں تک روا رکھا جائے۔ مثلاً جنگلات و خواہشات وغیرہ۔

(۳) یا وہ الفاظ جو عربی قاعدے سے ہندیوں نے بنائے ہیں لیکن عربی میں اُن کا پتہ نہیں چلتا مثلاً تنقید۔ وقیع۔ تردید۔ عادی وغیرہ۔

(۴) یا وہ الفاظ جو فارسی اُردو ہیں مگر عربی قواعد و الفاظ کے ساتھ ترکیب دے کر اُنھیں استعمال کیا جائے مثلاً فوق البھڑک، لاچار۔ مُرغن۔ بادشاہت وغیرہ

(۵) یا وہ فارسی ترکیبیں جنھیں اردو الفاظ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے مثلاً سمجھدار۔ گرانڈیل وغیرہ۔

(۶) یا وہ الفاظ جو مہمل اور از روئے قاعدہ بالکل غلط واقع ہوئے ہیں مثلاً درستی۔ ادائی وغیرہ۔

(۷) یا وہ الفاظ جو غلط معنے اور غلط محل پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً مُرتستی مسموم وغیرہ۔

(۸) اسی کے ساتھ ساتھ تلفظ کے متعلق بھی ارشاد فرمایا ہے کہ تلفظ کا مسئلہ بھی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے ایک گروہ تو اِس پر زور دیتا ہے کہ عربی و فارسی اعراب جو تصرف کہ اُردو نے کر دیا ہے اُسے روا رکھا جائے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں ہر فارسی عربی لفظ اپنے اصلی اعراب کے ساتھ استعمال کیا جائے مثلاً رمضان۔

حرکت ۔ میت ۔ نت ۔ وغیرہ

(۹) خاتمۂ مضمون پر لکھا ہے کہ وہ اس کے علاوہ دیگر غلطیاں اور بھی ہیں مثلاً سوائے میرے کے ۔ بجائے آپ کے ۔ مع اہل وعیال کے ۔ جوڑ توڑ کو ۔ وجوہات وامکانات وغیرہ

تفصیل میں جانے سے پہلے انشاء اللہ خاں کی "بڑی یادگار" اور "قابل قدر" کتاب دریائے لطافت سے ایک عبارت نقل کرتا ہوں قارئین کرام اس کو غور سے پڑھیں اور انشا کا فیصلہ اس باب میں ملاحظہ فرمائیں ملاحظہ ہو دریائے لطافت صفحہ ۱۴۲

"مخفی نماند کہ ہر لفظے کہ در اردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سریانی یا پنجابی یا پوربی از روئے اصل غلط باشد یا صحیح آن لفظ اردو ست اگر موافق اصل مستعمل است صحیح ست واگر خلاف اصل است ہم صحیح است صحت وغلطی آن موقوف بر استعمال پذیرفتن در اردو ہست زیرا کہ ہرچہ خلاف اردو ست غلط است گو در اصل صحیح باشد وہرچہ موافق اردو ست صحیح باشد گو در اصل صحت نداشتہ باشد"

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اس کی صحت وغلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے ۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اردو ہے غلط ہے، گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو"

اس رائے کے متعلق زبان اردو کے محقق مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو فرماتے ہیں کہ سید انشا کی رائے میں برقا صحیح اردو کا لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے ۔ یا وہ غدر کو بفتح دال اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکون دال ہے ۔ یہ سن کر بعض اصحاب جنھیں صحت لغت کا اسی قدر خیال رہتا ہے جیسے ایک مومن متقی کو ادائے ارکان صلوٰۃ کا ۔ اور خصوصاً ثقات لکھنو بہت جز بز ہوں گے ۔ لیکن جو لوگ اصول لسان سے واقف ہیں وہ سید انشا کی وسعت نظر اور اصابت رائے کی داد دیں گے فرق یہ ہے کہ سید انشا اردو کو ایک جدا زبان خیال کرتے ہیں اور غیر زبان کے جن الفاظ نے منجھ منجھا کر یا گھس پس کر یا اختلاف لہجہ یا دوسرے اسباب سے ایک خاص صورت اختیار کر لی ہے وہ اب اردو کے لفظ ہو گئے ہیں انھیں اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں رہا ۔ اور جو کچھ صورت ان کی پیدا ہو گئی ہے اور جس طرح وہ زبان زد خاص وعام ہو گئے ہیں وہی ان کی صحیح صورت ہے ۔ اصل زبان سے خواہ وہ کیسے ہی متباین اور مختلف کیوں نہ ہوں لیکن جو حضرات ابھی تک ان عربی فارسی الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں اصلی صورت میں لکھنا اور بولنا صحیح اور فصیح سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف کو غلط اور غیر فصیح، تو گویا وہ ابھی اردو زبان کو زبان ہی نہیں سمجھتے ۔ اسی اصول کو اگر مدنظر رکھا جائے اور ہر اردو لفظ اس کی اصلی صورت میں (یعنی جس زبان سے وہ آیا ہے) لکھنا اور بولنا شروع کریں تو اردو زبان کوئی زبان ہی نہ رہے گی اور موجودہ تحریر و تقریر کے سارے الفاظ باستثنائے چند کے غلط ٹھہریں گے ۔ کیونکہ اس میں جس قدر الفاظ ہیں وہ یا تو سنسکرت اور ہندی زبانوں کے ہیں یا عربی فارسی ترکی یا بعض یورپی السنہ اردو زبان مستقل زبان اسی وقت ہو گی جب وہ ان زبانوں کے لفظ لیکر انھیں اپنا کر لے اور جہاں وہ اپنے ہوئے ان کی شکل وصورت وضع قطع، رنگ ڈھنگ میں ضرور فرق آئے گا مگر ہم میں سے بعض نازک دماغ دقیق نظر حضرات کو ان غیرملکیوں کی یہ بے تکلفی ہرگز نہیں بھاتی وہ انھیں اپنا بنانا نہیں چاہتے بلکہ انھیں دھکیل دھکیل کر اپنے حدود سے باہر نکالنا چاہتے ہیں اگر سید انشا کے اصول پر عمل رہا تو اب تک اردو میں بہت کچھ وسعت اور شیرینی پیدا ہو جاتی"

اب میں ایک تفصیلی نظر ان الفاظ کے متعلق ڈالنا چاہتا ہوں جن کو کلیم نے مثالاً پیش کیا ہے ۔ امر اول کے متعلق عرض ہے کہ عطف و اضافت ان الفاظ میں جن کو باعتبار معنے وصورت عربی یا فارسی الفاظ سے کچھ بھی متشابہت یا مناسبت یا کوئی تعلق ہو ان کو مہند کہا جائے گا اور ان میں عطف و اضافت مخل فصاحت یا غلط نہ ہو گی ہاں محض ہندی الفاظ میں جیسے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک

وغیرہ قابلِ عطف واضافت نہ ہوں گے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ محرم جس کو کلیم نے مثالاً دیگر الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے جس کے معنے رازدار یا بات کا چھپانے والا۔ مگر کنایۃً انگیا کے معنے میں اہلِ ہند نے استعمال کیا ہے چونکہ اس کا پردہ عورت پر مرد سے واجب ہے اور یہ کپڑا گویا محرم راز ہے اس وجہ سے یہ نام رکھا گیا رفتہ رفتہ محرم نے یہ معنے اختیار کر لئے اس کو ہندی یا ہندی الاصل نہ صورۃً کہہ سکتے ہیں اور نہ معنےً۔ یہ لفظ عربی ہے اور مجازاً انگیا کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے چنانچہ آتش نے اس کو بترکیب فارسی استعمال کیا ہے کہتے ہیں ؎

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب سے جو برابر کوئی حباب آیا

اسی طرح غالب کے اشعارِ ذیل میں

پھر کھلا ہے درِ عدالت وناز	گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر	زلف کی پھر سررشتہ داری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب	اشکباری کا حکم جاری ہے
دل ومژگاں کا جو مقدمہ تھا	آج پھر اس کی روبکاری ہے

درِ عدالتِ ناز۔ اور بازارِ فوجداری میں اضافت طباطبائی مرحوم نے شرح دیوانِ غالب میں غلط بتائی ہے یہ غلط نہیں ہے اس لئے کہ عدالت بمعنے کچہری اور فوجداری بمعنے فتنہ وفساد بطورِ مجاز مستعمل ہوئے ہیں اس لئے کہ عدالت کے معنے انصاف کے ہیں اور کچہری کیا ہے جائے انصاف جس کے لیئے انصاف لازم ہے اسی طرح فوجداری، سررشتہ داری، روبکاری۔ مقدمہ، محرم وغیرہ سب مجازی معنے میں مستعمل ہیں

شوق نیموی لکھتے ہیں میرے نزدیک وہ الفاظ جو عربی یا فارسی ہوں اور اس میں ہند والوں نے لفظاً ومعناً تصرف کیا ہے اس کو بھی فصحا بترکیبِ فارسی جائز نہیں رکھتے مگر یہ قاعدہ انھیں الفاظ میں ہے جن کی فارسی مشہور ہے اگر فارسی ہند ہو یا نہ ہو مگر مشہور نہ ہو تو اس کو مفرس قرار دیتے ہیں اور بترکیبِ فارسی استعمال کر سکتے ہیں اساتذہ کے کلام میں جابجا ایسی ترکیبیں پائی جاتی ہیں چنانچہ ناسخ کہتے ہیں

؎ ہاتف بگفت مصرع سالِ بنائے آں
بابِ امام باڑہ سلطانِ خاص وعام

امام باڑہ کا ہندی ہونا رُبے ہندی کی وجہ سے ظاہر ہے پھر بھی بترکیبِ فارسی مستعمل ہے اسی طرح آتش کے شعر کے متعلق لکھتے ہیں ”محرم جن معنوں میں یہاں مستعمل ہے ہندا اور ترکیبِ فارسی موجود،،

میرے خیال میں سید انشاء اور مولوی عبدالحق صاحب کے فیصلے کے بعد اب کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے پھر بھی بعض امور کے متعلق عرض کیا جاتا ہے امر دوم کے متعلق عرض ہے کہ جنگل سے جنگلات۔ خواہش سے خواہشات وغیرہ یہ الفاظ جب بلا تکلف اردو میں بولے جاتے ہیں چنانچہ دکن میں محکمۂ جنگلات عام طور سے بولا جاتا ہے اُن کو زبانِ اردو میں اگر باقی رکھا جائے تو کیا قباحت ہے۔ جو لفظ عام ہو چکا ہے اور اردو کے بازار میں اس کا چلن عام ہو گیا تو اب اس کو کون روک سکتا ہے۔ لاکھ کوشش کی جائے مگر اس کا چلن نہیں رک سکتا۔

یہی گذارش امرِ سوم کے متعلق ہے یعنی وہ الفاظ جو عربی قاعدے سے ہندیوں نے بنائے ہیں لیکن عربی میں اُن کا پتہ نہیں چلتا مثلاً وقیع۔ تردید، تنقید۔ عادی وغیرہ رواج اور استعمال کو دیکھئے کہ اِن الفاظ کے استعمال میں ثقات احتیاط تو نہیں کرتے جب بلا تکلف زبان میں استعمال ہو رہے ہیں اور وسعتِ زبان کا مسئلہ درپیش ہے تو ایسی حالت میں جو الفاظ قبولیتِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں اُن سے بحث ہی نہ کرنا چاہیئے لفظِ تنقید پر ملک میں بحث ہو چکی ہے اور یہ لفظ اب ہر خواندہ شخص کی زبان پر ایسا عام ہو گیا ہے کہ اس کو ٹکسال باہر کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ یہ لفظ ادبیاتِ اردو سے خارج ہو سکتا ہے۔ عادی۔ عادت گیرندہ کے معنے میں استعمال صحیح ہے وزیر کہتے ہیں

؎ تیغِ ابرو کی زبان عادی ہوئی　بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی

نواب مرزا لکھنوی لکھتے ہیں

؎ ہم تو دشمن ہیں جعلسازی کے　آپ عادی ہیں رنڈی بازی کے

چونکہ لغۃً اس کے معنے ہیں وہ چیز جس کی عادت کی جائے

لیکن اُردو میں جہاں ترکیب فارسی نہ ہو عادی بمعنی عادت گیرندہ کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ سیکڑوں الفاظ عربیہ و فارسیہ کے معنوں میں اہلِ ہند نے تصرف کر لیا ہے اِس میں بھی تصرف روا رکھا جائے تو کیا نقصان ہے۔

صاحبِ فرہنگ آصفیہ اِس لفظ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "چونکہ یہ لفظ عربی ہے۔ فارسی مستند لغات یا کلام اساتذہ میں اس طرح نہیں آیا اِس وجہ سے اہلِ اُردو کا مخترع قرار دیا گیا۔ البتہ معتاد آیا ہے۔ لیکن صاحبِ غیاث کی رائے میں منسوب بہ عادت یعنی بحالتِ اِلحاق یائے نسبت تائے مصدری اخیر سے ساقط ہو گئی۔

امرِ چہارم کے متعلق عرض ہے کہ فوق البھڑک اور مجرّب وغیرہ اِس قسم کے الفاظ ہیں کہ مذاق اور ظرافت کے موقعہ پر لوگ استعمال کر جاتے ہیں اور ثقات مستند تحریروں میں اُن کے استعمال سے احتیاط کرتے ہیں لیکن والہ ہروی نے ذوالخور شیرین نظم کیا ہے۔

ؔ تا مہرِ تو گشت نور افشاں ذو الخور شیریں شد صفاہاں

اور مرزا بیدل نے النوید نظم کیا ہے ع النوید آفتاب عالمتاب۔

شوق نیموی لکھتے ہیں کہ کلماتِ عجمی پر الف لام کا داخل کرنا بعض اساتذہ کے کلام میں واقع ہوا ہے اما جائے کہ شائبہ مطائبہ نباشد فصحا اجتناب دارند بادشاہت، رنگت۔ نزاکت، یگانگت یہ فارسی والوں کی من گھڑت ہے عربی کے طور پر جعلی مصدر بنا ڈالے ہیں سب استعمال کرتے ہیں ان کا استعمال بھی کسی کے روکے نہ رُکے گا۔ لاچار کو غیر فصیح سمجھا جاتا ہے اور اُس کی جگہ ناچار فصیح خیال کیا جاتا ہے لیکن غالب نے لاچار ہی استعمال کیا ہے۔ البتہ مُرغن وتلاشی کے متعلق شوق نیموی کی رائے یہ ہے کہ مُرغن روغن داریا اِس قسم کے دوسرے الفاظ جن کا۔ مادہ عربی نہیں مگر اِن کا اشتقاق بطورِ عربی ہوا ہے اور عوام میں بولے جاتے ہیں میرے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں"۔

لفظ ادائی غنیمت پر نمبر، ڈال کر لکھا گیا ہے کہ وہ الفاظ جو مہمل اور از روئے قاعدہ بالکل غلط واقع ہوئے ہیں مثلاً درستی وادائی وغیرہ" میں نہیں سمجھتا کہ یہ الفاظ مہملات کی فہرست میں کیوں شمار کئے گئے ہیں۔

لفظ ادائی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ادا عربی کا مصدر ہے اور پھر اِس پر یائے مصدری یا یائے نسبتی بڑھانا درست نہیں ہے جب فارسی زبان میں اِس قسم کا تصرّف فصحا کے کلام میں موجود ہے تو پھر اِن الفاظ کو مہمل کہنا کیا معنے رکھتا ہے فصحا مصادرِ عربیہ کے آخر زیادتی یائے تحتانی کو جائز رکھتے ہیں چنانچہ انتظار سے انتظاری کہتے ہیں دیکھئے طالب آملی کا شعر ہے

ؔ ہر دل ز تو اشک ریز حسرت چوں گوشۂ چشم انتظاری (بہار عجم)

اِسی طرح زیادہ مصدر ہے اور اُس پر یائے بڑھا کر زیادتی کہا جاتا ہے مثلاً صائب کہتے ہیں:۔

ؔ بر چشم آن قدر کہ فزودیم ہمچو شمع سرمایۂ زیادتیِ اشک و آہ ما

اور اِسی طرح غالب کا شعر ہے۔

ؔ غلطیہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالے کو رسا کہتے ہیں۔

غلط مصدر ہے اور اُس پر یائے لگا کر غلطی بنایا اور پھر اُس کی جمع غلطیہا کہا۔

اب رہا تلفّظ کا مسئلہ کہ عربی فارسی اعراب پر جو تصرف کہ اُردو نے کر دیا ہے اُسے روا رکھا جائے یا فارسی و عربی لفظ اپنے اصلی اعراب کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

مسدس حالی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے اِس قِسم کے تصرف کو حالی نے جائز رکھا ہے اصلی تلفّظ سے ہٹ کر عام تلفّظ کا انھوں نے خیال کیا ہے چنانچہ حرکت اور برکت کو انھوں نے حرکت و برکت بسکونِ راء استعمال کیا ہے ع کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی۔

اور نیز فوقی یزدی کہتا ہے

ؔ ز لبس خوش حرکت و شیریں ادا بُو اگر مید و تیزی خوش نما بُو۔

شوق نیموی نے ازاحۃ الاغلاط میں لکھا ہے کہ غلط بر دو گونہ باشد اوّل غلطِ عام و آن اینکہ ہمہ دانان با اینکہ از چگونگی الفاظ ماہر باشند دران تصرفے کنند ہمچوں کافر کہ بکسرِ فاء است و با دلبر و خنجر قافیہ آرند و این قسم معیوب و مذموم نیست۔ دوم غلطِ عوام و آن خلافِ قسمِ اول بود ہمچوں تالاش بر وزنِ شاباش کہ محاورۂ ناواقفان است پس کسانیکہ غلط العام فصیح را در جوازِ غلط العوام آرند فرقے در ہر دو قسم نہ انگارند و از بے خبری غلط العام و غلط العوام را متحد المعنے پندارند

تلفظ کے مسئلہ کے تصفیہ کے وقت شوق نیموی کی رائے کا لحاظ رکھنا پڑے گا ورنہ زبان کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔

لفظ میت کے متعلق شوق کی رائے ہے کہ بفتح یائے مشددہ استعمال صحیح ہے نظم اردو میں کئی جگہ تربت وغیرہ کے وزن پر آگیا ہے مگر چونکہ قاعدے کے رو سے کسرہ چاہیئے فصحائے حال احتیاط رکھتے ہیں۔ اور لفظ نشہ کے متعلق کہتے ہیں بحرکتِ دوم شعرا نے استعمال کیا ہے ذوق

رات میخانہ میں ساقی جو نشہ سے بہکا خس شیشہ کو لگا کہنے خس جام تبر
رند ے مئے حسن کی کیا ہوئیں وہ بہاریں نشے رند نے کیا اتارے تھارے

بعض حضرات جو اس کو غلط بتاتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ یہ اردو کا محاورہ ہے اور بعض حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ جب ترکیب فارسی نہ ہو تو باتحریک ہی فصیح ہے یہ بھی قابل اعتبار نہیں ہے شیخ صاحب کے زمانے سے لے کر آج تک جتنے نامی شعرا ہوئے ہیں اُن کے کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ فارسی میں اس طرح آیا نہیں اِن لوگوں نے احتیاط کی ہے اور جس طرح فارسی میں مستعمل ہیں اُسی طرح یہ لوگ بھی فصیح سمجھتے ہیں۔

صاحب فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں کہ اِس لفظ کی تحقیق میں اختلاف ہے صاحب نفائس اس کو فارسی قرار دیتے ہیں صاحب بہار عجم اس کو اخیر میں ہمزہ کے ساتھ لکھکر عربی ہونے کا شبہ ڈالتے ہیں۔ صاحب آب حیات نشاہ لکھتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نشا اس کا مخفف اور یہ در اصل فارسی ہے۔ صاحب غیاث اس کا املا نشہ بروزن لِثہ لکھ کر عربی و فارسی ہونے کا احتمال پیدا کرتے ہیں اُن کے نزدیک الف یا ہمزہ سے لکھنا محض غلط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشدید حذف ہو کر نشہ ہو گیا۔ صاحب تنقیح اللغات بھی انھیں کے ہم زبان ہیں مگر انھوں نے مشدد ہونا ثابت کیا ہے۔ پس اِن اختلافات کی وجہ سے ہم نے بھی اس کو اردو قرار دے کر اساتذہ کے کلام کے موافق نشہ فارسی ہی مانا۔ میر صاحب نے حروف متغیرہ کے سبب ہائے مختفی کو بدل کر یائے مجہول سے بغیر تشدید لکھا ہے فرماتے ہیں

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُسکی میر سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا۔

جرأت کہتے ہیں

سرمہ جو دیا شیخ نے آنکھوں میں تو دیکھو دُنبالے ہیں یا نشۂ تریاک کے ڈورے

حالی کہتے ہیں

نشے میں تکبر کے ہے چور کوئی حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

یہی حال کیفیت کا ہے کہ اُس کو بھی فصحا نے تخفیف کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ سنجری کہتا ہے۔

مے کو ز دستِ ساقی مشکین کلالہ نیست در صد سبوش کیفیتِ یک پیالہ نیست

جمع الجمع کا اردو میں بہت رواج ہو گیا ہے مثلاً احباب۔ اغیار۔ اسرار وجوہ۔ یہ الفاظ خود جمع اور اِن کی جمع الجمع احبابوں۔ اغیاروں۔ اسراروں وجوہات۔ اکثر لوگ لکھتے ہیں اور بعض شعرا بھی استعمال کر گئے ہیں۔ فصحائے حال جائز نہیں رکھتے آزاد نے تو اس باب میں یہاں تک غلو کیا ہے کہ آب حیات میں ایک مقام پر معلوماتیں لکھ گئے ہیں۔ وجوہات وجہ کی جمع الجمع ہے چونکہ زبان زدِ خاص و عام ہو چکا ہے اس لفظ میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ خاتمہ مضمون پر کلیم نے لکھا ہے کہ اس کے علاوہ دیگر غلطیاں اور بھی ہیں مثلاً سوائے میرے مع اہل عیال کے وغیرہ اِس کے متعلق غالب کا ایک شعر جس میں سوائے اُس کے انھوں نے نظم کیا لکھے دیتا ہوں اور اس شعر پر جو تنقید طبا طبائی مرحوم نے کی ہے وہ لکھ کر اپنا مضمون ختم کئے دیتا ہوں وہ شعر یہ ہے

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں۔ لیکن
سوائے اِس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے

طبا طبائی مرحوم لکھتے ہیں کہ سوا عربی لفظ ہے اور الف مقصورہ ہے اضافت کی حالت میں فارسی والے اس میں ی بڑھاتے ہیں اور اردو میں لفظ سوا اور مع عامیانہ محاورہ میں اکثر باضافت بولتے ہیں اور پھر مضاف الیہ میں کے بھی لگاتے ہیں کہتے ہیں سوائے خدا کے کون ہے۔ اور مع اہل و عیال کے روانہ ہوا جو لوگ لکھے پڑھے ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ سوا خدا کے کون ہے اور مع اہل و عیال روانہ ہو مصنف مرحوم نے یہاں عام محاورہ کے موافق لفظ سوا کو اضافت

دی ہی اور پھر ہندی لفظ کی طرف اضافت کر دی ہی اور مضاف الیہ میں کے لگایا ہی یہ بالغرض قلم ہی۔ اِسی طرح ایک خط میں لکھتے ہیں۔ بیڑی کو زادیہ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا اور اپنے نام کا خط مع ان اشعار کے یوسف علی کے حوالہ کیا فقط

بیٹھ کر کُنجِ حرم میں سبحہ گردانی سے کیا
دل ترا تاریک ہی۔ ملبوسِ نورانی سے کیا

پائے بُت پر سجدہ ریزی رات دن بے سود ہے
تیرہ باطن ہے ترا۔ ظاہر کی قربانی سے کیا

سیکڑوں بیکس ترے امداد کے محتاج ہیں
کُنجِ خلوت سے نکل۔ یوں شغلِ روحانی سے کیا

قلبِ عالم کو مسخر کر تو عالم ہو ترا
حسرتِ کشورستانی ہی۔ جہانبانی سے کیا

بج رہی ہی نوبتِ شاہی بھی در پر صبح و شام
نفس کا بندہ بنا ہی۔ تیری سلطانی سے کیا

بیخبر تو ہی اگر آفت زدوں کے حال سے
اے امیرِ وقت۔ ثروت کی فراوانی سے کیا

بے سروساماں جو ہیں اُن پر نظر کرتا نہیں
تیری عشرت کوشیوں سے۔ عیش سامانی سے کیا

کی نہ بڑھ کر دستگیری جب کسی مجبور کی
رستمِ دوراں تبا۔ اِس زورِ جسمانی سے کیا

تیرے ہمجنسوں کو مشکل ستر پوشی الاماں
تیری جامہ زیبیوں سے۔ زیب دامانی سے کیا

جب کسی کو فائدہ پہنچے نہ تیرے علم سے
ای ادیبِ بے بدل۔ تیری ہمہ دانی سے کیا

دل جو پہلو میں ہے اہلِ درد کا ہمدرد بن
جو ہو صرف اپنے لئے۔ اِس چارہ سامانی سے کیا

بے نتیجہ ہی ترا ذوقِ ادب شوقِ ادب
شاعرِ رنگین نوا۔ ایسی سخندانی سے کیا

تیری نظریں جب نہ بہبودِ خلائق پر رہیں
ای تغافل کیش خود بیں۔ پھر نگہبانی سے کیا

عُقدۂ قومی نہ تیری سعی سے جب وا ہوا
منطق آرائی سی یا بسط۔ فلسفہ دانی سے کیا

شمعِ اُلفت تک رسائی جب تجھے دشوار ہی
صورتِ پروانہ۔ محفل میں پرافشانی سے کیا

خدمتِ خلقِ خدا کر۔ خدمتِ خلقِ خدا
خُلق انسانی نہیں۔ تو شکلِ انسانی سے کیا

خدمتِ خلقِ خدا کر تو اگر انسان ہے
خدمتِ خلقِ خدا ہی۔ دین ہی ایمان ہے

باسط۔ بسوانی

مردِ مضحک

اسرائیل احمد خاں سکندرآباد

حصہ (۲) باب (۱)

(۱)

لارڈ کلینکارلی

اُس زمانے میں اک مشہورِ عام حکایت تھی جو زبانِ خلق کے سلسلۂ روایت کی معرفت لوگوں تک پہنچی تھی۔ یہ روایت لارڈ لینس کلینکارلی کی ذات سے وابستہ تھی۔

بیرن کلینکارلی، کرامویل کا ہمعصر تھا؛ اور منجملہ اُن معدودے چند امرائے انگلستان کے تھا جنھوں نے اپنے مُلک میں آخرالذکر کی مشہور دعوتِ جمہوریت کا شرحِ صدر کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا! اُس کے اِس طرزِ عمل کی وجہ بظاہر تو یہ تھی کہ جمہوری تحریک نے غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ اور جب تک کہ "جمہوریہ" کی بالادستی تمام دیگر اَحزاب پر قایم تھی لارڈ موصوف کا وابستگانِ دامنِ دولت میں شامل رہنا لازمی تھا؛ لیکن اِس انقلاب کے خاتمے اور پارلیمنٹ کے اِنہزام کے بعد بھی اُس کی وفاداری معزول حکومت کے ساتھ علیٰ حالہٖ قائم رہی!

نئے نظامِ حکومت کے سایۂ عاطفت میں جو ایوانِ اعیان قایم ہوا تھا اُس میں داخل ہوجانا اُس کے لئے بالکل آسان تھا، جو لوگ اپنے گزشتہ سیاسی عقائد و مقاصد سے تائب ہوجاتے تھے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا!

جدید شاہِ انگلستان، چارلس دُوُم، اُن علمبردارانِ حریت پر جو قدیم شعارِ شاہ پرستی کو از سرِ نو تازہ کرلیا کرتے تھے، ترحّمِ خسروانہ و الطافِ شاہانہ کی بارش کردیا کرتا تھا؛ لیکن بات کے دھنی اور آن کے پکّے کلینکارلی نے وقت کی اِس صلائے عام پر لبیک نہ کہی: اُدھر ساری قوم بادشاہ سے خطاب کرکے یہ شادیانہ گا رہی تھی کہ ؎

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما
ذکرِ تو بود زمزمۂ شادیٔ ما!

اور یہ نعرے لگا رہی تھی کہ:

زندہ باد شاہِ ما! پایندہ باد مُلوکیتِ مُلکِ ما!

اور اِدھر یہ ازلی باغی اپنی شریعتِ رنگیں کے اس کلمۂ استقامت کی تلاوت کر رہا تھا کہ ؎

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا داریٔ کویش را چو جانِ خویشتن دارم

الغرض رائے عامہ شاہیّت کی حمایت میں اپنا فیصلہ صادر کرچکی تھی۔ لوگ ایک مرتبہ پھر مُلوکیت کے آگے سربسجود ہوگئے تھے؛ خاندانِ شاہی تختِ اقبال و اجلال پر بارِ دگر سرفراز ہوچکا تھا۔ اور ہاں جبکہ ماضی مُستقبل بن رہا تھا اور مستقبل ماضی۔ یہ لارڈ اپنی مُڑک پر اَڑا رہا!

اُس نے آسان پسندی کا مجوئی، جاہ طلبی و اقتدار پر لات مار کر

جلاوطنی وغریب الدیاری کو خوش آمدید کہا! اُس نے بجائے فدائی سلطنت بننے کے باعثِ حکومت بننے کو ترجیح دی۔ اِس حالت میں سالہا سال گزر گئے، مگر جمہوریت رفتہ کی تقویم پارینہ وصحیفۂ منسوخ کے ساتھ اُس کا ایمان بدستور منسلک رہا! وہ طعن وتشنیع، تضحیک وتحقیق کا نشانہ بنایا گیا ___ جو ہمیشہ سے ایسے مردانِ حق کا ناگزیر حصہ رہا ہے جنھوں نے دُنیوی مُنافع اور سیاسی مصالح کو ایسے خود کُشانہ انداز سے پس پُشت ڈال دیا ہے۔

کلینکاری سوئٹزرلینڈ میں زاویہ نشین ہو گیا تھا۔ جھیل جنیوا کے کنارے اپنی مسمار شدہ عظمت کے اک کھنڈر میں اک بوم نما بود وباش اُس نے اختیار کر لی تھی۔ ساحلِ جنیوا کے نواح میں زندانِ بانیوارڈ اور مقبرۂ لیڈ لو کے مابین ایک گوشے کے اندر اُس کی قیامگاہ واقع تھی! کوہستانِ ایلپس کی ناہموار بلندیاں، مع اپنے سپیدۂ سحر وسُرخیٔ شفق کے، مع اپنی فضائے ابروباد اور طوفانِ برف وباراں کے، اُس کے مسکن کے گرد حلقہ زن تھیں! سرِ بفلک پہاڑوں کے سایۂ تاریکی میں، اک مخفی کُنجِ عُزلت کے اندر وہ اپنی کسمپرسی زندگی کے دن کاٹ رہا تھا! وہ اپنے مُلک سے بھی خارج البلد تھا اور اپنے عہد کے خیالات وعقائد کی بزم میں بھی اک "غریب شہر" کی حیثیت رکھتا تھا! اِس زمانے میں جو سربرآوردہ لوگ مُلک کے اربابِ حَل وعقد ہُوا کرتے تھے، اُن کے لئے رسم ورہِ عام اور سُنتِ آبا واجداد سے انحراف کرنا اِلحاد وارتداد کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا!

اِنگلستان شاداں وفرحاں تھا معزول مُلوکیت کی بحالی اور شاہ ورعایا کے تعلقات کی تجدید کی رنگینی گویا میاں بیوی کی صُلح وصفائی تھی۔ جس نے چاروں طرف جشن وجلوس کی فضا، اور نغمۂ وشادیانہ کی نوا پیدا کر رکھی تھی! سونے پر سُہاگا یہ کہ نیا بادشاہ (چارلس ثانی) شخصاً اک محبوب شہریار کی سی خصوصیت رکھتا تھا۔ وہ جلال وجمال دونوں کا جامع واقع ہوا تھا۔ وہ نیٹیو ڈر میں جنگ کا ہیرو بنا تھا! اُس نے شہرِ ڈنکرک، فرانس کے ہاتھ بیچ کر دیا تھا۔ جو اک سیاسی "فتح مُبین" سمجھی جاتی تھی: اُمرا کا طبقۂ احرار جنھیں چیمبرلین "نامُرادِ جمہوریت کے افعیٔ کُشتہ کے نگاہ داشتہ بچے" کہہ کر پکارتا ہے، نیرنگیٔ روزگار کے "سنگ آمد وسخت آمد" کے سامنے سپر انداز ہو چکا تھا! یہ اَبنائے زمان دارالاُمرا میں اپنی کُرسیوں پر دوبارہ دخیل ہو گئے تھے! اِس حریمِ امارت میں بغاوت کے بعد پھر باریابی حاصل کر لینے کے لئے اُنھیں ذاتِ ہمایونی کے ساتھ وفاداری کا صرف حَلف اُٹھا لینے کی ضرورت تھی، اور بس! ع

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا!

اِس عہدِ معدلت عہد اور اِس "آسمانی بادشاہت" میں مذہبی اَحبار و رُہبان نے "وفاداران اولی الامر" کے طائفۂ شریفہ میں داخل ہو کر "عرشِ شاہیت" کے گرد "ملائکۂ مُقربین" کا سا پرا باندھ لیا تھا! اور بتفضلِ الٰہی "اجرِ غیر ممنون" سے خوش کام ہو رہے تھے!

لارڈ کلینکاری اِن اِبن الوقتوں کی خوشوقتیوں اور کامرانیوں سے بیخبر نہ تھا۔ یہ بات بالکل اُس کے اختیار میں تھی کہ اپنی جگہ سے صرف ایک جنبش کرکے اِن "بالانشینوں" کے پہلو بہ پہلو فروکش ہو جائے! اِس وقت سارا لنڈن دعوتوں اور ضیافتوں کے اَلوانِ نعمت سے رنگا رنگ ہو رہا تھا۔ ہر شخص شاد وبامراد تھا۔ دربارِ شاہی نوازش ونعمت اور بہجت وبشاشت کی سرائے مسرور بنا ہوا تھا! ساری فضا اک جنتِ نگاہ وفردوسِ گوش معلوم ہوتی تھی!

اِدھر انگلستان میں یہ رنگ رلیاں تھیں، نشاط وطرب کی یہ مجلسیں اور محفلیں تھیں، یہ "جاہ وجلالِ عہدِ وصالِ بتاں" تھا، اور ___ دوسری طرف سرزمینِ یورپ کے اک دور ودراز حصّے میں اک بدنام وگمنام، اک بھولا بھٹکا وطن، اک محرومِ ریاست وامارت، اک سرگشتۂ اِدبار اور خاک بسر دیوانکار، اک مغموم وملول، اک غریقِ فکر ومحوِ خیال، اک مدہوش وخود فراموش، اک زَرد رُو کہن سال، اور اک لب گور پیرِ خم گشتہ تھا ___ جو اک جھیل کے کنارے والہانہ ومجنونانہ انداز میں مصروفِ چہل قدمی تھا، اور گردوپیش کی زمہریری سردی، اور بالائے سر کے طوفان برفباری کے درمیان بالکل اک مختل الحواس وجود کی طرح از خود رفتہ وایستادہ!!

کس کی آنکھ اس منظر کو برداشت کر سکتی ہے! یہ تماشا حسرت وتأسف اور غیظ وغضب کے مخلوط جذبات کو دعوتِ اشتعال دیتا تھا!

ہر شخص کا یہی کہنا تھا کہ لارڈ کلینکاری عقل ودانش سے ہمیشہ بے نیاز رہا ہے! اُس کی سابقہ سیاسی زندگی بھی اُن کے خیال میں اُس کی اسی ماؤف دماغی کی کرشمہ سازی تھی!

کیوں نہو! سے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(۲)

انقلاب اور جوابی انقلاب

انگلستان کا ۱۶۶۰ء کا انقلاب جیسا فیصلہ کن تھا۔ اوراقِ صفحاتِ تاریخ میں اُس کے نقوش جتنے جلی ہیں، اُس کی کوئی نظیر اِس مُلک کی تمامی سرگزشت میں نہیں ملتی۔ ہر سنجیدہ دماغ شخص کی راہ قطعی ہو کر اُس کے سامنے آگئی تھی۔ برطانیہ کے بین الاقوامی اقتدار و اقبال کا سنگِ بُنیاد رکھ دیا گیا تھا۔ جنگِ سی سالہ کی ضرب سے جرمنی کو سرنگوں کر دیا گیا تھا! فرانس بھی اک ایسی ہی نمائشی طاقت کے ذریعے خاکِ مذلت پر لِٹا دیا گیا تھا! ڈیوک برگنیزا کے دستِ ہمت نے ہسپانیہ کی شوکت و صولت کو لگام دے دی تھی! خود کرامویل کے عہد میں میزارین کو رام کر لیا گیا تھا! بَیْنُ الیُورپی عہد ناموں کے دستخطوں میں فہرستِ شاہاں کی جو ترتیبِ جدید قائم ہوئی تھی، اُس میں والیٔ انگلستان کا نام، شہنشاہِ فرانس کے اسمِ سامی پر بھی سبقت رکھتا تھا! ولایاتِ متحدہ (امریکہ) پر ۸ لاکھ کا تاوان عائد کیا گیا تھا۔ الجزائر و طیونس پر بلند آہنگ بحری مُہمات بھیجی گئی تھیں! نئی دنیا کے سمندر کے اہم جزیرہ جمیکا پر عَلَمِ فتح نصب کر دیا گیا تھا۔ لزبن (پرتگال کے پایۂ تخت) کا سرِ پُرغرور نگونسار کر دیا گیا تھا! بارسیلونا میں اہلِ فرانس کے مقابلے میں بساطِ سیاست پر اک صفِ مُخالفین قائم کر دی گئی تھی۔ پرتگیز بالکل انگریز کا دست نگر بن گیا تھا۔ بحرِ الرّوم کو ابالئی بربر کے بحری قزاقوں کی زیرِ آب چٹانوں سے صاف کر دیا گیا تھا! بحرِ متوسط کے ان بے پناہ ترکتازوں کا تعاقب جزیرۂ کریٹ کی دور دست کمینگاہ تک کیا گیا تھا! بحرِ اعظم پر فرمان روائی کی بُنیاد وہ ارکانِ رکین پر رکھی گئی تھی، تسخیرِ ممالک، اور توسیعِ تجارت! امیر البحر مارٹن ہیرٹز فان ٹرامپ پوری تینتیس فتوحات کے تمغے اپنے سینے پر آویزاں رکھتا تھا۔ وہ اک آئی یورپ کا بطلِ حربی تھا! خود اپنے تئیں "نہنگِ بحرِ اعظم" کہا کرتا تھا۔ جس کے جلال کے سامنے اسپین کی قہار بحری طاقت کا طرۂ تاج بھی جھک گیا تھا! لیکن ۱۰ اگست ۱۶۵۳ء کی یادگار تاریخ میں اس شیرِ بحر کا دَبْدَبہ اور طنطنہ بھی خاک میں ملا دیا گیا تھا! برطانوی بیڑہ "کوس لمن الملکی" بجا رہا تھا۔

اور ہاں بحرِ اوقیانوس میں ہسپانوی آرمیڈا کا پرچم بلند غرق کر دیا گیا تھا! بحر الکاہل میں اہلِ ولندیز کے بیڑے کا یہی حشر ہو چکا تھا۔ بحرِ الرّوم کی سطح پر وینس کی ساری طاقتِ جہازی حَبابِ آسا بیٹھ چکی تھی! ایک جہانگیر جہازرانی اور عالمگیر بحر پیمائی کے ذریعے انگلستان ساری دُنیا کے سواحل و بنادر پر قابض ہو چکا تھا! سمندری شاہراہوں پر ولندیزی عَلَم انگریزی پرچم کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا تھا! فرانس اپنے سفیر کی معرفت الیور کرامویل کی بارگاہ میں کورنش بجالاتا تھا۔ انگلستان کا یہ مردِ قوی جب چاہتا تھا کیلے اور ڈنکرک کے شطرنجِ سیاسی کے مُہروں سے فرانس کو ناچ نچا دیتا تھا۔ سارا برِّ اعظمِ یورپ برطانیہ کے اس اوج و عروج پر لرزہ براندام تھا! انگلستان حسبِ مرضی جنگوں کا اعلان کرتا۔ شرائطِ صلح کی اِملا کراتا۔ اور انگریزی عَلَم کو بحر و بر میں گاڑتا پھرتا! مُلک کے قاہرانہ رُعب و داب کا یہ عالم تھا کہ انگلستان کے "امین الملتہ" کے زرہ پوش رسالوں کی ایک رجمنٹ برِّ اعظم کے اک پورے جیش پر بھاری پڑتی تھی! کرامویل کہا کرتا تھا کہ "میں انگلستان کی جمہوریہ کو ایسا ہی غالب و قاہر بنا کے چھوڑوں گا، جیسا کہ رومتہ الکبریٰ کی جمہوری پادشاہت کو جولیس سیزر نے بنا دیا تھا!

تحریر اور تقریر کی آزادی تھی اور انسانی ذہن و ضمیر کے سارے اغلال و سلاسل کاٹ ڈالے گئے تھے۔ اخبار و جرائد کامل حریت سے بہرہ ور تھے۔ سارا سرکاری احتساب اور سیاسی استبداد مفقود ہو گیا تھا۔ یورپی توازنِ طاقت کی رسمِ کہن دفن کر دی گئی تھی، اور برِّ اعظم کی شاہنشاہیوں کا تمام نظام جو خانوادۂ اسٹوارٹ کی مساعی سے اک رشتۂ ائتلاف میں مُنسلک ہو گیا تھا، درہم و برہم کر دیا گیا تھا!

لیکن آخر کار انگلستان کو عہدِ کرامویل و دَورِ جمہوریت کی پادریت و دورا ندیشیت اور اُس کی ساری تیز گامی و گرم خرامی ترک کرنی پڑی، اور پوری تلافیٔ مافات کر لی گئی۔ تمام شاکی اقوام کی تالیفِ قلوب عمل میں آگئی، اور ہر ایک منفعز گردہ سے عفو تقصیر کرا لی گئی!

واجد علی شاہ مزاج چارلس ثانی نے ایک فرمانِ مراحم و مراعات (منشور بریڈا) پر اپنی مہرِ منظوری ثبت کی۔ اور انگلستان میں قدیم دَورِ خانہ نشینی و غیر جنبہ داری اور اک مرنجان مرنج حکمت عملی کا نئے سرے سے آغاز ہوا۔ مئے عشرت و مسرت کے جام

چھلک رہے تھے! سابقہ آئینِ ملوکیت کی تجدید سے مُلک پر اک منظرِ تبسم چھایا ہوا تھا! شاہ پرستی و وفاداری رعایا کا پھر محبوب مشرب بن گئی تھی: لوگ سیاسیات کی "بیہودگیوں" سے تائب ہوگئے تھے! وہ انقلاب کا مضحکہ اُڑاتے۔ جمہوریت پر آوازے کستے، اور "حرّیت، عدالت، سبّیت" کے بلند بانگ و تہی میان، کلمات کا خاکہ اُڑاتے: انگلستان اک "خوابِ حماقت" سے جاگ اُٹھا تھا! لوگ کہتے تھے کہ "اِن سے زیادہ مجنونانہ حرکات اور کیا کرسکتے ہیں۔ جو ہم سے سرزد ہوئی ہیں: اگر سب کو حقوقِ انفرادیت اور مراتب مساوات و حرّیت حاصل ہوجائیں تو مُلک کا کیا نقشہ ہو: ذرا چشمِ تصوّر سے ایسی حکومت کا نظارہ کیجئے جہاں کے سررشتۂ نظم و نسق میں ہر فردِ رعیت کو دخل حاصل ہو! کیا کسی کے حاشیۂ خیال میں ایسا شہر آسکتا ہے، جس کے اربابِ حل و عقد خود اہلِ شہر ہوں! کوئی گاڑی کا بیل ایسا ہوسکتا ہے جو خود ہی گاڑی بان بھی ہو! "ووٹ" (حقِ رائے) کی لغویت و مہملیت کا کیا ٹھکانا ہے! یہ صرف طوائف الملوکی کا اک طوفانِ بدتمیزی ہوگا! گدایانِ گوشہ نشین کو رموزِ مملکت سے کیا واسطہ! اور پھر اس سرابِ صفت عمومیت کے ایوانِ حکومت کے بڑھ کر کون سا "بازارِ قصابان" ہوسکتا ہے! ہم کو اپنی اپنی شخصی زندگی کا لطف لینا ہے۔ حکومت کا دردِ سر خریدنا نہیں! بادشاہ سچ مچ ظل اللہ ہوتا ہے جو خلق اللہ کے سر پر سایہ فگن ہوتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کی ذات اک صاحبِ ایثار و تارکِ لذّات وجود ہوتی ہے جو ہم سب کے لئے حکمرانی و جہانبانی کی کوفت اپنے سر لیتی ہے! اور پھر ---------- بات تو یہ ہے کہ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

نظم و انتظام، امن پروری و عدالت گستری، وضع قوانین و نفاذِ آئین، تخمینۂ مالیہ و توازنِ میزانیہ، قیامِ امن و اعلانِ جنگ، بھلا کہئے اِن دماغ سوزیوں اور مغز پاشیوں سے رعایا کو کیا دلچسپی ہونی چاہیئے؟! بیشک رعیّت کا فرض ہے کہ وہ مالگذاری، محاصل ادا کرے، اور بلاشبہ وہ مکلّف ہے کہ خدمتِ شاہی میں داخل ہو، لیکن پھر بس یہی ہمارا منتہائے نظر ہونا چاہیئے! وہ راج میں خوش ہم باج میں خوش! لوگ لشکرِ شاہی کا دست و بازو ہوں، اس سے بڑھ کر اُن کے لئے کونسا فخر ہوسکتا ہے! بحیثیتِ حکمران و جہاں بان کے بادشاہ کی عنایاتِ بیغایت کا یہ ادنیٰ شکرانہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی جان و مال اُس کی نذر کردیں، نیز اِس کو اپنے بڑے بھاگ سمجھیں! ؎

منّت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنم

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

گر اپنے اوپر خود حکومت کرتا! العظمت للہ! اس سے بڑھ کر کوئی خیرہ سری ہوسکتی ہے؟! جاہل کو اک رہنما کی ضرورت ہے، اندھے کو اک لٹھیا پکڑانے والے کی ضرورت ہے! بادشاہ عصائے حکومت ہاتھ میں لے کر ہم نابینا مخلوق کے لئے یہی عصا گیری کی زحمت طلب خدمت انجام دیتا ہے: ذاتِ شاہانہ کا یہ ہم پر کتنا احسانِ عظیم ہے! لیکن لوگ اِس نعمتِ غیر مترقبہ کا احساس کیوں نہیں کرتے: یہ کیسا شنیع کفرانِ نعمت ہے! غالباً اُن کے اِس قصور کی علت اُن کی جہالت ہے مگر یہی جہالت تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے! ہاں لاریب کہ جہالت اک ایسی ظلمت ہے جس میں سراسر نورِ رحمت مضمر ہے: وہ اک ایسی مبارک تاریکی ہے جو منظرِ زندگی پر اک پردۂ سیاہ ڈال دیتی ہے، اور ہماری محبوبات و مالوفات کا بے نقاب نظارہ ہمارے دل میں جس حرص و ہوس کی تحریک کیا کرتا ہے۔ اُس فتنے کا اِس طرح سدِّباب ہوجاتا ہے! پس جہالت معصیت کی قاطع بن کر معصومیت کی خالق ثابت ہوتی ہے! جو آدمی پڑھ جاتا ہے وہ غور کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اور جو غور کرتا ہے وہ دلیل و استدلال سے کام لینے لگتا ہے، اور یہیں پہنچکر ہماری ساری روحانی کوفت و کلفت کا زنبور خانہ چھِڑ جاتا ہے ع

آنرا کہ فکر بیش غمِ روزگار بیش!

ہم کو چاہیئے کہ عقل و فکر کے اِس شجرِ ممنوعہ اور اُس کے اِس ثمرِ ملعونہ کے پاس نہ پھٹکیں! اِسی میں ہماری نجات ہے! یہ حقائق بیچون و بیچگون ہیں، اور انسانی نظامِ مجلسی کی عمارت کے ستونِ سنگیں!"

(۳)

خدایا روزگارِ سفلہ پرور را تماشا کن!

یہ تھی اُس وقت کے انگلستان کی خلقت کی ذہنیت! ہیئتِ اجتماعی اور نظامِ سیاسی کے متعلق ان "ایمانِ جنت" کے منقولہ بالا معتقداتِ صالحہ نے قبولِ عام حاصل کرلیا تھا! ع

جوہر نیکاں نماند تاکہ مذاخو گرفت!

اہلِ ملک کے ادبی مذاق میں بھی ماشاءاللہ اک اصلاحی تبدیلی ظہور میں آ گئی تھی! شیکسپیر کے سامنے سے شمعِ مشاعرہ ہٹ رہی تھی، اور اب ڈرائڈن منظورِ نظر بن رہا تھا!

ایڈسٹیوری نے یہ منتکلم دانش کیا تھا کہ "ڈرائڈن اپنی صدی میں انگلستان کی اقلیمِ شعر کا تاجدار نظر آتا ہے: "ملٹن کی بارگاہ میں جس کا شاہکارِ شعر" فردوس گم گشتہ" کے نام سے دُنیائے ادبیات میں بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ ایم ہوایٹ نے یہ شُترِ غمزہ کیا تھا کہ "میں حیران ہوں کہ ملٹن کی ایسی ہیچ در ہیچ ہستی نقادانِ سخن کے ہاں کیونکر کوئی اعتنا حاصل کر سکی!"

الغرض ہر شے علیٰ قدرِ مراتب اپنی صحیح جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ شیکسپیر پائیں پر تھا اور ڈرائڈن صدر پر! چارلس فرازِ تخت پر تھا، اور کرامویل قعرِ قبر میں ع

حیف گر در پسِ امروز بود فردائے!

انگلستان بے اعتدالی اور شرمندگی کے دورِ ماضی سے نکل چکا تھا! واللہ لوگوں کے لئے یہ کتنی سعادت ہے کہ بازگشتہ ناموسِ ملوکیت گم شدہ امن و یُمن کو بحال کر دے، اور ملکِ ادب میں بھی اک فراموش شدہ " ذوقِ صحیح" کی بازیافت عمل میں آ جائے!

اِن برکات و سعادات کے بارے میں "شک آوردن" در حقیقت "کافر گردن" کا مستوجب تھا، چارلس کے خلاف محسن کشی کا ارتکاب بدترینِ خلائق لوگ ہی کر سکتے تھے! تاہم بعض افرادِ ملک کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہی تھا! ان لوگوں نے لارڈ کلینکارلی کی مثال کی پیروی میں ایسا رویہ اختیار کیا تھا! لیکن بھلا سوچئے تو کہ اپنی ہی قوم کے جشنِ مسرت کا مقاطعہ کرنا بجز خللِ دماغ کے اور کیا ہو سکتا تھا!

۱۶۵۰ء میں پارلیمنٹ نے اک حلف نامہ ترتیب دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"میں "جمہوریہ" کے ساتھ پیمانِ وفا باندھتا ہوں جس کے آئین کے چار گوشے کے اندر کسی بادشاہ، کسی امیر، کسی صاحبِ تاج و تخت، کسی دارائے جاگیر و امارت کی گنجائش نہیں!"

ہاں، کلینکارلی کو اسی "میثاقِ ملیہ" کا پاس تھا! اسی کے احترام میں وطن کی زمین اُس نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی! اُس کی اِرادی تارکُ الوطنی، اور سوئٹزرلینڈ کے اک گوشۂ تاریک میں سرنگونی، انگلستان کی گرمیٔ محفل کو زبانِ حال سے خطاب کر کے کہہ رہی تھی: ؎

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے عَلَم ہوئے!

جمہوریت کی شریعتِ مرفوعہ کے ساتھ وہ اک مومن بالغیب کی طرح وابستۂ ایمان تھا! اُس کے احباب و رفقاء اصلاحِ حال کی کوششیں کر کے تھک گئے تھے، اور ناچار ہو کر انھوں نے اُس کی معیت کو خیرباد کہہ دیا تھا! اُس کے سابقہ مسلک کی اُنھوں نے عجیب عجیب وکیلانہ تاویلیں کی تھیں۔ انھوں نے اِس پیرایہ میں اُسے رد براہ کرانا چاہا کہ "کلینکارلی تو جمہوریہ کی صفوف میں اِس لئے داخل ہوا تھا کہ جاسوسانہ اُس کے محاذ کے کمزور نقاط کو معلوم کر لے، اور پھر موقع پا کر اس پر اک کاری ضرب لگائے اور نام نہاد دستورِ جمہور کی بساط کو اُلٹ کر رکھ دے! شاہی جاں نثاروں کا یہ قدیم روایاتی سو رہا ہے! ورنہ بادشاہ سلامت کے ساتھ اُن کی وفاداری ایک غیر متزلزل عقیدہ ہے۔ اور ذاتِ ہمایونی کے ساتھ اُن کا رشتۂ تعلق اک غیر شکستنی رشتہ"!

لیکن کلینکارلی ایسے جُنونی کی سمجھ میں ایک نہ آئی! مذہبِ جمہوریت کا وہ اک "مجذوب" تھا! اور اب شاید وہ اِس مشربِ نو کا "شہیدِ اوّل" بننا چاہتا تھا۔

جنون ہو یا مجذوبیت یا خبط، ہر ایک کی رعایت بھی کی جا سکتی ہے، لیکن پھر ایک حد تک! آدمی کا جانور بن جانا گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حکومتِ وقت سے باغی ہونا حیوانیت کی وحشت سے بھی متجاوز ہو جاتا ہے! پھر جمہوریہ کا یہ فدائی و شیدائی ایک معنی میں خود "غدار" تھا! کیوں، کیا اُس نے اپنے طبقۂ اُمرا کو چھوڑ کر عوام کالانعام کے معسکر (کیمپ) سے اِئتلاف نہیں قائم کیا تھا؟ بلاشبہ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے اپنی ساری دولت و دُنیا اُس پر قربان کر دی، لیکن یہ تو آخر کار خود فراموشی و خودکشی ہی کے فن میں اک کسبِ کمال تھا!

کلینکارلی بظاہر غداری اور وفاشعاری کا جامعِ ضدین تھا! اُس کو معزہ کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ایک راہ پر چند روز تک غلط رَوی ہی راہِ راست

کی طرف بازگشت کا دروازہ کیونکر کھلا رکھ سکتی ہے۔ پس وہ بابِ توبہ کو ہمیشہ کے لئے اپنے اوپر مُقفل کر چکا تھا: ؎

مدہ بشارتِ توبہ کہ سرنگونیٔ مَن
ہزار گوں بتر از قطعِ شہرِ گُم باشد

شرافت و ضمیر اُس کے تکیۂ کلام تھے۔ لیکن اُس کو دیکھنا چاہئے تھا کہ بالآخر یہ خالی خولی "الفاظ" ہی تو ہیں، جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہُوا کرتے! مجبوریوں کے آگے گردن جھکا دینا واقعات کی منطق کا احترام ہے! جس کی مزاحمت نہ صرف یہ کہ ناممکن ہوتی ہے، بلکہ جس کا خیر مقدم مستحسن ہوا کرتا ہے۔

اور پھر اربابِ سیاست کے لئے اخلاق و اصول کی پابندی میں ایسا غُلُو خود لغو ہے۔ مُفرط ضمیر پرستی، دل کی حسّاسی کا نہیں، قلب کی کمزوری کا نام ہے! وہ تذبذُب کی خالق بنتی ہے اور عزائم کی قاتل! ایمان و دیانت داری کا ایسا بے محل التزام کرنے والے اُس وقت بے دست و پا ثابت ہوتے ہیں، جب کہ اُن کے لئے عصائے حکومت پر گرفت جمانے کا موقع پیدا ہو گیا ہو! اور اُس ساعتِ سعید پر بھیجرے پائے جاتے ہیں، جبکہ "عروسِ مُلک" اُنھیں دعوتِ ہمبستری دے رہی ہو! ؎

چو خانہ خالی و معشوق مستِ ناز بود
تواں گریست بہ آں کس کہ پاکباز بود

یہ بد مذاق ایک قدم بھی جادۂ مستقیم سے انحراف کی تفریح کو پسند نہیں کرتے! چاہے اُن کی راہِ راست، مشکلاتِ راہ کی کتنی ہی الجھیاں پیدا کر دے اُن کی منزلِ مقصود کتنے ہی مراحلِ نامسعود سے بدل جائے۔ اُن کے ساحلِ مُراد میں کیسے ہی نامُراد در لجہائے ہلاکت حائل ہو جائیں! اُن کے احمقانہ تہوّر کی بے مغز آواز بس یہ ہوا کرتی ہے کہ: ع

شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

غریب کلینکارلی دور دست نوئنز رلینڈ کی کس مپرس خلوت سے شاہی درباریوں کی اِن دُرباریوں اور گلفشانیوں پر یُوں داد دیتا تھا: ؎

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری "وحشت" "تری" شہرت ہی سہی!

اسی مذہبِ عزیمت و ہمت، اِسی مشربِ صدق و صفا، اسی مسلکِ ثبات و استقامت پر رُستانہ گامزن ہو جانے والا کلینکارلی اِس وقت اک عالمِ سرخوشی میں تخییل جنبوا کے کنارے محوِ خرام ہے! ع

نرالی چال ہے اپنی، عجب ہی حال مستانہ

چونکا ہے کوئی نگار الٰہی توبہ
رس ہیں دو انار الٰہی توبہ
سینے میں ہیں ابھی پھوٹی نہیں گویا
ہونٹوں کا خفیف ابھار الٰہی توبہ

جوش

قطعہ

فروغِ چشمِ بصیرت ہیں تجربات مرے
کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی میں نے

شکست میں بھی نکالے ہیں فتح کے پہلو
سراب سے بھی بجھالی ہے تشنگی میں نے

بدل دیئے ہیں تغافل سے حادثوں کے مزاج
بنا دیا ہے حقیقت کو شاعری میں نے

وہاں حسینوں کا جھرمٹ ہوا ابھار آئی
جہاں بجائی محبت کی بانسری میں نے

نیازِ عشق میں ڈھونڈے ہیں شیوہ ہائے خودی
غرورِ حسن کو دیکھا ہے مسلتی میں نے

بہا بہا دیئے کاجل حسین آنکھوں کے
رولا رولا کے کسی کو کبھی کبھی میں نے

ہوس کی تیز ہوائیں جلا کے دل کا چراغ
دیارِ حسن میں کر دی ہے روشنی میں نے

نگاہِ ناز سے چھینی ہے تابِ گویائی
لبِ خموش سے کی ہے سخنوری میں نے

مگر قیودِ غلامی سے دل رہا آزاد
نہ اپنے سجدوں کو رسوا کیا کبھی میں نے

زمانہ مجھ سے چڑھائے ہے تیوریاں لیکن
بس اس خطا پہ کہ کیوں اپنی قدر کی میں نے

معاشرت مری آزادیوں سے ہے برہم
کہ پائے شوق کی زنجیر توڑ دی میں نے

فضائیں تنگ ہیں مجھ سے کہ بیقرار ہوں میں
ہوائیں چیں بجبیں ہیں کہ سانس لی میں نے

خدا کو ہے یہ شکایت کہ بے نیاز ہوں میں
بتوں کی ہے یہ روایت وفا نہ کی میں نے

غرض جہاں میں نہیں کوئی مطمئن مجھ سے
عجب طرح سے گزاری ہے زندگی میں نے

احسن احمد اشک، کلکتہ

مظلوم بچہ

بحسرت مالکہ کے حکم سے اک ناتواں بچہ
جھکا، میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا
سحر کا وقت ہے، شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں
گلی سے آرہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں
پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے
ذرا سا سر اُٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے
صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں
اُسے اپنے جگر پر ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں
تقاضۂ کمسنی کا دل میں جب دُھومیں مچاتا ہے
لرز اُٹھتا ہے، گردن موڑتا ہے، سر کھجاتا ہے
دما دم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رُخِ طفلی پر اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے
غریب افلاس! تجھکو دھیان میں لاتی نہیں دُنیا
ترے معصوم بچوں تک کو بہلاتی نہیں دُنیا

جوش

ایک رِند کا اعلانِ جنگ!

جوش ملیح آبادی

میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے ـــــ اور صبح پیری کے طلوع ہونے میں بہت دیر باقی نہیں ـــــ یہ ایک ایسا سانحہ ہے کہ روتے روتے آنکھیں پھوٹ بھی جائیں تو کم ہے ـــــ

اڑتیس، اُنتالیس سال کی عُمر، اور قُربِ قیامت، یعنی پیری کا احساس ـــــ بیشک یہ تعجّب کا محل، اور ماتم کا مقام ـــــ لیکن کیا کیا جائے، غُلام قوموں کی جوانی پائدار نہیں ہوا کرتی ـــــ جوانی، غلامی کی معیّت سے کتنی شرماتی ہے!!

آزاد قوموں کی زندگی میں تین فصلیں ہوتی ہیں۔ لڑکپن ـــــ جوانی اور بُڑھاپا ـــــ لیکن غلام قوم کی زندگی میں صرف دو ہی موسم آتے ہیں۔

لڑکپن ـــــ اور بڑھاپا۔

مرحوم حضرتِ عزیزؔ لکھنوی نے کیا خوب فرمایا ہے:-

اِس صحیفے سے کسی نے اک ورق کم کر دیا

اگر غلام قوم میں کسی پر اتفاق سے جوانی آ بھی جاتی ہے تو بِن کھلے غُنچے کی طرح قبل از وقت ہی مُرجھا کر رہ جاتی ہے ـــــ

اور اگر کوئی بدقسمتی سے غلام ہوتے ہوئے حسّاس بھی واقع ہوا ہے تو اُس کے بالوں کی سیاہی اور شگفتگی کا خدا ہی حافظ ہے ـــــ اُس کے چہرے اور اُس کی عُمر میں دوڑ ہوتی ہے ـــــ عُمر ہانپ کر پیچھے رہ جاتی ہے۔ اور یہ اُس کا چہرہ، احساس گزیدہ چہرہ ہی ہوتا ہے جو ہمیشہ عُمر سے آگے نکل جایا کرتا ہے۔

کیا عُمر کے ساتھ ساتھ چلتا چہرہ		کیوں شیب کے سانچے میں نہ ڈھلتا چہرہ؟
احساس پہ چہرہ، وقت پر عُمر سوار		کیوں عُمر سے آگے نہ نکلتا چہرہ؟

پیری کے متعلق بلبلِ شیراز نے بھی کیا خوب کہا ہے:-

من پیر ماہ و سال نیم، یارِ بے وفا
بر من چو عُمر می گزرد، پیر ازاں شدم

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے ـــــ میں پیری کا منحوس چہرہ دیکھنے پر راضی نہیں ـــــ

کوئی صاحبِ غیرت، پیری کے استقبال پر تیار نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ غور کرتا ہے کہ:-

جب اَوج پہ عُمر کا ستارا ہوگا		اِس سُود میں سر بسر خسارا ہوگا
حیراں ہوں کہ داغِ شیب و ننگِ پیری		کیونکر مری غیرت کو گوارا ہوگا

اگر صاحبِ غیرت ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کا مزاج شاعرانہ بھی ہے،

تو اس کی رنگین شریعت میں تو پیری اُسی قدر مبغوض و مکروہ ٹھہرے گی، جیسے اسلام میں طلاق۔ اور ہندوستان میں حُبِ وطن ——— وہ تو گڑگڑا گڑگڑا کر یہی دعائیں مانگے گا کہ :-

مرضی ہو تو سُولی پہ چڑھانا یا رب — سَو بار جہنم میں تپانا یا رب
معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ" — ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

اور اگر غیر تندی و شعریت کے دوش بدوش کوئی حکیمانہ مزاج بھی رکھتا ہے تو وہ صرف جذبات ہی کی بنا پر نہیں، اپنے مشاہدۂ تفکّر اور بصیرت کی رُو سے بھی زندگی کو ایک ظالمانہ تمسخر کی اور پیری کو ایک بے پناہ قہر سمجھنے پر مجبور ہوگا۔ اور اگر کوئی اُسے جینے کی دُعا دے گا تو وہ بگڑ کر کہے گا کہ :-

ناواقفِ ابتدا نہیں ہوں شاید — بیگانۂ انتہا نہیں ہوں شاید
ہو طُولِ حیات کی تمنّا مجھکو! — اتنا تو میں بے حیا نہیں ہوں شاید

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے۔ اور صبح پیری کے طلوع ہونے میں بہت دیر باقی نہیں ——— میں پیری پر لعنت بھیجتا ہوں، میں اُس کا جھرّیوں سے سمٹا ہوا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا ——— پیری کے تصوّر سے کافور و کفن کی بُو آتی ہے ———

لیکن مغضوبِ قدرت اور معتوبِ مشیّت حیوان کے ساتھ، جو خود کو اشرف المخلوقات کہہ کر اپنے ہی خوشامد کیا کرتا ہے، ازل کے دن سے یہی سفّاکانہ کھیل کھیلا جارہا ہے کہ وہ جن چیزوں کی طرف دوڑتا ہے، وہ اُس سے بھاگتی ہیں، اور جن چیزوں سے وہ بھاگتا ہے وہ اُس کے پیچھے دوڑتی ہیں ——— اگر خدانخواستہ اور نصیبِ اعدا، یہی پُرانا اور گھِسا ہوا کھیل مجھ سے بھی کھیلا گیا، اور پیری میرے علی الرّغم، مجھ پر مسلّط کر ہی گئی، تو دنیا یہ تماشا بھی دیکھ لے گی کہ میں اُس کا خم ٹھونک کر مقابلہ کروں گا ——— میں اُن لوگوں میں سے ثابت نہ ہوں گا جو پیری کی کمینسیں نکالنے لگتے، اور سپر انداختہ ہو جاتے ہیں ———

ہاں میں پیری کو اپنا سالم بنا کر مشیّت کا کلیجہ ٹھنڈا نہ کروں گا۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

میں نے پیری سے جنگ کرنے کے لئے کافی سامانِ حرب جمع کرلیا ہے ——— میری جوانی نے سفرِ پیری کے واسطے اتنا زادِ راہ اکٹھا کرلیا ہے کہ اِس راستے کی بھوک پیاس کا میں بہ آسانی مقابلہ کرسکوں گا ——— اور شیب کو نیچا دکھانے کی خاطر میرے شباب نے اپنے قلعے میں اِس قدر رسد جمع کر رکھی ہے کہ وہ دشمن کے محاصرے کا تمام عمر مقابلہ کرسکتی ہے۔

آپ پوچھیے وہ رسد اور وہ زادِ راہ کیا ہے؟ وہ زادِ راہ اور وہ رسد میرا یہ محکم اور فخر آمیز احساسِ مسرت ہے کہ میں نے اپنی جوانی کو استعمال اور بقدرِ طاقتِ بشری جی کھول کر استعمال کیا ہے۔

میں نے اپنی جوانی کو جنگل کے پھُول کی طرح ضائع نہیں ہونے دیا ہے۔ میں نے اُس کی ایک ایک پنکھڑی کا رس چُوسا ہے ——— میں نے جوانی کے ایک ایک لمحے کو نچوڑا ہے۔ اور میری کوئی ایک اُمنگ بھی ایسی نہیں ہے، جسے روزِ ابر میں جھومنے اور شبِ ماہ میں انیڈنے کا موقع نہ دیا گیا ہو۔

میں ——— تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

پر ہمیشہ عامل رہا ہوں ———

میں ایک لمحے کے لئے بھی ———

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

کا قائل نہیں رہا ——— کبھی کبھی تنہا چھوڑنا، مذہبِ رندی میں کُفر ہے ——— میں نے تو دل کو ہمیشہ تنہا ہی رکھا ہے ———

خلوتِ خاصِ عشق را بنگر
کہ بروں کردہ اند نیز مرا

سوسائٹی کی وحشت زدگی کے خلفِ الرشید یعنی "جوانِ صالح" اور مادرِ جور و تعصّب کے فرزندِ اکبر یعنی "شیخِ وقت" کی طرح تو میں نے جوانی کو ضائع نہیں کیا ہے کہ پیری سے ڈر جاؤں، "جوانِ صالح" کی بزدلی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ

یہ ہے تو عیشِ جوانی کہ خدا یاد رہے

اور "شیخِ وقت" کی تاجرانہ عبادت کو آگاہ ہونا چاہیئے کہ ———

کب نُور سے ظلمتیں جُدا ہوتی ہیں بَن بَن کے سحر جلوہ نما ہوتی ہیں
اِس کی بھی خبر ہے کہ نمازیں کتنی شیطان کے ایما سے ادا ہوتی ہیں

اور اسی کے ساتھ ساتھ اِن دونوں سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ:-

اُس کا جمال چھوڑ کر اُس سے بہشت مانگنا
تیری نظر میں ہو ہُنر، میرے لئے تو ننگ ہے

"جوانِ صالح" ممکن ہے کبھی سنبھل بھی جائے، لیکن مجھے تو "شیخِ وقت" پر رونا آتا ہے۔

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری بیچارے کی اک شب نہ سُہانی گزری
دوزخ کے تخیّل میں بڑھاپا بیتا جنّت کی دعاؤں میں جوانی گزری

آپ سمجھے "جنّت کی دعاؤں" کے پیچھے کونسا جذبہ کام کیا کرتا ہے؟ یہ تیاری ہے، یا تمنّا، جنّت میں اُن تمام افعال کے کرنے کی جو رند اِس عالمِ خاکی میں کیا کرتے ہیں۔

"جنّت جسے کہتے ہیں اُبھرنا ہے وہاں حُوریں ہیں جہاں مجھکو سنورنا ہے وہاں"
"کہتا ہے یہ شیخ تم گُنہ کر لو یہاں اور مجھکو یہ ہر گُناہ کرنا ہے وہاں"

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے، اور صبحِ پیری کے طلوع ہونے میں بہت دیر باقی نہیں ہے۔ آنے دو پیری کو۔ میں اُس پر قہقہے ماروں گا، میں اُس کا ایسا مذاق اُڑاؤں گا کہ وہ رو پڑے گی۔

بحمد اللہ کہ آبِ وضو کی دَلدَل، اور ہوائے ریش کی رطوبت میں تو میں نے جوانی گزاری نہیں ہے ---- ہاں میں کہہ سکتا، اور فخر سے کہہ سکتا ہوں۔

کس رات کو کی نہ بادہ خواری ہم نے کب کاکلِ عشرت نہ سنواری ہم نے
اب تک تو یہ رات، جس کو کہتے ہیں شباب زُلفوں ہی کے سائے میں گزاری ہم نے

ہاں میں رند ہوں ---- رند ---- لااُبالی ---- سیہ مست بند ---- موت و حیات سے بیگانہ ---- آغاز و انجام سے ناواقف ---- سُود و زیاں سے بالا ---- دُنیا و عقبیٰ کو ٹھکرانے والا ---- نقد سے بہرہ یاب، اور نسیہ سے رُو گرداں ---- سُنو میری تعلیم:-

مفلوج ہر اصلاحِ ایماں کر دے فردوس کو رہنِ طاقِ نسیاں کر دے
ساقی ہے، مغنّی ہے، چمن ہے، مَے ہے اِس نقد پہ سَو اُدھار قرباں کر دے

میں اعلان کروں گا اور بعزم و اعلان کروں گا، اور:-

گرچہ بر واعظِ شہر این سخن آساں نشود

ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کروں گا کہ:-

سرم خوش است و بہ بانگِ بلند می گویم
کہ من نسیمِ حیات از پیالہ می جویم

ہاں میں رند ہوں ---- اور رندی پر فخر کرنے والوں میں سے ہوں ---- اور میرا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ میں اپنے کو "گناہگار" نہیں، بلکہ "معصوم" سمجھتا ہوں ----

"گناہگار" ہوں میرے دشمن ---- "گناہگار" ہو میری بلا۔

رندی میں نہیں ہے کم نگاہی ساقی فرقِ من و شانِ کج کلاہی ساقی
اللہ کا بندے سے تعلق ہے جہاں واں گم ہیں اوامر و نواہی ساقی

"گناہگار" ہوں گے وہ، جو ہاتھ پیر تُڑواتے ہیں، اپنی جھوٹی نمازوں کے وزن سے زمین کا پیٹ لچکاتے رہتے ہیں ---- داڑھیوں کے سائے میں مالِ حرام کھاتے ہیں ---- جاہلوں کو دوزخ کی آگ اور نزع کی تکلیفوں سے دھمکا دھمکا کر روپیہ اینٹھتے ہیں۔ گُمتار کی بیویوں سے پاؤں دبواتے اور ع

چوں بخلوت می روند، آں کارِ دیگر می کنند

پر عمل پیرا ہو کر مذہب اور آئینِ مذہب کو رُسوا کرتے رہتے ہیں۔

ہاں میں رند ہوں، شاہد باز اور شراب خوار رند ---- جیسا ہوں، دُنیا کو معلوم ہے ---- میری کتابِ حیات، ایک کھُلی ہوئی کتاب ہے، جہاں سے چاہو ورق اُلٹ لو۔ میری کتاب میں کوئی "بابُ الاسرار" موجود نہیں ہے۔

کیا کوئی خُدا کا بندہ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کا دل دُکھایا؟ کسی کا حق غصب کر لیا؟ یتیموں، بوڑھوں اور بیواؤں کی خدمت گزاری سے مُنہ موڑا؟ خُدا کی زمین پر فساد پھیلایا؟ ---- مالِ وقف ہضم کر لیا؟ قدرت نے جو کچھ دل و دماغ پر نازل فرمایا، اُسے اپنی قوم تک پہنچانے میں میں نے کبھی بُخل کو روا رکھا؟ اپنی ملت کو بیداری و آزادی کی طرف نہیں پُکارا؟ اور میں دوستوں کے ساتھ محبت اور دشمنوں کے ساتھ مدارات کے ساتھ پیش نہیں آیا؟

اگر یہ تمام باتیں صحیح ہیں تو خدارا جواب دو کہ مجھے "گناہگار" کہنے کا اُس وقت تک کون ارتکاب کر سکتا ہے، جب تک کہ اُس کے انصاف کی آنکھیں پھوٹ نہ جائیں؟

سوسائٹی کیا ہے؟ رسم و رواج، تعصّبات اور اوہام و روایات کی غلامی کا پُلندا۔ جب تک میں ایک اچھے اور مفید شہری کی صورت سے زندگی بسر کر رہا ہوں، جب تک دوسروں کے حقوق کو مجھ سے جراحت نہیں پہونچی، اور جب تک کہ میری ذات سے مُلکی و قومی مفاد اور امنِ عامّہ کو صدمہ نہیں پہونچتا سوسائٹی میرے معصومانہ اور شاعرانہ اشغال میں کیوں دخل دیتی ہے؟

جانتا ہوں کہ ہر پھٹے میں پاؤں دینے، اور ہر دفتر میں نام لکھانے والی "خدائی فوجدار" سوسائٹی، وہ قہرمانی قوت ہے کہ دُنیا کا ہنوز سب سے بڑا ادارہ، یعنی مذہب بھی اُس سے دبکتا، اور راہ میں اُس سے کترا کر نکل جانے ہی میں اپنی خیریت سمجھتا ہے۔

لیکن قوّت و حیات کی قسم، میں اُن "تعصبات" و "اوہام" کو جنھیں سوسائٹی نے "جائز" و "ناجائز" کا لقب دے رکھا ہے، کبھی درخورِ اعتنار سمجھکر اپنی عقل کی توہین کا ارتکاب نہ کروں گا۔

میں سوسائٹی کی تلوار پر بارہا رقص کر چکا ہوں، اور کبھی میرے پاؤں زخمی نہیں ہوئے ہیں۔

ہاں میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے۔ اور صبح پیری کے طلوع ہونے میں زیادہ مدت باقی نہیں ——— لیکن مجھے پروا نہیں ———

اب ہم سے بھی دُنیا میں کہاں ہیں ساقی ۔۔۔ آنکھیں تری جانب نگراں ہیں ساقی
ہم کو نہیں آرزوئے تجدیدِ شباب ۔۔۔ ہر جام میں سَو جوانیاں ہیں ساقی

ہاں تو میری جوانی کی رات بھیگ چلی ہے ——— کوئی پروا نہیں ———

میں اس بھیگی ہوئی رات میں بجُولوں کا سائبان تعمیر کروں گا۔ شبنم کا شامیانہ نصب کروں گا۔ زہرہ جمالوں کی جھُوٹی شرابیں پیوں گا۔ ایسی شرابیں، جن کی سُرخی دیکھکر سجدہ کرنے کو جی چاہے ———

میں نادرہ کنواریوں سے سرگوشیاں کروں گا۔ عُود و عنبر، اور شراب و گیسو کی خوشبوؤں میں جھُولوں گا۔ دَہکتے ہوئے رخساروں میں مُنھ دیکھوں گا۔ اور مہکتے ہوئے لبوں پر مُہرِ نشاط ثبت کروں گا۔

میں سازوں کے نغموں، گھنگھروؤں کی جھنکاروں، کوئیلوں کی کُوکُو، ساغروں کی کھنک، اور بھیرویں گانے والی جوانیوں کی مست دُھنوں پر قدم اُٹھاتا ہوا وہاں پہونچ جاؤں گا جہاں پیری باریاب نہیں ہو سکتی ——— اور جب صبح طالع ہوگی تو میں اُسے اس قدر شگفتہ، سرشار، اور مضبوط، تر و تازہ، اور جوان ہمت ملوں گا کہ پیری کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے۔

ہاں مجھے کوئی قوت، بوڑھا، زرد رُو، اور خشک مزاج نہیں بنا سکتی:

جی کھول کے وقت کو جھنجھوڑوں تو سہی ۔۔۔ قدرت کی قوی کلائی موڑوں تو سہی
پیری کو کنوئیں جھکا کے چھوڑوں تو سہی ۔۔۔ آتی ہے، تو آئے میری جانب پیری

خود اپنی ہی آواز سے بیدار ہو جاؤ
نیچی ہی نگاہ چیر [illegible] تیر ہو جاؤ
ہمت ہے تو وہ شعلۂ بے باک [illegible]
[illegible] نفس [illegible] ہو جاؤ

جوش ملیح آبادی

یاس عظیم آبادی کا ایک شعر معرضِ بحث میں

سید حیدر عباس حیدر ایم اے

"جوہر آئینہ یعنی آئینہ" مصنفہ جناب مولوی محمد احمد صاحب تجوّد موہانی ایم اے، ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں "ہماری شاعری" مصنفہ جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے کے معائب دکھانے کی اَن تھک کوشش کی گئی ہے۔ اسی رسالے میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پیسا گیا ہے یعنی یاس عظیم آبادی کے اس شعر پر اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

یہی شعر جناب ادیب نے بلندیٔ خیال کی مثال میں پیش کیا ہے۔ اور اس کی تشریح یوں کی ہے۔

قول ادیب ——— شاعر کے نزدیک خوش نصیبی اور بدنصیبی کا معیار خداشناسی ہے یعنی خداشناسی کی فضیلت جس کو حاصل ہو، وہ خوش نصیب ہے اور جس کو حاصل نہ ہو وہ بدنصیب ہے جس کی خواہشیں ہمیشہ پوری ہوتی رہتی ہیں۔ وہ عیش و آرام میں پڑ کر خدا کو بھول جاتا ہے۔ غرضکہ بالعموم بختِ نارسا انسان کو خداشناس اور بختِ رسا کو ارادہ پرست بنا دیتا ہے"

اعتراضِ تجوّد ——— جناب مؤلف بھولتے ہیں، ناکامیٔ پیہم کا یہ اثر بھی ہوتا ہے۔ انسان ہستیٔ واجب کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس شعر میں کوئی مفہوم ادا ہی نہیں ہوا"

التماسِ حیدر ——— اگر بقول تجوّد ناکامیٔ پیہم کا یہ اثر بھی ہوتا ہے کہ انسان ذات واجب الوجود کا منکر ہو جاتا ہے تو کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ارادوں میں کامیابی کی کثرت انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے؟ دنیا کو ماننا پڑے گا کہ ایسا ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ تجربات اور مشاہدات اس کے شاہد ہیں۔ اس اعتبار سے دونوں صاحبان کا خیال اپنی اپنی جگہ پر صحیح، البتہ تجوّد کا اعتراض نقادانِ فن کی نظر میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

دوسری بات یہ کہ بقول تجوّد "اس شعر میں کوئی مفہوم ادا ہی نہیں ہوا" اس کا جواب دو لفظوں میں ممکن ہے۔ یہ شعر بقول ادیب حضرت علیؑ کے اس قول پر مبنی ہے "عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ العزائم" یعنی میں نے اپنے خدا کو اپنے ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا" اب ذرا اس کو منطق کی کسوٹی پر کسیئے۔ ظاہر ہے کہ جب ارادوں کے فسخ ہو جانے سے خداشناسی ممکن ہے تو ارادوں کے برابر پورے ہوتے رہنے سے عام لوگوں کے لئے خدا کو بھول جانے کا امکان بھی صحیح ہے۔ اور دلیل مبرہن یہ کہ وہاں "بفسخ العزائم" کا ٹکڑا ہے۔ عزائم عزم کی جمع ہے۔ عزم کے معنی ہیں ارادہ۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر ہر نکتہ رس سمجھ سکتا ہے

کہ اس مطلب کے ادا کرنے کے لئے ارادہ پرست سے بہتر فی الحقیقت کوئی لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر معترض کا یہ دعویٰ کہ اس شعر میں کوئی مفہوم ادا ہی نہیں ہوا کوئی معقول بات تو نہیں معلوم ہوتی۔

اعتراض تجو د ـــــ شعر کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ شاعر نے تعمیم کی شان پیدا کر دی، جو عقل و مشاہدہ دونوں کے خلاف ہے۔ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک ایسا آدمی بدنصیب ہے جو بختِ نارسا نہ رکھتا ہو۔ اس قول کا صریح البطلان ہونا ظاہر ہے۔ ایسے اقبال مند لوگ نایاب نہیں جو اپنے ارادوں میں برابر کامیاب ہوتے ہیں اور اُن کی بندگی اوجِ کمال کے مدارج طے کر جاتی ہے۔ اور آخر میں ہمہ تن بندگی اور سراپا نیاز بن کر رہ جاتے ہیں۔ بابر ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کے معرکوں میں مظفر و منصور ہوتے ہی سجدۂ شکر میں گرتا ہے، اور بہت سے شاہنشاہ جب اپنی تمناؤں میں کامیاب ہوتے ہیں، سجدۂ نیاز میں اُن کی پیشانی زمینِ عجز کو بوسے دیتی نظر آتی ہے ...... "

التماس حیدر ـــــ اس شعر میں تعمیم کی شان ضرور ہے۔ لیکن حقیقت سے دُور نہیں۔ تجو د کا یہ کہنا ہی حقیقت پر مبنی نہیں کہ یہ پہلی غلطی ہے۔ بالعموم دنیا والے اِدھر اکثر و بیشتر ارادوں میں کامیاب ہوئے، اُدھر خدا کو بھولے۔ اگر راقم حروف معترض کے مقابلے میں ناتجربہ کار ہے تو ہندی کا وہ قدیم شاعر جو زمانے کے گرم و سرد آزما کر یہ لکھتا ہے کہ "دُکھ میں ہر کو سب بھجیں اور سکھ میں بھجے نہ کوئے۔" یقیناً تجربہ کار ہے۔ "کوے" پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور سے ارادوں میں کامیاب ہونے والے خدا کو بھول بیٹھتے ہیں اور کم ایسے ہیں جو اس کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، یہ بات تجربوں کے بعد اس قدر صحیح ثابت ہوتی ہے کہ ضرب المثل ہو گئی ہے۔ مثلاً "روزی جو دی خدا نے تو روزے قضا کئے"، "مثل ہے درجہ پہنچا تو خالق کی بھی یاد آئی" وغیرہ وغیرہ۔ تجو د نے اس موقع پر بابر کی مثال پیش کی ہے کہ اُس نے ابراہیم لودھی اور رانا سانگا پر فتح حاصل کرنے کے بعد سجدۂ شکر ادا کیا۔ سبحان اللہ کیا انصاف ہے، بابر سارا ہندوستان فتح کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا اور معترض کا یہ خیال ہے کہ آگرہ، دلی، فتحپور اور مشرق میں صوبۂ بہار فتح کر لینے کے بعد سب ارادے بابر کے پورے ہو گئے۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ فتح کے پہلے ہی بابر اپنی مجبوریوں اور دشواریوں کا احساس کرنے کے بعد خدا کو سچے دل سے یاد کرتا ہے، جب ارادے میں ناکامیابی کا خوف ہوا تو خدا کو یوں یاد کیا کہ تائب ہو اور شراب کے پیالوں کو چور چور کر دیا۔ کیا کوئی مورخ بتا سکتا ہے کہ رانا سانگا کے معرکے کے قبل بھی کبھی بابر نے ترکِ مے نوشی کا عہد کیا تھا؟ انصاف کی عینک لگا کر دیکھئے تو اسی خاندان میں ایسے بادشاہ نظر آئیں گے جو فی الواقع اپنے ارادوں میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور خدا کو بھولے۔ اکبر کے حالات پڑھئے۔ دیکھئے بدایونی نے کیا کیا لکھا ہے۔ شعر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جس کے دو چار ارادے پورے ہو گئے، وہ خدا کو بھول جاتا ہے۔ نمرود، فرعون، شداد وغیرہ کی مثال دینے میں کیوں تامل ہے۔ خیر آگے چلئے۔ تجو د کے خیال سے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک ایسا آدمی بدنصیب ہے جو بختِ نارسا نہ رکھتا ہو، حالانکہ شعر میں اس کی جھلک تک نہیں۔ نہ وہاں "ہر ایک" نہ "ہر وہ" نہ "ہر" کا لفظ ہے جو خواہ مخواہ سب کو سمیٹ لے۔ یہ ضرور ہے کہ زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، اس لئے ایک عام بات کہی گئی۔ حالی کے اس شعر کا مفہوم سمجھنے کے بعد آتشِ اعتراض سرد ہو جائیگی۔

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

اعتراض تجو د ۳ ـــــ پہلے مصرع یعنی "بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے" میں ارادہ پرستی کا ٹکڑا امر او قائل سے بیزار ہے۔ اس لئے کہ شاعر کا مفہوم ذہنی صرف یہ تھا کہ بعض ایسے لوگ جو اپنی ہر تمنا اور اپنے ہر ارادے میں کامیاب ہوتے ہیں، وہ مغرور و خود پرست ہو جاتے ہیں..... مگر خود پرستی یا خودی کا مفہوم ادا کرنے والا کوئی لفظ شاعرِ جدت طراز کو نہ مل سکا اور لگی الٹی گنگا بہنے۔ میں اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کئے دیتا ہوں۔ ارادہ پرستی۔ ارادے کی پرستش کرنا ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا

کتنا اصل مفہوم کے خلاف ہے۔ کہیں ایسے لوگ ارادے کی پرستش کرتے ہیں، ارادہ خود ان کی پرستش کرتا ہے۔ یعنی ادھر ارادہ ہوا ادھر کامیاب ہوئے۔ شاعر نے یہاں عبد کو معبود اور معبود کو عبد بنا دیا۔ اب جو بندہ تھا وہ خدا ہے اور جو خدا تھا وہ بندہ ہے۔ اس لئے جب تک ارادہ پرستی کا ٹکڑا شعر میں موجود ہے یعنی کرسی نشین ہو نہیں سکتے"

التماس حیدر ——— یہ اور بات ہے کہ ارادہ پرست کو مغرور و خود پرست بھی کہا جائے لیکن حق یہ ہے کہ ارادہ پرستی کا نعم البدل اس شعر میں ممکن ہی نہیں۔ ارادے کی پرستش کرنے سے یہ مراد نہیں کہ ارادے کو بیٹھے پوجتے رہیں جس کو سچ مچ پوجا جاتا ہے۔ اس کے آگے سر نیاز خم کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مدعا بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے خدا پرست خدا سے اپنی حالت عرض کرتا ہے، اور بُت پرست بُت کو اپنی رام کہانی سناتا ہے۔ نہ یہ کہ خود اُس کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں ارادہ کے پُوجنے سے یہ مراد ہے کہ ارادہ پرست اپنے ارادوں سے بڑھکر دنیا میں کسی کو نہیں مانتا، اور جانتا۔ اُسے یہ بھی خبر نہیں کہ اُس کے ارادے کس کے حکم سے پورے ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمیشہ کامیاب ہو جانے سے اُسے اُس کی فکر ہی نہیں رہتی۔ کسی بات کے جاننے یا سمجھنے کا خیال اُس کو ہوتا ہے جس کو کبھی نقصان پہنچا ہو یا ضرورت ہو جس نے کبھی فاقہ ہی نہ کیا ہو وہ بھوک کی تکلیف کیا جانے۔ مثل ہے سانپ کا کاٹا ہوا رسی سے ڈرتا ہے، یا دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔ ان خیالات کو سامنے رکھ کر یہ بھی دیکھئے کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں "بخت نارسا نہ ملا" کا ٹکڑا "نہ ملا" سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے ارادوں کو کامیاب بنانے والا کوئی ہاتھ اور ہے۔ خود وہ نہیں ہے ورنہ اس کو ملتا کیوں۔ اور جب ملنا ثابت ہے تو اُس کے سمجھنے میں کیا دقت ہے کہ جسے کوئی شے کہیں سے ملی ہو وہ اس کا اہل نہیں کہ اس کی (یعنی پانے والے کی) پرستش کی جائے، بلکہ پرستش اُس کی کی جائے گی جس نے وہ شے عطا کی۔ معترض کا یہ لکھنا کہ عبد کو معبود اور معبود کو عبد بنا دیا صریحی زبردستی ہے۔ عبد عبد ہی رہا اور معبود معبود ہی۔ کوئی بات اُلٹ پلٹ نہیں ہوئی، یہ اور بات ہے کہ مطلب اُلٹا نکالا گیا۔ قاعدہ ہے کہ بات قریب قریب ایک ہی ہوتی ہے، لیکن الفاظ جداگانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی امر خرق عادت اگر کسی کافر یا کاہن سے ظاہر ہو تو استدراج کہا جاتا ہے۔ اگر وہی کسی ولی سے ظاہر ہو تو کرامات اور اگر کسی پیغمبر سے ظاہر ہو تو معجزہ۔ اسی طرح "ارادہ پرستی" کا مفہوم جو شاعر کے ذہن میں تھا، بقول بیخود غرور اور خود پرستی سے بھی ادا ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ عرفت ربی بفسخ العزائم پر مبنی ہے۔ اس لئے یہاں ارادہ پرستی سے بہتر کوئی ٹکڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

اعتراض بیخود صاحب ——— ارادے کی پرستش کرتے ہیں وہ لوگ جو بار بار اپنی کوششوں میں ناکام رہتے ہیں۔

التماس حیدر ——— بیخود کا خیال ہے کہ ارادہ پرستی ناکامی کا نتیجہ ہے، حالانکہ بار بار ناکامی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پھر کسی امر کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ اُس کو اپنی زندگی دُوبھر ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر بیٹھ رہتا ہے کہ جو خدا کو منظور ہو گا وہ ہو گا۔ کسی ایسے شخص سے جو اپنے ارادوں میں اکثر ناکامیاب رہ چکا ہو، اگر کوئی پُوچھتا ہے۔ کیوں صاحب اب کیا ارادہ ہے؟ تو وہ بیساختہ جواب دیتا ہے کہ ——— "میں کیا اور میرا ارادہ ہی کیا ——— ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال" اگر وہ ارادہ پرست ہوتا تو بھلا یہ فقرہ اپنی زبان پر جاری کرتا کہ "میرا ارادہ ہی کیا" جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کو اس حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ بھلا کوئی بُت پرست کہہ سکتا ہے کہ میرا بُت ہی کیا یا کوئی خدا پرست معاذ اللہ کبھی کہے گا کہ میرا خدا ہی کیا۔

غرض ان چند سطروں سے یہ ثابت ہو گیا کہ یاس کا شعر بھی صحیح اور ادیب کی شرح بھی درست، البتہ بیخود کا اعتراض فن تنقید کے خلاف ہے۔

〰〰〰〰〰〰

امروزِ بے فردا

موت کے آغوش میں جینے کا ساماں کیا کروں
کیا کروں اے پیچ و تابِ شامِ ہجراں کیا کروں

اب نہ نقدِ عافیت باقی، نہ توقیرِ حیات
اب خیالِ دُزد و خوفِ دُشمنِ جاں کیا کروں

دل سے تا ذرّات و انجم کوئی شے ساکن نہیں
کیا کروں اے گردشِ گردونِ گرداں کیا کروں

بھاگتی ہیں راحتیں مجھ سے، جدھر جاتا ہوں میں
اے مذاقِ خدمتِ عمرِ گریزاں کیا کروں

سر میں اک سودا سا ہے اور وہ بھی سودا عشق کا
دل میں اک خنجر سا ہے اور وہ بھی عریاں کیا کروں

ہو چکا ہے فکرِ ننگ و نام سے فارغ دماغ
اب یہ دامن کیا کروں، اب یہ گریباں کیا کروں

زندگی میں جب کوئی امروز ہی باقی نہیں
کاوشِ فردا سے دل کو اب پشیماں کیا کروں

آندھیاں ایسی چلیں، گُل ہو گئی شمعِ مُراد
اب چراغِ زندگی کو زیرِ داماں کیا کروں

چاندنی ہے، باغ ہے، صہبا ہے لیکن وہ نہیں
اے صبا کیونکر جیوں، اے ماہِ تاباں کیا کروں

ہائے وہ ناشُستہ جلوے، ہائے وہ انگڑائیاں
ہم نشیں اب مقدمِ صُبحِ درخشاں کیا کروں

دیکھتی تھی نبضِ موسم جس کے ڈوروں میں نگاہ
ہائے وہ آنکھیں۔ میں اب سیرِ بہاراں کیا کروں

یہ جُدائی، اور یہ راتیں بھری برسات کی
چُبھ رہی ہے پہلوؤں میں موجِ باراں کیا کروں

ہائے وہ شمسادِ رقصاں، ہائے وہ سروِ رواں
جوشؔ اب نظارۂ ابرِ خراماں کیا کروں

جوشؔ ملیح آبادی

وہ اور ہم

ڈاکٹر غلام سرور

(۱) وہ ایک ہی وقت میں عقل اور بدن کی تربیت کرتے ہیں اور فہم درست، عزمِ صمیم اور بدنِ توانا کے مالک ہوتے ہیں۔ ہم بے ورزشی بدن کو مہمل قرار دیتے ہیں اور قوائے عقلی و بدنی سے محروم رہتے ہیں۔

(۲) وہ عورتوں کو مراکزِ تعلیم و تربیت میں جانے کی آزادی دیتے ہیں۔ اس وجہ سے اُن کے بچّے تربیتِ صحیح سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ہم عورتوں کو جہلِ مطلق کی چار دیواری میں مقید رکھتے ہیں۔ اس سبب سے ہمارے بچے اخلاقِ فاسدہ و عاداتِ رذیلہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۳) وہ اپنے بچوں کو حقائقِ تاریخی کے سننے کا عادی بناتے ہیں، تاکہ وہ اپنا وقتِ عزیز تحقیقاتِ حقائق میں صرف کرکے صدائے حق بلند کریں۔ ہم اپنے بچوں کو موہومات و خرافاتِ بےمعنی سے آشنا کرتے ہیں تاکہ وہ اپنا وقتِ عزیز لغویات میں کھو کر عوام کی گمراہی کا موجب بنیں۔

(۴) اُن کے بچّے جوانی میں ایامِ طفولیت کے مذاکرات سے مستفید ہوتے ہیں۔ ہمارے بچے جوانی میں اُن مطالب کی تاثیرات سے دست و گریباں رہتے ہیں۔ جن کی تلقین بچپن میں اُن کو کی جاتی ہے۔

(۵) وہ ہمارے تمدّنِ قدیم کے منافعِ کثیر کے اقتباس میں کوشاں ہیں۔ ہم اُن کے تمدّنِ جدید کے قبائحِ متعدد کی تقلید میں ساعی۔

(۶) اُن کے لئے تفریح و تفنن تقویتِ عقل و تصفیتِ ذہن کی موجب ہے۔ ہمارے لئے تضیعِ اوقات و اتلافِ عمر کا سبب۔

(۷) وہ تحصیلِ علوم و فنون سے کبھی سیر نہیں ہوتے، اور اسی علوئے ہمتِ مقدس کے طفیل منزلِ مقصود پر پہونچتے ہیں۔ ہم علم و فن کی ایک قلیل مقدار پر قناعت کرتے ہوئے بے جا خودستائی و خودنمائی کا اظہار کرتے ہیں اور منزلِ مقصود سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

(۸) وہ علوم و فنون کی رہنمائی میں کام سر انجام دینے کے بعد بامِ ترقی پر پہونچتے ہیں۔ ہم جو ہنوز اطفالِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں فقط الفاظ کے طلسمات میں گم ہو کر ترقی معکوس کرتے ہیں۔

(۹) وہ قوائے فطرت کے مشاہدے کے بعد اُن سے خدمت لینے میں باوجود سینکڑوں مشکلات کے عروسِ کامرانی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں اور فقط آہِ سرد بھر کر یہ کہتے ہوئے کنجِ عزلت اختیار کرتے ہیں، کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

(۱۰) وہ ہمارے ملک میں آتے ہیں اور اپنی دانشمندی و دوربینی کے طفیل فائدے حاصل کرتے ہیں۔ ہم اُن کے ملک میں جاتے ہیں اور اپنی کم عقلی و کوتاہ بینی کے سبب ضرر اُٹھاتے ہیں۔

(۱۱) اُن کے متمولین اپنی دولت اعمالِ نافع کی ایجاد میں صرف کرتے ہیں اور ممالکِ عالم کی جہانبانی کے تاجِ زرنگار سے سرافراز ہوتے ہیں

ہمارے دولت مند زر و سیم زمین میں دفن کرتے ہیں، اور اغیار کی غلامی کا طوق زیبِ گلو کرتے ہیں۔

(۱۲) اُن کے غربا وقتِ ضرورت اپنے لئے کام پیدا کرنے کی خود فکر کرتے ہیں۔ اور عزت و غیرت کو اپنی مائیِ افتخار زندگی کا اصول قرار دیتے ہیں۔ ہمارے فقرا حالتِ احتیاج میں سوال کی ذلت و رسوائی برداشت کرتے ہیں۔

(۱۳) اُن کے قلوب نورِ علوم و فنون سے منور ہیں۔ وہ اپنی بلندیِ ہمت و استقامتِ ارادے کی بنا پر حُبِ وطن کو حُبِ نفس پر مقدم جانتے ہیں، اور اقوامِ عالم سے خراجِ تحسین و آفرین وصول کرتے ہیں۔ ہمارے دل ظلمتِ جہل و نادانی سے تاریک ہیں، ہم اپنی پستیِ ہمت و سستیِ ارادہ کی وجہ سے حُبِ وطن کے پردے میں اغراضِ شخصی کو معرضِ ظہور میں لاتے ہیں۔ اور رسوائے عالم ہوتے ہیں۔

(۱۴) اُن کے نزدیک نجاتِ زندگی کا سرمایہ اتحاد و اتفاق اور دیانت و امانت ہیں۔ ہمارے نزدیک افتراق و اختلاف اور عدمِ دیانت و خیانت۔

(۱۵) اُن کو حصولِ مقصود میں اگر کوئی امر سدِ راہ ہو تو وہ شخصی جِدّ و جہد سے اُسے دُور کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بیشک یہی مردانگی ہے ہم اگر کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو باوجود حصولِ استعانت کے مایوس ہو جاتے ہیں، لاریب یہی بزدلی ہے۔

(۱۶) وہ رفعتِ آئندہ پر نظر رکھتے ہیں اور میدانِ محاربہ میں فتح و فیروزمندی کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ ہم عظمتِ رفتہ کے دلدادہ ہیں اور عرصۂ کارزار میں شکست و ہزیمت کی ذلت اُٹھاتے ہیں۔ ع

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

شکستِ تمکیں

جو ہوئی حکیمِ فطرت، کی نگاہِ مشفقانہ　　تو خمارے عبارت، ہوئی مستیِ شبانہ

ہے تغیراتِ عالم کا رہین، دورِ حاضر　　کہ نیازِ فقر بن کر، رہے نازِ خسروانہ

نہ رہے وہ شاہِ افغاں[1] و شریف[2] و زار[3] و قیصر[4]　　یہی ایک درسِ عبرت، ہے فسانہ در فسانہ

رُخِ انقلابِ عالم پہ، نگاہ رکھ ہمیشہ　　کہ ہنوز اپنے محور، پہ ہے گردشِ زمانہ

ہے زوال کے خطر میں، یہ عروجِ جاہ و ثروت

ہے قریبِ برق، جتنا ہو بلند، آشیانہ

نشتر سندیلوی

(۱) امان اللہ خاں شاہ کابل (۲) شریف مکہ معزول شد (۳) زارِ روس (۴) قیصرِ جرمنی سابق معزول شد

جھرّیاں

اس ضعیفہ کی دیکھئے صُورت کس قدر جھُرّیوں کی ہے کثرت
پوپلا مُنھ، کریہہ، بدمنظر صُبح جیسے مریض کا بستر
تنگ، دُھندلی، دھنسی ہوئی آنکھیں جیسے فرمانِ قتل پر مہریں
حلقے گہرے، سیاہ، بھیانک سے جیسے اندھے کنوئیں بیاباں کے
چھاؤں پلکوں کی سرد ڈھیلوں پر جیسے بیمار پر سیاہ چادر
دانت دو اک، قریب گرنے کے بھولے بھٹکے سے راہرو جیسے
کوزہ پشتی سے چال بے تاثیر جیسے ٹوٹی ہوئی کماں کا تیر
بال رُخ پر سفید زُلفوں کے مَلگجی دھوپ، لاش پر جیسے
مُردہ لہجے کی کپکپی، گویا ٹوٹی قبروں کے روزنوں میں ہوا
جھُرّیاں مُنھ پہ، خال و خد میں نشاں جیسے دلدل میں گاڑیوں کے نشاں
جھُرّیوں میں نہاں ہے اک دُنیا یہ نشاں ہیں ریکارڈ[1] کے گویا
جن میں سوئے ہوئے ہیں مدّت سے کروٹیں لے رہے ہیں حسرت سے
زمزمے عہدِ کامرانی کے
گیت گزری ہوئی جوانی کے

جوشؔ

[1] گراموفون کے ریکارڈ

عزمِ انتقام

غرورِ حُسن سے ٹوٹا ہے جام کیا کہئے! دلِ غیور ہے پُر انتقام کیا کہئے!

تبسّم نگہِ فتنہ کار سے ٹُوٹا
ادائے چشمِ محبت شعار سے ٹُوٹا
بہار بن کے جمالِ بہار سے ٹُوٹا

ستم تو یہ کہ اداؤں میں تھی وفا کی نمُود
خدائے عشق کے آگے وہ خود تھے سربسجُود

رگِ خیال کو نوکِ نظر سے چھیڑ دیا
سکونِ دل کو صدائے اثر سے چھیڑ دیا
دلِ حزیں کو وفا کی خبر سے چھیڑ دیا

نظر ملا کے محبت جتا کے لُوٹ لیا
نگاہِ ناز سے خود مسکرا کے لُوٹ لیا

پھر اس کے بعد اداؤں میں بے رُخی آئی
نگاہ پھیر کے تصویرِ جور دکھلائی
مرے جنوں پہ اک تیغ بیکسی چھائی

غرورِ حُسن میں دردِ جگر سے رُوٹھ گئے
دلِ حزیں کو جلا یا نظر سے رُوٹھ گئے

اب اپنا دل وہ دکھائیں تو میں نہ دیکھونگا
بہار بن کے بھی چھائیں تو میں نہ دیکھونگا
خدا بھی بن کے وہ آئیں تو میں نہ دیکھونگا

ہزار بار سنور کر وہ آئیں منظر پر
نظر کی بھیک بھی مانگیں اگر مرے در پر

تو میں نظر بھی اُٹھاؤں نہ بیحیا بن کے
نگاہ پھیر لوں کیفِ غرور میں تن کے

خلش صدیقی

نقد و نظر

پیامِ تعلیم کا تاسیس نمبر

پیامِ تعلیم کا سالگرہ نمبر ہمارے پیشِ نظر ہے، جامعہ ملیہ دہلی سے یہ بچوں کا ہفتہ وار اخبار نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے، اور ہر سال اس کا سالانہ یعنی تاسیس نمبر بھی نکلا کرتا ہے، یوں تو اس کے تمام نمبر بچوں کے لئے مفید اور کار آمد ہوتے ہیں، تصاویر میں بھی کوئی نہ کوئی جدت پیشِ نظر رہتی ہے۔ مگر اس سال کا سالگرہ نمبر نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکلا ہے، جس کے لئے پیامِ تعلیم کا ادارہ قابلِ مبارکباد ہے۔

تین چار نظمیں ہیں، جن کی ترتیب میں بچوں کی استعداد اور ذہنیت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ایک نقل بھاٹو کی اور دوسرا ڈراما کھیل اور کام کے عنوان سے ہے، جو مفید اور پُر مذاق ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا مضمون "شیخ نیازی" اپنی نوعیت کا بے مثل مضمون ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی مزا دے رہی ہے۔

گھڑی، ہوائی سفر کا رواج، ہوا کا دباؤ، یہ مضامین تعلیمی اور کام کے ہیں۔ بچے اِن سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا مضمون ہماری زبان بھی خوب ہے۔

متعدد تصاویر اور بے شمار کارٹونی خاکوں سے پورا رسالہ مزین ہے۔

غرضیکہ رسالہ کی ترتیب، طباعت، کتابت سب دیدہ زیب ہے، اور اس میں بچوں کے لئے کافی علمی، تفریحی اور ادبی ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے۔

ادارۂ کلیم

ہاں صرف ادارے سے اتنی فروگذاشت ہو گئی کہ فہرست مضامین کے ساتھ ساتھ فہرست تصاویر نہیں ترتیب دی۔ بچوں کے لئے یہ ضروری اور مفید کام تھا۔ جو غالباً عجلت اور وقت کی تنگی کی وجہ سے ناتمام رہ گیا۔

صحافتی اور ادبی دنیا میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام نہایت اہمیت رکھتا ہے، لیکن پیامِ تعلیم اِس اہم فرض کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کر رہا ہے ستائش اور تحسین کے قابل ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے ادارے بھی اس کام کی طرف جلد متوجہ ہوں، تاکہ آئندہ کی ہونہار نسلیں ملک اور قوم کے لئے مفید ترین بن سکیں۔ اور وہی خدمت اُن سے لی جا سکے جس کی موجودہ زمانے کو ضرورت ہے۔

پیامی بچوں کی باہمی خط و کتابت کی انجمن کا ترتیب دیا جانا نہایت مبارک خیال ہے۔ خدا اِسے راس لائے۔ آمین۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

(دوفا فرخ آبادی)

سوزِ ناتمام

یہ جنابِ عاشق بٹالوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پیشِ لفظ کے تحت خود مصنف نے اپنی تصنیف سے قارئین کو روشناس کرایا ہے، اور مختصر افسانہ نویسی پر خفیف روشنی ڈالی ہے، اس کے بعد افسانے شروع ہوتے ہیں، جو تعداد میں ۲۲ ہیں۔ ہر افسانے کی سُرخی تلاش و جستجو کی حامل ہے،

اور افسانے کی حقیقت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

میں ہوں اپنی شکست کی آواز، جوانی کی لغزش۔ عذرِ گناہ، فریبِ حسن، نہایت خوب افسانے ہیں۔ افسانہ نگار کا کیا فرض ہے؟ ان افسانوں میں اس کا تشفی بخش جواب موجود ہے۔ ہر افسانہ اپنے یا اپنے قریبی ماحول سے ترتیب دیا گیا ہے جس کے اندر تمام افسانوی خوبیاں موجود ہیں۔

دوسری قسط میں شہیدِ تغافل۔ رات کی خاموشی میں۔ مجروحِ احساس، کے ماتحت نہایت دلچسپ افسانے ہیں۔ "دھمکی" دل آویز افسانہ ہے، اور اس میں ہلکی ہلکی ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ حدیثِ آرزو، قدرت کا انتقام بھی اچھے افسانے ہیں۔ بہرحال عاشق صاحب کی یہ کوشش کسی طرح ناکامیاب نہیں کہی جاسکتی۔ عاشق صاحب کے افسانوں میں ایک خصوصیت نمایاں اور قابلِ تعریف ہے، وہ یہ کہ کوئی افسانہ بیکار نہیں لکھا گیا۔ ہر افسانہ نتیجہ خیز اور سبق آموز ہے۔ ملک کے ہونہار ضرور اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ نظمیں، افسانے، تعلیمی مقالے غرض کوئی چیز قلم سے بیکار نہ نکلے۔ آج ملک اور قوم کو اسی کی ضرورت ہے، اور عاشق صاحب نے ملک اور قوم کی اس ضرورت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے جس کے لئے وہ لائقِ مبارکباد ہیں۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ دفتر ادبی دنیا لاہور۔

(وفا فرخ آبادی)

آپ کا چندہ ختم ہوگیا

حسبِ ذیل خریداروں کا چندہ جنوری اور فروری نمبر کے بعد ختم ہوتا ہے، لہٰذا مستدعا ہے کہ وہ اپنا اپنا زرِ چندہ بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرمائیں تاکہ وی پی کی زحمت اور صرفہ نہ ہو۔

جنوری نمبر کے بعد

جناب بشیر علی صاحب — آگرہ
جناب بال کشن داس صاحب — انبالہ چھاؤنی
جناب حاجی ولایت حسین صاحب — بنارس چھاؤنی
جناب محمد عزیز صاحب مصری — بانکی پور پٹنہ
جناب سید محمد صاحب — میرٹھ
جناب تیج نرائن صاحب ملا — الہ آباد
جناب محمد خلیل صاحب فائق — بریلی
جناب ظہور الدین احمد صاحب — حیدرآباد دکن
جناب نواب مرزا محمد صادق صاحب — لکھنؤ
جناب نواب مرزا محمد قاسم علی خاں صاحب — لکھنؤ
جناب نواب سید محمد رضا صاحب — لکھنؤ
جناب زاہد حسین صاحب — پشاور
جناب فضل الرحمٰن صاحب — ڈیرہ اسمٰعیل خاں
جناب محمد یونس صاحب — مظفر نگر
جناب دیوان علی شاہ صاحب — لائل پور
جناب عالمگیر خاں صاحب — آگرہ
جناب عبدالکریم عمر بھا دلیہ صاحب — کاٹھیاواڑ
جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ اسکول — انبالہ
جناب اے بی ساحر صاحب — بمبئی
جناب سکرٹری صاحب میونسپلٹی — سندیلہ
جناب عطاء اللہ خاں صاحب — بنوں
جناب فضل علی صاحب — لکھنؤ
جناب ایس اے شمسی صاحب — جبل پور چھاؤنی
جناب حبیب اللہ خاں صاحب — جالندھر
جناب ڈاکٹر غلام رسول صاحب — کلکتہ
جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اردو مڈل اسکول — چھتواڑگ
جناب پنڈت جگ موہن ناتھ صاحب رینہ — باندہ
جناب سید نور الحق صاحب نظر — گیا
جناب نواب اختر حسین صاحب — لکھنؤ
جناب محمد اسحٰق صاحب — فیض آباد
جناب نوشہ علی صاحب — پیلی بھیت
جناب چراغ دین صاحب — بہو
جناب ایچ۔ آر۔ خاں صاحب — کراچی
جناب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب — سکھر
جناب غلام حیدر خاں صاحب — گونڈہ
جناب مسٹر حیدری صاحب — لکھنؤ
جناب خواجہ وصی الدین صاحب — لکھنؤ
جناب ایس۔ این سپرو صاحب — الہ آباد
جناب ڈاکٹر ولی اللہ صاحب — الہ آباد
جناب مرزا صمصام الدین احمد خاں صاحب — فیروزپور
جناب مرزا اعتزاز الدین احمد خاں صاحب — گوجرانوالہ
جناب سکرٹری صاحب کامن روم اسلامیہ کالج — کلکتہ
جناب ایچ۔ ٹی۔ حنیف صاحب — ملکاپور
جناب ایس اے انصاری صاحب — الہ آباد
جناب مسٹر عین الہدیٰ صاحب — مونگھیر
جناب سید یحییٰ امام صاحب — پٹنہ
کیوریٹر کوئنز کالج — بنارس
جناب وزیر حسن صاحب — مونگھیر
جناب خورشید علی صاحب — پیگو (برما)
جناب ناصر احمد صاحب — فتح آباد
جناب عبدالواجد خاں صاحب — لکھیم پور

فروری کے بعد

جناب سکرٹری صاحب اردو لائبریری — بھوپال
جناب محمد رفیق صاحب — منا پور
جناب مولوی عبدالرزاق خاں صاحب — کلکتہ
جناب محمد یعقوب صاحب — میرپور

خاندانِ شریفی کی علمی خدمات

علامہ نجیب الدین سمرقندی کی کتاب "اسباب و علامات" پر "ملا نفیس" نے نہایت عمدہ شرح لکھکر طبی دنیا پر جو احسان عظیم کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن اس شرح پر افلاطونِ زمانہ اشرف الحکما حکیم شریف خاں صاحب دہلوی نے نہایت مفید حاشیہ تحریر کرکے کتاب کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس حاشیہ میں حکیم صاحب نے اپنے تمام خاندانی مجربات اور معمولات بلاکم و کاست تحریر کر دئے ہیں۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ تھی اور صرف خاندانِ شریفی میں دستور الطب کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

حکیم خواجہ رضوان احمد صاحب نے اس کتاب کے مجربات اور پوشیدہ خاندانی نسخہ جات

ترجمہ شرح اسباب

میں درج کر دئے ہیں جس کی وجہ سے یہ ترجمہ نہایت کار آمد و مفید ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کی یہ مقبولیت ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک طبیہ کالج کے کورس میں داخل ہو چکا ہے۔ مجربات اور معمولات کی وجہ سے یہ کتاب طبیب اور غیر طبیب دونوں کے لئے مفید ہے۔ متعدد عکسی تصاویر۔ قیمت مکمل ۱۱؎ جلد دوم للعہ جلد سوم ۲؎ جلد چہارم ۲؎

دیگر مطبوعات

ترجمہ حمیات قانون مع معمولات ۱؎ — حمیات قانون عربی معہ حاشیہ شریف خانی للعہ

ترجمہ موجز القانون ۴؎ — موجز القانون عربی ۸؎ — منافع الاعضا مع ۴؎

ملنے کا پتہ۔ دفتر دار التالیفات اجمل روڈ، قرولباغ دہلی

دلِ پھینک

(ایک روپیہ) مشہور مزاح نگار حضرت شوکت تھانوی کا دلچسپ ناول جو عشق و محبت کا ایسا دلکش فسانہ ہے کہ آپ ہنسی پر قابو نہ رکھ سکیں گے ایسا ناول اب تک آپ نے نہ ملاحظہ فرمایا ہوگا ضرور پڑھئے پسند نہ آئے تو قیمت واپس (قیمت عہ لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ)

سودیشی ریل شوکت تھانوی کا وہ مضمون جو اردو میں ادب لطیف کا بہترین نمونہ ہے، سیکڑوں اخبارات میں چھپ چکا ہے اب مصنف نے پلاٹ کو بڑھا کر اسے کتابی صورت میں کر دیا ہے، قیمت صرف ایک روپیہ۔ ایک ساتھ خریداری پر محصولڈاک معاف۔

منیجر نسیم بکڈپو لکھنؤ

کلیم میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو ترقی دیجئے

صبح کا ستارہ
جس طرح صبح کا ستارہ سورج کی جان بخش روشنی کا پیش خیمہ ہے
اسی طرح
طبیب نسواں
کا اجرا ملک کی خواتین کی تندرستی کا پیش خیمہ ہے
طبیب نسواں ماہوار طبی رسالہ ہے جسکو ملک کے
مایہ ناز ادیب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کی ادارت
کا فخر حاصل ہے اسکا سائز زنانہ (۲۷×۱۷) اور حجم ۶۴ صفحات ہے
کتابت وطباعت نفیس اور ٹائٹل نہایت دلفریب اور دیدہ زیب ہے
قیمت سالانہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ (ﻋﻪ)
(مینیجر طبیب نسواں دہلی)

بنام قوّت و حیات

کلیم

دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سُنائے جا ترانہ اپنا
منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد (۳) | فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۳۷ء | نمبر (۳)

اشارات

مدیر

"حلقۂ مفکّرین"

ہندوستان کی ذہنی تاریکی و پستی پر نگاہ کرکے اِس سے پیشتر بھی عرض کیا جاچکا ہے، اور آج بھی عرض کیا جارہا ہے کہ ایک ایسے حلقۂ مفکرین کے قائم کرنے کی شدید اور فوری ضرورت ہے جس کے ذریعے سے ایسے تندرست افکار کی نشرو ہمت افزائی کی جائے جو فلسفیانہ اور انتقادی تحقیقات پر مبنی ہوں۔ اور ایسے ادبیات کو فروغ دیا جائے جو نوعِ انسانی کی قوتِ استدلال کو اوہام و روایات اور تنگ نظری و تعصّبات کی زنجیروں سے آزاد کردیں۔

خصوصیت کے ساتھ اہلِ ہند کے واسطے یہ انتہائی شرمناک بات ہے کہ قدامت کو یہاں اب تک مُقدّس سمجھا جاتا، اور آزاد اندیشی پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔

ہمنے اب تک سیکھا اور سوچا ہی کیا ہے، جب اس پر نظر جاتی ہے تو ماتھے سے شرم کا پسینہ ٹپکنے لگتا ہے۔

کیا ہم علوم کے روبہ ترقی رجحانات کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ اِس کے جواب میں سر بگریباں ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

جب یہ ثابت ہوچکا ہے، نظری طور سے نہیں، بلکہ عملی شکل سے ثابت ہوچکا ہے کہ ہمارے موجودہ ادارے اِس ارتقائی دور میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے، تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک تازہ اور صحیح ادارہ کیوں نہ قائم کیا جائے۔ آخر جھجک کس بات کی ہے؟

سچ بولنا ایک نہایت ہی دُشوار بات ہے، اور سچ پر عمل کرکے دکھا دینا اُس سے بھی دُشوار ہے۔ لیکن سچی بات کا اعلان کرکے نفرین و ملامت کا ہدف بننا اِس سے کہیں بہتر ہے کہ سچ کو مخفی کرکے تحسین و آفرین کے زمزمے سُنے جائیں۔

اگر اب ہمارے ارضی و سماوی ضابطے ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر رہے ہیں، اور علمی دوڑ میں ہانپ رہے ہیں، تو کیا یا یک برمحل عاقلانہ بات ہوگی کہ اُن قدیم اداروں کی بوسیدہ اور مرطوب عمارتوں کو ڈھاکر اُن کی جگہ جدید فنِ تعمیر کے طرز پر ایک نیا قصرِ ضوابط تعمیر کیا جائے؟ —— یا آپ محض اپنے دیرینہ جذباتی روابط کی بناء پر یہ رائے دینا پسند فرمائیں گے کہ چونکہ ان اداروں کے ساتھ روایتی تقدس وابستہ ہے، اِس لئے انھیں غیر صحت بخش پُرانے کھنڈروں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا جائے؟

اِس میں شک نہیں کہ آپ کے لڑکپن کا کوٹ نہایت آرام دِہ اور چمکیلا تھا، لیکن کیا جوانی میں اُسی کوٹ کے* پہننے کے شوق میں آپ اپنے پر یہ ظلم کرنا پسند فرمائینگے کہ اپنے اعضاء کی قطع و بُرید کرڈالیں؟ سوال یہ ہے کہ کوٹ ہمارے جسم کے واسطے سیا گیا تھا، یا ہمارا

جسم کوٹ کی خاطر خلق ہوا ہے ؟

اور دوسرا سوال اسی کے اندر سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوٹ چھوٹا ہوگیا ہے تو ہم دوسرا بڑا کوٹ طیار کرلیں۔ یا اپنے جسم کو اُس کوٹ کے بقدر چھوٹا بنالیں ؟

یہ صحیح ہے کہ وہ نسخہ جو آپ کے واسطے آپ کے بچپن میں لکھا گیا تھا وہ نفع بخش ثابت ہوا تھا، لیکن اب جبکہ آپ بالغ ہو چکے ہیں، اور آپ کے مزاج وماحول اور جسمانی خصوصیات میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، کیا آپ اُس نسخے کے استعمال پر اصرار کرینگے، اور یہاں تک اصرار کرینگے کہ اجزاء تو اجزاء، اُس کے اوزان بھی وہی رہیں جو بچپن میں تھے ؟

ان دونوں میں عاقلانہ روش کیا ہے، خود آپ ہی بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں۔

حقایق لامحدود طور سے عظیم ہیں، اور اُن کے وہ بظاہر مختصر اجزاء بھی بے پایانی کے ساتھ عظیم ہیں جن پر "عقلا روشنی ڈال چکے ہیں" — یہ لکھتے ہوئے کہ "عقلاء روشنی ڈال چکے ہیں" مجھے شرم سی محسوس ہوتی ہے — میں تو :-

ہر کس نہ شناسندۂ راز است، دگر نہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

کا قائل ہوں — اِس لئے اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھنے کا وقت آگیا ہے کہ حقایق کو کرۂ ارض اور بالخصوص ہندوستان میں عام کردیا جائے، جہالت سے جنگ کی جائے، کوتاہ بینوں کو فنا کردیا جائے، علم الاصنام اور "مقدس حکایات" کا تجزیہ کرکے اوہام کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے۔

صرف اِسی قدر کافی نہ ہوگا کہ جدید حقایق اور تازہ اکتشافات علمی حلقوں، یا درسگاہوں تک ہی محدود رہیں، یا محض علمی رسائل ہی میں اُنھیں بند رکھا جائے — بلکہ اس کے برخلاف اِس کی شدید ضرورت ہے کہ انھیں آفتاب کی کرنوں کی طرح تمام اطراف واکناف میں پھیلا دیا جائے۔

حقایق، جہاں تک حیات وکائنات سے اُن کا تعلق ہے، تمام نوعِ انسانی کی ملکیت ہیں، اور اُنھیں ایک جگہ محدود کر دینا اپنی نوع کے حقوق کا غصب کرلینا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ اُن تمام افراد کو جن کی تعلیم وتربیت سے غفلت روا رکھی گئی ہے، یا جنھیں غلط اسلوب سے تعلیم دی گئی ہے، ایک ایسی آنکھیں کھول دینے والی تعلیم دی جائے کہ وہ تعقّل وتدبّر سے مانوس ہوجائیں، اُنھیں فطری علوم سے آگاہی حاصل ہوجائے، اور آزادانہ اندیشی کے پیدائشی حقوق، جن سے اُنھیں مسلسل چالاکیوں کے ذریعے سے محروم کردیا گیا ہے، اُنھیں پھر حاصل ہوجائیں، اور اُنکے قوائے ادراک اسقدر صاف وصحیح ہوجائیں کہ اُن کے دماغ تو طلی استدلال اور صحیح استخراج کے معنے سمجھنے لگیں۔

جو حضرات اس حلقۂ "متفکرین" کے رُکن بنیں، اُن کے واسطے یہ شرط ہوکہ وہ کسی منفی یا مثبت خلافِ عقل مسلک کے پیرو نہوں۔ کیونکہ اِس حلقے میں اُن تمام بے شمار خیالات ومسائل کے واسطے کافی سے زیادہ گنجایش موجود ہوگی جو فطرت اور عقل کے مسلّمہ حقایق کے مخالف واقع نہ ہوں۔

یہ حلقہ، اوہام وروایات کے معتقدین کو چیلنج دیگا کہ وہ اپنے معتقدات کا ثبوت پیش کریں، اور سوال اُٹھائیگا کہ وہ "مقدس" حضرات جو نوعِ انسانی کو فرضی معتقدات، اور اعتباری اصول کے جال میں پھنسانے کے مواقع کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے ہیں کیا اُنھیں دنیا میں اور کوئی روزگار نہیں ملتا، اور یہ بھی پوچھا جائیگا کہ اُنھیں اِس خطرناک کھیل کا کہاں سے حق پہونچتا ہے ؟

اِس حلقے کے ذریعے سے ایک ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کی جائیگی کہ تعقّل واستدلال کی فوقیت کو لامحدود صورت سے تسلیم کرلیا جائے، اور فلسفۂ اخلاق کا ایک ایسا مبنی بہ حکمت قاعدہ جاری کردیا جائے کہ تمام مطلق العنان اُمور قیاسی، اور تمام بے لگام نظریاتِ ظنّی سے آزاد ہوکر انسانیت اِس قابل ہوجائے کہ خالص تفکّر کی بنیادوں پر مسائل حیات وامور کائنات کا تصفیہ کرنے لگے۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ آجکل بہت سے ارباب تقلید وپیروانِ اوہام، زیادہ تر تو اپنے تیوروں سے، اور گاہ گاہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سے یہ ظاہر کرکے کہ وہ صحیح استدلال، اور عمیق مطالعۂ وتفکر کے پسند کرنے والے ہیں، اپنی روشن خیالی اور آزاد اندیشی کا لوہا منوانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں —— اور جہاں تک دوسری جماعتوں کے اعمال وعقائد کا تعلق ہے، یہ حضرات، استدلالیوں اور مفکروں کی طرح اُن پر نقد واعتراض کرکے اپنی روشن خیالی اور حکمت نوازی کا ثبوت بھی پیش کرتے رہتے ہیں — لیکن جیسے ہی کہ خود اِن کے اعمال وعقائد پر بحث چھڑ جاتی ہے، یہ فوراً روایتی عقائد اور درایتی تحقیقات کے بین بین رہتے ہوئے ایسی شاعرانہ تاویلیں، اور ایسے ادیبانہ لطیفے کرنے پر اُترتے ہیں، جن کی مدد سے تقلید و تعقل میں مصالحت ہو جائے، اور اُن کی وہم پرستیوں کو علم ودانش کا خطاب مل جائے۔

گو ہم جانتے ہیں کہ رُوحِ تفکّر نہایت ہی قوی وعظیم ہے، لیکن ہمیں اِس کا بھی احساس ہے کہ انسان کی ذہنی زندگی کو اِس کا مستقلاً پابند بنا دینا کوئی آسان کام نہیں —— پھر بھی نوعِ انسانی کے ہوا خواہوں کو ہمّت نہ ہارنا چاہئے، کیونکہ ہر فتح، مستقل ومسلسل جنگ کے بعد ہی حاصل ہوا کرتی ہے۔

اگر حلقۂ مفکرین قائم کرنے میں کامیابی ہو گئی تو بجا طور سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ روایتی دینیات، رسمی اخلاقیات، اور مبنی بر اوہام تقلید کے مقابلے میں یہ حلقہ، انسانی افکار وکردار پر بہت زیادہ، اور نہایت پائدار اثر ڈال سکیگا۔

اِس سے انکار نہ کرنا چاہئے کہ ضابطۂ اخلاق کے سلسلۂ ارتقار میں دینیات واخلاقیات ایک خاص مرتبے کے حامل رہے ہیں، لیکن جب عمیق نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ جہاں تک اخلاقِ انسانی کی صحیح، اور مستحکم نشوونما اور فطری نیکی کا تعلق ہے، اِن دونوں اداروں نے بوست تو ضرور پیدا کیا ہے، لیکن مغز کی پیدا وار میں انھیں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

ہمارے قدیم مسلک کئی حیثیتوں سے نسلِ انسانی کی حقیقی وفطری ترقی وفلاح میں ہمیشہ حارج رہے ہیں، اور ان کے نام پر آدم کی نسل ہمیشہ ایک دوسرے کا خون بہاتی رہی ہے، نیز ان مسلکوں کے نیک نہاد ہادیوں کے تمام جانبازانہ ومخلصانہ مساعی کے باوصف گنتی کے صرف چند افراد کے علاوہ، اِن سے عالمِ انسانیت کو کوئی عمومی اور پائدار فائدہ کبھی حاصل نہیں ہوا ہے۔

قدیم مسلکوں اور پارینہ ضابطوں کے پیرو اپنے عقائد کے برسرِ حق ہونے کے ثبوت میں اکثر یہ بات پیش کیا کرتے ہیں کہ جو لوگ اُن کی روش سے رُوگرداں کر دیتے ہیں، اُن کی زندگی بے مقصد وبے منزل ہو کر رہ جاتی ہے، اور وہ معصیت آمیز ترغیبات کے مقابلے میں بے دست وپا ہو کر ایک شائستہ زندگی بسر کرنے کے تمام تصوّرات سے خالی ہو جاتے ہیں ——

اِس میں شک نہیں کہ عقائد ترک کر دینے کے بعد انسانی زندگی اکثر وبیشتر بے لگام ہو جایا کرتی ہے، لیکن اِس صورتِ حال سے عقائد کا برسرِ حق ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا الزام (۱) اولاً تو خود نفس دینیات وعقائد ہی پر عائد ہوتا ہے کہ دینیات وعقائد نے ہمیشہ وسیع پیمانے پر بے اصل ما فوق الفطرت رشوتوں کے وعدوں سے بہلا پھسلا کے انسان کو نیکی پر اُکسایا، اور بے بنیاد ماورائے عادت عقوبتوں سے ڈرا دھمکا کر بدی سے روکا ہے —— اگر یہ ادارے رشوتوں، اور دھمکیوں سے کام نہ لیتے، اور یہ تعلیم دیتے کہ نیکی کو محض نیکی کی خاطر اختیار کرنا، اور بدی کو محض بدی کی خاطر ترک کرنا چاہئے تو ترکِ عقائد کے بعد انسانی زندگی کے لئے بے لگام ہو جانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ رشوتوں اور دھمکیوں کے ذریعے سے

نیکی کی رغبت، اور بدی کی نفرت کا بیج بونا اُس قدسی شعورِ اخلاق کو جو انسان کی مدنی فطرت کا جُزوِ لاینفک ہے، قطعیٔ طور پر فنا کردیتا ہے، اور شعورِ اخلاق کو فنا کردینے کے بعد اس بات کو دنیات کے برسرِ حق ہونے کے ثبوت میں پیش کرنا کہ ترکِ عقاید کے بعد انسانی زندگی بے لگام ہو جاتی ہے، اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(۲) اِس کے بعد اِس صورتِ حال کا الزام اُن انفرادی سبلے اصولوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو حقیقی ضابطۂ اخلاق اور مدنی ضروریات کی فطری بُنیادوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی خاطر حقایق و معارف کا سُراغ لگانے میں کافی سرگرمی سے کام نہیں لیا کرتے ــــ

ہر چند اکتسابی رجحانات، عادات اور روایتی معتقدات کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی سیرت، تبدیلیٔ رائے کے ساتھ فوراً تبدیل نہیں ہوسکتی، پھر بھی اس میں شک نہ کرنا چاہئے کہ ایک حقیقی ضابطۂ اخلاق کی بُنیادوں کا ذہنی انکشاف و احساس ایک نہ ایک روز ایک بہتر عملی زندگی کی صورت ضرور اختیار کرلیتا ہے، قدیم مسلکوں، اور فرسودہ اداروں کے مقابلے میں کسی نئے مسلک یا جدید ادارے کا قائم کرنا سردست نہایت ہی مشکل کام معلوم ہوتا ہے ــــ پھر بھی حلقۂ مفکّرین کے قیام سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ جب اس کے بالغ نظر ارکان کے افکار مُلک کے دُور و دراز گوشوں تک مستقل طور سے پہونچتے رہینگے، اور اس بّرِ اعظم کے مفکّرین مُتفقہ طور پر اور کامل باضابطگی کے ساتھ اوہام و روایات، اور تقلید و جُمود کے خلاف مسلسل جہاد کرنے پر تُل جائینگے تو ایک نہ ایک دن اسی تاریک اُفق سے آزاد اندیشی اور تفکر کا آفتاب بلند ہو کر اس وسیع سرزمین کو جگمگا دیگا اور یہ وہ مبارک ساعت ہوگی جس کے ظہور پذیر ہوتے ہی ہندوستان میں مسلکِ جدید کا دور شروع ہو جائیگا۔

واضح رہے کہ جس مسلک میں بھی نوعِ انسانی کی فلاح کی خاطر صحیح انہماک، اور ذی شعور مخلوق کی مسرت اندوزی کے واسطے قوی اور بے لوث جد و جہد پائی جائے، وہی مسلک در اصل دُنیا کا بہترین اور فطری مذہب کہا جاسکتا ہے ــــ

اس میں شک نہیں کہ :ــ

ع ـ آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

لیکن مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ :ــ

بہر کارے کہ ہمّت بستہ گردد
اگر خارے شود، گلدستہ گردد

نظیر اکبر آبادی نمبر

نظیر اکبر آبادی اردو کے ان شعرا میں تھے جنہیں اُردو کا سب سے پہلا ناظم کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے محض غزل کو اپنا سرمایہ نہیں بنایا بلکہ نظم کو اپنے اظہار خیال کیلئے منتخب کیا اور اسی پر اپنا تمام زور صرف کیا۔ یہ پودا جو انھوں نے اپنے مقدس ہاتھوں سے لگایا تھا بڑھتے بڑھتے آج پورا درخت ہو گیا ہے۔ اسی کی آبیاری آزاد و حالی نے کی اور اسی کو دورِ جدید کے شعرا نے پروان چڑھایا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسکا بیج نظیر اکبر آبادی ہی نے بویا تھا۔

چونکہ کلیم غزل کے مقابلہ میں نظم کا حامی ہے اسلئے اسکا فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبرِ نظم کی یاد میں اپنا ایک خاص نمبر نکالے اور جس میں نظیر اکبر آبادی اور انکی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالکر انہیں اچھی طرح اجاگر کرے لیکن یہ اہم خدمت ہم اسوقت تک انجام نہیں دے سکتے جبتک ہمارے اہل قلم حضرات اس طرف توجہ نکریں اسلئے ہم اپنے تمام معاونین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نظیر اکبر آبادی کے متعلق اپنے لئے موضوع منتخب فرما کر ہمیں جلد از جلد مطلع فرمائیں۔ چند عنوانات جو ہماری سمجھ میں آئے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ (۱) نظیر اکبر آبادی کے سوانح حیات۔ (۲) نظیر اکبر آبادی کے کلام کی خصوصیات۔ (۳) نظیر اکبر آبادی کے اصناف سخن۔ (۴) نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں انکے زمانہ کی سوسائٹی کا خاکہ (۵) نظیر اکبر آبادی کی لغت اور اصطلاحات۔ (۶) اُردو شاعری پر نظیر اکبر آبادی کے کلام کا اثر (۷) کیا نظیر اکبر آبادی [illegible] وغیرہ وغیرہ

کوشش کی کچھ سُنی بھی یہ منہ زورشیخیاں؟ کہتی ہے میں ہوں قالب انسانیت کی جان
باندھا ہے میں نے محفل آفاق میں سماں رونق مرے ہی دم سے یہ سب ہے یہاں وہاں

سُنتے ہو شور و غل جو یہ جاہ و جلال کے
بہروپ ہیں یہ سب میرے حُسن و جمال کے

تاریخ تمکو میری کہانی سُنائیگی تصویر پوری پوری وہ میری دکھائیگی
حیران مثال آئینہ تمکو بنائے گی ہمت کی طرح دل کو تمھارے بڑھائیگی

کس کس کے ساتھ میں نے ہے کیا کیا نہیں کیا
ہے ہے کوکسکی کس کی اہا ہا نہیں کیا

غربت میں تھے جو انکو میں لطف وطن بنی صحرائیوں کے واسطے سیر چمن بنی
شربت کا گھونٹ میں پئے تشنہ دہن بنی چھوٹا بنا ہی گراہے جس کی تو لگن بنی

آنکھوں میں اپنی اشک جو آیا بھرے ہوئے
لوٹا تو کشتیوں میں تھے موتی دھرے ہوئے

کیا جانے کوئی کیا مرے دل میں سمائی ہے بنجائیگی ابھی تو مری کیا بنائی ہے
کیسی زمیں فلک پہ میری اب چڑھائی ہے اب میں نے داغ بیل ہوا میں لگائی ہے

پتھر کو چیرتی ہوئی گردوں پہ جاوے گی
جاکر چراغ علم وہاں بھی جلاوے گی

اُوپر جو آؤں میں کبھی اپنی ہی بات کے تارے دکھادوں دن کے اوجالے میں رات کے
میں وہ ہوں ممکنات نے جس کی صفات کے بیکار حرف کر دیے ناممکنات کے

رکھدوں اولٹ کے گردش تقدیر تک کو میں
پیچھے ہٹادوں چھوٹے ہوئے تیر تک کو میں

ملکوں کو ایک شہر کے کوچے بناوے گی قوموں کو ایک کنبہ کے رشتے میں لاویگی
آتش کو دشمنی کی جہاں سے مٹادیگی بغض و حسد کی آگ کو لُو کا لگا دیگی

کانٹوں کو اختلاف مذاہب کے توڑ کر
چُن لونگی پھول صدق کی شاخونکو موڑ کر

پر میرے پیچھے پیچھے ہے محنت لگی ہوئی — محنت کے پیچھے پیچھے ہے دولت لگی ہوئی
دولت کے پیچھے پیچھے ہے عشرت لگی ہوئی — عشرت کے پیچھے پیچھے ہے شامت لگی ہوئی

شامت کے بعد آتا ہے تقدیر کا گلہ
آغاز ہوتا ہے یہاں قسمت کا سلسلہ

کاہل سے میرے پاس تک آیا نہ جائیگا — مردے سے بارِ زیست اٹھایا نہ جائیگا
ظلمت سے روشنی میں سمایا نہ جائیگا — اندھے کو مجھ سے رنگ دکھایا نہ جائیگا

خواہاں مرا تو خود ہی میرے ساتھ ساتھ ہے
کنجی خدا کے فضل کی خود میرے ہاتھ ہے

اے وہ جو مجھ سے رکھتے ہو الفت سنو سنو — اک بات میری اپنی گرہ سے یہ باندھ لو
ہرگز بدی میں مجھ سے مدد تم نہ چاہیو — نقصان تاکہ نفع کے بدلے نہ تم کو ہو

گیسو سے بچیو لپٹو گلے سے جو یار کے
ناگن کو چھو نہ بیٹھیو دھوکے میں ہار کے

میں نیک خو کے واسطے لطفِ شباب ہوں — پر میں کا بدخصال کے حق میں عذاب ہوں
دوزخ ہوں بد کو یعنی خدا کا عتاب ہوں — دریا ہوں نیک خو کو تو بد کو سراب ہوں

چکھیں جو مجکو نیک تو مادر کا شیر ہوں
پر میں بدوں کے سینہ پہ پہونچوں تو تیر ہوں

غافل یہ زندگی ہے کوئی دم کی زندگی — کب تک جئے گا شیون و ماتم کی زندگی
کب تک جئے گا دیدۂ پُرنم کی زندگی — چیونٹی سے سیکھ محنتِ پیہم کی زندگی

زندہ ہے تو تو زندگی محنت کا نام ہے
محنت کے دم سے امن و اماں کا قیام ہے

تاروں کے آسماں پہ بچھے جال ہیں ترے — دامانِ کہکشاں میں ٹکے لعل ہیں ترے
سکے ستارگاں کے زر و مال ہیں ترے — سیارے کہتے ہیں جنہیں فٹ بال ہیں ترے

فطرت میں ہر طرف ترا ابھرا اجال ہے
برقِ تپاں کی گود میں تیرا جلال ہے

اخگر نے مجھ سے منہ جو چھپایا برا کیا — کمبخت میرے پاس نہ آیا برا کیا
رحم اپنی زندگی پہ نہ کھایا برا کیا — وقت اپنا شاعری میں گنوایا برا کیا

پھرتا خدائی خوار نہ یوں دربدر کبھی
چلتا صلاحِ نیک پہ میری اگر کبھی

امداد حسین اخگر مرادآبادی

(گیت)

(۱)

مت کر بھارت کو بدنام　پیارے بھارت کو بدنام
ہندو مسلم میں کیوں بیر
مانگ اِن دونوں کی تو خیر
اِن میں کوئی نہیں ہے غیر
دَیر ہے کعبہ۔ کعبہ دَیر
رام ہے رحماں۔ رحماں رام　مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۲)

مت کر بھارت کو بدنام　پیارے بھارت کو بدنام
بھائی بھائی میں تکرار
جس کو دیکھو وہ بیزار
لڑنے مرنے کو تیار
کوئی تانے ہے تلوار
کوئی کھینچے ہے صمصام　مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۳)

مت کر بھارت کو بدنام　پیارے بھارت کو بدنام
تو نے کیا سوچا ہے یار
ناحق مذہب کی پیکار
تجھ کو ہنستا ہے سنسار
تیرا جینا ہے بیکار
تیرا مرنا ہے ناکام　مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۴)

مت کر بھارت کو بدنام　پیارے بھارت کو بدنام
کوئی ایسی کر تدبیر
پلٹے داسوں کی تقدیر　غلاموں
ٹوٹے پاؤں کی زنجیر
کاہے کرتا ہے تاخیر
کچھ تو سوچ اپنا انجام۔　مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

(۵)

مت کر بھارت کو بدنام　پیارے بھارت کو بدنام
دل کا پورا ہو ارمان
جنت ہو پھر ہندوستان
پھر ہو اِس کی پہلی شان
پھر ہوں اِس پر سب قربان
سُن لے باسط کا پیغام　مت کر بھارت کو بدنام
پیارے بھارت کو بدنام

باسط بسوانی

انسانی فطرت اور خیر و شر

سیکش اکبرآبادی

بہ سلسلۂ کلیم ستمبر ۳۶ء

نوٹ (کسی فرصت کے وقت اس مضمون پر اظہار خیال کیا جائے گا ——— (مدیر)

اصل میں سوال یہ ہے کہ فطرت انسانی خیر ہے یا شر یا یوں کہئے کہ قدرت نے آیا اسے مادۂ خیر زیادہ دیا ہے یا مادۂ شر۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے "فطرت" یا "قدرت" پر نظر پڑنی چاہیئے اور اس کے بعد "خیر و شر" پر قدرت کا اعتقاد چونکہ قادر کے وجود کو چاہتا ہے اور اس لئے ایک علیحدہ بحث چاہتا ہے۔ لہٰذا نظر انداز کر دیجئے۔ اب فطرت کو دیکھئے، حالانکہ وہ بھی خاطر کی محتاج ہے، مگر خیر فلسفیانہ مباحث سے قطع نظر اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ فطرت ترکیب ہیولیٰ و صورت کا وہ ابتدائی خاکہ ہے جو اساس کا حکم رکھتا ہے، مجھے اس تعریف کی صحت پر اصرار نہیں ہے، کوئی اور تعریف کر لیجے، مگر یہ امر مسلم ہے کہ فطرت ایک حقیقی اور واقعی شے ہے۔

اب خیر و شر پر نظر ڈالئے تو اس بارے میں یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ:-

"خیر و شر کوئی حقیقی شے نہیں محض اضافی و اعتباری چیز ہے ...."

تو ایک اضافی و غیر حقیقی شے کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر تلاش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

واقعہ یہی ہے کہ فطرت حقیقت ہے اور حقیقت تمام تعینات سے بالا و برتر ہے نہ کہ خیر و شر کی سی چیزیں جن کا شمار اعراض میں بھی مشکل ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ

"اگر ہم "خیر و شر" کو اصطلاحی معنی میں نہ لیں اور اسے "نیکی بدی" "اچھائی برائی" "زشت و خوب" "معصیت معصومیت" اور "مقبولیت و مقہوریت" کے تمام تصورات سے قطعی طور پر معرا کر کے استعمال کریں تو پھر اس کا فطرت انسانی کے اندر تلاش کرنا ہرگز ایک بے معنی سی بات نہیں ہو سکتی"

اور پھر اس کی مزید تشریح اس طرح کی جائے کہ:-

"اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہم انسان کی قانون شکنی، دروغ بافی، امن سوزی اور خوں ریزی" وغیرہ کے واقعات کو "شر" کا خطاب دیں اور اس کی قانون پرستی، راستبازی، امن پروری، اور انسانی ہمدردی وغیرہ کو "خیر" کے لفظ سے پکاریں تو اس تعریف کی رو سے "خیر و شر" کا فطرت انسانی کے اندر تلاش کرنا بالکل درست اور قطعی جائز ہوگا ......"

لیکن ممکن ہے اس موقع پر کوئی سوال کرے کہ قانون پرستی وغیرہ کو خیر کے لفظ کے بجائے شر کے لفظ سے کیوں نہ پکارا جائے اور دروغ بافی اور امن سوزی وغیرہ کو خیر کا خطاب کیوں نہ دیا جائے۔ دیکھئے ارجن جس خونریزی کو شر سمجھتے تھے کرشن جی نے کس ناقابل تردید دلیل سے اس کو خیر ثابت کر دیا۔

کبھی آپ نے ہندو مسلمانوں کو گائے کی قربانی پر ایک دوسرے کو ذبح کرتے نہیں دیکھا؟ دونوں مذہب کے نام پر لڑتے ہیں۔ کبھی آپ نے کانگریس اور حکومت کی قانون اور آزادی کے نام پر رسّاکشی نہیں دیکھی؟ دونوں سیاست داں ہیں، اور دونوں مہذب۔ اب بتائیے قربانی اور قانون شکنی خیر ہے یا شر؟ گناہ ہے یا ثواب؟ فطرت نے یہ دو لزوم گناہ اور ثواب ایک سانس میں کیوں کر عطا کئے؟

وہ لیاقتیں مثلاً قوی مزور فطرت کا عطیہ مانے جاسکتے ہیں اور قویٰ پر خیر وشر کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی شخص بندوق سے کسی بے گناہ کو قتل کرے یا کسی مظلوم کی امداد اور حق کی تائید کرے تو بندوق بنانے والے کو پھانسی دی جائے گی نہ انعام۔

افعال علیحدہ چیز ہیں اور افعال پر خیر وشر کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر وہ بھی اضافی اور اعتباری جیسا کہ بیان کیا گیا۔ شاید کہا جائے کہ فعل کے لئے قوّت لازمی ہے تو لازمی ہونے سے قوّت وفعل ایک تو نہیں ہوسکتے۔

فرض کر لیجئے کہ قدرت کے اسٹور میں خیر وشر تو دو ہی صورت میں رکھی ہوئی تھی جو اُس نے مخلوقات کو تقسیم کردی، اس صورت میں پہلے انسان کو جو کچھ ملنا تھا مل چکا تو آج یہ مسئلہ کس طرح طے ہوسکتا ہے کہ اولین انسان مائل بہ خیر تھا یا بہ مائل بہ شر۔

آج باپ کی صورت وسیرت کا اندازہ کس طرح کیا جاسکتا ہے جب کہ ایک بیٹا کالا اور ایک گورا، ایک شیطان اور ایک ولی ہے۔ اب اگر کثرت و قلت سے کوئی نظریہ قایم کیا جائے تو وہ کیونکر درست ہوگا، کیونکہ حبشیوں کی قلت کے باوجود یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ انسانِ اول گورا ہی تھا، پھر یہ کہ اگر انسانِ اوّل کی فطرت غیر منقش اور سادہ مان لی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ

"انسان کی فطرت کے سادہ اور غیر منقش ہونے کے نظریے کو جہاں تک انسانِ اول کی پیدائش کا تعلق ہے کسی حد تک ضرور قابلِ لحاظ سمجھا جاسکتا ہے"

تو پھر حال کے انسان کی فطرت انسانِ اوّل کی فطرت کے خلاف کیوں ہوگئی کیا فطرت تبدیل ہوجاتی ہے؟

"کیوں کہ یہ کسی ذی حیات کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی فطرت یا متعلقاتِ فطرت سے لڑنے یا انحراف کرنے کا تصور بھی کرسکے"

چاندی سونا اور ہیرا بہ نسبت پتھر کنکر کے کم ہیں، پھول والے درخت گھاس پھونس سے کم ہیں۔ اور اچھے آدمی بہ نسبت بُرے آدمیوں کے کم ہیں، لیکن دیکھئے ان چیزوں کی اچھائی کم ہونے ہی کی وجہ سے تو نہیں ہے؟ شاید آپ ہر کم کو اچھا سمجھتے ہوں تو پھر فطرت پر کیا الزام ہے اگر وہ سونے کی مقدار میں پتھر اور پتھر کی مقدار میں سونا پیدا کرتی تو آپ پتھر کو اچھا سمجھتے اور سونا پتھر کی طرح ارزاں ہوتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجئے کہ کم کی قدر کرنا فطرت ہے، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ فطرت نے شر زیادہ دیا ہے اور خیر کم، کیونکہ اس کا کیا اطمینان ہے کہ اگر شر کم اور خیر زیادہ تو آپ کا نظریہ یہی ہوتا جو آج ہے۔

کیا فطرت کے اصول جنس، نوع، اور شخص کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں؟ اگر تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ فطرت کوئی اصول یا دائرہ نہیں ہے اور اگر تبدیل نہیں ہوتے تو اس قدر اختلافات افعال کے علاوہ قویٰ اور مزاج و ترکیب میں کیوں پائے جاتے ہیں؟ ماننا پڑے گا کہ فطرت کا دائرہ اور حدیں جو ہم نے قائم کی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اصولِ فطرت وہی ہوسکتے ہیں کہ جو ہر مادہ، جنس، نوع، صنف اور شخص، سب پر یکساں حاوی ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ خیر وشر کا سوال جوہر سے لے کر جنس تک پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ نوع اور وہ بھی مخصوص نوع انسان ہی میں ہوسکتا ہے لیکن فطرت نوع میں تو محدود نہیں ہے تو اب فطرت کی تقسیم اس طرح کیجئے کہ فطرتِ ممکن اور ہے فطرتِ جنسی اور ہے، فطرتِ نوعی اور ہے، فطرتِ شخصی اور ہے، اب سوال ہوسکتا ہے کہ یہ فطرتیں آپس میں کیا نسبت رکھتی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ فطرتِ جنس خیر وشر سے بلند ہو اور فطرتِ نوعی مائل بہ شر یا مائل بہ خیر؟ کیا فطرت محل کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے؟ کوئی بتا سکتا ہے کہ انسان کا کالا، گورا، زرد، سرخ، ہونا فطری ہے، اگر نہیں تو کوئی انسان ان رنگوں سے خالی کیوں نہیں ہے، اور اگر فطری ہے تو کیا فطرت اتنی مختلف ہے؟ کیا فطرت آب وہوا سے تبدیل ہوجاتی ہے؟ کیا فطرت بارش کے پانی سے دُھل جاتی۔

اب ایک اہم بالشان سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے مبلغانِ خیر کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ نہیں کیا؟ انھیں محبسوں میں نہیں ڈالا؟ ان کی پشت پر کوڑے نہیں مارے؟ انھیں کانٹوں کا تاج نہیں پہنایا؟ اُن کے سامنے زہر کا پیالہ نہیں پیش کیا؟ اور انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر نہیں رکھ دیا؟"

ہاں بے شک خم ٹھونکے گئے، محبسوں میں ڈالا گیا، اور وہ سب کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن کیا یہ سب کچھ خیر کے نام پر نہیں ہوا؟ آبائی مذہب، تہذیب حاضرہ، اور قانونِ رائج کی حفاظت و احترام کے نام پر نہیں ہوا؟ دیکھنا یہ ہے کہ ان مبلغانِ خیر کی مخالفت کسی چھوٹا بڑائی کی طرف سے ہوئی یا مہذب دنیا کی طرف سے؟ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کہ وہ مبلغانِ خیر تھے، آج صدیاں گزر جانے کے بعد کیا جا رہا ہے کیا اس وقت بھی اُن کے متعلق یہی رائے تھی؟ اور کیا معلوم ہے کہ چند صدیوں بعد فیصلہ کیا جائے کہ وہ بزرگ مبلغانِ خیر نہیں بلکہ مبلغانِ شر تھے۔ اور اس لئے اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا وہی مناسب تھا۔ پھر اس کے مقابلے میں دیکھئے کہ دنیا نے کبھی کسی چیز کو جو سمجھ کر قابلِ احترام نہ سمجھا، کیا اُن کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ نہیں کیا گیا، کیا ازل سے لے کر آج تک یہ محبسوں میں نہیں ڈالے جاتے۔ ان کو پھانسیاں نہیں دی جاتیں، کیا مبلغانِ خیر کی طرح صدیاں گزر جانے پر بھی اُن کا احترام کیا جاتا ہے۔

کیا یہ مسلّم ہو چکا ہے کہ انسان کے تمام اعمال و کردار مطابقِ فطرت ہیں؟ کیا انسان اسی طرح رنگ برنگ کے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا، بلند مکان تعمیر کرتا ہوا، مشینیں چلاتا ہوا پیدا ہوا ہے؟ کیا یہ سب فطرت ہی فطرت ہے؟

یہ تو معلوم نہیں کیوں مگر یہ ضرور ہے کہ انسان کی انفرادیت ہر لحظہ اجتماعیت کی طرف مائل ہے۔ پس جو چیزیں کہ اجتماعی نظام کو نقصان پہنچانے والی ہیں، انھیں سے مذہب، تہذیب، تمدن، قانون، روکتے ہیں، اور چونکہ محبت و تعاون کو فطرتِ انسانی سمجھا جاتا ہے، اس لئے یہ نقصان پہنچانے والی چیزیں خلافِ فطرت یعنی شر سمجھی جاتی ہیں۔

نفسیات و اخلاقیات کی رُو سے اچھی عادتوں اور اچھی چیزوں کی طرف رجحان اعتدالِ مزاج کا نتیجہ ہیں، اور بری عادتیں فسادِ مزاج کا۔ اچھی خوشبو کو ناپسند کرنا صحتِ شامہ کی علامت نہیں ہو سکتا۔ بیماری فطرت نہیں ہو سکتی!

کیا انسان کو اپنے مقابلے میں بھی شر اتنی ہی محبوب ہے جتنی دوسرے کے مقابلے میں کیا ایک قاتل اپنے قتل ہو جانے کا بھی اتنا ہی مشتاق ہے جتنا اپنے دشمن کے قتل کا؟ آخر یہ فرق کیوں ہے؟ اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ فطرت نہیں ہے؟ ظالم کو آزار پاکر تو وہ لذّت حاصل نہیں ہوتی جو آزار دیکر ہوتی ہے، تو کیا انسان اپنی فطرت سے اپنے مقابلے میں اتنا نفور ہے؟

بچوں کے انکار و کردار پر شر کا حکم آپ ہی تو لگا رہے ہیں، کسی بچے سے تو اندازہ کرائیے، کیا وہ بھی اس کو برا ہی سمجھتا ہے، پھر جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ زمانہ وہ ہے جس میں بچہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس عمر میں تعمیر کے ساتھ جو تخریب کا رجحان پایا جاتا ہے اس کو تلاشِ حقیقت اور رفعِ تعینات کا نام کیوں نہ دیجے۔ تصنّع و تکلف کے مقابلے میں جہاد و آزادی کیوں نہ سمجھئے۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں گا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک انسان کی فطرت کچھ اور ہو اور دوسرے کی اور، لہٰذا اگر فطرت خیر ہے تو سب کی اور شر ہے تو سب کی، اس لئے اگر ایک آدمی بھی مظہرِ خیر ثابت ہو جائے تو یا تو اس نے خلافِ فطرت عمل کیا اور یہ مذکورہ وجوہ کی بنا پر ناممکن ہے اور یا پھر خیر و شر کا فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میری رائے میں یہی صحیح ہے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "قدرت نے کچھ مادہ خیر کا اور کچھ شر کا رکھ دیا ہے"؛ کیونکہ محلِ واحد میں اجتماعِ نقیضین محال ہے۔ (غیر مستفاد و غیر ماخوذ)

دُولہا کی واپسی

"خیر مجھ ماں کو بھلا بیٹھا تو کچھ بیجا" نہیں — "تجھ دُلہن کو بھول بیٹھا، آئے یہ کیوں کر یقیں؟"

"لیکن اے بیٹی، مرا بیٹا سعادت مند ہے" — "سچ مُچ اپنے مرنے والے باپ کا فرزند ہے"

"بیٹی، اِن بجھتی ہوئی آنکھوں میں نُور آجائے گا" — "لال میرا، آج، یا کل تک ضرُور آجائے گا"

"دل مرا بیچین ہے اُس دلرُبا کے واسطے" — "جا ذرا تصویر تو لے آ، خُدا کے واسطے"

"ہاں یہی۔ کیوں سر جُھکاتی ہے؟ اِدھر آ تو سہی"

"اِس پہ میں قُربان، میرے دل کا ٹکڑا ہے یہی"

"بچپنا چہرے پہ ہے، بالوں میں ہلکے جال سے" — "چودھویں کا چاند شرماتا ہے میرے لال سے"

"مُنھ سے کہہ "آمین" یہ کیسا حیا کا جوش ہے؟" — "میں دُعائیں دے رہی ہوں، اور تو خاموش ہے"

"ہائیں یہ آواز؟ لاری! اور یہ کیا اے خُدا؟" — "لاش! یہ کیا، ہائے اے اللہ یہ کیا ہو گیا؟"

"کیا ہے یہ اماں؟ ہوا جاتا ہے کیوں دل پاش پاش؟"

"میرے بچے کا جنازہ، اور ترے دُولہا کی لاش!"

جوش ملیح آبادی

ناستک

شیو فرید آبادی

(ملیالم زبان سے ترجمہ کیا گیا)

غرور سے سر اونچا کرکے میں اعلان کرسکتا ہوں کہ میں ناستک ہوں، بیوقوف دُنیا میری ہنسی اُڑائے، خدا کا یقین کرنے والے غصّے سے دانت پیسیں۔ اُن کی ہنسی اور غصّے کی میں پروا نہیں کرتا۔ اور بزور اعلان کرتا ہوں کہ میں ناستک ہوں۔

ناستک کتنا خوبصورت لفظ ہے۔ اس میں بے خوفی، آزادی، صداقت اور علم کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی گونج میں بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور پہاڑ کا سا استقلال ہے، ناستک کتنا شیریں، کتنا پُرجوش لفظ ہے، ہاں میں کافر ہوں۔ میں تمہارے مذہبوں سے نفرت کرتا ہوں۔ ان مذاہب کے زندانوں میں انسانیت قید ہے، یہ کاہلی اور سستی کی آماجگاہیں ہیں۔ ان کی بنیادوں میں کروڑوں آدمیوں کے ڈھانچے مدفون ہیں۔ کروڑوں مظلوم اور بیکس انسانوں کے خون سے مذہب کے ان چمکتے ہوئے نقروں پر گلکاریاں کی گئی ہیں، کیا ان متوں نے کتنے ہی عیساؤں کو صلیب پر نہیں چڑھا دیا ہے؟ کتنے ہی بدھ اور شنکروں کو قتل کرنے پر نہیں تُل گئے؟ کیا انھوں نے شردھانندوں کا خون نہیں بہایا؟ ان کی وجہ سے کتنے دھرم یدھ ہوئے اور قتل و خونریزیاں ہوئیں، جن کے سامنے چنگیز خاں اور نادر شاہ کے قتل عام ماند پڑ گئے، ان سے آدمی کے دماغ کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ سچائی کا گلا گھونٹتے ہیں۔ اور روشن خیالی کو پھانسی پہ لٹکا دیتے ہیں۔ مذہب کے نام پر دُنیا میں جو قبیح افعال کئے گئے ہیں۔ اُن کی تعداد اس قدر ہے کہ دماغ اُن کے سمجھنے سے قاصر ہے مذہب اس دُنیا کے خوبصورت جسم پر شل کوڑھ کے ہے۔ چھل، کپٹ، دغا بازی، مردم آزاری، بزدلی اور قتل عام کا جو کچھ مفہوم ہے وہ ایک لفظ "مذہب" میں آجاتا ہے۔ اسی وجہ سے میں پکا ناستک ہوں۔

ہاں میں ناستک ہوں۔ مجھے تمہارے مندروں سے نفرت ہے۔ پرستش گاہیں مندر ہوں یا خانقاہیں۔ گرجا گھر ہوں یا وہار اور مٹھ، عیاشی، دھوکے بازی کے اڈے ہیں۔ جن میں جہالت، کند ذہنی اور کورانہ تقلید اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ آپ کسی پرستش گاہ میں تشریف لے جائیں۔ اور ان میں آپ خواہ کتنی ہی گھناؤنی باتیں ملاحظہ فرمائیں۔ تاہم یہ بہشت اور سورگ میں پہونچ جانے کے پاسپورٹ تصور کئے جاتے ہیں۔ ان پرستش گاہوں سے میں نفرت کرتا ہوں، مے خانوں کی میرے دل میں اس سے زیادہ عزت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کا نشہ ایک لمحے کا ہے، تھوڑی دیر بعد اُتر جاتا ہے، اور دماغ صاف ہو جاتا ہے، لیکن پرستش گاہوں کا نشہ تو سینکڑوں صدیوں تک نہیں اترتا۔ ان سے کہیں زیادہ تو میں مذبح خانوں کی عزت کرتا ہوں، وہاں کپٹ اور دغابازی کا راج نہیں، پرستش گاہوں میں جو کچھ ہوتا ہے اُس پر رنگین کذب کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ اسی لئے میں ناستک ہوں۔

میں ناستک ہوں ۔ میں اِن مذہبی پیشواؤں سے نفرت کرتا ہوں، یہ دھوکے باز اور مکّار ہیں۔ رشوت خواری اِن کا پیشہ ہے، اِن کی لانبی عبائیں بڑے بڑے لبادے اور عمامے ۔ زعفرانی لباس ، اور گھٹی ہوئی بھنوی ٹانٹ میں جو غلاظت بھری ہوئی ہے اس سے تمہاری رُوح لرز جائے گی، اِن لیڈروں میں کبھی نہ بجھنے والی تشنگی ہے .... خون کی ..... امارت کی .... عُہدے کی .... دولت کی .... عیش وعشرت کی.... مذہبیت ہے کیا ؟ انسانوں کی نیک افعالی ۔ دولت آزادی کو ہڑپ کرنے کا ایک ذریعہ ۔ اپنی بدافعالی کو چھپانے کے لئے ایک سیاہ نقاب، اُنچی کا بھروسہ کیا جا سکتا ہے ، مگر ایک مذہبی پیشوا کا نہیں ، سانپ کا یقین کیا جا سکتا ہے ، مگر دھرم کی آڑ میں شکار کرنے والے ان پروہتوں کا نہیں، ان سے ڈرنا چاہیئے ، سانپوں کا زہر ایک مستقل نشہ ہے جو سوسائٹی کی رگ رگ کو سُن کر دیتا ہے ۔ اے جہالت اور کورانہ تقلید کے پجاریو اور مجاورو، مجھے تم سے نفرت ہے .... اسی لئے میں ناستک ہوں۔

میں ناستک ہوں میں تمہارے خدا سے نفرت کرتا ہوں......

تم اس کا کچھ بھی نام رکھو ، یہ محض دھوکے کا سایہ ہے ، خیال کا پرتَو ہے ، اس کی چھایا میں مجاور اپنے مذہب کا بیوپار چلاتے ہیں ۔ ایشور کی آڑ میں وہ سوسائٹی کو دھوکا دیتے ہیں ۔ عیاشی کرتے ہیں ، سماج کا خون چُوستے ہیں ۔ تمہارا ایشور ظالموں اور بدکاروں کی جائے پناہ ہے ۔ جہالت کی مورتی ہے اور قتل وغارت کا دوسرا نام ہے ۔ بے رحمی اور سفلے پن کا آئینہ ہے ۔ اُس کو رحیم کہتے ہیں ۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ نگاہ کے سامنے کروڑوں آدمی تڑپ رہے ہیں ۔ جب ظالموں اور بدمعاشوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے ۔ جب قاتلوں کے محلات کے نیچے بھوکے غریب بیچارے اپنی زندگی کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں ۔ جب جاہل اور کمزور آدمیوں پر ظلم توڑے جا رہے ہیں اور بیکس غریب اور معصوم بچے بے رحمی کے رولر کے نیچے کچلے جا رہے ہیں...... پھر بھی یہ راگ گایا جاتا ہے کہ پرمیشر رحیم و قادرِ مطلق ہے ، شرم نہیں آتی ...... اس دنیا میں مصیبتوں اور ظلم وستم کو دیکھتے ہوئے آپ کو کہنے کی یہ کیسے ہمت ہو سکتی ہے کہ آپ پرمیشور کو کریم و رحیم کا نام دیں ۔ مجھے ایسے ایشور سے نفرت ہے ، میں اِس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ، اسی لئے میں ناستک ہوں ۔

میں ناستک ہوں ، میں اپنے افعال اور کوشش پر اعتمادِ کامل رکھتا ہوں ۔ اپنا خدا میں خود ہوں ۔ اپنے افعال کی جوابدہی مجھ پر ہے ، اُن پر کڑی نگاہ رکھنا میرا اپنا کام ہے ۔ عیوب ونقائص کو پیدا کرنے والا ، نظر نہ آنے والا خدا نہیں بلکہ میں خود ہوں ۔ میں انصاف کی تلوار سے ناانصافی کو قتل کردوں گا ۔ میرا ضمیر میرے دل کا حاکم ہے ۔ میں آپ کے پرمیشر پر یقین کرنے والوں کی طرح اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا [illegible] ہو سکے گا ۔ آپ اندھی تقلید [illegible] ہیں ، اُن کی اندھیری چھایا میں ہی آپ کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں ۔ مگر میری کوشش یہی ہے کہ میں اِن کورانہ تقلید والوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکوں ۔ آپ روشن خیالی کو ظلمت کے گڑھوں میں دفن کر دینا چاہتے ہیں ، کیونکہ اِس سے آپ کی قلعی کھُل جائیگی ، مگر میں اس چراغ کی روشنی کو ہر جھونپڑی اور ہر اُجڑے ہوئے گھر میں پہنچانا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہوں ۔ آپ نے انسانی رُوح کو فولادی پنجرے میں مقید کر رکھا ہے ۔ آپ کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ آزادی کا یہ پنچھی پنجرے کی تیلیاں توڑ کر آسمان پر نہ اُڑ جاوے ۔ میرے یہ ہاتھ اس آتما کو نجات دے کر ہی دم لیں گے ۔ آپ کمزور اور گرے ہوئے بھائی کی چھاتی پر پاؤں رکھکر کھڑا ہونا چاہتے ہیں ۔ میں اُسے ہاتھ کا سہارا دے کر اُٹھا لوں گا ۔ آپ مجھے پاکھنڈی ۔ چانڈال ۔ گمراہ ۔ پاپی کتنے ہی بُرے ناموں سے یاد کریں مگر میں ذرّہ بھر بھی اس کی پروا نہ کروں گا ۔ میں اِن گالیوں سے ڈرنے والا نہیں ۔ میں جادۂ مستقیم سے نہ ڈگمگاؤں گا ۔ آستک کا ڈھونگ مجھے ناپسند ہے ۔ مجھے اِس کی ضرورت نہیں ۔ آپ کی گالیوں سے بھی زیادہ کہیں زور شور سے میں گرج کر کہدوں گا کہ میں ناستک ہوں ۔

بُزدلو ہوشیار ہو جاؤ ، وقت آپہنچا ہے ، اب مکاری اور چھل کپٹ کی بنیادیں ہل جائیں گی ۔ جاہلیت کی ظلمت چھُٹ جائے گی ۔ اس قیامت خیز تمہید کا پہلا لفظ دُور سے سُنائی دے رہا ہے ، انقلاب اور تبدیلی کا منظر دکھائی دے رہا ہے ۔ ہزاروں اور لاکھوں برس کے ظلم کا بدلہ لینے کے لئے وہ عوام میں طاقت اور حوصلہ پیدا ہو رہا ہے ۔ ان ہڈی پسلی والے کمزور جسموں میں طوفان کا زور اور پہاڑوں کا استقلال جمع ہو رہا ہے ۔ جھونپڑے چھوڑ کر وہ باہر آ گئے ہیں ۔ اب تمہاری

سماج کا شکار

ترجمہ از ٹیگور

پورن ماشی کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ بچھوا ہوا کے نرم جھونکے آم کے بور کی مہک چاروں طرف پھیلا رہے تھے۔ باغ کے تالاب کے کنارے لیچی کے پرانے درخت کی گھنی شاخوں سے ایک بیدار کوئل کی ان تھک پکار ہمنتا کی کھلی ہوئی کھڑکی سے اُس کے سونے کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ہمنتا بھی بہار کا اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کے گھنگریالے بالوں میں سے ایک لٹ جدا کر کے اُس نے اپنی انگلی پر لپیٹی۔ اُس کی چوڑیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجایا یا چمیلی کے ہار کو اُس کے سر پر اُس وقت تک آراستہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خم شدہ انداز میں اُس کے ابروؤں کے درمیان لٹکنے لگا۔ وہ اسی طرح مصروف تھا جس طرح باہر بیتاب ہوا پھولوں میں حسن کا احساس پیدا کرنے کے لئے اُنھیں اِدھر اُدھر جھُلانے میں مشغول تھی۔

لیکن اُس کی بیوی کُسم کھڑکی کے قریب بستر کے کنارے بے حس و حرکت اور خالی الذہن بیٹھی ہوئی چاندنی سے معمور فضا کی گہرائیوں میں غرق تھی۔ اُس کے پتی کو اِس چھیڑ چھاڑ کا کچھ جواب نہ ملا۔

آخر کار ہمنتا نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور اُن کو بے صبری سے ذرا جھٹکا دیتے ہوئے کہا "کُسم! آخر تم ہو کہاں۔ تم تو اس قدر دور چلی گئی ہو کہ تمہیں اگر دوربین سے بھی دیکھا جائے تو صرف ایک باریک سا نقطہ نظر آئے گا۔ دیکھو تو کیسا جادو بھرا موسم ہے"۔

کُسم نے بے پروائی کے انداز میں اپنی آنکھیں آسمان سے ہٹا کر اپنے شوہر کے چہرے پر جما دیں: "مجھے ایک جادو آتا ہے" اُس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا "جو اس بہار کے موسم کو، اس چاندنی کو، اور اس تمام حسن و جمال کو دم بھر میں فنا کر دے"۔

"اگر یہ بات ہے تو بڑا اچھا ہو کہ تم اپنا جادو کام میں نہ لاؤ" ہمنتا نے جواب دیا "لیکن اگر تم کوئی ایسا بھی جادو جانتی ہو جس سے ہفتے میں تین چار اتوار آ جایا کریں یا یہ رات کل شام تک ختم نہ ہو، تو اس قسم کا جادو ضرور کرو"۔ یہ کہہ کر ہمنتا نے اُسے کھینچ کر اور قریب کر لیا۔

کُسم نے اُس کی آغوش سے بچتے ہوئے کہا "میں آج تم سے ایک ایسا راز کہوں گی جسے میں بستر مرگ ہی پر ظاہر کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اب میں اپنی سزا آسانی کے ساتھ برداشت کر سکوں گی"۔

ہمنتا چاہتا تھا کہ کچھ عاشقانہ شعر سنا کر اس ناقابل فہم کیفیت کو دور کرنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کے بوڑھے پتا ہری ہر مکرجی کے کھڑاؤں کی آواز سنائی دی جو نہایت غصے میں تیزی سے اُس کے کمرے کی طرف زینے کی راہ سے آ رہے تھے۔

"ہمنتا" ہری ہر کی سخت آواز سنائی دی۔ جب وہ بالکل دروازے

کے پاس آگئے " اپنی بیوی کو فوراً نکال دو۔"

ہمنتا نے پریشان ہو کر کسم کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار بالکل نہ تھے۔ لیکن اُس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے اس طرح چھپا لیا گویا وہ دنیا کی تمام ہستیوں سے خوفزدہ ہے۔

کوئل کی آواز اب بھی کھڑکی میں سے آ رہی تھی۔ لیکن اب کوئی سننے والا نہ تھا۔ دنیا کس قدر دلکش ہے۔ لیکن اُس کی دل کشی کتنی جلد ختم ہو جاتی ہے۔

ہمنتا جب اپنے باپ سے بات چیت کر کے لوٹا تو اُس نے کسم سے دریافت کیا۔

"کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں یہ سب سچ ہے" کسم نے جواب دیا۔

"تم نے ابتک مجھے کیوں نہیں بتایا"

"اکثر میں نے کوشش کی کہ تم سے کہہ دوں، مگر ہمت نہ پڑی۔ میں کیسی پاپی ہوں"

"اچھا تو اب مجھے سب کچھ بتا دو"

کسم نے ہمت اور استقلال کے ساتھ اپنے تمام واقعات بیان کر دئے۔ وہ لال بھبوکا انگارہ دل پر سوچ سمجھ کر دھیرے دھیرے چل رہی تھی، بغیر یہ ظاہر کئے ہوئے کہ آگ اُسے کہاں کہاں پر اور کس قدر جلا رہی ہے۔

ہمنتا نے اُس کی ساری داستان سنی۔ اور ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ اٹھا اور باہر چلا گیا۔

کسم نے خیال کیا کہ میرا شوہر جو اس وقت مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اب کبھی بھی میرا نہ ہوگا۔

اُسے ذرا بھی تعجب نہ تھا۔ گویا جو کچھ اس وقت ہوا وہ قدرتی طور پر اُن کی زندگی کے آئے دن کے واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ وہ اس وقت مجسم بے حسی کی تصویر تھی۔ دُنیا اُس کی نظر میں محبت کیا بلکہ تمام چیزوں سے خالی تھی۔

جب ہمنتا کی پرانی محبت بھری باتیں اُس کو یاد آئیں تو اُس کے ہونٹوں پر ایک باریک خشک سا تبسم کھیلنے لگا جس میں مسرت کی جھلک تک نہ تھی۔ یہ ایک ایسا تبسم تھا جو خود اُس کے دل پر ایک زخم چھوڑ گیا۔ جیسے ایک نشتر اُس کے احساس کو مجروح کرتا ہوا آر پار نکل گیا ہو۔

وہ تمام محبت جو اب تک وہ محسوس کرتی رہی کیسی لامحدود گہرائیوں کی حامل تھی۔ ایسی محبت کا سرمایہ کہیں ختم ہو سکتا تھا۔ ایسی محبت جس میں ذرا سی کمی بھی بے انتہا تکلیف کا باعث ہوتی تھی۔ ایسی محبت جس میں ہر اتصال نشاط افزا تھا۔ ایسی محبت جو لامحدود ہی نہیں بلکہ وقت کے اثر سے بھی آزاد تھی۔ یہ بات خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ دوسری آن میں یہ محبت ختم ہو جائے گی لیکن سچ پوچھو تو یہ تمام محبت ایک نہایت ہی نازک رشتے پر قائم تھی۔ سماج کے ظلم کے ایک ہی جھٹکے نے اُسے زمین پر لا گرایا۔ اور محبت کا یہ سارا جوش و خروش ایک مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گیا۔

"کیسی خوشنما رات ہے" تھوڑی دیر پہلے ہمنتا نے محبت بھری آواز میں کہا تھا۔ اب بھی وہی رات تھی۔ کوئل اسی طرح کوک رہی تھی۔ پچھوا ہوا اب تک مچھر دانی کی شکنوں میں لہریں پیدا کر رہی تھی۔ چاند کی روشنی ایک محبت کی ماری ہوئی حسین عورت کی طرح اُن کے بستر کے کنارے پر پڑ رہی تھی، مگر اب یہ سب فریب نظر تھا۔

کسم سوچنے لگی کہ کیا محبت اپنے الفاظ اور عمل میں مجھ سے بھی زیادہ جھوٹی ہے۔

دوسرے روز صبح رات بھر کا جاگا ہوا ہمنتا بڈھے گھوسل کے مکان پر پہنچا۔ وحشت اُس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ بال پریشان تھے۔

"کہو کیا خبر ہے" گھوسل نے بڑی گرمجوشی سے پوچھا۔

ہمنتا کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ سارا جسم کانپنے لگا۔ اُس کی زبان سے بے اختیاری طور پر یہی نکل سکا: "تم نے ہماری ذات ستیاناس کر دی ——— ہمارا گھر مٹی میں ملا دیا ——— تمہیں اُس کی سزا بھگتنا پڑیگی ——— "جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

گھوسل مسکرایا ——— "اور تم لوگوں نے میری ذات کو بربادی سے بچا لیا!۔ تم لوگوں نے مجھے سوسائٹی میں رہنے دیا! تم لوگ تو میرے خاندان کے مربی بنے رہے! اور میرے ساتھ بڑی محبت اور توجہ سے پیش آتے رہے!

اگر ہمنتا کا غصہ اتنا ہی با اثر ہوتا جتنا پرانے زمانے کے برہمنوں کی بد دعائیں تو گوسل اسی وقت جل کر بھسم ہو جاتا۔ لیکن معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ہمنتا کے غصے کی آگ خود اسی کو جلائے ڈال رہی تھی، اور وہ بڈھا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

ہمنتا نے ہکلاتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا: "آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

"یہ سوال تو مجھے کرنے دو" گوسل نے کہا — "میری لڑکی — اکلوتی لڑکی — تمہاری چچی جو میرے لئے سب کچھ تھی، اُس غریب نے تمہارے باپ کا کیا بگاڑا تھا، تم اس بات کو نہیں جانتے۔ اچھا میرے بچے ذرا بیٹھ جاؤ اور میں جب تک کہتا رہوں خاموشی اور سکون کے ساتھ سنتے رہو۔ داستان بڑی ہے لیکن ہے دلچسپ۔

"میرا داماد جب اپنی بیوی کے ذریعے کر انگلستان بھاگ گیا اُس زمانے میں تم بچے تھے۔ شاید تم کو کچھ یاد ہو کہ جب وہ پانچ سال بعد انگلستان سے بیرسٹر بن کر لوٹا تو ہمارے گاؤں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ نہیں، تم کیا جانو۔ تم اُس زمانے میں کلکتے کے کسی اسکول میں تھے۔ ہاں تو تمہارے تایا جی نے ہماری ذات کے تمام لوگوں کو جمع کیا۔ سب سے پیش پیش وہی تھے۔ اُنھوں نے فیصلہ سنایا کہ اگر تم اپنی لڑکی کو اُس کے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دیتے ہو تو پھر تم کو اپنی لڑکی سے کوئی واسطہ نہ رہے گا۔

"میں نے کیسی کیسی منت کی کہ اس دفعہ معاف کر دو۔ میں نے ذلت گوارا کرکے داماد کی خوشامد کی کہ برادری میں دوبارہ لئے جانے کے لئے جو بھی کفارہ اس پر عاید کیا جائے وہ قبول کرے۔ لیکن تمہارے تایا جی نہ پسیجے۔ اور مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں اپنی پیاری لڑکی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں۔ بس میں نے ذات والوں کو خیرباد کہا اور کلکتے میں آ بسا۔

لیکن یہاں بھی سماجی بندھنوں سے چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ میرے بھتیجے کی ایک جگہ منگنی ہو گئی تھی۔ شادی ہونے ہی والی تھی کہ تمہارے پتا۔ دولہن والوں کے گھر پہنچ گئے۔ اور اُن کو بھڑکا کر یہ رشتہ ختم کرا دیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ اگر برہمن کی اولاد ہوں تو بدلہ لے کر چھوڑوں گا

"اب تم واقعات سے کچھ کچھ آگاہ ہوتے جاتے ہو۔ ٹھیرو۔ اس داستان کا بقیہ حصہ اور بھی دلچسپ ہے۔

"جب تم کالج میں داخل ہوئے تو بائیپر داس مرحوم جسے ہم لوگ چچا کہتے تھے۔ تمہارے مکان سے ملحق دوسرے گھر میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے ایک کائستھ لڑکی کو پناہ دے رکھی تھی۔ جو بچپن ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ بائیپر داس کو اُسے کالج کے لڑکوں کی نظروں سے بچانے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔

لیکن ایک جوان لڑکی کے لئے ایک بڈھے کو دھوکا دینا کچھ مشکل نہیں۔ اُسے اکثر کپڑے سکھانے کے لئے اور بہت سارے کاموں کی وجہ سے چھت پر جانا پڑتا تھا۔ دوسری طرف تم بھی اپنی برابر والی چھت پر پڑھنے کی غرض سے پہنچتے تھے۔ کیونکہ وہی ایک جگہ تھی جہاں تم اطمینان اور سکون سے پڑھ سکتے تھے۔

"اُن چھتوں پر تم دونوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں، اُن سے صرف تمہیں واقف ہو۔ لیکن لڑکی کی روز بروز گرتی ہوئی حالت نے بائیپر داس کو شک میں ڈال دیا۔ خانگی فرائض سے وہ حیرت انگیز طور پر بے پرواہ رہنے لگی۔ اُس کی بھوک مر گئی۔ اُس کی صحت کی رعنائی ختم ہو گئی۔ ایک دن شام کو بائیپر داس نے اُسے بے وجہ روتے ہوئے پایا۔ آخر کار اُنھیں تم دونوں کے تعلقات کا پتہ چل ہی گیا۔ اُنھوں نے چھپ کر تم لوگوں کی باتیں سنیں۔ اُنھیں معلوم ہو گیا کہ تم تنہائی میں پڑھنے کے عادی ہو گئے ہو۔ کالج کا ناغہ کرتے ہو صرف اس لئے کہ اکیلے کتابیں لے کر اُس زینے پر جو چھت پر نکلتا تھا بیٹھے رہو۔

"جب بائیپر داس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہئے تو وہ مجھ سے مشورہ کرنے آئے۔ میں نے کہا، دیکھو چچا! تم بہت دنوں سے چاہتے ہو کہ اس جگہ کو خیرباد کہہ کر بنارس میں قیام کرو۔ اب بہتر ہے کہ تم بنارس چلے جاؤ۔ میں لڑکی کی حفاظت کر لوں گا۔ اُنھوں نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا، اور بنارس کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں نے کُسم کو اپنے ایک گھرے دوست سری پتی چٹرجی کے یہاں مقیم کرا دیا۔ اور اُن پر یہ اچھی طرح واضح کر دیا کہ تمہیں اسے اپنی ہی لڑکی سمجھنا پڑے گا۔

"جو کچھ اس کا انجام ہوا تم مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ پھر بھی اُن پرانے واقعات کو دُہرانے میں مزا آتا ہے۔ کیونکہ سُننے میں یہ ایک رومان سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسے پڑھے تو بھی اس میں رومان ہی نظر آئے گا۔ ہاں میں لکھ نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ میرا میدان نہیں۔ میرا بھتیجا البتہ اس طرف مائل ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ذرا اس واقعے پر اپنا زورِ قلم صرف کرے۔ لیکن ہم اور تم دونوں مل کر اس قصّے کو اور بھی اچھی طرح لکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ابھی ہمیں اس کے انجام کا پتا نہیں:"

ہمنتا نے گھوسل کے آخری الفاظ نہیں سُنے: "کیا کُسم نے ایسی شادی کی مخالفت نہیں کی؟" اپنے خیالات کی رَو میں اُس نے پُوچھا۔

"یہ آسان سوال نہیں" گھوسل نے جواب دیا: "تمھیں تو اب خود عورت کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ عورتیں کیا ہوتی ہیں۔ جب وہ "نہیں" کہتی ہیں تو اُن کی مُراد "ہاں" ہوتی ہے۔ جب کُسم اپنے نئے مکان میں پہنچی اور تم سے نہ مل سکی تو اُس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ تھوڑے دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ تم اُس کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اب تم کالج کا راستہ بھولنے لگے اور سری پتی کے مکان کے سامنے کتابیں ہاتھ میں لئے ہوئے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے، گویا کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈھ رہے ہو۔ میں اس نتیجے پر کیونکر پہنچ سکتا تھا کہ تم اپنے کالج کا راستہ تلاش کر رہے ہو۔ کیونکہ ایک گھر میں رہنے والی بیوہ کی لڑکی صرف پَر والے کیڑوں اور محبت کے بیمار دلوں کے لئے ہی وقف ہوتی ہے۔ بہر صُورت مجھے لڑکی کی پریشانیوں اور تمہاری تعلیم کے دوران میں اس قسم کی مداخلتوں پر بڑا افسوس ہوتا تھا۔

"ایک دن میں کُسم کے پاس گیا اور اُسے ایک طرف لے جا کر کہا "بیٹی! تم اپنے بوڑھے چچا سے کسی قسم کا تکلف نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیوں گُھل رہی ہو۔ اُس نوجوان کی حالت بھی اچھی نہیں۔ میں تم دونوں کو ملا کر بڑی مسرت محسوس کروں گا۔ جواب میں کسم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور کمرے سے بھاگ گئی۔ میں بار بار اُس سے ملتا رہا اور تمہارے متعلق باتیں کرتا رہا، یہاں تک کہ اُس کی شرم دُور ہو گئی۔ آخر کار میں اُس کے دل پر یہ بات بٹھانے میں کامیاب ہو گیا، کہ شادی ہی اُس کی پریشانیوں کا واحد علاج ہے۔ لیکن وہ اپنے خیال پر قائم تھی کہ یہ ممکن نہیں!

"جب میں اور کُسم اس مسئلے کے موافق اور مخالف پہلوؤں پر بحث کر چکے تو کُسم نے کہا کہ اس بارے میں ہمنتا کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ بیچارہ تو قریب قریب پاگل ہو گیا ہے۔ میں اُسے خواہ مخواہ ان اُلجھنوں میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ جہاں شادی ہو گئی، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ حقیقت سے کوئی اور واقف نہیں اور نہ کسی کو معلوم ہی ہو سکتا ہے۔ پھر کیوں اُس کی زندگی کی تمام مسرتوں کو خطرے میں ڈالا جائے۔ خدا جانے کُسم سمجھی یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا، اُس پر ایک اشک آمیز خاموشی طاری تھی۔ آخر کار میں بولا تو پھر شادی ہو جانی چاہیئے۔ اس پر وہ بے اختیار رونے لگی۔

"یہاں تک معاملات پہنچ چکے تھے، جب میں نے سری پتی کو تمہارے والد کے پاس شادی کا پیغام دینے کے لئے بھیجا۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اپنی رضامندی دینے میں وقت نہ گنوایا۔ ان حالات کے تحت یہ صورت تمہاری شادی طے پا گئی۔

"اُس فیصلے کے دن سے کچھ روز پہلے کُسم کے خیالات میں پھر تبدیلی ہوئی۔ وہ بڑی لجاجت سے بولی، چچا! میں منت کرتی ہوں اس شادی کو رکوا دیجئے۔ بیوقوف کہیں کی۔ میں چلایا۔ تمام باتیں طے ہو جانے کے بعد اب میں اُن لوگوں سے جا کر کیا کہوں گا۔ اُس نے جواب دیا، مجھے کہیں اور بھیج دیجئے۔ اور اُن سے کہہ دیجئے کہ میں مر گئی۔ اور اُس نوجوان کا کیا حشر ہو گا۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ایسے موقع پر جب اُس کے خوابوں کی تعبیر کے صحیح ہونے کی امید ہو، اور وہ مسرت کے ساتویں آسمان پر ہو، میں اُس سے جا کر کہوں کہ کُسم مر گئی، اور پھر اُس کے بعد میں تمہیں اُس کی موت کی اطلاع دوں، جس کے جواب میں تمہارے مرنے کی خبر آئے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اس بڑھاپے میں میں ایک برہمن اور ایک عورت کا قاتل بنوں؟" ایک مبارک دن اور اچھی ساعت میں تمہاری شادی کی تمام رسمیں ادا ہو گئیں اور آخر کار بخیر و خوبی میری قسم پوری ہو گئی۔"

ہمنتا نے مغموم آواز میں کہا "یہ سب کچھ کرنے کے بعد تم نے اس راز کو

ظاہر کرنے میں کیا مصلحت سمجھی؟"

"جب مجھے کل معلوم ہوا کہ تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے تو میرے ضمیر نے پھر چٹکیاں لینا شروع کیں۔ فرائض سے مجبور ہو کر برہمن کی ایک ذات کو میں خراب کر چکا تھا۔ اب میں ایک معصوم برہمن کی ذات کو داغدار ہونے سے کیوں نہ بچاتا۔ یہ بھی میرا فرض تھا۔ بس میں نے لڑکے والوں کو لکھ دیا کہ ہمنتا مکرجی کی بیوی ایک "شودر" کی لڑکی ہے، اور میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔"

ہمنتا نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی ایک زبردست کوشش کی۔ رُک رُک کر اُس نے کہنا شروع کیا "اب اُس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ کیا تم اُسے اپنے یہاں رکھ لوگے؟"

"میں نے اُتنا ہی کیا جتنا میرے فرض کا تقاضا تھا۔ یہ میرا کام نہیں کہ دوسروں کی نکالی ہوئی بیویوں کو پناہ دیتا پھروں۔" یہاں گھوسل نے زور سے اپنے نوکر کو آواز دی: "ہمنتا بابو کے لئے ایک گلاس برف کا پانی، جلد"

لیکن ہمنتا اس سرد مہری کی مہمان نوازی دیکھنے کے لئے نہ ٹھیرا۔

چاند کی چودھویں رات کے بعد یہ پانچویں رات تھی۔ کوئل کی کوک کہیں نہ سنائی دیتی تھی۔ تالاب کے کنارے لیچی کا پیڑ ایسا نظر آتا تھا جیسے ایک سیاہ پردے پر روشنائی کا دھبہ۔ پچھوا ہوا چل رہی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندھوں کی طرح آسیب زدہ آوارہ پھر رہی ہے۔ اور تارے نظریں جمائے اس طرح دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ اس تاریکی میں کسی راز کا پتا چلا رہے ہیں۔

ہمنتا کی خوابگاہ میں اندھیرا تھا۔ وہ بستر کے کنارے کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا فضا کی تاریکی کو دیکھ رہا تھا۔ فرش پر اُس کے قدموں پر اس کی بیوی پڑی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت ٹھیر گیا ہے جس طرح ممکن ایک تصویر کو دیکھنے کے لئے یکایک خاموش ہو گیا ہو جو مصور یعنی قضا و قدر نے ابدی رات کے پردے پر کھینچی ہے ——— جذبات کی کشمکش میں گڑی ہوئی دو خاموش صورتیں ——— ایک منصف ——— ایک دادخواہ۔

کچھ دیر بعد کھڑاؤں کی آواز سنائی دی۔ ہری ہر کی کرخت آواز دروازے کے باہر سے آئی "تم اس صورت کو کب تک نکالو گے۔ میں ایسی آوارہ گرد کو اب اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔"

ہری ہر کی آواز سنتے ہی کُسم بے اختیاری طور پر اک آخری بار ہمنتا کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ہری ہر کے آخری الفاظ کے ساتھ ہی اُس نے بطور رخصتی سلام ہمنتا کے پیر کی خاک اُٹھالی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اُن قدموں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔

ہمنتا نے چلا کر اپنے باپ سے کہا "میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو کیا تم ہم لوگوں کو برادری سے الگ کراؤ گے؟" ہری ہر نے گرج کر کہا۔

"میں ذات پات کو نہیں مانتا" ہمنتا نے جواب دیا، "تو تم دونوں نکل جاؤ"

مترجم۔ معین احسن جذبی

پیمانۂ جشن [illegible] سے کچھ بھی پتہ نہیں

موعودۂ روزِ جزا سے کچھ بھی پتہ نہیں

اللہ تو ہے [illegible]

اللہ تو رحمت کے سوا سے کچھ بھی پتہ نہیں

جوش

نکات

ہے کون سی جا، جہاں نہیں ہے　　وہ جانِ جہاں کہاں نہیں ہے

لیکن ضد ہے یہ عاشقوں سے　　جس جا کہئے : ہاں نہیں ہے

یکساں ہے شہود و غیب، یعنی　　ہے، اور کوئی نشاں نہیں ہے

وہ جلوہ فروزِ بزمِ امکاں　　اتنا ہے عیاں، عیاں نہیں ہے

کوئی ہمتا نہیں ہے تیرا　　تجھ پر بھی ترا گماں نہیں ہے

ادراک سے بیتری ذات بالا　　گنجائشِ این و آں نہیں ہے

آتا ہے براہِ راست دل میں　　جس راز کا رازداں نہیں ہے

دشمن کو اماں دے فتح پا کے　　وہ سطوت بیکراں نہیں ہے

جو دل میں وہی زبان پر ہو　　وہ دل نہیں، وہ زباں نہیں ہے

اک روز حیا تھی اپنا ایماں　　مدّت سے وہ درمیاں نہیں ہے

وہ ولولۂ نیاز مندی　　وہ عشرتِ امتحاں نہیں ہے

شیوہ نہ رہا جو حق پسندی　　حق اپنا پاسباں نہیں ہے

جس کا جوہر نہ ہو محبّت　　انساں نہیں ہے ہاں نہیں ہے

~~~~~~~~~~

اب ہم نہیں درخورِ کرامت　　اب ہم پہ وہ مہرباں نہیں ہے

اپنے اعمال کی ہے شامت　　محنت کب رائگاں نہیں ہے

جو راہِ طلب میں سر بکف ہو　　وہ جذبۂ خوں چکاں نہیں ہے

جنگاہ و صلوٰۃ صف بصف ہو　　وہ دبدبۂ حکمراں نہیں ہے

ایسی ویسی بہت بنائیں　　دل سے بہتر مکاں نہیں ہے

اک سلکِ گہر کہ ضو فشاں تھی　　اشکوں کا وہ اب سماں نہیں ہے

سہرے پڑے تھے بجلیوں کے　　اب وہ طرزِ فغاں نہیں ہے

سن لے کوئی جسے کلیجا تھامے　　وہ حالِ بلاکشاں نہیں ہے

کیوں داغ کہوں، دئے ہیں غم نے　　وہ پھول جنھیں خزاں نہیں ہے

(آثر لکھنوی)
~~~~~~~~~~

اقوالِ حکیمانہ

ڈاکٹر غلام سرور ایم اے۔ پی ایچ ڈی

(۱) تنہا وہ قوت جو انسان کو عدل و انصاف، مہارت، اور علو طبع کیساتھ وظائفِ انسانی کے سرانجام دینے میں پُر متعدد کرتی ہے۔ تربیت ہے، جسے میں تربیتِ کاملہ کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ "ملٹن"

(۲) مشغولیتوں، خوش گذرانیوں اور ہوا و ہوس کے دوران میں وہ چیز جس کی فکر کسی کو نہیں ہوتی اور جو ہمیشہ آماجِ غفلت و تحقیر ہوتی ہے، لیکن جیسے ہی کہ اس نے روگردانی کی اس کی قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ جانتے ہو وہ کیا چیز ہے؟ تندرستی۔ (فریڈرک اعظم)

(۳) ابتدا میں کسی مملکت پر قبضہ کرنے کے لئے جو قدم [illegible] یا جاتا ہے، اس کی بنیاد بہانہ تلاش کرنے اور اُس مملکت میں داخل ہونے پر ہے۔ مشکل ترین کام یہی ہے، بقیہ کام تو اسلحۂ و قانون کی قوت سے بآسانی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ (فریڈرک اعظم)

(۴) حقیقت کے بغیر میں کسی چیز کی جستجو نہیں کرتا۔ ہر جگہ میں حقیقت ہی سے دوچار ہوتا ہوں اور اُس کو مفترض الطاعت خیال کرتا ہوں۔ (فریڈرک اعظم)

(۵) انسان جملہ اشیا کا واحد قیاسی ہے۔ پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کی پیمائش کے لئے اپنے قدموں کو پیمانہ بناتا ہے اور علوم ریاضی میں اپنی انگلیوں کے اعداد کو مقیاس قرار دیتا ہے۔ اس قدر ہمت و دور رسی کا مالک ہونے کے باوجود وہ کیا ہی عاجز مخلوق ہے۔ لیکن باوجود اس عجز کے مدارج ترقی پر صعود کرنے کے لئے کتنی عجیب استعداد رکھتا ہے۔

(۶) فلسفہ کو دوست رکھنا ایک حقیقت ہے نہ کہ ایک محبت جو علم کی ایک نوع یا ایک مسلک سے کی جاتی ہے۔ (بیکن)

(۷) فلسفہ اگر تجربہ سے اپنے تعلق کا انکار کرے اور چاہے کہ وہ تنہا دنیا کی توسیعِ معلومات اور ایجادِ قوانین کی خدمت سرانجام دے گا تو اس کا یہ دعویٰ مضحکہ خیز ہوگا۔ "شیلر"

(۸) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حقیقت ہی ہمارے جملہ مسموعات و مشہودات سے افضل ہے۔ (ووڈ)

(۹) جہالت و غلامی انسان کی حقیقی دشمن ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے شومیٔ قسمت و بدیٔ بخت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ خوش قسمتی و نیک بختی کا وسیلہ علم، آزادی اور محاکمۂ عقلیہ ہیں، جو انسان کو اخلاقِ فاسدہ و عاداتِ رذیلہ سے نجات دیتے ہیں۔ افکارِ باطلہ کے معالجہ اور آفتابِ حقیقت کے طلوع کا امکان انہی چیزوں سے ہے۔

(۱۰) میں جانتا ہوں کہ حقیقت رنج و زحمت کا باعث ہوتی ہے، اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ دقتِ نظر کا نتیجہ موت ہو، لیکن مجھے اس بات کی قطعاً پروا نہیں۔ اے چشمہائے حقیقت بین! ہمیشہ دیکھنے میں مشغول رہو (کوریلا)

(۱۱) آثارِ فکریہ کی موجد تنہا فکرِ انسانی نہیں ہے، بلکہ انسان کے تمام روحی و فطرتی قوا و افعال یعنی فطرت، تربیت، طرزِ زندگی، اطوارِ نفسیہ و کردارِ حسنہ اور عاداتِ رذیلہ و رفتارِ قبیحہ وغیرہ بحیثیت مجموعی ان آثار کے پیدا کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ اور انسان جو کچھ سوچتا اور لکھتا ہے اس میں یہ قوا و افعال اپنے مخصوص اثرات بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔

(۱۲) کاہلی و بیکاری ہمّتِ بلند و عزمِ صمیم کے جذبات کو فنا کر دیتی ہے، وہ اشخاص جن کا وظیفۂ حیات سعی و عمل ہے، اس بات کے مستحق ہیں کہ دوسرے اُنھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں۔

(۱۳) دنیا کی بہترین نعمت تندرستی ہے، اس کے بعد حسن و جمال، پھر وہ دولت جو شرافت و نیک نامی سے حاصل ہوئی ہو اور اُس کے بعد عہدِ جوانی کے لذائذ کا حصول، لیکن یہ چیز فقط رفقائے حقیقی کے کامل اشتراک سے حاصل ہوتی ہے۔

(۱۴) ہم سب کوتاہیٔ عمر و ناپائداریٔ روزگار کے شاکی ہیں، حالانکہ اپنے تصور و خیال سے کہیں زیادہ وقت کے مالک ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ بلکہ ہماری تمام زندگی ایسے امور میں صرف ہو جاتی ہے جو ہمارے فرائضِ حقیقی سے خارج ہیں۔

(۱۵) ہماری دانائی و فراست اور ہمارے تصوّرات و خیالات حصولِ نتیجہ کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ بلکہ سب اہمیت ہمارے کردار میں ہے۔

(۱۶) اکثر اشخاص بغیر اس بات کے کہ کسی خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھیں، زندگی گزار دیتے ہیں۔ اُن کی مثال اُس پرِ کاہ کی سی ہے جو سطحِ آب پر بہتا ہوا چلا جاتا ہے اور اپنی عمر کو انجام تک پہنچا دیتا ہے، وہ اشخاص خود حرکت نہیں کرتے بلکہ سیلِ عمر اُن کو اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہے، اور منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

آرٹ

آسکر وائلڈ — ترجمہ مظہر علی شاہ

آرٹسٹ خوبصورت چیزوں کا خالق ہے

آرٹ کا افشا، اور اپنی ذات کا اخفا آرٹسٹ کا مقصد ہوتا ہے۔

ناقد وہ ہے جو خوبصورت احساسات کو دوسری وضع میں ترجمہ کر سکے، یا اُسے جدید رنگ میں اُبھار سکے۔ نقادی کا اعلیٰ یا ادنیٰ معیار ایک طرح کی روشِ سوانحِ حیات ہوتی ہے ——— جو لوگ بھیانک اور بدصورت چیزوں میں خوبصورتی تلاش کرتے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں جو مسخ ہو چکے ہوں، اُن میں تسخیر نہیں۔

جو لوگ خوبصورتی میں خوبصورتی ہی تلاش کرتے ہیں، وہ بلند ہیں، اُن کے لئے اُمید ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں، جنھیں احساسِ حسن ہے۔

اُنیسویں صدی میں حقیقت سے نفرت وحشی کا غصہ ہے۔ جب وہ اپنا عکس آئینہ میں دیکھتا ہے۔

اُنیسویں صدی میں رومانیت سے نفرت وحشی کا غصہ ہے۔ جب وہ اپنا عکس آئینہ میں نہیں پاتا۔

انسان کی اخلاقی زندگی آرٹسٹ کا موضوعِ کار ہوتا ہے۔ مگر آرٹ کا اخلاق ناکمل ذریعہ کو مکمل طور پر استعمال کرنے پر منحصر ہے۔ کوئی آرٹسٹ کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ جو باتیں مسلّمہ ہیں وہ بھی ثابت کی جا سکتی ہیں۔

آرٹسٹ کے پاس اخلاقی ہمدردی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی رسمِ وضعداری ہے۔ کوئی آرٹسٹ معذور یا مجبور نہیں ہوتا۔ وہ ہر چیز کا اظہار کر سکتا ہے۔

خیال اور زبان آرٹسٹ کے اوزار ہیں جن سے وہ کام کرتا ہے۔

گناہ، ثواب اور نیکی و بدی اشیا ہیں جن پر وہ کام کرتا ہے شکل کے زاویۂ نگاہ سے ہر آرٹ شکلِ نغمہ ہے، احساس کے زاویۂ نگاہ سے ہر فن اداکار کا مرہون ہے۔

سب آرٹ سطحی بھی ہیں اور عمیق بھی۔

جو لوگ سطح سے نیچے جاتے ہیں وہ خطرے میں ہیں۔

جو لوگ سطح پر ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ خطرناک ہیں۔

صرف تماشائی کا چہرہ آئینہ میں نظر آتا ہے۔ زندگی کا نہیں۔

کسی موضوع پر مختلف الرائے ہونا ظاہر کرتا ہے کہ جدّت ہے۔ جب نقاد آپس میں یک زبان نہ ہوں تو آرٹسٹ اپنے آپ سے متفق ہوتا ہے۔

کوئی شخص بھی جو مفید چیز پیش کرے اور اُس کی تعریف نہ کرے معاف کیا جا سکتا ہے۔

مگر بیکار چیز بنانے والے کے لئے اور موضوع کے لئے کہ اُس کی تعریف بہت ہوتی ہے، یہی بات اُن کے لئے پیغامِ مرگ ہے۔

سب آرٹ بیکار ہیں۔

منظوماتِ برق

مشاہدہ شاہد ہے کہ ایک شاعر خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبت اور کہنہ مشق کیوں نہ ہو ہر صنفِ سخن پر قادر نہیں ہو سکتا۔ بالعموم اُسے محض کسی ایک صنف میں کامل دسترس ہوتی ہے۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دیگر اصناف کی جانب سے یک قلم بے بہرہ ہوتا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اُس کا مذاقِ ادبی ایک خاص رنگ اختیار کر لیتا ہے جو اس کا اور محض اُس کا حصّہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

مندرجہ بالا دعوے کے ثبوت میں اُستاد مرحوم کی "منظریہ شاعری" کے کچھ اقتباسات ہدیۂ ناظرین کروں گا۔ یوں تو آپ کا مجموعۂ نظم دیوان "مطلع انوار" مختلف جذبات و تاثرات کے بہترین نمونے پیش کرتا ہے، لیکن وہ حصۂ کلام جس پر مرحوم کو ناز تھا اور بجا طور پر ناز تھا اور جس سے ادبِ اُردو میں آپ کو ایک مستقل جگہ اور دوامی شہرت حاصل ہوئی وہ بیشتر آپ کی منظریہ شاعری پر مشتمل ہے۔ "ستارۂ صبح" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

ضیا فروش سرِ چرخ ہے ستارۂ صبح — نشانِ محفلِ انجم ہے ماہ پارۂ صبح
اِسے نصیب کہاں فرصتِ نظارۂ صبح — فسردہ ہونے کو چمکا ہے یہ شرارۂ صبح

ملی ہے ہستیٔ بے بود نیست ہونے کو
کہ آنکھ کھولی ہے خوابِ عدم میں کھونے کو

مختلف مصرعوں کی ترتیب اور باہمی ربط و تناسب پر ایک نگاہِ غور ڈالیے اور دیکھیے فصاحت و بلاغت دونوں کس طرح ایک دوسرے سے ہم دوش ہیں۔

تشبیہِ چند ... سکینہ طالب دہلوی

"ستارۂ صبح" کو "نشانِ محفلِ انجم" کہنا کس قدر موزوں اور بدیع تشبیہات میں سے ہے۔ اسی طرح

اِسے نصیب کہاں فرصتِ نظارۂ صبح

کہہ کر آپ نے ایک صریح حقیقت کی خوب وضاحت کی ہے۔

فسردہ ہونے کو چمکا ہے یہ شرارۂ صبح

یہ بیان بھی کس درجہ پُر اثر ہے، "ستارۂ صبح" کو بیک ساعت حیات و موت عطا ہوئی ہے، اِدھر نمودار ہوا کہ صبح کی روشنی کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ماند پڑنا شروع ہوا اور آخر کار نابود ہو گیا۔

شبِ گزشتہ کے جلووں پر اشکبار ہے یہ — اُداس صورتِ شمع سرِ مزار ہے یہ
خزاں نصیب کوئی غنچۂ بہار ہے یہ — نظر کو پیرہنِ نور میں بھی خار ہے یہ

چراغ کشتہ ہے بامِ سپہرِ اخضر پر
یہ داغ ہے فلکِ نیلگوں کی چادر پر

شوکتِ ماضی کی یاد ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بظاہر "ستارۂ صبح" کو ایک نوحہ خواں کی حیثیت سے یاد کرنا اُسے نشانِ محفلِ انجم ہی کے کہنے کے مترادف معلوم ہو گا۔ لیکن جس نئے پیرایہ اور جس موثر انداز میں یہ خیال پھر مرحمت ہوا ہے وہ باید و شاید۔ جدتِ طبعی کے یہی معنی ہیں۔

اسی طور پر "شمعِ مزار" کی بے رونقی کا تصور فرمائیں اور پھر اُس کا "ستارۂ صبح" سے تقابل۔ دونوں میں حد درجہ مشابہت پائیے گا۔ پھر کسی مرجھائے

ہوئے پھول پر نظر ڈالئے اور ایک نگاہِ غلط انداز آسمان پر بھی۔ آپ کے روبرو ستارۂ صبح کی صحیح تصویر کھنچ جائے گی۔

اگرچہ چوتھے مصرعہ کے مطابق ستارۂ صبح کو قدرت کی جانب سے ایک نورانی ملبوس ودیعت ہوا ہے لیکن شاعر کی نظر میں وہ ایک خار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس سے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اہلِ دل کے دل میں تڑپ اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ پھر "ستارۂ صبح" کو "چراغِ کشتہ" کہنا بھی گویا مجروح احساسات کے ساتھ کھیلنا ہے، اور آخر کا مصرعہ

یہ داغ ہے فلکِ نیلگوں کی چادر پر

تو شاعر کی شدتِ حس کا آئینہ ہے۔

تمام بند موزوں اور برجستہ تشبیہات سے مملو ہیں۔ لیکن ان تشبیہات کا زور بعد کے بندوں میں بڑھتا ہی جاتا ہے اور استاد مرحوم ؂

برنگِ اشک ہے بے آب و تاب گوہرِ صبح

ہے مانند صورتِ یاقوتِ ناتراشیدہ

کہہ کر اپنی ندرتِ طبع کا بہترین جوہر دکھاتے ہیں۔

آپ کے مجموعۂ نظم دیوان "مطلعِ انوار" میں ایک دلکش نظم "نسیمِ صبح" شامل ہے، حالانکہ اس تمام نظم میں شروع سے آخر تک نسیمِ صبح کی تعریف و توصیف ہے، لیکن چونکہ اس کے چند بند آمدِ صبح کی صحیح و فطری تصویر ہیں، اور ان میں ایک خاص جدتِ ادا پائی جاتی ہے، یہ بند درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

تو چمن میں آئی عشقِ گُل کا دم بھرتی ہوئی چھاؤں میں تاروں کی۔ گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی

گُل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا

غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

بند کے دوسرے اور تیسرے مصرعہ میں نسیمِ صبح کے نقل و حرکت کی عکاسی کی گئی ہے۔ بیت کے شعر میں حسن و عشق کے اختلاطِ باہمی کا آخری انجام حسن خوبی و لطافت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اُس کا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے اس کوچے میں عملی قدم رکھا ہے۔ یہ بند محاکات کی بہترین مثال ہے۔ آپ کو انہیں جذباتِ فطری کے عمل کھیلنے کی صحیح تصویر نظر آئے گی۔ اس کے علاوہ اس میں دلکش روزمرہ کے باعث مرحوم کے اُس عبور پر بھی روشنی پڑتی ہے جو آپ کو محاورہ دانی پر حاصل تھا۔

ایک بند اور ملاحظہ فرمائیں۔

چھاؤں میں تاروں کی وہ آنا ترا انداز سے وہ جگانا نیند کے ماتوں کو خوابِ ناز سے
جیسے سرگوشی کرے کوئی کسی دمساز سے یا کہے دیکھے ٹھہر کے یوں دبی آواز سے

لے چکے انگڑائیاں بس، گیسوؤں والو! اٹھو!

نور کا تڑکا ہوا، اے شب کے متوالو! اٹھو!

دبی آواز سے ٹھہر کے دینا بھی کتنا دلفریب انداز بیان ہے، اس نے نسیمِ صبح میں کسی شوخ اور البیلی نازنین کی رعنائیاں پیدا کر دی ہیں۔

ابتدائی دَور ختم ہوا، اب "جلوۂ سحر" کی بھی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ہیں نغمہ زن طیورِ سحر خیز باغ میں محوِ سپاسِ حق ہیں یہ طاعت گذارِ صبح
شبنم کی ہے شراب گُلوں کے ایاغ میں کتنی سرور خیز ہے سیرِ بہارِ صبح

کیا تازگی ہے خندۂ گُل کی شمیم میں فرحت فزائے قلب ہے تازہ کُن دماغ
اعجازِ جانفزائی ہے موجِ نسیم میں وقتِ سحر بجھے ہوئے دل بھی ہیں باغ باغ

یہ تمام بند شاعر کے گہرے مطالعۂ فطرت کا نتیجہ ہیں اور ان سے کچھ وہی اصحاب لطف اندوز ہو سکیں گے جنھیں فطرت نے شاعر کا دل و دماغ عطا کیا ہے، یا پھر وہ جو فطرتاً نیک طبع ہوں یا جن کا مذاقِ ادبی نہایت پاک اور بلند مرتبہ واقع ہوا ہو۔

پنجاب بہ اعتبار اپنے ناظموں کے ایک خاص حیثیت کا مالک سمجھا جاتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ یہ نظمیں آج بھی پنجاب کے لئے ایک قابلِ تقلید معیار پیش کرتی ہیں۔

تاروں میں اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں

گُل ہیں چراغ مہرِ منوّر کے سامنے

چھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں

کیا رنگ جم سکے شبہ خاور کے سامنے

پہلے مصرعہ کا انداز بیان طنزیہ ہے، نظم میں شروع سے آخر تک آپ وہی ایک بجلی سی دوڑتی ہوئی پایئے گا جو اس قطعہ کے ایک ایک لفظ میں دوڑ رہی ہے۔ لطفِ زبان و محاورہ اس پر طرّہ ہے۔ آخر میں۔

بیٹھا جہاں پہ سکّۂ خورشیدِ خاوری زیرِ نگینِ مہر ہے اورنگِ کائنات
ظاہر ہیں ذرّے ذرّے سے آثارِ زندگی چاروں طرف ہے گرمیٔ ہنگامۂ حیات

زندگی کی کشمکش بیشتر روزِ روشن سے وابستہ ہے، اسی کی جانب ایک خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے یہ نظم ختم فرمائی گئی ہے۔

دوپہر خواہ کسی موسم کی بھی ہو عموماً پُر کیف نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس موضوع پر مرحوم کی جو نظمیں ہیں زیرِ بحث نہیں لاتا ہوں، اگرچہ محاسنِ شاعری کے لحاظ سے شاعر نے اسے بھی کسی طرح کم کامیاب نہیں بنایا ہے۔

اب منظرِ شام سے متعلق چند نظموں کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ "بہارِ شفق" کی جاذبیت ملاحظہ ہو۔

ہے جلوۂ بہارِ شفق آسمان پر صہبائے سُرخ یا یہ خُمِ نیلگوں میں ہے
پردے سے مہر جلوہ فگن ہے جہان پر یا برقِ بیقرار تڑپ کر سکوں میں ہے

بند کے دوسرے مصرعہ کا ماحصل محض اس قدر ہے کہ آسمان پر بادلوں کے لال لال تختے جلوہ گر ہیں۔ لیکن یہ سادہ سا مفہوم جن تشبیہوں کے ذریعہ ادا فرمایا گیا ہے وہ قابلِ داد ہیں۔

لال بادلوں کو صہبائے سُرخ یعنی شرابِ آتشیں اور آسمانِ محیط کو خمِ نیلگوں قرار دے کر اُستاد مرحوم نے اپنی طبیعت کی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے، نیلگوں ساغر میں سُرخ شراب بھر کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

تیسرے مصرعہ میں پردے سے مہر کی جلوہ فگنی ایک نازِ معشوقانہ کی کیفیت کا مظہر ہے اور مصرعِ ثانی تو مجسّم قیامت ہے۔ یہ سمجھئے کہ کیفیات کا ایک سمندر اِن چند گنتی کے لفظوں میں موجیں کر رہا ہے۔

ذیل میں تشبیہات کی کثرت ملاحظہ فرمایئے۔ اِن سے استاد بر دور کی جدّت و آمد پر بعد جا لتم روشنی پڑتی ہے۔ کوئی کوئی تشبیہ تو بالکل نئی ہے اور اِس اقتباس سے دنیائے ادب میں اضافہ ہے۔ مثلاً

لالے کے پھول دامنِ چرخِ بریں میں ہیں یا معدنِ عقیق کی ضَو ہے نظر فروز
یا پارہ ہائے آتشِ گل، گُل زمیں میں ہیں یا ہے سپہر پر کُرۂ نارِ جلوہ سوز

پہنچا ہے اُڑ کے تا فلکِ اخضری گلال ہولی کا یا یہ کاسۂ گردوں میں رنگ ہے
یا رُوئے مہر پہ ہے یہ سُرخیٔ انفعال غُصّے سے لال رُوئے حسینِ فرنگ ہے

لیلائے شب ہے حجلۂ زریں میں جلوہ گر رکھے ہیں آس پاس مئے آتشیں کے جام
مستِ مئے نظارہ نہ ہو برق کیوں نظر جوشِ شباب پر ہے عروسِ بہارِ شام

مندرجۂ بالا قطعہ سے انسان کا تخیل بے ساختہ مرزا غالب مرحوم علیہ الرحمتہ کے اس شعر کی جانب مبذول ہو جاتا ہے۔ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ہر چند ہے مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جس طرح مرزا غالب مشاہدۂ حق کی گفتگو میں مشغول ہونے کے باوجود بادہ و ساغر جیسے رنگین الفاظ سے احتراز نہ فرما سکے، اُسی طرح اُستادِ خُلد آشیانی کی طبیعت بھی ہر مفہوم کو خواہ وہ کتنا ہی سادہ کیوں نہ ہو، رنگین الفاظ اور دلآویز تشبیہات کے ساتھ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی جس میں بلاغت، فصاحت اور لطافت کے پہلو بھی نمایاں ہوتے تھے اور دل آپ کے اعجازِ شاعری کا قائل ہو جاتا تھا۔

"شفق" کے عنوان سے ایک نظم اور بھی ہے۔ اس میں بھی تشبیہات کی کثرت نظر آئے گی۔ پورا لطف تو نظم کے تمام و کمال مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، مگر بہرحال ہمیں بخیالِ اختصار انتخاب ہی پر اکتفا کرنا مناسب ہے۔

آسماں پر موجزن جوئے شرابِ سُرخ ہو یا محیطِ چرخِ زنگاری سحابِ سُرخ ہے
آئینے میں چرخ کے ہے عکسِ تصویرِ بہار تابش افزائے نظر ہے یا فروغِ شعلہ زار
از سرِ نو پھوٹ نکلا ہے شبابِ چرخِ پیر یا مئے احمر ہے زیبِ شیشۂ ابرِ مطیر
رنگ لایا ہے شفق بنکر شہیدوں کا لہو لوحِ گردوں سے عیاں ہے نقشِ خونِ آرزو
قصرِ فردوسِ بریں کا دلنشیں نقشہ ہے یہ یا بہارِ بوستانِ خُلد کا خاکہ ہے یہ
سُرخ جوڑا لیلیٔ شب نے کیا ہے زیبِ تن روزِ روشن سے ہے ہم آغوش جو ستی کی دلہن
برق کی چشمک تری رنگیں ادائی پہ نثار کہکشاں کا نور اِس جلوہ نمائی پہ نثار

کیف آور تیرا جلوہ ہے سکوتِ شام میں آتشِ سیال ہے لبریز تیرے جام میں
جو دکھاتے ہی جھلک اُڑ جائے وہ سیماب ہے بے ثباتی کا مرقع جلوۂ بیتاب ہے

یہی حال باقی اشعارِ نظم کا ہے۔

اُستادِ مرحوم کی نظم "برسات کی شام" بھی مطلعِ انوار میں ایک خاص شان رکھتی ہے۔ اِس کے مطالعہ سے جو لُطف مجھے حاصل ہوا، اِس میں ناظرین کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

ہلکے، گہرے مختلف رنگوں کی ہے کیسی نمود تختۂ گلہائے رنگا رنگ ہے چرخِ کبود
ایک سے بڑھ کر دوسرے رنگ زینت میں فزوں ترمذی، اودا، سُنہری، لاجوردی، لالہ گوں
دُور سے بادل نظر آتے ہیں سونے کے پہاڑ قصرِ فیروزہ میں آویزاں ہیں یا کُندن کے جھاڑ
پردۂ زریں پڑے ہیں گنبدِ افلاک پر ہلکے ہلکے نُور کی بارش ہے فرشِ خاک پر
کوئی در پردہ لبِ بامِ فلک گلریز ہے یا فضا رنگینیوں سے سر بسر لبریز ہے

ایک اور نظم "شام" ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف اُستادِ گرامی کو مشکل نویسی پر قدرت حاصل تھی وہاں آپ نہایت سادہ سے سادہ زبان میں بھی نہایت بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ ادائے مطلب کر سکتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اندازِ بیان کس قدر بے تکلف اور فطری ہے تمام نظم میں آمد پائی جاتی ہے، فرماتے ہیں۔

سورج ڈوبا ہوا اندھیرا چڑیاں لینے لگیں بسیرا
جلنے لگے دیے گھر گھر میں گرجا، مسجد، اور مندر میں
بچے نیند میں غافل ہو گئے لوری سُنتے سُنتے سو گئے
جا پہونچے مزدور گھروں میں خوش خوش ہیں بیوی بچوں میں
دن بھر کب آرام لیا ہے خون پسینہ ایک کیا ہے
شام نے دی ہے کام سے فرصت دم لینے کی پل ہے مہلت
کشت و چمن سنسان پڑے ہیں خالی اب میدان پڑے ہیں
پہلا سا غُل شور کہاں ہے دوڑ دھوپ کا زور کہاں ہے
اہلِ راحت ہوا زمانہ ختم ہوا دن کا افسانہ

چہل پہل دو چار گھڑی ہے
سب کے سرہانے نیند کھڑی ہے

اپنی ایک لاجواب نظم "تارے" میں عروسِ شب کی زینت کیا خوب فرمائی ہے۔

دیدنی شام کے نظارے ہیں زینت افزائے چرخ تارے ہیں
آتشیں پھول پیارے پیارے ہیں ضَوفشاں نُور کے شرارے ہیں
اِن کی کچھ شان ہی نرالی ہے
نہ ہوں تارے تو رات کالی ہے

کیا بے تکلف اور مترنّم بند ہے، تاروں کو آتشیں پھول اور نُور کے شرارے قرار دینا، موزوں اور بدیع تشبیہ ہے۔ نظارہ ہائے شام کو دیدنی کر دکھانے میں کوئی بات نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اندازِ بیان کس درجہ سادہ اور بے ساختہ ہے۔ مثلاً

زینت افزائے چرخ ہیں تارے

اور مسدّس کے آخر کا شعر یعنی

اِن کی کچھ شان ہی نرالی ہے
نہ ہوں تارے تو رات کالی ہے

کے بے ساختہ پن اور معصومیت پر تو طبیعت بے اختیار پھڑک اُٹھتی ہے۔
تمام نظم میں تشبیہات کا دریا اُمنڈ رہا ہے۔ دیکھیے۔

جلوہ افروزِ شب چراغ ہیں یہ فرح بخشِ دل و دماغ ہیں یہ
سینۂ آسماں کے داغ ہیں یہ یا مئے نُور کے ایاغ ہیں یہ
بحرِ ظلمت میں ہیں حبابِ نُور
یا ہیں یہ گوہرِ خوش آبِ نُور

مندرجۂ ذیل شعر فصیح گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔

چرخ پر قمقمے سے روشن ہیں
یہ دیے بے نیازِ روغن ہیں

ایک بند اور ملاحظہ فرمائیں۔

ہجر میں مبتلائے صد آفات تارے گِن گِن کے کاٹتے ہیں رات
اُن کے حق میں ہیں یہ چراغِ حیات آنکھوں آنکھوں میں پوچھتے ہیں بات
دُور سے دیتے ہیں پیامِ سکوت
ہیں یہ دمسازِ تشنہ کامِ سکوت

مرحوم کی نظم "کہکشاں" "مطلعِ انوار" میں شامل نہیں ہے، اس کا کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں۔

کہکشاں ہے کہ حبابِ درّۂ ذرّیں　　یا فلک پر ہے جدولِ سیمیں
تابش افزا ہے جلوۂ رنگیں　　بہرِ گردوں ہے مایۂ تزئیں
دستِ فطرت کے نقش سارے ہیں
ہر دم کہکشاں کے تارے ہیں

"تاروں بھری رات" کے سلسلے میں فرماتے ہیں

دامانِ فلک میں گُلِ خوش رنگ پڑے ہیں
یا سقفِ زمرد میں دُر و لعل جڑے ہیں

تاروں کو گُلِ خوش رنگ کہہ کر انھیں دُر و لعل سے مشابہ کرنا اور فلک کو سقفِ زمرد سے خطاب کرنا خاص معنی رکھتا ہے۔ لفظِ سقف کے ساتھ زمرد کا استعمال خصوصاً قابلِ داد ہے، چونکہ زمرد باعتبارِ رنگ نیلا ہوتا ہے، اور آسمان بھی نیلا ہوتا ہے۔ اسی طرح الفاظ "دُر و لعل" کا انتخاب بھی مصنف کی دُور رسی کا شاہد ہے۔ بسا اوقات تارے آسمان پر خفیف سے سُرخی مائل نظر آتے ہیں۔ انھیں تاروں کے لئے لعل کی تشبیہ استعمال کی گئی ہے۔

گردوں پہ عجب محفلِ انجم کا ہے عالم　　آتا ہے نظر دُور سے اک مجمعِ برہم
کیا غوطہ زن ہے سرِ چرخِ بریں کاہکشاں کی　　اک موج ہے یہ نُور کے دریائے رواں کی
قندیلیں سرِ شام سے روشن ہیں فلک پر　　یا گنبدِ گردوں پہ چراغاں کا ہے منظر
لیلائے شب اوڑھے ہوئے تاروں کی رِدا ہے　　کیا حُسنِ ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے

تمام اشعار منظوم مصوّری کی بہترین مثال ہیں، اور گوناگوں کیفیات سے مالا مال۔

اشعارِ ذیل میں علمِ طبعیات کے اسرار کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔

سرگشتہ گردوں ہیں یہ دامانِ خلا میں　　لاکھوں کُرۂ نُور معلق ہیں ہوا میں
تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں　　ثابت کوئی، سیارہ کوئی، کوئی ہے رقصاں

ان اشعار میں واقعات و حقائق بیان کئے گئے ہیں۔

پانی میں جہاز ان کے اشارے پہ رواں ہیں
گویا یہ سفینوں کے لئے سنگِ نشاں ہیں
چھا جاتے ہیں جب دل پہ غم و یاس کے بادل
صحرا میں مسافر کو دکھاتے ہیں یہ مشعل
ہمدم یہی غم دیدوں کے ہیں رنج و تعب میں
دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائی شب میں

ذیل کے دو اشعار میں عروج و زوال کا نقشہ کھینچا گیا ہے

کیا گُل ہیں کھلے دامنِ گلزارِ فلک پر　　صدقے ہیں زر و لعل و گہر جن کی چمک پر
آیا ہے دمِ صبح یہ فرق ان کی چمک میں　　مرجھائے ہوئے پھول ہیں دامانِ فلک میں

نظم "ماہِ تاباں" کی شانِ تمہید قابلِ دید ہے۔

اے مہِ تاباں! سُرور افزا ہے تیری روشنی
اُجلی اُجلی یہ شعاعیں ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی

مصرعۂ ثانی دودھ میں دھویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
اسی طور پر ماہِ تاباں کا ضیائے محفلِ انجم سے مقابلہ کرتے ہوئے کس قدر صحیح فرمایا ہے۔

انجمِ تابندہ تابش سے تری گُل خوردہ ہیں
دامنِ چرخِ بریں میں غنچۂ پژمردہ ہیں

ذیل کے اشعار تشبیہات و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے پرکھئے۔ اندازِ بیاں کچھ ایسا پُر کیف اور مؤثر ہو گیا ہے جس سے سہل انکاری یا چشم پوشی برتنا حق و انصاف کا خون کرنا ہے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادیٔ گُل پوش میں
کاروانِ نُور اُترا منظرِ خاموش میں
پیرہن سیماب کا، پہنے ہوئے ہے موجِ آب
نُور در آغوش ہے چشمِ نظر بازِ حباب

آخر کے دو اشعار میں آپ نے جن سنسنی خیز حقائق کا اظہار فرمایا ہے وہ آپ کے قلبِ بصفا اور دوربین ہونے کے بہترین شاہد ہیں۔

نظم "شبِ ماہتاب" کی تشبیہ میں جدّتِ تخیل و ندرت آفرینی کا کمال دیکھئے۔ ہر تشبیہ میں ایک انوکھی بات پیدا کی گئی ہے۔

چشمۂ نور ابل پڑا دامنِ چرخِ پیر میں　　موجِ ضیا نہیں ہے یہ جوش ہے جوئے شیر میں

مصرعہ۔ پھیلی ہے روئے خاک پر سیم رقیق کی بساط

ذیل کے اشعار میں کیا خوب منظر باندھا ہے تشبیہات کا لُطف مزید ہے،

زرّیں ہیں سقف و بام و در، چمکے ہیں سب شجر حجر
جس طرف اُٹھ گئی نظر، رنگِ طلا ہے سر بسر
روشنی بخشِ شش جہت، گو ہر شب چراغ ہے
یا تو شرابِ نُور کا زرّیں کوئی ایاغ ہے

کیا بلحاظِ روانی و سلاست اور کیا زبان و محاورہ تمام نظم ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ استادِ مرحوم کی شاعری کے یہ معدودے چند نمونے ملاحظہ کرنے کے بعد کسی کو بھی اُن کے کمالِ فن میں شک نہیں ہو سکتا۔ تمام مُلک میں ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک زبان ہو کر اِن کی عظمت تسلیم کر لی ہے اور اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپ کو اِن کے کلام میں فصاحت، بلاغت شعریت غرضیکہ تمام لوازمِ شاعری بدرجۂ اتم نظر آئیں گے۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ایک شاعر کو لا کر صفِ اوّل میں بٹھا دیتی ہیں۔

اَطہر

گاؤں کی اک نگارِ ہوش رُبا — سر پہ چھینٹ دری، نہ بات میں چھلّا
نُور ساکن ہے، نار ہے بیتاب — ہو رہی ہے طلوع صبحِ شباب
انکھڑیوں میں حیا، نہ طرّاری — نہ نگاہِ کرم، نہ بیزاری
ایک بھٹکی ہوئی سی شانِ حجاب — ایک کھویا ہوا سا استعجاب
رُخ پہ ہلکی سی کشمکش سی ضرور — لیکن اس طرح جیسے تحتِ شعور
آ رہی ہے قدم بڑھائے ہوئے — زُلف کھولے، نظر اُٹھائے ہوئے

خواب میں جیسے چل رہا ہے کوئی
بے ارادہ مچل رہا ہے کوئی

جوش

(۲)

مولانا آزاد سبحانی

مولانا آزاد سبحانی، ان اہلِ ہند کے اُن گنتی کے صحیح مفکرین میں سے ہیں، جن پر قوم بجا طور سے فخر کرسکتی ہے۔

آزاد صاحب صرف نہایت صفائی کے ساتھ سوچتے ہی نہیں، بلکہ جو کچھ سوچتے ہیں، اُسے نہایت صفائی کے ساتھ بیان بھی کرسکتے ہیں۔ اور یہ دراصل اُن کی ایک ایسی مخصوص صفت ہے جس میں اُن کا شریک شاید ہی کوئی مل سکے۔

"ربانی انقلاب" کی شرح سے مولانا کا یہ دوسرا مضمون شائع کرتے ہوئے مجھے نہایت مسرت محسوس ہو رہی ہے، اسی لئے کہ اس کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس کی زخم خوردہ انسانیت کو خصوصیت کے ساتھ شدید ضرورت ہے!

مجھے آزاد صاحب کی نیت، اُن کی رُوح اور اُن کے مقاصد سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے میری رُوح میں جذب ہو کر میرے خیالات مجھ سے چھین لئے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس پر شدید اعتراض ہے کہ اس تحریک کو مذہبی لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

میں اہلِ ہند کی جہالت سے واقف ہوں، اور جانتا ہوں کہ جب تک کسی دوا کی گولی پر شکر نہ لپیٹ دی جائے وہ نگل ہی نہیں سکتے، اور شاید اسی وجہ سے مولانا آزاد نے مجبور ہو کر اپنی اس تحریک کے دامن پر مذہب کی گوٹ ٹانک دی ہے۔

مگر کم سے کم میرے نزدیک اب وقت آ چکا ہے کہ عوام اور جہلا کی ذہنیت کا پاس کرنے کے عوض اُسے صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی جائے، اور بتایا جائے کہ دوا، دوا ہے، اور شکر، شکر ہے۔ اگر تندرست ہونا چاہتے ہو تو دوا میں شکر کی آمیزش پر اصرار نہ کرو۔

دوا کو دوا کی طرح استعمال کرو، اور شکر کو شکر کی طرح۔ دین کو دین کی طرح برتو اور دنیا کو دنیا کی طرح۔ یہ کیا قیامت ہے کہ جب تک کسی دنیوی تحریک پر دین کے لفافے نہیں بنائے جاتے، اُسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا جاتا ہے

ربانی تخریب

(۱) ربانی انقلاب اپنے دو بازوؤں پر قائم ہے، ایک بازو ربانی تخریب ہے، دوسرا ربانی تعمیر۔ اگر ان میں سے ایک بازو بھی شکستہ ہے تو ربانی انقلاب بھی شکستہ ہے۔ نفسیاتی نظام کو خراب کرنا اس نیت سے کہ اس کے کھنڈر پر ربانی نظام کی ربانی تعمیر کھڑی کی جائے گی ربانی تخریب ہے۔ ربانی تخریب ربانی تعمیر کو جس طرح لازم ہے اُسی طرح اس سے مقدم بھی ہے۔ صحیح عمارت نہیں بن سکتی جب تک غلط عمارت ڈھا نہ لی جائے۔ پہلے غلط عمارت کو ڈھالو پھر صحیح عمارت بنانے کا نام لینا۔ بد دماغ و بے دل لوگ تخریب کے نام سے عزیاد کرتے ہیں۔ اور انقلابیوں پر بار بار تخریبی ہونے کا الزام لگاتے پھرتے ہیں۔ اُن کو جاننا چاہیئے کہ تخریب

کی مخالفت تو عین تعمیر کی مخالفت ہے، اور تعمیر کی بھی مخالفت کی جائے تو پھر دنیائے عمل میں رہ کیا جاتا ہے جس کی موافقت کی جاسکتی ہے۔ پھر تخریب کی مخالفت تو حقیقت کی مخالفت ہے، فطرت کی مخالفت ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عالم کون وفساد کی ایک چیز بھی اس وقت تک تعمیر کی ہستی نہیں پاتی، جب تک ایک دوسری چیز تخریب کی نیستی میں پہونچ نہیں لیتی خون بنتا نہیں ہے۔ جب تک غذا بگڑ نہ لے۔ ولی عہد تخت کے سر پر سوار نہیں ہوسکتا جب تک بادشاہ شاہی موت کی گود میں بے دم نہ ہولے، اور فطرت کا تو یہ حال ہے کہ وہ تعمیر بلا تخریب کے تصور تک سے ناآشنا ہے۔ وہ کام کا ایک ہی طریقہ جانتی ہے پہلے بگاڑتی ہے پھر بناتی ہے۔ مادے کی ایک صورت کو تخریب کی بھٹی میں پھونک لیتی ہے، تب دوسری صورت کو تعمیر کا جامہ پہناتی ہے۔ پھر تخریب کو کوسے جانا۔ اور تعمیر کا راگ گائے جانا۔ اور اس حماقت کو حکمت ٹھہرانا جہل مرکب نہیں تو کیا ہے پس ربانی انقلاب کے تماشے میں ایک سین اور پہلا سین ربانی تخریب کا اتنا ناگزیر ہے جتنا خود ربانی انقلاب ناگزیر ہے۔ اسی طرح تخریب اگر تعمیر پر ختم نہ ہو تو وہ تخریب ہی نہیں ہے۔ یعنی تخریب معتبر نہیں ہے۔ اور جو بے فہم و فراست لوگ انقلاب کے جوش عشق میں تخریب ہی تخریب کو رٹے جاتے ہیں اور تعمیر کے نام سے جھجکنے لگتے ہیں انھیں بتانا چاہئے کہ تخریب کو صرف سفر ہے اور منزل تعمیر ہے، جو تخریب تعمیر پر منتہی نہ ہوئی وہ سفر بلا منزل ہے۔ اور انھیں متنبہ کرنا چاہئے کہ وہ مخالفین تخریب سے کم جہل مرکب کا شکار نہیں ہیں۔ فطرت اور حقیقت دونوں حقیقت ناشناسوں کی یکساں ہنسی اڑاتی ہیں۔ پس ربانی انقلاب کے تماشے کا دوسرا لازمی سین ربانی تعمیر اتنا ہی ضروری ہے، جتنا خود ربانی انقلاب۔ لیکن یہ مضمون صرف ربانی تخریب کی داستان گوئی کرے گا۔

(۲) ربانی تخریب جن جن پرانی تعمیروں کو ڈھائے گی ان کی ایک منتخب فہرست یہ ہے۔

(الف) قومیت، وطنیت، فرقہ وارانہ ذہنیت کے قصروں کو مسمار کرے گی جو بحالت موجودہ تمام انسانی جھگڑوں اور فتنوں کے ناقابل تسخیر اڈے ہیں۔ جہاں فتنے ڈھلتے اور جہاں جھگڑے پلتے ہیں۔ جنھوں نے جنت ارضی کو جہنم نقلی بنادیا ہے۔ جن کا خاتمہ دنیا کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایمان کے لئے شیطان کا۔ ان تینوں سامان تفرقہ، جنگ کی جگہیں مذہب مطلق کے سے اسباب وحدت کو دی جائیں گی، جو جہنم ارضی کو جنت ارضی سے بدل دے گا۔ جو انسانیت کو نقطۂ حقیقت سے قریب تر کرسکے گا۔ اس لئے کہ انسانیت کی غائت کبریٰ یہی چیزیں ہیں۔

(ب) یہ تخریب متفرق حکومتوں، متفرق اُمتوں، متفرق تہذیبوں کے وجودوں کو جو قومیت، وطنیت، مذہبیت فرقی کی پیداواریں ہیں۔ مٹاکر ان کے حدود پر ایک حکومت، ایک آئین اور ایک تہذیب وحدانی کو محیط بنائیگی۔ تاکہ وحدت انسانی کا نقطۂ مقصود جو تصور سے بھی گم ہو چکا ہے رسائی کی دسترس میں آجائے۔ اور اس مقصود سے اس نصب العین اعلیٰ تک پہونچنا بھی ممکن ہوجائے جس کا وحدت انسانی صرف ایک وسیلہ ہے، یعنی تکمیل انسانیت و اکمال فطرت۔

(ج) متفرق معیارات زندگی کو، متفرق مدارج زندگی کو، متفرق ذرائع زندگی کو، متفرق استطاعات زندگی و متفرق امتیازات زندگی کے مصنوعی خطوط فاصل کو محو کرے گی اور ان کے بدلے ایک معیار زندگی ایک درجۂ زندگی ایک ذریعۂ زندگی ایک استطاعت زندگی اور ایک امتیاز زندگی کو عالم انسانی کا سکہ رائج بنائے گی، تاکہ کلفتوں کے روح فرسا باروں سے انسانیت کی لطیف روح سبکدوش ہوسکے۔ اور راحت خالصہ کا خواب شیریں جو ابھی تک صرف فردوس تخیل ہے منت کش تعبیر اور جنت حقیقت بنجائے۔

(د) شاہیوں، امارتوں، پیشواؤں کے مصنوعی تفوقات کے سر بفلک مصنوعی قلعوں کو جہاں محفوظ ہوکر حقیقت عامہ کے قدرتی حقوق انسانیت پر گولہ باریاں ہوتی ہیں۔ اور اس کے حقوق کو تباہ کرکے اس پر حکومت بجا کی جاتی ہے، زمین کے بالکل برابر کردے گی۔ اور اس غیر فطری، مصنوعی، ابلیسی امتیازات کو بھی ساتھ ہی ساتھ خاک کو سونپ دے گی۔ اور انسانیت کے احترام کو جو ان مصنوعی تفوقات کے باعث خاک میں ملا دیا گیا ہے، عہد فطری کی یادمبارک کے ساتھ ساتھ جب کہ انسانیت سادہ اور واقعی طور پر محترم تھی از سر نو بلند کرے گی۔ تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پالے اور خواب شیریں کی طرح خواب و خیال میں پڑی ہوئی جنت کو واقعۂ و تعبیر بناکر

اس کی مالک ہو جائے۔

(ل) دینِ مصنوعی یا تہذیبِ مصنوعی کے عقائدِ مصنوعی کی زنجیروں کو اور دینِ رسمی اور تہذیبِ رسمی کے رسوم و رواجاتِ مکلفہ کے بند ھنوں کو ایک ایک کر کے کاٹ دے گی اور دینِ حقیقی کو قائم مقام بنائے گی، اور اس ذریعے سے فطرتِ انسانی کو اس کی فطری آزادی تک پہونچائے گی۔ جو اس کا فطری حق ہے اور جس کو دینِ مصنوعی اور تہذیبِ مصنوعی کی دست درازیوں نے زبردستی چھین رکھا ہے۔

(ف) عقلیت و فطرت پر چھائی ہوئی وہم پرستیوں کے بیت عنکبوت کو تار تار کر کے رکھدے گی۔ اور عقلیت و فطرت کی طاقت کو اتنا بڑھا دے گی کہ وہ الہام و وحی کے دوش بدوش چل سکے۔ تاکہ ایک طرف الہام و وحی اپنے عمل کی وسعت و علویت کے باعث خود اپنی وسعت و علویت کے قرار واقعی مظاہرے کر سکیں۔ دوسری طرف عقلیت و فطرت کو بھی اپنی آخری بلندیوں تک پہونچ کر الہام و وحی کے گہرے قبول و انجذاب کے قابل بنا کر فکرِ اعلیٰ اور جذبۂ اقصیٰ کی برکتوں کے بکھیرنے کے بھی قابل بنا دے گی۔

(ج) نظامِ نفسانی یعنی حکومتِ نفسانی، تہذیبِ نفسانی، حیاتِ نفسانی کی پوری کائناتِ نفسانی پر حملہ آور ہوگی۔ اور جہاں تک اس پر انہدام و انعدام طاری کر سکے گی، طاری کرے گی۔ یہاں تک کہ اُس کی پر رونق آبادی کو شمشان اور خرابستان سے بدل دے گی، اور تب اس مرگھٹ اور ویرانے سے دنیا، ربانی کو نکالنے کی کوشش کرے گی۔

(س) تمام محتاجیوں تمام ذلتوں تمام کلفتوں اور تمام بُرائیوں پر جہاد کرے گی اور اُنھیں شکست دے گی اور امکان کے آخری درجے تک اُنھیں نیست و نابود کر کے رکھ دے گی۔ اور اُن کی جگہ خوشحالیوں، عزتوں اور تمام اچھائیوں کو انسانوں کی متاعِ مشترک بنا ڈالے گی اور اس طرح انسانیت کو عذابِ الٰہی سے چھڑا کر انعامِ الٰہی سے ہم آغوش کرے گی۔

(م) ربانی تخریب اپنے اندر تعمیر کا پہلو لئے ہوئے ہوگی، جیسا کہ ہر تخریبِ صحیح کا حال ہے اور اس لئے وہ تعمیری کام کی بھی بنیاد ڈالتی ہوئی آگے بڑھے گی۔ وہ ایک طرف نظامِ نفسانی پر حملہ آور ہوگی۔ اور رہے گی۔ اس حد تک کہ اس کے لئے تختۂ تابوت تیار ہو جائے اور دوسری طرف نظامِ ربانی کا بنیادی پتھر بھی رکھدے گی اور ربانی تعمیر کا دست و بازو بن کر نظامِ ربانی کی تعمیر کو آگے بڑھاتی رہے گی۔ اور صاف صاف خلاصہ یہ ہے کہ ربانی تعمیر کے زیر سایہ عملی فرمانروائی کرے گی۔

(۵) ربانی تخریب، تعمیری شمول کے ساتھ ساتھ، ربانی تعمیر کے زیر سایہ اپنا صورِ عمل پھونک چکی ہے۔ اس کا قدم ہلکا مگر مضبوط ہے، اس کی چال دھیمی مگر مسلسل ہے اور وقت آئے گا اور ضرور آئے گا، جب اس کا قدم برق تمثال اور اس کی چال مثلِ زلزال ہو جائے گی، اور اس وقت زمین نمونۂ قیامت بن جائے گی، اور اُسی وقت ایسا ہوگا کہ نشارتِ قدیمہ کے مُردہ ڈھانچے سے نشارتِ جدید کا زندہ پیکر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا، اور اس وقت ربانی انقلاب اپنی پہلی نصف منزل طے کر چکا ہوگا اور دوسری نصف منزل کو پے سپرد بنانے کے لئے پُر جوش حوصلے اور پُر جوش ولولے کے ساتھ ربانی انقلاب زندہ باد و ربانی تخریب مبارکباد کے نعرہ ہائے گرم میں قدم اُٹھا رہا ہوگا۔

لازم ہے دوا ہی نہ دعا یاد رہے
ہاں لعل لب و زلف رسا یاد رہے
حتیٰ کہ یہ ہے نزع بشر کی تعیین
گر عہد شباب میں خدا یاد رہے

جوشؔ

زمانے کی عیّاری

جوش ملیح آبادی

میرے دل کو ایک ایسی محبّت ودیعت کی گئی ہے جو بلا کی تلخ و شیریں ہے۔ وہ ایک ایسی آگ ہے، جو معشوقہ کے سوا، خود مجھے، اور تمام کائنات کو پھونکے دے رہی ہے۔

زمانے کی کیسی عدیم النظیر بے مہری اور ستم ظریفی ہے کہ میں پھر اُس ہولناک منصب پر فائز کیا گیا ہوں جسے میں ترک کر چکا تھا۔ ذرا دُنیا کا انصاف دیکھو، سالہاسال کی شب بیداریوں کے بعد، ابھی ابھی میری آنکھ جھپکی تھی کہ اس کمبخت نے مجھے پھر جگا دیا۔ ابھی ایک قیامت نے دم نہیں لیا تھا کہ دوسری قیامت نے شانے پر ہات رکھ دیا۔

ہوائیں بھی کبھی بند ہو جایا کرتی ہیں، مگر میرے دھڑکنے والے دل کو ایک لمحے کے سکوُن کا بھی حکم نہیں۔

خدا کے لئے انصاف سے کہو میں نے زمانے سے کب درخواست کی تھی کہ مجھے دوبارہ مزا چکھایا جائے۔ میں عورت، خطرناک جنّت۔ انگاروں کی بہشت، پھولوں کا جہنّم یعنی عورت سے قطعیؔ مایوس ہوں۔ یہ دلوں کو توڑ تو دیتی ہے مگر جوڑ نہیں سکتی۔ جوڑنے میں ایک ایسی کاریگری درکار ہے جو کمزور عورت کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اُس کی محبت، طوفانی سمندروں سے زیادہ پُرجوش ہوتی ہے۔ اور کھرے سونے کی طرح خالص بھی۔ مگر افسوس، صد ہزار افسوس، اُس میں پائداری کہاں۔ عورت نازک ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس کا پیمانِ محبت بھی نازک ہوتا ہے۔ آبگینے کا ہر جزو آبگینہ ہی ہوتا ہے۔ میں عورت کی محبت کی ناپائداری کے باعث عورت کو بُرا نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ مجھسے پیمانِ وفا نہ باندھے۔ کیوں کہ وہ ایک نہ ایک دن ٹوٹ کر میرے دل کو بھی توڑ دے گا۔ مگر ہمارے چاہنے سے ہوتا کیا ہے۔ زمانہ اپنی مصلحتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ ہماری خاطر اپنے نظامِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا ——

کیا میں اُس محبّت کو جو زبردستی مجھے دی گئی ہے۔ زمانے کے منھ پر مار دوں۔ سینہ چاک کر کے اُسے پھینک دوں؟ کاش میں اِس پر قادر ہوتا —— زمانہ جانتا تھا کہ میں محبت کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں، آسانی سے اُسے دوبارہ قبول نہ کروں گا۔ یہ خیال کر کے اُس نے مجھ سے ایک نہایت شاطرانہ چال چلی۔ اِس گرگِ باراں دیدہ نے مجھ سے کہا "لے میں تجھے ایک شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح دیتا ہوں، اس سے دل بہلا" میں نے شکریے کے ساتھ اُس "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" سے جی بہلانا شروع کیا۔ اور اُسے ایک ادبی مشغلہ سمجھنے لگا —— لیکن رفتہ رفتہ یہ "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" اپنے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُٹھانے لگی ——

اور جب پورے طور سے نقاب اُٹھ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ "شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح" تفریح نہیں "محبت" اور خطرناک محبت ہے جس پر زمانے کے چالاک ہات نے "تفریح" کی نقاب ڈال دی تھی —— دیکھو زمانہ کس قدر عیّار ہے۔ لیکن کس سے اِس کی شکایت [illegible] یہ ٹھگ تو بادشاہوں تک سے ہات ملاتا ہے۔ کس کے منھ میں دانت ہیں [illegible] اسے سزا دے —— دیکھو،

چالاکی یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے۔ ایک چالاکی کے اندر دوسری چالاکی تہ کی ہوئی ہے، جو پہلی چالاکی سے بھی لطیف و باریک ہے۔ زمانے کو پہلے سے علم تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اُس کی "شام کی تفریح" کو پہچان جاؤں گا۔ اور پہچانتے ہی نکل بھاگنے کی راہیں سوچنے لگوں گا۔ سو اُس نے بکمالِ عیاری وہ راہیں پہلے ہی سے بند کر دی تھیں۔ یعنی اُس نے جس پر مجھے فریفتہ کیا تھا، یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اُس کے دام میں دو تیلیاں نہیں، زنجیریں ہیں۔ لہٰذا اُسی کے ساتھ ساتھ اُس نے اِس نادرۂ روزگار کے ترکش میں نیاز مندی و بندہ پروری کے وہ تیر رکھدئے جو بھاگنے والے کا دُنیا کے ہر حصّے میں تعاقب کر سکتے ہیں

بہ دُوز گر دئ من از غرورمی خندد

حریف سخت کمانے کہ در کمیں دارم

زمانہ خوب جانتا ہے کہ حُسن جب وفا و کرم سے کام لے تو اُس کا مارا ہوا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔

بہرحال، اب تو میں گرفتار ہو چکا۔ میں رو رہا ہوں اور زمانہ قہقہے مار رہا ہے۔

کیا تو سُننا چاہتا ہے وہ کیسی ہے؟ تو سُننا چاہے، یا نہ چاہے، اِس منزل میں جہاں اب میں ہوں، ذکرِ محبوب سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہوا کرتا۔

وہ کیسی ہے؟ میرا سینہ رُندھا جا رہا ہے۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ حیوانِ ناطق کی یہ کیسی بدبختی ہے کہ جو باتیں کہے جانے کے قابل نہیں ہوتیں۔ اُنھیں وہ کہہ سکتا ہے، اور جو باتیں اِس قابل ہوتی ہیں کہ کہی جائیں، اُنھیں کہہ نہیں سکتا۔ کیسی بدقسمتی اور محرومی ہے کہ معنی کے آفتاب کا سامنا ہوتے ہی الفاظ کی شبنم اُڑ جاتی ہے۔ آہ اے گونگے انسان! تو زباندانی کا مُدعی ہے۔

زبان ایک گنوار خادم ہے جو پیتل اور تانبے کے برتن تو راکھ سے مانجھ سکتی ہے۔ مگر چینی اور شیشے کے ظروف توڑ ڈالتی ہے۔

ہاں تو وہ کیسی ہے؟ وہ انگوری شراب ہے، جو کسی دیوی کی دُعا سے انسانی پیکر میں جلوہ فروش ہو گئی ہے۔ وہ خالقِ عالم کا تصورِ بہشت ہے جس نے جسم کی صورت اختیار کر لی ہے، وہ شاعری کی رُوح ہے جس نے گوشت پوست کا رنگین لباس پہن لیا ہے ——— اُس کی جِلد، خدا جانتا ہے، اس میں مبالغہ نہیں۔ دودھ پیتے بچوں کی جِلد سے زیادہ چکنی اور ملائم ہے۔ میں نے اُس کی جِلد کو مَس کر کے فوراً گلاب کی پنکھڑی کو مَس کیا (اگر مبالغہ کرتا ہوں تو میرا حشر ظالموں کے ساتھ ہو) اور میں نے یہ بیّن فرق محسوس کیا کہ میری محبوبہ کی جِلد پنکھڑی سے بھی زیادہ ہموار، چکنی اور نرم ہے۔ میرے مَس نے اُس سے زیادہ نرم شے کا آج تک تجربہ نہیں کیا ہے۔ اُس کا چہرہ یونانی دیویوں سے ملتا ہے، اور دنیا کے منتخب ترین مصوّروں کا آئیڈیل بن سکتا ہے۔ اُس کی گردن ہنس کی سی ہے۔ ذرا سا خم لئے ہوئے جس میں تلوار کی سی لچک اور رقص کرتے ہوئے طاؤس کا سا بانکپن ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے معلوم ہوتا ہے تاروں کی چھاؤں میں کسی دُور کے مندر کے اندر چاندی کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اُس کا تبسّم، دل کے ساتھ وہ کرتا ہے جو قحط زدہ زمین کے ساتھ زُوم جھوم کر برسنے والی گھٹا کرتی ہے۔

ملبوس کے اندر سے اُس کے گورے پنڈے کا گلابی پن کس لطافت کے ساتھ جھلکتا رہتا ہے۔ اُس کے پنکھڑی سے زیادہ کاریگری کے ساتھ ترشے ہوئے لبوں کی خوشبو ایسی ہے، جس سے پھولوں کی دُنیا ناواقف ہے۔ اُس کی آنکھیں، کائنات در آغوش آنکھیں کتنی مخمور، مست، ساحر، اور عمیق ہیں۔ اُن میں کتنے جادوؤں کا مسکن، اور کتنے منتروں کا آشیانہ ہے۔ اُس کی دراز پلکوں میں شراب کی موجیں ہیں، ابر کا خرام ہے، اور رُوح کی کروٹیں ——— وہ ایک آہوئے صحرا ہے جس کی ملائم مگر سمندر سے زیادہ گہری آنکھوں کے سامنے شیر مقتول نظر آتے ہیں۔

میں نے ایک روز منھ اندھیرے، جب مُرغ بانگ دے رہے تھے، اُسے دیکھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میری رُوح کو معلوم ہوا کہ آسودگی کسے کہتے ہیں۔ اگر میں راسخ العقیدہ مسلمان ہوتا تو صبح کے وقت اُس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کرتا۔ کیونکہ میری محبوبہ صبحِ صادق کی حقیقی بہن ہے، اور اسلام نے دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ٹھیرایا ہے۔

یہ ہے سرسری اور بھدا سا خاکا اُس نادرۂ روزگار کا جس کے حوالے زمانے نے مجھے کیا ہے ——— اب خود سوچ، میں بھاگوں تو کیونکر اور اب جبکہ اچھی طرح معاملات میں نے بیان کر دئے ہیں، زمانے کو داد دو کہ اُس نے کیسی کامیاب عیاری سے مجھے ہمیشہ ہاتھ پاؤں باندھ کر حُسن کے قدموں پر ڈال دیا ہے۔

دعوت درد

اے تموّل پیشہ انساں اہلِ زر خانہ نشیں | کسبِ دولت میں تجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں
صرف تجھکو وسعتِ ظرفِ امارت چاہیئے | اپنے گھر بیٹھے ہوئے دنیا کی دولت چاہیئے
یوں زمیں پکڑے ہوئے آسودگی میں گھر نہ بیٹھ | سانپ بن کر اِس طرح گنجینۂ زر پر نہ بیٹھ
پاؤں کو تکلیف دے ایوانِ راحت سے نکل | جس طرف لے جا رہا ہوں میں تجھے ہمراہ چل
تجھپہ ثابت کر دکھاؤں اک تماشا گاہ سے | تو کہ ہے گزرا ہوا انسانیت کی راہ سے

درسِ عبرت کے لئے نیرنگِ دُنیا دیکھ لے
ہند کے اسٹیج پر آج اک تماشا دیکھ لے

وہ مناظر حشر زا ہو جائیں گے خود بے نقاب | کانپ اُٹھے گی لرز جائے گی روحِ انقلاب
اک دھماکا ہے کہ رعد و برق کی آواز ہے | ہند کے اسٹیج پر کس کھیل کا آغاز ہے
ہر فضا میں گونج اُٹھی یوں نوائے انقلاب | جیسے بندھ جائے ہوائے نغمۂ چنگ و رباب
یہ سماں رامشگرانِ وقت کی آواز پر | بجلیاں تک رقص میں ہیں بادلوں کے ساز پر
دیکھ لایا ہوں تجھے میں کس تماشا گاہ میں | تو کہاں بیٹھا ہوا تھا حرصِ عز و جاہ میں

ہند کے اسٹیج پر اِس کے اداکاروں کو دیکھ
جان پر کھیلے ہوئے ہیں بخت کے ماروں کو دیکھ

دیکھ نکلے راہ کوہ و دشت سے خانہ بدوش | کارواں در کارواں غربت زدہ قسمت فروش
حشر زا نظّارہ ہے طفل و جوان و پیر کا | دیکھ ناداروں میں رنگ افلاسِ عالمگیر کا

اہلِ دولت کی دُہائی دے رہی ہے جابجا — اِن کی یہ آوارہ بختی اِن کی یہ مسکیں ادا

جس طرف نکلیں لئے سودائے ہستی سر میں ہیں — رات دن گردش زدہ تقدیر کے چکر میں ہیں

ہو کہاں حاصل اُنھیں کاشانۂ امن وسکوں

رہ نوردی میں ہیں یہ بیگانۂ امن وسکوں

دیکھ نکلا جھونپڑوں سے وہ کسانوں کا گروہ — جن کے حالِ بیکسی پر رو رہے ہیں دشت وکوہ

باش لے بیدرد انساں باش لے سرمایہ دار — یہ وہ انسانی جماعت ہے جو ہے تیرا شکار

یہ جماعت دانے دانے کے لئے محتاج ہے — جس کی پستی آج تک تیرے لئے معراج ہے

اے حریصِ سربلندی عالمِ پستی بھی دیکھ — اپنی دولت دیکھ کر اِن کی تہیدستی بھی دیکھ

اِن کا خونِ گرم تیرے بدنما پیکر میں ہے — اِن کی کُل گاڑھی کمائی دیکھ تیرے گھر میں ہے

قرض کی صورت میں اِن کا چوس لیتا ہے لہُو — سانپ بن کر ڈسنے والی جونک ہے در اصل تُو

کچھ زمیں کچھ تو لئے ہے اِن کی محنت کا ثمر — یہ جفاکش پیٹ پر نکلے ہیں پتھر باندھ کر

اے عدوئے نوعِ انساں حق تلف بیداد گر

خیر انھیں بھی چھوڑ دے تو اب خدا کے رحم پر

دیکھ مزدوروں کا دَور آیا ہے تیرے سامنے — اِن کا بگڑا وقت انھیں لایا ہے تیرے سامنے

بار اُٹھانے کو تری خدمت میں ہیں آئے ہوئے — چار پیسوں کے لئے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے

دیکھ تیرے رحم کا دروازہ اِن پر بند ہے — کیا اِسی بنیاد پر تو آج دولت مند ہے

دل بجھا کر یوں نہ دے تو اِن کو ناکامی کا داغ — اِن سے روشن ہے ترے قصرِ امارت کا چراغ

یہ وہی ہیں جن پہ ہے غلبہ کئے فکرِ معاش — یہ وہی ہیں جن کو ہے ہر روز روزی کی تلاش

یہ وہی ہیں جو کہ ہیں شاکیٔ قسّامِ ازل — جن کی ہے آزردگی تقسیمِ دولت کا عمل

یہ وہی ہیں جن کے ہاتھوں ہے تری دنیا کی موت — یہ وہی ہیں جن سے ہو جائے گا مقصد تیرا فوت

یہ وہی ہیں جن کا مستقبل مٹا دے گا تجھے　　اک نشانِ بے نشانی جو بنا دے گا تجھے
یہ وہی ہیں فتحیابی جن کی ہے تیری شکست　　بھول جانے والا ہے تو جلد اپنا بندوبست
یہ وہی ہیں جو اٹھائیں گے صدائے احتیاج　　ان کی قوت بڑھ کے پوچھیگی امارت کا مزاج
چھوڑ دے اس حال کو بھی ان کے استقبال پر
کر نظر ان کے سوا اوروں کے بھی احوال پر

دیکھ آیا کارواں وہ مختلف افراد کا　　رنج ساماں حال ہے ہر خانماں برباد کا
ان میں کچھ مظلوم بھی ہیں ان میں کچھ مغموم بھی　　شا کی مقسوم بھی، دولت سے ہیں محروم بھی
ان میں مفلس بیبیاں بھی ان میں بیوائیں بھی ہیں　　بیٹیاں بھی ان میں ہیں بہنیں بھی ہیں مائیں بھی ہیں
کچھ یتیم ان میں ہیں اپنی بیکسی کی یادگار　　بے وسیلہ، بے سہارا، بے بضاعت، بے دیار
دیکھ کتنے مبتلا امراضِ جسمانی میں ہیں　　طالب امداد ہیں، دورِ پریشانی میں ہیں
ان میں کچھ مفلوج بھی ہیں ان میں کچھ مدقوق بھی　　ان میں کچھ مسلول بھی ہیں ان میں کچھ محروق بھی
دیکھ کتنے ہیں گدا جو طالبِ امداد ہیں　　تیرے ایسے اہلِ زر کی بدنصیب اولاد ہیں
کتنے ہیں جن کے ہے کشکولِ گدائی ہاتھ میں　　جمع کرتے پھر رہے ہیں پائی پائی ہاتھ میں
دیکھ کتنے ہیں شریف ان میں جو ہیں تکلیف میں　　کتنے ہیں زار و نحیف ان میں جو ہیں تکلیف میں
کتنے ہیں جن کے لیے ہے بیکسی کی زندگی　　کر رہے ہیں جو بسر فاقہ کشی کی زندگی
کچھ نہ کچھ عاید ہیں سب پر تیرے شیطانی حقوق　　اور تو بھولا ہوا بیٹھا ہے انسانی حقوق
واقعاتِ ہند میں عبرت مگر تیرے لئے　　ہاں صلائے درد ہیں اے اہلِ زر تیرے لئے
کتنے رُخ بدلے ہیں اے بدکیش تیرے سامنے　　سب مناظر ہو چکے ہیں پیش تیرے سامنے
کس نتیجے پر تو پہنچا ہے بتا اے اہلِ زر
یہ تماشا تو نے دیکھا ہند کے اسٹیج پر

آغاز برہانپوری

اقبال اور ثاقب

مادرِ مشفقہ کی یاد میں

عطاءاللہ۔ پالوی

کلیم کے قلمی معاون جناب عطاءاللہ صاحب پالوی کے، اس مضمون میں اقبال اور ثاقب کے اشعار پر جو لفظی یا فنی اعتراضات ہیں، اُن سے سردست قطع نظر کرتے ہوئے یں صرف یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ فاضل مقالہ نگار نے ثاقب صاحب پر جو معنوی اعتراضات کئے ہیں مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ اظہارِ غم میں اعتدال کو فطری اور شدتِ غم میں نالۂ بے اختیار کو تصنع فرماتے ہیں، جو کم سے کم میرے نزدیک درست نہیں، اس لئے کہ ع ——— ہر کوئی درماندگی میں نالے سے مجبور ہے۔

ذرا اُس وقت کا تصور کیجئے کہ کسی عزیز کا جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے اور آخری دیدار کے واسطے مُنہ سے کفن سرکایا جا رہا ہے۔ اُس موقع پر منہ سے بے اختیار آہ نکلے گی یا آدمی نہایت سنجیدگی کے ساتھ موت کا فلسفہ گِنا رنے لگے گا؟ اقبال اور ثاقب کی نظموں پر شاعرانہ خوبیوں، اور اعلیٰ طرزِ بیان کے لحاظ سے رائے ظاہر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ اس قدر ضرور کہوں گا کہ جہاں تک فطرتِ انسان کا تعلق ہے جنازہ دل کے دھڑکنے کا مطالبہ کرتا ہے نہ کہ دماغ کی حرکت کا، اور لاش آنسو چاہتی ہے نہ کہ حکیمانہ الفاظ۔ اقبال نے لاش کے سامنے فلسفیانہ خطبہ دیا ہے اور ثاقب نے آنسو بہائے ہیں۔ اب یہ فیصلہ آپ پر ہے کہ دونوں میں کون فطری ہے اور کون غیر فطری۔

شاعری نام ہے اظہارِ جذبات، یا اُس طرزِ بیان کا جو جذبات کو برانگیختہ کر دے۔ جنابِ جوش نے فرمایا ہے کہ شعر میں اس قدر اثر ہے کہ:

آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب — پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں — قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں

ہوسکتا ہے کہ یہ تعریف مع مبالغہ سمجھی جائے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسے الفاظ جو خون میں ہیجانی کیفیت اور گرمی پیدا کر دیں "شعر" کہے جائیں گے اور اسی کا نام شاعری ہے۔ اور شاعر نام ہے اُس شخص کا جو جذبات کو ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ اس طرح پیش کرے کہ سننے والوں کے دل میں تیر و نشتر بن کر اُتر جائیں۔ چنانچہ جب ایک حقیقی اور فطری شاعر کسی ہنگامی واقعے سے متاثر ہوتا ہے تو اُس کے خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اُس کے جذبات بحر و وزن سے مرتب ہو کر شعر کی صورت میں اُس کی زبان سے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اِس میں اس کی تخصیص ہرگز نہیں کہ وہ جذباتِ طربیہ ہوں یا حزنیہ۔ جیسے واقعات ہوں گے ویسے ہی جذبات کا مدّ و جزر ہوگا۔ اور اُسی نوع کے اشعار نکلیں گے۔

اقبال نے اپنی مادرِ مشفقہ کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہو کر "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی جو بانگِ درا میں

شائع ہو چکی ہے اور مُلک کے چند ہی افراد ایسے ہوں گے جن کی نظر سے یہ نظم نہ گزری ہو گی، اسی عنوان کے تحت اور اسی طرح کے حادثۂ جانگاہ سے متاثر ہو کر جناب ابو محمد ثاقب کانپوری نے بھی ایک نظم لکھی ہے۔ ثاقب صاحب کوئی غیر معروف اور نو مشق شاعر نہیں، آپ دنیائے شاعری میں کافی شہرت کے مالک ہیں۔

اس موضوع پر جناب ثاقب کی نظم بھی کامیاب ہے، اور جن جذبات و اثرات کی حامل و ضامن ہے اہلِ بصیرت سے مخفی اور مستور نہیں۔ مگر میں آج کی صحبت میں یہ دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہوں کہ جب ایک ہی عنوان پر دو ماہرینِ فن نے طبع آزمائی کی تو کس نے کیا بات پیدا کی؟ کون کس قدر اور کس کس جگہ تحسین و آفرین کا مستحق ہے؟ اور کس کے کلام میں کیا عیوب و محاسن ہیں، اور وہ کس حد تک محلِ نظر ہیں؟ اس سے کسی کی تضحیک و تنقیص یا حمایت مقصود نہیں، بلکہ اظہارِ حقیقت مدِ نظر ہے۔

سب سے پہلے ابتدائی مضمون میں فلسفۂ موت کے متعلق دونوں شعراء کے خیالات ملاحظہ ہوں، جناب ثاقب ایک جگہ موت کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر اور معذور رہ کر فرماتے ہیں۔

موت کیا ہے؟ یہ سمجھنے سے بشر مجبور ہے
پردہ ہائے راز میں یہ راز بھی مستور ہے
موت کیا ہے؛ عقل اس ادراک سے مجبور ہے
موت کیا ہے؛ علم ہی اس علم سے معذور ہے
موت کی گتھی سلجھی عقل ہرزہ کار سے
چل رہی ہے ویسی ہی یہ بیش و کم رفتار سے

اقبال اس جگہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ اِس کو سلجھاتے ہیں، کہتے ہیں۔

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

آگے چل کر جناب ثاقب پھر موت کی گتھی کو سلجھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

موت کیا ہے؟ زندگی کی کاوشوں کا اختتام　　موت کیا ہے؛ اک حیاتِ تازہ کا گویا پیام
موت کیا ہے؛ ارتفاعِ روح کا اک نام ہے　　زلیست کا انجام صبحِ زندگی کی شام ہے
موت وہ ہے جس سے قائم ہے نظامِ کائنات　　موت رُوحِ مضمحل کے حق میں اک تازہ حیات
موت کیا ہے؛ تلخیٔ ایام کا شیریں ثمر　　موت کیا ہے ایک میٹھی نیند کا دلکش اثر

بلاشبہ اک، اک مصرعہ نہایت خوب ہے، اور موت کی گتھیاں ایک حد تک سلجھی بھی ہیں۔ مگر مضمون طویل ہو گیا، حالانکہ کمال شاعری بڑے سے بڑے خیالات اور بڑے سے بڑے مضامین کو مختصر کم الفاظ میں ادا کرنا ہے یا بہ الفاظ دیگر یہ کہئے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا در اصل شاعری کی معراج ہے، جن خیالات کو جناب ثاقب نے چار شعر میں کہا ہے، اقبال نے ایک شعر میں ادا کیا ہے، فرماتے ہیں۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اقبال کا پہلا مصرع ثاقب کے اول الذکر دونوں اشعار کی معنویت کا حامل ہے، اور دوسرا مصرع آخر الذکر دونوں اشعار کی ترجمانی کرتا ہے۔

چکبست نے بھی موت و حیات سے متعلق ایک شعر کہا ہے جو بہت مشہور ہے، اور اس میں اُنھوں نے فلسفۂ موت و حیات کا طویل و لاینحل مسئلہ جس حد تک حل کیا ہے، لائقِ صد ستائش ہے، فرماتے ہیں۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

مگر اس میں بھی وہ بات نہیں جو اقبال کے شعر میں ہے، کیونکہ اقبال موت کو ایک نئی روحانی زندگی بتاتے ہیں جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے، اور جناب چکبست جسدِ خاکی کو مع رُوح اسی دنیا میں دفن کر دیتے ہیں اور موت و حیات کو صرف ترتیبِ اجزا بتاتے ہیں، برخلاف اُس کے جگر مراد آبادی نے ایک حد تک اچھا شعر کہا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہے خواب، اجل تعبیرِ خواب

اس شعر اور اقبال کے شعر میں کیا مناسبت ہے، یہ نہ تو کھول کھول

کر جانے کی ضرورت ہے، اور نہ اُس کا موقع ہی ہے۔

جنابِ ثاقبؔ اپنی مادرِ شفیقہ کے سانحۂ ارتحال کو ایک نئی اور اپنے لئے مخصوص مصیبت تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چاند کی ہو ضو فشانی، چاندنی کے ساتھ ساتھ — اور تاروں کا تبسم دلکشی کے ساتھ ساتھ
مدِ روشن شب کی تاریکی سے ہم آغوش ہو — قطرہ قطرہ بحر سے مل کر سراپا جوش ہو
نکہتِ گُل ہو چمن کی وسعتوں میں عطر بیز — ہوں شعاعیں سطح پر دریا کی آکر عکس ریز
شمع کو نسبت ہو جلنے میں پروانوں کے ساتھ — بادۂ پُر جوش وابستہ ہو پیمانوں کے ساتھ
ہاں فقط دنیا میں محرومِ تمنا میں ہوں — اس فلک کے سائے میں برگشتہ قسمت میں ہوں

ماں کی جدائی اور وہ بھی دائمی، بلاشبہ بیحد دردناک اور غم انگیں ہے، لیکن یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں، ساری دنیا کا اسی چلن پر مدار ہے۔ اس لئے قرآنی آیت كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کو پیشِ نظر رکھ کر ماں کی موت پر اس انداز میں نوحہ کرنا مستحسن نہیں۔ اقبال کا نوحہ اس عیب سے پاک ہے وہ موت کو عام اور برحق سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں۔

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر — آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت — گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں — کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت — دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں — ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں

کہتے ہیں کہ موت برحق ہے اور ہر شخص کے لئے ہے، اس دارِ فانی کا کوئی فرد، اس کی کوئی شے اور اس کی کوئی چیز فنا ہونے سے بچ نہیں سکتی، چاہے وہ کہیں ہو، کہیں جا کر پناہ لے اور کسی طرح کی تدبیر کرے، یہ خدائی قانون اپنی جگہ اٹل ہے۔ اور اس جگہ انسان بالکل مجبور ہے۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے — پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں — انجمِ سیماب پا رفتار بھی مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں — سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں
نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر — ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر

اقبال موت کو برحق اور ناقابلِ رستگاری سمجھتے ہوئے کتنے خوبصورت الفاظ میں صبر و سکون کی تلقین کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے — زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے
قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں — اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں — خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

بلاشبہ یہ تین شعر سکون و طمانیت کے لئے کافی ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ "مجبوری کا نام شکر ہے"۔ مگر مصرعِ آخر میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ سیلِ اشک "دل" میں خشک ہو جاتا ہے، حالانکہ "اشک" کو "دل" سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ صرف "آنکھ" سے تعلق ہے۔ چنانچہ خود ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

پھر ایسی صورت میں اقبال کا مصرعۂ آخر کس حد تک صحیح ہے، یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

بالعموم سانحۂ ارتحال اور بالخصوص مادرِ مہربان کی دائمی مفارقت جانستاں معلوم ہوتی ہے۔ مگر اظہارِ غم میں اعتدال ضروری ہے۔ ورنہ غم بجائے حقیقی غم کے مجازی اور تصنع معلوم ہوگا۔ جنابِ ثاقبؔ اظہارِ غم میں ذیل کے اشعار نظم کرتے وقت حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نظم میں تصنع کا دخل ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سوچتا ہوں اس فضا میں واقعاتِ زندگی — کس قدر تھی شعلہ برپا کائناتِ زندگی
میں وہی ہوں گھر وہی ہے اُس کے بام و در وہی — ہے وہی نقشہ جہاں کا اور وہ منظر وہی
ہاں مگر دنیا کو اب بدلا ہوا پاتا ہوں میں — اُس کی ہر اک دلکشی سے آج گھبراتا ہوں میں
جی نہیں لگتا ہے اس دُنیائے غم آباد میں — ہو مسرت پھر کہاں سے عالمِ برباد میں
بن گئی ہے موجبِ غم اُس کی ہر اک دلکشی — "ماں" نہیں ہے اب تو بے کیف ساری زندگی

آخر الذکر دونوں اشعار میں مبالغہ کا عنصر بغایت موجود ہے، بلاشبہ اپنے عزیزوں کی موت کا غم ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ مگر دنیاوی طریقہ اور

میں نے یہ مانا کہ تو اب رنج سے آزاد ہے روح تیری جنت الفردوس میں آباد ہے
دل کہاں پائے گا لیکن تیری الفت کے مزے مجھکو یاد آتے رہیں گے تیری شفقت کے مزے

آہ اے ماں خاطرِ بیتاب کی تسکیں تھی تو گو بظاہر خوش تھی لیکن درد سے غمگیں تھی تو
آرہا ہے یاد مجھکو عہدِ طفلی بار بار جبکہ تھی محدود میری زندگی مستعار
تھا سکونِ مستقل، حاصل تری آغوش میں رو کے سو جاتا تھا میں اُس دمعتِ خاموش میں
عطر سے بڑھکر تھی تیرے جسم کی خوشبو مجھے مایۂ کونین سے افضل تھی یعنی تو مجھے
تیری ہر کروٹ میں تھا آرام کا میری خیال تھی مری افسردگی تیرے لئے وجہ ملال

یا رب یہ اشعار اس قدر سچے اور اس درجہ پُر درد اور مؤثر ہیں کہ سخت سے سخت دل بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عہدِ طفلی میں ماں کی شفقتوں کی اتنی سچی اور مکمل منظر کشی کی گئی ہے کہ بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اور بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔

"مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے" یہ کسی کو نہیں معلوم۔ البتہ مرنے والے کے ذاتی صفات کی بناء پر لقدر طاقت خود ہی کہنا پسند الکہ "ورنہ اللہ کی بات اللہ ہی جانے۔ چنانچہ ثاقب اپنی والدہ مشفقہ کے ایمانی کارناموں کے نتائج کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

دل میں برپا ہوتا ہے جب کا برہ عقوز وگداز آسماں کے مجھکو دروازے نظر آتے ہیں باز
دیکھتا ہوں نور پاشی میں حجاب اندر حجاب یعنی جلوے رقص و لرزش میں نقاب اندر نقاب
دیکھکر تیری عبادت کا یہی یہ پیشِ نظر غم سے اک لمحے کو ہو جاتا ہوں اپنے بے خبر

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کن خوبیوں کا حامل ہے، یہ میری سمجھ سے باہر ہے اور مجھے اپنی نقد انیال کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اس مصرعے سے کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔ دوسرا مصرع خیر ایک حد تک غنیمت ہے، مگر بالکل بے کیف کوئی خاص بات اس میں بھی نہیں۔ بجز اس کے کہ چند بڑے بڑے الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ میری دانست میں تیسرے شعر کی وضاحت ہرگز اس شعر سے نہیں ہوتی۔ دوسرے دو راز حقیقت واقعات کا عنصر اس میں بھی موجود ہے۔ مثلاً دروازۂ آسمان کا باز ہونا یا جلوے رقص و لرزش میں نقاب اندر نقاب نظر آنا وغیرہ، برخلاف اس کے اقبال نے اس مفہوم کو بڑی سادگی اور خوبصورتی سے ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

پہلے مصرعے سے زندگی کی خوشگواری اور دوسرے مصرعے سے بآسانی سفر آخرت کا صاف پتا چلتا ہے، جو اعمالِ صالح کی جزائے اولیں کا بین ثبوت ہے۔

آخر میں اقبال نے دعائیہ اشعار پر اپنی نظم ختم کی ہے، فرماتے ہیں۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال جہاں قدرت سے قبر کو فروزاں کرنے کی استدعا کرتے ہیں وہاں فطرت سے اُس قبر کو قائم و دائم رکھنے کی بھی استدعا کرتے ہیں، جبکہ فروزاں کرنے کی دعا کی گئی ہے۔ قبر کی تاریکی ضرب المثل ہے، ایسے موقع پر مرقد کے فروزانی کی جو تصویر "مثلِ ایوانِ سحر" کہہ کر کھینچی گئی ہے۔ داد سے مستغنی ہے اور پھر قبر کے ظاہری شکل کو قائم رکھنے کی جو آرزو کی گئی ہے وہ عین فطرت ہے، اور اس طور پر اقبال مرقد اور اہلِ مرقد مکان اور مکین دونوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح جناب ثاقب بھی اپنی نظم دعائیہ شعر پر ختم کرتے ہیں، مگر وہ بات نہیں۔ فرماتے ہیں۔

سایہ گستر رحمتیں ہوں قبر پر تیری مدام برکتیں نازل ہوں تیری روح پر ہر صبح و شام

پہلے مصرع میں رحمتوں کے قبر پر سایہ گستر ہونے کی دعا کی گئی ہے۔ حالانکہ اگر رحمت کی دعا صاحبِ قبر کے لئے ہوتی تو البتہ مستحسن تھا۔ ورنہ صرف قبر کے لئے رحمتوں کی بارش کی دعا بے معنی محض ہے۔

بہر کیف مری حقیر رائے ان صفحات کی صورت میں حاضر ہے اب اہلِ نظر دیکھیں اور پرکھیں کہ میں کس حد تک صحیح اور غلط ہوں میری ان دو حضرات میں کسی سے بھی ملاقات یا راہ و رسم نہیں اور نہ کسی سے مجھے خدانخواستہ بغض و عناد ہے، میں نے صرف ادبی حیثیت سے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ اور جس کے کلام میں مجھے جو عیوب و محاسن نظر آئے میں نے نیک نیتی سے اُن کو ظاہر کر دیا ہے۔ یہ ایک بے لاگ تنقید ہے جس میں تعصب یا حمایت بیجا کو ذرا بھی دخل نہیں۔

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
(غالب)

اسرائیل احمد خان سکندرآباد دکن

(مسلسل)

(۳)

لارڈ ڈیوڈ ڈری مائر!

لارڈ کلینکارلی ہمیشہ سے کہن سال اور تباہ حال اور برگشتہ اقبال نہ تھا۔ وہ بھی جوانی کی بہشتِ رنگینی کی گلگشت کرچکا تھا! عورتوں کے ساتھ عشقبازیوں اور صنفِ نازک کی نازآفرینیوں اور نیازنوازیوں سے وہ بھی تجربہ کش ہوچکا تھا! خود کرامویل ایسے متین و متقی مُرشدِ طریقتِ سیاست کا عہد شباب بھی اِس مذاقِ بشری سے مُعرّیٰ نہ رہا تھا! ع

کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں ذوقِ گنہ اُس فیضِ ازل سے کوئی محروم نہیں!

کلینکارلی کے اک لڑکا بھی تھا جو دَورِ جمہوریت کے آخری ایام میں پیدا ہوا تھا اِس نوزائیدہ بچے کی دنیا میں آمد اور کلینکارلی کا مُلک سے اخراج قریباً ہمعصر واقعات ہیں! چنانچہ بیٹا باپ کی صورت سے کبھی آشنا نہ ہوا، اور بعد میں تو اُس نے ایسی ناخلفی کا بھی ثبوت دیا کہ نووارِدِ تخت و تاج شاہ چارلس کے مُقرّبین میں داخل ہوگیا! اِس فرزندِ ارجمند کو "لارڈ ڈیوڈ ڈری مائر" کا طویل الذیل خطاب مرحمت ہوا! اور یہ محض اپنی والدۂ ماجدہ کے طفیل میں، جو ایک حسین و مہجبین عورت تھی، — جس کی نزاکتِ حُسن اپنے شوہر کے دَورِ اِدبار کی اُفتاد کے وقت اُس کے ساتھ اپنے عہدِ وفا کی تاب نہ لاسکی! اُس نے اپنے پہلے عاشق کے ساتھ پیمانِ اوّلین تازہ کیا! — اور یہ پہلا عاشق وہی شخص تھا جو اِس وقت خود انگلستان کی "عروسِ مُلک" کو کنارگیر کرچکا تھا! یعنی شاہ چارلس!

الغرض یہ عورت بادشاہ بیگم بن گئی۔ چارلس کی اقبال مندی و فاتحکاری کے کیا کہنے کہ جمہوریت کے اک زبردست اور صاحبِ استقامت عَلَم بردار کی بیوی، اور بیٹا دونوں اُسے مالِ غنیمت میں ملے! ع

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم!

خاتونِ موصوف نے اپنے غیر معمولی حُسن و جمال کی بدولت بادشاہ کے دل پر حقوقِ حکمرانی حاصل کرلئے! اُس کا بیٹا (لارڈ ڈیوڈ) گوناگوں خطابات و اعزازات کا حامل بنا، اور معتمدانِ خاص میں داخل ہوکر بکثرت شاہی خدمات پر مامور ہوا۔ اُدھر باپ عالمِ جلاوطنی میں سوئزلینڈ کے اک گوشۂ تاریک کے اندر اک بومِ عزلت گزین کی طرح اپنی حیاتِ تلخ کے باقی دن کاٹ رہا تھا، اور اِدھر بیٹا شاہی دربار و محلات میں عیش و نشاط اور اعزاز و اکرام کی شادکام زندگی بسر کررہا تھا! ع

حیف، گر در پسِ امروز بود فردائے!

ہنری ہشتم اور جیمس دُوم کے عہدِ سلطنت میں بھی وہ اِسی رسوخ و تقرب سے مُفتخر رہا۔ کیوں نہ ہو، شاہ پرست ابن الوقتوں کا تکیۂ کلام تو یہ ہوا کرتا ہے کہ:۔

"بادشاہ نے وفات پائی، — زندہ باد بادشاہ ما!!"

ڈیوک آف یارک کی تخت نشینی کے وقت لارڈ ڈیوڈ کے ہمسرانہ خطابات

میں ایک طرۂ افتخار کا اور اضافہ ہوا۔ یعنی اپنی ماں کی وفات کے بعد اُس کی شخصی
متروکہ جاگیر واقع اسکاٹلینڈ کا بھی وارث بنا، اور اسی ریاست کی ملکیت کے انتساب سے
اُس کا نام نامی و اسم سامی اب "لارڈ ڈیوڈ آف ڈری مائر" قرار پایا! آہ اس کا
بے نام و ننگ اور نہنگ باپ! ع

تو و قطعِ منازلہا من و یک لغزشِ پائے!

(۴)

امارت و مناصب!

جیمس ثانی اگرچہ بادشاہ تھا لیکن خود بدولت کو جنرل بننے کا شوق تھا!
تختِ شاہی پر نشست حاصل کر لینے کے بعد ہر مرتبہ و مقام تک "جست" آسان ہو جاتی
ہے! چنانچہ نوجوان فوجی افسروں کی جھرمٹ میں وہ جوشن و چار آئینہ میں ملبوس
اور خود و زرہ سے محفوظ، اسپ خاصہ پر سوار نکلا کرتا تھا! لارڈ ڈیوڈ کا شاندار پیکر
اُس کی آنکھوں میں کھبا جاتا تھا! وہ بیش از بیش اُس کی بانکی اور سجیلی طرح اُڑانے
کی کوشش کیا کرتا! ساتھ جمہوریت کی یہ اک قیمتی متاع بھی ہو لارڈ موصوف کی شخصیت
کے وجود میں انگلستان کے بحال شدہ خانوادۂ شاہی کو خداداد ملی تھی!

لارڈ ڈیوڈ کو اب خوابگاہ ہمایونی کا معتمد بنایا گیا جو معراجِ قاب قوسین
کی سمت میں اک بڑی پرواز تھی!

یہ غایت درجہ تکریم و نوازش کا منصب تھا۔ یہ عہدہ دار، شاہی بستر استراحت
کے پاس ہی اک پلنگ پر سویا کرتا ہے، اور بارہ آدمی شب میں باری باری ایک
دوسرے کو سبکدوش کیا کرتے ہیں!

لارڈ ڈیوڈ توشہ خانے کا بھی سپرد دار تھا، اور میر آخور بھی! ان مزید
فرائض کی بجاآوری کے صلے میں اُسے مزید مشاہرہ ملتا تھا۔ اصطبل کا تمامی عملہ اور
اکثر شاہی پیشہ خدمت اُس کے ماتحت تھے۔ شرط کے گھوڑوں کی داشت و پرداخت
کا کام بھی اُسی کو تفویض تھا۔ یہ سلطانی تربیت گاہِ اسپ مقام نیومارکیٹ میں واقع
تھی۔ صرفِ خاص کے جس صیغے سے اُمرا و اعیان کو خلعت عطا کئے جاتے تھے وہ بھی
لارڈ ڈیوڈ ہی کے زیر اہتمام تھا۔ بادشاہ سلامت کی پیشی خاص کے سررشتے کے ساتھ
وابستگان اُس کو کورنش بجا لاتے تھے۔ انگلستان کا پُرشوکت دربار مہمان نوازی
میں اپنی نظیر آپ تھا۔ لارڈ ممدوح ان شاہی ضیافتوں کا سربراہکار اور پذیرائی
کی صحبتوں کا پردہ دار بھی ہوا کرتا تھا۔ بیشتر پبلک تقریبات میں وہ ذاتِ شاہانہ کی
عین پس پشت کھڑا ہوتا تھا! لارڈ ڈیوڈ ہی پنجشنبہ مبارک کے دن اُن بارہ غریبوں کو
حضور ہمایونی میں پیش کیا کرتا تھا جن کو ظلِ سبحانی اپنی مدتِ جلوس کی سالوں کے
ہم تعداد نقرئی سکے ارزانی فرمایا کرتے تھے! جب کبھی نصیبِ دشمناں بادشاہ سلامت
بسترِ علالت پر ہوتے تو یہ فرض بھی اُسی کا ہوتا کہ دو پادریوں کو شاہی اطاق علالت میں
حاضر کیا کرے اور مجلسِ مملکت کی منظوری کے بغیر اطبا کو باریابی و مزاج پرسی کی
کی اجازت نہ دے!

لارڈ ڈیوڈ اسکاچ رجمنٹ میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر بھی فائز تھا اور
اس حیثیت سے متعدد معرکوں میں دادِ شجاعت دے چکا تھا۔ وہ بے نظیر سپاہی
تھا، اک خوشرو انسان، اک خوش پیکر جوان، اور اک فیاض و دریا دل امیر!
وہ بیک وقت رفیع المنزلت اور بلند قامت واقع ہوا تھا!

ایک دفعہ ایسا موقع آیا کہ لارڈ ڈیوڈ کو چشم بد دور وہ منصب عطا
کیا جانے لگا جس کا ایک فریضہ شاہ ذیجاہ کو قمیص زیب تن کرانا بھی ہوتا تھا! لیکن اس
امتیاز کے لئے شہزادگی یا اقل درجہ، درجۂ اول کی امارت کی شرط تھی۔ اس عطائے
امارت کا معاملہ بہت نازک تھا۔ اس سے بہت سے اُمیدواروں کے دل میں
رقابت اور عداوت کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ اس اعزاز کی غلط بخشی سے
اگر بادشاہ کو ایک طرف اک ممنون و مکرم، جان نثار امیر ہاتھ آتا تو دوسری طرف
دل برداشتہ اُمراء کے حلقے میں متعدد دشمنانِ جانستان پیدا ہو جاتے! اس قباحت سے
بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ امارتوں کے انتقال سے کام لینے کی جدت
اختراع کی گئی۔ اس طریقے سے بادشاہ کو اپنی غایتِ مقصود بھی حاصل ہو جاتی تھی
اور دربار کے آئین میں کسی اصولی و انقلابی تبدیلی کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی!
اسی راہ سے لارڈ ڈیوڈ کو دربار شاہی کے طبقۂ علیا میں پہنچا دینے پر ارکانِ
بزمِ سلطانی کو کوئی اعتراض یا شکایت نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اب بادشاہ لارڈ
مذکور کو مستقل امارت دے کر اپنی اک محبوب دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کے کسی موقع کا
منتظر تھا!

(۵)

بہت جلد یہ حالتِ منتظرہ بھی ختم ہو گئی اور اک موقع رونما ہو گیا۔

لارڈ کلینکارلی کی موت کا اعلان گوش زد ہُوا، لارڈ متوفی کی وفات نے
اُسے "قیدِ حیات" اور "بندِ غم" دونوں سے آزاد کر دیا!

کلینکارلی کی رحلت کے چند روز قبل اور چند روز بعد کے واقعات پر مختلف
لوگوں نے مختلف خیال آرائیاں کیں۔ مگر یہ سب از قسمِ افسانہ تھیں۔ اگر ان بادہوائی
قصوں پر اعتبار کیا جائے تو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ لارڈ کلینکارلی اپنی زندگی کے
آخری دَور میں اور بھی غالی جمہوریت پرست ہوگیا تھا! یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اُس نے
اَیَن بریڈشا نامی اک عورت سے شادی بھی کی تھی! اور اس عورت کے بطن سے
اک لڑکا بھی پیدا ہُوا تھا! روایتِ عام کی بنا پر وضعِ حمل کے وقت خود ماں جاں بحق
ہوگئی تھی! اگر یہ حکایات صحیح تھیں تو اس لڑکے کو لارڈ کلینکارلی کا جائز وارث
ہونا چاہیئے تھا! لیکن خبریں سخت مبہم اور باہم متضاد تھیں اور اُن پر بجائے
خبروں کے "افواہوں" کا اطلاق زیادہ موزوں تھا! سوئٹزرلینڈ کے واقعات و واردات
اُس عہد کے وسائل رسل و رسائل کے لحاظ سے انگلستان کے لئے ویسی ہی دور کی
باتیں تھیں جیسے کہ آج انیسویں صدی کے اواخر میں مشرقِ بعید و چین کے حوادث
برطانیہ کے لئے! لارڈ کلینکارلی کا نکاحِ ثانی، ولادتِ فرزند، اور ان ہر دو وقوعوں
پر اُس کی عمر کا مزعومہ تعین، اگرچہ یہ سب باتیں غیر ممکن نہ تھیں، تاہم غیر اغلب
ضرور تھیں! لوگوں کا یہ بھی بیان تھا کہ کلینکارلی کا نوزائیدہ بچہ ایسا ہی سُرخ و سفید
اور وجیہہ و شکیل ہے جیسا کہ اک "امیر ابنِ امیر" کو ہونا چاہیئے!

لیکن آخر کار ان سب یادہ گوئیوں اور داستان سرائیوں کو
حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا، اور ایک دن اک خوشنما منظر صبح کی ساعتِ خوش
طالع میں شاہ جیمس نے جریدۂ سلطانی میں یہ "فرمانِ قضا جریان" شائع کرایا کہ:-

"چونکہ لارڈ کلینکارلی کا انتقال ہوگیا ہے،
اور اُس کا کوئی اور بیٹا نہیں ہے، لہذا لارڈ
ڈیوڈ اُس کا تنہا فرزند، اُس کا وارث قرار
دیا جاتا ہے، اور اپنے باپ کے جملہ خطابات و القاب
اور حقوق و مراعات کا حقدار بنایا جاتا ہے!"

مگر یہ استحقاق و وراثت اک خاص شرط سے مشروط تھا! اور وہ یہ کہ لارڈ ڈیوڈ
عند الوقت ایک لڑکی کو اپنے حجلۂ عروسی کی صدر نشین بنائے جو ابھی گہوارۂ شیرخوارگی میں
جھول رہی تھی، اور جسے بادشاہ نے اس مجوزہ رشتے کے اعلان کے ساتھ ہی "ڈچز"
(ڈیوک بیگم) بنا دیا تھا!

اس نسبت و کتخدائی کے متعلقہ "رموزِ مملکت" بادشاہ ہی کو معلوم تھے، یا
یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اک "رازِ فاش" تھے!

یہ ننھی بچی ڈچز جوزیانہ کہلاتی تھی!

بہت سے عظیم حوادث کی تہ میں اِس چھوٹی سی لڑکی کا وجود کارفرما تھا!
اس وقت وہ خود امیر تھی، جب اس کی شادی ہوگی اس کی امارت اس کے شوہر کو منتقل ہو جائیگی
اعزاز و افتخار دو خانوادہائے امارت کے دونو امتیازات کے قِران کا
مظہر ہوگا!

لیڈی جوزیانہ کی ذاتی دولت و حشمت بھی بڑی گراں قدر اور بلند مرتبت
تھی۔ اس کا بیشتر حصہ ان عطیات سے ملا تھا جو مادام سان کوین نے ڈیوک آف
یارک کو عنایت کئے تھے۔ یہ مؤخر الذکر بیگم بہت ہی رفیع الشان خاتون تھی
فرانس کے دربار میں ملکۂ معظمہ کے بعد اُسی کی پایگاہ سمجھی جاتی تھی۔

(۶)

شاہان چارلس و جیمس کے بعد لارڈ ڈیوڈ نے شاہ ولیم کا دورِ حکومت
دیکھا! اس عہد میں اُس کا اعزاز و اکرام اور بھی المضاعف ہوگیا! اس کے
یعقوبی معتقدات اتنے قوی نہ ثابت ہوئے کہ وہ شاہ جیمس کی جلاوطنی کے ایام
میں اُس کی رفاقت کرتا! باوصف شاہ معزول کی ساری ارادت و عقیدت
کے وہ اتنا وقت شناس ضرور تھا کہ اُس نے غاصبِ تاج و تخت ولیم سے سرتابی
اختیار نہ کی! ع

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود!

لارڈ ڈیوک اک مثالی فدائی شاہان تھا! وہ اک ہرفن مولا افسر بھی تھا
اب اس نے اپنی خدمات فوجِ برّی سے عساکرِ بحری میں منتقل کرالیں، جہاں
"جیشِ ابیض" میں منسلک ہو کر اُس نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ اک مختصر سی
قامت کے جہاز کے کپتان کی حیثیت سے اُس نے صیغۂ بحریہ کے تمام بالائی مدارج
و مناصب پر سرافرازی پائی۔

وہ محفل کے اندر اک دلفریب شخصیت تھا۔ حسین گناہوں سے چندا ں

اجتناب نہ رکھتا تھا! شعر و سخن سے بھی بلاشبہ ذوق تھا! سب سے زیادہ یہ کہ وہ ازل سے
قربِ سلطانی و امیر کے لئے مخلوق ہُوا تھا! وہ اک "مادر زاد شاہ پرست تھا! بادشاہوں
اور شہزادوں کے لئے بہترین ندیم تھا۔ دعوتوں اور ضیافتوں، جلسوں اور جلوسوں
کے اہتمام و انصرام کی صفِ اوّل میں نظر آیا کرتا تھا خواتین کی پذیرائی و دلداری کے
محل میں وہ ہمہ تن شیر و شہد تھا! وہ بزم کا مسند نشین تھا اور رزم کا عَلَم بردار!
بڑا یار باش اور مجلس طراز تھا۔ اپنے دوست احباب سے بہت متواضع تھا
لیکن بحیثیت امیر کے بڑا پُر نخوت و رعونت! وہ پہلی ملاقات میں تو بے تکلفی اور
زود آشنائی کا اظہار کرتا تھا مگر پھر جلد اپنے سر کے گرد اک "ہالۂ عظمت" قائم کر لیتا
تھا! بادشاہوں کا بڑا مزاج داں تھا اور اُن کے "تسلیمے رنجیدن" اور "بدشنامی
خلعت دادن" کی مطلق العنانیوں اور طفلانہ ادائیوں کا پورا محرمِ راز!
بادشاہ کی مرضی پاکر آگ میں کود پڑنا، اور سلطانی اشارۂ چشم و ابرو پر نوکِ تیغ و خنجر پر
اپنا سینہ رکھدینا، ان سب فرض شناسیوں میں وہ خوب طاق تھا!

لارڈ ڈیوڈ اپنے ماتحتین و متعلقین پر بڑے بڑے عتاب کر لیتا تھا۔ لیکن
دل آزاری اور غریب کُشی کا ارتکاب اُس سے ناممکن تھا! علمِ مجلس میں مہارتِ تام
رکھتا تھا۔ وہ اوپر سے "خواجہ" تھا، اور اندر سے "خواجہ سرا"!

اب اُس کی عمر "چہل سالگی" سے متجاوز تھی، لیکن توئی کی تازگی کے اعتبار سے
بالکل جوانِ رعنا معلوم ہوتا تھا!

لارڈ ڈیوڈ فرانسیسی غزلیں بڑے والہانہ آہنگ سے گایا کرتا تھا اور
شاہ چارلس اُس کے اس تفننِ طبع سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ وہ فصاحت و بلاغت کا
ذوق آشنا تھا، ادبی محاسن کا لذت کش تھا، اور اُن خطباتِ تعزیت کا بڑا مداح
تھا جو باسویٹ نے جنازوں کی تقاریب پر دیئے ہیں!

اُس کی ماں کا ترکہ ـــــ ۱۰ ہزار پونڈ سالانہ ـــــ اس قدر
کافی تھا کہ وہ با فراغت امیرانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن اپنی شاہ خرچیوں کے
خمیازے میں وہ معتدبہ طور پر مقروض ہو چکا تھا۔ تزک و احتشام، کرّ و فرّ،
جملہ لوازمِ امارت، اُن کی جدت و ندرت، اور عام اسراف و تبذیر میں کوئی
امیر اُس کا حریف نہ تھا۔ پھر جونہی کسی نے اُس کی طرح اُڑائی اور اُس نے اُسے
ترک کر دیا! وہ گھوڑے کی سواری میں ذرا کھیلتے ہوئے بوٹ استعمال کیا کرتا تھا!

اُس کے ہیٹ کی ہیئت اپنی نظیر آپ تھی! اُس کی کُلاہ کے طُرّے اور قبا کے
دامنوں کی سنجابیں ایسی ہوتی تھیں کہ کہیں دیکھیں نہ سُنیں! اور یہ سب خصائص
و نوادر اُس کے ایجاد بندہ تھے! الغرض وہ امتیازِ فائق کا مظہر بننا چاہتا تھا
جو زبانِ خلق سے بخراجِ تحسین حاصل کر سکے کہ ع
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی!

(۷)

ڈچیز جوزیانہ!

۱۷۰۵ء کا سال ہے۔ لیڈی جوزیانہ کا سنِ چشم بد دور اب اگرچہ تئیس سال
ہے اور لارڈ ڈیوڈ کی عمر چوالیس سال، لیکن ہنوز شادی کا انعقاد نہیں ہوا ہے!
بہترین دلائل اس التوا کے مؤید تھے!

کیا اُن کے درمیان محبت نہ تھی؟ حاشا و کلا! لیکن بات یہ ہے کہ جو چیز
اپنی ہو جاتی ہے اُس پر کلی قبضہ و تصرف کے لئے انسان کے دل میں کوئی اشتیاق
یا عجلت باقی نہیں رہتی! جوزیانہ ابھی دوشیزگی کی آزادی سے اور لطف اندوز
ہونا چاہتی تھی! اور لارڈ ڈیوڈ بھی ابھی جوان رہنا چاہتا تھا! عقدِ نکاح کی تاخیر
کو وہ توسیعِ شباب سمجھتا تھا! متوسط عمر کو پہنچے ہوئے کنواروں کا یہ خاص دور تھا!

ہر زمانہ و زمین میں فیشن ایبل بننا سب باتوں سے بالا سمجھا جاتا ہے۔ لارڈ
ڈیوڈ اک جلیل الشان جوان تھا، لیکن جمال و جلال کے ساتھ اکثر یہ خطرہ
لاحق حال رہا کرتا ہے کہ آدمی کہیں "خُشک" نہ ہو جائے! تاہم لارڈ ڈیوڈ اس عالمِ بدلگامی
و بدمذاقی سے محفوظ تھا۔ وہ آزادانہ قماربازی کرتا، بے تکلفانہ "باکسنگ" کھیلتا، اور
لاابالیانہ اپنے اوپر قرضے کے انبار لگاتا! کتّوں، گھوڑوں، اور گوناگوں کھیلوں میں
اُس کی خرچیوں اور زرپاشیوں سے جوزیانہ بہت مرعوب تھی! لارڈ ڈیوڈ،
ڈچیز موصوفہ کے اس حسنِ ظن پر شاکرانہ آداب بجا لاتا، بہ پیرایہ:۔

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ؟!

اس دوشیزہ کے عذارِ صبیح، طلعتِ مہتاب سے زیادہ بے داغ تھے
مگر اپنی عالی نسبتی اور شاہانہ دماغی میں وہ آفتاب سے زیادہ پُرجلال تھے!
اُس کی ذات محفل پر فسوں طرازی کرتی! اُس کے حضور میں براہ راست باریابی
سے ہوس بھی لرزہ براندام ہو جاتی! لارڈ ڈیوڈ بھی اپنے عاشقانہ قصائد میں جوزیانہ

کے ساتھ صرف "تشبیب" کی جرأت کر سکتا تھا! ان "منشآتِ تغزل" کو کبھی کبھی اس نا طورۂ عالم فریب کی زبانِ ناز سے پڑھے جانے کا افتخار نصیب ہوا کرتا! اپنے ان لہانی ترانوں میں لارڈ ڈیوڈ اکثر اس طرف کنایہ کیا کرتا تھا کہ "جوزیانہ سے ہم آغوش ہونا گویا ستارۂ زہرہ کی معراج حاصل کرنا ہے!" —— مگر یہ معراجِ عشق سال بسال معرضِ التواء میں پڑتی چلی جاتی تھی! ہر نئی سال کی تقویم جو اس "جوزائے محبت" کے وصال کے "آثارِ سعد" سے خالی پائی جاتی اک "تقویم پارینہ" نظر آتی! ؎

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض؟
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے!

لارڈ ڈیوڈ اگرچہ جوزیانہ کے حریمِ دل کا مالک تھا، لیکن وہ اس حرمِ محترم کے اندر بلا اِذن داخل ہونے کی بے ادبی نہ کر سکتا تھا، بلکہ خادمانہ و نیازمندانہ اُس کے سنگِ آستان پر جبہہ سائی ہی پر اکتفا کیا کرتا تھا! دربار کے حلقوں میں عاشق و معشوق کی اس خود ساختہ کردہ ہجر و فرقت کے لطیف ذوق کی بڑی داد دی جاتی تھی۔ لیڈی جوزیانہ کہا کرتی تھی کہ "یہ بڑی بدمذاقی ہوگی اگر مجھے ازدواجِ عشق کے لئے تحکمانہ دعوت دی گئی! میں اک غیر معلومہ مدت تک اُس کے ساتھ بجائے تعقیل حبالۂ زوجیت کے، ریشمی رشتۂ محبت ہی سے وابستہ رہنا چاہتی ہوں!"

جی بھر کے بزمِ عیش میں ارمان نکالنا
او چھا سا اک خیالِ پریشاں سا خواب ہے!
حسرت نکل گئی تو ہے ناکامیابِ دل،
حسرت مچل رہی ہے تو دل کامیاب ہے!

جوزیانہ اک کشیدہ قامت پیکرِ نسائیت تھی۔ اُس کے دامگاہِ محبت زلف و کاکل کے بالوں کا وہ رنگ تھا جو لُغاتِ حسن میں "طلائی سرخ"، کہلاتا ہے! اُس کے اعضائے بدن تر و تازہ، سیراب و شاداب، ملائم و گداز تھے! اپنی تابش تن میں وہ سیج مچ زریں پردا "واقع ہوئی تھی! پھر اپنی صورت و سیرت میں بھی اِس کی مصداق کہ ؎

از خوئے ناخوش دوزخ ہیبیے! وز روئے دلکش مینو لقائے!

وہ بڑی ذہین و فطین اور شوخ و شنگ تھی۔ اُس کی آنکھیں اک بلیغ زبان کی آئینہ دار تھیں! وہ بادشاہانہ غرور و تمکنت سے صرفِ خرام ہوتی! اُس نے اپنی بارگاہِ حسن میں کسی عاشق کو نوازا تھا نہ عصمت و عفت کا کوئی سوال پیدا ہوا تھا! اُس کا عاشق کوئی انسان ہو، معاذ اللہ! —— دیوتا اُس کے خریدار ہوتے تو ہوتے! اگر پاکدامنی کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی ایسی چیز کی حفاظت کیجئے جو بجائے خود ناقابلِ رسائی ہو، تب تو بیشک اس نسوانی وصف کا انتساب اُس کے ساتھ کیا جا سکتا تھا! وہ "جمالِ دل فروز" بلاشبہ اک "مہرِ نیمروز" تھی اور قطعاً نظارہ سوز!

تاہم وہ معصومیت سے بالاتر بھی نہ تھی! وہ دربار کی سازشوں اور محل کی ریشہ دوانیوں سے خواہ مخواہ کچھ ذوق نہ رکھتی تھی، لیکن کسی ساز باز میں ملوث کئے جانے پر وہ کسی تنفّض کا اظہار بھی نہ کرتی تھی! —— بشرطیکہ اُس میں اُس کی جد و جہد کا مقصود کوئی ایسی شئی ہو جو اُس کی بلند نظری و عالی حوصلگی کے غیر شایانِ شان نہ ہو! وہ اپنی نیکنامی کی چنداں پروا نہ کرتی تھی، لیکن وہ اپنی جلالتِ قدر اور شانِ امتیاز کو بہرحال ملحوظ رکھتی تھی! بظاہر بہت دل نواز اور مائل بہ التفات ہونا، مگر عملاً اپنی پاکی دامن کو دَرائے رسائی رکھنا تکمیلِ نسائیت کے معیار کی معراج ہے! جوزیانہ اک پُر جبروت شہنشاہِ جمال تھی! اُس کے حسن کی ماہیت ہی جُداگانہ تھی: بجائے "مسحور" کرنے کے وہ "مرعوب" کرتی تھی! وہ ایسی تختۂ زمیں پر محوِ خرام ہوتی جس پر یکسر دلوں کا فرش ہوتا! "زیرِ قدمت ہزار جان ست" کی نزاکت اُس کی مستقل خصوصیتِ خرام تھی! وہ دل نوازی سے ایسی عاری تھی کہ بمشکل اپنے سینے میں دل کے وجود کو تسلیم کرتی تھی! وہ "دل" کے لئے اک "ذرۂ درد" کو اک ایسا ہی خارجی عنصر سمجھتی تھی جیسا کہ آنکھ کے اندر کسی ریزۂ خاک یا پرکاہ خاشاک کا پڑ جانا! وہ حکیم لاک کے فلسفے پر تقریر کیا کرتی، اور لوگوں کو شک تھا کہ وہ عربی بھی جانتی تھی! ع

ہر لحظہ برنگِ دگر آں یار بر آمد!

الغرض نفسی و اخلاقی سیرت میں لیڈی جوزیانہ اک ایسی طرفہ معجون چیز تھی۔ کون جانتا تھا کہ اُسکی شاخِ بلور ایسی گردن، تختۂ سیمین ایسے سینے، جلوۂ قمر ایسی طلعتِ منوّر، المعابرق ایسی آنکھوں، دُرہائے غلطان ایسے دانتوں، اور چہرے کی عام ملکوتی شانِ تجمل کے نقاب کے نیچے اک مبہم و موہوم، معمّا آمیز و اسرار خیز قسم کی عجیب الخلقت روح پردہ نشین ہے، جو شاہانہ زندگی میں مزید مسخ ہو کر اک عفریت کی ہم فطرت بن گئی ہے! یہ اک فوق العادت جوہرِ نسائیت تھا جو جوزیانہ کے نہاں خانۂ توہمات کے اعماق کے اندر غرقِ پیچیدگی و ژولیدگی ہو گیا تھا!

انسان اشرف المخلوقات سب سے بڑا عجیب المخلوقات ہے!

مورِ ضعیف

خدا کی شان تو دیکھو کہ ایک مورِ ضعیف — میں اُس کے ذوق کشاکش کی کیا کروں تعریف
بہ ایں قوائے نحیف ونزار وزار ونحیف — پہاڑ سامنے ہو تو کہے مزاج شریف

نظر کا نقش جہاں ہے۔ اُچٹ نہیں سکتا
قدم ہے سست۔ مگر بڑھ کے ہٹ نہیں سکتا

جو پانی آئے تو تنکوں کا پُل بنا کے بڑھیں — ملے ذرا سی گلگز بھی تو ڈگمگا کے بڑھیں
ہزار فصل پہ ہو فصل۔ پھیر کھا کے بڑھیں — نہو جو راہ سرنگیں لگا لگا کے بڑھیں

یہ ایک ایک جری خیل سے نہیں رُکتا
کہ جیسے شیر کا مونھ سیل سے نہیں مُڑتا

قطار باندھ کے جاتا ہے اِس طرح لشکر — کہ جیسے جا کے اُلٹ دے گا گنبدِ خضر
یہ مُنہ میں دانے ہیں یا ہیں بھرے ہوئے گوہر — سروں پہ بوجھ نہیں پھول رکھ لئے سر پر

ہے دُھن بندھی ہوئی مقصد سے لَو لگائے ہوئے
ہوائے شوق لئے جاتی ہے اُڑائے ہوئے

آغا شاعر

یزدانیوں کے عیسائیت پر حملے

سید اختر علی تلہری

اگرچہ انگلستان کا نامور حکیم لاک صحیح معنوں میں "یزدانی" نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ "الہام و وحی" کا منکر نہیں ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے افکار میں یزدانیت (Deism) کے جراثیم پورے طور سے موجود تھے وہ "استدلال" کو "روایتی اور نقلی" قوتوں پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے اسے نہایت وضاحت سے ثابت کیا تھا کہ انسانی علم تجربہ سے ماخوذ ہے اُس کے نزدیک "عقیدہ" بالکل عقل کے ماتحت تھا وہ انجیل کے الہامات ضرور مانتا تھا مگر اُس کا خیال تھا کہ اگر الہامات عقل کے فیصلوں کے مخالف ہیں تو انھیں مسترد کر دینا چاہیئے۔ اُس کے نزدیک الہامات سے اُتنا قطعی علم نہیں حاصل ہو سکتا جتنا کہ عقل سے ہو سکتا ہے۔ وہ وحی و الہام کے سامنے سر جھکانے کو موجود تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ کہتا تھا کہ اُس کا علم کیونکر ہو کہ حقیقۃً یہ چیز "وحی و الہام" بھی ہے۔؟

"وحی و الہام" کی حیثیت اس قدر مشتبہ ہو جانے کے بعد "یزدانیت" تک پہونچنے کے لئے فاصلہ ہی کتنا رہ گیا؟

ٹھیک اُس زمانہ میں کہ جب لاک "عقل" کو نقل پر ترجیح دینے کی سعی میں مصروف تھا اور "عیسائیت" کو موافق عقل ثابت کرنے کے متعلق اُس نے ایک کتاب لکھی تھی جان ٹولینڈ "یزدانیت" (Deism) کے علمبردار کی حیثیت سے نمودار ہوا جان ٹولینڈ یزدانیوں (Deists) کی جماعت کا زبردست مفکر سمجھا جاتا ہے اُس نے اس سلسلہ میں "عیسائیت مجموعہ اسرار نہیں ہے" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو عیسائیت کی نگاہ میں اس سلسلہ کی بہت ہی خطرناک کڑی ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال "مذہبیت" کے لئے بظاہر کچھ زیادہ خطرناک نہیں معلوم ہوتا لیکن جس عنوان سے اُسے ثابت کیا گیا ہے اور اس ضمن میں جو بحثیں کی گئی ہیں وہ عیسائیت کے لئے سم ہلاہل سے کم نہیں ہیں۔

جان ٹولینڈ نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اناجیل میں کوئی ایسی شئی نہیں ہے جو عقل کے مخالف ہو یا عقل کی حکومت کے ماورا ہو۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ عیسائیت حق ہے لیکن اُس میں ایسی چیزیں نہیں ہو سکتی جو ہماری فہم کے دائرہ میں نہ سما سکیں۔ اگر خدا با فہم ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ الہامات معما ہوں اور ہمیں سمجھانے کے بجائے دوسری اُلجھنوں میں مبتلا کریں۔

جان ٹولینڈ نے یہ دعوے کر کے کہ عیسائیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو ہمارے دائرۂ فہم میں نہ سمائے تمام معجزات کی جڑ کاٹ دی اور الہامات کی یہ خصوصیت بتا کر کہ وہ معما نہ ہوں اور وہ ہمیں سمجھانے کے بجائے دوسری اُلجھنوں میں مبتلا نہ کریں وحی و الہام کے اعتقاد کی عمارت گرا دی۔

تشدد کا نتیجہ خطرناک نفاق کی صورت میں

لہ ہم نے "یزدانیوں" کا لفظ (Deists) کی جگہ پر استعمال کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو وجودِ خدا کے قائل ہوں لیکن وحی و الہام کے منکر ہوں۔ منہ

ان ارباب فکر کی طرف سے عیسائیت کی حمایت کے لئے اس قسم کے جو عنوانات اختیار کئے جا رہے تھے اُن سے حقیقت میں مذہب کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا تھا بلکہ اُس کی جڑیں اس طریقہ سے اور زیادہ ہلتی جا رہی تھیں کیونکہ عیسائیت کے قوانین و اصول میں سرے سے اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ عقل کی محک پر ٹھیک اُتر سکیں

اس سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیئے کہ زمانہ متذکرہ میں عقل و نقل کی معرکہ آرائی کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ عقل کے یہ تمام پرستار (فرانس کے اٹھارویں صدی کے ممتاز فلسفیوں کو مستثنے کرتے ہوئے) مذہب کی صداقت کا زبان سے اعتراف کرتے تھے لیکن اُن کا انداز استدلال اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ اُس سے انھیں عقائد کو صدمہ پہونچے جن کی صداقت کے وہ مدعی تھے ممکن ہے ان حکما و مفکرین کا اسلوب فکر اس سانچہ میں ڈھل چکا ہو اور اُن کے بحث و نظر کا ظاہری عنوان اُن کے حقیقی معتقدات کے مخالف نہ ہو لیکن قرائن یہ بتاتے ہیں کہ اُن کی اس روش میں صداقت نہ تھی اُن کے اس طریق کار کا ذمہ دار کسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ جواب صاف ہے کلیسا کی غیر رواداری اور سخت گیری کی پالیسی۔

عیسائیت کے ذمہ داروں نے دار و گیر کا جو مسلک اختیار کر رکھا تھا اس کا نتیجہ ہی یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مروجہ عیسائیت کے مخالف اپنے خیالات کے اظہار میں فرزانگی و پرکاری سے کام لیں۔

ذیل کی سطروں سے مسیحی رہنماؤں کی درازدستیوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکیگا۔

مسیحی تشدد کی درازدستیاں

عیسائیت قیام امن کی مدعی بن کر آئی تھی صلح و آشتی کی تبلیغ اُس کا نقطۂ نظر تھا لیکن ستم ظریفی دیکھئے اُس نے انھیں عقائد کی حفاظت کے لئے اس قدر خون بہائے ہیں کہ اُن کے تذکرہ سے بھی دل لرز اُٹھتا ہے عیسائیت کے مخالف خیالات روکنے کے لئے پاپائے روم کی حکومت کے محکمۂ احتساب عقائد (انکویزیشن) قائم کیا تھا۔ اس خوفناک محکمہ کی خونین سرگرمیوں کے متعلق ڈریپر مصنف معرکہ مذہب و سائنس رقمطراز ہے

"عام الفاظ میں انکویزیشن کا مقصد یہ تھا کہ تخویف و ترہیب کے ذریعہ سے مذہبی اختلافات کا استیصال کیا جائے اور بدعت و زندقہ کو نہایت خوفناک سزاؤں سے وابستہ کیا جا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ ارباب محکمۂ احتساب عقائد ہی کو بدعت و زندقہ کی تعریف و تعین کا اختیار حاصل ہو اس طور پر معیار حق انکویزیشن کے ہاتھ آگیا اور پاپا کی طرف سے یہ محکمہ مجاز کیا گیا کہ اُن ملاحدہ و زنادقہ کی نسبت بعد سراغ برآری تجویز مناسب صادر کرے جو شہروں مکانوں تہ خانوں جنگلوں غاروں اور کھیتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

اغراض مذہبی کے تحفظ کی اس خدمت کی انجام دہی میں اس محکمہ نے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۸۰۸ء تک اُس نے تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں اور اشخاص سزایاب میں سے تقریباً بتیس ہزار نفوس زندہ جلائے گئے۔ اول اول جب عام خلائق کو اُس کی وحشیانہ سزاؤں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی جرأت اور مجال نہ تھی تو بسا اوقات ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ امرا اہل قلم قسیس راہب اور ہر طبقہ کے عوام الناس الزام عائد ہوتے ہی بلا اس کے کہ اُنھیں اپیل کا موقع دیا جائے اُسی دن مار ڈالے جاتے تھے ارباب فکر و دانش کی جدھر نظر پڑتی تھی اُنھیں بھیانک اور ڈراونی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کوئی شخص بلا خوف سزایابی آزادانہ رائے کے اظہار پر قادر نہ تھا"

حکیم برو تو محکمہ احتساب کے شکنجہ میں

سولھویں صدی میں برو تو کوپرنیکس کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ برو تو کوپرنیکس کے نظام کا حامی تھا اور اپنے خیالات کے اظہار میں بے باک، ابتداء میں برو تو کا قصد تھا کہ اپنی زندگی کلیسا کی خدمت گذاری کے لئے وقف کرے چنانچہ وہ ڈمینیکین فرقہ کے راہبوں میں بھی داخل ہو گیا تھا لیکن مسئلہ

"عشائے ربانی" اور مسئلہ "استقرار حمل بحالتِ دوشیزگی" پر غور کرنے سے اُس کا ایمان مبدل بہ شکوک ہوگیا۔ چونکہ اُس نے اپنے خیالات کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی لہذا اُسے بہت جلد پیشوایانِ دین کا موردِ عتاب ہونا پڑا اور اُن کے پنجۂ عقوبت سے بچنے کے لئے اول سوئٹزرلینڈ پھر فرانس پھر انگلستان پھر جرمنی میں پناہ لینا پڑی لیکن انکویزیشن کے یہ خونخوار تازی کُتے جن کی قوتِ شامہ بلا کی تیز تھی برابر اُس کے پیچھے لگے رہے اور آخر جب وہ اٹلی واپس آیا تو اُس کا کھوج لگا کر رہے۔ وینس میں وہ گرفتار کیا گیا اور بیامبی کے جیل میں چھ سال تک اس سختی سے قید رکھا گیا کہ نہ اُسے لکھنے کے لئے قلم دوات کاغذ دیا جاتا تھا نہ پڑھنے کے لئے کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ اُس سے کسی دوست کو اجازت تھی کہ اُس قیدِ تنہائی میں آکر گھڑی دو گھڑی کے لئے اُس سے ملے اور اُس کا غم غلط کرے۔

پیشوایانِ مذہب کے مطالبہ پر برونو وینس سے روما کو منتقل کیا گیا اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ ملحد ہی نہیں بلکہ رئیس الملاحدہ ہے انکویزیشن کے مجلس میں قید کیا گیا سب سے بڑا الزام اُس پر یہ تھا کہ وہ تعددِ عوالم جیسے ناپاک مسئلہ کا قائل ہے جو کتبِ مقدسہ سیاق اور آیاتِ الہامی خصوصاً اُن آیات سے تناقضِ کلی رکھتا ہے جنھیں انسان کی سبیلِ نجات سے تعلق ہے۔ دو سال تک قید کاٹنے کے بعد وہ حاضرِ عدالت کیا گیا اور حکامِ عدالت نے اُس پر فردِ قرارداد جرم لگا کر اُسے مسیحی برادری سے خارج کردیا اور جب مقدس عدالت کے اس حکم کی تعمیل سے اُس نے ازراہِ غایت شرافتِ نفس انکار کیا کہ اپنے گناہ سے توبہ کرے تو کارفرمایانِ قضا و قدر یعنی حکام انکویزیشن نے اس سفارش کے ساتھ اُسے دنیوی حکام کے سپرد کردیا کہ اُسے نہایت نرمی سے سزا دی جائی اور یہ خیال رکھا جائے کہ اُس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ عدالت انکویزیشن کے اس خوفناک فقرہ کا مطلب ایسے موقعوں پر یہ ہوا کرتا تھا کہ مجرم کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چونکہ برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے دشمن اگرچہ اس کے جسم کو فنا کرسکتے ہیں لیکن اُس کے خیالات کی اشاعت نہیں روک سکتے۔ اُس نے اپنے ججوں کو مخاطب کرکے کہا کہ تمہارے اس فیصلے کو سُن کر میرے قلب پر اُس خوف کا عُشرِ عشیر بھی طاری نہیں جو خود تمہارے دل میں اُس کے صادر کرتے وقت پیدا ہوا ہوگا۔ اس فیصلہ کی تعمیل فروری ۱۶۰۰ء میں ہوئی اور برونو زندہ جلا دیا گیا۔ (معرکۂ مذہب و سائنس ڈریپر)

انصاف کا مقام ہے کہ اس قسم کے ہولناک منظر خونیں تشدد کی موجودگی میں اربابِ فکر و دانش اپنے خیالات آزادی سے کیونکر ظاہر کرسکتے تھے؟ ان حالات میں مخالف خیالات رکھنے والوں کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ وہ عیسائیت کا لبادہ جسم پر ڈالے رہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عیسائیت سے اُن کی کھلم کھلا بغاوتیں اتنی ہرگز مضر نہیں ہوسکتی تھیں جتنی کہ ان کی حمایتیں ہوئیں۔ ان کے افکار و آراء نے عیسائیت کی دیواروں میں خوفناک سوراخ پیدا کردئیے۔ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرتے رہے کہ "اُن کے نظرئیے عیسائیت کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ عقیدہ اور دلیل کی حدیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ وہ الہامی کتابوں پر براہِ راست کسی قسم کا اعتراض نہیں کرتے تھے لیکن مخفی راستوں سے انھیں فضول و بےمعنی ثابت کرتے تھے۔" مذہبی کٹر پنتے کے احترام کا انھیں برابر ادعا رہا لیکن زبان و قلم سے ایسے خیالات ادا ہوتے رہے جن سے اس جذبۂ احترام کو کوئی مناسبت ہی نہ ہوسکتی تھی۔ عقل جن امور کی غلطیوں کا پردہ فاش کرتی تھی وہ انھیں مذہب کے دائرہ میں صحیح بتاتے تھے اُس عصر کی ادبیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان امور کا قدم قدم پر ثبوت ملے گا۔

عیسائیت کے متعلق بائیل کی روش

بائیل حکیم لاک کا معاصر تھا۔ وہ المسٹرڈم میں رہتا تھا۔ اس نے وہیں سے اپنی "فلسفیانہ لغت" شائع کی تھی۔ وہ بالکل آزاد خیال تھا لیکن مذہب کا لباس اُس نے کبھی اپنے سے علیحدہ نہیں کیا۔

عیسائیت کے بنیادی قوانین و اصول کے خلاف جو اعتراض منکرین کی طرف سے کئے گئے تھے اُنھیں باقاعدہ طور سے درج کرنے میں اُسے نہایت مسرت ہوتی تھی۔ حضرت داؤد کے متعلق عیسائیت جن واقعات کو بیان کرتی تھی اُن کی مجرمانہ حیثیت اُس نے نہایت بیدردی سے نمایاں کی اور بتایا کہ خدا کا یہ عزیز بندہ عیسائی روایتوں کے بموجب ایسا شخص تھا جس سے مصافحہ کرنے میں عامی سے عامی شخص کو عار معلوم ہونا چاہئیے۔ اُس نے اس خصوص میں جو انداز بیان اختیار کیا وہ انتہا پسندانہ تھا۔ عیسائی دنیا اس بیباکانہ اظہارِ خیال پر برہم نہ ہوتی ناممکن

تھا۔ اُس کی طرف سے اس گستاخی کے خلاف احتجاج ہوا اور زبردست احتجاج ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ عیسائیت کے قہر وغضب کی بجلیاں قریب تھا کہ اُس کی ہستی کا خرمن پھونک دیں کہ وہ سنبھلا اور اُس نے مذہب اور عقل کی حدوں کی علیحدہ ہونے کی بحث چھیڑ کر مسیحی دنیا کے بگڑے ہوئے تیوروں کے درست کرنے کی کوشش کی

بائبل کے نزدیک مذہبی فضیلت

اُس نے خشم وعتاب کے شعلوں کو اس دلچسپ نظریئے کے چھینٹوں سے بجھانا چاہا کہ عقیدہ کی مذہبی فضیلت اِس میں ہے کہ الہامی صداقتوں کا اعتقاد تنہا خدا کی شہادت پر کیا جائے۔ اگر تم دلائل کی بنا پر روح کے غیر فانی ہونے کے قائل ہو تو اس میں شک نہیں کہ تمھیں کٹر مذہبی کہا جا سکتا ہے لیکن جس چیز کا نام عقیدہ (Faith) ہے اُس کا تمھیں کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔ جس قدر الہامی صداقتیں انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں اُسی قدر ناقابلِ فہم اور دلائل کے خلاف ہوگی ہیں اُسی قدر اُن کے تسلیم کرنے میں اپنے فہم وادراک کی قربانی کرنا ہوگی اور ہماری اطاعتِ خدا کا درجہ اتنا ہی اونچا ہو جائیگا۔

بائبل نے عقیدہ کی عظمت کا جو معیار قرار دیا ہے وہ بالکل سفسطہ آمیز ہے غور فرمائیے جو مذہب جس قدر زیادہ خرافات ومزخرفات کا مجموعہ ہوگا اُس کے تسلیم کرنے میں اُسی قدر عقل کی قربانی دینا ہوگی اور اس لئے بائبل کے مذاق کے بموجب اُن کے تسلیم کرنے میں اتنا ہی اطاعت خدا کا درجہ بڑھتا جائیگا گویا مزخرفات وخرافات کے انبار کے سامنے عقل کا سربسجود ہونا ہی "ربانیت وروحانیت" کے اعتراف کا پیش خیمہ ہوگا کوئی فہمیدہ شخص اس صورتِ حال کے تسلیم پر راضی نہیں ہو سکتا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بائبل نے اس نظریہ کے ذریعہ سے ایک طرف تو عقیدہ کا لطیف پیرایہ میں مضحکہ اُڑایا ہے اور دوسری طرف عیسائیت کے انتقام کے چنگل سے اپنے کو بچاتا ہے۔ اور اگر بائبل نے سنجیدگی سے اس خیال کا اظہار کیا ہے تو منکرین کی جماعت میں اُس کا پایہ نہایت ہی پست ماننا پڑتا ہے۔

منکرینِ خدا کے اخلاقی فضائل کا اعتراف

بائبل نے اپنی فلسفیانہ لغت میں منکرینِ خدا کے اخلاقی فضائل کا بھی اعتراف کیا تھا۔ یہ بات بھی مذہبی حلقوں میں ناپسند ہونا چاہیئے تھی چنانچہ ناپسند ہوتی اور اچھی طرح ناپسند ہوتی۔ اُس کے اس نقطۂ نظر کو سختی سے موردِ اعتراضات بنایا گیا۔ اُس نے ان اعتراضات کے جواب میں جو ستم ظریفانہ روش اختیار کی ہے وہ بھی میرے سابق خیال کی مؤید ہے بائبل میں لکھا ہے۔

"اگر اُسے خدا کے اُن منکرین کا علم ہوتا جن میں اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہوتیں تو وہ اُن کا ضرور تذکرہ کرتا لیکن بدقسمتی سے وہ ایسی جماعتِ ملاحدہ سے واقف نہیں ہے جن میں اخلاقی رزائل پائے جاتے ہوں۔ وہ تاریخی مجرمین جن کے جرائم کے تذکرہ سے انسان کانپ اُٹھتے ہیں ہمیشہ مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی غیر مقدس زندگیاں اُن کی مذہبیت کا ثبوت ہیں۔ مذہب کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ شیطان خدا کا منکر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور وہی درحقیقت جرائم ومعاصی کی طرف لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے اس لئے انسان کی شرارت کو شیطان کی شرارت سے مشابہ ہونا چاہیئے اور یہیں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کی شرکت شیطان کے ساتھ خدا کے اعتقاد میں لازمی ہے۔ بدترین سیاہ کاروں کا منکرینِ خدا ہونا اور ایمانداری کے وصف سے ایزد ناشناسوں کا زیادہ متصف ہونا خدا کی غیر محدود عقلمندی کا ثبوت ہے۔ اس انتظام سے اُس نے انسان کے بگڑنے کی حدیں مقرر کر دی ہیں کیونکہ اگر انکارِ خدا اور اخلاقی شرارت ایک ہی جماعت میں موجود ہو جائیں تو پھر دنیا کی انسانی سوسائٹیاں جرائم ومعاصی کے طوفان سے ہمیشہ زیر وزبر رہتیں"۔

ان ستم ظریفانہ جوابات کی جو حیثیت ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر فی الواقع انھیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتا ہے تو اُس کی "فکری سادہ لوحی" میں کیا شک ہے؟

اصل یہ ہے کہ "خوش کرداری اور لامذہبیت" میں کسی قسم کا لزوم نہیں ہے

بائبل نے جس عنوان سے ان میں الزام دکھانا چاہا ہو وہ "مضحکہ خیز خطابت" کے
تحت میں آجاتا ہو۔ یہ امر اور زیادہ عجیب وغریب ہو کہ اُسے اُن منکرین خدا کا علم
نہیں ہو جن میں اخلاقی بُرائیاں پائی جاتی ہوں۔ ہمارے سامنے آج بھی ایسے
منکرین مذہب موجود ہیں جن میں مسلمہ اخلاقی ضوابط و قوانین کے لحاظ سے برائیاں
پائی جاتی ہیں اور جن کی زندگیاں کسی سے پاکیزہ نہیں ہیں مگر اس کا مطلب
یہ نہیں ہو کہ منکرین مذاہب خوش کردار اور پاکیزہ سیرت ہوتے ہی نہیں۔ یقیناً
ایسے لامذہب افراد بھی موجود رہے ہیں جو نیک کرداری اور خوش سیرتی کے
لحاظ سے ممتاز رہے ہیں۔ اُن کے دل میں ملک وملت کا درد ہوتا ہو جس سماج کر
اُن کا تعلق ہوتا ہو اُس کی معاشرتی حالت درست کرنے کی اُنھیں فکر رہتی ہو
لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہو کہ اُن خوش کردار لامذہبوں کی
ان اخلاقی ومعاشرتی صلاحیتوں کا "چشمہ لامذہبیت" کے منبع سے نہیں پھوٹتا ہے
غرضیکہ بائبل کی حمائت عیسائیت کے لہجہ کا عام انداز یہی ہو۔ ظاہر ہو کہ
اس حمائت سے عیسائیت کیا فائدہ اُٹھا سکتی تھی؟ ان دلائل سے تو وہ اور زیادہ
خلافِ عقل ثابت ہوتی جاتی تھی اور اُس کی مقبولیت کی دیواریں گرتی جاتی تھیں
بائبل کی تصنیفات کا اثر انگلستان اور فرانس پر اچھی طرح پڑا۔ اُنھوں نے ان دونوں
ممالک میں مخالفین عیسائیت کے لئے اسلحہ مہیا کر دیئے۔

برطانوی یزدانیوں اور کٹر عیسائیوں کے مباحثے

ابتدا میں اس حملہ کو نہایت سرگرمی سے برطانوی یزدانیوں
(English Deists) جاری رکھا۔ اُنھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ سے
عیسائیت کی بنیادیں بہت کچھ ہلادیں۔ ان یزدانیوں اور کٹر عیسائیوں میں یہ
سوال زیر بحث رہا کہ آیا خدا کا وجود عیسائی تصور کے ماتحت عقل سے ثابت
کیا جاسکتا ہو اور آیا وہ خدا عیسائی الہامات کا موجد ہوسکتا ہو۔

یزدانیوں کے نزدیک اس کا اثبات بالکل غیر ممکن تھا۔ دلائل سے جس
خدا کا وجود ثابت ہوتا ہو اُس کی سیرت کے یہ بالکل مخالف ہو کہ وہ نام نہاد عیسائی
الہامات کا اختراع کرتا۔ عیسائیت کے حامیوں نے بھی ان یزدانیوں کے مقابلہ
میں دلیل ہی پر اعتماد کیا اور اس سلسلہ میں بہت سے عیسائی اپنے عقائد سے ہٹنے لگے

توحید فی التثلیث کے متعلق عجیب عجیب خیالات ظاہر کئے گئے۔ اُس
زمانہ میں اخلاقیات پر ہر گروہ نے خصوصیت سے زور دیا۔

عیسائیت کا یہ خیال تھا کہ آخرت کے ثواب وعقاب کا اصول
اخلاقی اصلاح کے لئے ضروری ہو۔ ان یزدانیوں کا خیال تھا کہ اخلاق کی بنیاد
محض عقل پر ہو موجودہ الہامات میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو صحیح اخلاقی
قوانین کے بالکل مخالف ہیں ان یزدانیوں نے اسپنوزا کے اس خیال کو کہ الہامی
کتابوں کی بھی دوسری کتابوں کی طرح تاویل کرنا چاہیئے اپنا خاص اصول قرار
دے لیا تھا وہ قانون کی زد سے بچنے کے لئے اپنے یہ خیالات ہلکے ہلکے پردوں میں
چھپا چھپا کر پیش کرتے رہتے۔

مذہبی آزادی سلب کرنیوالے قوانین

لیکن اب تک ۱۶۶۲ء کا پریس لائسنسنگ ایکٹ موجود تھا۔ وہ
اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت کامیابی کے ساتھ روکتا رہا ۱۶۹۵ء میں یہ قانون
معاً منسوخ ہوا اور اُس وقت اُس "یزدانی ادب" (Deistic Literature)
کا ظہور قوت کے ساتھ شروع ہوا تاہم اب بھی قوانین کفر والحاد موجود تھے
ان کے ماتحت سزا ہوسکتی تھی۔ ان قوانین میں اتنی طاقت بہرحال تھی کہ اُن کے
ذریعے سے مخالفین عیسائیت کا سر کچلا جاسکے ۱۶۹۸ء میں حسب ذیل ایک
جدید قانون اور بنا دیا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص جس کی تعلیم عیسائی مذہب میں
ہوئی ہو تحریراً تقریراً یا طباعتہً تثلیث کے اقانیم ثلثہ میں سے کسی کی "ربوبیت"
کا بھی انکار کریگا یا ایک خدا سے زیادہ خداؤں کا عقیدہ ظاہر کریگا یا عیسائیت
کی صداقت کا منکر ہوگا یا قدیم وجدید انجیل کی ربانی حیثیت تسلیم نہ کرے گا
تو وہ مجرم قرار دیا جائیگا۔ پہلے جرم پر پبلک ملازمتوں کا استحقاق اُس سے
چھین لیا جائیگا اور دوسرے جرم پر اُس کے شہری حقوق ضبط ہو جائیں گے
اور تین سال کی قید جھیلنی ہوگی۔

قانون بالا کا منشا بتاتے ہوئے صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ
بہت سے لوگوں نے کھلم کھلا عیسائیت کے اصولوں کے خلاف ملحدانہ گفتگوئیں
کرنے اور خیالات شائع کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا ہو۔

آزادخیالی استعاروں کی آڑ میں

یہ قانون فلسفیانہ آزادخیالی کے لئے پورا مضرتناک تھا لہٰذا اُس کی زد سے بچنے کے لئے آزادخیالوں نے بہت سے طریقے اختیار کئے۔

منافقانہ عنوان سے مذہبی امور میں بحث کے طریقے کا پہلے ذکر ہوچکا ہے۔

اس مقام پر ایک دوسرے طریقے کا ذکر منظور ہے۔ آزادخیالوں نے مقدس کتابوں کی استعاروں کے پردے میں حسب منشا تاویلیں شروع کر دیں۔ اُنھوں نے صاف صاف لکھنا شروع کیا کہ ان کتب مقدسہ کے لفظی ترجموں پر اگر اعتماد کیا جاتا ہے تو بہت سی مہمل باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ ایسی بہت سی چیزیں تسلیم کرنا ناگزیر ہوجائیں گی جو خدائی حکمت والنصاف کے بالکل منافی ہیں اس لئے ان عبارتوں کا مجاز واستعارہ پر محمول کرنا لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ ایک حد تک عقل کے موافق ہے۔ مجاز و استعارہ کا استعمال تمام زبانوں میں رائج ہے لیکن اس کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا اور جو بات ذرا سی بھی اپنی عقل کے خلاف معلوم ہو اُسے بعید سے بعید مجازات پر محمول کر دینا مذہب کے ساتھ خیانت ہے۔

اگر کسی مقدس کتاب کی کوئی تعلیم ہمیں عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور ہم اُسے کسی طور سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتے تو خواہ مخواہ مضحکہ خیز مجازات کی عمارت تعمیر کرتے اُس کے ڈانڈے عقل سے ملانا دیانت نہیں ہے۔ لیکن یہ آزادخیال اس روش کے اختیار کرنے پر عیسائیت کی طرف سے مجبور کر دیئے گئے تھے۔ اگر مذہبی حلقے حریت فکر کے دشمن نہ ہوتے تو آزادخیالوں کی ایک جماعت کو اس کی ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مذہب کو استعارات و مجازات پر محمول کرنے کے طریقہ سے کام لے۔

اس میں شک نہیں کہ ان حملوں کی حیثیت شبخون کی تھی اور عیسائیت کو ان سے کافی نقصان پہونچا مگر اس کی ذمہ دار خود مذہبیت ہے۔ ان "یزدانی مفکروں" نے یہ بحثیں اس عنوان سے چھیڑی تھیں کہ اُن کے پڑھنے والے ان الہامی کتابوں کے بیانات کی طرف سے بددل ہوتے گئے اور اُن کے دلوں سے اُن کا وقار زائل ہوتا گیا۔

معجزوں کی بحث۔ کالنز اور وولسٹن

معجزوں کی بحث اس زمانہ میں تیز سی چھڑی رہی۔ کالنز اور وولسٹن نے انجیلی معجزوں اور پیشین گوئیوں کی ظاہری حیثیت کے خلاف سختی سے تنقیدیں کیں۔ اُنھوں نے نہایت فرزانگی کے ساتھ معجزات وغیرہ کے فی نفسہ ممکن ہونے یا نہ ہونے کی بحث کو سرے سے نظر انداز کر دیا البتہ بہت سے معجزات کو فرداً فرداً لے کر یہ واضح کیا کہ یہ چیزیں مہمل ہیں یا معجزہ دکھانے والے کے شایان شان نہیں ہیں۔ ان معجزوں اور پیشین گوئیوں کی ظاہری حیثیتوں کو اس طرح مقدوح کرنے کے بعد اس نظریہ پر زور دیا کہ یہ معجزات درحقیقت استعارہ ہیں حضرت مسیح کے اُن عجیب وغریب وغیر قابل فہم تاثیرات اور اعمال کے جن کی انسانی روح میں وہ برابر تخلیق کرتے رہتے ہیں۔

کالنز کو اپنے خیالات کی اشاعت کے سلسلے میں زیادہ مشقتیں جھیلنا نہیں پڑیں البتہ وولسٹن مسیحی معجزات کے متعلق کتاب لکھ کر مصیبت میں مبتلا ہو گیا وہ سڈنی سکس کالج کیمبرج کا فیلو تھا۔ اُس سے یہ اعزاز چھین لیا گیا اور اُس پر لائبل کیس چلایا گیا جرمانہ اور ایک سال قید کی سزا اُسے دی گئی۔ وہ جرمانہ ادا نہ کرسکا اور جیل ہی میں مر گیا۔

ایک دلچسپ واقعہ

وولسٹن نے اس سلسلہ میں جو رسائل لکھے تھے اُنھوں نے عام پبلک پر اچھا خاصا اثر ڈالا تھا۔ اُس کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس سے خالص مذہبی طبقہ کتنا برہم تھا؟

وہ ایک مرتبہ خراماں خراماں کہیں گھومتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک خوش وضع نوجوان عورت اُسے ملی۔ بجائے اس کے کہ وہ سلام کرتی اُس نے یہ سوال کیا کہ او بڈھے شیطان تجھے اب تک پھانسی نہیں ہوئی۔ وولسٹن یہ عجیب وغریب سوال سن کر کھڑا ہوگیا اور اُس نے حیرت سے دریافت کیا کہ اے نیک خاتون میں تم سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ میں نے تمھاری برہمی کی کون سی بات کی ہے؟ آخر تم مجھ سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟ اس عورت نے بگڑ کر جواب دیا کہ تم میرے معین ونجات دہندہ کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ اس سے بڑھ کر برہمی کی کونسی بات ہوسکتی ہے؟

برطانیہ کے مشہور تشکک فلسفی ڈیوڈ ہیوم پر بھی قریب قریب یہی واقعہ گذرا ہے وہ غریب بھی غالباً کسی گڑھے میں گر گیا تھا۔ اُس نے مدد کے لئے پکارا۔ ایک شخص کا اِدھر سے گذر ہوا۔ اُس کا تعلق بھی غالباً صنفِ نازک ہی سے تھا۔ اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ جس وقت ہیوم نے اپنا نام بتایا تو اُس شخص کی طرف سے کہا گیا کہ تو کسی اعانت کا مستحق نہیں ہے تو معجزات کا منکر ہے۔ اگر اپنے اس گناہ سے سچے دل سے تائب ہو جائے تو اس مصیبت سے تجھے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ ہیوم نے ہنس کر اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اس مصیبت سے رہائی حاصل کی۔

ہیوم کا ذکر یہاں ضمناً آگیا۔ تذکرہ وولسٹن اور کالنز کا تھا۔ یہ دونوں یزدانیوں بھی جماعت میں کچھ بڑے پایہ کے مفکر نہ تھے۔ اوسط درجے کے فہم و دانش کے انسان تھے مگر انہیں اپنے خیالات کی اشاعت میں بہت زیادہ انہماک تھا اس لئے وہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب رہے۔

الہامات پر حملہ

اُس زمانہ میں میتھو ٹنڈل نے ذرا زیادہ وسیع نقطۂ نظر سے الہامات پر حملہ کیا۔

۱۷۳۰ء میں اُس نے "کرسچینٹی از اولڈ از کریئیشن" نامی کتاب لکھ کر یہ ظاہر کیا کہ انجیل بطور ایک الہامی چیز کے محض فضول ہے کیونکہ اس سے انسان کے اُس فطری مذہب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جسے خدا نے سب سے پہلے ہم پر عقل کے توسط سے القا کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ جو لوگ الہامی مذہب (عیسائیت) کی اس لئے حمایت کرتے ہیں کہ وہ فطری مذہب کے منافی ہے اور اس طرح عقل و نقل دونوں کی دوہری حکومت قائم کرتے ہیں وہ ایک عجیب "استدلالِ مخمصہ" دور میں گرفتار ہوتے ہیں ایک ہی وقت میں وہ ان مقدس کتابوں کی صداقت سے اُن نظریات و قوانین ثابت کرتے ہیں جو اُس میں موجود ہیں اور پھر اُن نظریات کی صداقت کا نتیجہ اس واقعہ سے نکالتے ہیں کہ وہ ان کتابوں میں موجود ہیں۔

انجیل کے متعلق بحث

انجیل پر تفصیلی تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اسے غلطیوں سے پاک ثابت کرنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ جہاں کہیں مخالفِ عقل بیانات ملیں تو ان کے لئے لفظی معنی ذبح کئے جائیں اور حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف آیا جائے تاکہ استدلال و برہان کی خلاف ورزی نہ ہو۔ انجیل میں جو واقعاتی اور طبیعیاتی غلطیاں بیان کی جاتی ہیں اور جن سے اس کتاب مقدس کے محفوظ عن الخطا ہونے کو صدمہ پہونچ سکتا ہے اُن کا جواب دیتے ہوئے ایک بشپ نے لکھا تھا کہ انجیل میں خدا انسانوں کے خیالات اور تصورات کے مطابق گفتگو کرتا ہے کیونکہ وحی و الہام کا یہ کام نہیں ہے کہ ان معاملات میں اُن کے ارا، کی ٹنڈل نے اس کا جواب بجواب حسبِ ذیل دیا ہے۔

> " اس جگہ دو امر ہیں ایک تو ہماری غلط منطق اور فصاحت و بلاغت کی اصلاح نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ خود اُن کا استعمال کرنا دوسرے لفظوں میں، ایک بات تو یہ ہے کہ ان چیزوں کے متعلق ہمارے غلط تخیلات کی اصلاح نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ انہیں کے مطابق گفتگو کر کے اُن کو اور مضبوط بنا دینا۔ اس مقدمہ کی تمہید کے بعد وہ نہایت بیباکی سے یہ پوچھتا ہے کہ اس دوسری صورت کا استعمال خدا کیوں کرتا ہے؟ کیا غیر محدود و غیر متناہی عقل اُس ذلیل تدبیر کا استعمال کئے بغیر انسانوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکتی تھی؟"

ٹنڈل نے عیسائیت کے تنہا ناجی ہونے کے نظریہ کی بھی سختی سے تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے "کیا ایسے شخص کے متعلق جو بہشت کا دروازہ اُن لوگوں کے لئے بند کر دیتا ہے جو دلیل و برہان کے فتووں کی پابندی کرنے والے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسانوں کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا گیا تھا؟"

ٹنڈل نے انجیل کی اس قسم کی بہت سی باتوں کی جن سے خدا کے عادلِ مطلق ہونے پر دھبا آتا ہے تنقید کی ہے۔

وولسٹن اور کالنز کے مقابلہ میں ٹنڈل زیادہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھا اُس کی تنقیدوں میں زیادہ وزن تھا اس لئے اُس کی تحریروں سے مذہب کو زیادہ نقصان پہونچا۔ کٹر عیسائیت کی بنیادیں گرنا شروع ہو گئیں اور یزدانی جماعت کے خیالات کو فروغ ہونے لگا۔

نغمۂ زندگی

ازلانگ فیلو

Long Fellow

ترجمہ ایم اے شیخپوروی

غم آگین لہجہ میں تم مجھ سے یہ نہ کہو :-
زندگی ایک بے کیف خواب ہے !
اور روح موت کی نیند سو جاتی ہے !
اور دنیوی اشیاء درحقیقت ویسی نہیں جیسی بظاہر نظر آتی ہیں ۔
نہیں بلکہ زندگی حقیقت ہے، ایک بیّن حقیقت،
اور عالم وجود کا ایک ضروری عنصر !
اور فنا اس کی منزل مقصود نہیں،
اور روح کی آواز ہرگز یہ نہیں ہے کہ
تم مٹی سے بنے ہو اور مٹی میں مل جاؤ گے
خوشی اور غم
نوشتہ تقدیر نہیں، بلکہ سعی عمل
اور ہماری آفرینش کا منشاء
شاہراہ ترقی پر ہر نقش قدم اول نمایاں کرنا ہے۔
کیونکہ ہر "آج" جلد ہی "کل" ہو جائے گا۔
کام بہت زیادہ ہیں،
اور رخش وقت تیز گام،
ہمارے دل اگرچہ قوی ہیں،
لیکن اس ڈھولک کی مانند
جو کوچ کا نقارہ
ہر ساعت قبر سے قریب تر پیٹ رہا ہے۔
دنیا کے وسیع میدان کارزار میں،
غلامی کی سنہری زنجیروں میں مقید،
اور ایک معصوم بھیڑ کی طرح قید بند میں
جکڑا نہیں رہنا چاہیئے۔
بلکہ ایک اولوالعزم اور ایک نامور ہیرو کی طرح
میدان کشمکش میں

زندگی کو زریں اور خوشگوار بنانا چاہیئے۔
کیونکہ قوم کی بہبود و فلاح کا مدار اسی میں ہے
مستقبل کی درخشانی پر امید نہ رکھو،
اور ماضی کا غم خواب پریشاں کی طرح بھول جاؤ۔
زمانۂ حال میں وسعت تخیل اور علو ہمتی سے نمایاں کام انجام دو۔
اور مسلسل جد و جہد کرو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔
مشاہیر عالم کی سوانح حیات
ہمیں درس دیتی ہیں کہ ہم اپنی زندگی خوشگوار بنا سکتے ہیں
اور اپنی داستان معاشقہ کے رنگین اوراق
اور اپنے علو تخیل و جلال و تمکین کے گیت
اور اپنی عظمت و الوہیت کے طمطراق
اور اپنے نقوش پا،
زمانہ کی ریگ زار پر انھیں کی طرح چھوڑ سکتے ہیں۔
شاید کوئی خستہ دل انسان،
زندگی کے بے پایاں سمندر پر
ان نقوش پا کو دیکھ کر اپنی شکستہ ہمت پھر استوار کر سکے !
اس لئے ہمیں علو ہمتی اور جانبازی سے میدان عمل میں گامزن ہو جانا چاہیئے۔
اور قسمت کے اوراق کو الٹنے کے لئے مقابلہ کرنے والا دل پیدا کرنا چاہیئے۔
اور نتیجے کا استقلال سے انتظار کرنا لازمی ہے۔

ہمیں حصول مقصد کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا چاہیئے۔
ہماری آرزوؤں اور تمناؤں پر رنگین پھولوں کی بارش ضرور ہوگی۔
اس لئے پھر اب یہ نہ کہو کہ
زندگی ایک بے کیف خواب ہے، اور صرف خواب پریشان۔

کل کی بات

یہ جناب فراق گورکھپوری کے آنجہانی والد کا کلام ہے اور اسے تبرکاً اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ اس میں وطن پرستی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو ہر صورت وطن کے لئے مفید ہے۔ (مدیر)

نہ قصہ ہے یہ کابل یا پشکن کا ۔۔۔ نہ ہے ماجرا ملکِ چین و ختن کا
نہ روما کا ذکر ہے نہ باغِ عدن کا ۔۔۔ سناتا ہوں میں حال اپنے وطن کا

کبھی تھا یہ ہندوستاں رشکِ جنت
یہاں جگمگاتا تھا تاجِ حکومت

ہر ایک ملک پر اس کو حاصل تھی عظمت ۔۔۔ کھٹکتی تھی ہر آنکھ میں اس کی دولت
نہ تھی قوم فاتح کی تابع رعیت ۔۔۔ یہیں کا تھا حاکم یہیں کی حکومت

اسی کی ہر ایک ملک میں گفتگو تھی
ہر اک باغ میں اک اسی گل کی بو تھی

نہ یاں اہلِ جور و ستم کا گذر تھا ۔۔۔ نہ بادِ مخالف کے جھونکوں کا ڈر تھا
فقط ہندیوں کا یہاں کر و فر تھا ۔۔۔ نہ کھٹکا نہ خطرہ نہ فتنہ نہ شر تھا

بہت مطمئن تھی یہاں زندگانی
ٹپکتی تھی ہر شکل سے شادمانی

خود اپنا ہی جاہ و حشم دیکھتے تھے ۔۔۔ شجاعت کی تیغ دو دم دیکھتے تھے
شرافت کا اونچا علم دیکھتے تھے ۔۔۔ رذالت کے سر کو قلم دیکھتے تھے

شگفتہ رعایا کے دل کا کنول تھا
گلے تھے، نہ شکووں کا کوئی محل تھا

یہیں کے بخارات اٹھتے تھے پیہم ۔۔۔ یہیں ابر بن کر برستے تھے چھم چھم
مویشی بھی آزاد تھے مثلِ ضیغم ۔۔۔ ہرے جنگلوں میں وہ پھرتے تھے ہر دم

ہر اک سمت تھیں کھیتیاں لہلہاتی
مچلتی تھی ذروں میں روحِ نباتی

یہیں کاٹتے تھے یہیں ہم تھے بوتے ۔۔۔ یہیں کے تھے سامان یہیں صرف ہوتے
یہیں جاگتے تھے یہیں ہم تھے سوتے ۔۔۔ یہیں ہم تھے ہنستے یہیں ہم تھے روتے

حریفوں میں لٹتا تھا سونا نہ غلّہ
کسی کا بھی اونچا نہ تھا ہم سے پلّہ

گرانی نہ تھی یاں نہ تھی خشک سالی نہ ادبار کی یہ گھٹائیں تھیں کالی
نہ تھا عدل جھوٹا، نہ وعدے خیالی یہ تھی سلطنت ہند کی بھولی بھالی
ہوا امن کا تھی پھریرا اُڑاتی
رعایا تھی جنگل میں منگل مناتی

نہ تھا سخت قانون کا تازیانہ نہ کھٹکے میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
ہر اک عدل و انصاف میں تھا یگانہ ہر اک بزم تھی غرقِ چنگ و چغانہ
تکلف سے آزاد اُن کا چلن تھا
عجب اُن کے انداز میں سادہ پن تھا

نہ فتنوں کے پیدا نشاں تھے کہیں پر نہ بے وجہ پڑتی شکن تھی جبین پر
نہ تکرار ملت میں حجت نہ دیں پر گڑا صلحِ کُل کا تھا جھنڈا زمیں پر
لگدکوبِ دوراں سے محفوظ تھے وہ
اُخوت کے سائے میں محظوظ تھے وہ

زباں پر کسی کی شکایت نہیں تھی نظر میں کسی کی حقارت نہیں تھی
بھلائی سے گذریں یہ عادت نہیں تھی بُرائی پر آئیں یہ خصلت نہیں تھی
وہ منشائے فطرت کو پہچانتے تھے
غنیمت شرافت کو وہ جانتے تھے

اگرچہ یہاں ہوتی تھی بُت پرستی مگر سایہ افگن تھی رحمت خدا کی
ہرے کھیتوں میں لہلہاتی تھی کھیتی نہ پانی سے مرتی نہ سوکھے سے جلتی
ہمیشہ برستا تھا رحمت کا پانی
کسانوں کو پڑتی نہ تھی خاک اُڑانی

پرائے دھنوں پر نہ اُن کی نظر تھی نہ مائل طبیعت سوئے سیم و زر تھی
غلامی سے وہ زندگی بے خبر تھی توکل پرستی پہ طبع بشر تھی
سلف میں یہی ہندیوں کا چلن تھا
اسی سادگی میں چھپا بانکپن تھا

جو اس مُلک کی جاہ و ثروت بڑی تھی تو آنکھ اس کی غیبا فلک کی گڑی تھی
ترقیٔ دولت یہاں ہر گھڑی تھی ہر اک قوم میں کھلبلی سی پڑی تھی
تمنا تھی، لوٹوں سے گھات پا کر
[illegible]

منشی گورکھ پرشاد آنجہانی عبرت گورکھپوری

کلیم پر تنقید

خود کلیم کے لئے

مرزا "صادق"
بی اے

ادارۂ کلیم خواہشمند ہے کہ کلیم کے مطالعہ کرنے والے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ جہاں تک کہ راقمِ سطورِ ہذا کا تعلق ہے اس کی حیثیت محض ایک طالب علم کی ہے۔ کسی ایسے مہتم بالشان رسالہ کے مضمونوں اور مضمون نگاروں کے بارے میں اظہار رائے کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تاہم بایں امید کہ شاید ذیل کے خیالات ادارۂ کلیم سے تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سطورِ ذیل سپردِ قلم کی جاتی ہیں۔

(۱) حضرتِ جوشؔ کی نظمیں

جس وقت کلیم کے اجراء کا اعلان ہوا ہے اور یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے مدیرِ خصوصی حضرتِ جوشؔ ہوں گے۔ نہ صرف میں بلکہ بہت سے حضرات جن سے میں واقف ہوں۔ رسالہ کے شائع ہونے کے بےچینی سے منتظر ہو گئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ اس ذریعہ سے حضرتِ جوشؔ کی رنگیں نوائیوں کے تازہ شاہکار پڑھنے کی اُمید تھی۔ لیکن افسوس کلیم کے قریب ایک سال کے اجراء کے بعد بھی اس اُمید نے واقعہ کی صورت نہیں اختیار کی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ جوش نے اپنی نظموں کے ذریعے سے اُردو شاعری میں ایک تخیلی انقلاب پیدا کر دیا ہے، اُنھوں نے اس داغ بیل پر جو نظیر اکبر آبادی۔ حالیؔ، اور اقبالؔ نے ڈالی تھی ایک شاہراہ بنا دی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شعرائے اردو کا رجحان غزل۔ قصیدہ، اور مثنوی سے ہٹ کر اس صنفِ شاعری کی طرف ہو گیا ہے۔ جس کو اصطلاحاً نظم کہتے ہیں۔

خیالات کی ندرت، الفاظ کی رنگینی، بندشوں کی جدت۔ طرزِ ادا کا نرالا پن مضامین کا انتخاب، شاعری میں مصوری، انقلاب کا پیام۔ اصطلاح کا ترانہ، غرض کسی بات کو لے لیجئے۔ حضرتِ جوشؔ امتیازی جگہ پر نظر آئیں گے۔ اُن کی کوئی نظم اُٹھا کر دیکھئے۔ بار بار پڑھئے، ہر بار ایک نیا لطف آتا ہے، لیکن پھر بھی یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوتی ہے کہ وہی نظمیں جو اخبارات و رسائل میں عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہیں، کلیم میں دوبارہ نکل رہی ہیں۔

(۲) حضرتِ جوشؔ کے "اشارات"

جہاں تک کہ نثر نگاری کا تعلق ہے، حضرتِ جوشؔ نے میرے علم میں اس میں کوئی خاص شہرت نہیں حاصل کی ہے۔ اِن کا وہ خطیبانہ اندازِ تحریر جو ہر ماہ کے کلیم میں "اشارات" کے تحت نظر آتا ہے۔ میری رائے ناقص

میں بہت کچھ اصلاح کا محتاج ہے۔ اس کو پڑھکر مجھے مولوی عبدالماجد صاحب
دریا بادی کی خشک نویسیاں اور پند آفرینیاں یاد آتی ہیں۔ وہ دونوں طرزِ
تحریر یکساں طور سے طبیعت کو منغص کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ طبیعت اس لئے
منغص نہیں ہوتی کہ اپنی زندگی کی بداندیشی اور بے راہ روی یاد آتی ہے ——
اگر ایسا ہوتا تو پھر شکایت ہی کیا تھی —— بلکہ اس لئے منغص ہوتی ہے کہ خطیب
اپنے مخاطب کو کندۂ ناتراش اور جاہلِ محض تصور کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ کہنے والا فلسفے کی رفعتوں اور تاریخ کی بلندیوں سے پیغمبرانہ شانِ الوہیت
سے گھرا ہوا اپنے ان ہم جنسوں سے خطاب کر رہا ہے جو نیچے، بہت دور، دنیاداری،
طلبِ منفعت، کوتاہ بینی، اور خودغرضی کے قعرِ مذلت میں پڑے ہیں، لیکن ہیں
ہمہ تن گوش۔ یہ طرزِ ادا اُس مقصد میں معاون نہیں ہو سکتا جس کے لئے
"اشارات" تحریر کئے جاتے ہیں۔ حضرتِ جوش اہلِ ملک سے اُن کی پست
خیالیوں کی وجہ سے متنفر ہیں۔ اُن کو امراء، علماء، شعراء یا کسی دوسرے گروہ
میں ترقی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ اس بات کا احساس اُن کے دل میں
نہایت شدت اور انتہائی جوش کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا
واقعہ جو اہلِ ملک کی بے راہ روی کی وجہ سے مفادِ قومی کے خلاف رونما
ہوتا ہے۔ حضرتِ جوش کے خون کو کھولا دیتا ہے اور اُن کے دل کی گہرائیوں
میں خار کی طرح چبھتا ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کا سا حساس اور حب
وطن سے بھرا ہوا دل ہر اُس شخص کا ہو جائے جس کو اُن کے خیالات کا علم ہو،
یہی وہ باتیں ہیں جو "اشارات" کے مطالعہ کرنے والے کے دل میں پیدا
ہوتی ہیں اور بس۔ اُن کے خیالات تخریبی ہیں تعمیری نہیں۔ افسوس کہ وہ مقصد
جو "اشارات" کی تحریر میں پنہاں ہے پورا نہیں ہوتا، یعنی قارئین کی حالت
کو درست کرنے میں "اشارات" مطلق معاون نہیں ہوتے۔ میرے خیال
ناقص میں اس کے لئے اُن کی شاعرانہ ذہنیت ذمہ دار ہے۔ مسائلِ دنیا کو
شاعر جس انداز میں بیان کرتا ہے، اسی انداز کو اُنھوں نے نثر میں قائم رکھنا
چاہا۔ "نقادِ سخن"، "ذاکر سے خطاب" اور "خاتونِ مشرق" ایسی نظمیں ہیں جو
اُردو کی کلاسیکی شاعری میں جگہ پانے کی مستحق ہیں، لیکن اگر وہی اندازِ بیان
جو ان نظموں میں اختیار کیا گیا ہے۔ نثر میں اختیار کیا جائے تو وہ نثر یقیناً
کسی سنجیدہ مزاج آدمی کے پڑھنے کے قابل نہ ہوگی۔

کلیم کے مطالعہ کرنے والوں میں، میرے خیال میں، زیادہ تر اس گروہ کے
لوگ ہیں جو نئی روشنی والوں کا گروہ کہا جاتا ہے۔ نئی روشنی والوں میں عقل اور
منطق دلائل اور استخراج نتائج بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں واعظ
اور خطیب کا گزر نہیں۔ اس لئے اگر حضرتِ جوش اپنے خطیبانہ اور واعظانہ اندازِ
تحریر کو بدل کر وہ رنگ اختیار کریں جو دل کے بجائے دماغ پر اثر کرے تو اُن کا
مقصدِ اصلاح بدرجۂ اتم پورا ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے،
گو ابھی تک حضرتِ جوش نے "اشارات" میں اپنے مخاطب کو "تم" سے خطاب
نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر یہی اندازِ بیان قائم رہا تو کسی نہ کسی دن اس ذلت
سے بھی سامنا کرنا ہوگا۔ مولانا شبلی، ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی
سے لے کر معمولی سے معمولی مصنف یا مضمون نویس کتاب یا مضمون کے پڑھنے
والے کو "تم" سے خطاب کرتا ہے۔ اس سے ہم پڑھنے والوں کے جذبۂ خودداری
کو سخت ضرب پہونچتی ہے۔ اس طرزِ خطاب سے جو روحانی تکلیف پہونچتی ہے،
اس کا اندازہ ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ ایسے مصنفین اور مضمون نگاروں سے
میں سوال کرتا ہوں کہ اگر کوئی آپ میں سے کسی سے یہ کہے کہ "تم نے مضمون
بہت خوب لکھا"، تو آپ اُس شخص کے متعلق کیا خیال کریں گے۔ بس وہی خیال
ہمارے دلوں میں بھی پیدا ہوتا ہے۔

یہ الفاظ محض بہ خیالِ حفظ ما تقدم عرض کر دئے گئے۔

(۳) مُلّا رموزی

جب کسی انگریزی کتب خانہ میں مجھے پروفیسر میکس مولر کی موٹی موٹی
کتابیں نظر آتی ہیں تو میرے دل میں ایک وحشت آمیز جذبۂ نفرت پیدا ہوتا
ہے اور منتظمین کتب خانہ کی بد مذاقی پر تاسف ہو کر میں جلد سے جلد کتب خانے
سے رخصت ہوتا ہوں یا جب انجمن ترقی اردو کی کتابوں میں "ملا وجہی"
اور "سب رس" قسم کی کتابیں دیکھتا ہوں تو بھی میرے دل میں ناموافق جذبات
کا ہیجان شروع ہو جاتا ہے، اسی طرح جب میں اردو رسائل یا اخبارات میں

مُلّا رموزی کا کوئی مضمون دیکھ لیتا ہوں ــــــــ مُلّا صاحب مجھے معاف فرمائیں ــــــــ تو میرا توازنِ دماغی قائم نہیں رہتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اب تک مُلّائے موصوف اخبارات اور رسائل کے حلقۂ ادارت میں سجدہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مُلّا رموزی بہت مقبول تھے، لیکن اب بفضلہٖ اُردو ظرافت نگاری اور طنز نویسی کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے، اور مُلّا رموزی اب بھی "اندر اس کے کے" "بیچ اس کے میں" "یہاں بہمہ وجوہ خیریت ہے" اور "دیگر احوال یہ ہے" کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ظرافتِ ذہنی، طنزِ شگفتہ، اور مضحکاتِ شیریں کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے۔ جن معاملات پر وہ نکتہ چینی کرنا چاہتے ہیں اُن کا انتخاب بعض اوقات ناموزوں ہوتا ہے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ مُلّا صاحب اس ذہنی انقلاب کے ساتھ ساتھ نہیں چل رہے ہیں، جو مُلک میں عرصے سے رُونما ہے، اور بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات و رسائل کے ادارت خانے مُلّا صاحب کو قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور نتیجہ ظاہر ہے؟ الفاظ اور پوشاک، طرزِ تحریر اور اندازِ پوشش میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر نہیں ہے۔ تہذیب و تمدن، زبان و مذہب ان سب کی بقا کا راز عمل اور صرف عمل میں ہے، لکھنے والوں کے فقدان سے مجبور اور مُلّائے موصوف کی گزشتہ شہرت سے مرعوب ہو کر ادارۂ کلیم نے بھی اُن کے ــــــــ بقول اہلِ پنجاب ــــــــ "شاہکاروں" اور "جواہر پاروں" کے لئے جگہ نکالی لیکن انتخاب کچھ موزوں ثابت نہیں ہوا۔ ملائے موصوف اپنے ایک مضمون میں تاجروں اور دوکانداروں کے سائن بورڈوں پر بہت ناراض ہیں۔ لیکن جو لوگ اشتہار نویسی کی نفسیات سے واقف ہیں وہ تاجروں کی پابندیوں اور مجبوریوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تاجر خواہ اردو کی ترقی اور ترویج پر جان دیتا ہو، لیکن وہ اپنا اشتہار یا سائن بورڈ ان لوگوں کے واسطے تیار کرائے گا، جو اس کے خریدار ہیں۔ ولایت کے کسی پیٹنٹ دوا کے بکس کو کھولئے، دوا کی ترکیب استعمال اور اس کا اشتہار آپ کو ہندوستان کی ایک درجن زبانوں میں نظر آئے گا۔ دُور کیوں جائیے، ہندوستانی دواخانہ نے اردو ناگری اور انگریزی میں اپنے یہاں کے پمفلٹ شائع کرنا شروع کر دئے ہیں۔ ایسا کرنے سے اشتہار دینے والا یا دوکاندار ہرگز اپنی زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ لیکن ملا رموزی کو انھیں لوگوں کے کاندھوں پر اُردو کا جنازہ نظر آتا ہے۔ دہلی کے بعض تاجروں کے سائن بورڈ دیکھ کر اُن کا توسنِ فکر چراغ پا ہوتا ہے۔ وہ خدا جانے کیا کیا لکھ مارتے ہیں، تاجروں کے سائن بورڈوں اور طلبا، کی انگریزی آمیز گفتگو میں ان کو اردو کی موت نظر آتی ہے۔ اس قدر نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ایسے فضول اعتراضات اُردو کی ترویج میں معین ہو سکتے ہیں۔ میں نے ایک بار پروفیسر اشتیاق حسین ــــــــ نام مجھے صحیح طور سے یاد نہیں ہے ــــــــ کا لکچر فتحپوری ہال میں سُنا تھا جب وہ تازہ ایران سے واپس تشریف لائے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ایران کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہے اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ اہلِ ایران گفتگو میں بکثرت فرانسیسی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح، اگر مصری اخبارات ہمارے مُلّا صاحب کے مطالعے میں ہیں تو ان کو احساس ہوا ہوگا کہ اطالوی، فرانسیسی، اور انگریزی الفاظ کس طرح رفتہ رفتہ مصری زبان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل جب دنیا کی طنابیں روز بروز کھنچی چلی جا رہی ہیں ریل، ہوائی جہاز، تار، لاسلکی، سینما اور ریڈیو تمام ممالک کو ایک شہر بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں ایسے زمانے میں یہ اُمید کرنا کہ کوئی زبان خالص رہے اور دوسری زبان کی دست نگر نہ ہو ایک مضحکہ خیز خیال ہے، دراصل افراط و تفریط ہر موقع پر اور ہر جگہ غیر مفید ہیں۔ ہمارے ملک میں دو گروہ ہیں جن سے مجھکو بغض للّہی ہے، ایک وہ جو ہندوستانی ہوتے ہوئے خود کو بالکل انگریز تصوّر کرتا ہے، اور دوسرا وہ جو دنیا کا باشندہ ہوتے ہوئے خود کو صرف ہندوستانی سمجھتا ہے، دونوں غلطی پر ہیں۔ آخر الذکر گروہ ہر ممکن طریقے سے ان لوگوں کا مضحکہ اُڑاتا ہے جو انگریزی داں ہے، شاید وہ اس طرح اپنی انگریزی سے عدم واقفیت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی انگریزی داں "لالٹین رکھی ہے" کے بجائے "لیَن ٹرن رکھی ہے" کہے تو مُلّا رموزی اور ان کے ہم خیال اُردو کی موت کی پیشین گوئی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی عربی داں اُردو میں گفتگو کے دوران میں عین کی آواز حلق سے نکالے یا صاد کا تلفظ لبوں کے درمیان میں زبان لا کر کرے تو مُلّا صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور یہی وہ ہندوستانیت ہے جس پر مجھے اعتراض ہے۔

گفتگو میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی ملائے موصوف کے نزدیک اُردو کو گلا گھونٹ کر قتل کرنے کے مرادف ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جو جس فضا میں رہتا یا تربیت پاتا ہے اس کا اثر اس کی گفتگو پر بھی پڑنا ضروری ہے۔ انگریزی مدارس کے طلباء قدرتاً اردو گفتگو میں بھی ضرور انگریزی الفاظ استعمال کریں گے۔ یہی حال عربی مدارس کا ہے۔ عربی مدارس کے طلبا کے گروہ میں اگر آپ بیٹھ جائیں مگر ہوں آپ عربی سے ناآشنا تو آپ کو ان کی گفتگو سمجھنے میں بہت دقت ہوگی۔ طلباء بعض اوقات انگریزی اردو یا عربی فارسی ہی پر قانع نہیں رہتے ہیں۔ اکثر اپنے گوناگوں خیالات کو الفاظ میں لانے کی خاطر وہ نئے الفاظ اختراع کر لیتے ہیں جو آپ کو کسی زبان کی لغت میں نہیں ملیں گے اور اگر ملیں گے بھی تو ان کے وہ معنیٰ نہ ہوں گے جن معنوں میں طلباء بولتے ہیں۔ جن لوگوں کو علیگڈھ کالج یا یونیورسٹی میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے ان کو بکثرت ایسے الفاظ معلوم ہوں گے مثلاً چھاپنلزم۔ لفٹ دینا، بھیّا سوسائٹی، ملیٹو کلب وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کے الفاظ چلا پانے کے بعد زبان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً زید بڑا بدھو ہے یا بکر تو بالکل ڈُوٹ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "بدھو" اور "ڈیوٹ" کے الفاظ مذکورۂ بالا معنیٰ میں ابتدا سے نہیں بولے جاتے ہیں بلکہ رفتہ رفتہ زبان نے ان کو قبول کر لیا۔ الفاظ کے استعمال کو بالائے طاق رکھئے۔ کسی انگریزی داں کی اردو عبارت کا موازنہ کسی غیر انگریزی داں کی عبارت سے کیجئے۔ خواہ تمام الفاظ اردو ہی کیوں نہ ہوں لیکن آپ کو طرز ادا میں بیّن فرق نظر آئے گا پھر بہت سے الفاظ بھی ایسے ہوتے ہیں جن کو بلا قبول کئے ہوئے کام نہیں چلتا ہے۔ پروپیگنڈا اور ریڈیو کے الفاظ آج کل ہر شخص کی زبان پر ہیں لیکن کسی اردو کے بہی خواہ نے اردو کے ایسے الفاظ نہیں بتلائے جو ان کی جگہ استعمال کئے جا سکیں اور سندِ قبول حاصل کر سکیں۔

یونہیں ملا رموزی کا پارہ مزاج سب سے اونچے درجہ پر پہونچ جاتا ہے جب وہ انگریزی پوشاک کی تضحیک پر قلم فرسائی فرماتے ہیں۔ صرف ملا رموزی ہی پر منحصر نہیں بلکہ اکثر قدامت پرست حضرات اس مضمون پر گہر فشانی فرمانے میں ظرافت اور طنز کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پوشاک کے متعلق بہت سے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس موقع پر زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے تاہم بعض ضروری امور کے متعلق گزارش لازمی ہے۔ اگر پوشاک کی تدریجی اور ارتقائی ترقی کا افسانہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب چھال اور پتے

ستر پوشی کا کام دیتے تھے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف قسم کی پوشاکیں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ اور ابتدا سے اب تک برابر تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ جو پوشاک اس وقت قدامت پرستوں کے گروہ میں مقبول ہے گزشتہ صدی کی پیداوار ہے۔ اگر پوشاک تبدیل ہوتی رہتی ہے تو ملا رموزی اور ان کے ہم خیال حضرات کیوں ترقی پسند گروہ کی راہ میں اپنے مضحکات و طنزیات کا روڑا اٹکا کر اپنی قدامت پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سوسائٹی کے بعض افراد پر سراسر ظلم کر رہے ہیں۔ ملا صاحب چاہتے ہیں کہ ایک کسان جس وقت کھیت پر ہل لے کر جائے یا مزدور جب کسی کارخانے میں کسی مشین پر کام کرنے جائے تو وہ پاجامہ پہنے ہو، اچکن ڈانٹے ہو، کاندھے پر رومال پڑا ہو، اور ایک کشتی نما دفتی کی ٹوپی سر پر رکھے ہو۔ یا کالج یا اسکول کے لڑکے جب ہاکی یا فٹ بال کھیلنے نکلیں تو جبّہ و دستار سے مزیّن ہوں، یا فوج کا یا پولیس کا سپاہی جب تو اعد کرنے کے لئے میدان کی طرف رخ کرے تو اس کے کرتے کا دامن زمین بوسی کرتا ہوا چلے۔ اگر وہ ایسا نہیں چاہتے ہیں تو وہ میرے ہم خیال ہیں۔ اور اگر وہ میرے ہم خیال ہیں تو پھر ان کی تمام ظرافت آفرینیاں بے سود ہیں۔

کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے لیکن میں بہ ادب ملا صاحب سے عرض کروں گا کہ پوشاک کا جمالیاتی پہلو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں مخترعینِ پوشش نے اس پہلو کو بھی ضرور پیش رکھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انگریزی پوشاک پر جو اعتراض کرتے ہیں وہ قدامت پرستی سے مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں یا حقیقتاً وہ خوبیاں اس پوشاک میں نہیں پائی جاتیں جو ہونی چاہئیں۔ اس کا فیصلہ میں ملا صاحب پر چھوڑتا ہوں۔

ہمارے ملک میں نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو پوشاک میں نسوانیت کا قائل ہے جس طرح گروہ صوفیا میں ایک اسی قسم کا گروہ تھا ملا صاحب اس گروہ کے بہت خلاف ہیں اور گو ان کے حملے ناموزون اور طنز بھدے ہوتے ہیں تاہم عمومی حیثیت سے میں ملا صاحب کا بالکل ہم نوا ہوں۔ ایسی پوشاک میں جائز سمجھتا ہوں جو مردانہ حُسن کو چار چاند لگائے لیکن ایسی پوشاک جو نوجوانوں کو "ہیجڑا" کہے جانے کا مستحق قرار دے سراسر مذموم ہے۔

کچھ عرصہ سے ملائے موصوف نظم کی طرف مائل نظر آتے ہیں لیکن میں

یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی نظمیں ابھی کلیم میں جگہ پانے کے قابل نہیں ہیں کسی دریا پر جانا، گھاٹ پر یا راستے میں کسی حسینہ سے مڈبھیڑ اس کی شرمائی اور دبی للچائی ہوئی نظروں کی مواصلت، ساڑھی کا ڈھلکنا، ماتھے کی بندی، پھولوں کا گجرا یا گال، ایک فرسودہ اور پامال شدہ مضمون ہے۔ ملا صاحب کلیم کے ایک نمبر میں اس پر طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ ارتباطِ لفظی کے لئے ایک مصرع دوسرے مصرع کا محتاج رہتا ہے۔ اظہار مفہوم کے لئے الفاظ تلاش کئے جاتے ہیں اور نہیں ملتے۔ تشبیہات بھدی ہیں خیالات منتشر ہیں۔ لیکن وہ نظم کلیم کے سے رسالے میں شائع ہوتی ہے

(۴)

اردو از مولانا محمود علی ماہر

زبانِ اردو کی تشبیہ ایک دولہن سے ——— شاید یہ حضرت آزاد کی جدت تھی۔ ان کے بعد بہتوں نے اسی تشبیہ کو اردو کا ذکر کرنے میں اختیار کیا۔ یہاں تک کہ اب اگر اس کا اعادہ کسی مضمون میں کیا جاتا ہے تو اس کے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کلیم کے ایک پرچے میں ماہر صاحب نے پھر وہی داستان دہرائی ہے۔ اردو کو نئی نویلی دولھن بنایا ہے۔ اس کے سہاگ کی رات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے شباب اور جوانی کا نقشہ کھینچا ہے ——— وہی پرانا قصہ۔ وہی فرسودہ کہانی حضرت آزاد نے شاہجہان کے زمانے سے ابتدا کی۔ کسی صاحب نے اس کو خلجی بادشاہوں تک پہونچایا۔ کسی نے محمود غزنوی کو اردو بولتے سنا ابھی بعثتِ رسول سے ہم زمانہ ثابت کرنے والے پید ابھی نہیں ہوئے تھے کہ کلیم کے مضمون نگار نے مہاراجہ بکرماجیت کے زمانے میں عربی اور فارسی الفاظ کا اس زمانے کی زبان میں داخل ہونا بیان کیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ دعویٰ غلط ہے اس لئے کہ یہ ایسا مضمون ہے جس پر میرا خود سر دماغ غور کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوتا ہم دلیل محتاجِ ثبوت تھی صاحبِ مضمون کو پرتھی راج راسا جس کا حوالہ دیا ہے، کا اقتباس دینا تھا۔ اور بفرضِ محال اگر اس وقت فارسی یا عربی کے دو چار لفظ استعمال بھی کئے گئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ ہندوستان اور عرب و ایران میں تجارتی تعلقات قائم تھے۔ وقتاً فوقتاً اہلِ ایران سے لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ممکن ہے کہ دو چار لفظ رواج پا گئے ہوں، لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ زبان کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی۔ اردو کے قیام اور اس کی زیست کے لئے اس کی قدامت کوئی دلیل نہیں ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اردو کی ابتدا کسی قدیم ترین زمانے سے ثابت کر دیں تو یہ بات اس کے بقا میں معاون ہوگی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر زبان میں صلاحیت زیست ہے تو کسی قسم کا پروپیگنڈا اس کو مردہ نہیں کر سکتا اور اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو اس کی تاریخ کی انتہائی قدامت بھی اس کو زندہ نہیں رکھ سکتی۔

(۵)

آربند و گھوش

ہم میں سے جو لوگ گزشتہ صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ہیں ان کی یاد میں اربند و گھوش نے پہلے پہل قضیۂ تقسیم بنگال میں شہرت حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ان کا ذکر محض پانڈیچری کے سنیاسی کی حیثیت سے باقی رہ گیا ہے۔ دنیا اور مسائلِ دنیا کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے سیاسیات میں ان کی روش کیا ہے۔ مذہب کے متعلق ان کے خیالات کیا ہیں، فلسفہ کی گہرائیوں میں وہ کہاں تک پہونچے ہیں۔ ان تمام سوالات کے جوابات سے اردو دان طبقہ میری رائے میں قطعی نابلد ہے اُن کے مضامین کے ترجمے بہت شگفتہ ہیں۔ نہایت سلیس ہیں لیکن اس شخص کے ذہن میں جو آربندو گھوش کے نقطۂ نظر سے ناواقف ہے بکثرت سوالات ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کے جوابات ان مضامین میں نہیں ملتے ہیں۔ اگر مضامین کی ابتدا سے قبل آربندو گھوش کی زندگی اور ان کے خیالات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جاتا تو یہ وقت باقی نہ رہتی۔ خیر یہ کمی اب بھی پوری کی جا سکتی ہے۔

(۶)

مردِ مُضحک

مردِ مضحک کے مترجم کو داد دینے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ ایسا شگفتہ، ایسا سلیس، اور اس قدر بامحاورہ ترجمہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس کی

روح ترجمے میں بدستور موجود ہے۔ لطیف طنز اُسی قوت سے اردو میں بھی نمایاں ہے۔ تفصیلات کے بیان میں ترجمے نے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی۔ ادبی خوبیاں اصل اور ترجمے میں برابر پائی جاتی ہیں۔ یورپی زبانوں سے اس قسم کے افسانوں کے ترجمہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے فسانہ نگار باوجود گذشتہ زمانے کی غیر معمولی ترقی کے اب تک اس معیار سے بہت دور ہیں جو یورپ نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارے بعض فسانہ نگار بڑے شد و مد سے اعلان کرتے ہیں کہ ان کا فسانہ تحلیلِ نفسی کا شاہکار ہے، سیرت نگاری کا در بے بہا ہے۔ رنگینی اور آرٹ کا بہترین نمونہ ہے، یا تخلیق کردار کا انمول موتی ہے۔ لیکن دراصل یہ ہے کہ کسی یورپی زبان کے فسانہ کو اردو کا جامہ پہنا کر ہندوستانی پس منظر کا غازہ لگا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اگر فسانہ کو پڑھیے تو ان سب خوبیوں سے کوسوں دور نظر آئے گا جن کے وجود کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہمارے فسانہ نگار اب تک واقعات کو سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ مطالعۂ عمیق کی ہر طرف کمی نظر آتی ہے۔ منشی پریم چند نے دیہات کے زندگی کے مطالعے میں اپنی عمر ختم کر دی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع بھی تھا اور عمیق بھی، لیکن مردِ مضحک کے مصنف کے برابر نہیں۔ طوفان کی کیفیت، کشتی کا سین، اہلِ کشتی کے حالات، برف باری کا منظر غرض سب کچھ وسیع اور عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے۔ بحرِ شمالی سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر پڑھنے پر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام واقعات ہماری نظروں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ ہماری زبان میں اس قسم کے افسانوں کے ترجمے کئے جائیں لیکن مترجم بھی ویسے ہی ہوں جیسے مردِ مضحک کے مترجم۔

(۷) حکیم عبدالوالی کا خط

لکھنو کے اطبائے جھنوائی ٹولہ کے خاندان کے تین افراد کے ناموں میں ——— اصحابِ متعلقہ معاف فرمائیں ——— مجھے ہمیشہ دھوکا ہوتا ہے حکیم عبدالقوی، حکیم عبدالولی، اور مسٹر یا حکیم عبدالوالی۔ میں ایک کو بجائے دوسرے کے سمجھنے لگتا ہوں۔ بہرحال ان تینوں صاحبان میں سے جو صاحب میرے ذہن میں ہیں میں ادارہ کلیم سے درخواست کروں گا کہ جو معاوضہ بھی ممکن ہو پیش کر کے ان صاحب کو یا تو حلقۂ ادارت میں یا حلقۂ مضمون نگاران میں شامل کر لیا جائے۔ خیالات کی جدت، تحریر کی سادگی، طرزِ ادا کا بے ساختہ پن عبارت کی شوخی، قدامت سے نفرت، فلسفیانہ موشگافیاں، مضامین کی آمد ظرافتِ ذہنی کی افراط ——— غرض کوئی توصفت ایسی نہیں ہے جس کے جوہر ان کا قلم دکھاتا ہو۔ اتنا لکھنے کے بعد میں نے اپنی ایک غلطی محسوس کی۔ ان کو حلقۂ ادارت میں شامل تو ضرور کیا جائے لیکن ان کو انتظامی معاملے سے الگ رکھا جائے۔ ہر ذہین آدمی کی طرح وہ بھی سیماب صفت معلوم ہوتے ہیں۔ میری یاد میں آسمانِ صحافت پر ان کا ستارہ بارہا طلوع ہوا اور بڑی آب و تاب سے چمکا لیکن .... نتیجہ سب جانتے ہیں۔

(۸) ڈاکٹر اشرف

خواہ آپ کی رائے سے ہمیں اتفاق نہ ہو لیکن یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے خیالات سلجھے ہوئے ہیں، طرزِ ادا متین ہے۔ عبارت سلیس لکھتے ہیں، درحقیقت کلیم کے سے رسالے کے واسطے ایسے ہی مضمون نگاروں کی ضرورت ہے۔ آپ سوشل، اقتصادی، اور سیاسی مسائل کو اس عینک سے نہیں دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے آبا و اجداد سالہا سال سے دیکھتے آئے ہیں۔ پرانی تاریخی کہانیاں اور ان کے متعلق بے سر و پا لاف زنی سنتے سنتے طبیعت اُکتا گئی۔ ہر شخص کسی نئے نقطۂ نظر کا متلاشی ہے۔ اور واقعاتِ عالم کو کسی نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف اور عبدالوالی صاحب کے سے مضمون نگار سوچنے اور غور کرنے کے لئے کافی مواد اکٹھا کر دیتے ہیں غالباً ڈاکٹر اشرف پہلے شخص ہیں جنھوں نے سرسید کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہایت جرأت سے کیا ہے۔ سرسید نے اپنے وقتوں میں مصالح ملکی و قومی کا لحاظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی کیا ہو اس کا تجزیہ اور تحلیل کسی مورخ کے لئے چھوڑنا چاہیئے لیکن یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ ان لوگوں کا رویہ کہاں تک حق بجانب ہے جو سرسید کی پالیسی اب بھی سراہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اب بھی لوگ اسی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ ہمارا ملک ایک دورِ انقلاب سے گزر رہا ہے جو مطمحِ نظر ملک کی ہر جماعت نے قائم کیا ہے اس کے حصول کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ سیاسی غلط فہمیاں اور اقتصادی کج رویاں

منظرِ عام پر لائی جائیں جنھوں نے ایک صدی سے ہماری قومی زندگی کو معیبت بنا دیا ہے اور ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔

۹ دتاتریہ کیفی

آپ ہماری زبان کے لئے نہایت ٹھوس کام کر رہے ہیں۔ مطالعۂ عمیق آپ کے تمام مضامین کی جان ہے۔ آپ نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے مسائل پر کافی غور کیا ہے۔ کوئی مضمون ایسا نہیں ہوتا جس میں کوئی نہ کوئی اچھی اور سودمند تجویز موجود نہ ہو۔ خصوصاً نئے الفاظ کے اختراع میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کی تمام تجاویز کو سندِ قبول نہیں حاصل ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی بکثرت تجاویز ایسی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے اردو زبان میں قوت، شگفتگی، سادگی، اور زور پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔ اسما سے افعال بنانے کا سوال پرانا ہے۔ وحید الدین سلیم اس کے زبردست مؤید تھے اور آپ ان کے ہم خیال ہیں۔ مضمون زیرِ بحث میں بھی آپ نے "سلکانا" اور "آبدوزنا" دو مصدر مشتق کئے ہیں۔ لیکن اردو داں طبقے نے ابھی تک اس قسم کی تجاویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا ہے۔ حیدرآباد میں ضرور یہ طریقۂ اشتقاق بہ نسبتِ شمالی ہند کے زیادہ رواج پانے لگا ہے۔ مگر امید ہے کہ ضرورت بہت جلد شمالی ہند والوں کو بھی اس کو اختیار کرنے پر مجبور کر دے گی۔

۱۰ اردو شاعری از حضرت احتشام رضوی

اردو شاعری کے جدید رجحانات کے متعلق پر مغز اور قابلِ غور مضمون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعرائے قدیم ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جب یا تو عیش پرستی کا دور تھا یا اس عیش پرستی کے دور سے رخصت ہو جانے کے غم کا زمانہ تھا۔ شعراء کا دائرہ فکر محدود تھا۔ سوسائٹی جس میں اُنھوں نے نشو و نما پائی تھی محض درباری زندگی اور اس کے پر تکلف اور بناوٹی رسم و رواج کی زنجیروں میں مقید تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیگر اصنافِ ادب کی طرح شاعری بھی ایک محبوس قفس پرندکی طرح اپنے تنگ دائرہ میں محدود رہ گئی۔ جتنی جتنی سوسائٹی کی وہ بندشیں دور ہوتی جاتی ہیں، پرانے رسم و رواج کے قیود مٹتے جاتے ہیں۔ قفس کی تیلیاں ٹوٹتی جاتی ہیں۔ شاعری بھی اپنا روپ بدلتی جا رہی ہے۔ اب شاعری شاہی تکلفات کو بھول چکی، ایران کے شعراء کی تقلیدِ کورانہ کا خیال شعراء کے ذہن سے نکلتا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی میری رائے میں ہماری شاعری کم از کم مضمون یا پس منظر کے انتخاب میں، طرزِ ادا میں، خیالات میں، عوام سے دور ہے۔ بعض شعراء اس جانب متوجہ ضرور ہیں لیکن ان کی توجہ کا نتیجہ محض یہ ہے کہ بعض اوقات وہ عوام کے لئے شاعری کرتے ہیں لیکن عوام کی شاعری نہیں کرتے۔ ہندی میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے دیہاتی گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ اردو میں بھی عظیم کریوی بعض اوقات انھیں گیتوں کا ترجمہ اور شاید کبھی کبھی کوئی نیا گیت شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ شعراء کے طرزِ ادا، طرزِ تخئیل، انتخابِ الفاظ، اور زاویۂ نگاہ میں اور ان لوگوں کی انھیں باتوں میں کیسا بیّن فرق ہے جنھوں نے ان گیتوں کو نظم کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کا مقابلہ ان گیتوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن اُن سے ہم کو کم از کم اس بات کا اندازہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ ہماری شاعری ابھی عوام سے کتنی دور ہے۔ ہماری شاعری کا میدان وسیع ہو گیا ہے۔ ہمارے شعراء کو خود قائم کردہ قیود سے آزادی حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی نظریں کشادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کے خیالات کی پرواز انھیں پروین و ثریا سے ہٹ کر دنیا کے گوشوں میں پہنچا رہی ہے۔ لیکن ابھی صرف ابتدا ہے۔ تصنع اور تکلف کی کثافتوں سے اب تک ہمارے شعراء گلو خلاصی نہیں کر سکے۔ لیکن جیسا حضرت احتشام رضوی نے فرمایا ہے کہ ہماری شاعری کا رجحان اس طرف بھی ہے۔ امید ہے کہ جتنی جتنی تعلیم عام ہوتی جائے گی علم کی شعاعیں جس قدر اکنافِ ملک میں پہنچتی جائیں گی اتنی ہی ہماری شاعری بھی اس جانب ترقی کرتی جائے گی۔

۱۱ کلیم کی عام حالت

کلیم کی عام حالت بہت سے چوٹی کے رسائل سے بہتر ہے۔ البتہ قصائد کے انتخاب میں کسی قدر اصلاح کی ضرورت ہے۔ میرا منشا عریاں پسندی

کے خلاف احتجاج کرنے کا نہیں ہے۔ میں ان حضرات کا ہم نوا نہیں جنھوں نے بعض تصاویر کے "اخلاق سوز" مناظر کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ تصاویر کا انتخاب فنی اعتبار سے نہیں ہوتا۔ کوئی ایسی تصویر جس میں کوئی خصوصیت نہ ہو کلیم میں شائع نہیں ہونی چاہئیں۔ نیز تصاویر کے بلاک تیار کرانے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ بعض تصاویر میں وہی خد و خال موہوم نظر آتے ہیں جن کو سب سے زیادہ روشن ہونا چاہیے تھا۔

۱۲ تجاویز

ادارۂ کلیم کے پیشِ نظر جو مقصد ہے اس کا خیال کرتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کے مسائل دلچسپ طریقہ سے اور آسان زبان میں پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ حسبِ ضرورت تصاویر کے ذریعے سے بھی ان مسائل کو سمجھایا جائے۔ مختلف ممالک اور ہندوستان کی ادبی، اقتصادی، سوشل اور سیاسی تاریخ کے ابواب جدید طرز پر تحریر کیے جائیں جن میں بادشاہوں و جنگوں کا ذکر تو کم ہو لیکن مختلف دور میں سوسائٹی میں جو انقلابات ہوئے ہیں ان کا ذکر زیادہ ہو۔ جغرافیائی معلومات دلکش پیرایہ میں پیش کی جائیں۔ قطبین کے دریافت اور پہاڑوں کی چوٹیوں یا سمندروں کی گہرائیوں میں پہونچنے کے لئے جو جو قربانیاں کی گئیں اور کی جارہی ہیں ان کا مفصل بیان مع تصاویر کے شائع کیا جائے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر جن لوگوں نے کئے ہیں ان سے وہاں کے لوگوں کے حالات قلمبند کرائے جائیں۔ اقتصادیات اور سیاسیات میں جو نئے نئے اور جدید نظریئے قائم کئے جارہے ہیں ان کے متعلق ماہرین سے مضامین حاصل کر کے شائع کئے جائیں۔ اس طور سے کلیم اپنے مقصد سے قریب تر ہو جائے گا۔ اور ادارۂ کلیم کو ملک اور ادب کی صحیح خدمت کرنے کا فخر حاصل ہوگا۔

مغموم ہوں ذوقِ خوشدلی کی سوگند
ہر سانس ہے موت زندگی کی سوگند
ہر چیز نظر آتی ہے دھندلی دھندلی
فرقت کی اداس چاندنی کی سوگند

جوش

نقد و نظر

ادارۂ کلیم

میدانِ عمل

اس دور کی اردو افسانہ نگاری کے میدان میں ابتدائً دو شہسوارانِ ادب اوروں سے الگ ایک نئی راہ لئے بناتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایک ان میں سلطان حیدر جوشؔ ہیں دوسرے سجاد حیدر یلدرم۔ انکا دور اگرچہ بہت ہی مختصر رہا لیکن انھوں نے افسانہ نگاری میں جس طرز جدید کو متعارف کیا اور اس فن پر اپنے جو نقوش چھوڑے انہی پر در اصل بعد کو دورِ جدید کی اردو افسانہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ اردو ادب میں مختصر افسانوں کو درجۂ قبول تک پہونچانے میں جن اُردو ادیبوں نے ان دونوں کے بعد توجہ کی ان میں پانچ نام نمایاں ہیں، ظفر عمر، نیاز، ل احمد، سدرشن اور پریم چند۔ ظفر عمر کی ادبی خدمات اگرچہ بہت مختصر ہیں اور یہ صرف چند جاسوسی افسانوں کے ترجموں تک محدود ہیں لیکن عوام میں مختصر افسانوں کا ذوق پیدا کرنے میں ان سے بڑی مدد ملی۔ نیاز اور ل احمد نے البتہ اس لائین میں بڑی محنت سے کام کیا اور فن کے اعتبار سے بھی نہایت اچھے اچھے افسانے لکھے لیکن انکے افسانوں کو قبول عام کا درجہ حاصل نہو سکا۔ اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں نے ابتدائً یونانی علم الاصنام کو اپنے پیش نظر رکھا، اور اس نامانوس موضوع پر ایسی غیر مانوس زبان میں افسانے لکھے جس سے سوائے ایک خاص جماعت کے عام اردو داں طبقہ بے تکلف نہو سکا۔ اگرچہ کچھ دنوں بعد ان دونوں نے علم الاصنام سے علیحدہ ہوکر بھی بعض بہت اچھے افسانے لکھے ہیں اور کردار نویسی میں بھی بڑی دقت نظری کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کے باوجود انکی طرز تحریر نے انکی کاوشوں کو وقف عام نہ ہونے دیا۔ نیاز اور ل احمد کے انداز تحریر میں اگرچہ جدت اور بڑی حد تک ندرت بھی پائی جاتی ہے لیکن یہ افسانوں کے مطلب کی نہیں۔ افسانے کی زبان نرم لوچدار اور مشاہدات میں ڈوبی ہوئی ہونی چاہئے نہ کہ ایسی سخت، مغلق، اور پیچیدا کہ پڑھنے والے کو قصہ کی دلچسپیوں سے نکالکر الفاظ اور ترکیبوں کے گورکھ دھندے میں اُلجھا دے تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ اُردو افسانوں سے اردو داں طبقہ میں صحیح ذوق پیدا کرنے میں انکا بھی حصہ ہے۔ انہی دونوں کے ساتھ ساتھ دو اور ادیب اس میدان میں تیزی سے گامزن نظر آئے یہ پریم چند اور مہاشہ سدرشن تھے۔ سدرشن اگرچہ اس لائین میں پریم چند سے بہت جونیر تھے اور بہت تھوڑے عرصہ باقی رہے لیکن اس مختصر سی مدت میں افسانہ نگاری کے سلسلہ میں جو کام انھوں نے کیا وہ ایسا بے اثر نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جاسکے۔ سدرشن پر بنگالی ادب کا اثر بہت زیادہ تھا اور پریم چند پر ہندی کا۔ سدرشن نے بنگالی افسانوں کے ترجموں سے ابتدا کی اور بعد کو اوریجنل افسانے لکھے لیکن پریم چند نے ابتدا ہی اوریجنل افسانوں سے کی اور آخر تک اسی پر قائم رہے۔

صلاحیت اس فن کی دونوں میں نمایاں تھی، خیالات میں دونوں کے رفعت و بلندی پائی جاتی تھی اور زبان میں دونوں کے سلاست و روانی، لوچ اور نرمی ہوتی تھی۔ البتہ ایک بنیادی فرق ان دونوں میں ابتدا ہی سے نمایاں تھا۔ سدرشن سطح کے نقاش بہت اچھے تھے لیکن اس سے آگے وہ نہیں بڑھتے تھے۔ اور پریم چند جذبات کی گہرائیوں اور کردار کی نفسی کیفیات کا چربہ اتارنے میں زیادہ محنت کرتے تھے۔ اس سعی پیہم سے انکے افسانوں میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ وہ حقیقت اور واقفیت سے زیادہ قریب اور اپنی اثر پذیری کے اعتبار سے زیادہ کامیاب محسوس ہونے لگے۔ انکے افسانوی کردار اصلیت اور واقفیت کے زندہ اور بے تکلف مرقعے اور انسانی زندگی کے مکمل اور قابل تقلید نمونے دکھائی دینے لگے ــــ پریم چند کی یہی خصوصیت تھی جس نے بالآخر انہیں اپنے دور کے سارے افسانہ نگاروں سے آگے نکال دیا اور وہ دور جدید کی اُردو افسانہ نگاری کے سرعسکر تسلیم کر لئے گئے۔ یہ وہ اعزاز ہے جس میں اسوقت تک منشی پریم چند کا کوئی حریف نہیں۔

پریم چند کے سیاسی عقائد چاہے کچھ ہی ہوں لیکن انھوں نے اپنے افسانوں کے لئے سوشیل اور معاشی مسائل کو منتخب کر لیا تھا اور انہی پر وہ اپنا سارا زور قلم صرف کیا کرتے تھے سول نافرمانی کے دور کے بعد انھوں نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن میں عدم تشدد کے عقیدے پر بحث کی ہے یا شراب کی دوکانوں پر پکیٹنگ انکے اثرات اور اخلاقی نتائج پر گفتگو کی ہے اور ایسے افسانے بھی انھوں نے لکھے ہیں جن میں ہندو مسلم اختلافات کی تشریح کی ہے اور گائے اور باجے کے سلسلہ میں ان دونوں قوموں میں جو چند بحث پیدا ہوگئی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے، لیکن ان افسانوں میں بھی وہ اپنے سوشیل نقطہ نظر سے دست بردار نہیں ہوئے۔ آخر عمر میں انہیں گاندھی جی کی اچھوت اُدھار تحریک سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ اس دور کے انکے تقریباً سارے افسانوں میں اچھوت کردار زیادہ نمایاں اور زیادہ موثر انداز میں پیش ہوا ہے۔ اور تفصیلات کے ذریعہ انھوں نے اپنے اس مشن کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے اچھوت ادھار کی تحریک بھی سوشیل اصلاح ہی کی سرحد میں داخل ہے۔ اس اعتبار سے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کی زندگی کا اصلی مشن سوشیل اور معاشی اصلاح کا پیغام تھا جو افسانوں کے رنگ میں انھوں نے ملک میں پہونچا دیا۔

"میدان عمل" منشی پریم چند کا آخری مستقل کارنامہ ہے۔ اس میں وہ ساری خصوصیات اپنی پوری تابانی کے ساتھ جمع ہیں جنھوں نے پریم چند کو دور جدید کا سب سے بڑا افسانہ نگار بنا دیا۔ امرکانت اور سکھدا کے کردار پیش کرنے میں انھوں نے بڑی نفسیاتی تحقیق اور دقت نظری کا ثبوت دیا ہے اور اپنے ناول میں دلکشی قائم رکھنے کے لئے بجائے حسن و عشق کی چاشنی دینے کے اچھوتوں کی اصلاح اور مزدوروں اور کسانوں کے فلاح اور بہبود جیسے خشک مسائل کو جڑ دیا ہے اور اپنی شیریں تحریر اور زبردست قوت مشاہدہ سے کام لیکر ناول کی دلکشی کو آخر تک قائم رکھنے میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ امرکانت اور سکھدا کے علاوہ اور جس قدر کردار اس ناول میں پیش ہوئے ہیں وہ سب کے سب اپنے ماحول کے اعتبار سے مکمل اور سبق آموز ہیں اور اسقدر مہذب انداز میں پیش ہوئے ہیں کہ ہر عمر اور ہر سوسائٹی کے افراد اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔

"میدان عمل" اس حیثیت سے بھی کہ یہ منشی پریم چند کی ۲۰ سالہ ادبی خدمات اور کامیاب افسانہ نگاری کا حاصل ہے اور اس سے بھی یہ بے تکلف کسی دوسری زبان کے بڑے سے بڑے ادیب کے ادبی کارنامے کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے اس قابل ہے کہ وہ طبقہ جسے اپنی زبان اور اپنے ادب سے دلچسپی ہے اسے احترام کے ہاتھوں سے لے اور قدر کی نگاہوں سے اسکا مطالعہ کرے کہ اپنی زبان اور اپنے ادب کو ترقی دینے میں اسی جذبۂ صادق کی ضرورت ہے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ نے اسے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب، کاغذ نہایت دبیز، صفحات ۴۹۲ جلد بہت خوبصورت اور باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف ۶/ رکھی ہے

"م م"

پستالوزی کا فلسفۂ تمدن و تعلیم

پستالوزی، اٹھارویں صدی عیسوی کا مشہور جرمن مفکر ہے جس نے قومی تعلیم کے مسئلہ پر ایک نئے زاویہ سے نظر کی تھی اور ایک ایسا علمی نظریہ یورپ کے آگے پیش کیا تھا جس نے بعد کو یورپ کے تعلیمی نظام میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے نزدیک جدید مغربی تمدن کی تکمیل اور جامعیت کا راز، محض افراد کی ذہنی تربیت میں تھا، اور ذہنی تربیت کا مدار صرف تعلیم پر ہو سکتا تھا۔ ـــــ اعلیٰ تعلیم پر نہیں، ابتدائی تعلیم، اور ایسی تعلیم پر جو قوم کے نونہالوں کے نظری جوہر نکھار دے، انکی صلاحیتوں کو جلا دیدے، انکی خداداد قابلیتوں کے نشو و نما کا ذریعہ بن جائے۔ کیونکہ ذہنی تربیت جس آسانی سے بچوں کی ہو سکتی تھی اس آسانی سے بڑوں کی ناممکن تھی اور مستقبل میں تمدن کی تکمیل کا واحد ذریعہ وہ قوم کے انہی ہونہاروں کو سمجھتا تھا۔

اسے اپنی زندگی میں یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ اپنے اس نظریہ کو عملی حیثیت سے بھی آزما دیکھے۔ چنانچہ اس نے اپنے مقرر کردہ اصول کے ماتحت ایک یتیم خانہ اور مدرسہ بھی جرمنی میں قائم کیا تھا اگرچہ بعض وجوہ کی بنا پر یہ مدرسہ زیادہ دنوں نہ چل سکا لیکن اسکا تعلیمی نظریہ نہ صرف اپنی جگہ قائم رہا بلکہ اس عملی تجربہ سے اس میں جلا آ گئی اور رفتہ رفتہ اس نے انیسویں صدی کے آخر تک سارے یورپ کے نظام تعلیم کو متاثر کر لیا۔

پستالوزی بہ حیثیت فلسفی کسی بڑی شہرت کا مالک نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں وہ فلسفی تھا بھی نہیں۔ اس نے دنیا اور اس کے مسائل کو فلسفیوں کی طرح کبھی منطق اور ریاضی کے روکھے پھیکے مقررہ قواعد کے ماتحت حل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ایک بے تعلق جج کی طرح اس نے چند مقدمات سے ایک بے لاگ نتیجہ مستنبط کرنے کی کوشش کی۔ وہ دراصل ایک "فطری مفکر" ایک دردمند مصلح قوم تھا، جو دنیا میں ایک خاص مشن لیکر آیا تھا۔ قدرت نے اسے نہایت حساس، دردمند اور مخلص دل عطا کیا تھا اور رائی کی مدد سے وہ اپنے دور کی تمدنی کمزوریوں کا تجزیہ کرنے اور انکا علاج تجویز کرنے میں کام لیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے اس مشن میں اسقدر کامیاب ہوا کہ اسکا نظریۂ تعلیم آج بھی یورپ اور امریکہ میں یکساں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جرمنی میں جو اسکا وطن عزیز ہے آج بھی اسکی قبر پر عزت و احترام کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

"کوئی قوم اسوقت تک صحیح معنوں میں بڑی نہیں کہی جا سکتی جب تک اس میں ایک پستالوزی نہ پیدا ہو چکا ہو"

یہ موجودہ جرمنی کے سب سے بڑے محقق اور ماہر تعلیم پروفیسر سپرانگر کا اعتراف ہے جس سے پستالوزی کی شخصیت اور اسکے مشن پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید زبیری بی اے (جامعہ) ام اے پی ایچ ڈی نے اس کتاب میں نہایت جامعیت سے پستالوزی اور اس کے فلسفہ تمدن پر روشنی ڈالی ہے اور اس عنقا کے ساتھ یہ کتاب ملک کے آگے پیش کی ہے کہ پستالوزی اور اسکا نظریۂ تعلیم ہندوستان کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے اور کوئی ایسا پستالوزی ہندوستان میں بھی پیدا ہو جائے جو یہاں کے مروجہ نظام تعلیم پر توجہ کرے اور کردہ رد و بدل

ہندوستانی بچوں کو جسمانی ذہنی اور اخلاقی تباہی سے بچالے ——— فاضل مصنف کی اس تمنا میں یقیناً ہر محب قوم ہندوستانی شریک ہے۔ خدا کرے ہندوستان کے بھی جلد دن پھریں اور وہ بھی ایک "بڑی قوم" کہلائے جانے کی مستحق قرار دی جائے آمین!

لکھائی چھپائی دیدہ زیب، سائز ۲۰×۲۴/۱۶ صفحات ۲۱۶ قیمت صرف ۸ر، منیجر مکتبہ جامعہ سے مل سکتی ہے۔

("م م")

شمع راہ

جناب محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی مرحوم پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن و رکن رکین جامعہ عثمانیہ و ترقی اُردو کے چار خطبات جو مختلف مجالس میں پڑھے گئے تھے، جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی نے شمع راہ کی صورت میں مرتب فرما کر شائع کئے ہیں۔

پہلا خطبہ کعبہ کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت کو واضح کرتا ہے اور پروفیسر صاحب کی مذہبی تلاش کا حامل ہے۔ زبان بھی سادہ استعمال کی ہے۔

خطبۂ دوم رسوم شادی اور متاہل زندگی پر خطبۂ سوم ذکر میلاد پر اور خطبۂ چہارم تعلیم پر ہے۔ جو پہلے خطبہ ہی کی طرح تحقیق و تفتیش کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

لیکن کتاب میں کتابت کی بے انتہا اغلاط ہیں اور ان غلطیوں نے کتاب کی معنوی خوبیوں پر بظاہر پانی پھیر دیا ہے۔ بہرحال معنوی خوبیوں کے لحاظ سے کتاب نہایت خوب ہے اور قیمت بھی ۸ر زیادہ نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ:- دفتر کتابت صفوۃ اللہ بیگ صوفی (پبلشر) سجاد منزل دہلی۔

(وفا فرخ آبادی)

رسید

حسب ذیل کتب بھی بغرض ریویو موصول ہوئی ہیں:

۱۔ تنقیدات عبدالحق مرتبہ محمد تراب علی خاں باز سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۸۰۔ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ: کاشانۂ باز۔ بازار گھانسی۔ حیدرآباد دکن۔

۲۔ باز کے سو شعر۔ سائز ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات ۳۲۔ قیمت ۲ر ملنے کا پتہ۔ ایضاً

۳۔ آغا شاعر کے سو شعر۔ سائز ۲۰×۳۰/۳۲ صفحات ۳۲۔ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:- نگارستان ایجنسی کشمیری دروازہ دہلی۔

۴۔ خسرو ذیشان یعنی شہنشاہ جارج پنجم کے حالات زندگی از سعید احمد صاحب انصاری سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۰۰ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ۔ ایس ایم نذیر احمد گلی ۲۳ بیڈن پورہ قرول باغ دہلی

۵۔ ہدیہ اخلاص بحضرت اقبال از محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ صفحات ۴۲۔ قیمت ۳ر ملنے کا پتہ عبداللطیف اعظمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ۔ دہلی +

رفتار وقت

ادارۂ کلیم

انتخابات کے نتائج

جدید آئین کے ماتحت صوبائی اسمبلی اور کونسلوں (ایوان بالا) کے انتخابات پچھلے مہینہ میں ختم ہو گئے۔ چونکہ اسمبلی کے تمام نتائج کا اعلان بھی ہو گیا ہے۔ اور اسی مجلس کو ملک کی سیاست میں زیادہ اہمیت اور دستور میں زیادہ اختیارات حاصل ہیں اس لئے ہم اسمبلی کے صوبہ وار نتائج درج ذیل کرتے ہیں۔

یوپی

جماعت	نشستیں
کانگریس	۱۳۳
غیر متعلق مسلم	۲۹
مسلم لیگ	۲۷
نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی	۱۸
غیر متعلق ہندو	۹
زمیندار	۶
یورپین	۳
ہندوستانی عیسائی	۲
اینگلو انڈین	۱
ہندو سبھا	۰
میزان	۲۲۸

مدراس

جماعت	نشستیں
کانگریس	۱۵۹
جسٹس پارٹی	۱۶
پیپل پارٹی	۱
مسلم لیگ	۱۰
مسلم پروگریسو پارٹی	۱
غیر متعلق مسلم	۸
یورپین	۴
انڈین کامرس	۱
اینگلو انڈین	۲
دیگر	۱۰
میزان	۲۱۵

سی پی

جماعت	نشستیں
کانگریس	۷۱
رؤف شاہ جہلم پارٹی	۸
شریف مسلم پارٹی	۵
غیر متعلق مسلم	۱
غیر برہمن	۳

امبیدکر پارٹی	۴
نیشنلسٹ	۲
راجہ پارٹی	۱
یورپین	۱
اینگلو انڈین	۱
ہندو سبھا	۱
دیگر	۱۴
میزان	۱۱۲

بمبئی

کانگریس	۸۸
مسلم لیگ	۲۰
غیر متعلق مسلم	۱۰
یورپین اینگلو انڈین اور عیسائی	۸
انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی	۱۲
غیر برہمن	۸
ڈیموکریٹک سوراج پارٹی	۵
کسان پارٹی	۲
دیگر	۲۲
میزان	۱۷۵

بہار

کانگریس	۹۷
مسلم یونائٹڈ پارٹی	۶
مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی	۱۶
مسلم احرار پارٹی	۳
دیگر	۳۰
میزان	۱۵۲

اڑیسہ

کانگریس	۳۶
یونائٹڈ پارٹی	۵
نیشنل پارٹی	۴
غیر متعلق	۱۱
دیگر	۴
میزان	۶۰

آسام

کانگریس	۳۵
غیر متعلق ہندو	۱۰
یونائٹڈ پیپلز پارٹی	۳
آسام ویلی مسلم پارٹی	۵
برہما ویلی مسلم پارٹی	۵
مسلم لیگ	۹
پرجا مسلم پارٹی	×
غیر متعلق مسلم	۱۴
یورپین	۹
انڈین کرسچین	۱
غیر متعلق نسواں	۱
پسماندہ اقوام	۹
ہندوستانی باغبان	۲
لیبر	۴
میزان	۱۰۸

پنجاب

یونینسٹ	۹۹
کانگریس	۲۹

خالصہ نیشنلسٹ پارٹی	۱۳
ہندو الکشن بورڈ	۱۲
احرار مسلم	۲
مسلم لیگ	۱
کانگریس نیشنلسٹ	۱
اتحاد ملت مسلم	۲
غیر متعلق	۱۶
میزان	۱۷۵

سرحد

کانگریس	۱۹
ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی	۷
مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی	۲
غیر متعلق مسلم	۲۱
غیر متعلق ہندو	۱
میزان	۵۰

بنگال

کانگریس	۴۳
اچھوت اقوام	۳۱
غیر متعلق ہندو	۲۲
مسلم لیگ	۵۰
پرجا مسلم پارٹی	۳۵
کریشک پارٹی	۵
غیر متعلق مسلم	۳۳
یورپین	۲۵
اینگلو انڈین	۴
انڈین کرسچین	۲
میزان	۲۵۰

سندھ

یونائیٹڈ مسلم پارٹی	۲۳
کانگریس	۷
آزاد مسلم پارٹی	۳
مسلم پارٹی	۳
ہندو سبھا	۴
غیر متعلق	۱۷
یورپین	۳
میزان	۶۰

مذکورۂ بالا نتایج پر ایک نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صرف کانگریس اور مسلم لیگ دو ایسی جماعتیں ہیں جو تمام صوبوں میں ایک جماعت کی حیثیت سے انتخاب میں شریک ہوئیں۔ لہذا اِن دو جماعتوں کا مجموعی نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نام صوبہ	کانگریس	مسلم لیگ	دیگر	میزان
یوپی	۱۳۳	۲۷	۶۸	۲۲۸
مدراس	۱۵۹	۱۰	۴۶	۲۱۵
سی پی	۷۱	×	۴۱	۱۱۲
بمبئی	۸۸	۲۰	۶۷	۱۷۵
بہار	۹۷	×	۵۵	۱۵۲
اڑیسہ	۳۶	×	۲۴	۶۰
آسام	۳۵	۹	۶۴	۱۰۸
پنجاب	۲۹	۱	۱۴۵	۱۷۵
سرحد	۱۹	×	۳۱	۵۰

بنگال	۴۳	۵۰	۱۵۷	۲۵۰
سندھ	۷	×	۵۳	۶۰
میزان	۷۱۷	۷۱۷	۷۵۱	۱۵۸۵

آپ کو ان اعداد سے اندازہ ہوگا کہ چھ صوبوں میں کانگریس کی خالص اکثریت رہی یعنی تمام دوسری پارٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد سے کانگریس پارٹی کے ممبر وہاں زیادہ ہیں ۔ البتہ پانچ صوبوں میں کانگریس اقلیت میں رہی ۔ یعنی اسام ۔ پنجاب ۔ سرحد ۔ بنگال ۔ اور سندھ انیں سے آسام اور بنگال کے صوبوں میں یورپین عنصر زیادہ ہے اور بنگال ۔ پنجاب ۔ سرحد اور سندھ میں مسلم آبادی زیادہ ہے ۔ اس لئے کانگریس کو وہاں خاطرخواہ کامیابی حاصل نہوئی ۔ بہرحال مجموعی طور پر ۱۵۸۵ نشستوں میں کانگریس نے ۷۱۷ نشستیں حاصل کرلیں ۔ اور یہ کامیابی کسی پارٹی کے لئے کچھ کم قابل فخر نہیں ہے ۔

کانگریس کے بعد صرف مسلم لیگ ایک ایسی جماعت ہے جس نے ہندوستان کے تمام صوبوں سے اپنے امیدوار کھڑے کئے اور ایک حدتک اسے کامیابی بھی ہوئی ۔ مسلم لیگ کا نظام کانگریس کے مقابلہ میں نہایت ناقص نامکمل اور کمزور ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ درحقیقت اس کا کوئی مستقل نظام نہیں ہے ۔ یہ بھی صرف انتخابات کے زمانہ میں ہنگامی طور پر اس نے ایک عارضی نظام ترتیب دے لیا تھا اور یوں کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد بھی ہوگیا ۔ علاوہ ازیں عملی اعتبار سے بھی مسلم لیگ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی ۔ ڈرائنگ روم کی سیاست کے علاوہ مسلم لیگ نے کبھی مسلمانوں کی عملی سیاست میں کوئی رہنمائی نہیں کی اور سالانہ جلسے کرنے ۔ چند تجاویز پاس کردینے یا چند بیانات شایع کردینے کے علاوہ کبھی کوئی عملی کام نہیں کیا ۔ اس کے باوجود مسلم لیگ کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اسکا پتہ دیتی ہے کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جس میں سیاسی بیداری کے آثار نظر آرہے ہیں ۔ حالانکہ یہ بھی واقعہ اور افسوسناک واقعہ ہے جو موجودہ انتخابات سے اور زیادہ واضح ہوگیا ہے کہ مسلمانوں میں رجعت پسند طبقہ ابتک بااثر اور بااقتدار ہے ۔ جو مسلم حقوق کی آڑ لیکر اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرتا ہے اس لئے قطع نظر اس چیز کے کہ کانگریس یا مسلم لیگ اچھی جماعتیں ہیں یا نہیں اور مسلمانوں کو انمیں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں اس چیز کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے کہ مسلمانوں میں رجعت پسند طبقہ کا اثر و اقتدار کم ہو اور ترقی پسند طبقہ آگے بڑھے اور منظم ہوکر قوم و وطن کے تمام کاموں میں برابر کا شریک ہو ورنہ یقین رکھئے کہ ہمارا رجعت پسند طبقہ ہمیشہ غریبوں سے ناجائز فائدہ (Exploit) اٹھاتا اور اپنے اغراض پورے کرتا رہیگا ۔ اور مسلمان ملک کی سیاست میں صدیوں پیچھے رہ جائیں گے ۔

ہندوستان کا میزانیہ

حکومت ہند کا سالانہ میزانیہ جو ممبر مالیات نے اسمبلی کے اجلاس میں پیش کیا سابقہ میزانیہ کے ساتھ ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء کا میزانیہ

متوقع آمدنی	۸۳۱۴	لاکھ
متوقع خرچ	۸۳۰۸	لاکھ
متوقع بچت	۶	لاکھ

مذکورہ بالا میزانیہ نظرثانی کے بعد

آمدنی	۸۱۳۶	لاکھ
خرچ	۸۳۳۳	لاکھ
خسارہ	۱۹۷	لاکھ

سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء کا میزانیہ

متوقع آمدنی	۷۹۹۹	لاکھ
از ریزرو فنڈ	۱۸۴	لاکھ
متوقع خرچ	۸۳۴۱	لاکھ
متوقع خسارہ	۱۵۸	لاکھ
نئے ٹیکسوں کی آمدنی	۱۶۵	لاکھ
متوقع بچت	۷	لاکھ

(م ۔ ع ۔ خ)

مصری جدید برقعہ دو حصوں میں منقسم

تشریح بالائی حصہ

سر سے شروع ہوکر ہاتھوں کی لمبان تک رہتا ہے اس میں نہایت خوبصورت جُنبٹ دار ٹوپی ہے جس کے پہننے سے نہ سر کا شیپ ظاہر ہو اور نہ کسی قسم کی تکلیف

تشریح زیرین حصہ

کندھے سے شروع ہوکر پیر کے ٹخنے تک رہتا ہے۔ اس کی وضع مثل اُوور کوٹ کے ہے۔ کمر کے اوپر خوبصورت بلیٹ پڑے ہیں پہلو میں جیب ہے۔ کالر بھی مثل اُوور کوٹ ہے۔

بشرط واپسی منگائیں۔ ناپ کندھے پیر کے ٹخنے تک اور سر کی گولائی اِنچ کا ناپ کر روانہ کریں۔
قیمت سُوتی ہے، ٹسری عہ، کریب سلک عہ، ناپسند ہونے پر اُسی دن واپس کرنا لازمی ہے

پتہ یہ ہے **خاتون اسٹور ۴۰ فتحپوری بازار دہلی**

طبقہ نسواں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا اور سچا حامی

ماہوار مصور نامہ

جہان آرا

گزشتہ اعلان کے مطابق "جہان آرا" بالکل تیار ہو چکا ہے، صرف رجسٹر نمبر کا انتظار ہے نمبر ملتے ہی فوراً پرچہ روانہ کر دیا جائیگا۔ بھیجنے سے انتظار کیجئے۔

ملک کی اہل قلم مستورات کے گرانقدر مضامین بیش قیمت نظمیں اور دیگر مواد جو ایک نسوانی پرچے کا زیور ہے۔ کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب ٹائٹل مصور، ضخامت چالیس صفحات علاوہ اشتہارات۔ قیمت سالانہ ۸ ؍ لیکن شاہد کے موجودہ خریداروں کو اور ان حضرات کو جو اس ماہ شاہد کی خریداری منظور فرمائیں گے مفت پیش کیا جائے گا۔ لیکن تین آنے کے ٹکٹ محصولڈاک کے لئے آنا ضروری ہیں۔

مینجر شاہد دار الادب بریلی

ہفتہ وار **اسد** لکھنؤ

(اودھ کے اردو اخبارات میں سب سے کثیر الاشاعت اخبار)

کا **محرم نمبر** بالتصویر

اخبار "اسد" کا محرم نمبر جو ہر سال انتہائی شان واہتمام سے بالتصویر شائع ہوتا ہے اور اس قدر مقبول ہوتا ہے کہ اُس کی ایک کاپی بھی دفتر میں نہیں بچتی، امسال بھی یکم محرم الحرام کو شائع کیا جائیگا۔ حادثہ کربلا کے متعلق ملک کے مشاہیر اہل قلم کے فاضلانہ مضامین اور نظمیں بلا امتیاز مذہب وملت اس مخصوص نمبر میں درج کی جائینگی اور مقامات مقدسہ کی نادر اور نایاب تصویروں سے اس مخصوص نمبر کو زینت دی جائے گی۔

وہ حضرات جو اخبار اسد کے خریدار نہیں پانچ آنے کا ٹکٹ فی کاپی بھیجکر طلب فرما سکتے ہیں۔

مشتہرین کے لئے نادر موقع۔ اُجرت اشتہار فی صفحہ ۱۰ ؍ نصف صفحہ ۶ ؍ سائز ۲۰×۳۰ ؍

المشتہر اخبار "اسد" لکھنؤ

خاندان شریفی کی

علمی خدمات

علامہ نجیب الدین سمرقندی کی کتاب اسباب و علامات پر علامہ نفیس نے نہایت عمدہ شرح لکھ کر دنیا پر جو احسان عظیم کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے لیکن اس شرح پر افلاطون زمانہ اشرف الحکما حکیم شریف خاں صاحب دہلوی نے نہایت مفید حاشیہ تحریر کرکے کتاب کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے، اس حاشیہ میں حکیم صاحب نے اپنے تمام خاندانی مجربات اور معمولات بلا کم و کاست تحریر کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ تھی اور صرف خاندان شریفی میں دستور الطب کے طور پر استعمال کی جاتی تھی حکیم خواجہ رضوان احمد صاحب نے اس کتاب کے مجربات اور

پوشیدہ خاندانی نسخہ جات

ترجمہ شرح اسباب

میں درج کر دیئے ہیں جس کی وجہ سے یہ ترجمہ نہایت کارآمد و مفید ہو گیا ہے اس ترجمہ کی یہ مقبولیت ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک طبیہ کالج کے کورس میں داخل ہو چکا ہے۔ مجربات اور معمولات کی وجہ سے یہ کتاب طبیب اور غیر طبیب دونوں کے لئے مفید ہے۔ بتعدد عکسی تصاویر۔ قیمت مکمل ۱۲؎ جلد دوم للعہ سوم ۲؎ جلد چہارم ۲؎

دیگر مطبوعات

ترجمہ حمیات مع معمولات ۳؎ — حمیات قانون عربی مع حاشیہ شریف خاں للعہ

ترجمہ موجز القانون ۲؎ — موجز القانون عربی ۸؎ — منافع الاعضا ہر حصہ ۲؎

ملنے کا پتہ دفتر دار التالیفات اجمل روڈ قرول باغ دہلی

سفوف سلیمانی

ضعف ہضم کو دور کرنے کی بہترین دوا ہے، ہر قسم کی مقوی سے مقوی غذاؤں کو ہضم کرکے جزو بدن بناتا اور خون کی پیدائش کو بڑھا کر جسم کو طاقتور اور چہرہ خوشرنگ خوبصورت بنا دیتا ہے اگر اچھی طرح بھوک نہیں لگتی، معدہ و جگر کمزور ہے یا قبض رہتا ہے یا پیٹ میں ریاح بھرے رہتے ہیں اور طبیعت سست رہتی یا کھٹی ڈکاریں آتی ہیں یا پیٹ میں درد ہو جاتا ہے تو اسکو استعمال کیجئے

سفوف سلیمانی کا ہر گھر میں رہنا نہایت ضروری ہے کیونکہ پیٹ کے اچانک درد کے موقع پر فوری فائدہ پہونچاتا ہے۔ پیٹ کی گرانی، بدہضمی، اپھارا میں تو اکسیر ہے، ایک بھروسہ کی چیز ہے، بچے بوڑھے سبکو مفید ہے قیمت شیشی چار اونس صرف ۹؎

ملنے کا پتہ:- منیجر مسیح الہند دواخانہ۔ قرول باغ۔ دہلی

بیگماتی ابٹنہ

جو بیگمات کی خواہش پر شاہی اطبا نے تجویز کیا تھا۔ اور اب بھی دہلی کے خاص خاص گھرانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یقیناً آپ بھی اس کو ہر قیمتی پوڈر اور صابون سے فوائد میں بہتر پائیں گے، نہایت بہترین ادویات سے تیار کیا جاتا ہے۔ علاوہ روزانہ استعمال کے شادی کے موقع پر دولہا، دولہن کے لئے تو بہترین تحفہ ہے۔ جلد کی سیاہی اور زردی کو دور کرکے سرخی، نرمی اور شگفتگی لاتا ہے۔

قیمت فی ڈبہ تین روپے، علاوہ محصولڈاک

مفید دواخانہ نمبر ۳ دہلی سے منگائیے

ہمارا کارخانہ

جالندھر شہر میں اپنی قسم کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ ہمارے ہاں نہایت زود اثر مجرب المجرب ادویات سائنٹیفک اصولوں پر تیار ہو کر ہندوستان کے گوشے گوشے اور نیز ممالک غیر میں بکثرت جاتی ہیں۔ آج تک تقریباً ایک لاکھ مریض فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ کارخانہ سے مفصل واقفیت ضرور حاصل کیجئے۔ اور بوقت ضرورت فائدہ اٹھائیے، اپنے دوستوں، رشتہ داروں ملنے والوں کو خبر کر دیجئے، اور ایک کارڈ لکھ کر **شاہی جنتری** سن رواں مفت حاصل کیجئے۔ اس کارڈ پر اپنے دوستوں کے نام تحریر کر دیں۔ اُن کو بھی شاہی جنتری مفت روانہ کر دی جائے گی اس جنتری میں کارخانے کی تمام ادویات درج ہیں۔

ملنے کا پتہ ایس۔ شیر اینڈ کمپنی جالندھر (پنجاب)

جاپان

مُصنّفہ

چمن لال سیّاح

مُترجمہ

محمود علی خاں (جامعی)

قیمت دو روپے

نغمات

مُصنّفہ

ل۔ احمد اکبر آبادی

(نثر میں شاعری)

قیمت ۸؎

کلیم بک ڈپو دہلی

بنام قوت و حیات

کلیم

آ رہی ہے آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

دہلی

جلد ۳ | فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۳۷ء | نمبر ۴

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر اکبر منزل اجمل روڈ قرول باغ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مدیر

شاید کوئی عبرت حاصل کرے

میرے ایک دوست کے خسر جو رئیس بھی تھے، نواب بھی، اور "سر" بھی، تھوڑے دن ہوئے کہ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کے لئے گئے تھے ــــــ نواب صاحب کو ایک طرف تو قدرت نے ایک بڑی جاگیر کا مالک کیا تھا۔ دوسری طرف ذاتی اور ظاہری وجاہت میں بھی کمی نہیں تھی۔ آدمی گورے چٹے اور خوبصورت تھے۔ چہرے مہرے سے ایک خاص وقار ٹپکتا تھا۔ مُنہ پر ڈاڑھی رکھتے تھے۔ جو کافی شاندار تھی۔ اور سختی کے ساتھ اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

مقاماتِ مقدّس کی زیارت کرتے ہوئے جب وہ قاہرہ پہونچے تو ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام فرمایا ــــــ شام کا وقت تھا، اور نواب صاحب اپنے احباب اور دیگر حضرات کے ساتھ سبزے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مسلمان گداگر جس کی عُمر ساٹھ ستّر سے کم نہ ہوگی، کراہتا اور لاٹھی ٹیکتا اُن کے سامنے آیا جس کے چہرے کی بیشمار گہری جھُرّیوں کے اندر فاقوں میں گزرے ہوئے بے حساب ماہ و سال کروٹیں لے رہے تھے، اور آنکھوں کی، بجھتے ہوئے چراغ کی سی دُھندلی روشنی، متواتر فاقوں کی غمازی کررہی تھی۔

بوڑھے گداگر نے دانت نکال کر نوّاب صاحب کی طرف دستِ سوال دراز کیا۔ اُس کا بھیک میں اُٹھا ہوا ہاتھ، دھڑکتے ہوئے دل کی سُست رفتاری کے باعث کانپ رہا تھا۔

نواب صاحب سے ضبط نہ ہو سکا، جیب میں ہات ڈالا، اور پانچ روپے بوڑھے گداگر کے حوالے کردیئے۔

گداگر نے شاید یکمشت پانچ روپے اور پھر اپنے ہات میں کبھی نہ دیکھے ہوں گے، اُس کے کُمھلائے ہوئے چہرے پر خُون دوڑنے لگا۔ اِس طرح خُون دوڑنے لگا جیسے کائی سے ڈھکے ہوئے تالاب پر موسمِ خزاں کے ہلکے ابر کا سایہ ــــــ

فاقہ کش بوڑھے نے نواب صاحب کی طرف آنکھ اُٹھائی، اُس کے پاس شُکریئے کے الفاظ کا ذخیرہ نہ تھا، جس کے پاس روٹی نہیں ہوتی، اُس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا، اور اِس طرح نواب صاحب کو دیکھتا رہا گویا وہ کسی فرشتۂ رحمت کو خواب میں دیکھ رہا ہے۔

آخرکار اُس نے زبان کھولی، شاید ٹوٹے پھُوٹے الفاظ میں شکریہ ادا کیا، یا آنسوؤں کے سے رقیق الفاظ میں دعائیں دیں۔ غرضکہ اُس نے کمزور آواز میں کچھ کہا، اور ایک بار پھر نواب صاحب پر نگاہیں جماکر رخصت ہوگیا۔

سچ ہے جذبات کی شدّت ہونٹوں پر قُفل لگادیتی ہے۔ اور

شرحِ حال کی انتہائی آرزو انسان کو گونگا بنا کر چھوڑتی ہے۔

لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہی گداگر پھر نظر آیا۔ اُس کا رُخ نواب صاحب ہی کی طرف تھا۔

نواب صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ بوڑھا پھر سوال کرنے آرہا ہے۔ انھوں نے دل ہی دل میں غالباً کہا ہوگا کہ یہ گداگر بھی کس قدر غیر قانع، اور بےحیا ہوتے ہیں۔

امارت مفلسی کو کس قدر حقارت آمیز اشتباہ کے ساتھ دیکھتی ہے۔

اس مرتبہ اس کمزور بوڑھے کی رفتار میں ایک طرح کا زور، اور اُس کے چہرے پر ایک نوع کی سُرخی پائی جاتی تھی، ایسی سُرخی جو مُرجھائے ہوئے زرد پتوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مرتبہ بوڑھا گداگر نواب صاحب سے احترام آمیز فاصلے پر ٹھٹک کر نہیں کھڑا ہوگیا، بلکہ وہ اُن کے قریب آگیا، اس قدر قریب کہ اُس کا سایہ نواب صاحب پر پڑنے لگا ــــ گویا شفق سے نکھری ہوئی ندی پر جلی ہوئی لکڑیوں کا دھواں محیط ہو گیا۔

بوڑھے نے نواب صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "آپ کس مُلک کے باشندے ہیں؟" ــــ نواب صاحب نے کہا "ہندوستان کا" اور اُسی کے ساتھ ساتھ اس کو یہ بھی بتایا کہ "بحمداللہ مسلمان بھی ہوں"

یہ سُنتے ہی گداگر نے نواب صاحب کے پانچوں روپیوں کو اُن کے سامنے والی میز پر اس طرح گھبرا اور تلملا کر رکھدیا گویا دھوکے میں اس نے انگارے اُٹھا لیئے تھے ــــ

نواب صاحب نے متعجب اور منفعل ہوکر نیم غضب آلود آواز میں پوچھا "یہ کیا؟"

"آپ مجھ پر احسان کر چکے ہیں، اس لئے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا" گداگر نے شریفانہ انداز میں جواب دیا۔

"نہیں، تمہیں بتلانا ہوگا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟" نواب صاحب نے اس مرتبہ کسی قدر بگڑ کر کہا۔

"مجھے بتانا ہوگا؟" گداگر نے احسانمندی سے دبی ہوئی تُرشی کے ساتھ جواب دیا: "تو سُنئے، میں کہنا نہ چاہتا تھا، مگر جب آپ مجھ سے کہلوانا ہی چاہتے ہیں تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے آج تیسرا فاقہ ہے، مجھے آپ کے یہ پانچ روپے بہت دن چلا سکتے تھے" یہ کہکر گداگر پھر خاموش ہوگیا، گویا کوئی اُس کا گلا پکڑے لیتا ہے"

"کہو، کہو، صاف صاف کہو، کیا معاملہ ہے، میں تم سے ناخوش نہ ہوں گا" نواب صاحب نے بے صبری کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"یہ عظیم الشان چاندی کے پانچ ٹکڑے" گداگر نے کھانستے ہوئے کہا "مجھے بہت دن چلا سکتے تھے، اور آج ایک زمانے کے بعد میں قہوہ بھی پی سکتا تھا، مگر ...."

"ہاں ہاں کہو، جلد کہو" نواب صاحب نے تھوڑی سی اضطراب آمیز جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا"

"لیکن" گداگر نے کہنا شروع کیا "میں غلاموں کی بھیک سے اپنا فاقہ توڑنا نہیں چاہتا ...... مسلمان اور غلام ہو، یہ جھوٹ ہے، یہ رسول اللہ کی توہین ہے"

شوپنہار کا فلسفہ[1]

کچھ بھی نہیں اس دہر میں اِلّا افسوس
افسوس ہے لے نظام دُنیا، افسوس
غم ہی کا نتیجہ غم ہو، اتنا ہی نہیں
غم تو ہے خوشی کا بھی نتیجہ افسوس!

دوسرے حیوانات کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ بحیثیتِ مجموعی اُن کی زندگی خوشی میں بسر ہوتی ہے کہ غم میں مگر جہاں تک اس نامراد مخلوق کا تعلق ہے، جسے انسان اور اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے، ہم بلا خوفِ ابطال یہ کہ سکتے ہیں کہ اس غریب جنس کی زندگی ایک ایسا مخ

[1] ماخوذ از "شوپنہار" از حضرت مجنوں گورکھپوری

ہے، جس کا علاج ہی نہیں ہو سکتا، ذوقؔ نے تو ع

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کہہ کر صرف اپنے اشتباہ کا اظہار کیا تھا، مگر اب جب کہ دنیا کے اربابِ نظر اِس امر کے تسلیم کرنے پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں کہ سلسلۂ حیات کبھی اور کسی عالم میں بھی منقطع نہ ہوگا، تو یہ تصور کر کے کتنی مایوسی ہوتی ہے کہ زندگی کا مرض لا علاج ہے، اور یہ کمبخت حیات ہمیشہ ہمارا تعاقب کرتی رہے گی۔

جس قدرتِ کاملہ نے ہستی کا اتنا زبردست، یہ جال پھیلا رکھا ہے، وہ ایک اندھی قوت ہے، جو سراسر ایک حِس یا ارادۂ محض ہے۔ اُس میں استدلالِ عقلی کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتی ہے اپنے ایک وقتی اُبھار، یا آنی جذبے سے مغلوب ہو کر کرتی ہے۔ نظامِ کائنات میں کوئی معقول ترتیب نہیں ہے۔ زندگی دراصل قدرت کا ایک اندھیر ہے، ایک ظلم ہے۔ اس لئے ہم کو اس سے نجات حاصل کرنے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہیئے۔

دُنیا ایک علّت و معلول کا ایک مکمل سلسلہ ہے۔ اس تعلق سے علیحدہ ہو کر ہمارا النفس کسی چیز کو بھی سمجھ نہیں سکتا۔

اس ہستی کے ہنگاموں میں ہمیں ایک وجود بالذّات کا بھی خیال آتا ہے، جس کا علم ہم کو کسی طرح نہیں ہو سکتا، کیونکہ ذوات و اعیان کی دُنیا ہماری سرحدِ ادراک سے باہر واقع ہوئی ہے۔

انسان محض ایک صاحبِ وقوف، یا صاحبِ تعقل حیوان ہی نہیں ہے، یہ صرف خارج سے ارتسامات ہی قبول نہیں کرتا، بلکہ جب وہ اپنے شعور کا مطالعہ کرتا ہے تو اُسے ایک محرک قوت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اندر قوتِ انفعالی کے دوش بدوش ایک قوتِ فعلی بھی موجود ہے اور قوتِ فعلی اُس کی اصل ہستی ہے۔

ہم اپنے کو دو حیثیتوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک تو ہم اپنے کو ایک محرک قوت پاتے ہیں، جس کو عرفِ عام میں "ارادہ" کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہم اپنے کو مادّہ یا جسم پاتے ہیں، جو خارجی دُنیا سے محسوسات کی صورت میں نقوش قبول کرتا رہتا ہے۔

ہمارے شعور کو جب خود اپنا شعور ہوتا ہے تو وہ اپنے کو "ارادہ" پاتا ہے، اور ادراک و تعقل کی صورت میں وہ اپنے کو "جسم" پاتا ہے لیکن حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے۔ "ارادہ" ہماری اصلی ہستی ہے، اور ہمارا جسم اُس کا محض ایک مظہر ہے۔

ابھی یہ کہا جا چکا ہے کہ جب ہم اپنے باطن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو اپنے جسم کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی ہم اپنے ارادے کو مادّے کی صورت میں محسوس کرتے ہیں۔

اس مثال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کائنات میں جتنے مادّی اجساد ہیں وہ عام اس سے کہ ذی حیات ہوں، یا غیر ذی حیات، سب کے سب ایک ہی "مشیّت" کے نَو بہ نَو جلوے اور پرتو ہیں۔

سنگ و آہن اور دیگر ادنیٰ مخلوقات میں یہ "مشیت" محض ایک اندھی قوت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن انسان اور دوسری اعلیٰ اور ذی شعور مخلوقات میں اِس "مشیت" کو خود اپنا شعور ہونے لگتا ہے۔

قطب نُما کی مقناطیسی سُوئی ہمیشہ شمال ہی کی طرف اشارہ کرتی رہتی ہے۔ اور اگر کسی چیز کو اوپر سے نیچے گرایا جائے تو وہ ہمیشہ سیدھی ہی گرتی ہے۔ یہ، اور اِس قسم کے اور بے شمار واقعات اِس بات کی دلیل ہیں کہ قدرت کے سارے کارخانے میں کوئی نہ کوئی قوت کارفرما ہے جو بالکل نفسِ انسانی کی اُس قوت کے مثل ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں۔

دُنیائے نباتات میں اگر دیکھا جائے تو یہی مشیّت، نشو و نما اور بالیدگی کی صورت میں کام کرتی ہوئی ملتی ہے، اور یہی مشیت حیوانات کی زندگی اور اُن کے کردار و حرکات کی ذمہ دار ہے، اور موقع و ماحول کے لحاظ سے چیزیں پیدا کرتی رہتی ہے۔

ایک جنگلی جانور جسے شکار کر کے پیٹ پالنا ہوتا ہے شکار کیونکر کر سکتا ہے؟ مشیّت نے اُس کے لئے زبردست پنجے، نکیلے دانت، اور ایسے سخت اعصاب و عضلات مہیا کر دیئے ہیں جو اِس کام کو انجام دینے کے لئے ضروری تھے۔

غرضکہ جہاں دیکھیئے یہی قوت کام کر رہی ہے۔ یہ ہستی پسند قوت، زندگی کی اصل رُوح ہے۔

مشیّت جو اصلِ کائنات ہے، وہ ہستی کے مختلف مدارج میں مختلف

وزن۔ تجاذب کیمیاوی۔ حرارت، برق، اور دوسری بے شمار صورتوں میں ظہور فرماتی رہتی ہے۔ یہی مشیّت، انسان میں شعور بن کر رونما ہوتی ہے۔ مشیّت کا ظہور انسان میں اپنے درجۂ کمال تک پہونچ جاتا ہے۔ یہاں پہونچ کر وہ اپنی ضرورت کے موافق عقل پیدا کر لیتی ہے، عقل دراصل ایک آلے کی سی حیثیت رکھتی ہے، جس کو مشیّت نے اپنا کام انجام دینے کے دوران ارتقار میں پیدا کر لیا ہے۔

یہ مشیّت، ہماری قوّتِ ادراک، حافظہ، متخیّلہ، اور ہمارے تصوّر و استدلال پر پوری حکومت کرتی ہے۔ یعنی مشیّت کے خلاف نہ ہم کو کسی چیز کا درک ہوتا ہے، نہ کوئی بات ہم یاد رکھ سکتے ہیں ــــــ مختصر یہ کہ ہمارے تمام کوائف وافعالِ ذہنی اسی مشیّت کے تابع ہیں۔

حیوانات اور ان سے ادنیٰ مخلوقات مثلاً نباتات، اور جمادات میں عقل و شعور حسبِ مراتب گھٹتے گھٹتے تقریباً بالکل نابود ہو جاتے ہیں۔ لیکن مشیّت ہے ساری مخلوقاتِ ادنیٰ و اعلیٰ کی جان۔

یہ مشیّت، بالذّات کوئی دانا، یا ذی شعور شے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک اندھی یا غیر شاعر قوّت ہے جو ہستی کی طرف مائل رہتی ہے۔ یہ ہستی کا میلان اس میں اس بنار پر نہیں پایا جاتا کہ وہ ہستی کو کوئی اچھی چیز سمجھتی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر ہست ہونے کی ایک غیر معقول خواہش پائی جاتی ہے۔

فلسفے میں ریاضیات و طبیعیات کی سی صحت نہیں ہو سکتی، ریاضیات وغیرہ کو چونکہ واقعات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس لئے اُن میں جس قدر منطقی صحت سے کام لینا چاہئیے، لے لیجئے، لیکن جب آپ واقعات کی دُنیا میں آئیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کارخانۂ قدرت کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو مضمر ہوتا ہے جس کی توجیہ لاکھ توجیہ و تفحّص کے بعد بھی نہیں کی جا سکتی، جس کا سبب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مشیّت خود اندھی ہے، اور بغیر کسی منطق کے عمل کیا کرتی ہے۔

علم اور عقل اسی مشیّت کی ایک ارتقائی شکل ہے ــــــ اپنے کو عالمِ ہست و بود میں لانے کے لئے مشیّت مختلف آلات پیدا کرتی رہتی ہے جب ایک صورت اس کے کام کی نہیں رہتی تو نئے اعضا اور نئے قوا پیدا کر کے دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانات میں جو قوّت، ادنیٰ شعور بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ وہی انسان میں آکر عقل و استدلال کی قوّت بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان تصوّراتِ مجرّدہ (abstract ideas) قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان، دوسری مخلوقات کے مقابلے میں آزاد اور مختار واقع ہوا ہے۔ نہیں، وہ بھی دوسری مخلوق کی طرح بندگی بیچارگی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور اُنھیں قیود کا پابند ہے جن کی پابندی شجر، حجر، چاند، سورج، خشکی، تری، اور چرند و پرند کے لئے لازمی ہے، مختصر یہ کہ انسان بھی اسی ناعاقبت اندیش مشیّت کا غلام ہے جو جبر کی گردن میں طوق ڈالے ہوئے ہے، اور جس عقل و استدلال پر اس کو ناز ہے وہ محض اوزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن سے مشیّت اپنا کام کرتی ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہماری عقل، اور ہماری رُوح، مشیّت کی غلامی سے آزاد ہو جائے!

زندگی کا ایک مقصد ضرور معلوم ہوتا ہے، یہ محض میکانیت (Mechanism) یا اضطراریت نہیں ہے۔

مشیّت اپنے سامنے منتہائے کمالات رکھتی ہے، یعنی ارتقائے شعور ـــــ اور اس ارتقار کی آخری منزل، بظاہر شعورِ انسانی معلوم ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ مشیّت اندھی ہے لیکن انفرادیت و تشخّص میں ہر فرد کے اندر حسبِ استعداد ایک قوّت پیدا ہوتی رہتی ہے جس کو ہم شعور کہتے ہیں اور جو بتدریج کم اندھی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ انسان میں یہ شعور تقریباً مکمل ہو جاتا ہے۔

اس طرح اگر ہم تمام افراد کو ملا کر کائنات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی پیدائش ایک علتِ غائی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہوئی ہے، اور یہ علتِ غائی اغلباً انسان ہے ـــــ گویا یہ سارا ہنگامۂ ارتقا ظہورِ آدم کے لئے تھا۔

لیکن ظہورِ آدم کی علّتِ غائی کیا ہے؟

اگر آج دنیا میں حُسن و عشق اور فنونِ لطیفہ کا وجود نہ ہوتا تو پھر ہمارے پاس کوئی ایسا علاج نہ تھا جس سے بیمار زندگی کی المناکیاں اور زمانے کی تلخیاں دُور کی جاسکتیں۔

یہ سچ ہے کہ زندگی ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ بلاؤں اور مصیبتوں کا قدرت کے کارخانے میں جدھر نظر اُٹھا کر دیکھئے دوڑ دُھوپ کا ایک ہنگامہ برپا ہے، ہر طرف نفسی نفسی پڑی ہوئی ہے، کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنی غرض کے جادے پر گامزن ہے۔ گویا زندگی کا ہے کو ہے ایک میدانِ کارزار ہے جس میں کُل مخلوق سرگرمی کے ساتھ شریکِ جنگ ہے اور پھر ان تمام ہنگاموں، حادثوں، اور لڑائیوں کا نتیجہ کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ہر سوچنے والا جب زندگی کے تمام ہنگاموں سے تھک کر، اور تمام ہنگاموں کے نتائج کی تلخی سے آشنا ہو کر نظر اُٹھاتا ہے تو اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نکل جاتی ہے، اور وہ پکار اُٹھتا ہے ؎

لے آئی کس دیار میں عمرِ رواں مجھے؟

لیکن ہم اس ہولناک مصیبت اور اِس قیامت خیز دار و گیر سے اغلباً نجات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر چند یہ راہ نہایت ہی دشوار ہے۔

ان مصائب سے نجات پانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان دنیا میں رہتے ہوئے دُنیا کے تمام علائق سے اپنے دل کو اُٹھالے۔ زندگی کے تمام ہنگاموں میں تو شریک رہے۔ مگر اُن کے نتائج سے نہ تو خوش ہو نہ ناخوش۔ میرا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے کو محض ایک ایکٹر فرض کرلے، اور حیات کی جس منزل سے بھی گزرے اُسے محض "ایک پارٹ" سے زیادہ اہمیت نہ دے،

یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ انسان فنونِ لطیفہ، شاعرانہ محویت، اور جمال پرستی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ حیات کے دانت اُسے کاٹ نہ سکیں۔

شاعرانہ محویت جو تمام فنونِ لطیفہ میں یکساں ضروری ہے، ہم کو دُنیا کے افکار و آلام سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

فنونِ لطیفہ ہم کو اِس قابل بنا دیتے ہیں کہ ہم رنج و خوشی سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جائیں۔ اگر انسان میں حُسن بینی کا ملکہ پیدا ہو جائے تو خواہ کہیں حُسن کا وجود تک نہ ہو، اُسے ہر جگہ اور ہر چیز میں حُسن ہی حسن نظر آئے گا اور اس طرح اُسی کی رُوح اپنی ذات کو بھول کر مشیت کی قیود سے آزادی حاصل کرسکے گی۔ ورنہ یوں تو غریب انسان کی دُنیا اور عقبیٰ دونوں خراب ہیں۔

اِس کو اگر سمجھنا ہے تو یوں سمجھئے کہ ہم لاکھ آزردہ و دلگیر ہوں، زندگی کی ناہمواریوں نے ہمیں لاکھ بے دم کر رکھا ہو، لیکن جس وقت ہم کوئی دلکش تصویر دیکھتے یا کوئی اعلیٰ درجے کا نغمہ یا شعر سُنتے ہیں تو کم از کم وقتی طور پر اپنی محرومیوں اور تلخیوں کو بھول جاتے ہیں، اور اپنے دل میں ایک رُوح پرور کیفیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اِس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ فنونِ لطیفہ زمانے کی گردش کو روک سکتے، اور اعتبارات و تعلقات کو فنا کرسکتے ہیں۔ کیونکہ محض وہ جوہرِ قدیم جسے "تصوّر" کہتے ہیں اُن کا موضوع ہوتا ہے۔

شاعر کا علم، جو اُسے شاعرانہ بصیرت کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے، ایک منطقی علم سے جس کی بنا تجربہ و استدلال پر ہوتی ہے قطعاً بالاتر ہوتا ہے شاعر کی شعریت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنی انفرادی ہستی کو، بلکہ ان تمام اضافات کو جو کہ اُس کی ذات اور کائنات کے درمیان واقع ہوئے ہیں، بے معنی سمجھ کر نظر انداز کردے۔ ذاتیت یا خود پرستی کسی شاعر یا صناع کے شایانِ شان نہیں۔ شاعر، ذات اور غیر ذات کے لغو امتیازات کو بھول جاتا ہے۔ جب تک ہم اپنے ذاتی اغراض اور اپنی انانیت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اُس وقت تک ہم کو مشیت کے زبردست اور جابر ہاتھوں سے پناہ نہیں مل سکتی۔

اس لئے یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ فلسفی ہونے سے شاعر ہونا زیادہ خوش نصیبی کی بات ہے۔ اگر کوئی دُنیا میں اس طرح رہ سکتا ہے، جیسے پانی میں کنول، یا جس طرح بعض دواؤں پر "بغیر ہاتھ سے چھوئی ہوئی" لکھا ہوتا ہے؛ اسی طرح اگر کوئی انسان اِس دنیا کو "بغیر دل میں جگہ دئے ہوئے" زندگی بسر کرسکتا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا شعور رکھتا ہے کہ ؏ بدل اگر نخلد ہر کہ از نظر گزرد" کی کسوٹی پر پُورا اُتر سکتا ہے تو اُسے مژدہ ہو کہ ظلمِ مشیت اُس کا بال تک بیکا

نہیں کر سکتی۔ اور اگر کسی میں اتنی بے پایاں قوت نہیں ہے کہ اپنے دل کے دروازے دُنیا اور زندگی کے جذبات پر بند کرلے تو میں اُسے یہ مشورہ دوں گا کہ وہ فنونِ لطیفہ کے سُنہرے پردوں میں اپنے کو غائب کردے۔

اس طرح وہ ایک ایسے سحر آفریں ماحول میں پہونچ جائے گا، جہاں مشیّت کی خونخواریاں سکونت اختیار نہیں کر سکتیں۔

میں بار بار کہوں گا، اور ہر مرتبہ پوری قوت کے ساتھ کہوں گا کہ زندگی ایک عذاب ہے جسے مشیت نے بلا وجہ انسان اور حیوان پر نازل کردیا ہے۔ دنیا ایک خرابہ ہے یا سانس لیتے ہوئے مُردوں کی دوزخ۔

ہم جدھر نظر اُٹھاتے ہیں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے، ایک ہنگامہ برپا ہے، ایک جنگ چھڑی ہوئی ہے اور ایک خون کا دریا ہے کہ ہر طرف موجیں مارتا نظر آتا ہے۔

ہر شے اپنی غرض پوری کرنے کی فکر میں لگی ہے، اور ہر چیز حصول مقصد کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ انسان کو اِس لحاظ سے کہ وہ بھی انھیں فتنوں میں مبتلا ہے، کسی طرح اشرف المخلوقات نہیں کہا جاسکتا۔ انسان بھی اپنی خواہشوں کا غلام ہے، اس کے اندر بھی طرح طرح کے ہولناک عزائم اور اندھے ولولے ایک ہنگامہ برپا کئے ہوئے ہیں جنھیں نئے نئے بہانے تلاش کرکے آسودہ کرنا اُس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ زندگی نام ہے موت سے پہلو بچا بچا کے بھاگتے رہنے کا۔ ہماری ہر سانس عبارت سے بڑی ایک جنگ ہے، موت کے ساتھ ——— جو ہر نفس ہمیں دھمکایا کرتی ہے ——— بے وقوف انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ پینترے بدلتا ہوا موت سے بچ کر نکل جائے گا، حالانکہ موت ایک یقینی چیز ہے جس گھڑی انسان پیدا ہوتا ہے، اُسی وقت وہ در اصل موت کا شکار بن چکتا ہے۔ البتہ موت اپنے شکار کے ساتھ کچھ دیر کھیلتی ہے، جیسے شیر شکاریوں کے باندھے ہوئے بکرے کے ساتھ چند لمحے کھیلتا ہے۔ اس کھیل کے وقفے کو ہم زندگی کا خطاب دیتے ہیں، اور نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ موت سے ہم کو رہائی حاصل ہے۔

جب ایک بار زندگی ختم ہو جاتی ہے تو مشیّت اُس کو دوبارہ پیدا کرتی ہے، تاکہ کون و فساد کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے۔ کیونکہ مشیت کا کام ہی یہی ہے کہ وہ خود بینی اور خود نمائی کا تماشا کبھی ختم نہ ہونے دے۔

مشیّت میں اگر اتنی بے رحمی نہ ہوتی تو آج ہمارے گلوں میں زندگی کا طوق نہ پڑا ہوا ہوتا۔ زندگی کی بنیاد خود غرضی اور نفس پرستی پر ہے۔ انسان بالطبع بے رحم، بُزدل، اور نفس پرست واقع ہوا ہے۔ وہ اگر کبھی ایماندار، رحم دل اور خدا ترس نظر آتا ہے تو محض اس لئے کہ اُسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اُس کی بدکرداریوں کے بدلے میں دوسرے اُس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ نہ کرنے لگیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی شرافت بھی، رذالت ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔

اور پھر ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس دوڑ دھوپ اور ہلچل کے باوصف ہم اپنی حسرتیں نکالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ زندگی کی ابتدا ناکامیوں سے ہوتی ہے اور انتہا بھی ناکامیوں ہی پر ہوتی ہے۔ اگر آج ہمیں آسودگی میسّر آجائے تو یہ تمام جھگڑے اِسی وقت مٹ جائیں، اور مشیّت کی شکست ہوجائے، لیکن مشیّت اِسے کب گوارا کرسکتی ہے؟

ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی اس جانکاہ حقیقت کو نہ بھولنا چاہئے کہ زندگی کی اصلیت شور و شر ہے، اور انسان جنم کا پاپی ہے۔ پاپی ہونے پر وہ مجبور ہے اُسے نیک بننے کا ایک موقع بھی نہیں دیا جاتا۔

اِن تمام اُمور پر غور کرنے کے بعد انسان کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ مشیّت کو کسی نہ کسی طرح زک دے دے، زیر کرلے، اور مشیّت کو نیچا دکھانے اور زیر کرلینے کے لئے میں دوبارہ کہوں گا کہ اے مشیّت کے صید زبوں، علائق میں گرفتار رہتے ہوئے ترکِ علائق کر، کہ وہ سب کچھ جو سب کرتے ہیں، مگر ان سب سے اپنا دل اُٹھالے اور "دست بکار، دل بیار" پر عمل پیرا ہوجا۔ ورنہ یاد رکھ کہ خونخوار مشیّت کے اندھیرے سے تمام عمر نجات نہیں ملے گی، اور مرنے کے بعد بھی مشیّت کا تاریک سایہ تیرا تعاقب کرتا رہے گا۔

وَفاق

(جس کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہوگیا ہے)

دھومیں مچی ہوئی ہیں نظامِ وفاق کی — ہندوستاں ہنوز ظلُوم و جہُول ہے

اِس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نویدِ گُل — اک بے پناہ چُوک ہے، اک سخت بھُول ہے

یہ بوستانِ اہلِ سیاست کی "شاخِ گُل" — شیطاں کے پائیں باغ کی سُوکھی ببُول ہے

یہ ہے نیا نکاح کہ دولھا تو ہے خموش — قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ دل سے قبُول ہے

ہشیار اہلِ ہند، کہ پھر اِس زمین پر — گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزُول ہے

کہتے ہیں جس کو "دولتِ بیدار" اہلِ غرب — وہ اک متاعِ کاسد و جنسِ فضُول ہے

نادان اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فُول ہے

جوش ملیح آبادی

سراج الدّولہ

تاریخ وطن کی ایک فراموش شدہ عظمت

اشتراکی ادیب باری

سراج الدّولہ کا قتل ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج کا سب سے بڑا سبب ہے۔ لیکن کم ظرف اور تنگ نظر مورخوں نے سراج الدّولہ کی سیرت کو اس بری طرح سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں سراج کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات سرایت کر جاتے ہیں۔ ان اوراق کا محرر شاہی کا حامی نہیں اور نہ پادشاہوں کی مدح وستائش ہی سے اُسے واسطہ ہے۔ اُسے سراج الدّولہ کی بے جا اور غیر ضروری حمائت مقصود نہیں، بلکہ اسے ان اسباب کو ظاہر کرنا ہے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو قوت مقتدر کے بنانے میں کارفرما تھے۔ جب ظالم ومظلوم دونوں تاجدار ہوں تو اس صورت میں مظلوم تاجدار کی حمایت اگرچند اچھے جملوں سے کی جائے تو کیا یہ مورخانہ بددیانتی ہوگی؟

انگریز مورخوں نے سراج الدولہ کو بدترین انسان ثابت کرنے میں بہت زور صرف کیا۔ ان کے نزدیک سراج کی خانگی زندگی اخلاقی طور پر قابلِ اعتراض تھی۔ کیا ان مورخوں نے کبھی کلائیو کی خانگی زندگی پر بھی غور کیا؟ اگر سراج حقیقی معنوں میں عیش وعشرت کا متوالا ہوتا تو اس سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی خوش بختی اور کیا ہوسکتی تھی۔ مکّار لوگوں کا عیاش تاجداروں سے ہر قسم کی مراعات حاصل کر لینا بہت آسان ہے۔ اگر کمپنی کے پیش نظر محض تاجرانہ مراعات کا حصول تھا تو اس مقصد کے لئے بدکردار سراج۔ ذی ہوش سراج سے کہیں زیادہ مفید تھا۔ چونکہ سراج ایک قابل اور مدبر حکمران تھا اور کمپنی کا اُس کے تدبر کے سامنے کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ اس لئے سراج کے خون ہی سے کمپنی کا نخلِ مراد بارآور ہوسکتا تھا۔ تاج وتخت کے لئے سینکڑوں ہاتھ خون آلود ہونے کے لئے آستینوں میں خنجر چھپائے رکھتے ہیں۔

جعفر کا وجود ایک فطری امر تھا۔

علی وردی خاں کے زمانے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی لڑائیاں صرف دکن تک ہی محدود تھیں۔ کلکتہ اور چندر نگر ان جنگوں سے بے خبر رہے، ظاہر ہے کہ علی وردی خاں کی موجودگی میں یورپ کی قومیں بنگال کو اپنی حکمتِ عملی کا شکار نہ بنا سکتی تھیں۔ انھیں دعویدارانِ تخت کی تلاش تھی۔ لیکن بنگال میں صرف ایک تاج پوش تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو علی وردی کی موجودگی میں تاج وتخت کے امیدوار میسر آنے ناممکن تھے۔ تاج کی نسبت وار زیادہ قریب تھی۔ علی وردی انگریزوں کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھا۔ مرنے سے پیشتر اس نے

سراج الدولہ کو ان الفاظ میں وصیت کی ۔

مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو ۔ جو اُنھیں ہندوستان میں حاصل ہے ۔ اگر میری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہوتا تو تمہارے اس ڈر کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتا ۔ اس کام کی تکمیل تیرے ذمے ہے ۔ میرے چراغ ! دکن میں ان کی سیاست تمہارے لئے چراغِ ہدایت کا کام کریں ، ذاتی جنگوں میں الجھ کر اُنھوں نے مغل اعظم کی رعایا کے اموال اور املاک پر قبضہ جما لیا ہے ۔ ایک ہی وقت میں تینوں[1] طاقتوں کو تباہ کرنے کی فکر نہ کرنا .... سب سے پہلے انگریزوں کی قوت توڑنا .... سنو بیٹا ! انھیں سپاہی رکھنے اور قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا ۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں ۔"

قطع نظر اس سے کہ یہ الفاظ علی وردی خاں کی زبان سے نکلے یا برطانی حاکی ہال ویل کے افسانہ طراز ذہن کا نتیجہ ہیں ۔ ان الفاظ سے سراج الدولہ کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ ۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کی " وصیت " پر عمل کرنے کے لئے مجبور کیا ۔ کمپنی کا رویہ سراج الدولہ سے بے حد معاندانہ تھا ۔ ژین لا اپنی یادداشت میں لکھتا ہے ۔

" انگریزوں نے دربارِ سراج سے تمام تعلقات منقطع کر لئے ہیں ۔ بارہا اُنھوں نے سراج الدولہ کو قاسم بازار کی فیکٹری میں داخل ہونے سے روک دیا ۔"

انگریزوں نے سراج الدولہ کی تخت نشینی کے موقعہ پر اسے تحائف نہیں بھیجے تھے ۔ انگریز سراج الدولہ کے خلاف سازش میں شریک تھے ۔ کمپنی کے ملازم تاجرانہ مراعات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ۔ سراج الدولہ کے خزانے پر کمپنی کی ان بداعمالیوں کا بُرا اثر پڑا ۔ انگریزوں نے کلکتے کے قلعے کو نواب کی اجازت کے بغیر مستحکم کرنا شروع کر دیا ۔ انگریزوں نے ڈھاکے کے دیوان راج ولبھ کے بیٹے کرشن داس کو اپنے ہاں پناہ دی ۔ سراج الدولہ کے پیہم اصرار پر بھی انگریزوں نے اُسے نواب کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا ۔ مجرم کو اپنے ہاں پناہ دینا اور پھر اس یارو مددگار کی حفاظت کے لئے اپنوں اور بیگانوں سے لڑنا اخلاقی جرات کا بلند ترین معیار ہے ۔ لیکن کمپنی اور کرشن داس کے معاملے میں اخلاقی جرأت کی جگہ حرص و ہوس کارفرما تھی ۔ کرشن داس کو صرف اس لئے پناہ دی گئی کہ اس کا باپ ڈھاکے کا دیوان ہونے کی صورت میں انگریزوں کے مالی مفاد کے لئے بہت مفید تھا ۔

ان اسباب نے سراج الدولہ کو مجبور کر دیا کہ وہ تاجروں کی بدکردار جماعت کو اپنی مملکت سے باہر نکال دے ۔

" سراج الدولہ انگریزوں پر حملہ کرے تاریخ کا فتویٰ ہے[2] "

ایک انگریز مصنف ہل جنگ سے قبل کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

"سراج الدولہ کا انگریزوں پر حملہ حق بجانب تھا "

انگریزوں کو اپنی مملکت سے نکالنے کے لئے سراج الدولہ قاسم بازار کی فیکٹری پر حملہ آور ہوا ۔ فیکٹری زیادہ مستحکم اور مضبوط نہ تھی ۔ نواب کی فوجوں کا مقابلہ ناممکن تھا ۔ انگریز سپاہی تعداد میں بہت کم تھے ۔ فیکٹری کی تسخیر پر نواب کے سپاہیوں کا ایک کارتوس بھی ضائع نہ ہوا ۔ سراج الدولہ اگر چاہتا تو اس وقت تمام انگریز سوداگروں کی زندگی ختم کر دیتا ۔ لیکن شریف اور بردبار سراج نے برطانی چراغِ حیات بجھانے کی کوشش نہ کی ۔ اب سراج کلکتے کا رُخ کرتا ہے بنگال کے بدترین موسم میں قاسم بازار سے کلکتے تک کا عسکری کوچ سراج کی قابلیت کا بہترین ثبوت ہے ۔ اگر سراج کے فوجی افسر غدّار نہ ہوتے تو اس کا شمار ہندوستان کے بہترین جرنیلوں میں ہوتا ۔ سراج کی فوجوں کو آتے دیکھکر کلکتے کے انگریز تاجروں نے وہاں کی دیسی آبادی کی حفاظت کا ذرہ بھر خیال نہ کیا بلکہ ان کے مکانوں کو شعلوں کے سپرد کر دیا ۔ ایک طرف کلکتے کے باشندوں سے اس قسم کا سلوک ہو رہا تھا اور دوسری طرف آرمینیوں اور پرتگیزوں کو اپنے ہاں پناہ دی جا رہی تھی ۔

انسانیت مذہب کے تیشوں سے مجروح ہو رہی تھی ۔

امیر چند ان ایام میں کلکتے میں مقیم تھا ۔ امیر چند کی غداریوں کے سبب سے انگریز تاجروں کی مالی حالت بہت اچھی ہو چکی تھی ۔ امیر چند غدار تھا اور انگریز غدّار پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے ۔ اُنھیں شک تھا کہ کہیں امیر چند کی رگِ وطنیت

[1] انگریز ، فرانسیسی اور ولندیز

[2] ہندوستان میں نصرانی اقتدار کا عروج

میں خونِ انتقام نہ اُبل پڑے۔ یہ محض اُن کا "حُسنِ ظن" تھا۔ غدارانِ ازلی اور کاسہ لیسانِ سرمدی کے وہم و گمان میں بھی ملک و ملت کی بہی خواہی کا تصور نہیں آسکتا۔ انگریز سپاہیوں نے امیر چند کو قید کرنے کے لئے اس کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ غدار نے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اب انگریز امیر چند کے بھائی ہزاری مل اور اس کے مہمان کرشن داس کو بھی قید کرنا چاہتے تھے۔ ہزاری مل اور کرشن داس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ انگریز سپاہیوں پر گولی چلائیں۔ ہزاری مل انگریز سپاہیوں سے اس وقت تک لڑتا رہا، جب تک اس کا ایک ہاتھ ضائع نہ ہو گیا۔ انگریز سپاہی امیر چند کے زنانے میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اُن کے عزائم محتاجِ بیان نہیں۔ امیر چند کے نوکروں کا جمعدار بیگمات کی توہین کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں خون اُتر آیا۔ وہ انتہائے جوش سے کانپ رہا تھا، وہ انتقام چاہتا تھا۔ انگریز سپاہیوں سے لڑتے ہوئے اسے اپنی جان کھو دینے میں کوئی دریغ نہیں، کیا اس کی موت بیگمات کی عصمت بچا سکتی؟ ہرگز نہیں! موت وحشی سپاہیوں کے لئے شہوانی لذتوں کے دروازے کھول دیتی ہے۔

خادم اپنے خون کی آگ میں جل رہا ہے۔

"زندہ اور گریبان دریدہ بیگمات سے مردہ اور بے حس نعشیں بہتر ہیں" اس نے خیال کیا، اب اپنے آقا کے مکان کو شعلوں کی صورت میں تبدیل کر دیا تاکہ بیگمات اپنے خادم کے ہاتھ میں خون آلود خنجر دیکھ کر مارے خوف کے باہر کی طرف نہ بھاگیں۔ جہاں درندے اُنھیں دبوچنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ خنجر کے ۱۳ حملوں سے اس نے اسی قدر بیگمات کو ابدی نیند میں سلا دیا۔

کیا اُنھیں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے" اس نے پھر سوچا۔

تکمیلِ وفا کے لئے وہی خون آلود خنجر باوفا قاتل کے سینے کی طرف بڑھتا ہے۔

خدمت: خون و خنجر سے!

نواب ۱۶؍جون ۱۷۵۶ء کو کلکتے پہنچا۔ تیس دن کے بعد نواب کی فوجوں نے فورٹ ولیم پر حملہ کیا۔ نواب کے فرانسیسی اور پرتگیزی توپچیوں نے قلعہ پر گولے برساتے وقت نمک حرامی کا بدترین ثبوت دیا۔ اس امر کے باوجود انگریز نواب کی فوجوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ قاسم بازار کی فتح کے بعد نواب نے انگریزوں پر صلح کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کے مغرور اور سرکش افسروں نے نواب کے ساتھ صلح کی گفت و شنید سے انکار کر دیا۔

سرکشی گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہے۔

انگریز کس منہ سے صلح کی گفت و شنید کریں۔ ناچار انگریزوں نے امیر چند سے کہا کہ وہ ثالث کے فرائض سر انجام دے۔ امیر چند نے گزشتہ تحقیر و تذلیل کے پیشِ نظر انگریزوں کی اس خواہش کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ اب راہِ فرار کے سوا انگریزوں کے پاس کوئی دیگر ذریعۂ نجات نہ تھا۔ فورٹ ولیم نواب کے قدموں پر تھا۔ نواب برطانی خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر بھی نواب کی فطری رحم دلی، جذبۂ انتقام پر غالب آئی۔ نواب کی اس کامیابی کے ساتھ انگریز مورخوں نے ایک افسانہ کو اس طرح وابستہ کر رکھا ہے کہ تاریخ کے طالب علم کو اس کے ہر جملے سے بوئے انتقام آتی ہے۔ اس افسانے کا عنوان "بلیک ہول" ہے۔ اس افسانے پر پورا زورِ قلم صرف کرتے ہوئے ہِل لکھتا ہے:

"دیسی سپاہیوں نے یورپینوں کے مال اسباب کو لوٹا لیکن ان سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی۔ مذہبی پیشوا نمازِ شکرانہ ادا کر رہے تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا تغیر رونما ہوا۔ بعض یورپی سپاہیوں نے نشے میں بدمست ہو کر دیسی سپاہیوں کی تذلیل کی، ان سپاہیوں نے نواب سے شکایت کی۔ نواب نے دریافت کیا کہ اس قسم کے بدسلوک سپاہیوں کو انگریز کہاں قید کرتے ہیں۔ نواب کو جواب میں بتلایا گیا کہ "بلیک ہول" اس قسم کے لوگوں کے لئے مقرر ہے۔ چنانچہ نواب نے حکم دیا کہ اُنھیں رات کے وقت اس میں بند کر دیا جائے .... نواب کے افسروں نے بدسلوک سپاہیوں اور دوسرے جنگی اسیروں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا .... ۱۴۶ انگریزوں کو رات کے وقت ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا جس کا رقبہ ۱۸ مربع فٹ تھا۔ ہولناک تکالیف .... ایک قطرۂ آب کے لئے کشمکش .... دیسی سپاہیوں کی

دل لگی کو ہالویل نے اس انداز میں بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ روح فرسا واقعہ برطانی ہندوستانی تاریخ میں نہیں مل سکتا۔ سات بجے شام سے چھ بجے صبح تک یہ مصیبت جاری رہی۔ دیسی افسروں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ نواب کی نیند میں مخل ہوکر اُسے اس واقعے سے آگاہ کرتے۔ مصیبت نواب کی بیداری تک جاری رہی ۱۴۶ قیدی زندہ داخل ہوئے اور صرف ۲۳ قیدی باہر زندہ نکلے ۔۔۔۔۔۔"

سراج الدولہ کو بدنام کرنے کے لئے انگریزوں نے اس افسانے کو اس انداز میں پیش کیا کہ پونے دو سو سال تک سراج ہندی اور غیر ہندی مورخوں کے تیروں کا نشانہ بنا رہا۔ اس واقعے کو غلط ثابت کرنے کے لئے اکاشی کمار میترا نے بنگالی زبان میں "سراج الدولہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ڈاکٹر بھولاناتھ چندر ۱۸۹۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی میگزین میں لکھتے ہیں۔

"مجھے بلیک ہول کے حادثے کی صحت سے انکار ہے۔ اس واقعے کی سب سے پہلے نشر و اشاعت کرنے والا ہالویل ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ۱۴۶ انسان ۱۸ مربع فیٹ کمرے میں ہرگز نہیں سما سکتے۔ خواہ اُنھیں انار کے دانوں ہی کی طرح کیوں نہ بند کیا جائے۔ چونکہ اس حادثے میں اقلیدس اور ریاضی ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے اس واقعے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔"

مشہور بنگالی مورخ باسو اسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے "ہندوستان میں نصرانی اقتدار کا عروج" میں لکھتا ہے۔

"ہم عصر مورخین اس واقعے کا ذکر تک نہیں کرتے۔ "سیر المتاخرین" کا مصنف خاموش اور مدراس کونسل کے مباحث میں اس کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ کلائیو اور واٹس کے ان خطوط میں اس واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا جو اُنھوں نے نواب کو لکھے۔ علی نگر کے عہد نامے میں اس واقعے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ سراج الدولہ کی تخت سے علیحدگی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے جو خطوط کلائیو نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھے اس میں اس واقعے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس سازش میں جو انگریزوں نے میر جعفر سے کی بلیک ہول میں مرنے والوں کے پس ماندگان کی اعانت کا ذکر نہیں۔ ۱۹ اگست ۱۷۵۷ء میں اس نے مجلس منتخب کے سامنے جو یادداشت پڑھی اس میں اس واقعے کا نام تک نہیں لیا۔"

سراج الدولہ نے کلکتے کا نام علی نگر میں تبدیل کرتے ہوئے راجہ مانک چند کو حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ سراج اگر چاہتا تو انگریزوں کا کام تمام کر دیتا۔ فلتا میں پناہ گزین انگریزوں کی طرف مزید توجہ کرنا سراج نے اپنی توہین خیال کیا۔ اس کے خیال میں ہواؤں کے موافق ہوتے ہی انگریز مدراس چلے جائیں گے۔ سراج ۲۴ رجون ۱۷۵۶ء کو روانہ ہوکر ۱۱ رجولائی ۱۷۵۶ء کو مرشدآباد پہنچا۔

قاسم بازار اور کلکتے کی شکستوں نے مدراس کونسل میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ارکان کونسل نے "نہ صرف بنگال میں تاجرانہ مراعات واپس لے لینے کا فیصلہ کیا بلکہ اُنھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ کثیر فوج سے کلکتہ فتح کرنے کے بعد نواب کے خلاف بغاوت اور سازش کا بازار گرم کریں گے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۷۵۶ء میں ۹۰۰ یورپی اور ۱۵۰۰ دیسی سپاہی بنگال کی طرف روانہ ہوئے۔ بحری اور بری فوجوں کے کمان دار واٹس اور کلائیو تھے۔ دسمبر میں انگریزی فوجیں منزل مقصود پر پہنچ گئیں۔ ۱۷ دسمبر کو واٹس اور کلائیو نے نواب کو نیم تحکمانہ اور نیم صلح جویانہ خطوط لکھے۔[1] واٹس اور کلائیو نے مانک چند سے سازش کی، چنانچہ بج بج کے محکم اور مضبوط قلعے سے اس کا نصف گھنٹہ لڑنے کے بعد بھاگ جانا اس امر کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ۲۹ دسمبر کو انگریزوں نے بج بج کا قلعہ فتح کیا۔ مانک چند کے فرار ہونے کے بعد کلکتے کی فتح بہت آسان تھی۔ انگریزوں نے کلکتہ فتح کر لیا۔ فاتح انگریزوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنھوں نے فورٹ ولیم میں اپنے تجارتی مال اسباب کو بالکل اسی طرح پایا جس طرح وہ چھوڑ کر گئے تھے۔[2] مفرور باغیوں کے املاک و اسباب کی حفاظت اسی

[1] ان خطوط میں بلیک ہول کا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔

[2] اورم: جلد ۲ صفحہ ۱۲

سراج کے احکام سے ہو رہی تھی۔

کیا انگلستان کی تاریخ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش کر سکتی ہے؟

ہگلی میں نواب کی عسکری قوت کو کم دیکھتے ہوئے کلائیو اور اس کے شرکائے کار نے ہگلی پر حملہ کر دیا۔ بے گناہوں کا بے دریغ خون بہایا گیا۔ رعایا کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا گیا۔ کمپنی کے سپاہی نواب کی نیکیوں کا صلہ اس کی رعایا کے خون کی صورت میں دے رہے تھے۔

"۱۱ جنوری ۱۷۵۷ء کا دن قلعے کے ارد گرد کے مکان لوٹنے میں صرف ہوا۔ .... ۱۸ جنوری تک کمپنی کی فوجیں دیسی آبادی میں لوٹ مار کرتی رہیں۔ بعض سپاہی اس بہانے سے ولندیزی علاقے میں داخل ہو گئے کہ نواب کی رعایا اس علاقے میں پناہ گزین ہو رہی تھی[1]"

کمپنی کی ان سفاکانہ حرکات سے سراج کی آنکھوں میں خون اتر آنا یقینی تھا۔ وہ اگر اس موقع کو بنائے مخاصمت قرار دیتے ہوئے بنگال میں ہر انگریزی بولنے والے کی زبان کاٹ دیتا تو بین الملی عسکری اخلاقیات کی قطعاً خلاف ورزی نہ ہوتی۔ لیکن نواب نے ہر بار سوداگروں کی قوم سے شریفانہ سلوک روا رکھا۔ اب پھر سراج اس کوشش میں تھا کہ تمام معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا جائے۔ چنانچہ سراج الدولہ نے مندرجہ ذیل سطور ایک مکتوب کی صورت میں امیر البحر واٹسن کو بھیجیں۔

"آپ نے ہگلی پر قبضہ کرنے کے بعد میری رعایا کے مال و اسباب کو لوٹا۔ یہ حرکات سوداگروں کے لئے زیبا نہیں۔ میں مرشد آباد سے روانہ ہو کر ہگلی کے قریب پہونچ چکا ہوں میں اپنی فوجوں سمیت دریا عبور کر رہا ہوں۔ اس فوج کا ایک مختصر حصہ آپ کے معسکر کی طرف روانہ ہو چکا ہے... ...... ان امور کے باوجود اگر آپ صلح پر راضی ہیں تو گفت و شنید کے لئے اپنا ایک نمائندہ میرے ہاں بھیج دیں۔ .... میں کمپنی کو سابقہ مراعات دینے کے لئے تیار ہوں۔ میرے مقبوضات میں بسنے والے انگریز اگر میرے احکام کی اطاعت کریں اور مجھے تنگ کرنے کی حکمت عملی چھوڑ دیں تو آپ یقین جانئے کہ میں اُن کے نقصانات کی تلافی مدّنظر رکھتے ہوئے اُن کی تسلّی کروں گا۔"

آپ خوب جانتے ہیں کہ سپاہیوں کو لوٹ مار سے نہیں روکا جاتا۔ .... تاہم آپ سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کے لئے میں ان نقصانات کی بھی تلافی کر دونگا۔

آپ نصرانی ہوتے ہوئے جانتے ہیں کہ جنگ کے شعلوں کو سرد کر دینا اُنھیں ہوا دینے سے بہتر ہے۔ لیکن اگر آپ جنگ کے ذریعے سے کمپنی اور اس کے افراد کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں تو اس میں میری کونسی خطا ہے؟ اس قسم کی تباہ کن جنگ کو ختم کرنے کے لئے میں یہ مکتوب بھیج رہا ہوں۔"

ایک سوفسطائی کا ایک متشکک کو مکتوب!

نواب ۴ فروری ۱۷۵۷ء کو کلکتہ پہنچا۔ کلائیو کے عیارانہ ذہن نے ایک شرارت پیدا کی۔ کلائیو نے کمپنی کی طرف سے نواب کے خیمے میں دو نمائندے بھیجے جو بظاہر صلح کی گفت و شنید کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا حقیقی مقصد نواب کے خیمے کی عسکری قوت کا اندازہ لگانا تھا۔ رات کے وقت یہ جاسوس اپنے خیموں میں چلے گئے۔ نواب کے پہرہ داروں کو فریب دینے کے لئے انھوں نے اپنے خیموں کے چراغ گل کر دئے۔ گویا ان پہ خواب خرگوش طاری ہے۔ تاریکیٔ شب میں یہی نمائندے واپس جا کر کلائیو کو تمام حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان نمائندوں کی حرکات سے کمپنی کی جنگ جویانہ حکمت عملی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایم ژین لا اپنی یادداشت میں لکھتا ہے۔

" اگلے روز (۵ جنوری) چار بجے صبح گہرے دھندلکے میں کمپنی کی فوج نے کلائیو کے زیر کمان ٹھیک اسی خیمہ پر

---

[1] اورم جلد اول

حملہ کیا۔ جہاں کمپنی کے دو نمائندوں نے اسے رات کو دیکھا تھا۔ اچھا ہوا کہ نواب اس خیمے میں نہ تھا۔ نواب کے دیوان نے اسے دوسری جگہ شب بسر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انگریزی سپاہیوں نے نواب کے پندرہ سو سپاہی قتل کر دئے۔ ...

.... نواب خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ کلکتے سے سولہ میل اُدھر جا کر نواب نے سانس لی۔ نواب کے سپاہیوں اور ایک ایرانی رسالے نے انگریزوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ روشنی نمودار ہونے کو تھی، اس لئے کلائیو واپس چلا گیا۔ اس لڑائی میں انگریزی فوج کے دو سو سپاہی کام آئے۔"

دربارِ سراج میں غدّار پیدا کئے جا چکے تھے۔ ان حالات میں نواب کا انگریزوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ نواب نے ۹ فروری ۱۷۵۷ء کو عہد نامۂ علی نگر پر دستخط کر دئے۔ اس عہد نامے کی مندرجہ ذیل شرائط تھیں۔

(۱) ان تمام مراعات کا تسلیم کرنا جو شہنشاہِ دہلی نے کمپنی کو دے رکھی ہیں۔

(۲) برطانی پروانۂ راہداری کے ذریعے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کا مال بغیر محصول ادا کئے داخل ہو سکتا۔

(۳) نواب اس نقصان کی تلافی کرے جو کمپنی یا اس کے ارکان کو نواب کے سپاہیوں کے سبب ہوا۔

(۴) انگریز حسبِ منشا کلکتے کا استحکام کریں!

(۵) انگریزوں کو سکہ جاری کرنے کا حق ہوگا۔

(۶) جب تک نواب اس عہد نامے پر عمل پیرا ہو برطانی قوم اور کمپنی کی طرف سے کلائیو اور واٹسن وعدہ کرتے ہیں کہ وہ نواب کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھیں گے۔

ہنوز اس عہد نامے کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ مجلسِ منتخبہ کو نواب سے مزید مطالبات منظور کرانے کی فکر ہوئی۔ کمپنی اس فوری عہد شکنی کو کام میں نہ لا سکی۔ تاہم کمپنی نے نواب کو اس امر پر رضامند کر لیا تھا کہ کمپنی کا ایک سفیر مرشدآباد میں رہے گا۔[1]

واٹسن کمپنی کی طرف سے سفیر مقرر کیا گیا۔ کمپنی کا یہ سفیر دربارِ مرشدآباد میں سازش کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے ساتھ امیر چند کو لے گیا۔ اب سراج کا تخت کانٹوں کا بچھونا تھا۔ واٹسن نواب کے خلاف سازش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ واٹسن ہی نے فورٹ ولیم میں کہلا بھیجا تھا کہ چندر نگر کی فرانسیسی بستی پر حملہ کیا جائے کمپنی کے ارکان نے نواب سے اس حملے کی اجازت چاہی، نواب نے جواب میں کہا کہ انگریزوں کا چندر نگر پر حملہ عہد نامے کی خلاف ورزی ہے کیونکہ چندر نگر اس کی مملکت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن انگریز چندر نگر پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے چندر نگر پر حملہ کر کے بنگال میں فرانسیسی اثر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ انگریزوں کے اس حملے کی روک تھام کے لئے نواب نے نند کمار کو حکم دیا کہ انگریزوں کو ہگلی سے آگے نہ بڑھنے دے۔ لیکن رشوت نے نند کمار کو مزاحمت میں اس قدر نرم بنا دیا کہ انگریزوں کا اپنے ارادہ میں کامیاب ہونا بہت آسان ہو گیا۔

عہد نامے کی خلاف ورزی کرنے والا انگریز تھا نہ کہ سراج۔

انگریزی سفیر امیر چند کی مدد سے نواب کی قبر کھود رہا تھا۔ چنانچہ چند دنوں میں کمپنی نے لطف خاں، میر جعفر، مانک چند، راج بلبھ اور درلابھ رام ایسے سازشی کردار اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کے لئے پیدا کر لئے۔ ان حالات میں سراج کا نواب رہنا بہت مشکل تھا۔ امیر چند کے ذریعے سے میر جعفر سے تاج و تخت کا وعدہ کیا گیا۔ میر جعفر سراج کے خلاف سازش میں شریک ہو گیا۔ میر جعفر نے کمپنی کو نوابی کے صلے میں اخراجاتِ جنگ کے علاوہ ایک کروڑ چھہتر لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ امیر چند نے سازش کو کامیاب بنانے کے صلے میں تیس لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا۔ کمپنی میر جعفر کو نواب بنانا چاہتی تھی۔ لیکن امیر چند کو روپیہ دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ کلائیو کے پُرفریب ذہن نے پھر ایک بات پیدا کی۔ چنانچہ کلائیو نے دو اقرار نامے تیار کئے، اصلی اقرار نامے میں امیر چند کے مطالبے کا ذکر نہ تھا لیکن جعلی اقرار نامے میں امیر چند کو روپیہ دینے کا ذکر تھا۔ کلائیو نے چاہا کہ واٹسن بھی اس جعل سازی میں اس کا شریک ہو جائے۔ لیکن واٹسن مکاری کی ان گہرائیوں تک نہیں پہنچا تھا جہاں کلائیو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھا۔ کلائیو نے جعلی اقرار نامے پر واٹسن کے جعلی دستخط بنا کر امیر چند کو مطمئن کر دیا۔

---

[1] ایشیائی تاجداروں نے یورپی سفیروں کو اپنے ہاں جگہ دے کر تاج و تخت سے ہاتھ دھوئے ہیں۔

"پروردۂ افلاک سربازہ کی سیرت!

نواب کے خلاف اب سازش مکمل ہوچکی تھی۔ مرشد آباد میں مقیم انگریز شکار کے بہانے سے شہر چھوڑ کر چلتے بنے۔ اگلے روز واٹسن اور امیر چند بھی غائب تھے۔ سراج سازش سے باخبر ہوچکا تھا۔ میر جعفر نے کلائیو کو پلاسی کی طرف کوچ کرنے کا مشورہ دیا۔ نواب کی فوج میں غداری کا بیج بویا جاچکا تھا۔ پلاسی کے میدان میں دونوں فوجیں برسرِپیکار ہوئیں۔ پلاسی کے لوگ آج تک میر جعفر کو غدار کہتے ہوئے سُنے گئے ہیں۔ لیکن ان کی گردنیں میر میداں[1] کی شجاعت اور شہادت کے سامنے جھک جاتی ہیں۔ میر جعفر اپنی فوجوں کو لئے ہوئے علیحدہ کھڑا رہا۔ میر جعفر کی غداری۔ جرنیلوں کی سازش، کلائیو کی مکاری اور میر میدان کی شہادت نے سراج کو میدانِ جنگ میں شکست کا منہ دکھایا۔ شکست خوردہ سراج ایک ہاتھی پر سوار ہوکر مرشد آباد کی طرف چل پڑا۔ اس شکست کی خبر آگ کی طرح سارے بنگال میں پھیل گئی۔ نواب بے یار و مددگار تھا۔ یگانے اور بیگانے سب اس کے دشمن ہوچکے تھے۔ اس کے درباریوں نے سراج کو اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن سراج اس ذلت سے بے تاج و تخت ہونا بہتر خیال کرتا تھا۔

میر جعفر مرشد آباد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سراج مرشد آباد کو فقیر کے بھیس میں خیرآباد کہہ رہا تھا۔ غدار تخت نشین ہو رہا ہے۔ وطن پرست جنگلوں میں جا رہا ہے۔ بنگال نے سراج اور جعفر میں سے جعفر کو منتخب کیا۔ جعفر نے لندن کو مرشد آباد پر مسلط کردیا۔

سراج گرفتار ہوکر جعفر کے بیٹے میرن کے ہاتھوں قتل ہوا۔[2]

[1] سراج کا مشہور جرنیل جو پلاسی کی جنگ میں کام آیا

[2] بنگالی مورخ باسو کے نزدیک خونِ سراج سے کلائیو کا ہاتھ بھی رنگین ہے

(بقیہ مضمون پریم چند کے مختصر افسانے صفحہ ۲۳۶ سے)

نے بتایا ہے کہ گئو ہتیا کرنے کی وجہ سے دو راج کمار دگی اور دو راج کماریاں کی جانیں گئیں۔ الغرض منشی پریم چند نے ہند و تاریخ کے زریں کارناموں کو لیکر دنیا کے بہترین افسانے پیش کئے ہیں، اور اس طرح اپنی غافل اور بزدل قوم کو جانبازی کرنے اور راہِ آزادی میں فنا ہوجانے کا بہترین طریقہ پر درس دیا ہے۔

خدمتِ زبان

فی زمانا زبان کے مسئلے نے ایک خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔ ہر طرف سے صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ زبان کو سہل و عام فہم بنایا جائے۔ مگر چونکہ اس بدنصیب ملک میں غلامی و محکومی کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستی اور برادرانِ وطن میں باہمی بداعتمادی کا دور دورہ ہے۔ اس کا بہت گہرا اور نمایاں اثر زبان پر بھی پڑا ہے۔ جس کے ثبوت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اخباروں کی زبان کا اختلاف پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہندوؤں کے اخبار چھپتے تو عربی رسم الخط میں ہی ہیں مگر ان کی زبان میں ہندی اور سنسکرت کے ادق اور ناقابلِ فہم الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور اکثر ہندو اخبار تو ایسی زبان میں چھپتے ہیں جس کا مطلب اردو دنیا کی سمجھ میں آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے اخباروں میں عربی و فارسی کے ادق الفاظ کی افراط ہوتی ہے۔ یہ ہر دو گروہ خدمتِ زبان نہیں بلکہ تخریبِ زبان کر رہے ہیں ادب اُردو کی تاریخ کے دورِ اوّل اور ثانی کے ادیبوں مثلاً مولانا نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ کی زبان میں بھی یہی نقص ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سب سے پہلے زبان کو سہل و عام فہم بنانے کی طرف توجہ دی۔ اس کوشش میں مولانا حالی کے حقیقی پیرو مولانا عبدالحق اور اُن کے متبعین ہیں۔

حالی کے بعد منشی پریم چند نے ایک ایسی زبان لکھی جسے ٹھیٹ ہندوستانی کہنا چاہیئے۔ منشی جی نے فرقہ پرستوں کی مذموم و پست ذہنیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرکے عربی۔ فارسی۔ ہندی اور سنسکرت کا دلپسند مرکب ہے۔ مگر اس نیک کوشش میں کہیں کہیں بُری طرح ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ جہاں کہیں الفاظ کے توازن کا خیال نہیں رہا ہے وہاں ایسے جملے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ایک طرف تو بھاشا کے شیریں الفاظ ہیں اور دوسری طرف فارسی کے لفظوں کی مہتم بالشان ترکیب۔ ان دو انمل بے جوڑ چیزوں نے ایک جگہ جمع ہوکر ایک ایسی زبان پیدا کردی ہے جو کانوں کے علاوہ مذاق پر بھی گراں گزرتی ہے۔ لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں اس امتزاج میں توازن ہے وہاں ایک بھدا اور پُرکیف زبان پیدا ہوگئی ہے۔

راہِ طرب

اللہ رے آج جشنِ خرابات کا فروغ　　لرزش میں تارِ ساز ہے، گردش میں دورِ جام

چھائی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی　　رقصندہ آبِ نہر ہے، تابندہ سقف و بام

جھکتی صراحیوں میں ہے رُوحِ رباب و چنگ　　اُٹھتی جوانیوں پہ ہے نُورِ مہِ تمام

نکھری ہوئی ہے نشے سے نمناک چاندنی　　ڈوبی ہوئی ہے کیف میں بادِ سُبک خرام

نغمے ہیں اپنے چشمۂ پنہاں سے ہمکنار　　رُوحیں ہیں اپنے مرکزِ اصلی سے ہمکلام

جبریل سے بھی اُٹھ نہ سکے جس کا ایک حرف　　وہ آرہے ہیں عالمِ ارواح سے پیام

گردش میں ہیں، سروں پہ اُٹھائے گُلابیاں　　تُرکانِ ماہ پارۂ و خوبانِ لالہ فام

آیا یہ کون راہِ طرب پُوچھتا ہوا!
چہرہ تو کہہ رہا ہے کہ ہے رہبرِ انام

آنے دو، اس بزرگ کو، آنے دو روبرو　　لازم ہے ہر جوان کو پیری کا احترام

یہ ریش، یہ عمامہ، یہ حق آشنا نظر　　راہِ طرب کی فکر میں نظریں یہ سوئے جام

ہاں اِس طرف۔ قریب۔ ذرا اور کچھ قریب
اچھا..... جنابِ خضر ہیں! وعلیکم السلام!

جوش

احسن الانتخاب پر ایک نظر

محمد خاں بنگلور

"احسن الانتخاب" مولفہ احسن صاحب مارہروی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے نصاب تعلیم میں شامل ہے اور یہی سررشتۂ تعلیم گورنمنٹ میسور کو بغرض منظوری بھیجا گیا ہے۔ مولف صاحب "تعارف" میں لکھتے ہیں کہ "احسن الانتخاب کی تالیف وترتیب میں حتی الامکان اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ جدید کورس ہر حیثیت سے طلبہ کے لئے مفید و کارآمد ثابت ہو" مولف صاحب کے سے کہنہ مشق شاعر مسلم محقق اور اردو ادبیات کے زبردست سرپرست جب فرمائیں کہ میں نے اس تالیف کو ہر حیثیت سے مفید بنانے میں حتی الامکان کوشش کی ہے تو نتیجۃً سارے طلبہ خواہ وہ علی گڈھ کے ہوں یا حیدرآباد کے یا میسور کے آپ کی ہر تحقیق کو وحی سمجھیں گے اور بیچارے لکچرار اگر اتفاقاً مولف صاحب کی کسی تحقیق سے متفق نہ ہوں تو اس کا اظہار کرنے کے بعد طلبہ کی نظر میں ذرا مشکل سے اپنی حیثیت کو سنبھال سکیں گے۔ خصوصاً جب کہ "مدیر کلیم" نے ستمبر ۳۶ء کے رسالہ میں صفحہ ۱۹۸ پر "کچھ زبان کے متعلق" کے تحت میں جناب احسن صاحب کی رائے بھی طلب کی ہے، تو حیثیت سنبھالنے کا مسئلہ اور بھی اہم ہو جاتا ہے، مجھے اس کورس کو سرسری طور پر دیکھنے کا اتفاق ہوا، لیکن اکثر مقامات میں مولف صاحب کی رائے سے اتفاق نہ ہوا۔ اگر یہ کتاب نصاب تعلیم میں داخل نہ ہوتی تو میں اس امر کو نظر انداز کر دیتا، لیکن جب کہ اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کی کوشش ہو رہی ہیں، اور اعلیٰ حضرت تاجدار دکن اردو کو ادب عالیہ کا درجہ بخشنے کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہا رہے ہیں تو زمانۂ مستقبل میں ان مقاصد کو پروان چڑھانے والی نسلوں کی تعلیم میں تساہل نہیں برتا جا سکتا۔ امید ہے کہ مولف صاحب ادھر توجہ فرمائیں گے۔

انتخاب کلام میر

مولف صاحب۔ صفحہ ۲۱

گلبرگ سے بھرے تھے کبھے تو کنار جیب
کیا کیا سمیں یہ گریۂ خونیں دکھا گیا

سماں بمعنی منظر اردو کا لفظ ہے، رس کی جمع سمیں خلاف روزمرہ ہے، کیونکہ مذکر لفظ کی جمع ی، ن سے نہیں بنائی جاتی، بہر حال آج کل فصیح نہیں زیادہ سے زیادہ سمے (یائے مجہول سے) بول سکتے ہیں۔

معترض۔ احسن صاحب نے سماں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت سطحی ہے،

پہلے تو یہ لکھا کہ "مذکر لفظ کی جمع ی، ن سے نہیں بنائی جاتی" حالانکہ یہ صریح غلطی ہے۔ پھر لکھا کہ بہرحال آج کل فصیح نہیں" لیکن یہ نہیں لکھا کہ سماں کی فصیح جمع آج کل کیا آتی ہے۔ پھر آخر میں فرمایا کہ "زیادہ سے زیادہ سمے (یائے مجہول سے) بول سکتے ہیں" مگر جو لوگ سماں کو یہاں رواں وغیرہ کے ساتھ ہم قافیہ کرتے ہیں وہ اس کو کیوں کر تسلیم کر سکتے ہیں۔ علاوہ "زیادہ سے زیادہ" کی ترکیب سے ظاہر ہے کہ احسن صاحب کا عقیدہ سمے کے متعلق بھی ڈانواں ڈول ہے۔ قارئین فیصلہ فرمائیں کہ اس حاشیئے سے طلبہ کی قابلیت بڑھے گی یا گھر ہی۔

مصباح القواعد کے مصنف مذکر کی جمع بنانے کے قاعدوں کے تحت میں لکھتے ہیں۔

"اگر آخر میں نون غنہ اور اس سے پہلے الف ہو تو جمع میں الف یائے مجہول سے بدل جائے گا" جیسے کنواں، کنویں۔ دھواں، دھویں، سماں، سمیں۔

مولوی عبدالحق صاحب قواعد اردو میں "تعداد و حالت" کے تحت میں لکھتے ہیں کہ "جن مذکر لفظوں کے آخر میں (ا ں) (الف اور نون غنہ) ہوتا ہے اُن کی جمع میں واحد کا الف ے سے بدل جاتا ہے، جیسے دھواں سے دھویں، رواں سے رویں"

لیکن فرجاد صاحب نے آئین اردو میں لکھا ہے کہ "جن واحد مذکر لفظوں کے آخر میں حروف واؤ الف نون ہوں تو جمع کے لئے ۱۔ حرف واؤ کو ساکن کرکے الف کو ۲۔ ایسی یائے مجہول مکسور سے جس کے مرکز پر ہمزہ ہو بدل کر اس کے بعد اور نون غنہ سے پہلے ایک اور یائے مجہول ساکن زیادہ کرتے ہیں، جیسے دھواں، دھویں، رواں، رویئں۔ کنواں، کنویئں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے فتح محمد خاں صاحب کے بتائے ہوئے قاعدے کو بتغیر الفاظ نقل کر دیا ہے۔ مثالوں میں فقط ایک لفظ دھواں مشترک ہے۔ جالندھری صاحب نے رواں نہیں لکھا، اور مولوی صاحب نے سماں حذف کر دیا۔

فرجاد صاحب الف اور نون غنہ سے پہلے واؤ کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں، اس لئے سماں اس قاعدے سے خارج ہو گیا۔ مولوی صاحب نے مثالوں میں اگرچہ سماں کا لفظ نہیں لکھا۔ لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھیں سمیں کو سماں کی جمع ماننے میں تامل ہے۔ تعجب ہے کہ فرجاد صاحب نے جو قواعد اردو میں اپنی موشگافیوں کی وجہ سے مشہور ہیں، سماں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

میری دانست میں وہ مذکر اسم جن کی جمع ویں، سے بنتی ہے، چار قسموں میں منقسم ہیں۔

واحد - بھلاواں، چھلاواں، پرچھاواں، سالواں۔

جمع - بھلاویں، چھلاویں۔ پرچھاویں، سالویں۔

ان میں ہمزہ متعذر ہے۔ یعنے بقول فرجاد ان مثالوں میں واؤ کو ساکن کر کے اس کے بعد ایسی یائے مجہول مکسور جس کے مرکز پر ہمزہ ہو لاکر دیکھیں کہ تلفظ میں کس قدر ثقل واقع ہوتا ہے۔ فرجاد کہتے ہیں کہ بھلاویں کو فعولن کے وزن پر نہ پڑھو۔ مفاعیلن کے وزن پر پڑھو۔ یہ محض ہٹ دھرمی ہے۔

واحد - دھواں - رواں - کنواں۔

جمع - دھویں - رویں - کنویں۔

ان میں ہمزہ ثقیل تو نہیں، لیکن تکلف سے خالی نہیں، دونوں صورتوں میں فرجاد کا قاعدہ نہیں چلتا۔ مثلاً ؎

نالہ اک دم میں اُڑا دے گا دھویں
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا (بحر رمل مسدس محذوف)

(گا - دُھ - ویں) فاعلن کے وزن پر ہے، اور اگر بقول فرجاد دھویں کو فعلن (مخبون مسکن) کے وزن پر پڑھیں تو علم عروض کی مٹی پلید ہو جائے گی، ایک اور ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ واؤ کو تقطیع سے ساقط کر کے ہمزہ بڑھا لیں، لیکن یہ ایک ایسا تکلف ہے جو سراسر فضول ہے۔ اور اسی قسم کے لایعنی تکلفات سے زبان کی پیچیدگیاں بڑھ جاتی ہیں۔ کنویں کا استعمال دیکھئے۔ بحر ؎

یہ جگہ وہ ہے فرشتوں نے کنویں جھانکے ہیں
پاک آلائش دنیا سے بشر کیا ہوگا (بحر رمل مثمن مخبون محذوف مسکن)

واحد - رویاں

جمع - رویئں

اس میں ہمزہ ضرور آئے۔ یہاں فرجاد کا قاعدہ اس لئے غلط ہے کہ واؤ پہلے ہی سے ساکن ہے۔

بحر ؎

نسبت اس کے بدن سے دیتے ہم
روئیں ہوتے اگر نہ مخمل میں (بحرِ خفیف)

واحد - سماں

جمع - سمیں

یہ لفظ دوسری قسم میں شامل ہے۔ لیکن اس میں (ان) سے قبل واؤ کے نہ ہونے سے اس کی نوعیت علیحدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ نقطہ نظر کا دھوکا ہے۔ لہٰذا سماں کی جمع سمیں اتنی ہی فصیح ہوتی جتنی کہ دھواں - رواں - کنواں کی جمعیں فصیح ہیں۔

مذکر کی جمع بنانے کے قاعدوں کے تحت میں فرماد صاحب نے ایک جدید قاعدہ گھڑا ہے جو بڑا ہی انوکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اگر اسم واحد مذکر کے آخر میں یائے مفتوح اور الف ساکن اور نون غنہ موقوف ہو تو صرف ہے کو کسرہ دے کر اس کے مرکز پر ہمزہ لائیں گے اور الف کو گرا دیں گے، جیسے

واحد - دایاں - بایاں

جمع - دائیں - بائیں

اس مغالطے کی دو وجہیں میرے قیاس میں آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ نے صفات کو اسماء سمجھ لیا۔ دوسری یہ کہ جانب راست وجانب چپ کے معنے جوابِ راست وچپ لئے۔ اور اگر دایاں اور بایاں سے وہ طبلے مراد ہیں جو دائیں اور بائیں ہاتھ کی طرف رہتے ہیں تو دو باتیں تحقیق طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ جیسے بائیں ہاتھ کی طرف کے طبلے کو بایاں کہتے ہیں اسی طرح دائیں ہاتھ کی طرف کے طبلے کو دایاں کہتے ہیں یا نہیں؟ دوسری یہ کہ ان کی جمع کیا آئے گی۔ مثلاً کسی شخص کو بائیں ہاتھ کی طرف کے دو طبلوں کی ضرورت ہے تو وہ لڑکے سے کیا کہے گا۔
"فلاں طبلچی سے دو ...." مانگ لاؤ "

اہلِ زبان حضرات توجہ فرمائیں (قاعدہ نمبر ۱۱ نظر میں رہے)

مولف صاحب - صفحہ ۲۱

ہستی مری کہ سرچ سحی میں منفعل رہا
اس شرم سے ندان زمیں میں سما گیا

ندان - نادان کا مخفف ہے۔ پرانی زبان ہے۔ اب نہیں بولتے۔

معترض ندان بکسر نون بمعنی آخر کار ہے۔ اگر مولف صاحب کے قیاس کے مطابق یہ نادان کا مخفف ہوتا تو بالفتح ہوتا۔ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔

مولف صاحب صفحہ ۲۳

کچھ میں ہی نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرت ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

رسالہ - فوج کے ایک دستے کو کہتے ہیں - دل کے انتشار اور پریشانی کو رسالے سے تعبیر کیا ہے۔

معترض یہاں رسالے کے معنی چھوٹی سی کتاب کے ہیں اور رسالے کی صفت "برہم" لانے سے یہ مراد ہے کہ اس کی شیرازہ بندی نہ ہوئی تھی۔

لطیفہ - سرحد پار کے مولویوں کی ایک جماعت مولوی نذیر احمد مرحوم سے عربی پڑھ رہی تھی، زید بن حارث کے سفر کا حال تھا، اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی انار اللیل" سے ادا کیا تھا، ان بچے آدمیوں نے رات کو قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا۔ اس میں شامتِ اعمال سے "انار" کے معنی مٹکے کے بھی ہیں، اللہ دے اور بندہ لے۔ انھوں نے یہاں مٹکا پھنسا دیا، اور نہایت متانت سے "فی انار اللیل" کے معنی "رات کے مٹکے میں سفر کیا" سے کر دئے، مولوی صاحب نے فرمایا، انار کے دوسرے معنی بھی تو ہیں۔ پڑھنے والے نے کہا جی ہاں کئی معنی ہیں، لیکن اس مقام پر مٹکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ (نذیر احمد کی کہانی از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب)

مولف صاحب - صفحہ ۲۶

کیا تنگ حوصلہ تھے دیدہ و دل دونوں آہ
اک دم رازِ محبت کا چھپا یا نہ گیا

تنگ حوصلہ - کم حوصلہ - ہلکا پن

معترض ہلکا پن اسم ہے اور تنگ حوصلہ صفت، صفت کی مرادف کوئی صفت ہی ہوگی نہ کہ اسم۔

مولف صاحب صفحہ ۲۷

جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پر لیکن
حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پشیمان نہ ہوا

تنک ہندی لفظ ہے ۔ بمعنی ذرا۔ اردو میں اب متروک ہے۔

معترض احسن صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ ایک جدید انکشاف ہے کہ سعدیؒ ہندی سے واقف تھے ۔ جبھی تو لکھا ہے ؎

دریائے فراواں نہ شود تیرہ بسنگ
عارف کہ برنجند تنک آب است ہنوز

اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔

مولف صاحب ۔ صفحہ ۳۰

باندھو مت رونے کا تار لے ناقباحت فہم چشم
اس سے پایا جاتا ہے سررشتہ جی کی جاہ کا

سررشتہ ۔ سلسلہ ، معاملہ پایا جاتا ہے ۔ متروک زبان ہے ۔ اب پا یا جاتا ہے ، فصیح ہے ۔

معترض کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ارشاد ہو رہا ہے ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

مولف صاحب ۔ صفحہ ۳۳

اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے
مرا زمزمہ گاہ بے گاہ کا

گاہ بے گاہ ۔ کبھی کبھی

معترض ان دونوں جملوں میں کہ وہ گاہ بے گاہ ہے اور وہ گاہ بے گاہ گاتا ہے بہت بڑا فرق ہے ۔ پہلے جملے سے گانے کی کمی اور ندرت اور دوسرے سے گانے کے اوقات کی بد نظمی ظاہر ہوتی ہے ۔ پہلے جملے کے معنی ہوں گے کہ وہ کبھی کبھی گاتا ہے ۔ اور دوسرے کے یہ معنے ہیں کہ وہ وقت بے وقت گاتا ہے ۔ وقت بے وقت کا گانا سننے والوں کی طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے ، اور یہی اس پرندے کی گرفتاری کا باعث ہوتا ہے ۔ میر صاحب خوش اس لئے ہیں کہ اُن کے پکڑے جانے کے اسباب جمع ہو گئے ہیں ؎

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

مولف صاحب صفحہ ۲۰۹

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

چونکہ عموماً غریب و مفلس کے پاس تیل کم ہوتا ہے ، اس لئے اس کا چراغ جلد بجھ جاتا ہے ۔ یہی مفہوم اس شعر میں ادا کیا گیا ہے۔

معترض ۔ سا کسی لفظ کے معنے کی کیفیت کو ہلکا کرنے کے لئے آتا ہے ۔ میر صاحب فرماتے ہیں کہ شام ہوتے ہی دل یک لخت سرد نہیں ہو جاتا ۔ بلکہ اس پر کچھ مردنی سی چھا جاتی ہے ۔ گویا ہمارا دل مفلس کا چراغ ہے جس کی بتی تیل زیادہ خرچ ہو جانے کے ڈر سے بالکل کم رکھی گئی ہے اور وہ ٹمٹماتا ہوا جلتا ہے ۔

مولف صاحب ۔ صفحہ ۱۴

تھے برے مغ بچوں کے تیور لیک
شیخ میخانے سے بھلا کھسکا

مغ دراصل آتش پرست کے پیر و مرشد کو کہتے ہیں ۔ اسی مناسبت سرداری سے ساقی کو بھی کہنے لگے ۔ مغاں کا واحد یا مخفف ہے ۔ مغ بچے اطفال مے خانہ ۔ ساقی کے خدمتی و ماتحت میخوار ۔

معترض مغ کے معنے فقط آتش پرست کے ہیں ۔ پیر و مرشد کو پیر مغاں کہتے ہیں ۔ اور اگر مغاں کو مغ کا مزید علیہ مان لیں جیسے مستان مست کا مزید علیہ آتا ہے تو مغ اور مغاں دونوں ہم معنی ہونے چاہئیں ۔ حالانکہ مغاں بطور واحد کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ حافظ علیہ الرحمتہ کے اس مصرعہ میں کہ ع

در خرابات مغاں ما نیز ہم منزل شویم

مغاں یا تو مغ کی جمع ہے یا مضاف محذوف ہے اور حالی کی اس رباعی میں ؎

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا	آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے	انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ہندو اور دھری کے تقابل سے ظاہر ہے کہ مغاں سے مراد پیر مغاں ہے ۔ اگر مولف صاحب کو اصرار ہے کہ مغاں کا مخفف مغ آتا ہے تو وہ کسی لغت یا قواعد کی کتاب سے سند پیش کریں ۔

مولف صاحب صفحہ ۱۸

قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی   گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا

نالگی۔ یعنی نالہ کرنا۔

معترض اس میں یا فاعلی ہے نہ کہ مصدری یعنی نالگی کے معنی ہیں نالہ کرنے والا۔ علاوہ روضہ خواں کے ساتھ نالگی کی مناسبت ظاہر ہے۔ جہاں تک میں نے فارسی زبان کا مطالعہ کیا ہے یائے مصدری کو صفت کے ساتھ اور یائے فاعلی کو اسم کے ساتھ لاحق ہوتے دیکھا ہے۔ مثلاً خرمی اور خوشدلی کی (ی) مصدری ہے اور جنگی و چنگی کی (ی) فاعلی۔ اب جبکہ مولوی احسن صاحب نے نالگی کی (ی) کو مصدری قرار دیا ہے تو گویا ایک مسلمہ قاعدے کا خلاف کیا ہے اور شاید سند بھی رکھتے ہوں گے۔

مولف صاحب۔ صفحہ ۵۹

گل و آئینہ کیا؟ خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

تدھر پرانی زبان ہے اب جدھر فصیح ہے۔

معترض تدھر کے معنی ہیں ادھر۔ اگر بقول مولف تدھر کو جدھر کا مرادف مان لیں تو شعر مہمل ہو جائے گا۔ ع

جدھر دیکھا جدھر تیرا ہی رو تھا

مولف صاحب صفحہ ۶۲

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار اپنا
یہاں سے لوگ سب رخت سفر کرتے ہیں بار اپنا

بے بصیرت۔ بے بصر۔ اندھے

معترض اندھے عقل کے نہ کہ آنکھوں کے۔ اندھے کا لفظ صراحت چاہتا ہے۔ اگر ابتدا میں ہی بصارت اور بصیرت کا فرق طلبہ کے ذہن نشین نہ کیا گیا تو وہ اُن کے استعمال میں ٹھوکریں کھایا کریں گے۔

انتخاب غزلیات غالب

مولف صاحب صفحہ ۹۲

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سر ہونا ایک محاورہ ہے جس کا مفہوم انکشاف حال کے لئے کوشش و سعی کرنا ہے۔

معترض محاورہ ہے اور معنے بیان ہوئے ہیں۔ متعدی۔ مولانا حالی نے اپنے ایک مکتوب میں آزاد مرحوم کو اس شعر کے معنے سمجھائے ہیں کہ یہاں سر ہونا سے مراد بل کھلنا ہے۔ اور یہ خط مکتوبات آزاد کے آخر میں چھپ گیا ہے۔ احسن صاحب نے جو معنے لکھے ہیں وہ کسی طرح اس شعر میں نہیں جچتے۔

مولف صاحب۔ صفحہ ۹۹

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں

آسمان پر شمالی جانب سات ستارے ہیں: جن میں سے چار ستارے جنازے (کھٹولے) کی شکل میں نظر آتے ہیں، اور تین جنازہ اُٹھانے والوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں کو نبات النعش کہتے ہیں۔ نبات جمع بنت بمعنی دختر۔ نعش جسم۔ لاش۔

معترض کس قدر متضاد جملے ہیں۔ "جنازہ اُٹھانے والے" بنات النعش" کیونکر ہو گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ بنات کی مزید وضاحت کی ہے" بنات جمع بنت یعنی دختر"۔ اگر "جنازہ اُٹھانے والیاں" لکھتے تو کم از کم عبارت کا ربط ہی قائم رہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ "عرب جنازہ اُٹھانے والے کو ابن النعش کہتے ہیں، اور ان کے محاورے میں ابن النعش کی جمع بنات النعش ہے"۔ اگر احسن صاحب مولانا نظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب یا نور اللغات دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے تو طلبا کو اس گورکھ دھندے میں نہ پھنساتے۔ پھر نعش کے جو معنے لکھے ہیں وہ بھی غلط۔

مولف صاحب صفحہ ۱۱۱

آتش گل پہ قند کا ہے قوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرط الفت سے — باغبانوں نے باغ جنت سے
انگبیں کے بحکم رب الناس — بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخ نبات — مدتوں تک دیا ہے آب حیات

- - - - - - - - - - - -

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پھر کہاں بو باس

اس شعر میں آتش گل سے مراد گلاب کا پھول ہے۔ اس کی سرخی کو آگ

سے استعارہ کیا ہے۔ قوام بمعنی شیرہ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ آم درحقیقت گلاب ہے، اور اس پر شہد کا قوام کیا گیا ہے۔ اور اس قوام سے جو تار نکلتا ہے وہ آم کا ریشہ ہے۔ بعض شارحین کا خیال ہے کہ آتشِ گل سے پھول کی آگ مراد ہے جس پر قوام تیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس شرح پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آم کی تشبیہ صرف قوام سے دینا غالب جیسے دقیقہ رس شاعر سے بعید ہے۔ جب کہ پھول کی شکل موجود ہے جس سے تشبیہ کامل ہوتی ہے۔

معترض بقول مولف صاحب آتشِ گل میں اضافت تشبیہی، ان لیں تو پھر اس کی سرخی کو آگ سے استعارہ کرنا کونسی بلاغت ہے۔ یعنی جب کہہ دیا کہ گل آتش کی مانند ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں سرخی وجہ تشبیہہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آم کا شیرہ اس قدر لطیف اور میٹھا ہے کہ گویا مصری کا قوام آتشِ گل پر تیار کیا گیا ہے۔ اس میں تخیل کی نزاکت فقط اسی قدر ہے کہ ایندھن کی آگ پر جو قوام بنتا ہے وہ بھی ہم نے چکھا ہے۔ لیکن آم کے شیرے کی مٹھاس کچھ اور ہی جداگانہ کیفیت رکھتی ہے۔ اس لئے ہو نہ ہو ؏

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام

آم کا ریشہ دار ہونا پسندیدہ نہیں تھا۔ اس عیب کو یہ کہہ کر دور کیا کہ ریشے اس قدر ملائم ہیں کہ چکھتے وقت آپ انھیں محسوس تک نہیں کرسکتے، گویا قوام کے تار ہیں۔ باقی احسن صاحب نے جو کچھ لکھا ہے مثلاً آم اور گلاب کی تشبیہہ۔ شہد کا قوام کیا جانا، وغیرہ وغیرہ سب بے بنیاد ہے۔

انگبین کا لفظ تیسرے شعر میں آیا ہے۔ مگر وہ مضمون ہی علیحدہ ہے اور دوسرے شعر کی ابتدا میں (یا) کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے۔ قند کے قوام کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ البتہ شہد کے سربمہر گلاس اور آم میں مشابہت ہے نہ کہ گلاب کے پھول اور آم میں۔ ہاں اگر احسن صاحب گلاب کی کلی کہتے تو کوئی بات تھی۔ مگر غالب کے حواس کچھ مختل نہیں ہوگئے تھے جو کلی کی سرخی کو آتشِ گل کہتا۔ احسن صاحب نے جس طریقے پر ان دو مضامین کو گڈ مڈ کر دیا ہے، یہ بات آپ کے پائے سے گری ہوئی ہے۔ اس پر دقیقہ رسی کا دعویٰ جدا اور دوسرے شارحین پر اعتراض الگ۔

مولف صاحب۔ ترنج۔ یعنی نارنگی یا لیموں۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ خسرو کے پاس ایک سونے کا ڈلا سا جو بشکلِ ترنج تھا، اور وہ اُس کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا، آور وہ مثلِ موم کے نرم ہوجاتا تھا۔

معترض۔ احسن صاحب نے ترنج کے جو معنے لکھے ہیں اُن کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نہ تو ترنج ہی دیکھا ہے نہ نارنگی اور نہ لیموں۔ ترنج زر کی جو مزید تشریح کی ہے اس عبارت میں پہلے جملے کی خبر کہاں ہے۔ شاید کاتب نے جو بڑھا دیا ہو گا جس کے بغیر جملہ صحیح ہے۔

مولف صاحب۔ صفحہ ۱۱۱

آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

طلائے دست افشار، دست افشار اس وجہ سے کہتے ہیں کہ موم کی طرح ہاتھ کے ہلانے سے دب جاتا اور پچک جاتا ہے۔

معترض یہاں یہ تھا کہ ہاتھ کے ہلانے سے کوئی چیز کیونکر دب یا پچک جائیگی میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے اس خوش اعتقادی سے کہ احسن صاحب نے تجربے کے بعد ہی یہ لکھا ہو گا، موم کا ایک گولہ لے کر ہاتھ کو خوب ہلایا، بلکہ کئی بار گھمایا، لیکن موم کا گولہ نہ تو دبا اور نہ پچکا، ہاں جب دبایا تو دبا اور جب پچکایا تو پچکا۔

مولف صاحب۔ صفحہ ۱۱۲ طوبیٰ اور سدرہ بہشت کے درخت ہیں۔

معترض۔ آج تک جتنے لغت نویس گزرے ہیں، سب یہی لکھتے آئے ہیں کہ طوبیٰ بہشت کے ایک درخت کا نام ہے اور سدرہ آسمان ہفتم میں ایک پیڑ ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ دونوں بہشت ہی میں ہیں اور یہ بھی آج ہی کھلا کہ سعدیؒ کے اس شعر کے کیا معنی ہیں ؎

چناں گرم در تیہ قربت براند
کہ در سدرہ جبریل ازو باز ماند

یعنی معراج کی رات رسولِ خداؐ جنت میں سے ہو کر گزرے، اور جبریل سدرہ کے پاس ٹھہر گئے۔

مولف صاحب۔ صفحہ ۱۱۵ امتثالِ امر حسب الحکم۔ فرمائش پر

معترض امتثال کے معنی ہیں حکم ماننا تو امتثال امر کے معنی ہوئے کسی کے حکم کی تعمیل کرنا۔

"ذرہ امتثال امر" تعمیل حکم کے طور پر، یعنی امتثال امر سے فرمانبرداری ظاہر ہوتی ہے، اور "حسب الحکم" یا "فرمائش" پر سے حکم و فرمائش یعنی پہلے سے خادم کی اور دوسرے سے مخدوم کی حالتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لہٰذا لفظ اور مولف صاحب کے لکھے ہوئے معنے میں تضاد ہے۔

قطعات حالی

مولف صاحب۔ صفحہ ۱۳۰

فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا

مغز چلانا یا چلنا۔ احمق یا مغرور ہو جانا

معترض — مغز چلانا۔ متعدی، کسی کو بیوقوف بنانا اور مغز چلنا۔ لازم۔ احمق ہو جانا۔

مولف صاحب صفحہ ۱۳۳

کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
رکھ کے بالائے طاق سب تکیں

بالائے طاق۔ یعنی چھوڑ دینا۔ الگ کر دینا۔

معترض — بالائے طاق کے معنے ہیں طاق پر اور بالائے طاق رکھنا کے معنے ہیں چھوڑ دینا اور الگ کر دینا۔

یہ اور اس قسم کی کئی اور غلطیوں کو دیکھکر اندیشہ ہوتا ہے کہ احسن صاحب کے کسی شاگرد نے ان حاشیوں کو لکھکر اپنے استاد کے نام سے چھاپ دیا ہوگا۔ اصل معاملہ خواہ کچھ ہو، لیکن یہ "انتخاب" ترمیم اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اس پر فوری توجہ فرمائیں گے۔ اس انتخاب میں عروض کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر انشاء اللہ کسی فرصت کے موقعہ پر نظر ڈالی جائے گی۔

طنزیات

دل پُر داغ میں اُمید بھی ہے یاس بھی ہے　　باغ میں آم بھی ہے اور املتاس بھی ہے

عارضِ سبز و لبِ سُرخ کا ہے عشق مجھے　　یاں چقندر بھی ہے قسمت میں اناس بھی ہے

رنگ اور روپ پہ مرتی ہے ذرا آنکھ تو کھول　　مغربی پھول میں بلبل کوئی بُو باس بھی ہے؟

میں ہی گردش میں نہیں آپ بھی ہیں لے مہراج　　آسماں کہتے ہیں جس کو یہی آکاس بھی ہے

اُن سے کیا وصل کی درخواست کرے مفلسِ عشق　　دُور ہی سے یہ صدا آتی ہے کچھ پاس بھی ہے

اس زمانے میں مسلمان کی بربادی کے　　اور ساماں ہیں جہاں اُنیں اک افلاس بھی ہے

شعر بے مثل، غزل خوب، قوافی دلچسپ
کچھ ہو احمق مگر اس میں تری بکواس بھی ہے

مداح (احمق) پھپھوندوی

سرشاریاں

آج تو ہر ذرہ اے پیرِ مغاں سرشار ہے
رند کیسے، خود شرابِ ارغواں سرشار ہے

وقت کی رفتار میں پیدا ہیں لاکھوں لغزشیں
رُوحِ ماہ و سال کیا، کون و مکاں سرشار ہے

کیف میں ڈوبے ہوئے ہیں مطربوں کے زیر و بم
نشہ چھایا ہے زمیں پر، آسماں سرشار ہے

پستیٔ و بالائیٔ و مرگ و حیات و ہست و بُود
آج تو انساں کا ہر وہم و گماں سرشار ہے

باغِ عشرت میں نشاطِ مے کشاں ہے غرقِ جام
کُوئے عصمت میں گروہِ قُدسیاں سرشار ہے

جسم سے تا عالمِ ارواح چھایا ہے سرور
داستاں گو ہی نہیں، خود داستاں سرشار ہے

چل رہی ہے آج کچھ اس لوچ سے بادِ مُراد
بحر میں کشتی، ہوا پر بادباں سرشار ہے

ساجد و مسجود میں دشوار ہے آج امتیاز
سر اگر بدست ہے، تو آستاں سرشار ہے

آئینہ کیا، سکندر کو ہے وجد آیا ہوا
اِنس و جاں کیا، خود خدائے اِنس و جاں سرشار ہے

حسن اگر مدہوش ہے تو عشق ہے مدہوش تر
کارواں سے بڑھ کے میرِ کارواں سرشار ہے

پھر لبوں کی گلفروشی سے جواں ہے زندگی
پھر کمر کے لوچ سے عُمرِ رواں سرشار ہے

جوشؔ اے سرخیلِ رنداں، مرحبا صد مرحبا
آج تیرے جام سے ہندوستاں سرشار ہے

جوشؔ

مردِ مضحک (مسلسل)

اسرائیل احمد خاں

(۸) عَلم بردارِ فیشن

آج کل جو زیانہ بہت مکدر و منغص ستی : اس اجمال کی تفصیل یہ ستی۔

لارڈ ڈِلیو ڈ لندن کے فیشن ایبل حلقوں میں اک قولِ فیصل تھا۔ تمام خواص و عوام کی طرف سے اُس پر احترام کی نظریں پڑا کرتی تھیں۔ یہاں ہم اپنے البیلے لارڈ کا اک نو بنو کارنامہ نقل کرتے ہیں جو اُن ایام کی پایۂ تخت کی صحبتوں میں اک افسانۂ بزم و انجمن بنا ہوا تھا! اُس نے یکبارگی اک انقلابی زقند بھری اور اپنے سر کے مصنوعی بالوں کو اُتروا ڈالا! اک مجلسی تہلکہ برپا ہوگیا!

غیر اصلی بالوں کے خلاف عرصے سے اک ردِ عمل کی روح مصروفِ کار تھی۔ مگر اِن مجتہدانہ جیالیوں میں سر کے بالوں سے زیادہ خود سر خطرے میں تھے : تاہم "سرکف" لارڈ نے یہ خطرناک اقدام کر ہی ڈالا اور اک "ہنگامۂ رسوائی" گرم کر لیا : ؎

جہاں ترکِ یک مو بھی ممکن نہیں ہے
وہاں دعوتِ ترکِ سر جیتا ہوں

اک عالمگیر غیظ و غضب کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ جس میں جوزیانہ کی کشیدہ ابرو خشمگینی سب سے زیادہ میٹھی چھری بنی ہوئی تھی ؎

لاکھوں لگاؤ۔ ایک چُرانا نگاہ کا!
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وائیکونٹ ہیرفرڈ، جو انگلستان کا درجۂ اوّل کا امیر تھا، اس وضع جدید کا بانیٔ اوّل تھا۔ مگر اس مقتدر ہستی کو بھی کافی اہانت سے دوچار ہونا پڑا۔ وائیکونٹ موصوف عرفِ عام میں پرنس ڈیورے کے نام سے روشناس تھا چند روز بعد لارڈ ڈیلوڈ اپنا وِگ اتارے ہوئے اُس کے مقلدین کی صفِ اوّل میں ایستادہ نظر آیا۔ اس قسم کی خفیف شوخیاں بھی ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا کرتی ہیں۔ چنانچہ لارڈ ڈیلوڈ کو پرنس ڈیورے سے بھی زیادہ ناملائم سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم وہ اپنی استقامت کے پرچم کو سرنگوں کرنے والا نہ تھا۔ وِگ کے خلاف جہاد کرنے میں وہ اگرچہ مجتہدِ وقت ڈیورے کا خلیفۂ اول تھا۔ لیکن یہاں الفضل للمتقدم کی حقیقت اس کلیے سے منسوخ ہوگئی تھی کہ الفخر للمتاخر۔

اگرچہ اک انقلابی تحریک کا عَلم بلند کرنے کی تقریب سے اُس کو کسی اجتہادِ فکر سے کام نہ لینا پڑا، لیکن اک پُرخطر تقلید جس عزیمت و ہمت کی متقاضی ہوا کرتی ہے۔ اُسے بہم پہنچانا بھی "کارے وارد" کا مضمون تھا! پرنس ڈیورے کے لیے تو کم از کم جدت ہی کا نعم البدل موجود تھا۔ لیکن لارڈ ڈیلوڈ نے اک خالص مصیبت کو دعوت دی تھی۔ جس میں تسکینِ خاطر کا بھی کوئی عنصر نہ تھا! بعد میں ان دو انقلابیوں کے جمود شکن اقدام کے بعد اُن کے بہت سے مقلدین و مریدین پیدا ہوگئے جو اپنے "وِگ" سے فارغ البال ہوگئے، اور جن کے سروں کے لئے یہ چیز وبالِ دوش ہو رہی تھی! ان لوگوں نے اپنے قدرتی بالوں پر قناعت کرنی اختیار کی۔ جن کے رنگ کے تغیر کے لئے اب اک خاص قسم کا خضابی سفوف

رواج پانے لگا!

لارڈ ڈیوڈ نے سر کے بعد پاؤں کی طرف اپنی توجہ منعطف کی! وہ اب گائے کے چمڑے کے بوٹ پہننے لگا۔ اپنی نت نئی جدت طرازیوں کے طفیل میں اُس نے اپنے لئے اک خاص نمود و شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ ہر کلب کا صدر تھا۔ باکسنگ (مکہ بازی) کا کوئی میچ ایسا نہ تھا جس کا "ریفری" (حکم) بننے کی اُس سے فرمائش نہ کی جاتی ہو! متعدد کلبوں کے دستور العمل قواعد و ضوابط اُس کے قلم سے مرتب ہوئے تھے۔

اُن دنوں کئی رمنے قائم تھے۔ از آنجملہ ایک "لیڈی گنی" تھا۔ اس کلب میں طبقۂ امراء کے نوخیز شوقین جمع ہوا کرتے۔ اور پھر وہاں خوب قمار بازی ہوتی! کم از کم شرط پچاس گنی کی لگائی جاتی۔ اور پوری بساطِ قمار بیس ہزار گنی کی مجموعی رقم کا اک تختۂ زرین بن جاتی! ہر کھلاڑی کے پہلو میں اک پائدان سا ہوتا جس پر چلے کا پیالہ رکھا ہوتا۔ اسی محل میں اک زرق برق ظرف اور ہوتا جس میں ہر قمار باز کی گنیاں پڑی ہوتیں۔ گرد و غبار سے اپنے ملبوسِ فاخرہ کی حفاظت، اور برق صفت فانوس سے اپنی آنکھوں کی صیانت کے لئے علی الترتیب دستانے اور پردے استعمال کئے جاتے۔ سروں کے آراستہ و پیراستہ بالوں کا بچاؤ اک گلپوش چھجے دار کلاہ سے کیا جاتا۔ چہرے کے لئے اک قسم کا نقاب بھی مستعمل تھا۔ جو بد قماری کے خمیازے سے پیدا ہونے والی کوفت و بدر دلتی کی پردہ پوشی کا کام انجام دیا کرتا تھا! کھلاڑی اپنے کوٹوں کے دامنوں کو اک خاص نوع کی بے ترتیبی سے رکھتے تھے۔ اور یہ بات اک شگونِ نیک کے طور پر کی جاتی تھی!

لارڈ ڈیوڈ بکثرت دوسرے مجالس و دوائر کا مرکزی پیکر تھا۔ وہ اگرچہ بغایت وجیہہ و شکیل تھا۔ بایں ہمہ یادش بخیر، "اگلی کلب" (مجمعِ زشت رویاں) کے رشتۂ رُکنیت سے بھی منسلک تھا۔ کلب مذکور بد صورتی کی تقدیس کا گویا معبد تھا۔ یہاں کی شمعِ محفل کوئی شعلہ رو حسینہ نہ ہوتی۔ بلکہ اُس کا رونق مسند کوئی پرلے درجے کا بد ہئیت مرد ہوتا! کلب کی عمارت کا دیوان خانہ نہایت کریہہ الصورت اور بغایت قبیح الہیئت تصاویر سے مزین تھا۔ یہ سب مرقعے تاریخ عالم کی شہرۂ آفاق "قبول صورت" شخصیتوں کے تھے۔ جن میں حکیم ایسپ و سقراط اس انجمن "اخوان الصفاء" کے چشم و چراغ تھے! مزید براں اندھوں اور کانوں کا اک ہجوم تھا! تصویروں کو پہلو بہ پہلو یا مقابل یکدگر آویزاں کرنے میں خاص ربط و توازن مرعی رکھا جاتا تھا۔ جب مسز وامی سارٹ (اک زنانہ رُکن کلب) کے چیچک نکلی جس سے اُس کے نظر افروز خط و خال کے سارے نقش و نگار اک "ورقِ سیہ گشتہ" بن کر رہ گئے تو ممبرانِ کلب کی جانب سے بڑی گرمجوشی سے خاتونِ موصوف کو "جامِ صحت" پیش کیا گیا۔

یہ بدیع المثال کلب اُنیسویں صدی کے آغاز تک موجود تھا۔

چارلس دوم کی مراجعتِ تخت و تاج کے بعد تمام انقلابی کلب بند ہو گئے تھے۔ اِن سیاسی رمنوں میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت "کاف ہیڈ کلب" (دائرۂ کاسۂ سرِ گاؤ) تھا! اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ انقلابِ جمہوریت کی خونریزی کے دوران میں جب شاہ چارلس اول کا سر چونگ کیا گیا تو اس یادگار روز واقعے کے موقعے پر اُس کی تقریبِ سعید میں اک گائے کے بچھڑے کی کھوپڑی کے "رطلِ گراں" کے اندر شرابِ ارغوان نوشِ جاں کی گئی! بقول گویا، یہ اک جامِ بیادِ رُخِ سردار کرمویل[1] تھا!

یہ کلب بھی اب بند کر دیا گیا تھا، اور اُس کی جگہ ملوکیت پرست مشرب کے "خرابات" قائم ہو گئے تھے!

ایک عجیب جانِ جدت کلب "ہیل فائر کلب" (حلقۂ اصحابِ نارِ جہنم) تھا! یہاں معصیت کے ربّ النوع کی پرستش کی جاتی تھی! یہ الحاد زندقہ اور فسق و فجور کا آتشکدہ تھا! سب سے بڑے سیہ مست رندِ خراباتی کو "اعزازِ جہنم" کا طغرائے امتیاز پیشکش کیا جاتا تھا!

پھر خیر سے ایک "ٹنگ کلب" (جڈ مار کلب) تھا! ارکان کے اعمال و اشغال کی طرف اُس کے طریق تسمیہ میں اک مجمل کنایہ موجود ہے۔ کبھی سڑک پر چلتا ہوا کوئی حمال، چوڑے چکلے برادوش کا اُنھیں مل جاتا جو صورت سے کچھ احمق اور ہولق سا ہوتا۔ وہ اُسے اس بات پر آمادہ کرتے۔ اور کبھی بزور مجبور کرتے۔ کہ وہ کلب کا ایک برتن اُن سے لے لے، اور اُس کے معاوضے میں اپنے سینے پر اُن کے سر کی چار ضربیں لگا لینے دے۔ اس سرزنش و سینہ کوبی کے کھیل میں وہ باہم شرطیں بھی باندھتے تھے! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خطۂ ویلز کا ایک دیہاتی جو بالکل اک کُندۂ ناتراش وحشی تھا، "جڈ مار کلب" کی اس تفریح کے لئے سینہ سپر ہو گیا! لیکن تیسری ہی ضرب پڑی تھی کہ جاں بحق ہو گیا! معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔

---

[1] بتقابل "یک جام بیادِ رُخِ شاہنشہ قاچار" (صلائے عام برائے نوشانوش جشن جلوس ایرانی تاجدارانِ قاچار)

اس کے سرکاری تفتیش شروع ہوئی۔ مگر جوری نے یہ فیصلہ سُنایا کہ "متوفی قلب کے اندر غیر معمولی اجتماعِ خون کی وجہ سے مرا ہے۔ اور قلب کی یہ پُرخونی غیر معتدل شراب خوری سے پیدا ہوئی!" ـــــ بلاشبہ یہ شخص شراب ہی کا شکار تھا۔ لیکن یہ شراب وہ تھی جو اک حمّال کے سینے کے خُم میں اِن بدمستانِ بادۂ شرارت و امارت نے پی تھی۔

اک "فن کلب" تھا! اِس لفظ کے مصداقات میں تفنن، تفریح، ضیافتِ طبع وغیرہ سب ہی داخل ہیں، لیکن اُس کی صحیح تعبیر اور حقیقی ترجمانی ذرا مشکل ہے! "فن" مزاح کے نسخے میں وہی عنصر رکھتا ہے جو فلفل سیاہ، نمکِ سفید میں! کسی مکان میں دیوانہ وار گھس جانا اور اک قیمتی آئینے کو طفلانہ شرارت سے توڑ دینا، محل کے نگار خانے کو تہ و بالا کر ڈالنا، گھر کے کتے کو زہر کھلا دینا، اور "بی بلی" کو روشندان کے اندر "بالائے طاق" کر دینا، یہ تفنن کے مظاہر کا مشتے نمونہ از خروارے ہے! ...... کسی مُہلک حادثے کی جھوٹی خبر اُڑا دینا اور وارثانِ متعلقہ کو تھوڑی دیر کے لئے صفِ ماتم پر بٹھا دینا، تفنن کی جان تھا! یہ بھی تفنن کی اک جدت نواز نوع سمجھی جاتی تھی کہ سرِراہ کسی مکان کی دیوار میں مُربع شکل کا ایک رَوزَن کاٹ دیا جائے۔ البتہ الجمال زہرہ کے مجسمے کو توڑ ڈالنا تفنن کا بڑا "صف شکن معرکہ" تسلیم کیا جاتا تھا!

جیمس ثانی کے "عہد معدلت مہد" میں ایک دفعہ اک نوجوان کروڑپتی لارڈ نے ایک بھولس کی جھونپڑی میں رات کے وقت آگ لگا دی! جھونپڑی کے سوختہ بخت ساکنین کے ہاں اک شورِ نشور برپا تھا۔ لیکن سارا لندن قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ تفنن کی اِس تازہ بتازہ نو بنو اختراعِ فائقہ کے صلے میں لارڈ ممدوح کو "شاہِ تفنن" کا خطاب دیا گیا! ع

خون میریزند و خون بہا میخواہند!

"فن کلب" کے ممبر جو سب کے سب زمرۂ امرار میں سے ہوتے تھے، اپنی جنون سامانی کے دورے کے وقت دفعتہ رات میں اپنے محلات سے نکل کھڑے ہوتے۔ کواڑوں کی کنڈیاں، کھٹکھٹا ڈالتے۔ پمپوں کے نل کاٹ دیتے جس کی وجہ سے مکاناتِ مسکونہ کے حوض "طوفانِ نوح کے تنور" بنجاتے! وہ خیابانِ باغ کو کھود ڈالتے، سڑکوں کی لالٹینوں کو گل کر دیتے، عمارتوں کے چوبین ستونوں کو آرے سے کاٹ ڈالتے۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیتے وغیرہ وغیرہ! اور اُن کی اس تاخ و تاراج کے آماجگاہ عموماً غربا کے محلے ہوتے! اہلِ ثروت و اقتدار اپنی ان نفسِ امن کی حرکات میں قانون کی ہر گرفت و پُرسش سے بالاتر تھے۔

اِن ستم ظریفیوں کی "باقیاتِ صالحات" ابھی بالکلیہ مفقود نہیں ہوئی ہیں۔ انگلستان اور انگریزی نوآبادیات کے اکثر حصوں میں اس قسم کی وارداتیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں کہ رات کی ساعات میں کسی عمارت کو کوئی نقصان پہنچا دیا گیا۔ یا کسی چار دیواری کو منہدم کر دیا گیا۔ یا کسی خار دار احاطے کو درہم برہم کر دیا گیا۔ یا کسی دروازے کی کنڈی مروڑ کر غتر بود کر دی گئی! اگر یہ نالائقیاں اور برہم زنیاں کوئی غریب آدمی کرتا تو فوراً کیفرِ کردار کو پہنچا دیا جاتا۔ لیکن یہ باتیں چونکہ شگفتہ طبع نوجوان اُمرار کی خوش فعلیاں تھیں پس اُن کی داد دی جاتی تھی!

ع واہ واہ از دستِ دولت واہ واہ

سب سے زیادہ فیشن ایبل کلب کا صدر نشین خیر سے بنفس نفیس بادشاہ سلامت ہوتا۔ جو اپنی ناصیۂ جمال پر بخطِ جلی اک "ہلال" آویزاں رکھا کرتا! اس کلب کا نام "موہاک کلب" تھا! موہاک کلب، فن کلب پر بھی بازی لے گیا تھا! "شرارت کی خاطر شرارت" اس مجمع عالی کا مقولہ تھا! اس کا اک اہم بالشان نصب العین ضرر رسانی تھا! اِس فریضۂ عظیمہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر قسم کے ذرائع جائز تھے۔ کلب مذکور میں، بوقتِ داخلہ، حلفِ وفاداری بایں الفاظ لیا جاتا تھا کہ "حسب توفیق ہر ممکن طریقے سے موذی بنوں گا!" نقصان رسانی و ایذا دہی میں کسی وقت کسی موقع، اور کسی شخص کی کوئی تمیز نہ تھی، اور علی الاطلاق یہ فرضِ عین انجام دیا جاتا تھا! موہاک کلب کے ہر رکن کو کسی نہ کسی فن میں کمال حاصل کرنا لازمی تھا۔ اس ادارے میں ایک صاحب بمنصبِ "استادِ رقص" کہلاتا تھا! اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ وہ موقع ملنے پر راہ چلتے دیہاتی لوگوں کو گھیر لیتا، اُن کی ٹانگوں میں اپنی تلوار کی نوک سے پے در پے کچوکے لگا دیتا، جس سے وہ غریب بے طرح ناچ ناچنے لگتے! بعض دوسرے ارکان کی یہ تفریح تھی کہ کسی اجنبی ستم زدہ کو پکڑ لیتے اور اُس کے گرداگرد اک تنگ حلقہ باندھ لیتے۔ محاصرے کی اس جیتیش میں وہ بیچارہ مجبور ہوتا کہ اِن شرفار و عمائدین میں سے کسی نہ کسی کی طرف اپنی پشت کر کے کھڑا ہو جائے۔ مگر اس بے ادبی کی فوراً سزا دی جاتی اور پیچھے کھڑے ہوئے کوئی چشم و چراغِ امارت اپنے خنجر سے اُس کی پیٹھ میں اک تیز چرکا لگاتے! وہ تڑپ کر مڑتا، لیکن اب بھی لازماً کوئی نہ کوئی "مردِ شریف" اُس کے عقب میں آ جاتا جو معاً اپنا وار کر کے اپنی اہانت کی سزا دیتا۔ وعلیٰ ہذا القیاس، وہ نرغے میں آیا ہوا مصیبت زدہ اک مسلسل گردش میں ہوتا اور اُس کی پشت خنجروں کے پیہم و غیر منقطم پیکانوں سے چھلنی ہو جاتی! غریب

خون میں چور ننگ اور عرق میں غرق ہو جاتا اور بہزار خرابی اپنی جان لے کر بھاگتا! اُس بیچارے کی پیٹھ پارہ پارہ ہو جاتی، اور ان شیاطین کے پیٹوں میں بل پڑجاتے!

اک اور کھیل کھیلا جاتا تھا، جو کلب کی لغاتِ رموز کی اصطلاح میں "شیر کا شکار" کہلاتا تھا! اس کی صورت یہ تھی کہ کسی غریب الوطن مسافر کو پہلے بڑی خندہ پیشانی و تپاک سے سلام و خطاب کرکے یہ اشرار روک لیتے اور پھر دفعتہً اُن میں سے کوئی ایک اُس کی ناک پر اک پُر زور ٹکہ مار کر اُسے توڑ دیتا، ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں اُس کی دونوں آنکھوں میں بھونک دیتا! اگر اس دل لگی میں اُس برگشتہ قسمت کی آنکھیں پھوٹ جاتیں تو چشم بد دور کچھ معاوضہ دیدیا جاتا، اور یہ کافی اشک شوئی سمجھی جاتی! ع

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است!

الغرض، اٹھارویں صدی کے اوائل میں لندن کے بنکروں کے یہی مشاغل تھے۔

اہلِ پیرس کا آئینِ تفریح و تفنن بھی کم و بیش اسی اساسِ زندہ دلی یا سنگدلی پر قائم تھا! چنانچہ فرانس کی اس "عروس البلاد" کے اک البیلے رئیس نے محض تفننِ طبع کے پیرایہ میں اک ناکردہ گناہ باشندۂ شہر کو کھڑے کھڑے گولی کا نشانہ بنا دیا، اگرچہ یہ مظلوم و معصوم اس وقت صرف اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اُس کا طرفہ قصور یہ تھا کہ "کیوں وہ اس وضعِ قیام میں استادہ تھا کہ اک صاحبِ ذوق اور حساس شکاری کے داعیۂ تفنگ انگنی کے لئے اس اشتیاق انگیز ہیئت کو نظر انداز کر دینا ناممکن ہوا؟"

امارت و شباب کو بہر کیف اپنے لئے سامانِ دلبستگی چاہیئے!

(۹)

مگر لارڈ ڈیوڈ نے اپنی مخصوص عالی منشی اور سیر چشمی کے تقاضے سے ان جملہ تفریحات کے اندر اک انسانیت نواز روح پھونک دی تھی: اپنے ذوقِ تفنن میں وہ بھی دوسرے اُمرا کی طرح بڑی بے تکلفی سے اک چھپر میں آگ لگا دیا کرتا تھا، اور بہت سے موقعوں پر اُس خس پوش مکان کے مسکین مکین جھلس کر بھی رہ جاتے تھے، مگر پھر وہ ان تمام نقصان رسانیوں کا بیش قرار ہرجانہ دلاتا، اور چھپر کی جگہ پکا مکان بنوا دیتا! ایک مرتبہ اک خاتون اُس کے شغلِ شوخی کے سلسلے میں معرضِ توہین میں آگئی، لیکن اک گرانقدر رقم ادا کرکے اُس نے نسوانیت کے ان برہم جذبات کے لئے اک مرہم بہم پہنچا دیا۔ اک اور لیڈی بھی اسی حادثۂ نا ملائم کی زد میں آئی جس کی اشک شوئی لارڈ ڈیوڈ نے اس طرح کی کہ اس کے شوہر کو اپنے اک ماتحت محکمے میں اک ممتاز عہدے پر سرفراز کر دیا! الغرض ؎

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست!

مُرغ بازی کے فن میں لارڈ ڈیوڈ نے بعض قابلِ داد جدتیں کی تھیں جس طرح وہ اک مُرغ کو اکھاڑے کے لئے ساختہ پرداختہ کیا کرتا تھا، وہ اک قابلِ مطالعہ عمل تربیت ہوتا تھا۔ یہ مُرغ لڑنے میں ایک دوسرے کے پروں پر گرفت کیا کرتے تھے، اس لئے لڑائی کے مُرغوں کے پر و بال اُن کی جان کا وبال بن گئے تھے! مگر کھلاڑی لارڈ اپنے مُرغ کو بالکل "پر قینچ" کر دیتا! اور کہا کرتا کہ "اُسے میری مقراض نے اب دشمن کی منقار سے محفوظ کر دیا!" پھر وہ مُرغ کے بازوں کے "سیخ پروں" کو بالکل ننگا کر دیتا، اُن کے سروں کو نوک دار بنا دیتا، اور کہتا کہ "یہ حربے حریف کی آنکھوں کی تواضع کے لئے ہیں!" اب وہ مُرغ کے پاؤں کے ناخنوں کو چھیل کر اُنھیں خاردار کر دیتا، اور پھر اُن پر فولاد کے خول چڑھا دیتا!" پالی" سے عین پہلے وہ مُرغ کے سر اور گردن پر اچھی طرح لُعابِ دہن لگا دیتا، جیسے کہ پہلوانوں کے بدن پر "مالش" کی جاتی ہے! اس تراش خراش کے بعد، اور ان گوناگوں طریقوں سے مسلح و مرتب کرکے جب وہ اپنے مرغ کو اکھاڑے میں اُتارتا تو فخریہ کہتا کہ "یہ ہیں وہ گُر جنسے مرغی گھر کا اک مُرغا کوہستان کا اک عقاب بن جاتا ہے!"

لارڈ ڈیوڈ لہو و لعب کے تمام انعامی مقابلوں کے موقعوں پر بذاتِ خاص موجود ہوتا، اور ان اجتماعوں کی جان ہوتا۔ وہ کھیل کے میدان کے مختلف حلقوں کی نشاندہی اور نقشہ بندی کرتا اور ملاعب کی جملہ جزئیات کا اہتمام و انصرام کرتا۔ رسّا کشی کے میچوں میں وہ کھلاڑیوں کی طرح طرح سے حوصلہ افزائی مشورہ دہی، اور چارہ سازی کیا کرتا! اُن کے خونچکاں ہاتھوں کو اسفنج سے پونچھتا، بوتل میں پانی لیکر اور اُسے اپنے مُنہ میں بھر کر ہمت شکستہ کھلاڑیوں پر "پھُریری" دیتا، اور اُنھیں تازہ دم مُقاوِم بناتا! جب کھیل میں وہ ثالث (امپائر) ہوتا تو ثالث بالخیر" ہونے کا حق ادا کر دیتا، کسی کو لڑنے بھڑنے نہ دیتا، ناجائز ہتھکنڈوں سے ایک دوسرے کی امداد نہ کرنے دیتا، آپس میں ٹکر نہ مارنے دیتا۔ کسی کھلاڑی کے گر جانے پر اُسے پامال ہو جانے سے بچاتا، اور کھیل کے لائحۂ عمل کے آغاز و اختتام میں ایک لمحے کی بھی تقدیم یا تاخیر کو گوارا نہ کرتا! لہو و لعب کے نظم و نسق کے فلسفے میں

باایں ہمہ فضیلت وعبور جزئیات وہ کسی مبصرانہ نمائش اور عالمانہ مشیخت سے کام نہ لیتا! ان تمام عامیانہ حرکات سے کامل احتراز کرتے ہوئے وہ ایسا انداز قائم رکھتا جو تکلف و تصنع سے یکسر پاک ہوتا تھا۔

کھیل کے میدان میں جب اپنی مخصوص شانِ بے تکلفی و ادائے سادگی کے ساتھ جب لارڈ ڈیوڈ حَکَم کے فرائض انجام دیتا ہوتا تو اُس وقت کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ اُس کے حلقۂ فرمان فرمائی میں قدم رکھے، یا اُس کے احکام میں دخل در معقولات کرکے اپنے کسی دوست دار کھلاڑی کی طرفداری کرسکے۔ لارڈ موصوف کا شمار کھیل کے اُن معدودے چند ثالثوں میں تھا جن کے بے لاگ انصاف کی ساکھ اور بے داغ ضابطہ کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی!

لارڈ ڈیوڈ اک بے نظیر اُستادِ ورزش بھی تھا۔ جس جوان کی تربیت کا وہ بیڑا اُٹھا لیتا اُس کا جیتنا یقینی تھا۔ وہ اک تنومند نوجوان کو "ورزشی رستم" بنانے کے لئے منتخب کرتا۔ اور چند روز کے اندر اُس کو اک سنگی چٹان کی طرح قوی الجثہ اور اک بُرج کی طرح طویل القامت پیکر میں تبدیل کر دیتا! لارڈ ڈیوڈ ہی نے فنِ ورزش کے وہ مشہور اُصول وضع کئے تھے جن کا نقشِ ثانی ہمارے سے منقول ہے! اہلِ ورزش کے لئے اُس نے مختلف غذائیں اور دوائیں تجویز کی تھیں، جن کا استعمال شب و روز کے مقررہ اوقات و ساعات میں بڑی پابندی کے ساتھ مشروط تھا! بعض مالش کے روغن بھی معمول تھے۔ وہ اپنے شاگردوں اور پٹھوں کی تیاری کے زمانے میں اُن کے اخلاق کی حفاظت کا بھی التزام رکھتا تھا اور اُنھیں کوچہ و بازار میں نظر بازی اور دیہات و مضافات میں آوارہ گردی نہ کرنے دیتا تھا؛ اول الذکر مقامات میں تیز رفتار گاڑیوں اور شتر بے مہار گھوڑوں کے حادثات بھی درپیش رہتے تھے، اور بدمست شرابیوں اور "فتنہ گرِ شہر" لڑکیوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا! لارڈ ڈیوڈ کی اس مادرانہ نگرانی اور مشائخانہ مطالبۂ ضبطِ نفس نے اُس کی تعلیم و تربیت کو اک نادر معیارِ تکمیل تک پہنچا دیا تھا!

الغرض اک کامل و اکمل، شائستہ و شستہ "مردِ شریف" بننے کے لئے بڑے بڑے "ہفت خوان" طے کرنے پڑتے ہیں! ع

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست!

لارڈ ڈیوڈ عام نمائشوں، وحشی جانوروں کے سرکسوں، اشتہار باز دوا فروشوں کی داستان سرائیوں، شعبدہ باز تماشا گروں کی نظر بندیوں اور کرشمہ نمائیوں، پیشہ ور مسخروں کی فرحت فروشیوں، اور عام میلوں ٹھیلوں کے ہنگاموں سب کا بڑا شائق تھا! اِس مذاق کی مہمیز زنی اُس سے لندن کی سرائیوں، بندرگاہوں، اور ساری پبلک جگہوں اور عام گزرگاہوں کا گشت کراتی! ان بازاری مقامات میں سیر و گردش کرتے ہوئے وہ صرف معمولی ملاحوں کا اک جیکٹ پہنا کرتا تھا! اگرچہ معلوم ہے کہ وہ "جیشِ ابیض" میں اک نہایت ممتاز منصب پر فائز تھا! اِس خاص بھیس کے اختیار کرنے میں اُسے خاص آسانی اس وجہ سے تھی کہ اُس کے سر سے امیرانہ مصنوعی بال غائب تھے! لوئی چہاردہم کے عہد تک امرا کے لئے یہ "بال" وہی اہمیت رکھتے تھے جو شیر کے لئے "ایال" لیکن اپنے "وِگ" سے فارغ البال ہو جانے کے بعد لارڈ ڈیوڈ کو ہر قسم کی آزادیٔ عمل حاصل تھی۔ عوام کالانعام جو عام راستوں پر اُسے ملتے اضطراراً اُسے تعظیم پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اک امیرِ کبیر سے ہم کلام و سلام ہوا کرتے ہیں۔ اِن لوگوں نے اس شہر گرد ہستی کا اک عامیانہ نام رکھ لیا تھا، یعنی "ٹام جم جیک"! یہ نامِ نامی لارڈ ممدوح کا بڑا مقبول تھا۔ اور عوام الناس کے تمام حلقوں میں وہ اسی ہر دلعزیز تسمیہ سے معروف تھا!

الغرض وہ گوناگوں اور بوقلموں صفات و کمالات کا آدمی تھا اُس کی شخصیت کی یہی جامع حیثیات شان اُس کی منظورِ نظر لیڈی جوزیانہ کی نظروں میں بڑی قابلِ قدر چیز تھی ع

میں خوش ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں!

مُلّا کی خدماتِ جلیلہ

محلے میں مرے اک پارسائے رندمشرب تھے
سُنا تھا جن کو گمراہانِ ملت کا خضر میں نے

کبھی سورج نہ چھپتا تھا مُریدی کی قلمرو میں
یہ دیکھا آپ کا اطرافِ عالم میں اثر میں نے

ریاست تھی، نہ صنعت تھی، نہ کاروبار کرتے تھے
مگر جلسوں میں دیکھا آپ کو باکرّو فر میں نے

مرے ہمسائے تھے، دن رات میں سو بار ملتے تھے
مگر ہر بار دیکھا تھا بہ ملبوسِ دِگر میں نے

مُریدوں کی جوانی آپ کی پیری سے نادم تھی
سدا دیکھی تلاشِ گُشتہ جاتِ سیم و زر میں نے

سُنا ہے اور کیفیت تھی خلوت کی، مگر ان کو
خُدا کے خوف سے جلوت میں دیکھا نوحہ گر میں نے

زمانہ تو سدا یکساں کسی کا بھی نہیں رہتا
اِنھیں حضرت کو دیکھا پھر بہ اندازِ دگر میں نے

نہ وہ اسراف باقی تھا، نہ وہ جلسوں کی شرکت تھی
تفکّر میں اُنھیں پایا پئے تحصیلِ زر میں نے

وہ اک درخواست انگریزی میں لکھوانے کو لائے تھے
طویل اتنی کہ دو دن تک کھپایا اُس میں سَر میں نے

کیا تھا عرض اُس میں آپ نے صوبے کے افسر سے
وفاداری میں ساری عُمر کر دی ہے بسر میں نے

اِدھر نقشہ بنا کوئی اُدھر میں نے بگاڑا ہے
اِدھر جلسہ ہوا کوئی اُدھر دی ہے خبر میں نے

ہوئی گر مجتمع قوت تو ڈالا تفرقہ فوراً
نزاعی مسئلے کی بحث کوئی چھیڑ کر میں نے

مسلمانوں کو یوں مصروف کر کے خانہ جنگی میں
دلِ حاکم کو رکھا اس طرف سے بے خطر میں نے

اِنھیں جب غیرتِ دیں نے اُبھارا سر فروشی پر
تو کھینچا نقشۂ محرومیٔ فتح و ظفر میں نے

یہ ہجرت کے سفر کی کلفتوں سے لطف لیتے تھے
بنایا ہے انھیں گرویدۂ عیشِ حضر میں نے

یہ طبعِ امن و عافیت کو نامردی سمجھتے تھے
بنایا ہے انھیں بیگانۂ تیغ و سپر میں نے

جہادِ سیف اصولِ دیں میں تھا میں نے کیا خارج
مجاہد اور مفتی کو بنایا بے ضرر میں نے

جہاد اک شے تھی جس سے افسروں کو رات بھر دیکھا
شبستاں میں لرزتے صورتِ نجمِ سحر میں نے

نزاعِ حق و باطل میں دلِ مردانِ غازی کو
وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ سے رکھا پُر حذر میں نے

کرے تیغ کھلوائی سدا لَا تُفْسِدُوْا کہہ کر
کبھی بھی جَاہِدُوْا کہہ کر نہ بندھوائی کمر میں نے

سکھا کر مصلحت اندیشیاں مردِ مجاہد کو
بدل کر رکھدی روباہی سے خوئے شیر نر میں نے

اُولِی الْاَمْرِ اور مِنْکُمْ کا تعلق منقطع کر کے
اَطِیْعُوا اللہ کے پردے میں جھکوائے ہیں سر میں نے

اگر احرار نے مل کر جماعت کوئی قائم کی
تو نصب العین کو اُس کے کیا ثابت لچر میں نے

وہ اِس پر بھی رہی زندہ تو پھر حکام کے آگے
بنا ڈالا اُسے مخدوش سے مخدوش تر میں نے

خوشامد پیشہ اخبار و رسائل کی حمایت کی
عوام الناس کا ان کو بنایا راہبر میں نے

کیا ایرانی و ترک و عرب کو میں نے خود رسوا
اسی سے "پان اسلامزم" کا کھیلا ہے سر میں نے

امان اللہ خاں کے تیوروں کو پہلے میں سمجھا
پڑھے تھے اُس کی سلطانی میں آثارِ خطر میں نے

اُبھارا میں نے افغانوں کی غیرت کو خلاف اُس کے
پھرایا تاج چھنوا کر اُسے پھر دربدر میں نے

ثریا کی وہ تصویریں، جو فرضی تھیں مہیا کیں
کئے تشہیر کو اطرافِ عالم میں سفر میں نے

حکومت کو مزا آیا ہے شعلوں کی بلندی پر
مسلمانوں کے خرمن میں پھیلائے شرر میں نے

وظیفہ مجکو اِن خدمات کا ماہانہ ملتا تھا
سہارے سے اسی کے زندگی کی ہے بسر میں نے

وظیفہ بند ہے میرا مگر اب ایک مدت سے
خدا ہی جانتا ہے جس طرح کی ہے گزر میں نے

ملی ہے جس مری تقریر پہ اتنی سزا مجھ کو
دکھایا تھا اسی میں خیر خواہی کا ہنر میں نے

مسلمانوں کو شک ہونے لگا میرے رویے پر
تو حریت نوازی ہی میں دیکھا تھا مفر میں نے

حصولِ اعتمادِ رفتہ کی تھی اک یہی صورت
حکومت کی مذمت ہی کو پایا کارگر میں نے

مری تقریر جس نے نقل کی تھی وہ یہ کیا جانے
مفادِ حکمراں پر کیسے رکھی تھی نظر میں نے

مریضِ دردِ قومی کو جو دی تھی زہر کی گولی
تدبر سے کیا تھا اُس کو ملبوسِ شکر میں نے

بنا پر ان کی میں اُمید کرتا ہوں بحالی کی
بیاں کی ہیں جو کچھ خدمات اپنی مختصر میں نے

ضرورت ہو تو میں اُس حلف کی تجدید بھی کردوں
تقرر پر اُٹھایا تھا جو اس سے پیشتر میں نے

غیور احمد رزمی صدیقی

آثارِ حاضرہ

شورشِ کائنات ہے خاموش — موت ہے زندگی کے دوش بدوش

صدقے صد کائناتِ مستی و ہوش — کچھ تو لے چین اے دلِ غم کوش

رسن و دار لرزہ براندام — ذرّہ ذرّہ ہے جبر در آغوش

اور عالم ہے دل دُکھوں کا ترے — اب وہ زعمِ جنوں نہ شورشِ ہوش

حسنِ صبحِ ازل کا اک پرتو — عاشقی سر بسر قیامت کوش

کیا یہ ہر سمت شورِ بے ہنگام — زندگی خود ہے اک پیامِ خموش

آپ ہی آپ اُبلی پڑتی ہے — زندگی ہے کہ بادۂ سرجوش

دن کے ہنگامے شورشِ پنہاں — رات کی خامشی پیامِ سروش

عشق کی خود نمائیاں ۔ جن کی — خود ہے برقِ جمال پردہ پوش

تجھ سے اے رسم و راہِ نظمِ کہن — زندگی ہو چلی ہے کیوں روپوش

اب تو وہ سوز و ساز بھی نہ رہا — بزم برخاست ۔ شمعِ بزم خموش

جلوۂ مہرِ انقلاب نہ پوچھ — اُڑ گئے ظلمتِ حیات کے ہوش

رنگِ رفتارِ دہر دیکھ فراق
آج فردائے آخرت بھی ہے دوش

فراق گورکھپوری

ایک جھلک

وجاہت علی سندیلوی بی اے

منظر ۔ ایک بڑی میز کے گرد ایک پنڈت ایک مولوی ۔ ایک پادری ، اور ایک بدھ مہنت اپنے اپنے مذہبی لباس میں بیٹھے ہیں ۔ اُن کے سامنے بڑی بڑی موٹی کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے ۔

مولوی ۔ دیکھو ہمارا ہی مذہب ہے جس نے دنیا کو سب سے پہلے مساوات اور جمہوریت کا سبق ۔

پادری ۔ لیکن ہاں یہ تمہارا ہی مذہب ہے جس نے سب سے زیادہ خلق خدا کا خون بہایا ۔

مولوی ۔ تم اپنے آپس کی خانہ جنگیاں بھول گئے ۔ ہم نے محض مدافعت کے لئے تلوار اُٹھائی ، اور اگر ہم تلوار نہ اُٹھاتے تو آج دنیا میں توحید بھی نہ ہوتی ۔

مہنت ۔ لیکن تمہاری توحید سے دنیا کو فائدہ ہی کیا ؟

پادری ۔ خیر جو کارنامے ہم نے محض اچھی مثال اور نیک صلاح سے کئے ہیں وہ تمہاری تلوار کی قطع و برید کبھی نہیں کر سکی ۔

پنڈت ۔ بجا ارشاد ۔ مذہب کے نام پر جتنا تم نے لوگوں کو پریشان کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو ۔ تمہارا مذہب تو محض تمہاری ملوکیت کا پروپیگنڈا ہے ۔ مذہب کے پرچار میں جو کام ہم نے کیا ہے ....

مہنت بس بس آپ تکلیف نہ کیجئے ۔ مذہب کا ڈھونگ رچا کر تم نے اپنے ہی مذہب والوں پر وہ وہ ظلم توڑے ہیں کہ تو بہ بھلی ....

ہندو ۔ قطع کلام معاف ، سوپ تو سوپ چھلنی کیا بولے جس میں بہتر چھید ۔

مہنت ۔ جی ہاں ۔ بس عیسائیوں نے جو چودھویں صدی میں کیا وہ تم اب بھی کر رہے ہو ۔

پادری ۔ غلط بالکل غلط ۔

مولوی ۔ بالکل ٹھیک کہتا ہے ۔

پادری ۔ اپنی آنکھ کا شہتیر تو دیکھو تم ! تم لوگوں کو خبر بھی ہے ۔

مولوی ۔ سب خبر ہے ، آپس میں تم لوگوں نے ایک دوسرے کو زندہ جلا ڈالا ۔

پادری ۔ اور تم نے اپنے آپس میں لڑ لڑ کر کیا نہیں کیا ؟

مولوی ۔ چپ رہئے آپ مجھے کہنے دیجئے ۔

مہنت ۔ میں کہہ رہا تھا ۔

پنڈت ۔ جھوٹ کہہ رہے تھے تم ۔

پادری ۔ یہ سب فضول کی بات چیت ہے ۔

مولوی ۔ خاموش رہئے آپ !

(ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے)

ملازم آ کر اطلاع دیتا ہے ۔ کھانا تیار ہے ۔

(سب خاموش ہو جاتے ہیں)

پادری ۔ ہاں تو لے آؤ ۔ دیکھو گوشت خوب بھُن گیا ۔

پنڈت ۔ رام رام میں تمہارے ساتھ نہیں کھا سکتا ۔ دیکھو میرا کھانا بالکل الگ آئے ۔

مہنت۔ اور وہ پانی چھان لیا تم نے۔
مولوی۔ دیکھو خوک لیئم سے میری پلیٹ چھو بھی نہ جائے۔

(پردہ)

منظر ۲

سب الگ الگ بیٹھ کر ایک دوسرے کی طرف سے پیٹھ کرکے جلدی جلدی بڑے بڑے نوالے کھا رہے ہیں۔

ملازم آکر اطلاع کرتا ہے۔ دو بھوکے فقیر دروازے پر شور مچا رہے ہیں۔
سب جلدی سے اپنے ہاتھ کے نوالے منہ میں رکھ لیتے ہیں۔
تھوڑی دیر تک سب ایک دوسرے کی طرف تکنے لگتے ہیں۔

پادری۔ کچھ ہے نہیں ہمارے پاس۔
ملازم۔ بس تھوڑا سا گوشت ہے۔
پنڈت۔ (گھبرا کر) کس چیز کا؟
مولوی۔ (گھبرا کر) کس چیز کا؟ سور کا؟
مہنت۔ وہ ہیں کون مذہب؟

ملازم جاتا ہے اور لوٹ کر جواب دیتا ہے۔

ملازم۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ مذہب کس کو کہتے ہیں۔
مولوی۔ دیکھو سور کا گوشت مت دینا۔
ہندو۔ دیکھو انھیں نشٹھ نہ کرنا۔
ملازم۔ تو بھگا دوں اُنھیں؟

سب خاموش ہو جاتے ہیں

(پردہ)

منظر ۳

سب پھر میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ ملازم آکر کہتا ہے۔

ملازم۔ وہ بھوکے بیٹھے ہیں۔
مولوی۔ بلا لاؤ۔
پادری۔ ہاں ہاں لے آؤ۔
پنڈت۔ کیا ہو گا اُنھیں بلا کر۔
مہنت۔ آنے تو دیجئے۔

دو ضعیف بڈھے چیتھڑوں میں کانپتے ہوئے...... داخل ہوتے ہیں۔

مولوی۔ تم کون مذہب ہو۔
پہلا بڈھا۔ مذہب؟
پنڈت۔ تمہارا دھرم کیا ہے۔ ہندو، مسلمان۔
دوسرا بڈھا۔ ہم لوگ بہت بھوکے ہیں۔ ہمارا دھرم کیا۔
پادری۔ تم لوگ ایمان کے بھوکے ہو۔ تم کو یہ نہیں معلوم کہ تم کو کس نے پیدا کیا۔ اور تم کو کون نجات دے گا۔
مولوی۔ تم نے کبھی اپنے خالق کے سامنے سر نہیں جھکایا؟
پنڈت۔ تم کو ذرا بھی اپنے دھرم کا خیال نہیں؟

(دونوں بڈھے حیران رہ جاتے ہیں)

دوسرا بڈھا۔ ہم بہت بھوکے ہیں۔ کل سویرے سے روٹی نہیں کھائی۔
مہنت۔ تمہاری آتما بھوکی ہے۔
مولوی۔ جلدی اپنے معبود کے سامنے سر جھکاؤ۔
پہلا بڈھا۔ معبود۔ معبود کیا؟
پنڈت اور پادری ساتھ ساتھ۔ خدا۔ پرمیشر

(بڈھے ہکا بکا رہ جاتے ہیں)

مولوی۔ تم خدا کو نہیں جانتے؟
پنڈت۔ پرمیشر کو نہیں پہچانتے؟
پہلا بڈھا۔ میں نے صرف نام سنا ہے؛
پادری۔ تو کیا تم خدا کو دیکھتے۔
پہلا فقیر۔ ہاں۔ خدا ہے کیا؟
مولوی۔ جس نے تمہیں یہ سب نعمتیں دیں۔
دوسرا بڈھا۔ کون؟

(مولوی خاموش ہو جاتا ہے)

پادری۔ تمہیں پیدا کیا۔ تم کو......

(فقیروں کی حالت دیکھکر وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

دوسرا بڈھا۔ سردی سے ہم ٹھٹھرے جاتے ہیں۔ ہمیں روٹی دیجئے۔ خدا کے نام پر۔

مولوی۔ تم مسلمان ہو جاؤ۔

پادری۔ تم عیسائی ہو جاؤ۔

دونوں بڈھے۔ روٹی کون دے گا؟

(مولوی اور پادری ایک دوسرے کا منھ تکنے لگتے ہیں)

مولوی۔ خدا۔

دوسرا بڈھا۔ خدا کہاں ہے؟ ہمیں روٹی دے۔

مہنت۔ روٹی تو ختم ہو گئی۔

(دونوں بڈھے بڑ بڑاتے چلے جاتے ہیں)

مولوی۔ جل جلالہٗ۔ خدا کا شکر ہے آج ایک وقت کی بھی نماز قضا نہیں ہوئی۔ نماز پڑھکر کیسی طبیعت خوش ہوتی ہے۔

پادری۔ اے خدا ہمیں ہماری روزانہ کی روٹی دے۔ خدا سے دعا مانگ کر کیسا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

پنڈت۔ بس رے رام۔ اس سردی میں بھی میں اشنان کر آیا۔ دل صاف ہو گیا۔

(پردہ)

منظر ۴ ایک تاریک گلی

دونوں بڈھے فقیر اندھیرے میں بڑ بڑاتے چلے جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک تیسرا فقیر ملتا ہے۔

تیسرا فقیر۔ کچھ ملا۔

دونوں فقیر۔ کچھ نہیں!

تیسرا فقیر۔ لو (ایک ایک روٹی دیتا ہے)

دونوں فقیر۔ کہاں مل گئی؟

تیسرا فقیر۔ وہی کلّو نانبائی۔ آج جوئے میں جیت گیا۔ اس نے مجھے چھ روٹیاں دیں۔ تم کہاں تھے؟

دونوں فقیر۔ اسی طرف تھے۔ ایک جگہ ملنے کی امید تھی، وہیں بیٹھے رہے۔

تیسرا فقیر۔ پھر کیا جواب ملا؟

دونوں فقیر۔ مذہب۔ خدا۔ پرمیشر۔ بھگوان۔

تیسرا فقیر۔ اُونچی دوکان، پھیکا پکوان۔

(تینوں فقیر بڑی زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)

(پردہ)

قدموں پہ میرے عرش معلّی بھی جا پڑی
خورشید کی انجمن میں ذرہ بھی جا پڑی
[illegible] جب سے لیے
حوریں پہ حاضر ہوئی [illegible] بھی جا پڑی
اچھا حاضر [illegible] تقوی کا بھی جا پڑی

(جگر)

سجدے سے افلاک کو جھکا دیتا ہوں میں
سجدے [illegible] کھینچتا ہوں میں
[illegible] آ جاتا ہے
جب وقت [illegible] ہاتھ میں آ جاتا ہے
نبض زمین [illegible] دیکھ لیتا ہوں میں

(جگر)

منشی پریم چند کے مختصر افسانے

سید محمود مورخ بی اے

قوموں کے عروج و زوال اور تہذیب و تمدن کی تاریخ ان کے افسانوی ادب کے مطالعے سے مرتب کی جاسکتی ہے۔ ہر قوم اور ہر زمانے کا ادب اس کے خط وخال اور ماحول کا آئینہ دار ہے۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر ایک مورخ کے بیان کو پرکھا جاسکتا ہے۔ حیاتِ انسانی اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ادب نے بھی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ جب ہندوستان میں آریاؤں کی حکومت تھی آزادی۔ خوشحالی اور بے فکری کا زمانہ تھا۔ تو اس وقت وید۔ پران۔ رامائن اور مہابھارت کی سی مقدس اور گراں بہا کتابیں لکھی گئیں۔ رامائن اور مہابھارت دنیا کے افسانوی ادب کی بہترین کتابوں میں شامل ہیں۔ اُن کے مطالعے سے آریاؤں کے خط وخال۔ ان کی تہذیب و تمدن۔ انکا نظامِ حکومت، ان کے اصولِ اخلاق۔ ان کی مجلسی تنظیم۔ ملک کے اصلی باشندوں کی حالت، طرزِ بود و باش اور اصولِ جنگ کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس زمانے کی معاشری جنگی اور مجلسی تاریخ لکھتے وقت اُن سے مستفید ہونا ناگزیر ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کا ادب زبانِ حال سے بتا رہا ہے کہ اس وقت ہندوستان پر ایک ایسی قوم حکمراں تھی جس کی مادری زبان سنسکرت یا ہندی نہیں بلکہ عربی و فارسی تھی۔ اور جس کے اخلاقی مجلسی۔ معاشرتی اور اقتصادی اصول اس قوم کے اصول سے قطعاً مختلف تھے جس کا ذکر ویدوں۔ پرانوں۔ رامائن اور مہابھارت میں ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر اہلِ ہند کے ادبی کارنامے ایک ایسی زبان میں ملتے ہیں جو نہ خالص آریائی ہے اور نہ خالص اسلامی۔ یعنی وہ ہر دو قوموں کے باہمی اختلاط کا لازمی نتیجہ ہے۔

اٹھارویں اور اُنیسویں صدیوں کا ادب اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ایک ایسی قوم آگئی تھی جو یہاں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ادبی کارناموں پر مغربی ادب کا نمایاں اور گہرا اثر پڑنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کے پُرشور زمانے کے بعد ادب اردو کا دورِ جدید شروع ہوا۔ جتنا جتنا ہمارے خیالات ہماری تہذیب و تمدن اور اصولِ معاشرت پر مغربی اصول کا اثر پڑتا رہا۔ اسی رفتار سے ادب اُردو نے بھی ارتقائی منزلیں طے کیں۔

آزاد۔ سرسید۔ شبلی۔ نذیر احمد اور حالی کی اَن تھک کوششوں کی بدولت اردو ادب نے طوفانی رفتار کے ساتھ ترقی کی انہیں بزرگوں خاصکر نذیر احمد اور سرشار نے اُردو کے جدید افسانوی ادب کی بنیاد رکھدی تھی، اور ان کے بعد مولوی بشیر الدین۔ مولانا راشد الخیری اور منشی سجاد حسین نے اُسے مالا مال کیا۔ شرر نے طرزِ جدید کے ناولوں کی داغ بیل ڈالی۔ اور سر والٹر سکاٹ کی طرح تاریخی ناول لکھے۔ مگر اس وقت اردو میں طرزِ جدید کے مختصر افسانوں اور معاشری ناولوں کی کمی بڑی طرح محسوس ہورہی تھی۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے خالقِ اکبر نے بنارس کے ایک غیر معروف

موضع میں لالہ دھنپت رائے کو پیدا کیا جنھوں نے ہوش سنبھالتے ہی نہ صرف اس کمی کو بحسن و خوبی پورا کر دیا بلکہ اس رہبرِ اعظم نے اس طفلِ شیر خوار کی اُنگلی پکڑ کر اُسے منزلِ شباب تک پہنچا دیا، اور اُسے لطیف اثرات کا مالک اور وجدان اور اس کی کیفیتوں سے آگاہ کر دیا۔ اس رہبر کے مقلدین و معاصرین نے اس کی ظاہری شکل و صورت کو حسین بنا دیا۔

دُنیا کی نامور اور زندۂ جاوید ہستیاں خود ساختہ ہوتی ہیں۔ اُنھوں نے گہوارۂ افلاس میں ہوش سنبھالا، تعلیم و تربیت حاصل کی۔ قدم قدم پر گوناگوں مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور متعدد بار ناکام رہنے کے بعد اس قدر کامیابی حاصل کی کہ زندہ جاوید ہو گئے۔ سقراط۔ ڈانٹے۔ شکسپیر۔ نپولین۔ لینن۔ اسٹالن۔ گورکی۔ مصطفےٰ کمال پاشا۔ مسولینی اور نذیر احمد وغیرہ سب ہی نے اپنے ذاتی محاسن اور کوششوں سے کامیابی حاصل کی۔ منشی پریم چند بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ نہ تھے۔

منشی پریم چند ایک متوسط الحال ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ابھی طفلِ نوخیز ہی تھے کہ مادرِ مہربان داغِ جدائی دے گئیں۔ اور جب اُنھوں نے ہوش سنبھالا اور ابھی طالب علم ہی تھے کہ چرخِ کجرفتار نے اُن پر ایک اور ستم ڈھایا۔ باپ کے سائے بھی محروم ہو گئے۔ اس سانحۂ ارتحال کے بعد گو اُنھوں نے میٹرک کا امتحان ضرور پاس کیا۔ مگر وہ تفکرات اور مصائب کے بھنور میں قبل از وقت پھنس چکے تھے۔ اُنھیں طالب علمی کی زندگی کو خیر باد کہکر ملازمت کرنی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے ایک ایسے زمانے میں جنم لیا تھا کہ ملک اور قوم کی قدیم عظمتیں اور اُن کی یادگاریں مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب میں بہی جا رہی تھیں۔ ان کا ذکر تک ایک ایسا بھولا ہوا خواب ہو چکا تھا جس کو یاد کرنے کی سعی سب کرتے تھے۔ مگر اس کا صحیح نقشہ ذہن میں آتا ہی نہ تھا۔ ان کے علاوہ منشی پریم چند نے افلاس کے مدرسے میں تربیت پائی تھی۔ اُنھوں نے اپنی مفلوک الحال اور فاقہ کش قوم کا حالِ زار بچشم خود دیکھا تھا، اور ذاتی طور پر اس کا تجربہ رکھتے تھے۔ اور پھر وہ ایک حساس اور دردمند دل لیکر آئے تھے۔ اس لئے ان کا قومی تحریکوں سے متاثر ہونا اور اُن سے دلچسپی رکھنا ناگزیر تھا۔ فطرت کو بھی یہی منظور تھا کہ وہ اپنی قوم کے ناخدا بنیں۔ اور اس کی قدیم عظمت اور روشن تاریخ کے راگ الاپیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ بہی خواہانِ قوم اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی پیہم کوششیں کر رہے تھے۔ پریم چند نے بھی اُن سے تعاون کیا۔ اور اپنی قوم کی پامال شدہ عظمت اور اس کے زرّیں کارناموں کو افسانے کے لباس میں بیحد رنگین و پُرتاثیر انداز سے پیش کیا۔

مافوق الفطرت واقعات کو افسانوی لباس میں پیش کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اور اب اُن سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہمارے سے گوشت و پوست کے انسانوں کے قابلِ یادگار کارنامے بیان کئے۔ ان کا مقصد دنیا کو محوِ حیرت کرنا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ نونہالانِ قوم اپنے بزرگوں کی عظمت اور بلندی کے جلوے اپنی نظروں کے سامنے پھرتے دیکھیں۔ اور اُن سے سبق حاصل کرکے اپنی پست حالت کو سنوارنے کی سعی کریں۔ منشی پریم چند نے بہادر اور وطن پرست راجپوتوں کی دنیاوی اور روحانی فتوحات کی رنگین اور دلکش لفظی تصویریں پیش کی ہیں۔ اُنھوں نے افسانوں سے وہ کام لیا جس کو انجام دینے کے لئے ہمدردانِ قوم اور شاعرانِ وطن بے تاب تھے۔ منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں حقیقت اور شعریت کو اس حسن و خوبی سے شیر و شکر کیا ہے کہ دوستوں اور دشمنوں کو بھی اُن کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی راج قائم ہوئے ایک صدی سے بھی زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔ ہندوستان کے شہروں پر مغربی طرزِ بود و باش اور تہذیب و تمدن کا اس قدر گہرا اور نمایاں اثر پڑا ہے کہ اہلِ شہر کے لباس چال ڈھال، معیارِ زندگی وغیرہ مغربی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یہانتک کہ اگر آج ۱۸۵۷ء سے قبل کے لوگ زندہ ہو جائیں تو وہ یقیناً ہمیں ہندوستانی کہنے کو تیار نہ ہوں گے (مگر شہروں میں اس حیرت انگیز انقلاب کے باوجود ہمارے دیہات ابھی تک مشرقی تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں۔ اہلِ دیہات کی زندگیوں کے مطالعے سے قدیم ہندوستان کی معاشری اور اخلاقی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ اُن کی سادگی، اُن کی توہم پرستی۔ ان کی مذہب اور روایاتِ قدیم سے محبت خالص ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے افسانوں کو ہندوستانی یا مقامی رنگ میں رنگنے کے لئے اہلِ دیہات کی زندگیوں سے

بہتر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔ منشی پریم چند اس نکتے سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے اُنھوں نے اپنے بہت سے افسانوں کے پلاٹ دیہات کی سرزمین میں رکھتے ہیں۔

منشی پریم چند نے اہلِ دیہات کی سادہ لیکن پُر از مصائب زندگیوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ کسانوں کو دو دھاری تلوار ــــــ سرمایہ دار فطرت ــــــ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف عمالِ حکومت پولیس۔ زمیندار اور مہاجن ہیں جو غریب اور مصیبت زدہ کسانوں کی زندگیوں کو تلخ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ غریبوں کا گلا گھونٹنے۔ ان پر نت نئے ظلم کرنے اور اُن کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر دادِ عیش وعشرت دینے میں ماہر ہیں۔ اُن کی زندگیوں کا نصب العین ہی مفلسوں کے پیٹ کاٹنا اور ان کو بھوکوں مارنا ہے۔ وہ جب انتہائی ظلم کرنے پر تل آئیں تو خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔ اور اپنی جیب بھرنے کے لئے غریب کسانوں کا گھر بار تک نیلام کرا دیتے ہیں۔

دوسری طرف فطرت ہے جس کی نیرنگیاں ہمیشہ عبرت انگیز ہوتی ہیں۔ اگر کبھی وہ فیاضی پر اُتر آئے تو غریب کسانوں کو مالا مال کر دیتی ہے۔ بارش کے قطروں کی صورت میں زر و جواہر برستے ہیں۔ آفتاب کی سنہری اور روشن کرنیں کسانوں کے خرمن کے دانوں کو اپنے رنگ سے سنہرا بنا دیتی ہیں۔ اور اگر کبھی تباہی و غارتگری پر کمر بستہ ہو جائے تو موسلا دھار بارش یا قلتِ باراں یا سیلاب یا برق و رعد یا بھونچال کی صورت میں کسانوں کے سامانِ حیات کو تباہ و برباد کر کے ان کو ہلاکت کے غار میں پہنچا دیتی ہے۔ الغرض فطرت سادہ لوح دیہاتیوں کے لئے کبھی سامانِ مسرت اور کبھی پیغامِ غم بن کر آتی ہے۔ منشی پریم چند نے غریب کسانوں اور دیہاتیوں کی ان تمام مصیبتوں کا ذکر اپنے افسانوں میں اس قدر مؤثر انداز سے کیا ہے کہ ان کو پڑھ کر ہر درد مند دل رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ منشی صاحب نے دکھایا ہے کہ کسان ان گوناگوں مصائب کا مقابلہ تیر و تفنگ، تلوار و بندوق سے نہیں بلکہ صبر و شکر سے کرتا ہے۔ منشی پریم چند نے سب سے پہلے اُردو میں ایسے افسانے پیش کئے جن میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ دراصل وہ مصورِ فطرت تھے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر اعظم کریوی اور علی عباس حسینی نے اس رنگ کو ترقی دی۔ اس خاص رنگ میں ڈاکٹر اعظم کریوی بہت زیادہ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دیہاتیوں کی زندگیوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ منشی پریم چند سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان پر یہ قول پورا اُترتا ہے کہ

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز نقشِ اول

کامیاب افسانوں کی ایک خصوصیت مقامی رنگ بھی ہے۔ اس میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ افسانہ نگار اسی مجلس یا جماعت کے حالات قلمبند کرے جس کی خوبیوں اور خامیوں سے وہ خوب واقف ہو۔ منشی پریم چند کے افسانوں کی دلکشی اور کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ ان میں صرف وہی باتیں تحریر ہیں جن کے ہر پہلو سے وہ اچھی طرح آگاہ تھے۔ "پریم پچیسی" "پریم بتیسی" اور زادِ راہ میں کئی افسانے مقامی رنگ کے لحاظ سے متمدن دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ منشی جی کے بعد ڈاکٹر اعظم کریوی۔ علی عباس حسینی۔ مسٹر فضل حق قریشی نے خاصکر اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کو نہایت کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے۔ فضل حق قریشی متوسط درجہ کے مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان اور اپنی حیثیت کے دیگر گھرانوں کی زندگیوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے وہ ان گھرانوں کے حالات کو نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کر سکے ہیں۔ مولانا نیاز فتحپوری نے مذہب کے خود ساختہ علم برداروں کے ساتھ ایک مدت تک زندگی گزاری ہے اور وہ ان کی مکاریوں، عیاریوں اور مذہب کے نام پر دنیا کو دھوکا دینے کی کوششوں۔ ظاہراً سادہ اور مقدسانہ مگر دراصل عیاشی کی زندگی بسر کرنے کے راز سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے ایک قابل تعریف طریقے سے ان عیاروں اور مہذب لٹیروں کے حالات پر سے پردہ اُٹھایا ہے۔ نیاز کی کامیابی کا راز وہی ہے جسے انگریزی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ اُنھوں نے اس نوع کے افسانوں میں اس قدر کامیاب مقامی رنگ پیدا کیا ہے کہ کوئی اور افسانہ نویس ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔

منشی پریم چند محبِ وطن تھے اور خود مزدور ہونے کی وجہ سے مزدوروں کے مصائب سے آگاہ تھے اس لئے اُنھوں نے اپنے بعض افسانوں میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی باہمی کشمکش، سرمایہ داروں کے مظالم، عمالِ حکومت اور خاصکر

پولیس کی سرمایہ داروں کی پشت پناہی کے بھی بیحد دلچسپ۔ دلکش اور عبرت انگیز قصے پیش کئے ہیں۔ اس نوع کے افسانوں کی بنیاد تخیل پر نہیں، بلکہ تجربے اور مشاہدے پر رکھی ہے۔ اردو کے دیگر کامیاب افسانہ نویسوں نے اس رنگ کے بہت ہی کم افسانے لکھے ہیں۔ جن کی وجہ غالبًا یہی ہے کہ چونکہ مرکزی و صوبجاتی حکومتوں کی عنان سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ فطری طور پر اشتراکیت کو کچلنے اور مزدوروں کے مطالبات کی مخالفت کرتے پر مجبور ہیں۔ اس لئے افسانہ نویس اس پُرخار وادی میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

فطرت سے مطابقت۔ پلاٹ کا فطری ارتقا اور فطری انجام۔ کرداروں کی نقل و حرکت اور گفتگو میں فطرت کی پیروی منشی پریم چند کے افسانوں کی خصوصیات ہیں۔ اُن سے پہلے اردو کے افسانہ نویسوں نے نفسیات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ اور گو مولوی نذیر احمد کو کردار نگاری اور افسانے کی نفسیاتی ترتیب میں بدرجۂ اتم کمال حاصل تھا۔ مگر اُن کے معاصرین مثلاً سرشار، منشی سجاد حسین اور شرر وغیرہ نے اپنے اپنے افسانوں کی ترتیب میں نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن منشی پریم چند نے مغربی افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے خاص اہمیت دی اور منشی جی کے تقریبًا تمام کامیاب معاصرین نے اُن کی پیروی کی یہاں تک کہ آج بعض افسانہ نویس تو اپنے افسانوں کی بنا ر ایک نفسیاتی نکتے ہی پر رکھتے ہیں۔ ان میں قیسی رامپوری۔ نیاز فتحپوری۔ مجنوں گورکھپوری۔ ڈاکٹر اعظم کریوی اور کوثر چاندپوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ البتہ کسی کا فلسفہ گہرا ہے۔ اور کسی کا سطحی۔ منشی پریم چند کا افسانہ "تریا چرتر" افسانوی دنیا کا ایک بہترین افسانہ ہے اور اصولِ فطرت کی پیروی کرنے کے لحاظ سے زندہ جاوید۔

نصیحت و وعظ روکھی پھیکی اور غیر دلچسپ باتیں ہیں۔ اسی طرح ادبیات اور خاصکر افسانوی ادب کی مدد سے اصلاح حال کرنے کی کامیاب سعی کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ اس کام میں صرف ماہرین فن ہی سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں اردو افسانوی ادب میں اس ایجاد کا سہرا مولانا نذیر احمد کے سر ہے۔ مولانا نے مسلمان عورتوں کی جہالت اور ناگفتہ بہ حالت سے متاثر ہو کر اپنی توجہ اس طرف منعطف کی۔ اور افسانوی ادب کی مدد سے اس اہم کام کو کرنے کا فیصلہ کیا، اور چونکہ وہ ایک ماہر فن افسانہ نویس تھے۔ اس لئے اُنھوں نے بیحد دلچسپ اور کامیاب اصلاحی ناول لکھے اور ان سے وہ کام لیا جو مصلح قوم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا بشیر الدین اور مولانا راشد الخیری نے مولانا نذیر احمد کی پیروی کی اور ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ مگر یہ محمود کوشش ناول کی دنیا تک محدود تھیں۔ ان کا مختصر افسانوں سے نہ ہونے کے برابر تعلق تھا۔ منشی پریم چند نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ وہ چونکہ قوم پرست اور محب وطن تھے۔ اور اپنی قوم کی ذہنی بے حسی کا علاج کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُنھوں نے قومی رنگ میں ڈوبے ہوئے اصلاحی افسانے لکھے اور اپنے کمال کی بدولت ان کو بے کیف اور بے لطف بھی نہ ہونے دیا۔ (مولانا نذیر احمد اور منشی پریم چند کے اصلاحی ناولوں اور افسانوں کی مقبولیت کی اہم وجہ انکی دلچسپی و رنگینی ہے) منشی پریم چند کے بعد ڈاکٹر اعظم کریوی اور علی عباس حسینی نے بھی افسانے کو غیر دلچسپ بنائے بغیر اس نیک مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

اسے انگریزی میں Art of story telling یا فن قصہ گوئی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خشک سے خشک اور مستعمل موضوع کو بھی اس قدر دلچسپ اور عجیب انداز میں بیان کیا جائے کہ قاری کو دلچسپی کا احساس ہر وقت رہے۔ منشی پریم چند کے افسانے اس ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ ع

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

(منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں قاری کی رجحانِ طبیعت اور مذاق کا خیال رکھنے کے بجائے آئینِ فطرت کی پیروی کرنا ضروری سمجھا ہے۔ ادب اردو کے دور ابتدائی کے افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ افسانہ نویس قاری کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے افسانہ کا انجام عمومًا طربیہ دکھایا کرتا تھا۔ وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ واقعات کا تقاضہ ہے کہ افسانہ کا انجام حزینہ ہو۔ منشی پریم چند نے اردو افسانہ نویسوں کے اس غیر فطری اصول کو ترک کر کے اپنے افسانوں کا انجام حزینہ بھی اور طربیہ بھی دکھایا ہے۔ سید امتیاز علی تاج نے "پریم بتیسی" (جلد دوم) کے دیباچے میں بالکل سچ کہا ہے کہ "حزینہ قصہ ہمیشہ طربیہ قصہ سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ منشی پریم چند کے حزینہ قصوں کے پڑھنے سے اثر تمام بدن میں بجلی کی طرح دوڑ جاتا ہے۔ لیکن طربیہ قصوں کا اثر اس پائے کا نہیں"۔)

ابتدائے آفرینش سے ہی عورت مرد کی دلچسپی کا باعث رہی ہے مرد نے

کی لکھی ہوئی کتابوں میں عورت کی تخلیق کا سبب مرد کی دلچسپی اور خوشنودی کا سامان فراہم کرنا بتایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت ایک نامعلوم زمانے سے افسانے کا موضوع بحث رہی ہے (قدیم زمانے کے قصہ نویسوں نے عورت کے حسن ظاہری اس کی نزاکتوں۔ اداؤں اور اس کی دیگر دلچسپیوں پر عجیب وغریب تخئیل آرائی کی ہے۔ اردو کی افسانوی دنیا میں مولانا نذیر احمد نے سب سے پہلے افسانہ نویسوں کی اس ذہنیت کے خلاف عملی جہاد کیا، اور اپنے ناولوں میں عورت کے ظاہری و مادی حسن کو سراہنے کی بجائے اس کے روحانی اور باطنی حسن، نیک سیرتی اور نیک خصلت کو پیش کیا ہے) لیکن روایات قدیم" کو بیک قلم مٹا دینا بہت ہی مشکل ہے۔ مولانا نذیر احمد کے اس جہاد کا اثر ان کے مقلدین پر تو ضرور پڑا مگر بہت کم۔ (مولانا کے بعد منشی پریم چند نے پوری طرح اُن کی پیروی کی اور عورت کو محلس میں ایک نہایت بلند مرتبہ دلوانے کی کوشش کرتے ہوئے اُسکو ہر دلکش سے دلکش صفت اور حسن کا مالک بنا دیا ہے۔ مثلاً وہ اپنے افسانۂ لعنت" (زاد راہ) میں ایک تجربہ کار مرد کا تصور عورت کے متعلق اس طرح پیش کرتے ہیں کہ "عورت طبعاً عشرت پسند اور نفس پرور ہوتی ہے۔ اس پر لاکھ جان نثار کرو، اس کے لئے مر ہی کیوں نہ مٹو۔ لیکن جب تک تمہاری جاں نثاریوں کا کوئی عملی اظہار نہ ہو۔ مرصع زیورات کی صورت میں ریشمی ملبوسات کی صورت میں بیش قیمت تحائف کی صورت میں۔ فرمائشوں کی تکمیل کی صورت میں۔ اُبلتے ہوئے کیش بکس کی صورت میں اُسے تسکین نہیں ہوتی۔ وہ محض کھریرا نہیں چاہتی دانہ اور گھاس بھی چاہتی ہے" اس کے آگے منشی جی اس خیال کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ" یہ (عورت) ایک دیوی ہے جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھتی ہے اور مرتی ہے مہر و وفا کے لئے خلوص و محبت کے لئے دلسوزی اور دلجوئی کے لئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت نے اردو کی افسانوی دنیا میں ایک خاص حیثیت حاصل کر لی) منشی جی کے معاصرین نے عورت کے متعلق مختلف نظرئے پیش کئے ہیں۔ مولانا راشد الخیری نے حیات نسوانی کو "شام زندگی" اور "نوحہ غم" بتایا ہے۔ عابد علی نے عورت کو مرد کے ہر گناہ اور عیب کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے حیات نسوانی کو سرچشمۂ گناہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ منشی پریم چند نے ہندوؤں کی تواریخ سے ان کے بعض زرین کارناموں کو لے کر بیحد دلچسپ دلکش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ "وکرمادت کا تیغہ" حکمرانوں کو انصاف و عدل کرنے کا سبق دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ حکمران کو اپنی رعایا کا ہر وقت خیال رکھنا چاہیئے۔ عمال حکومت کی بدعنوانیوں کی ذمہ داری حکمران پر ہے۔ اور اسی کے خون سے اس گناہ کا کفارہ دیا جاسکتا ہے۔ "رانی سارندھا" بندھیلکھنڈ کے راجپوتوں کی بہادری۔ عالی حوصلگی اور اولوالعزمی کی زندہ جاوید داستان ہے جس کے ذریعے سے منشی پریم چند نے راجپوتوں کی جرأت کی زندہ تصویر کھینچکر پیش کر دی ہے۔ اور دکھایا ہے کہ راجپوتنیاں بھی اپنے مردوں سے ہرگز کم بہادر اور جری نہ تھیں "رانی سارندھا" موجودہ زمانے کی عیش پرست نسل کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ رانی سارندھا نے آزادی کے مندر میں حکمرانی اور عیش و نشاط سب کی بھینٹ چڑھا دی اور ایک سچے بہادر کی طرح میدان جنگ کو عیش و نشاط اور رقص وسرود کی محفلوں پر ترجیح دی۔ اس افسانے کی ہر سطر سے حب آزادی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور قاری کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ بھی غلامی کے مقابلے میں مٹ جانے کو ترجیح دے۔ بندھیلکھنڈ کی زریں تاریخ کی دوسری "داستان" "ہردول" ہے۔ جس میں منشی جی نے دکھایا ہے کہ سچی بہادری اور عالی حوصلگی کیا چیزیں ہیں۔ راجہ ہردول نے اپنے وہمی مزاج بھائی کے شکوک دور کرنے اور اپنی بھاوج کے نام پر سے بے وفائی کا جھوٹا داغ مٹانے کے لئے زہریلا بیڑا کھالیا۔ اور اپنے خون سے ایک عفیفہ کے داغ بدگمانی کو دھویا۔ اسی افسانے کے دیباچے میں منشی جی نے بالکل سچ لکھا ہے کہ "سنگ وخشت کی یادگاریں اور تاریخی فتوحات انسان سے شناو صفت کی داد لیتی ہیں۔ مگر مردانہ جانبازی دلوں میں مذہبی ارادت پیدا کر دیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ جب تک کوئی فرد بشر ایسا عظیم الشان کام نہ کرے جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہو اس وقت تک عوام الناس کا دربار اُسے دیوتاؤں کی پدوی نہیں دیتا۔ فاتح اور شاعر سخی اور عادل دماغ کے مندر میں جگہ پاتے ہیں۔ مگر حمیت کے نام پر قربان ہونے والا انسان دل کے مندر میں جلوہ افروز ہوتا ہے" "گناہ کا اگن کنڈ" جو دھپور کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جس میں منشی جی نے دکھایا ہے کہ گئو ہتیا کرنے والا عذاب الٰہی سے ہرگز نہیں بچ سکتا ہے۔ اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی عذاب میں پھنسا لیتا ہے۔ منشی جی

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۰۴ پر)

رسم الخط

نیاز الدین احمد گورنمنٹ کالج لودھیانہ

ارتقائے انسانیت میں مذہب پرستی پہلی منزل ہے۔ اس سے گزر کر قومیت کا درجہ آتا ہے اور اس کے بعد بین الاقوامیت۔ ہر ملک کے عہدِ پارینہ میں مذہب کی بڑی شدت سے پیروی ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی مذہب لوگوں کو اپنی کڑی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا۔ اب ترقی یافتہ ممالک میں مذہب کی جگہ قومیت نے لے لی ہے۔ وہاں کے لوگ مذہب کو چھوڑ کر قوم پرست ہو گئے۔ اس لئے وہ قومیت کی پرورش کے لئے ہر طرح سے کوشاں ہیں۔ اور اُن کے نزدیک مذہب کے بجائے قومیت کی روح کو بیدار کرنے والے عناصر زیادہ مقدم ہیں۔ جن میں سے ایک وحدت زبان بھی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تمام ملک کے طول وعرض میں ایک زبان رائج ہونی چاہیئے تاکہ قوم میں یکجہتی پیدا ہو جائے اور اس طرح قومیت کے جدید تخیل کو فروغ حاصل ہو۔ بہت سے ترقی یافتہ ممالک مثلاً روس و سپین قومیت کے درجے سے گزر کر بین الاقوامیت کے منتہائے نظر کو پہنچ چکے ہیں۔ جن کے اثرات وہاں نمودار ہو گئے ہیں۔ لیکن ہندوستان مکمل طور پر ترقی یافتہ نہیں ہے۔ اس لئے یہاں ابھی مذہب پرستی زائل نہیں ہوئی ہے۔ البتہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو مذہبی جوئے کو پھینک کر قومیت کو مذہب پر ترجیح دیتا ہے۔ اور اس کو مقدم ترین ٹھہراتا ہے۔ یہ قوم پرست طبقہ زبان کے لئے ایک ہونے کا بھی حامی و مددگار ہے۔ لیکن قومیت کا سوال ہندوستان میں قبل از وقت اُٹھایا گیا ہے۔ اس نیک تحریک کا اجرا اُس وقت ہونا چاہیئے تھا جبکہ ہندوستان اپنی دو بڑی لعنتوں یعنی مذہب پرستی اور غلامی سے آزاد ہو جاتا۔ جب تک ہندوستان آزادی حاصل نہیں کر سکتا اس قسم کی تحریکات کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ غلامی میں قومیت کے عناصر پیدا نہیں ہو سکتے۔

اگر ہم ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حقائق کا بہ نظرِ امعان مطالعہ کریں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ بحالتِ موجودہ ہندوستان میں وحدتِ لسانی قریباً ناممکن ہے۔ اس حقیقت کو ہم استقصا اور انبساط کی رُو سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن غیر ملکی مورّخوں نے ان کی تعداد کہیں بڑھا چڑھا کر بتائی ہے۔ اُن کے شمار کے مطابق ہندوستان میں اس وقت ۲۵۲ زبانیں رائج ہیں۔ اُنھوں نے ہندی کی مختلف اشکال کو علیحدہ علیحدہ زبانیں شمار کیا ہے۔ اسی طرح پنجابی کی چاروں اقسام کو چار مختلف زبانیں بتایا ہے۔ اگر ایک ہی زبان کی ان مختلف اشکال سے قطع نظر کریں تو تقریباً پندرہ قابلِ ذکر السنہ رہ جاتی ہیں، جو ہندوستان میں رائج ہیں۔ اِن میں سے اکثر مثلاً بنگالی۔ گجراتی۔ تامل، ہندی اور اُردو ایسی ہیں جن کا اپنا ادب یا لٹریچر پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ اور اپنے پاؤں پر بلا مدد کھڑی ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک ملکی زبان (Lingua Franca) ہونے کے لئے اپنا حق پیش کرے گی اور اُن کے مطالبات اپنی اپنی جگہ کافی معقول اور وزن دار ہوں گے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ اگر ہندی والے اپنی زبان کی

نشر و اشاعت کرنے میں کوشاں ہیں تو اُردو والے اپنا راگ الاپ رہے ہیں حال ہی میں پنجابی نے بھی سر اٹھایا ہے۔ دریں حالات ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قریباً ایک فی صدی تک ہندوستان میں ایک زبان کے وجود کی کوئی امید نہیں۔ البتہ اس کے بعد کے حالات کا کسی کو علم نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی بین الاقوامی زبان پیدا ہو جائے۔ جو تمام ہندوستان میں پھیل جائے۔

مذکورۂ بالا بیان سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکال لے کہ اگر ہندوستان میں ایک زبان رائج نہ ہوئی تو یہ مصیبت زدہ ملک قومیت کی نعمت سے بے بہرہ رہے گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہندوستان مختلف زبانوں کا گھر ہوتے ہوئے بھی قومیت کے بیش بہا مرتبے سے سرفراز ہو سکتا ہے۔ اس وقت مغربی دنیا میں ایسے ممالک پائے جاتے ہیں۔ جہاں کہ مختلف زبانوں کی موجودگی میں جذبۂ قومیت کافی ترقی یافتہ ہے۔ جرمنی میں پندرہ مختلف زبانیں رائج ہونے کے باوجود قومیت موجود ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایک زبان کا ہونا قومیت کے لئے کوئی خاص ضروری عنصر نہیں۔ اگرچہ ماہرین سیاست اس پر بہت زور دیتے ہیں۔ لیکن عملی میدان میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ مخصوص حالات ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ قومیت کے ضروری عناصر میں سے ایک آدھ نظر انداز ہو جائے۔ چنانچہ "ہندوستانی قومیت" کے لئے وحدتِ لسانی لابد نہیں۔

عملی طور پر کسی زبان کے لوگ اپنی زبان یا اس کے رسم الخط کو چھوڑنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اور اُن کا یہ مطالبہ نہایت معقول دلائل پر مبنی ہے۔ ہر قوم کا تمدن اور زبان لازم و ملزوم ہیں۔ لٹریچر یعنی ادب قوم کی رُوح کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر کسی زبان کو فراموش کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تمدن اور ثقافت (Culture) فنا ہو جائیں گے۔ اور تمدن و ثقافت کی تباہی ملک کی تباہی ہے۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں مدت دراز ہو گئی۔ لیکن اُن کا تمدن ہندو قوم سے علیحدہ ہے۔ اگر اُن کا تمدن تباہ ہو جاتا تو وہ بیس سال یا اس سے کم مدت میں ہندو قوم سے مل جاتے۔ تمدن کی حفاظت قوم کی حفاظت ہے۔ جیسا کہ فلسطین کے یہود و عرب کی باہمی آویزش سے ظاہر ہے۔ اگر کسی قوم کا رسم الخط بدل دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زبان کا پُرانا ادب فراموش ہو جائے گا۔ اور اُس کا کوئی مطالعہ نہ کرے گا۔ مثلاً اُردو کو اگر ناگری رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیں تو پرانے اساتذہ کا کلام ایک مدت کے بعد بالکل فراموش ہو جائے گا یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس سارے ادب کو نئے رسم الخط میں تبدیل کیا جائے۔ لیکن اوّل تو یہ ممکن العمل نہیں کہ تمام ادب کو نئے خط میں بدلا جائے دوسرے زبان کی خصوصیات کا خط کی خصوصیات سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔

پس مذکورۂ بالا وجوہ سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں ہر صوبے کے لوگ اپنی زبان اور اپنا رسم الخط کبھی نہ چھوڑیں گے۔ فطرتاً ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے تمدن اور ادب کی حفاظت کریں۔ جس کے لئے ان کو اپنی زبان کی حفاظت ضروری ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی راز ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ تمام ملک میں اپنی مرضی سے ناگری یا فارسی رسم الخط جاری کر دیا جائے۔ بعض لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ہندی اور اردو کو ملا دیا جائے۔ کیونکہ یہ آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ڈالی جائے۔ عملی طور پر یہ امر ممکن نہیں کیونکہ دونوں زبانوں کا ادب علیحدہ ہے۔ اور دونوں السنہ مختلف تمدنوں کی آئینہ دار ہیں۔ البتہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک صورت ہے جس سے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے تمدن کے ساتھ ایک گونہ ہمدردی ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ سکولوں میں لڑکوں کو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط سکھائے جائیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان اور ہندو دونوں ایک دوسرے کے ادب سے واقف ہو جائیں گے۔ اور اس طرح ایک دوسرے کے جذبات کو بطریقِ احسن سمجھنے لگیں گے۔ نیز اس سے قومیت کی تربیت کے سامان بھی مہیا ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں صرف ہندی اور اُردو ہی کثیر الرواج زبانیں ہیں۔ بنگالی۔ گجراتی وغیرہ اپنے اپنے صوبوں کے لئے مخصوص ہیں اور وہاں سے باہر نہیں نکلیں۔ اس لئے اگر ہندی اردو کا مسئلہ حل ہو جائے تو ایک حد تک ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

پس اگر تعصب کی عینک کو اتار کر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ صرف فارسی یا صرف ناگری رسم الخط جاری کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ دونوں کا پہلو بہ پہلو رائج ہونا بعید از قیاس نہیں۔

ہندوستان میں یہ ایک عام مرض ہے کہ ہندو ہمیشہ ہندی رسم الخط کی اور مسلمان فارسی خط کی حمایت کریں گے۔ وہ اس کو اپنا مذہبی فرض خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کی سی قابل قدر ہستی اس تعصب کا شکار ہوگئی ہے۔ اُنھوں نے حال ہی میں ایک خطبے میں فرمایا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے" میں حیران ہوں کہ مہاتما جی اتنے عالم و فاضل ہوتے ہوئے تشنگیٔ علم کا ثبوت دیتے ہیں۔ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے یا اردو۔ کاش ان کو معلوم ہوجائے کہ اُن کی ہندی کے فروغ کے لئے سرگرمیاں بالکل ناکارہ ثابت ہوں گی۔ اور اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ اُن کی اُردو کے لئے حمایت بالکل فضول ہے کیونکہ یہ جدوجہد سنہ ۲۲ء کی شدھی اور تبلیغی جھگڑے کی طرح آخر کار ختم ہوجائے گی۔

ایک اندھی لڑکی کی دُعا

تو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سورج کو جمال　　　بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال

نور پاشی میں قمر ہے آپ ہی اپنی مثال　　　مجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذوالجلال

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کے کئی اقسام ہیں　　　سُرخ ہیں کالے ہیں، پیلے اور نیلی فام ہیں

اور اِن رنگوں سے وابستہ بہت سے کام ہیں　　　مجھ کو کیا! یہ آنکھ والوں کے لئے انعام ہیں

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

سُنتی آئی ہوں کہ کھِلتے ہیں چمن میں لالہ زار　　　رُوئے گُل پر رنگ برساتی ہے ساون کی پھوار

تازگی سی رُوح میں بھرتا ہے کلیوں کا نکھار　　　میں نہیں کہتی کہ یہ سب دیکھ لوں پروردگار

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لُوں

میری آنکھوں کو بصارت کی ہوس اصلا نہیں　　　بے بصر ہوں میں مگر اس کی مجھے پروا نہیں

تُو نے سمجھا ہے میں عاجز ہوں مگر ایسا نہیں　　　مجھ کو ہرگز آرزوئے دیدۂ بینا نہیں

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

غلام رسول نازکی کشمیر

مُغل بیگمات

از محمد فاتح فرخ سیوہاروی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پردہ نشین مغل بیگمات کی دنیا محلات کی چہار دیواری ہی تک محدود تھی۔ اُن کی تمام زندگی اس چہار دیواری میں گزر جاتی تھی اور دنیائے بیرونی پر اتفاقاً ہی کبھی نظر پڑ جاتی تھی۔ اگرچہ یہ دنیا محدود تھی مگر تمام عالم کی نیرنگیاں اس میں پنہاں۔

بوجہ ان نیرنگیوں کے وہ یہ یقین کر لیتی تھیں کہ انھیں محلات کی دنیا میں رہنے کے لئے وہ پیدا ہوئی ہیں۔ محلات شاہی کے حسب ذیل قوانین مقرر تھے۔ محل سرا کے دروازے پر حبشی خوجہ۔ ترک غلام اور راجپوت سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ کوئی آدمی شاہی محل میں نہیں جا سکتا تھا۔ اگر کوئی ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا تھا تو اس کی سزا موت ہوتی تھی۔ نیز معمار بھی محل میں بذریعۂ پروانہ داخل ہوتے تھے۔ اور جب واپس آتے تھے تو حبشی خوجہ ان کو بنظرِ غور دیکھتے تھے کہ آیا وہی آدمی ہیں یا نہیں۔ اگر ان میں کوئی دوسرا شخص شامل ہوتا تھا تو اس کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ جو عورتیں حرم سے تعلق رکھتی تھیں اُن کی تلاشی ہوتی تھی کہ کوئی منشی شے مثل بھنگ۔ چرس۔ شراب وغیرہ تو اُن کے پاس نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسری عورت حرم سرا میں داخل ہونا چاہتی تھی تو دیکھا جاتا تھا کہ کوئی مرد اس عورت کے لباس میں تو ملبوس نہیں ہے۔ رات کے وقت شاہی محل کا صدر دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ اور قفل سربمہر کر دیا جاتا جاتا تھا۔ اور دروازوں کے برآمدوں میں ساری رات مشعلیں روشن رہتی تھیں۔ ہر دروازے پر ایک سنتری پہرہ دیتا تھا اور رات بھر وہاں کسی مرد کا گزر ناممکن تھا۔ ایرانی شعرا محل کی شان میں بہت قصیدے کہتے تھے۔ کبھی محل کا فردوسِ بریں سے مقابلہ کرتے تھے تو کبھی مغل بیگمات ساکنانِ محل کو جنت کی حوروں سے تشبیہہ دیتے تھے۔ اور اس انداز سے یہ تمام واقعات بیان کرتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ محض شاعرانہ جذبات نہیں بلکہ اصلی واقعات ہیں۔ محل کے باغات ایرانی طرز پر تھے، جا بجا رنگارنگ کے پھول لگے ہوتے تھے۔ کہیں صد برگ و گلاب۔ تو کہیں جنار۔ دُور سے معلوم ہوتا تھا کہ آگ لگی ہوئی ہے۔ نہریں بہتی تھیں اور اُن کے کناروں پر قدِ آدم سرو کے درخت کھڑے ہوتے تھے۔ فوارے چلتے ہوئے وسطِ باغ میں نظر آتے تھے۔ باغ میں سنگِ مرمر کا مسقف چبوترہ بنا ہوتا تھا۔ غرض ہر چیز اس چھوٹی سی دنیا میں رنگین نظر آتی تھی۔ صنفِ نازک کی معمولی سے معمولی خواہش اسی عالم محدود میں سیر ہو جاتی تھی۔ اور غزالی آنکھیں اس فضا میں ہمیشہ سرشار رہتی تھیں۔ تمام مغل بیگمات بہت آزادی سے انھیں حدودِ معینہ میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ بعض کو یہ بھی نہیں محسوس ہوتا تھا کہ صبح کب ہوئی اور شام کب۔ امورِ خانہ داری سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ فکر سے آزاد تھیں۔ محل کے انتظامات ایک صدر ناظر کے ذمے تھے، جو معقول تنخواہ پاتا تھا۔ اس کے سپرد شاہی توشہ خانہ اور خلعتِ شاہی کا تیار کرنا تھا جو منصبداروں اور امیروں کو جشن اور تہوار کے روز بخشے جاتے تھے۔ بیگمات کو مقررہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور کثیر تعداد داشتہ عورتوں کی بھی محل میں تھی۔ جو کہ کنیزوں کے نام سے موسوم تھیں۔ یہ بیگمات کی خدمت

میں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ان بیگمات کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک بیگم ایک دوسرے سے بڑھکر تھی۔ اصفہان اور شیراز کی بیگمات بھی حرم میں تھیں۔ جن کی رگوں میں خالص عجمی خون دوڑتا تھا۔ ان کی آنکھیں غزالی۔ بدن چھریرا قد دراز۔ رنگ صبیح ہوتا تھا۔ نیز بیگماتِ ہند بھی موجود تھیں جو عموماً راجپوت تھیں۔ یہ راجپوت بیگمات عہدِ اکبری سے حرم میں داخل ہوئیں۔ ان کی چشم سیاہ بال لمبے۔ میانہ قد۔ رنگ ملیح ہوتا تھا۔ غرض ہر بیگم اپنے مُلک کے اعتبار سے لاجواب تھی۔ ہر قوم و مُلک کی بیگمات ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور آپس میں مبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ نیم ہند و مسلم شہزادیاں جو عہدِ شاہجہاں اور اورنگ زیب میں تھیں اِن میں اور ایرانی بیگمات میں بالکل ایسا ہی اختلاف تھا جیسا کہ آج ایک جدید ہند و روشن خیال لڑکی اور ایک ہندو قدیم عورت میں ہے۔ اس خلط ملط کا بہت اثر پڑا۔ اور تہذیب اور تمدن بالکل ہندوستانی ہوگیا۔ بہت سی مغل بیگمات وہ تھیں جن کی رگوں میں ہندی خون موجزن تھا۔ علاوہ ازیں مغل بیگمات کے لئے نباتاتی باغات تھے جن میں وہ اپنی رنگین زندگی کے چند لمحے گزارتی تھیں ان کی زندگی کے تمام لوازم پورا کرنے کے لئے بازار بنے ہوئے تھے جہاں سے وہ اپنی مرضی کی اشیاء خرید سکتی تھیں۔ غرضکہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو انھیں میسر نہ آسکتی ہو۔ بازار کے قریب عبادت کے لئے ایک مسجد بھی واقع تھی۔ ایسے رنگین ماحول اور پُرسکون فضا کے باوجود محل میں ایسی بیگمات بھی موجود تھیں جو عیش سے بالکل بے بہرہ تھیں اُن کے مزاج میں رنگینی کا شائبہ بھی نہ تھا ان بیگمات میں نور جہاں اور ممتاز محل صفِ اول میں نمایاں ہیں۔ نورجہاں تو ان بیگمات میں سے ہے جس نے امورِ سلطنت بخوبی انجام دیئے۔ داد و شجاعت کا مجسمہ تھی۔ مغلیہ آرٹ جس نے آج ہمارے عجائب خانے مزین ہیں اُن میں سے ہزاروں تصویریں اُن بیگمات کی ہیں جن کے کارنامے زندہ ہیں۔ ان بیگمات کا دستور العمل یہ تھا کہ صبح کو بیدار ہونے کے بعد نمازِ فجر سے فارغ ہوکر ہر ایک بیگم ایک معطر غسل کرتی تھی۔ بعد ازاں اس کی تمام کنیزیں اس کے تنِ کافوری کو گرانبہا لباس سے مزین کرتی تھیں۔ کوئی آنکھوں میں سرمہ لگاتی تھی تو کوئی گیسوؤں کو تابدار بناکر پریشان زلفوں کا شیرازہ یکجا کرتی تھی۔ پوشاک میں ایک دھاریدار پیٹی کوٹ پہنایا جاتا تھا جس سے جسم کا ہر ایک حصہ چمکتا تھا۔ ہر بیگم جب بیش بہا جواہر لعل و یاقوت سے مُرصع ہوجاتی تھی تو وہ اپنی زریں کرسی سے اُٹھتی تھی اور حسن کے ان اسلحہ جات سے مسلح ہوکر سینکڑوں انداز سے شاہی دل زخمی کرنے کے لئے بادشاہ کے حضور میں جاتی تھی۔ قدم اُٹھانے پر سونے کی پازیبیں بجتی تھیں اور چال کی لچک کے ساتھ گردن کے لعل اور ہیرے بھی حرکت کرتے تھے۔ لباس کی شکن اور سر کے بالوں سے خوشبو آتی تھی۔ غرض بادشاہ یہ دلفریبی کے مناظر اور حسن و جمال کو دیکھکر بیساختہ دل دے دیتا تھا۔

منگنی کا چھلا اور اُس کا روزنامچہ

(مصلح الدین احمد آسیرؔ)

پنجشنبہ ۲۳ ر اپریل

میں یہاں اس خوبصورت ڈبیہ میں پڑے پڑے اُکتا گیا ہوں - اس میں شک نہیں کہ یہ زندگی آرام دہ ہے - مگر بہت ہی غیر دلچسپ - میں ذرا دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہوں - میری تمنا ہے کہ کوئی مجھے خرید لے - - - دیکھو ایک لڑکی ایک نوجوان کے ساتھ آرہی ہے —— وہ بحیثیت مجموعی خوبصورت معلوم ہوتی ہے - —— اب مجھے اپنا روزنامچہ ایک لمحے کے لئے چھپا دینا چاہئے - اور سلیقے سے بیٹھکر اپنی چمک دمک اور خوشنمائی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے -

لڑکی نے مجھے پسند کرتے ہوئے نوجوان سے دریافت کیا "تمہارا کیا خیال ہے؟" جس کے جواب میں اُس نے دبی زبان سے کہا "پیاری میگی میں اتنی قیمت ادا نہ کرسکوں گا" بیچاری میگی نے پھر ایک ایسی انگوٹھی پسند کی جس میں صرف ایک ہی ہیرا تھا - اور مجھے اس کی ذات سے کوئی فائدہ نہ پہونچا -

جمعہ ۲۴ - اپریل

آج میں بہت ہی خوش ہوں - میں اب زیادہ دیر تک اس ڈبیہ کے اندر بند نہ رہوں گا - مجھے ایک خوبصورت لڑکی "پگی" نے خرید لیا ہے - وہ اپنے محبوب نوجوان کے ساتھ آئی اور اُن دونوں کی نظر انتخاب مجھی پر پڑی - لڑکی نے کہا "میں فلاں انگوٹھی پسند کرتی ہوں جس میں ایک ہیرا اور کئی یاقوت جڑے ہوئے ہیں" نوجوان نے جواب دیا "اور پیاری میں بھی تو اُسی کو دیکھ رہا تھا" اس کے بعد اُن دونوں نے بغیر قیمت دریافت کئے ہوئے میرے خریدنے کا فیصلہ کرلیا حساب طلب کیا اور قیمت ادا کردی -

شنبہ ۲۵ ر اپریل

آج جم، پگی اور ہم موٹر میں ہواخوری کو گئے تھے - واہ کیا سہانا دن تھا، لیکن مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں کسی نرم دھات کا بنا ہوا نہیں ہوں - ورنہ اس قدر غیر معمولی رگڑوں سے آج مجھے سابقہ پڑا تھا کہ میرا تو دم ہی ہوا ہو جاتا - میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں - لیکن وہ نوجوان اُس لڑکی کا ہاتھ دبائے جاتا تھا اور وہ بھی کبھی کبھی چیخ اُٹھتی تھی - اس کے بعد میں نے چند مضحکہ خیز آوازیں سنیں اور پگی نے کہا "بس پیارے! اب میں تھک گئی —— اب تعداد تقریباً پچاس تک پہونچ چکی ہے —— کیا اب بھی بس نہ کروگے؟" میں حیرت میں ہوں کہ وہ کیا تھا!

یکشنبہ ۲۶ ر اپریل

میں آج جم اور پگی کے ہمراہ گرجا گیا تھا - پہلے پہل تو میں کچھ مایوس سا ہو چلا تھا - کیونکہ مجھے مطلقاً کچھ نظر ہی نہ آرہا تھا - تم سمجھے کیوں؟ اس لئے

پگی کچھ پہنے ہوئے تھی جسے وہ دستانے کہتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اُنھیں اتار ڈالا۔ اور میں اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھ سکا۔ وہاں بڑا مجمع تھا۔ ابھی ہم گرجا کے باہر ہی تھے کہ ان میں سے بہتوں نے مجھے دیکھنا شروع کیا، ایک شخص نے —— جو مضحکہ انگیز لباس پہنے ہوئے ذرا بلندی پر کھڑا تھا —— کچھ کہنا شروع کیا۔ اُس کی گفتگو کا ایک ہی جزو میری سمجھ میں آیا۔ جب اُس نے کہا "تم اپنے پڑوسی کی بیوی کو بُری نظر سے نہ دیکھنا" تو جم۔ پگی کی جانب مڑا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا "شکر ہے خدا کا کہ میں نے اپنے پڑوسی کی بیٹی پر نگاہیں ڈالیں، بیوی پر نہیں" جس پر پگی نے شرما کر کہا "ہوں جم، بدتہذیبی کی باتیں مت کرو"

دوشنبہ ۷۲ اپریل —— جمعہ ۵ جون

ان دنوں میں اس درجہ مصروف رہا کہ مجھے دم مارنے کی فرصت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ کچھ اور کام نہ تھا۔ ناچ رنگ۔ دعوتوں، سیروں اور تصویر کشی کے سوا، جب سے میں دوکان سے باہر نکلا ہوں میں نے بہت کچھ دیکھ سُن لیا ہے۔ مگر اب ان تمام مسرتوں سے عاجز آگیا ہوں۔ اب میں سمجھا کہ وہ مضحکہ خیز آوازیں جو پہلے دن میں نے سنی تھیں کیا تھیں، وہ بوسے تھے۔ جم اور پگی، اس مہینے کے آخر تک میاں بیوی ہو جائیں گے۔ تب مجھے ایک اور ساتھی ملجائیگا کیونکہ پگی کو ایک عقد کی انگشتری پہنائی جائے گی۔ لیکن وہ بالکل سادی ہوگی۔ میری سی شاندار نہ ہوگی۔

شنبہ ۶ جون

ہم لوگ آج تیرنے کے لئے گئے تھے۔ جم اور پگی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں کود پے۔ مجھے کا ہیکو کبھی اتنے پانی میں جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں اس قدر پانی دیکھکر میرے حواس جاتے رہے۔ جس کی وجہ سے ایک ہیبت ناک واقعہ رونما ہوا۔ میں ڈر کے مارے پگی کی انگلی سے سرک گیا۔ اور اس قدر خوفزدہ ہوا کہ پانی کی سطح پر بھی نہ ٹہر سکا۔ سیدھا تہ میں جا لگا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بس آج میرا خاتمہ ہو گیا۔ مگر فوراً ہی ایک گرداب نے مجھے اچھالا یا۔ اُسی وقت پگی کو میں نے کہتے سُنا "ارے جم وہ دیکھو وہ وہاں ہے" اور میرے اچھے جم نے مجھے بچا لیا۔ لیکن وہ کسی قدر منتشر سا معلوم ہوتا تھا اور مجھے پھر پگی کی انگلی میں پہناتے وقت اس نے کہا "اے پگ منگنی کے چھلے کا اس طرح گر جانا شگون بد ہے" پگی ہنسی اور کہنے لگی "دیوانہ مت بنو جم" میرا ارادہ ہوا کہ میں جم کو سمجھا دوں کہ "میں ہرگز گرا نہیں بلکہ خود ہی انگلی سے اتر گیا تھا" لیکن اس نے میری سنی ہی نہیں۔

یک شنبہ ۷ جون

آہ آج کا دن بھی کس قدر خوفناک تھا۔ مجھے اپنی قسمت بُری معلوم ہوتی ہے۔ کل وہ واقعہ پیش آیا۔ اور آج یہ۔ تم کچھ سمجھے؟ لو سنو! پگی اور جم میں آج کے دن ایک چائے خانہ میں ملنے کا وعدہ تھا۔ لیکن جب پگی اور میں وہاں پہونچا تو پگی، مارے غصہ کے دیوانی ہوگئی اور یکایک کواڑوں کی آڑ میں چھپ گئی۔ میں بہت متوحش تھا کیونکہ میں دیکھ ہی نہ سکا کہ کواڑوں کی آڑ میں کیا ہو رہا تھا۔ لیکن جم نے یقیناً ہم لوگوں کو دیکھ لیا وہ ہماری طرف لپکا اور پوچھا "پگی کیا معاملہ ہے؟" لیکن پگی نے بہت ہی ترشروئی سے جواب دیا "جی ہاں!! آپ کو تو کچھ خبر ہی نہیں، لیکن یہ یاد رکھئے گا کہ میں نے سب کچھ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے" اور مارے غصے کے گھر کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ایک علیحدہ گاڑی میں آئی۔ اور جم بعد کو روانہ ہوا۔

جم اور ہم لوگ گھر پہونچے۔ پگی، جم کی طرف بڑھی اُس وقت اُس کا چہرہ سُرخ انگارہ تھا وہ کہہ رہی تھی کیوں جم: یہ بھی ایک کھیل تھا۔ تم مجھ سے منسوب ہو اور پہلے ہی سے چائے خانہ میں پہونچکر ایک خادمہ کا بوسہ لینے لگے۔ نہایت بے تکلفی سے بات چیت کرنے لگے اچھی بات ہے، جاؤ پھر اُسی کے ساتھ شادی بھی کرلو" اور قبل اس کے کہ جم بیچارہ کچھ جواب دیتا۔ اُس نے مجھے انگلی سے اُتار لیا اور جم کے چہرے پر پھینک مارا۔ اُس کے ہاتھ سے نکل کر میں ایک صوفہ پر جا گرا۔ اور اس کے غلاف کی ایک شکن میں چھپکر بیٹھ رہا۔ میں پھر کچھ دیکھ تو نہ سکا۔ لیکن پگی کو یہ کہتے ہوئے ضرور سنا "مجھے جانے دو" اور جم کہتا تھا "ہاں ہاں ابھی ایک لمحہ میں تم جا سکتی ہو۔ مگر میری اس بات کا ذرا جواب تو دیدو۔ کیا تم مجھے اتنا کمینہ سمجھتی ہو؟" جس پر پگی نے کہا "ہاں" تب میں نے جم کو کہتے ہوئے سنا کہ "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں حقیقت حال تم سے بیان کر دوں گا جس سے تم یقیناً مطمئن ہو جاؤ گی" مگر پگی نے کہا "میں اب ایک لفظ سننا نہیں چاہتی تم بھی ویسے ہی نکلے جیسے کہ اکثر لوگ ہوا کرتے ہیں۔ آج

سے مجھسے تم سے کچھ مطلب نہیں "تب جم نے کہا " بہتر ہے" اس کے بعد جم نے مجھے اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ میں نے دیکھا کہ پگی چل کھڑی ہوئی تھی۔ جم کا خیال درست نکلا۔ کل اُس نے کہا نہیں تھا کہ میرا گرنا فالِ بد ہے؟

دوشنبہ ۸ رجون

جم نے اپنی جیب سے نکال کر میز کے خانہ میں رکھدیا۔ اب میں کسی چیز کو مطلق نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ جم کو اپنی ماں سے اتنا کہتے سنا کہ آج سارا قصہ ختم ہوگیا۔

سہ شنبہ ۹ رجون ——— شنبہ ۲۷ رجون

کیا زندگی ہے۔ یہ تین ہفتے میرے تقریباً اُسی میز کے خانے میں بسر ہوئے صرف اس وقت باہر نکلنے کو ملتا تھا۔ جب جم، دن میں ایک بار مجھے ہاتھ میں لیتا تھا۔ ایک ریشمی رومال سے میرا منہ پوچھتا تھا اور مجھے بوسہ دیتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے صرف اُس کی سنگار میز کی سطح ہی دیکھنے کو ملتی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ پگی کی ایک بڑی سی تصویر بھی۔ میرا خیال ہے کہ انسان بڑا ہی خود غرض ہے۔ دراصل جم اور پگی کے اس قسم کے برتاؤ سے میں مایوس ہوچلا ہوں۔

یکشنبہ ۲۸ رجون

اب تمہارا خیال کیا ہے میں کہاں ہوں؟ پگی کی چھوٹی ساری چھتری کے اندر" یہ کیونکر ہوا؟

سنو! ایک روز جم، حسبِ معمول گر جا گیا اور بالکل پگی کے پیچھے والی نشست پر بیٹھا۔ میں اس راز سے پہلے ہی واقف تھا۔ کیونکہ وہ اُس روز مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ میں یہ تو نہ سمجھا کہ اس سے اس کا مقصد کیا تھا تاہم مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اب پگی سے صفائی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ان معاملات میں کس قدر سست ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ صفائی کرانے میں میں بھی اس کی مدد کروں گا۔ اتفاق کی بات کہ مجھے جم کی جیب میں ایک سوراخ بھی مل گیا۔ اُسی طرف سے ٹھیک اُس وقت جب کہ سب کے سب جھکے ہوئے تھے۔ میں چپکے سے کھسک گیا کہاں؟ پگی کی چھتری کے اندر، اُس نے اپنی چھتری ہم لوگوں کے سامنے اپنی کرسی کے نیچے رکھدی تھی اس لئے میں وہاں آسانی سے پہونچ سکا، جب اُس نے چھتری اُٹھائی تو میں بالکل ہی تہ میں جا پہونچا۔ اس میں شک نہیں کہ خطرہ ضرور تھا اگر وہ بغیر چلتے ہوئے اپنی چھتری کھولتی تو میں گر پڑتا، پھر خدا معلوم مجھ پر کیا بیتتی۔ لیکن چونکہ ابر باد تھا۔ اس لئے اُس نے چھتری کھولی ہی نہیں اور میں ابھی تک اُس کے اندر ہی ہوں معلوم نہیں جم کیا خیال کرتا ہوگا۔

دوشنبہ ۲۹ رجون

پگی کو میں مل گیا۔ اُس نے آج کہیں باہر جاتے ہوئے جیسے ہی اپنی چھتری کھولی میں گر پڑا اور لڑھک کر قصداً اُس کے سامنے جا پہونچا، تاکہ وُہ مجھے دیکھ لے۔ اُس نے تھوڑی دیر تک تو مجھے گھورا پھر لپک کر اُٹھالیا اور مجھے بوسہ دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے لکھنے کی میز پر گئی اور جم کو چند سطریں لکھیں چونکہ میں اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ اس لئے سارا تماشہ دیکھ رہا تھا اُس نے ایک ایک کرکے تقریباً سات خط لکھے اور پھاڑے آخر میں یہ خط روانہ کیا۔

ڈیر مسٹر فیرنٹ

میں نہیں سمجھ سکی کہ تم نے اس منگنی کے چھلے کو میری چھتری میں کیوں ڈال دیا۔ مہربانی کرکے آؤ اور اس کو واپس لے جاؤ۔

تمہاری مخلص پی، لیہی

(دیکھئے اُس نے مجھے خط کے ساتھ ہی ساتھ نہ بھیجدیا، بلکہ اُلٹے جم ہی کو میرے لے جانے کے لئے بلا بھیجا ہے۔ اہا ہا)

پگی باہر نہ گئی وہ اپنی انگلی میں مجھے پہنے ہوئے کمرہ میں بیٹھی انتظار کیا کہ اس کے سامنے میں نے جم کا ایک بڑا فوٹو بھی آج دیکھا جو اس سے پیشتر کبھی اُس کمرے میں نہ تھا۔ اسی سے تو میں انسان کو تماشا سمجھتا ہوں۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی، پگی اچھل پڑی، اُس نے مجھے اپنی انگلی سے اتار کر میز پر رکھدیا، اور اُس فوٹو کو میز کے خانہ میں جلدی سے چھپا دیا۔ تب اُس نے کہا " اندر آؤ" ——— اور جم اندر داخل ہوا۔

(اب دیکھئے وہ خود ہی مجھے لینے کے لئے آیا۔ کیا کوئی اور نہ تھا جس کو وہ بھیجتا اہا ہا)

پگی نے مجھے اُٹھایا اور کہا کہ جم، یہ تمہارا چھلّا ہے ——— مجھے اپنی

چھتری کے اندر رہا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے کیا کہنا چاہیئے۔ میں جم کی صورت گھور رہا تھا۔ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ آخر کار اُس نے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور کہا "پگی کیا تم اب پھر اس کو واپس کر دو گی"؟ تب پگی نے چپکے سے کہا۔ مگر جم اس خادمہ کا کیا قصہ ہے؟" اب جم نے مسکرا کر کہا۔ جب میں نے اس گتھی کو سلجھا دینا چاہا تو تم سننے پر تیار نہیں ہوئیں"۔ اور پگی کے ہونٹ تھرانے لگے —— کیا انسان تماشا نہیں ہے؟ —— اور اُس نے گُھن گُھن کرکے کہنا شروع کیا۔ "ہاں جم اب بیان کرو اس وقت میں ضرور سنوں گی۔ دیکھوں کیا قصہ ہے" جم نے بیان کرنا شروع کیا کہ وہ خادمہ جس کو اس نے بوسہ دیا تھا دراصل اُس کی بہن تھی جو کہ ایک جریدہ نگار ہے وہ آج کل کسی چیز کے بارے میں کچھ لکھ رہی ہے اس کے لئے مواد حاصل کرنے کی غرض سے اس نے ہفتے عشرے کے لئے یہ جگہ قبول کرلی ہے —— یہ ایک بڑا راز ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جم نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات کو ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن پگی نے جم کی بات کا اعتبار کر لیا۔

تب پگی نے پھر مجھے پہنا —— بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جم نے پھر مجھے اس کی انگلی میں پہنا دیا اور پگی نے مجھے محبت کے ساتھ بوسہ دیا —— ان دونوں نے بھی حسب سابق کے ایک دوسرے کا بوسۂ شوق لیا۔

سہ شنبہ ۳۰ر جون —— چہارشنبہ ۲۲ جولائی

دعوتوں اور ناچ رنگ کی وجہ سے لکھنے کا موقع نہیں۔

پنجشنبہ ۲۳ر جولائی

حیرت ہوتی ہے کہ ابھی تین ماہ ہوئے جب سے میں نے اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ اُسی زمانہ میں میری نئی زندگی کا آغاز ہوا اور آج اس کا خاتمہ بھی ہوگیا۔ اب سے صرف میرے ذمہ اتنا ہی کام رہ گیا ہے کہ میں خوشنما نظر آیا کروں۔ کیونکہ آج سے پگی نے دوسری انگوٹھی بھی میرے ساتھ پہننا شروع کر دی ہے —— جو کہ سادی سادی اور سونے کی ہے —— اب ہم دونوں اُس کی انگلی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور سب سے بڑی خوشخبری یہ ہے کہ اب جم اور پگی ساتھ ہی ساتھ ایک ہی مکان میں رہنے لگے۔ کیونکہ اب اُن کی شادی ہو چکی ہے۔

ہنسو لوگو ہنسو، خوشیاں منا ؤ

آج کل

پھر دل فریبِ خوردۂ مژگاں ہے آج کل — پھر چشمِ یار شعبدہ ساماں ہے آج کل
پیدا ہیں دل میں پھر وہی اگلی سی وحشتیں — پھر معرضِ خطر میں گریباں ہے آج کل
لعلِ شکر فروش کی پھر ہیں حکایتیں — پھر ذکرِ خوبیٔ رُخِ تاباں ہے آج کل
پھر سر میں کوئے یار کا سودا ہے اِندنوں — پھر دل میں شمعِ عشق فروزاں ہے آج کل
پھر آگ سی لگی ہے دلِ دردمند میں — پھر حُسنِ یار شعلہ بداماں ہے آج کل
ہر ذرّہ پھر ہے روکشِ خورشید اِن دنوں — ہر خار پھر جوابِ گلستاں ہے آج کل
پھر پیچ و خم ہے موجِ ہوا میں بہار سے — پھر کشمکش میں زلفِ پریشاں ہے آج کل

پھر سینۂ اثر میں ہے طوفانِ شوقِ مرگ

عورت

عطاء اللہ پالوی

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ نظارہ کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

یوں تو جمالیاتی ذوق سے کوئی ذی رُوح ہستی اور دنیا کی کوئی شے خالی نہیں۔ مگر سب سے زیادہ یہ ذوق شعرا میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ "شاعر" قدرت کی طرف سے ایک حساس دل، ایک نکتہ شناس دماغ اور ایک جدت پسند طبیعت لے کر عالم وجود میں آتا ہے، اُسے قدرت کے تمام کرشمے، فطرت کے تمام مشاہدات اور صانعِ مطلق کے تمام صنائع بے پردہ نظر آتے ہیں۔ اُس کی آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو عوام نہیں دیکھ سکتے، اور اُس کا دل وہ محسوس کرتا ہے جس کے احساس سے عام طبائع مجبور ہیں۔

"شاعر" اک ایسا شخص ہے جسے فطرت کے سارے حسین مناظر قدرت کے سارے لطیف مشاہدات اور صانعِ مطلق کے سارے دلکش مظاہر انتہائی گرویدگی کے ساتھ پکارتے ہیں کہ

اِدھر آ رے مرے شاعر اِدھر آ

اور "شاعر" ہی ایک ایسا شخص ہے جس کے آستانِ نیاز پر قدرت کی ساری گلکاریاں فطرت کی ساری خوشنمائیاں اور دنیا کی ساری نیرنگیاں سربسجود نظر آتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں "شاعر" اُسی شے کو منتخب کرے گا جو اعلیٰ درجے کی ہوگی وہ اُسی لطیف عنصر کی طرف رجوع ہوگا جو حسین ترین ہوگی، اور اُسی چیز کو شرفِ قبولیت بخشے گا، جو قدرت کی صناعی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوگا۔ چنانچہ جب ہم شاعر کے ذوقِ انتخاب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "عورت" ہی ایک ایسی چیز ہے جو شاعر کے نزدیک قدرت کی سب سے بڑی صنعت تسلیم کی جاتی ہے، اور "عورت" ہی وہ حسین کرشمہ ہے جس نے ساری زبانوں کے شعراء کو کلیتاً اپنی جانب کھینچا ہے جس "زبان" کو دیکھئے "عورت" کی ثناخوانیوں میں اُس کے دفتر کے دفتر سیاہ نظر آتے ہیں اور جس "شاعر" کو دیکھئے "عورت" کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "عورت" ہے بھی ایسی ہی شے، وہ نہ صرف باغبانِ حقیقی کی گلکاریوں کا اعلیٰ ترین نمونہ اور فطرت کی بے پناہ رنگینیوں کا حسین ترین مجموعہ ہے بلکہ "عورت" ایک آواز ہے شیریں و سحر آگیں، ایک بربط ہے، پُرکیف و پُرجوش اور ایک نغمہ ہے مسرور و مسحورکُن، پھر ایسی صورت میں ایک "شاعر" اُسے کس طرح نظرانداز کر سکتا ہے؟

یوں تو دنیا کی تمام زبانوں میں اس عنوان پر طبع آزمائیاں کی گئی ہیں، لیکن اِس لطیف موضوع پر عربی زبان نے جس قدر مواد فراہم کیا ہے، وہ یکجائی طور پر دوسری کل زبانوں سے زیادہ ہے اور شعرائے عرب نے اسی عنوان کے ماتحت فصاحت و بلاغت کے جو دریا بہائے ہیں اُن کا مقابلہ یورپ اور ایران کی ادبیات بھی نہیں کر سکتیں، ایسی صورت میں اردو زبان کا کیا ذکر جو بیچاری ابھی اپنے ابتدائی منازل بھی طے نہیں کر چکی ہے! اور اس زبان

کے شعراء کا کیا شمار جو ابھی اس میدان میں طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں؛ پھر بھی اگر تلاش و جستجو اور غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس زبان میں بھی اس عنوان پر ایسی نظمیں ملیں گی جن میں ادب کی چاشنی، زبان کا لطف تشبیہات کی جدّت اور استعارات کا انوکھا پن بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، اور جن کی لطافتیں بھی دوسری زبانوں کی پاکیزگیوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ذیل کی سطروں میں اُن چند نظموں پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے۔ جو "عورت" جیسے لطیف موضوع پر سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک مختلف کتب و رسائل میں شائع ہوئی ہیں اور جن میں ہر شاعر نے اپنی صلاحیت، حسنِ بیان، ذوقِ نظر اور جدّت پسند طبیعت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ ہمیں اپنے شعراء کی رنگین طبیعتوں کا پتہ چلے گا بلکہ یہ یکجائیت ان شوخ طبیعتوں کو بھی مدد پہونچائے گی، جو اس عنوان پر کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہی ہیں یا کریں گی، کیونکہ سر اقبال کا خیال ہے کہ ؎

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد (ضربِ کلیم)

سنہ ۱۹۳۱ء میں جناب سید شاہ منظور الرحمٰن صاحب اختر کاکوری کی ایک نظم "جنسِ لطیف" کے عنوان سے رسالہ ندیم (گیا) اکتوبر نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم دس بند یا تیس اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں "عورت" کی انفرادی و اجتماعی توصیف قابلِ صد ستائش ہے، فرماتے ہیں۔

اے گل و گلزارِ خوبی، مایۂ شوق و اُمید ۔۔۔ مخزنِ عیش و طرب، گنجِ مسرت کی کلید
تیرے باعث شامِ غم اپنی نظر میں صبحِ عید ۔۔۔ ہے دلِ زاہد بھی تیری تیغِ ابرو کا شہید
جب کہ تیری ذات ہے وجہِ قرارِ زندگی
دُور ہو جائے نہ کیوں پھر انتشارِ زندگی

دو جہاں میں بھی اک سامانِ راحت تجھ سے ہے[۱] ۔۔۔ غم میں بھی نظارۂ عیش و مسرت تجھ سے ہے
رنج تجھ سے دُور ہے کافورِ کلفت تجھ سے ہے ۔۔۔ الغرض اس عالمِ ہستی میں عشرت تجھ سے ہے
تیری ہستی مرہمِ زخمِ دلِ رنجور ہے
دیکھ کر تجھ کو تمنا دل سے دل معمور ہے

پیکرِ مہر و وفا گہوارۂ عصمت ہے تو ۔۔۔ موجبِ تفریحِ خاطر، باعثِ راحت ہے تو
حاملِ عزت ہے تو، سرمایۂ نعمت ہے تو ۔۔۔ تیرے آگے دولتیں سب ہیچ، وہ دولت ہے تو
زندگی تیری کتابِ عمر کی تفسیر ہے
مختصر یہ ہے کہ تو اک بولتی تصویر ہے

تیرا گیسوئے سیہ ہے یا شبِ دیجور ہے ۔۔۔ ہے جبینِ نور افشاں، یا کہ برقِ طور ہے
ساعدِ سیمیں ترا ظالم عجب پُرنور ہے ۔۔۔ سچ یہ ہے انساں نہیں ہے بلکہ تو اک حور ہے
چشمِ شوخی ریز وجہِ گردشِ لیل و نہار
عارضِ پُرنور، شانِ قدرتِ پروردگار

لعلِ لب تیرا عجب دلچسپ و فرحت خیز ہے ۔۔۔ گوہرِ دنداں ترا ظالم تبسم ریز ہے
اُف یہ مستانہ خرامی تیری حشر انگیز ہے ۔۔۔ توسنِ ارماں کے حق میں یہ بھی اک مہمیز ہے
قامتِ رعنا تری نظارۂ عشرت فروز
صورتِ زیبا تری سرمایۂ راحت فروز

دشنۂ ابرو ترا اک خنجرِ سر تیز ہے ۔۔۔ خندۂ راحت فزا تیرا عجب گلریز ہے
شرم سے منہ کا چھپانا تیرا معنی خیز ہے ۔۔۔ جو ادا ہے الغرض تیری نشاط انگیز ہے
دیکھنا تیرا وہ مُڑ مُڑ کر عجب انداز سے
کون بچ سکتا ہے اِس تیغِ نگاہِ ناز سے

خاک کا پُتلا نہیں ہے تو سراپا نُور ہے ۔۔۔ جلوہ اُفگن گھر میں ہر سو مثلِ شمعِ طور[۲] ہے
ظاہرا جلوہ ترا پردے میں گو مستور ہے ۔۔۔ پھر بھی تو ناز و ادا سے سر بسر معمور ہے
دہر میں پھیلی ہوئی ساری تری تنویر ہے
تیرے ہی دم سے مکمل زیست کی تعمیر ہے

تیری خاموشی میں پنہاں شوخیٔ تقریر ہے ۔۔۔ اور نگاہِ ناز پرور میں عجب تاثیر ہے
ہے یہ پیکانِ نظر تیرا کہ پیکِ تیر ہے ۔۔۔ گیسوئے پُرپیچ ہے یا حلقۂ زنجیر ہے
ہے سراپا تیرا ہمرنگِ سراپائے پری
آفتِ جانِ دو عالم ہے تری عشوہ گری

مظہرِ اسرارِ قدرت، مصدرِ رازِ وجود ۔۔۔ ہستیٔ بے مثل سے تیری مسرت کی نمود
دیکھ کر تجھکو جبیں اپنی ہوئی وقفِ سجود ۔۔۔ اور زبانِ شوق پر جاری ہوا شغلِ درود
دم بخود ہیں کُل ملائک تیری صورت دیکھ کر
دستِ قدرت خود ہے نازاں تیری خلقت دیکھکر

---

[۱] یہ مصرع باوجود کوشش کے بھی سمجھ میں نہ آیا۔ (عطاء اللہ)

[۲] عمر کی مستقل روشنی کو شمع طور کہہ سکتے ہیں یا نہیں، یہ محل نظر ہے۔ عطاء اللہ

اک نظر تیری پڑی جس پر وہ بسمل ہو گیا ایک عالم خنجر ابرو سے گھائل ہو گیا

حُسنِ زیبا پر ترے اخترؔ بھی مائل ہو گیا نو اسیرِ دامِ گیسوئے طائرِ دل ہو گیا

باعثِ تخریبِ ایماں نوجوانی ہے تری

رہزنِ عقل و خرد جادو بیانی ہے تری

اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں "عورت" کے ہر حسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر عضو کی ثنا خوانی کی گئی ہے اور ہر ادا پر بحث کی گئی ہے، نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "عورت" کا وجود نہ صرف مردوں کے لئے سرمایۂ راحت ہے بلکہ نظامِ دنیا میں بھی اُس کو کافی دخل ہے، چنانچہ ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چشم شوخی ریز، وجہِ گردشِ لیل و نہار

یعنی دنیا کی رفتار اور گردشِ لیل و نہار کا دارُ مدار "عورت" کی گردشِ چشم پر ہے اگر اُس کی آنکھ ساکن و صامت ہو جائے تو لیل و نہار کا امتیاز اُٹھ جائے اور ظاہر ہے کہ جب نظامِ دنیا میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہ ہوگا یا جس وقت لیل و نہار میں کسی طرح کا کوئی فرق نہ باقی رہے گا۔ اندازہ کیجئے کہ اُس وقت کائنات کی ابتری کا کیا عالم ہوگا؟ راحت و آسائش مفقود، سکون و طمانیت مفلوج اور عیش مسرت مذبوح نظر آئیں گی، اور ایسے موقع پر دنیا کی ہر شے، کائنات کا ہر ذرّہ اور قدرت کی ہر چیز ابتر، پریشان حال اور غیر مربوط ہوگی۔

غرض آنکھ کو "وجہِ گردشِ لیل و نہار" کہنا ایک ایسی اختراع ہے جو اخترؔ صاحب کی غیر معمولی ذہانت طبع ظاہر کرتی ہے۔ چشمِ معشوق کو شعرا نے "ساغر بکف" "بادہ بجام" اور "مینا بدوش" وغیرہ سینکڑوں جگہ کہا ہے، یہاں تک کہ جگرؔ نے گردشِ چشم کو گردشِ جام کہہ کر "وجہِ وحشت و جنون" ہی کہا ہے ؎

ترے چشمِ مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں

یہ تمام ہوش یہ سب جنوں، اسی ایک گردشِ جام سے

اور ذکی صاحب نے گردشِ چرخ کو گردشِ ساغر سمجھا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ

مست ہیں بادۂ تسلیم و رضا سے ہم رند

گردشِ چرخ کو بھی گردشِ ساغر جانا

لیکن آنکھ کی گردش کو "وجہِ گردشِ لیل و نہار" کسی نے نہیں کہا ہے، اخترؔ صاحب کی یہ جدت ہر طرح قابلِ قبول اور بہر صورت لائقِ ستائش ہے، ساتھ ہی ساتھ نظم میں چند قابلِ اعتراض مقامات بھی ہیں۔ اخترؔ صاحب نے

چوتھے اور پانچویں بند میں "عورت" کو "ظالم" کہہ کر خطاب کیا ہے، حالانکہ شاعرانہ اصطلاح میں "ظالم" معشوق کو کہا جاتا ہے، اور یہ نظم "معشوق" سے نہیں، بلکہ "عورت" سے متعلق ہے، اس میں عاشق و معشوق کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دوسرے جس ہستی کو بندِ ماقبل میں "پیکرِ مہر و وفا" کہا گیا ہے، اُسی ہستی کو اس جگہ "ظالم" کہا جا رہا ہے۔ یہ عجیب طرح کی بات ہے، ایک ہی ہستی متضاد صفات کی حامل نہیں ہو سکتی، جہاں تک "عورت" کی صفات کا تعلق ہے میرا خیال یہ ہے کہ "عورت" صرف "پیکرِ مہر و وفا" ہے اور اُس کی تعریف میں اُس کو "ظالم" کہنا اُس کی تعریف نہیں بلکہ ہجو کرنا ہے۔ اسی طرح اخترؔ صاحب کا ایک شعر ہے ؎

قامتِ رعنا تری نظّارۂ عشرت فروز

صورتِ زیبا تری سرمایۂ راحت فروز

اس شعر میں "قامت" کو مؤنث استعمال کیا گیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ انیسؔ اور ناسخؔ نے "مؤنث" بھی لکھا ہے، اس لئے اِسے غلط نہیں کہہ سکتے لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ فصاحت "قامت" کو مذکر ہی استعمال کرنے میں ہے۔

اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں "صورتِ زیبا" کو "سرمایۂ راحت فروز" کہا گیا ہے جو میرے نزدیک درست نہیں، کیونکہ "صورتِ زیبا" کو یا تو "سرمایۂ راحت" کہہ سکتے ہیں یا صرف "راحت فروز"

بہر کیف اخترؔ صاحب کی فروگذاشتیں محاسن کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، اور اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم کامیاب اور اخترؔ صاحب کی کاوشیں لائقِ ستائش ہیں۔

[illegible] میں جناب علی اختر، اخترؔ (حیدرآباد دکن) کی ایک نظم رسالہ ساقی (دہلی) مارچ نمبر میں شائع ہو کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہے، اس نظم کا عنوان "عورت" ہے، اور اس میں اخترؔ صاحب نے دکھایا ہے کہ قبل تخلیقِ عورت کائنات کی بے رونقی کا کیا عالم تھا۔ اُس کی ساری چیزیں کس طرح وجودِ عورت کے لئے پریشان تھیں، اور پھر کس طرح "عورت" کی تخلیق عمل میں آئی، فرماتے ہیں

مطربِ فطرت نے جب چھیڑا سرودِ کائنات خاک کی نبضوں میں رقصاں ہو چکا خونِ حیات

ذرہ ذرہ اپنی قسمت کا خزانہ پا گیا ابرِ بخشش گھر کے اُٹھا اور فضا پر چھا گیا

قدسیوں نے بھی نہ جن رازوں کا پایا تھا سراغ اُن سے روشن کی گئی آدم کی قندیلِ حیات

خاک کی دُھندلی جبیں سے پھوٹ کر بہنے لگے غیرتِ صد کوثر و تسنیم چشمے نور کے

اپنے خال و خد کی رعنائی پہ اترانے لگی
کائنات اقصائے مہر و مہ کو شرمانے لگی

لیکن اب بھی گرچہ دنیا تھی جمالستانِ مدح
کانپتی تھی حسن کے سینے میں اک تاریک موج

چھا رہا تھا قصرِ بیداری پہ ہلکا سا دھواں
یہ فضائے نور تھی اور خواب کا سا اک گماں

قلب کو تڑپا رہا تھا گرچہ مطرب کا شباب
گو کھلے نغموں سے تھا لبریز ہر تارِ رباب

جام میں تھی لرزشِ صہبا سے اک مستانہ روح
روح میں چونکا نہ تھا لیکن ابھی کیفِ صبوح

عشق کی نرم آنچ کے طالب تھے اجزائے شہود
برف کے سینے کی خنکی قلبِ آہن کا جمود

قلزمِ ہستی کی یہ بے چین موجیں دیکھ کر
پا گئی اس راز کو صانعِ فطرت کی نظر

اور اک پیکر بنایا دل پذیر و تابناک
جس کی رعنائی سے روشن ہو گئی تعمیرِ خاک

پھول کی نرمی عطا کی، اُس کو غنچوں کی ہنسی
چاندنی کی سی لطافت، صبح کی سی زندگی

پھول سی آنکھیں اور اُن میں حسنِ عصمت کی ضیا
مسکراتی لوحِ پیشانی، دلِ دردآشنا

پنکھڑی سے لب، لبوں میں وہ تبسم جلوہ بار
قدسیوں کے حسن کی پاکیزگی جس پر نثار

لحن میں لحنوں کی شیرینی، نظر میں اہتزاز
بات میں نورس شگوفوں کی لچک، دل میں گداز

صبر کی خو، درد کا احساس، عزمِ مستقل
بے زبانی، بے ریا اخلاص، اک خود دار دل

لذتِ احساں، شعارِ اعتنا، شانِ کرم
دوسروں کو انبساط، روح خود فانوسِ غم

نغمہ پرورِ شب کی خاموشی، جمالِ شب فروز
شمع کی رخِ پر تجلی، دل میں پروانے کا سوز

سرمدی پھولوں کا تاج اک فرق پر رکھا گیا
اور اسے دنیا میں "عورت" کا لقب بخشا گیا

سبحان اللہ یہ ہے اک حقیقت شناس کا نظریہ، اور یہ ہے اک شاعر کے تخیل کی رنگینی اس نظم کا کمال یہ ہے کہ اس میں جہاں "عورت" کی تخلیق و تعمیر کے اسرار و اشکال منکشف کئے گئے ہیں۔ وہاں انوکھے طرزِ ادا سے نظم میں الوہیت و بداہت بھی پیدا کی گئی ہے، جہاں "عورت" کے کل محاسن اختصار اور دلکشی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں نظم میں ادب کے جواہر پارے بھی بکھیرے گئے ہیں، حضرتِ اختر نے بتایا ہے کہ اگر دنیا میں "عورت" کا وجود نہ ہوتا تو ساری کائنات غیر خوشگوار اور اس کی تمام دلچسپیاں پھیکی اور بے مزہ ہوتیں، اور جس وقت تک اس کا وجود نہ تھا، ہر چیز پر ایک افسردگی، ایک پژمردگی اور ایک اضمحلال مسلط تھا، آخر صانعِ عالم نے اس راز کو سمجھا، اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس کمی کا اعتراف کیا، یہاں تک کہ "عورت" کا وجود تخلیق کیا گیا، مگر اس طرح نہیں

جس طرح ساری دنیا ایک لفظِ "کن" سے پیدا کی گئی، بلکہ "عورت" کی تخلیق میں اس قادرِ مطلق کو بڑے بڑے اسباب فراہم کرنے پڑے۔ پھول کی نرمی، چاندنی کی لطافت، غنچوں کی ہنسی، پروانے کا سوز اور صبح کی تازگی، غرض کل مظاہرات قدرت کے لطیف اجزا، کل برگزیدہ اشیاء کے بہترین عناصر اور کل حسین تصورات کے باریک خد و خال بہم پہونچائے گئے۔ انھیں کوثر و تسنیم اور مار مین سے خمیر کر کے نور کے سانچے میں ڈھالا گیا، تب جا کر کہیں وہ چیز تیار ہوئی جسے "عورت" کہا جاتا ہے، اور جس کے متعلق حضرتِ اختر کاکوی نے فرمایا ہے کہ ؎

دم بخود ہیں کل ملائک تیری صورت دیکھ کر
دستِ قدرت خود ہے نازاں تیری خلقت دیکھ کر

ورنہ اگر یہ نازک ہستی لفظِ "کن" سے بنائی جاتی تو پھر اس میں نہ کوئی جاذبیت ہوتی اور نہ لطافت، نہ سحر آگین ہوتی اور نہ نزاکت، نہ کوئی کشش ہوتی اور نہ نفاست۔

بہرکیف یہ نظم اپنی خصوصیات کی وجہ سے لائقِ صد قدر ... اختر کی کاوشیں قابلِ صد ستائش ہیں، نیز اُن کی یہ نظم کیا بلحاظ لطافت و رنگینی اور کیا بلحاظِ الفاظ و معانی جناب اختر کاکوی کی نظم پر بہرحال فوقیت رکھتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں جناب سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی کی ایک نظم بعنوان "عورت" رسالہ ندیم (گیا) مارچ نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم گیارہ اشعار کی حامل ہے اور جناب رسا اس نظم میں باندازِ نو جلوہ گر ہوئے ہیں، فرماتے ہیں:

قسم اُس شرم کی جو پارسا عورت کی فطرت ہے
قسم اُس حسنِ دلکش کی نگہباں جس کی عصمت ہے

قسم اُس رخ کی جس پر چودھویں کا چاند ہو صدقے
قسم اُس زلف کی جس کی سیاہی شامِ عشرت ہے

قسم اُن آنکھوں کی اعجاز بھی ہو سحر بھی جن میں
قسم اُس جبینِ ابرو کی جو شمشیرِ محبت ہے

قسم اُن پھول سے خوش رنگ گورے گورے گالوں کی
گلابی رنگ بھی ہے بار جن پر وہ نزاکت ہے

قسم اُن سرخ نازک ہونٹوں کے موجِ تبسم کی
کہ جس میں بجلیاں ہیں، حسن ہے، پیغامِ الفت ہے

قسم اُس شہد سے شیریں رسیلی نرم بولی کی
بھری جس میں محبت ہے، شرافت ہے، صداقت ہے

قسم اُس نازکی جس ناز پہ ہے بانکپن قرباں
قسم اُس چال کی جس چال پر صدقے قیامت ہے

قسم اُس سادگی کی، ہے بناؤ فطرتی جس میں
قسم اُس نازکی کی جو کہ خود جانِ نزاکت ہے

قسم اُس چارہ سازی کی جو ہے رشکِ مسیحائی
قسم اُس دلدہی کی جو شریکِ رنج و راحت ہے

قسم اُس آہ کی جو ہے الف افسانۂ دل کا
قسم اُس اشک کی جو جانِ صد کانِ الفت ہے

قسم اُس سوز کی جو شمع ہے بزم محبت کی
کہ "عورت" ایسی شے ہے جس سے دنیا رشکِ جنت ہے

جناب رسا کی یہ نظم معمولی درجے کی ہے اس میں کوئی جدت، کوئی اختراع اور کوئی رنگینی نہیں، "عورت" کی ہر خصوصیات کا قسم کھا کھا کر تذکرہ کرتے ہوئے صرف یہ کہنا کہ "عورت ایسی شے ہے جس سے دنیا رشکِ جنت ہے" کافی نہیں، دنیا کا کوئی موضوع، کوئی خیال اور کوئی نظریہ دنیائے شاعری میں ایسا نہیں جس پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ مگر اس کے جانتے ہوئے بھی ہم شعراء کے دواوین کی ورق گردانی کیوں کرتے ہیں؟ محض اس لئے کہ "شاعر" نے کس فرسودہ مضمون، کس پامال خیال اور کس معمولی بات کو کس طرح اپنے نئے انداز، انوکھے طرز اور جدید اصطلاحات کے تحت پیش کیا ہے، ایسی صورت میں اگر وہی فرسودہ اور پامال طرز اختیار کیا گیا جو صدیوں سے دیکھا جا رہا ہے تو پھر نئی اور پُرانی روشنی میں فرق ہی کیا ہوا؟ پھر بھی اس نظم میں چند معنوی محاسن اور معائب ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

رسا صاحب کا ایک مصرع ہے۔

قسم اُس سادگی کی، ہے بناؤ فطرتی جس میں

اس مصرع میں جس سادگی کا ذکر کیا گیا ہے وہ بذاتِ خود اپنی سادگی کے لحاظ سے لائقِ ستائش ہے۔ فرماتے ہیں کہ "عورت" کی سادگی، سادگی نہیں ہے بلکہ دراصل وہ ایک ایسا بناؤ ہے جس پر سینکڑوں آرائشیں، ہزاروں زیبائشیں اور لاکھوں بناؤ سنگھار قربان ہے، اور ثبوت میں یہ دیکھو کہ "چاند" ہر طرح کی زیبائشوں سے بے نیاز ہونے کے باوجود کتنا حسین نظر آتا ہے؟ مگر یہ بھی جان لو کہ "عورت" کا چہرہ چاند سے بھی زیادہ خوبصورت ہے، اور اُس کا ثبوت یہ ہے کہ چاند خود اُس کے چہرے پر صدقہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک مصرع ہے ؎

قسم اُس اشک کی جو مایۂ صد کانِ الفت ہے

اس جگہ رسا صاحب نے "عورت" کے اُس سب سے بڑے حربے، اُس سب سے ضروری عنصر اور اُس سب سے زبردست طاقت کا اظہار کیا ہے جسے "اشک" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ "عورت" کی برترین خصوصیات "اشک" اور "رشک" ہیں، اور "عورت" کے تذکرے میں انھیں فراموش کر دینا بڑی سخت غلطی ہے اور میں کہوں گا کہ بجز رسا صاحب کے اور کسی شاعر نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔

اب آیئے معائب کی طرف، رسا صاحب کا ایک مصرع ہے

قسم اُس حسنِ دلکش کی نگہباں جس کی عصمت ہے

شاعر نے اس مصرعے میں "عصمت" کو "حسن" کی نگہبان کہا ہے، حالانکہ تمام شعراء نے "حسن" کو "عصمت" کا نگہبان قرار دیا ہے۔ یہ صدائے احتجاج جو خلافِ جمہور بلند کی گئی ہے، ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ قبول ہے۔

دوسرا مصرع ہے،

قسم اُس زلف کی جس کی سیاہی شامِ عشرت ہے

اس مصرع میں "شامِ عشرت" بمعنی "صبحِ عشرت" استعمال کیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے، کیونکہ "شامِ عشرت" بمعنی "زوالِ عشرت" استعمال کیا جاتا ہے، اور زُلف کی تعریف میں یہ کہنا کہ اُس کی سیاہی "شامِ عشرت" ہے، تعریف نہیں بلکہ ہجو ہے۔

۱۹۳۴ء میں علامہ عاشق حسین صاحب سیماب اکبر آبادی کی ایک نظم اُن کے مجموعۂ کلام "کار امروز" میں "رنگین تیتری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، یہ ایک مختصر سی رنگین نظم ہے اور اس میں "عورت" کے فرسودہ لفظ کو ترک کرکے اُس کا نعم البدل "رنگین تیتری" تجویز کیا گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم اپنی جگہ خود "رنگین تیتری" ہے۔ ملاحظہ ہو۔

راتیں لبانیوالی، دن جگمگانے والی　　تکلیف سہنے والی اور مسکرانے والی
اپنے ہی خاص گُل پر قربان ہونے والی　　اپنے ہی رنگ و بُو سے حیران ہونے والی
عصمت کے گلکدے میں پابندِ دستِ محرم　　اُڑنے لگے تو نکہت، گرنے لگے تو شبنم
دامانِ گل سے مستی بن کر اُلجھنے والی　　اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی
نازک سی موجِ رقصاں، رنگین سی ایک بجلی　　مہکا ہوا سا شعلہ، دہکی ہوئی سی مستی
لرزاں سا اک ستارہ، رخشاں سا ایک جگنو　　پربستہ ایک کوئل، محرومِ رم اک آہو
جذبات کی فضا میں اک ذرۂ پریدہ　　رنگوں کے ارتقا میں اک نقش برگزیدہ
کاہیدہ سا ترنم، خوابیدہ سا ترانہ　　پُر جوش کیفِ بادہ، خاموش اک فسانہ

صد رنگ پھول جس میں مردوں کی زندگی ہے
عورت اُسی چمن کی رنگین تیتری ہے

اس نظم کے متعلق سیماب صاحب کے ایک شاگرد جناب فضل الدین صاحب آثر نے ایک تنقیدی مقالہ بھی تحریر فرمایا ہے، جو دو بار دو مختلف رسالوں میں بلا تغیر و تبدل شائع ہوا ہے۔

اس مضمون میں صاحب موصوف نے دو باتوں پر بہت زور دیا ہے، ایک یہ کہ یہ نظم چند لمحوں میں برجستہ کہی گئی ہے، دوسرے یہ کہ

"تیتری عورت ہے" یا "عورت تیتری ہے" اس کی معنوی لذت عمر بھر محسوس کئے جایئے اور پھر بھی تشنہ رہیے لیکن ایک کی فطرت کا دوسرے پر اس قدر صحیح اطلاق ——
غور فرمایئے کیا انتہائی کمال نہیں؟ تصور کیجئے، ایک تیتری اُڑتی ہوئی ایک پھول کے قریب آتی ہے۔ طواف کرتے کرتے پتی پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن ایک لمحے کے بعد چونک کر اُڑ جاتی ہے، اور پھر وہیں آ بیٹھتی ہے"

اس کے بعد اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ

"جب بھی اس نظم کا خیال آتا ہے، ایک رنگین تیتری کی ایک نوزائیدہ پھول کے طواف میں محوسرور میرے تصور میں تڑپنے لگتی ہے"

اول تو ایک حقیقی شاعر کے لئے نُو شعر کی ایک مختصر نظم برجستہ کہہ دینی کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیونکہ وہ اس سے دس گنی طویل نظم کہہ سکتا ہے، دوسرے اس کارنامے پر ایک شاگرد کے قلم سے اظہار افتخار مستحسن نہیں، کیونکہ اس طرح کے افتخارات مبالغہ تصور کئے جاتے ہیں۔

رہی یہ چیز کہ اس نظم کا اطلاق واقعی "رنگین تیتری" پر بھی ہوتا ہے یا نہیں، تو اس سلسلے میں التماس یہ ہے کہ آثر صاحب بذات خاص جو چاہیں خیال فرمائیں، لیکن غور کرنے پر یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے، اس نظم کا اطلاق کبھی اور کسی حالت میں بھی ایک "تیتری" پر نہیں ہوسکتا۔ "رنگین تیتری" سے مراد "عورت" اور صرف "عورت" ہے، ورنہ ذیل کے مصرعے ردّی ہیں۔

(۱) عصمت کے گلکدے میں پابند دست محرم
(۲) پربستہ ایک کوئل، محروم رم اک آہو
(۳) کابیدہ سا ترنم، خوابیدہ سا ترانہ
(۴) اپنے ہی خاص گل پر قربان ہونے والی
(۵) پُرجوش کیفِ بادہ، خاموش اک فسانہ

ان سب کے علاوہ جب علامہ نیاز فتحپوری صاحب نے اس نظم کے عنوان "رنگین تیتری" کو حقیقتاً ایک رنگین تیتری قرار دے کر سیماب صاحب کے اس مصرعے پر کہ

اپنے ہی خاص گل پر قربان ہونے والی

یہ اعتراض کیا تھا کہ "اس مصرع کا پہلا ٹکڑا بالکل بے معنی ہے کیونکہ تیتری کا کوئی گل مخصوص نہیں"

اُس وقت خود حضرت آثر نے جواب دیا تھا کہ

"نظم میں تیتری کی مثال دے کر مشرقی عورت اور بالخصوص ہندوستانی اور مسلمان عورت کا کردار پیش کیا گیا ہے نظم دراصل "تیتری" پر نہیں ہے، بلکہ موضوع نظم "عورت" ہے۔ جس کو نظم کا آخری مصرع صاف ظاہر کر رہا ہے کہ

"عورت اُسی چمن کی رنگین تیتری ہے"

اسی طرح جب اس مصرعے پر کہ

پربستہ ایک کوئل محروم رم اک آہو

نیاز صاحب نے اعتراض کیا تھا کہ

"تیتری کو پربستہ اور محروم رم کہنا جب کہ وہ ہر وقت پرّاں نظر آتی ہے، کسی طرح درست نہیں ہوسکتا"

اُس وقت آثر صاحب نے فرمایا تھا کہ

"اجی حضرت یہ تشبیہات "عورت" کے کردار سے وابستہ ہیں۔ "تیتری" تو موضوع مجازی ہے، نظم عورت پر ہے عورت پر"

بہرکیف ان منتخبات سے ظاہر ہے کہ حضرت آثر خود مقر ہیں کہ یہ نظم عورت پر ہے، اور درحقیقت اسے "رنگین تیتری" سے کوئی واسطہ نہیں، ایسی صورت میں اُن کا یہ قول از خود غلط ہو جاتا ہے کہ

"ایک کی فطرت کا دوسرے پر اس قدر صحیح اطلاق، غور فرمایئے کیا انتہائی کمال نہیں؟"

یوں تو "عورت" کے لطیف عنوان پر بیشتر نظمیں موجود ہیں، اور آئندہ

بھی کہی جائیں گی۔ لیکن اس نظم میں سیماب صاحب نے جو اعجاز دکھایا ہے وہ نہ تو اب تک کسی شاعر نے دکھایا اور نہ آئندہ اس کا قرینہ ہے، ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ اپنے اندر معنویت کی ایک دنیا پنہاں رکھتا ہے۔ ایک ایک ترکیب اچھوتی، ایک ایک تشبیہ نادر اور ایک ایک مصرع مایۂ صد کانِ معانی ہے۔ اس نظم میں جدید تمثیلات اور حسین تشبیہات کے ذریعے مشرقی "عورت" کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ مستغنی از تحسین و آفرین ہے۔

(۱) تکلیف سہنے والی اور مسکرانے والی

کس قدر سچی اور کھلی ہوئی حقیقت ہے اور کس طرح ایک "عورت" کا صحیح کردار پیش کیا گیا ہے؟

جناب علی اختر کا مصرع

دوسروں کو انبساط، روح خود دمانوسِ غم

اور اختر کاکوی کا مصرع

غم میں بھی نظارۂ عیش و مسرت تجھ سے ہے

اسی معنی میں ہے، مگر جو سلوریت، شیرینیت اور سحوریت سیماب صاحب کے مصرع میں ہے وہ (۱) دونوں میں کہاں؟

(۲) عصمت کے گلکدے میں پابندِ دستِ محرم

اور

اپنے ہی خاص گل پر قربان ہونے والی

ہم معنی مصرعے ہیں۔ اور اظہارِ کمال میں ایک ہی خیال کو دو طریقے سے ادا کیا گیا ہے۔ مگر انصاف سے کہئے کہ یہ دونوں مصرعے ایک "عورت" کی عصمت آبی کی کس قدر عمدہ تفسیر ہیں! باوجودیکہ ذیل کے مصرعے

(۱) پیکرِ مہر و وفا گہوارۂ عصمت ہے تو (اختر کاکوی)

(۲) پھول سی آنکھیں اور آئینِ حسنِ عصمت کی ضیا (علی اختر)

(۳) قسم اُس شرم کی جو پارسا عورت کی فطرت ہے (رسا)

اسی معنی میں ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رنگینی، پرکاری اور رفتارگی جو سیماب صاحب کے مصرعے میں ہے، وہ ان میں سے اجمالی یا انفرادی طور پر کسی میں بھی نہیں۔

(۳) اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی

بلاشبہ ایک مشرقی خاتون کے ماحول کی ایسی سچی تعریف ہے جو کسی دوسرے شاعر کے کلام میں اس خوبصورتی، اس جاذبیت اور اس صفائی کے ساتھ نظم میں ہوئی ہے۔ عورت کی تعریف ان الفاظ میں کہ

نازک سی موجِ رقصاں، رنگین سی ایک بجلی — مہکا ہوا سا شعلہ، دبکی ہوئی سی مستی
لرزاں سا اک ستارہ، رخشاں سا ایک جگنو — پر بستہ ایک کوئل، محرومِ رم اک آہو
کابیدہ سا ترنم، خوابیدہ سا ترانہ — پرجوش کیفِ بادہ، خاموش اک فسانہ

حقیقتاً ایک الہام ہے، ایک ایک تشبیہ مفقود المثال، ایک ایک تمثیل عدیم النظیر اور ایک ایک ترکیب صحیح الذوقی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ہے تو یہ ایک مختصر سی نظم، لیکن اجمالی طور پر محاکات شاعری کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ ہے جو شاید دوسری زبانوں میں بھی نہ ملے گا۔

متذکرہ بالا تشبیہات میں "مہکا ہوا سا شعلہ اور دبکی ہوئی سی مستی" ایسی تشبیہیں جو بعض کانوں کو انوکھی اور غیر مانوس معلوم ہوں گی۔ اس لئے میں اس جگہ سیماب صاحب کے ایک شاگرد سید احمد عروج کا ایک شعر درج کردیتا ہوں جس میں ان دونوں تشبیہات کو نظم کردیا گیا ہے اور جس سے یہ تشبیہات قرار واقعی سمجھ میں آتی ہیں وہو ہذا ؎

اک "مہکتا ہوا شعلہ" ہے ترا جوشِ شباب
اک "دہکتی ہوئی مستی" ترے انداز میں ہے

۱۹۳۵ء میں جناب صدیار خاں ساغر نظامی کی ایک نظم ان کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" میں "عورت" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ ساغر صاحب مدیرِ ایشیا نے عام متغزلین سے علیحدہ ہو کر اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے، چنانچہ اس عنوان پر بھی ان کی جو نظم شائع ہوئی ہے وہ اُن کے مخصوص رنگ اور خاص طرز میں ہے، فرماتے ہیں۔

عورت ایک پھول ہے جہاں میں
خوشبو میں گلاب سے بھی بڑھکر — مستی میں شراب سے بھی بڑھکر
اُس کی آنکھیں حیا کی کشتی
نظریں اُس کی حسین سمندر
اُس کی باتیں خدا کی ہنسی
اُس کے ہونٹوں پہ کھیلتا ہے — ہلکا ہلکا سا اک تبسم
کچی کلیوں کا بند بند
آوازِ شگفت کا ترنم

نکہت سے نسیم سے بھی بڑھکر   معصوم شمیم سے بھی نازک
عورت اک پھول ہے جہاں میں
خوشبو ہے اُسی کی جسم وجاں میں

عورت اک حُور کی نظر ہے
نیچی نیچی جھکی جھکی سی   مست و مخمور سی رسیلی
سب کو تسکین دینے والی
معصوم ہیں اُس کی سب ادائیں
لیکن دل چھین لینے والی
اُس کی ہستی دلوں کی بستی   اُس سے آباد گھر کی محفل
اُس کی تسخیر بادشاہی
اُس کی تعمیر سب سے مشکل
فطرت کا حسین اک معمہ   قدرت کا لطیف تر عطیہ
عورت اک حُور کی نظر ہے
یا اک جنت زمین پر ہے

عورت رنگین اک کنول ہے
سندر، نازک، حسین، پیارا   ہلکے بادل میں جیسے تارا
احساس کی ایک شمع روشن
اُس کا پیکر وفا کی دُنیا
اُس کی ہستی خوشی کا گلشن
اُس کی پلکوں کی لرزشوں میں   کالے بھوروں کی تھرتھراہٹ
ہیں آنکھ میں ماتا کے آنسو
لب پہ رنگین مسکراہٹ
کیفِ الفت سے مست پیکر
خوشبوئے وفا سے دل معطر
عورت رنگین اک کنول ہے
عشق جاوید کا محل ہے

ساغر صاحب سیماب صاحب کے شاگرد ہیں اور خود سیماب صاحب کی یہی نظم اس مضمون میں شامل ہے۔ مگر لطف دیکھئے کہ ساغر نے شاگرد ہونے کے باوجود اس نظم میں اپنی استادی کا کمال دکھایا ہے، الفاظ تو سادے استعمال کئے ہیں، لیکن شیرینیت کا جادو اس طرح بھر دیا ہے کہ پڑھتے وقت زبان ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتی ہے، بات تو کوئی نئی نہیں ہے، لیکن تمثیلات و تشبیہات ایسی لطیف ہیں کہ جب پڑھئے روح ایک خاص طرح کا انبساط حاصل کرتی ہے۔

(۱)   اُس کی آنکھیں حیا کی کشتی

آنکھ اور کشتی کی مشابہت پر غور کیجئے، کس قدر برجستہ تشبیہ ہے، کیا اسجگہ "مینا بدوش" اور "جام بجام" وغیرہ کی تشبیہہ کھپ سکتی تھی؟ یہ ہے جدید رنگ شاعری اور یہ ہے ساغر کا امتیازی رنگ۔

(۲)   اُس کی باتیں خدا کی بنسی

"بنسی" سے مراد "بانسری" ہے جس کی آواز اتنی میٹھی اور اس قدر کیف آور ہوتی ہے کہ جب، جس وقت اور جتنی دُور سے سُننے دل کھینچ کر وہاں پہونچ جاتا ہے، اب تصور فرمائیے اُس بانسری کا جو خدا کی ہے، کیا اُس کی شیرینیت کا اندازہ ممکن ہے؟

(۳)   عورت ایک حُور کی نظر ہے

حُور کون حُور؟ وہ جس کی تعریف و توصیف میں قرآن مجید گواہ ہے اور جس کی ثنا خوانی میں آیت کی آیت موجود ہے۔ غور کیجئے اس کی آنکھ کا کیا عالم ہوگا؟ وہ کس قدر خمار آگیں اور کس قدر وجد آفریں ہوگی؟ کیا اس سے بڑھکر "عورت" کی تعریف ممکن ہے؟

(۴)   اُس کی ہستی دلوں کی بستی

سیماب صاحب نے عورت کی تعریف میں کہا تھا کہ "راتیں بسانیوالی" اب آپ اس صفت کو ساغر کے مصرع کے مقابلے میں رکھکر دیکھئے، اور بتلایئے کہ استاد اور شاگرد میں کیا فرق ہے؟ سیماب صاحب کا مصرع اُسی وقت تک بلند تھا، جب تک ساغر نے یہ مصرع نہ کہا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ اس وقت اُس کی کیا وقعت ہے۔

(۵)   اُس کی تسخیر بادشاہی

ساغر کہتے ہیں کہ جس "عورت" کو تم معصوم سمجھتے ہو، اُس کا تسخیر کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک سلطنت حاصل کر لینا، اور اگر واقعی تم نے عورت کا دل تسخیر

کرلیا تو گویا ایک بادشاہت حاصل کرلی، اسکا ایک لطیفہ سُنیئے۔

ملک کے مشہور مذاحیہ نگار عظیم بیگ صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ بیوی اور سلطنت کے حصول میں ایک ہی طرح کی دقتیں حائل ہوتی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ سلطنت لڑائی جھگڑے کے بعد حاصل ہوتی ہے، لیکن حاصل ہوجانے کے بعد کوئی قصہ نہیں ہوتا، اور بیوی لڑائی جھگڑے کے بغیر حاصل ہوتی ہے، لیکن حاصل ہونے کے بعد بہت لڑتی ہے۔

(۶) سُندر، نازک، حسین، پیارا
ہلکے بادل میں جیسے تارا

کہاں ہیں پنڈت دیا شنکر کول مصنف گلزارِ نسیم کے وہ ثنا خواں، جن کا دعویٰ تھا کہ دیا شنکر کے اس شعر کا جواب ناممکن ہے!

حق نے دیئے تھے چار فرزند
دانا، عاقل، ذکی، خردمند

آئیں اور دیکھیں کہ جو سلاست و روانگی، لطافت و برجستگی اور نفاست و فرزانگی دیا شنکر کے شعر میں ہے، وہ ساغر کے شعر میں موجود ہے یا نہیں۔

بہر کیف "عورت" کی ثنا خوانی ساغر نے اپنے خاص رنگ میں جس طرح کی ہے وہ اپنی مثال آپ اور اپنی جگہ نایاب ہے۔

۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا تیسرا مجموعۂ کلام "ضربِ کلیم" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں ایک باب بعنوان "عورت" صرف مستورات اور ان کے متعلقات کے لئے وقف ہے، اس باب میں کئی عنوانوں کے ذریعے اقبال نے عورتوں کی موجودہ اور آئندہ زندگی کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات ظاہر کئے ہیں، چنانچہ ایک عنوان کے تحت وہ "عورت" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

اقبال کی نظم نہ تو کوئی مستقل حیثیت رکھتی ہے اور نہ اُنھوں نے اس موضوع پر خاص طور سے قلم اُٹھایا ہے، پھر بھی یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ اقبال نے "عورت" کی جامع تعریف ایک شعر میں اس طرح کر دی ہے کہ اُس کا ایک شعر بڑی بڑی نظموں پر بھاری ہے۔ ورنہ یوں تو بقولِ خود اقبال ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

۱۹۳۶ء میں جناب عبد الغنی صاحب شمس کی ایک نظم "عورت" کے عنوان سے ندیم (گیا) مارچ نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ صاحبِ موصوف نے اس نظم میں عورت کے بچپن، دوشیزگی اور جوانی کا تذکرہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ "عورت" کا وجود بہر حال اپنے اندر جاذبیت، کشش اور سامانِ ربودگی رکھتا ہے، وہ اپنی عمر کے ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے وابستگان کے لئے "نعمت" تصور کی جاتی ہے، اور یہ خصوصیت متاعِ عالم کے صرف اُس شاہکار اور قادرِ مطلق کے صرف اُس مظاہرِ قدرت میں ہے جسے "عورت" کہا جاتا ہے اور بس، چنانچہ فرماتے ہیں۔

تیرا بچپن رُوح افزا، دل فزا، جانِ نشاط / یہ ترا بھولا سراپا اک گلستانِ نشاط
تیرے اُلجھے بال، میلے گال، سامانِ نشاط / باپ اور ماں کی نگاہوں میں تو اک کانِ نشاط
روشنی آنکھوں میں، ٹھنڈک دل میں تیری ذات سے
کیسی شادابی ٹپکتی ہے تری ہر بات سے
عالمِ دوشیزگی تیرا قیامت در کنار / آنکھ میں وہ سُرخ ڈورے وہ جوانی کا خمار
عارضِ رنگین فروغِ حسن لیلائے بہار / مستیوں کی ایک دُنیا ہر قدم پر آشکار
وہ نظر بہکی ہوئی جیسے کسی کی ہو تلاش
رازِ سربستہ وہ ہر اندازِ بیتابی سے فاش
وہ تری معصومیت، وہ بھولا پن محشر بدوش / وہ بلا کی سادگی رخنہ زنِ ایمان و ہوش
وہ خموشی میں تری روپوش بے پایاں خروش / وہ تری باتیں ترنم ریز اور فردوس گوش
ایسی مے ملتی کہاں عالم کے میخانے میں ہے
جیسی تیری نرگسی آنکھوں کے پیمانے میں ہے
وہ نزاکت سے لچکنا اور بل کھانا کبھی / وہ شرارت سے مچلنا اور شرمانا کبھی
ہمسنوں میں وہ ملاریں بیٹھ کر گانا کبھی / دل ہی دل میں سوچ کر کھویا سا ہو جانا کبھی

تن کے بل کھاتے ہوئے انگڑائی لینے کا سماں
سر سے وہ آنچل کا گر پڑنا زمیں پر الاماں
اف جوانی میں تری سفاکیاں ہیں کس قدر — آہ کب بچتا ہے تیرا کشتۂ تیرِ نظر
یہ ترے ابرو نہیں، ہیں بلکہ ہیں تیغ دو سر — جس سے گھائل ہو کے رہتا ہے ہر اک قلب و جگر
کاروانِ دل پہ رہزن بن کے چھا جاتی ہے تو
مثلِ دیوِ مرگ، انسانوں کو کھا جاتی ہے تو
اک بلائے جاں فزا ہے تیری زلفِ عنبریں — غیرتِ لبہائے خنداں، تیرا ہر خطِ جبیں
تیرے مکر و کید کے بھی دام ہیں کتنے حسیں — دیکھ کر خود آ پھنسے ہر طائرِ سدرہ نشیں
کونسا جادو گھڑی بھر میں چلا دیتی ہے تو
ہائے فرزانہ کو دیوانہ بنا دیتی ہے تو

میکدہ بر دوش تو ہے آبروئے میکدہ — تجھ سے وابستہ ہے ساری آرزوئے میکدہ
ہے تجھی پر منحصر یہ ہاؤ ہوئے میکدہ — ہے تو ہی شانہ کشِ زلفِ سبوئے میکدہ
جوش بنکر دل میں ہے، دل بن کے ہر سینے میں ہے
اے پری جلوہ ترا اک ایک آئینے میں ہے

گو یہ ایک ناتمام نظم ہے، مگر پھر بھی جتنی کچھ ہے وہ اپنی رنگینیت کے اعتبار سے اکملیت کا درجہ رکھتی ہے، اور نومشق شاعر مستحق ہمت افزائی ہیں۔

ان نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری اردو زبان میں بھی "عورت" جیسے لطیف عنوان پر اچھی اچھی نظمیں موجود ہیں اور ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اردو زبان کی ترقی کے یہ ہی لیل و نہار رہے تو انشاء اللہ ہم بہت جلد دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہو جائیں گے۔

---

[1] "عورت" جیسے لطیف موضوع پر طبع آزمائی کرتے وقت جذبات بھی لطیف ہونے چاہئیں۔ اس مصرع کی ثقالت نے تو "عورت" کے سارے محاسن پر پانی پھیر دیا اور حال یہ ہے کہ ع
چبھتے ہیں لفظ، ہم یہ لاشیں اٹھا سکتے نہیں۔ (اعلاء اللہ)

خادم خلق

اقوام، جو یہ انجمن آرائے جہاں ہیں — سب وہ ہیں جو یہ دردِ مزدور و کساں ہیں
پہونچاتا ہے دہقان ہی افراد کو روزی — اقوام کے ہر شاد کو ناشاد کو روزی
مزدور ہی کی سعی سے بنیادِ تمدن — بالواسطہ ہے باعثِ ایجادِ تمدن
شائستگی دنیا میں جو آتی ہے نظر آج — تہذیب سے آراستہ ہے نوعِ بشر آج
جاہل کی بدولت ہے نہ عالم کی بدولت — حاصل ہے اسی خلق کے خادم کی بدولت
جو فرض سے اپنے کبھی غافل نہیں ہوتا — تبدیلیٔ ماحول سے بددل نہیں ہوتا
ہو فوج میں، تو سطوتِ شاہی کا محافظ — تعمیلِ اوامر میں نواہی کا محافظ
چھڑ جائے لڑائی تو سپاہی بھی وہی ہے — میدان میں یلغار کو راہی بھی وہی ہے
جو امن میں کرنا ہو سے وہ جنگ میں کرنا — خدمت غرض انسان کی ہر رنگ میں کرنا
باوصف اس ایثار کے ارشد یہ گلہ ہے
مجبورِ مصائب ہے وہ محرومِ صلہ ہے

ارشد تھانوی

رفتار وقت

ادارہ

کنونشن اور وزارتیں

وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ تو کانگریسی حلقوں میں بہت عرصہ سے چھڑا ہوا تھا لیکن اس خیال سے کہ آپس میں کوئی اختلاف رائے پیدا نہو کانگریس نے اس مسئلہ کو معلق کر رکھا تھا اور حامی و مخالف دونوں اپنا اپنا انفرادی پروپگنڈا کر رہے تھے اب جبکہ نئے آئین کے ماتحت انتخابات ختم ہوگئے اور کانگریس کو گیارہ صوبوں میں سے چھ میں خالص اکثریت حاصل ہوگئی تو اسے فیصلہ کرنا پڑا کہ آیا وزارتیں قبول کی جائیں یا نہ کیجائیں۔ چنانچہ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے مارچ میں دہلی میں ایک آل انڈیا کنونشن طلب کیا گیا جس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تمام اراکین اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام کانگریسی ممبر مدعو کئے گئے

کنونشن میں دونوں خیال کے لوگوں نے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ حامیوں کی یہ رائے تھی کہ وزارت قبول کرنے سے کانگریس کے وقار میں اضافہ ہو جائیگا۔ اور مختلف قسم کے تعمیری کام کر کے اپنی قوم کو فائدہ پہونچانے کا موقع ملے گا۔ علاوہ ازیں وزارتوں پر قبضہ کر کے جدید دستور کو زیادہ آسانی سے باطل کیا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مخالفوں کا خیال تھا کہ وزارتیں قبول کرنے سے کانگریس کے وقار کو صدمہ پہونچے گا۔ کیونکہ اس آئین کے ماتحت طرح طرح کی بندشوں کی وجہ سے کوئی معقول کام کیا جا سکتا ہی نہیں پھر جب کانگریسی کوئی اچھا ریکارڈ پیش نہ کر سکیں گے تو تمام الزام انکے سر آئے گا اور وہ مفت میں بدنام ہو جائیں گے نیز یہ کہ اگر اس دستور کو ہمیں توڑنا یا باطل کرنا ہے تو وزارت قبول کر کے نہیں بلکہ انکی مخالفت کر کے ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کو ایک درمیانی راستہ تلاش کر کے دو مخالف فریقوں میں مصالحت کرانے کا بہت زبردست ملکہ حاصل ہے اور اسی ملکہ کی بدولت وہ ہندوستانی سیاست کے نازک ترین مواقع سے بہت آسانی سے گزر جاتے ہیں چنانچہ اس موقع پر انکا یہ تدبر کام آیا اور انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کانگریسیوں کو وزارتیں قبول کرنے کی اجازت دیدی جائے بشرطیکہ ہر صوبہ کا گورنر یہ اطمینان دلائے کہ جب تک وزرا آئین سے باہر قدم نہ رکھیں گے وہ انکے کام میں کسی طرح کی کوئی مداخلت نہ کریگا۔ اور اپنے اختیارات خصوصی استعمال نہ کریگا۔ اس تجویز کو کنونشن نے کثرت رائے سے منظور کر لیا۔

حامی اس سے مطمئن تھے کہ وزارت قبول کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس اجازت کے ساتھ جو شرط لگائی گئی ہے وہ اتنی معقول ہے کہ کسی گورنر کو اس میں عذر نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب ہم آئین کے اندر رہ کر کام کریں گے تو گورنر کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور جب اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا تو اطمینان دلانے میں بھی کیا تامل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہمارے آئینی کاموں میں بھی دخل دے تو (اسکے وہ بھی معترف تھے کہ) ہمارا وزارتیں قبول کرنا محض لاحاصل ہوگا۔

مخالف اول تو ناخن سے گوشت جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کرنے کو تیار نہ تھے۔ دوسرے وہ اس شرط کو اتنا اہم سمجھتے تھے کہ انکا خیال تھا کہ گورنر ہرگز اسے تسلیم نہ کرینگے لیکن اگر گورنر اسے مان لیتے ہیں تو پھر انکی رائے میں بھی وزارتیں قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

لیکن اس شرط کے مجوز یعنی مہاتما گاندھی کا یہ خیال تھا کہ کانگریس کی پالیسی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی صورت پیدا کر دی جائے جس سے تمام اختیارات رعایا کے ہاتھ میں آجائیں اور یہ صورت اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک گورنروں اور کانگریسی وزرا کے درمیان مفاہمت اور رواداری موجود نہو۔ کیا فائدہ کہ آج کانگریس وزارت قائم کریں اور کل اسے توڑ کر چلے آئیں لہذا اگر وزارت قبول کرنا ہے تو کام کرنے کی نیت سے قبول کی جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب گورنروں کا رویہ دوستانہ ہو۔ اسلئے یہ شرط انکے دوستانہ رویہ کے اظہار کے طور پر لگائی جاتی ہے۔

چوتھی جانب اس شرط نے حکومت کی پوزیشن بھی بہت خراب کر دی۔ یعنی اگر وہ ایسی معقول شرط کو رد کرتی ہے تو گویا یہ کہتی ہے کہ ہم تمہارے آئینی کاموں میں بھی دخل دینگے اور اس طرح اس شرط کو نامنظور کر کے جدید آئین کو تباہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے اور اگر وہ اس شرط کو منظور کرتی ہے تو برطانوی ملوکیت کے قبضہ سے جو جدید آئین کی روح رواں ہے دست بردار ہوئی جاتی ہے۔

غرضکہ کنونشن نے یہ تجویز منظور کر لی کہ جن صوبوں میں کانگریسی خالص اکثریت میں ہیں وہاں وہ مذکورہ بالا شرط کے ساتھ وزارت قبول کر سکتے ہیں اور جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں وزارتوں سے سروکار نہ رکھیں۔ چنانچہ اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد ان چھ صوبوں کے گورنروں نے جہاں کانگریسی اکثریت تھی کانگریسی لیڈروں سے گفت و شنید کی اور اس شرط کو نامنظور کرتے ہوئے قانونی موشگافی کے سائے میں پناہ لی۔ انہوں نے یہ عذر کیا کہ اپنے مخصوص اختیارات استعمال نہ کرنے کا وعدہ کرنا ان اختیارات کو رد کرنے کا مترادف ہوگا۔ اور چونکہ آئین کے کسی دفعہ کو رد کرنے کا ہمیں اختیار نہیں ہے اسلئے ہم یہ وعدہ کرنے سے معذور ہیں۔ اس پر کانگریسی لیڈروں نے وزارتیں ترتیب دینے سے انکار کر دیا۔ اسکے بعد جن حضرات نے جس طرح وزارتیں قائم کیں انکی صوبہ وار تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

مدراس

صوبہ مدراس میں جب سی راجگوپال آچاریہ لیڈر کانگریس پارٹی نے وزارت ترتیب دینے سے انکار کر دیا تو گورنر مدراس نے رائٹ آنریبل مسٹر سرینواس شاستری سے عارضی وزارت ترتیب دینے کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے اسے گوارا نہ کیا اور صاف انکار کر دیا۔ اسپر یہ خدمت سر کے۔ وی۔ ریڈی نائیڈو کے سپرد کی گئی اور انہوں نے حسب ذیل عارضی وزارت ترتیب دی:

سر کے۔ وی۔ ریڈی نائیڈو چیف منسٹر
مسٹر اے۔ ٹی۔ پنیر سلوم
کمار راجہ متھیا چیٹیار
مسٹر آر۔ ایم۔ پلٹ
راؤبہادر ایم۔ سی۔ راجہ
مسٹر خلیفہ اللہ

بمبئی

صوبۂ بمبئی میں جب کانگریسی لیڈر مسٹر بی۔ جی۔ کھیر اور مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر سر اے۔ کے۔ ایم دہلوی انکار کر چکے تو یہ خدمت سر دھنجی شاہ۔ بی۔ کوپر فنانس ممبر کے سپرد ہوئی اور انہوں نے حسب ذیل عارضی وزارت ترتیب دی:

سر دھنجی شاہ۔ بی۔ کوپر چیف منسٹر انچارج قانون وانصاف
سر ایس ٹی کامبلی وزیر تعلیم و آبکاری
مسٹر حسین علی رحمت اللہ وزیر لوکل سلف گورنمنٹ
مسٹر جمنا داس مہتہ وزیر مالیات

سی پی

صوبہ سی پی میں کانگریسی لیڈر ڈاکٹر کھرے کے انکار کے بعد

قرعہ فال سر ای رگھوندر رائو کے نام نکلا اور انہوں نے حسب ذیل عارضی وزارت ترتیب دی

سر ای۔ رگھویندر رائو چیف منسٹر
آنریبل مسٹر بی۔ جی۔ کھاپرڈے
ایس۔ ڈبلو۔ اے۔ رضوی
دھرم راؤ بہرجنگ راؤ

اڑلیسہ

صوبۂ اڑیسہ میں کانگریسی لیڈر مسٹر بشوا ناتھ داس کے انکار کے بعد مہاراجہ پرلاکمیدی منتخب ہوئے اور انہوں نے حسب ذیل عارضی وزارت مرتب کی۔

مہاراجہ پرلاکمیدی چیف منسٹر
جی۔ پٹ نائک
مولوی لطیف الرحمٰن

پنجاب

صوبۂ پنجاب میں کانگریس کی نہیں بلکہ یونینسٹ پارٹی کی اکثریت تھی اسلئے اس کے لیڈر سر سکندر حیات خاں کو ترتیب وزارت کا کام سپرد ہوا اور انھوں نے حسب ذیل وزارت ترتیب دی

سر سکندر حیات خاں چیف منسٹر انچارج قانون وانصاف
سر سندر سنگھ مجیٹھیا وزیر مال
راؤ بہادر چھوٹو رام وزیر ترقیات
مسٹر منوہر لال وزیر مالیات
میجر خضر حیات خاں ٹوانہ وزیر کارہائے عامہ
مسٹر عبدالحیٔ وزیر تعلیمات

بنگال

صوبۂ بنگال میں کسی پارٹی کی خالص اکثریت نہ تھی اس لئے پرجا پارٹی کے لیڈر سر اے۔ کے۔ فضل الحق کو حکم دیا گیا کہ وہ مشترکہ وزارت ترتیب دیں چنانچہ انہوں نے پورے گیارہ وزیروں کی ایک فوج ترتیب دی۔

سر اے۔ کے۔ فضل الحق چیف منسٹر
نواب صاحب ڈھاکہ
سید نوشیر علی
حسن شاہد سہروردی
خواجہ سر ناظم الدین
مہاراجہ سرِیش چند نندی آف قاسم بازار
سر بجوئی پرشاد سنگھ رائے
مسٹر نلینی رنجن سرکار
مسٹر پرسن دیو رائے کوٹ
مسٹر مکند بہاری ملک

سرحد

صوبۂ سرحد کا حال بھی بنگال کا سا تھا چنانچہ سر عبدالقیوم نے مشترکہ وزارت ترتیب دی

سر عبدالقیوم چیف منسٹر
رائے بہادر مہر چند کھنہ
خان بہادر سعد اللہ خاں

آسام

صوبۂ آسام کا حال بھی بنگال اور سرحد کی طرح تھا چنانچہ سر محمد سعد اللہ نے مشترکہ وزارت ترتیب دی

سر محمد سعد اللہ چیف منسٹر
مسٹر روہنی کمار چودھری
ریورنڈ جے۔ جے۔ ایم۔ این رائے
شمس العلما ابو نصر محمد وحید

سندھ

صوبۂ سندھ میں یونائٹڈ مسلم پارٹی کی اکثریت تھی لیکن لطف یہ کہ پارٹی کے لیڈر سر شاہ نواز بھٹو اور ڈپٹی لیڈر سیٹھ عبداللہ ہارون دونوں ہار گئے تھے اسلئے سر غلام حسین ہدایت اللہ نے وزارت ترتیب دی۔

سر غلام حسین چیف منسٹر انچارج محکمہ داخلہ ومالیات
مسٹر کھی گوبند رام وزیر آبپاشی

مسٹر میر بندہ علی خاں وزیر مال

بہار

صوبۂ بہار میں کانگریس کی اکثریت تھی۔ لیکن جب کانگریسی لیڈر مسٹر سری کرشن سنہا نے انکار کر دیا تو مسٹر یونس کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا اور انہوں نے حسب ذیل وزارت ترتیب دی

مسٹر محمد یونس چیف منسٹر

مسٹر کمار اجیت سنگھ دیو

بابو گورشے لال

خان بہادر نواب عبدالوہاب خاں

یوپی

صوبۂ یوپی میں کانگریس کی اکثریت تھی۔ چنانچہ جب اسکے لیڈر مسٹر گوبند بلبھ پنتھ نے وزارت ترتیب دینے سے انکار کر دیا تو نواب صاحب چھتاری کے سپرد یہ خدمت ہوئی۔ نواب صاحب موصوف نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ غیر کانگریسی ممبروں کا جلسہ کیا جس میں صرف گیارہ افراد کی ٹیم نے وزارت قبول کرنے کی تائید کی۔ بہرحال انہوں نے کسی نہ کسی طرح حسب ذیل وزارت ترتیب دے لی۔

۱۔ نواب صاحب چھتاری چیف منسٹر

۲۔ نواب سر محمد یوسف

۳۔ سر جے۔ پی۔ سریواستو

۴۔ راجہ صاحب سلیم پور

۵۔ راجہ صاحب تروا

۶۔ مہاراجکمار وزیانگرم

۷۔ راجہ مہیشر دیال سیٹھ

یا چناں کن یا چنیں

یا اسی صورت سے رہ دنیا میں رسوا و خراب
یا بپا کر اپنے صبح و شام میں اک انقلاب

یا کمندِ گردشِ صبح و مسا میں ہو اسیر
یا ترے نخچیر ہوں یہ آفتاب و ماہتاب

خود بھی یا آواز ہو جا اپنے تارِ ساز کی
یہ اگر ممکن نہیں، تو توڑ دے اپنا رباب

یا تو افلاک سے ابلیسِ ناری کو شکست
ترک کر دے ورنہ "مسجودِ ملائک" کا خطاب!

یا طلب کر فقرِ سلمان و گلیم بایزید
یا طلب کر تختِ کسریٰ شوکتِ افراسیاب

یا ستاروں کو شہادت کے لئے آمادہ کر
یا نہ کر ہرگز تمنائے طلوعِ آفتاب

یا پہاڑوں کی طرح محکم ہو تیری زندگی
یا ہوا کے رحم پر ہو زندگی مثلِ حباب

یا سکونِ ساحلِ بے زندگی کر لے قبول
یا خدا سے مانگ دریاؤں کا جوش و اضطراب

نعیم صدیقی

درسِ آزادی

اہل غیرت ہے تو غیرت پیش کر ملکی و ملی حمیت پیش کر
کبر و نخوت دیکھکر یوں چپ نہ بیٹھ اُٹھ، جوابِ کبر و نخوت پیش کر
التماسِ عاجزی کے دِن گئے اب غرورِ تاب و طاقت پیش کر
عرضِ حالِ بیکسی کے دن گئے اب وفورِ عزم و ہمت پیش کر
عجز درویشانہ کی خو چھوڑ کر بادشاہانہ جلالت پیش کر
خوف مرگ و زیست سے مُنہ موڑ کر شانِ اربابِ جلادت پیش کر
ملک گرمِ جنگِ آزادی ہے اُٹھ جنگ آزادی میں شرکت پیش کر
قوتوں کے امتحاں کا وقت ہے تو بھی اُٹھ اور اپنی قوت پیش کر
دشمنوں کے سامنے بھی بار بار جذبۂ صلح و مودت پیش کر
اور اگر بے جنگ چارہ ہی نہو جنگ کی بیخوف و عوت پیش کر
مرد کو خوف و خطر زیبا نہیں مردبن مردانہ خصلت پیش کر
بے خطر گھمسان کی جنگوں میں کود بے دھڑک شوق شہادت پیش کر
ہر طرف بڑھ اور آزادی دِلا ہر طرف جا آزادی دولت پیش کر
ملک بھر ہر مدد تیار رہے ملک کے آگے ضرورت پیش کر
لاکھ اقوالِ شجاعت رائگاں چند اعمال شجاعت پیش کر
دادِ پامردی بلا حجت نہ چاہ کوئی پامردی پہ حجت پیش کر
جنس آزادی بلا قیمت نہ مانگ جنس آزادی کی قیمت پیش کر
بادشاہی کی ہوس برحق، مگر بادشاہی کی لیاقت پیش کر

حکیم الطاف احمد آزاد انصاری

مسئلہ ارتقا

فروری ۳۷ء کے کلیم میں مسئلہ ارتقا کے عنوان سے شبلی صاحب کا ایک مضمون ڈارون کے نظریے کے متعلق شائع ہوا تھا جس میں اس نظریے پر کچھ اعتراضات تھے اور شبلی صاحب نے خود اپنا نظریہ بھی پیش کیا تھا جو اگرچہ اجمالی طور پر مذہبی روایات پر مبنی تھا مگر اُس کی تفصیلات اُنھوں نے خود اپنے ذہن سے مُہیا کی تھیں، جہاں تک اعتراضات کا تعلق ہے اُن میں سے بعض تو بظاہر غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بجا طور پر ڈارون کے نظریے پر عائد ہوتے ہیں مگر ایسا کوئی اعتراض نہیں ہے جس کی بنا پر نظریے کو بحیثیت مجموعی قطعی طور پر ناقابل فہم قرار دیا جا سکے۔ ڈارون کا مقصد اس نظریے سے محض یہ تھا کہ علمی تحقیقات کے لئے ایک نیا میدان پیش کرے اور اس ضمن میں ابتدائی مباحث کے لئے کچھ مواد بہم پہونچا یا جائے تاکہ آگے چل کر آئندہ نسلیں اس پر مستحکم عمارت تعمیر کر سکیں۔ مگر چونکہ یہ نظریہ تمام تر مادّی نقطۂ نظر پر مبنی تھا اس لئے مذہب کی طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی جو آج تک جاری ہے، مگر تحقیقاتی مسائل میں روائتی اور مذہبی تعصب روا نہیں ہے۔ بعض لوگ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی ماہر علم الحیوانات کی تحریروں میں کوئی ایسا اقتباس مل جائے جو اس نظریے کے مخالف ہو تاکہ اُن کے رجحانات کی تائید ہو سکے۔ یہ انتاد مزاج علمی مباحث میں درست نہیں ہر ایک ایسے نظریے کو جو کسی نئی سمت کی تحقیقات سے تعلق رکھتا ہو بعض جزوی اور تفصیلی امور میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ڈارون کے نظریے کے لئے یہ مشکلات اور بھی زیادہ تھیں کیونکہ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے براہ راست تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے ثبوت پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُسکو ایک مسلمہ قانون فطرت کا درجہ کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ ڈارون کا نظریہ محض ایک نظریہ ہے اور اسکو محض اسی حیثیت سے دیکھنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی مخالفت نہ صرف مذہبی حلقوں تک محدود ہے بلکہ خالص علمی تحقیقات کی رُو سے بھی وہ مشکوک سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض لوگ تو اسکو غلط قرار دے چکے ہیں مگر علمی تحقیقات ابھی تکمیل نہیں ہے اور اس لئے مخالف فیصلہ بھی اپنی جگہ پر قطعی نہیں ہو سکتا۔ نظریے کی مجموعی حیثیت قرین قیاس ضرور ہے البتہ شہادت کی کمی اس کے زیادہ فروغ حاصل کرنے میں مانع ہے۔ ابتک علمی دُنیا میں جو کچھ اس کے خلاف کہا گیا ہے اس کی بنا، شہادت اور ثبوت کے فقدان پر ہے، قرین قیاس ہونے میں شبہہ نہیں۔ ورنہ شروع ہی سے مزید تحقیقات پر زور نہ دیا جاتا۔ اور اس ضمن میں تمام کوششیں لغو قرار دی جاتیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظریے کی تہ میں ایسی بات ضرور

ہے جو قابل تحقیق ہے اور دل کو لگتی ہوئی ہے۔ اسی لئے کوشش برابر جاری ہے اور اگرچہ ابتک اس میں ناکامی ہوئی ہے مگر اس کو ترک کرنے کے لئے دماغ تیار نہیں۔

عام طور پر جو اعتراضات اس نظریے پر کئے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اگر انسان ادنٰے درجے کے حیوانات سے ترقی کرکے موجودہ صورت میں آیا ہے اور اس کے قریبی اجداد بندر رہتے تو اب ایسا کیوں نہیں دیکھنے میں آتا کہ ایک بندر انسان بن کر جنگل سے بھاگ کر آدمیوں میں شامل ہوجائے۔ یا بقول شبلی صاحب ادنٰی درجے کے حیوانات تو آج بھی موجود ہیں پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ وہ انسان بن جائیں۔ اب ارتقا کیوں بند ہوگیا۔

۲۔ انسان ابتدا سے اسی صورت میں تھا جس میں آج ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نوعی حیثیت سے نہیں ہوا۔

۳۔ انسان کے بچپن کا زمانہ اسقدر طویل کیوں ہوتا ہے جب کہ دیگر حیوانات کا عہد طفولیت اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔ اگر انسان نے حیوان ہی سے ترقی کی ہے تو اس میں یہ خصوصیت اپنے آبا و اجداد کے خلاف کہاں سے آگئی۔

پہلا اعتراض تو بہت سطحی اور طفلانہ ہے جس کی وجہ ارتقا کو بخوبی نہ سمجھنا ہے۔ ارتقا کا مقصد تدریجی ترقی ہے جس میں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ تبدیلی انقلاب میں محسوس ہوتی ہے مگر جانور آدمی میں منقلب ہرگز نہیں ہوتا جو تبدیلی محسوس ہوسکے۔ یہ خیال کی غلطی ہے۔ ایک بندر یا بن مانس سے انسان کی صورت میں آنے کے لئے بے شمار درمیانی منازل طے کرنے پڑے ہونگے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ بندر یا اس کی ترقی یافتہ کوئی نوع یک لخت انسان بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو یہ انقلاب کہا جائیگا۔ ارتقا نہیں کہا جا سکتا۔ ارتقا میں ہر ایک خفیف تبدیلی کے لئے ہزاروں برس درکار ہوتے ہیں اور وہ خفیف تبدیل شدہ حیوان تناسل کے ذریعے سے ایک علیحدہ اور مستقل نوع کی صورت میں قائم رہتا ہے۔ اسی طرح لاکھوں برس کے عرصے میں خفیف خفیف تبدیلیوں کے ذریعے سے انسانی ہئیت پیدا ہوتی ہے جو وحشی ہونے کے باعث جنگلوں اور بھٹوں میں رہتے ہیں پھر کچھ شعوری کیفیت میں اضافہ ہونے سے وہ درندہ نما انسان بنتے ہیں اور پھر قرنوں گزرنے کے بعد وہ وحشی انسانی جرگوں کی صورت میں جنگلوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسا کہ روئے زمین کے بعض حصوں میں آج بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے بعد صدیاں گزرنے پر تمدن کا آغاز ہوتا ہے اور بتدریج اس کے مختلف مدارج طے ہوتے رہتے ہیں اور ان تمام مدارج کی یادگاریں جن میں سے انسان ہوکر گزرا ہے اور موجودہ حالت کو پہونچا ہے آج تک اپنی اپنی جگہ پر مختلف طبقوں کی صورت میں باقی چلی آتی ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ارتقا بند نہیں ہوا ہے بلکہ بدستور جاری و ساری ہے۔ تمام عمل اسقدر آہستہ اور بتدریج ہوتا ہے کہ تبدیلی کسی درجے پر محسوس نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر اس طرح سمجھئے کہ ابتداً گاڑی کی اختراع چھکڑے کی صورت میں ہوئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ گاڑی کی صورت میں اور ترقی ہوئی یہاں تک کہ یکا۔ شکرم۔ لینڈو وغیرہ تیار ہوئیں۔ پھر ریل بنی۔ بائیسکل بنی۔ موٹر بنی۔ یہ سب گاڑی کی ارتقائی منازل اور نوعی صورتیں ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ موٹر چھکڑے سے بنی ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ صاحب آج کل ہم کسی چھکڑے کو موٹر میں تبدیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ تو اس کا یہ اعتراض کسقدر لغو اور مہمل ہوگا۔

رہا دوسرا اعتراض کہ انسان شروع ہی سے اسی صورت میں پایا جاتا ہے جس میں وہ آج ہے۔ تو یہ ایک لفظی مغالطہ ہے۔ جس کو منطقی غلطی کہا جائے تو بجا ہے۔ انسان جب سے اس صورت میں آیا جس پر لفظ انسان کا ہوسکتا ہے اسی وقت سے وہ انسان کہلایا جاتا ہے۔ اور انسان سمجھا جاتا ہے۔ اس سے قبل وہ انسان ہی نہ تھا۔ یا جو کچھ بھی تھا اُس پر لفظ انسان کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ انسان شروع ہی سے ایسا تھا جیسا کہ آج ہے بالکل ٹھیک بات ہے

اور اس سے ڈارون کے نظریے پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ شروع کے معنی یہ ہیں کہ جب سے انسان انسانی صورت میں آیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ انسان کا بچپن برخلاف اپنے حیوانی اجداد کے کیوں اسقدر طویل ہوتا ہے۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اس کے دماغی قوی کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ خصوصیت انسان کے پیشرو انواع میں نہیں پائی جاتی۔ تو پھر یہ اعتراض انسانی بچپن کی طوالت پر نہیں رہا بلکہ دراصل انسانی دماغی قوی کے متعلق ہوگیا۔ اور اعتراض کے یہ معنے ہونگے کہ انسانی دماغ کی خصوصیت دیگر حیوانوں میں کیوں نہیں پائی جاتی۔ تو یہ اعتراض مہمل ہے، کیونکہ ارتقائی لحاظ سے دیگر حیوانات پر جو برتری اور تفوق انسان کو حاصل ہے وہ اس کے دماغ ہی کا نتیجہ ہے اگر یہ بات دیگر حیوانات میں بھی مشترک ہوتی تو انسان کو ترقی یافتہ حیوان نہ کہا جاتا۔ انسان کا دیگر حیوانات کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہونا اس کی جسمانی قوت پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ دماغ ہی پر ہے اور ڈارون کے ارتقا کے غلط ہونے کی دلیل انسان کی یہ دماغی خصوصیت نہیں قرار دی گئی ہے بلکہ اس کو مسترد کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "اس بات کے لئے کوئی شہادت نہیں ہے کہ حیوانات کا بڑا فرق دوسرے فرق سے پیدا ہوا"۔

شبلی صاحب اسی باب میں خود یہ فرماتے ہیں کہ "بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ انسان کا بچپن اس سے طویل ہے کہ اسے تعلیم و تربیت حاصل کرنی تھی"، لیکن انکے نزدیک یہ دلیل نظریہ ارتقا کے خلاف ہے موافق نہیں ہے؛ "کیونکہ حامیان ارتقا کی رو سے چونکہ انسان "نیچ ذات کے جانداروں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اس لئے اسے چاہئے تھا کہ "وہ علم و حکمت جانوروں کی بہ نسبت جلد حاصل کرے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ" ارتقا نہیں ہوا بلکہ تنزولی ترقی ہوئی"۔ یہ عجیب استدلال ہے۔ گویا شبلی صاحب کے نزدیک تحصیل علم و حکمت آدمی کے مقابلے میں جانور ہی جلد کر لیتے ہیں اس لئے یہ ارتقا نہیں بلکہ ترقی معکوس ہے۔ اس حجت کے مقابلے میں سوائے خاموشی اور کیا جواب ہو سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں خصوصیت کے ساتھ علم و حکمت سیکھنے سے بحث نہیں ہے بلکہ محض سیکھ لینے سے بحث ہے اور شبلی صاحب کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کے بہم پہونچانے کے لئے جن باتوں کا سیکھ لینا ضروری ہوتا ہے وہ باتیں جانوروں کے بچے جلد سیکھ جاتے ہیں بہ نسبت آدمیوں کے بچوں کے۔ اور اس لحاظ سے انسان بجائے ارتقا کے ترقی معکوس کرتا ہے۔ تو اس کا جواب زیادہ وقت طلب نہیں ہے۔ اول تو جانور کی ضروریات اور آدمی کی ضروریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اس لئے آدمی کو جانور کے مقابلے میں زیادہ عرصہ درکار ہونا ارتقائی تخیل کے منافی نہیں۔ دوسرے جانور اپنی ضروریات کو سیکھنے اور ان کو بہم پہونچانے کے لئے کسی اکتساب علم کی حاجت نہیں رکھتا بلکہ اسکی عقل حیوانی مبہم طور پر اسکی رہنمائی کرتی ہے اسکی کوئی حرکت سمجھ بوجھ کر نہیں ہوتی بلکہ اسی عقل حیوانی کے تابع ہوتی ہے جو قدرت ابتدا ہی سے اس میں ودیعت کرتی ہے۔ صحیح معنوں میں جانوروں میں سیکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ کسی چیز کو سیکھتے نہیں بلکہ قدرت انکی رہنمائی کرتی ہے، سیکھنے کا تعلق عقل سے ہے جو جانوروں میں مفقود ہوتی ہے۔ جن باتوں میں جانوروں کو سکھایا اور سدھایا جاتا ہے اور جو انکی زندگی کی ضروریات سے تعلق نہیں رکھتیں ان میں وہ انسان کے مقابلے میں بہت سست اور دیر طلب ثابت ہوتے ہیں اور وہ بھی ناقص اور نامکمل طور پر۔

انسان کے ابتدائی دور میں اس کا بچپن کا زمانہ اتنا طویل نہ ہوتا تھا جتنا جتنا تمدن تہذیب، علم و عقل میں ارتقا ہوتا گیا یہ زمانہ طویل ہوتا گیا۔ اور اب بھی متمدن طبقوں میں غیر متمدن طبقوں کے مقابلے میں یہ زمانہ زیادہ نازک اور طویل ہوتا ہے۔ بہرحال اس کا تعلق انسان کے قوائے دماغی کے ارتقا سے ہے اور ارتقائی نظریہ اسی بات کا متقضی تھا۔ اس میں کوئی تناقض یا عدم مطابقت کا اعتراض عائد نہیں ہوتا۔

جب تک کہ قوائے ذہنی کی تربیت ہو انسان کے بچے میں بھی عقل حیوانی ابتدائی حالت میں موجود ہوتی ہے جو اس کی ابتدائی حیوانی ضرورتوں کے لئے لازمی ہے۔ مثلاً پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ پینے کی صلاحیت وغیرہ۔ یہ باتیں اسکو کوئی سکھاتا نہیں۔ مگر جانوروں کی طرح

محض عقل حیوانی انسانی وجود کو سنبھالنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ ورنہ انسان اور حیوان کے وجود میں کوئی امتیاز نہیں رہیگا۔ اور ارتقا بے معنی چیز ہوجائیگی اس لئے اسکو عقل کی ضرورت ہوتی ہے، اور انسان اسی کی مدد سے سیکھتا اور علم حاصل کرتا ہے اور اس کے لئے قدرتاً عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اول تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے کافی مواد کا اکٹھا ہونا۔ پھر دماغ کا اس قابل ہونا کہ اس مواد سے عام نتائج کا استنباط کرسکے۔ غرض انسان اور حیوان کا تمام فرق دماغی قوٰی کے متعلق ہے جس کا تربیت یافتہ ہونا دیرطلب ہے۔ مگر ارتقا کے موافق ہے نہ کہ مخالف بلکہ عین ارتقا ہے۔

آگے چل کر شبلی صاحب نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور ایک جگہ مرد کے بچہ جننے کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جب یہ ثابت ہوگیا کہ شروع میں نہ تو متعدد جوڑے تھے۔ نہ ایک جوڑا تھا۔ نہ ایک "عورت تھی بلکہ ایک مرد تھا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ عورت کے بغیر بچے کیونکر پیدا ہوئے؟" اس کا جواب وہ خود ہی اس طرح دیتے ہیں کہ "ہوسکتا ہے کہ قدرت نے صرف مرد ہی میں ایسی خصوصیت رکھی ہو کہ شروع میں اُسے کسی عورت کی حاجت نہ رہی ہو مثلاً نطفہ کو قابل پیدائش بنانے کے لئے مرد میں ہی ایک رحم بھی بنادیا گیا ہو" وغیرہ۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ شبلی صاحب نے ایک علمی مقالہ سپرد قلم کرتے وقت اپنے رجحان طبع کی تاویل میں کسقدر بعید از قیاس مفروضات سے کام لیا ہے اُنکے نزدیک یہ سب کچھ ہوسکتا ہے یعنی مرد کے اندر رحم کا ہونا۔ وغیرہ۔ لیکن ڈارون کا نظریہ ممکن نہیں ہوسکتا جس میں بظاہر کوئی قیاسی دشواری اور قباحت نہیں ہے اور صرف ایک اصطلاحی نکتے پر شہادت کی ضرورت ہے۔ ڈارون پر اعتراض کرتے ہوئے شبلی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ کم درجے کے حیوانات پہلے ظہور میں آئے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ انسان بن گئے۔" مگر اُن کے نزدیک شاید اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ابتدا میں مرد کے اندر رحم بھی موجود تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ زمانے میں بعض ایسے مافوق العادت کرشمہائے فطرت کی ہم کو خبر دی گئی ہے مثلاً مرد کا عورت میں تبدیل ہوجانا اور اسکو ایام کا نمودار ہونا وغیرہ جن سے شبلی صاحب کے نظریے کے متعلق تھوڑی بہت قیاس آرائی میں مدد ملتی ہے۔ تو جواباً یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مرد کے عورت ہوجانے کی مثال اس ضمن میں کافی نہیں ہے کیونکہ شبلی صاحب کے خیال کے بموجب ابتدائی انسان کو بیک وقت مرد بھی ہونا چاہیئے اور عورت بھی۔ اور پھر اگر فطرت کے ایسے فقید المثال اور عجیب الخلقت نمونوں سے کسی قسم کے ممکنات پر استدلال جائز رکھا جاسکتا ہے تو پھر ڈارون کے نظریے کو قبول کرلینے میں کیا قباحت رہ جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کا امکان ہونا اور اُس کا واقعی ہونا دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔ امکان سے واقعیت پر استدلال نہیں ہوسکتا جب تک کہ ثبوت نہو۔ اور اگر قرین قیاس ہونے کی بنا پر کوئی نظریہ پیش کیا جاسکتا ہے تو ڈارون کا نظریہ بدرجۂ اولیٰ اس کا مستحق ہے۔

ایک اور بات جو تخلیق آدم کی مذہبی روایت کے متعلق قابل ذکر ہے یہ ہے کہ بنی نوع انسان رُوئے زمین کے ایسے دُور و دراز حصص میں کیونکر پہونچ گئے جو آپس میں ایک دوسرے سے منقطع ہیں اور جن میں آمدورفت کے ذرائع غیر متمدن زمانے میں مسدود اور مفقود ہونے چاہئیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زمین کی موجودہ تقسیم اور عام جغرافی حالت انسان کے منتشر ہونے کے بعد وقوع میں آئی تو اس کی تائید میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے، بلکہ اس باب میں جو کچھ معلومات ہیں وہ خلاف ہی ہیں یعنی زمین کی موجودہ تقسیم دور انسانی سے بہت قبل عمل میں آئی اور یہ قرین قیاس بھی ہے کیونکہ انسان کے نمودار ہونے سے قبل ہی دُنیا کو کیل کانٹے سے درست ہونا چاہئے تھا۔ اگر ایسے عظیم الشان انقلابات جو تمام روئے زمین کی ہئیت ہی کو سرے سے بدل ڈالیں انسان کے بعد رونما ہوتے تو انسان کا اُن سے بچ جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہی اعتراض ارتقائی انسان پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ

انسان کا رونما ہونا خواہ ارتقا کے تحت ہو یا ایک اتفاقی حادثہ اور کرشمۂ فطرت ہو بہر حال اس کا غیر متمدن حالت میں نا قابل گذار حصص میں منتشر ہو جانا دونوں حالتوں میں یکساں طور پر بعید از فہم ہے۔ تو اس کی توجیہ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ عظیم الشان انقلابات جنہوں نے روئے زمین کو بدل دیا اسوقت وقوع پذیر ہوئے جبکہ انسان موجودہ صورت میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ ارتقا کے ابتدائی منازل طے ہو رہے تھے یہی وجہ ہے کہ سلسلۂ ارتقا کی درمیانی انواع کسی ایک جگہ نہیں پائی جاتیں بلکہ کوئی کہیں ہے اور کوئی کہیں۔ اس خیال کی تائید اور بھی دیگر آثار سے ہوتی ہے جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات ہم پھر یاد دلانی چاہتے ہیں کہ ابھی تک کوئی نظریہ اس باب میں یقینی اور مسلم الثبوت نہیں ہے اور نہ شاید ہو سکتا ہے کیونکہ موضوع بحث ایسا ہے جس میں قیاسات کو بہت دخل ہے اور قیاس کی بنا پر ڈارون کا نظریہ زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

ہر چند کہ اس بات کا ثبوت ابھی تک ہم نہیں پہونچا کہ جانوروں کی ایک نوع دوسری نوع سے پیدا ہو۔ مگر ایک ہی قسم کے جانوروں کا خفیف خفیف فرق کے ساتھ موجود ہونا (مثلاً مختلف مقامات میں ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ بن مانسوں کی بہت سی اقسام کا پایا جانا) اور اس خفیف خفیف فرق کے بہت سے درجے طے ہو جانے کے بعد آپس میں اسقدر بُعد ہو جانا کہ انتہائی اقسام یہاں تک متبائن ہو جائیں کہ وہ بالکل علحدہ نوع قرار دی جانے لگیں ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی توجیہ ڈارون کے نظریے سے بہتر ذہن میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ناکامی کے باوجود اس باب میں تحقیقات جاری ہے۔

آپ کا چندہ ختم ہو گیا

حسب ذیل خریداروں کا چندہ اپریل نمبر کے بعد ختم ہوتا ہے، لہذا استدعا ہے کہ وہ اپنا زرچندہ بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرمائیں تاکہ وی پی کی زحمت اور صرفہ نہ ہو۔

ابن عباس صاحب	گوالیار
عبدالستار صاحب	کلکتہ
ایس۔اے قدوس صاحب	پونا
مرتضیٰ احمد صاحب	حیدرآباد سندھ
محمد عبدالسلام صاحب	برہانپور
سید محمد وصی صاحب کاظمی	ضلع بارہ بنکی
ہیڈ ماسٹر اردو مڈل اسکول	داونگری
مس جہاں آرا صاحبہ	کلکتہ
مسز انیس شبیر احمد صاحب	لدھیانہ
مشتاق احمد صاحب	جہلم
سکریٹری صاحب مسلم لائبریری	الہ آباد
ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول	داونگری
مسز تقیہ اقبال حمید	سیالکوٹ
سکریٹری صاحب بزم ادب	شملہ دہلی
رام دیال صاحب بی اے۔ ایل ایل بی	ٹانک N.W.F.P.
ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول	ہوشیارپور
" اردو مڈل اسکول	کولار
مسٹر ترپاٹھی صاحب	دھولپور
ہیڈ ماسٹر اردو مڈل اسکول	گرگیشوری
"	مادھوگری
"	سیرا
محمد علی صاحب نظامی	ریاست جموں
مسٹر روپ کرن صاحب	حیدرآباد دکن
نظم العلی صاحب	الہ آباد
ورنگل کالج	خیرآباد
شیو کمار سنگھ سکریٹری	فیض آباد
سید حسین مجتبیٰ صاحب	لکھنؤ

نقد و نظر

جواہر سخن - جلد دوم

(یعنی اُردو شعرا کے کلام کا انتخاب)

ادارہ

از مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی - حجم ۸۴۰ صفحہ - قیمت مجلد آٹھ روپیہ آٹھ آنہ غیر مجلد آٹھ روپیہ - پتہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد +

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے ۱۹۲۶ء میں یہ فیصلہ کیا - کہ اُردو کے مشہور شاعروں کے کلام کا انتخاب چھ جلدوں میں شائع کیا جائے۔ اور ہر ایک شاعر کا مختصر تذکرہ بھی انتخاب کے ساتھ شامل ہو - اصل کام تو مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی کے سپرد ہوا - مگر نگرانی اور نظرثانی کے لئے چھ اصحاب کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی - جن میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک جلد پہ نظرثانی کرنے کا کام لگایا گیا - پہلی جلد مولانا سید سلیمان ندوی کی نظرثانی کے بعد شائع ہو چکی ہے اور "جلد دوسری" اس وقت ہمارے سامنے ہے -

〰〰〰

ہم سب سے پہلے تذکرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں - کہ شاعروں کے حالات لکھنے میں فاضل مرتب نے کافی تحقیق سے کام نہیں لیا - اور تو اور نام تک کی تحقیق میں پوری توجہ نہیں برتی گئی - مثلاً جرأت کا نام قلندر بخش لکھا ہے - حالانکہ ان کا نام یحییٰ امان تھا اور قلندر بخش عرف تھا - اسی طرح جن شاعروں کی ولدیت ہمیں معلوم تھی - لازم تھا کہ یہ بھی لکھ دی جاتی - مگر نہ معلوم ایسا کیوں نہیں کیا گیا - مثلاً سوز کے والد کا نام سید ضیاء الدین تھا - "تیر اندازی میں صاحب کمال مشہور تھے اور حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد سے تھے" مگر ان کا نام نہیں لکھا - اسی طرح مصحفی کے والد کا نام ولی محمد تھا - شاہ نصیر کے والد کا نام شاہ غریب تھا - افسوس کے والد سید علی مظفر خاں تھے - شہیدی کے والد کا نام عبدالرسول خاں تھا - ان میں سے کسی کا نام نہیں لکھا -

جہاں کہیں کسی شاعر کی اولاد کا پتہ چلتا ہے - بہتر تھا اگر انکے نام لکھ دیئے جاتے - مگر یہاں بھی خاموشی سے کام لیا گیا ہے - مثلاً میر کے ایک صاحبزادے میر عسکری عرف میر کلو تھے - عرش تخلص تھا اور صاحب دیوان تھے - اسی طرح سوز کے بھی ایک صاحبزادے تھے - جو اپنے والد کے تخلص کی رعایت سے داغ تخلص کرتے تھے - ان کا کوئی ذکر نہیں +

اب لیجئے سنین کا حال - میر درد کے حال میں لکھتے ہیں "خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے" بہت اچھا - مگر آخر میں لکھتے ہیں "خواجہ صاحب نے ۶۱ سال کی عمر میں ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو جمعہ کے دن وفات

پائی"۔ چونکہ ۱۱۹۹ھ کی وفات کے متعلق یقین ہے۔ تاریخ وفات ہے ع
حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب۔ اس لئے ۶۱ برس کی عمر ہو تو پیدائش ۱۱۳۳ھ میں نہیں ہو سکتی۔ مگر عمر بھی ۶۱ غلط ہے۔ آزاد لکھتے ہیں ۶۸ برس کی عمر میں فوت ہوئی۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں۔ وفات کے وقت عمر ۶۰ برس تھی۔ غرضیکہ اس باب میں زیادہ تجسس کی ضرورت تھی۔
میر محمدی بیدار کا انتقال ۱۲۰۹ھ میں ہوا۔ وہ نہیں لکھا۔

یہی حال سوانح حیات کا ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں پرانے شاعروں کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ پرانے تذکرہ نگاروں نے اس طرف بہت کم توجہ کی۔ لیکن اس وقت تک اتنے تذکرے چھپ چکے ہیں کہ اگر کوشش کی جاتی۔ تو اس سے زیادہ حالات دستیاب ہو سکتے تھے۔ جتنے اس کتاب میں درج ہیں۔ اور جو کچھ لکھا بھی گیا ہے، وہ بھی غلطی سے خالی نہیں۔

مناسب تھا کہ اگر کسی شاعر نے کوئی اور کتاب تصنیف کی ہے تو اس کا نام بھی لکھ دیا جاتا۔ سوائے ایک میر کے اور کسی کی تصنیفات کی مکمل فہرست نہیں دی گئی۔ سودا کے حال میں تنبیہ الغافلین کا ذکر کیا ہے۔ آزاد نے اس کتاب کا نام عبرۃ الغافلین لکھا ہے۔ نہ معلوم ان دونوں میں سے درست کیا ہے۔

شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ بھی ضروری تھا۔ اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں کی گئی۔ اور جہاں کی بھی گئی ہے۔ اتنے بخل کے ساتھ کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ فاضل مرتب نے جن شاعروں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے لئے معیار کیا رکھا تھا۔ جہاں ہمیں لبل۔ جوشش اور ریشر ایسے غیر معروف اور غیر ضروری شعرا کا کلام اور نام دکھائی دیتا ہے وہاں اس مجموعہ میں ضیاء الدین ضیا۔ جعفر علی خاں حسرت۔ ثناء اللہ خاں فراق اور سعادت یار خاں رنگین کا نام نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ استاد تھا۔ اس کے مقابلہ پر شاہ نصیر الدین نصیر کو اس دور میں شامل کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ آخری دور کے شاعر ہیں۔ اور ان کا حال ناسخ۔ آتش اور ذوق کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ پھر ایک اور غضب کیا کہ ترتیب کا بھی کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا۔ مثلاً انہی نصیر کا حال اور انتخاب پہلے درج ہے اور قیام الدین قائم چاند پوری کا بعد میں۔ حالانکہ قائم نصیر الدین کے دادا استاد تھے۔ یعنی نصیر شاگرد ہیں شاہ محمدی مائل کے اور مائل شاگرد ہیں قائم کے

پھر خود انتخاب پر نظر ڈالی جائے۔ تو وہاں توازن کا کہیں پتہ نہیں۔ کل کتاب ۴۸۰ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں سے ۲۴۰ صفحوں میں میر کا۔ ۱۱۰ صفحہ میں سودا کا۔ ۴۰ صفحہ میں درد کا، اور صرف ۱۱ صفحہ میں سوز کا۔ زیادہ اچھا ہوتا کہ جن اساتذہ کے دیوان نہیں ملتے یا کمیاب ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب زیادہ دیدیا جاتا۔ تاکہ یہ کمی پوری ہو جاتی۔ میر اور سودا کے انتخاب علحدہ بھی چھپ چکے ہیں۔ ان پر اتنی جگہ صرف کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ نصیر کا انتخاب صرف ساڑھے چھ صفحوں میں ہے۔ حالانکہ ان کی پرگوئی کا ایک عالم معترف ہے۔ ان کا دیوان رامپور میں موجود ہے۔ لازم تھا کہ اس کی نقل لی جاتی یا مستعار لیا جاتا اور اس انتخاب کو زیادہ مکمل بنایا جاتا۔

مگر اس کتاب کا سب سے بڑا عیب اس کی طباعت کی غلطیاں ہیں۔ آخر میں ایک فہرست اغلاط دیدی گئی ہے۔ مگر اس کے علاوہ بھی غلطیوں کی بھرمار ہے۔ لیتھو کی چھپائی میں یہ شکایت عام تھی کہ اس میں کتابت کی غلطیاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ اور اس پر یہ عام ہے کہ ہر سطر کہنا تو خیر غلو اور اغراق ہوگا شاید ہی کوئی صفحہ غلطی سے خالی ہو۔

غرضیکہ یہ مجموعہ اردو اکیڈیمی کے نیک نام پر ایک داغ ہے۔ ہم نے پہلی جلد نہیں دیکھی۔ اس کے لئے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دوسری جلد کسی پہلو سے بھی اکیڈیمی کے شایان شان نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آیندہ جلدوں میں زیادہ محنت اور توجہ سے کام لیا جائیگا۔

(م - ر)

کائنات

مصنفہ محمود علی خانصاحب (جامعی) سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۰ صفحات قیمت ۱۲ر
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

ناشرین اُردو نے بچوں کے لٹریچر کی طرف ابتک بہت کم توجہ کی ہے۔ اس سلسلہ میں اولیت کا سہرا تو دار الاشاعت لاہور کو حاصل ہے لیکن انکا لٹریچر تمامتر قصہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ بچوں کو مفید اور کارآمد کتابوں کی طرف انھوں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کام کو سب سے پہلے مکتبہ جامعہ نے سنبھالا اور بہت تھوڑی مدت میں اس قسم کی کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

کائنات میں علم ہیئت کو آسان سے آسان زبان اور سادہ سے سادہ اسلوب بیان میں پیش کیا ہے۔ اور ہر مسئلہ کو بے شمار مثالوں اور نقشوں سے سمجھایا ہے، غرض اس امر کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے کہ علم ہیئت کے مبادیات بچوں کے پوری طرح ذہن نشین ہوجائیں۔

کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں حسب ذیل مسائل کو نہایت خوبی سے سمجھایا ہے:

۱۔ دنیا گول ہے۔ ۲۔ دن رات کیسے ہوتے ہیں۔ ۳۔ جاڑے گرمی کی کیا وجہ ہے۔ ۴۔ سال، مہینے کیسے بنتے ہیں۔ ۵۔ بدر و ہلال کیونکر ہوتے ہیں۔ ۶۔ گہن اور طوفان کی کیا وجہ ہے۔ ۷۔ ثوابت اور سیاروں میں کیا فرق ہے۔ کتنے سیارے ہیں۔ وہ کتنے بڑے اور کتنے دور ہیں۔ ۸۔ دُمدار ستارے کیا ہیں۔ ۹۔ قطب کہکشاں اور بُرج کیا ہیں۔ ۱۰۔ گرمیوں اور سردیوں میں آسمان پر کون سے ستارے نظر آتے ہیں اور ان کی کیا پہچان ہے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ کتاب بچوں کے لئے نہایت مفید ہے اور انکے جغرافیہ کے اسباق میں بھی اس سے مدد مل سکتی ہے۔ بالخصوص اسکاوٹوں کے لئے بہت کارآمد ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ اعلےٰ۔ قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔

یگانہ

یہ پندرہ روزہ رسالہ ہے جو کلیم کے سائز پر ۴۸ صفحہ پر رامپور سے شائع ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے دو نمبر ہمارے پیش نظر ہیں۔ پہلا نمبر دوسرے نمبر کے مقابلہ میں بہر صورت بہتر ہے۔ دونوں نمبروں میں مضامین اور نظموں کا معیار بلند رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصاً "تحقیق الفاظ" از مولوی عتیق الرحمٰن خانصاحب کلیم رامپوری اور "دیوان البسہ" از مولوی سید محمد نقی صاحب شاداں لکھنوی بہت اچھے مضامین ہیں یہ ہمیں علم ہے کہ ادارۂ یگانہ اس رسالہ کو کامیاب بنانے کی ان تھک کوشش کر رہے ہیں، اتنا انہماک اور کوشش خود اپنی جگہ پر قابل مبارکباد ہیں۔ خدا کامیاب کرے۔

رسالہ متعدد تصاویر سے مزین ہے کتابت طباعت اوسط درجہ کی ہے۔ کاغذ رنگین استعمال کیا جاتا ہے۔ چندہ سالانہ ۸ہ ہے جو کسی طرح زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

(وفا فرخ آبادی)

بنام قوت و حیات

کلیم

دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۷ء	نمبر ۵

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کوردھن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم اکبر منزل ایکل روڈ قرول باغ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

(۱) ایک خطرناک مشورہ

گرہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں خراب خواہد شد

علی گڑھ مُسلم یُونیورسٹی کے ایک "پروفیسر" تاریخ نے حال ہی میں وہاں کے طُلّاب کو جو مشورہ دیا ہے، وہ اِس قدر خطرناک ہے کہ اُس پر خاموش نہیں رہا جاسکتا۔

وہ ایک طرف تو مُسلم یُونیورسٹی کے طُلّاب میں فرقہ وارانہ ذہنیّت پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف اُن کی تمنا یہ ہے کہ طُلّاب، سیاسیات، و اقتصادیات سے بیگانہ رہیں، یعنی بالفاظِ دیگر —— ایک طرف تو مسلم کی حیثیت سے وہ اپنے کو غیر مسلموں سے علٰحدہ رکھ کر ہندوستان کی قومیّت کو کمزور بنا دیں، اور دوسری طرف کالج کے باہر کی دُنیا سے، جو حقیقی دُنیا ہے، اور جس سے عنقریب اُنھیں سابقہ پڑنے والا ہے، بیگانۂ محض رہتے ہوئے، اپنے دل کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔

یہ بھگوان، اور رحمٰن کے ناموں پر کٹ مرنے والا ہندوستان عجیب مُلک ہے —— یہاں جو کچھ بھی ہو، کم ہے۔ یہی وہ مُلک ہے، جہاں بیسویں صدی میں بھی، ایسی خلافِ عقل باتیں زبان سے نکالی جاسکتی ہیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ "پروفیسر" ہونے کے باوجود، علی گڑھ کے "پروفیسر صاحب" کو اب تک شاید یہ علم ہی نہیں کہ "طالب علم" کہتے کسے ہیں، اور طالب علم کے فرائض کس قدر وسیع واقع ہوئے ہیں —— اور یہ غلطی غالباً اِس امر پر مبنی ہے کہ "پروفیسر" صاحب کو حقیقت میں "علم" کے معنی ہی نہیں معلوم ہیں۔

اُن کے نزدیک "علم" اُن تمام نرم وگرم، معقول و غیر معقول، اور سنجیدہ و خرافات مضامین کے اندر محصور ہوتا ہے جو نصاب کے اندر "مُدوّن" ہوتے ہیں۔

حالانکہ ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک ذمّہ دار رکن کی حیثیت سے اُنھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ "علم" کے معنی ہیں "دانستن" یعنی "جاننا" اور یہ "دانستن" وہ شئے ہے، جس کا احاطہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

میں "کتابی علم" کا پُورا پُورا احترام کرتا ہوں اور "صحیح علم" تک پہونچنے کا اِسے ایک ناگزیر ذریعہ سمجھتا ہوں، مگر یہ خیال کہ "علم" کتابوں کے اندر ہی محصور ہے، ایک ایسا افسوسناک اور محدود خیال ہے، جس کی تائید کرنا، اپنے کو گمراہی میں مبتلا کر دینے کے برابر ہے۔

"کتابی علم" محض ایک علامت ہے، جس کے ذریعے سے ہم "حقیقی علم" تک پہونچ سکتے ہیں۔

بیشک نقشے (اٹلس)، کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، لیکن نقشے کو صرف نقشے کی خاطر دیکھنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا —— نقشے کو دیکھ کر یہ تصور تو ضرور پیدا ہوتا ہے کہ فلاں فلاں مقامات، فلاں فلاں حصّوں میں

ہیں، اور فلاں فلاں حصّوں میں فلاں فلاں دریا بہتے ہیں۔

لیکن زندگی نام ہے عمل کا، یہاں صرف تصورات سے کام نہیں چل سکتا ــــ اگر کوئی شخص نقشے کی مدد سے دُنیا کی سیاحت نہیں کرتا ہے اور اُن مُلکوں، پہاڑوں، اور دریاؤں کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے جو نقشے میں درج ہیں، تو اُس کا نقشے علم کوئی معنی ہی نہیں رکھ سکتا۔

اگر کوئی نقشے کو بچھا کر اُس پر بیٹھ جائے، اور یہ دعوے کرنے لگے کہ دُنیا اُس کے زیرِ نگین ہے، اور وہ "سیّاحِ بحر و بر یا فاتحِ عالم" ہے، تو کیا ایسے شخص کو مجنون نہیں سمجھا جائے گا؟ یہی حال "کتابی علم" کا ہے، اگر کوئی شخص حیات اور اسرارِ حیات سے مُنھ موڑ کر صرف کتابوں ہی کا ہو کر رہ جائے تو کیا کوئی دانا اُسے "عالم" کا خطاب دے سکے گا؟

لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ جنّت نشان ہندوستان عجیب مُلک ہے۔ یہاں کے "پروفیسر" اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ حیات اور اسرارِ حیات، مُلک اور حالاتِ مُلک سے بیگانہ رہتے ہوئے صرف کتابوں کے کیڑے بنے رہیں۔

دوسرے، یا یُوں کہئیے کہ زندہ ممالک میں طُلّاب کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے اندر ہی اپنے مُلک کے تمام سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی مسائل سے بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اور جب کالج سے نکلتے ہیں تو اپنی قوم اور اپنے مُلک کے حق میں ایک سعادت و برکت بن کر نکلتے ہیں ــــ کیا ہمارے طُلّاب سے کہا جاتا ہے، بار بار کہا جاتا ہے، اور بڑے بڑے مقاماتِ بلند سے کہا جاتا ہے کہ خبردار حقیقی دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھنا، تمہارے واسطے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ ہندوستان ایک جزیرہ نما ہے جو ایشیا کے جنوب میں واقع ہے، اور برطانیہ کے ماتحت ہے، اور ہم سب اسی کے وفادار محکوم ہیں۔ اپنے مُلک کے حالات سے ذرہ برابر دلچسپی نہ لینا، ورنہ "امنِ عامّہ" اور "نظمِ عالم" میں اختلال واقع ہو جائے گا اور تمہارے بیدار ہوتے ہی، ہمارے "شریف شہریوں" کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔

آخر اس سرزمین پر یہ اُلٹی گنگا کیوں بہتی ہے، یہاں تمام دُنیا کے مسلّمہ قواعد کے خلاف عمل کیوں کیا جاتا ہے؟ ــــ کیا اِس تہ میں کوئی راز، اور اِس "پردۂ زرنگاری" میں کوئی "معشوق" چھپا ہوا ہے؟

یا اِس مُلک کے حالات کی نوعیت ہی ایسی خطرناک ہے، کہ اگر نوجوانوں کو اِس کا علم ہو جائے گا تو اُن کا گرم خون کھولنے لگے گا اور وہ چشم زدن میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیں گے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو خدا کے واسطے بتائیے کہ ہندوستان کے طالب علموں کو مُلک کے حالات سے قطعی بے خبر رکھنے کی اِس سعیٔ پیہم کی تہ میں کونسا راز پوشیدہ ہے؟

طُلّاب نام ہے مُلک کی نئی نسل اور نوجوان جماعت کا ــــ اور نوجوان ہی دراصل زمانۂ آئندہ کے امین، اور مستقبل کے وارث ہوتے ہیں۔ اگر انھیں اِس سختی کے ساتھ مُلک کے سیاسیات وغیرہ سے ناواقف رکھا جائے گا، تو ذرا انصاف سے بتائیے کہ زمانۂ آئندہ کی امانت، اور مستقبل کی وراثت پھر کس مسخرے کے سپرد کی جائے گی؟ اور مُلک کی حیاتِ نو کا آفتاب کس قبرستان کے اُفق سے بلند ہو گا؟

میری یہ مُراد ہرگز نہیں کہ طالبِ علم کتاب اور کالج چھوڑ چھاڑ کر مُلک کے دیگر مسائل میں اِس طرح مستغرق ہو جائیں کہ علم حاصل کرنے کے امکانات ہی باقی نہ رہیں۔ میں تو صرف اِس قدر چاہتا ہوں کہ جس طرح ایک طالب العلم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے نصاب پر حاوی ہو، اُسی طرح اُس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے مُلک سے بھی بخوبی واقف ہے اور اگر موقع آ جائے تو اپنے نصاب کو اپنی قوم پر قُربان کر دے۔

بعض "سالخوردہ" اور "تجربہ کار" اپنی عینکوں کو ماتھوں پر سرکا سرکا کر فرماتے ہیں کہ طالب علموں کا خون بہت گرم ہوتا ہے، وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں، انھیں سیاسیات کی طرف دعوت نہ دینا چاہئیے۔

وہ شاید طالبِ علم سمجھتے ہیں صرف آٹھ آٹھ دس دس برس کے بچوں کو ــــ کوئی خدا کا بندہ اُنھیں مطلع کر دے کہ کالج کے طالب علم بچے نہیں ہوتے، جوان اور نوجوان ہوتے ہیں، جاہل نہیں ہوتے، پڑھے لکھے ہوتے ہیں، وحشی نہیں شائستہ ہوتے ہیں ــ خود ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جانا تو بڑی بات ہے، اُن میں اِس قدر صلاحیت ہوتی ہے کہ چھوٹے درجے کے طُلّاب کو بھی اپنے قبضے میں رکھ کر مشتعل نہ ہونے دیں۔

اِس کے علاوہ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ ٹھنڈے خون کی دانائیوں کے تمام انبار کو گرم خون کی ایک نادانی پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔

زمانہ دراز سے یہ رونا رویا جا رہا ہے کہ ہمارا نصابِ تعلیم نہایت ہی خراب ہے، لیکن کسی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی ـــــ ہماری تعلیمی مصیبت مکمل ہے۔ صرف ہمارا نصاب، اور طرزِ تعلیم ہی خراب نہیں، ہمارے اساتذہ، اور ہمارے پروفیسر بھی ناامیدی کی حد تک خراب واقع ہوئے ہیں۔

ہندوستانی پروفیسروں کو پروفیسر کہنا دراصل پروفیسری کی توہین ہے۔ اِس ملک میں جہاں لاکھوں باتیں تعجب انگیز ہیں، وہاں یہ بھی ایک نہایت ہی حیرتناک بات ہے کہ اِس جہالت آباد میں کسی کو یہ علم تک نہیں کہ پروفیسر کہتے کسے ہیں، اُس کے علمی، اخلاقی اور ذہنی خصوصیات کیا ہونا چاہئیں، اور اِس بزرگ ترین پیشے کے واسطے کون کونسے شرائط ناگزیر ہیں۔

پروفیسری ایک ایسا قابلِ احترام مرتبۂ بلند ہے جس کے سامنے حکومت کا جھکنا، پروفیسری کی نہیں، خود حکومت کی عزت ہے۔

لیکن اِس ملک میں ہر بی اے، اور ہر ایم اے یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار کی جوتیاں سیدھی کرکے غیرمشروط طور سے پروفیسری کی کرسی پر جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ درخواست گزار اِس منصبِ جلیل کا اہل ہے کہ نہیں، دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ آیا درخواست گزار اچھے توڑ جوڑ کرسکتا ہے کہ نہیں، خوشامد کی ایک کثیر مقدار حسبِ مطالبہ پیش کرنے پر آمادہ ہے کہ نہیں، طالبِ علموں کو وطن، اور حبِّ وطن سے بیگانہ رکھنے میں کامیاب ثابت ہوسکتا ہے کہ نہیں، اور ہماری سازشوں میں ایک اچھے آلۂ کار کی طرح استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں ـــــ اگر درخواست گزار اِس کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو آنکھیں بند کرکے اُس کی درخواست منظور کرلی جاتی ہے۔ اور اُسے لائسنس دے دیا جاتا ہے کہ اپنی جہالت، دناءت اور وطن دشمنی کے تمام حربے استعمال کرکے نئی نسل کی مٹی پلید کر دے۔

ہمارا پروفیسر کلاس میں اِس جذبۂ شریف کے ساتھ لکچر نہیں دیتا کہ اُسے اپنے نونہالوں کو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اُبھارنا، اور انھیں صحیح انسان بنانا ہے۔ وہ تو صرف ڈبل روٹی اور مکھن کھانے، اور پیر سوپ سے منہ دھوسکنے کی خاطر کلاس میں بے تکان چلاتا رہتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے علیم پروفیسر صاحب سے ذرا دریافت تو فرمایئے کہ جنگِ عظیم کے موقع پر انگلستان، فرانس، اور جرمنی کے طلاب کہاں تھے؟ وہ اُس موقع پر "امنِ عامہ" اور "نظم و نسق" Discipline کے نام پر کسی معدے کی خاطر لکچر دیتے ہوئے پروفیسر کی ہوا میں اُڑتی ہوئی رنگین ٹائی کا نظارہ کر رہے تھے، یا پرچمِ جنگ کے خُنک سائے میں برستے ہوئے گولوں سے کھیل رہے تھے؟

دور کیوں جایئے، پوچھیے آج اسپین کے طلاب کہاں ہیں؟ وہ کالجوں کی کرسیوں پر بیٹھے فرسودہ تاریخ کا درس لے رہے ہیں، یا خندقوں میں لیٹے اپنے خون سے ایک نئی تاریخ لکھ رہے ہیں؟

(۲) ایک طالبِ علم کی خودکشی

بات میں بات یاد آتی ہے۔ علی گڑھ کے پروفیسر صاحب ذرا غور سے سُنیں، عبرت کے کانوں سے سُنیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو شاہجہان پور تشریف لے گئے تھے، اور وہاں آپ کی تقریر سُننے کی خاطر ایک طالبِ علم جلسے میں شریک ہوا تھا ـــــ جس کی پاداش میں اُسے برسرِ عام کوڑے مارے گئے تھے۔ اور اِس علانیہ بے عزتی کی تاب نہ لاکر اس غیور طالبِ علم نے خودکشی کر لی تھی۔

طالبِ علم کا جُرم آپ کو معلوم ہے؟ وہ صرف اپنے قومی راہنما کی تقریر سُننے گیا تھا۔ اُس کی سزا آپ کو معلوم ہے؟ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں اُس کی پشت پر کوڑے مارے گئے ـــــ

اِس کا نتیجہ آپ کو معلوم ہے؟ طالبِ علم یہ بے عزتی برداشت نہ کرسکا۔ اور اُس نے خودکشی کر لی۔

اِس موت کی ذمہ داری کس پر ہے؟ طالبِ علم پر، یا کوڑے مارنے والے پر؟

ظاہر ہے کہ وہ طالبِ علم ہندوستانی تھا، وہ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا، اور ہندوستان ہی میں اُسے مرنا تھا ـــــ ہندوستان ہی میں اُس کے باپ دادا پیدا ہوئے تھے، اور ہندوستان ہی کی خاک

میں وہ مدفون ہیں۔

اِس لیئے ہندوستان سے محبت کرنا اُس کے خمیر میں داخل تھا ـــــ اُس نے پنڈت جی کا نام سُنا، اور یہ بھی سُنا کہ وہ میرے مُلک کو نجات دلانا چاہتے ہیں، اور اُسی کے ساتھ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شاہجہان پور آئے ہوئے ہیں، اور آج فلاں مقام پر اُن کی تقریر ہو گی ـــــ چنانچہ یہ ایک قطعی قدرتی اور فطری بات تھی کہ وہ پنڈت جی کی تقریر سُننے کے لئے جلسے میں چلا گیا۔

کیا طالب علموں کا اپنے وطن سے محبت کرنا، اور اپنے وطن کے رہبروں کی تقریر سُننا کوئی جُرم ہے!

اگر حُبِّ وطن کوئی جسُرم نہیں، تو پھر اِس موت کی ذمّہ داری کس پر عائد کی جائے!

کاش طالب علموں کو سیاسیات کی سی قدرتی شے سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرنے والے اب بھی غور فرمائیں۔

(۳) رومان و افسانہ

انھیں صفحات میں بار بار اِس امر پر اظہارِ افسوس کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر صرف رومان اور افسانے پر مٹے ہوئے ہیں، اور جب رومان یا افسانے سے فرصت ملتی ہے تو "مذہبیات" "الٰہیات" میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اِس وقت آگ لگی ہوئی ہے، اور یارانِ طریقت ہیں کہ:۔

خیالِ زُلفِ جاناں کب ہمارے دل سے نکلے گا، الاپے چلے جا رہے ہیں۔

"کلیم" کا رومانی اور افسانوی فائل ہمیشہ بھرا رہتا ہے، لیکن علمی اور عملی مضامین کا فائل حبیب دیکھئے سسکتا نظر آتا ہے۔

رومان و افسانہ دونوں اپنی اپنی جگہ قابلِ عتنا، اور درخورِ التفات ہیں، مگر یہ باتیں بزم کے شایانِ شان ہیں، ہندوستان تو اِس وقت رزم میں مبتلا ہے، اور مُلک کا ہر گوشہ میدانِ جنگ بنا ہوا ہے، ایسے موقع پر رومان اور افسانے کی یہ بھرمار بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے۔ مُلک کی سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی حالت اِس قدر ابتر ہو رہی ہے کہ سب کام چھوڑ کر ہر صاحبِ قلم کو اِس طرف معروف ہو جانا چاہیئے۔ اور رومان اور افسانے میں بھی اِس چیز کو پیشِ نظر رکھنا اُن کا سب سے بڑا فرض ہے۔

ہر چیز وقت پر اچھی معلوم ہوتی ہے، جس وقت ہندوستان کو نجات حاصل ہو جائے گی، اُس وقت میں سب سے پہلے بزم آرائی کا غلغلہ بلند کروں گا، اور ایسے ایسے ترانے چھیڑوں گا جنھیں گوشِ فلک نے بھی کبھی نہ سُنا ہو گا۔

(۴) شاعری اور مولوی

ایک نیک "مولوی صاحب" نے خدا انھیں نیک ہدایت دے، اور اُن کے شعور کو کم سے کم اتنا ضرور ہی بیدار کر دے کہ وہ شعر سمجھنے لگیں ـــــ "علمائے کرام" کے ایک غالباً سہ روزہ اخبار میں "موج در موج" کی سُرخی کے تحت (موج در موج سے شاید پیش جنائی مراد ہے) اِس بات پر نہایت ہی خشونت کا اظہار کیا ہے کہ آج کل کے اکثر و بیشتر شعراء بے دینی و الحاد کی اشاعت میں معروف ہیں۔

"مولوی" اور نشرِ الحاد پر خشونت کا اظہار!

اُسے تو اِس سے خوش ہونا چاہیئے تھا کہ آخر کار ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو نشرِ الحاد میں اُس کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔

نشرِ الحاد میں تو وہ خود صدیوں سے معروف ہے، وہ تو ایک مدّت نامعلوم اِس دھن میں لگا ہوا ہے کہ لوگ نمازیں تو پڑھیں، لیکن بے خضوع و خشوع صرف حوروں اور سونے چاندی کی خاطر ـــــ روزے تو رکھیں، مگر شرائط صوم سے قطعی بیگانہ ہو کر، صرف لوگوں کے دکھانے، اور افطاریاں کھانے کے لئے ـــــ اور جہاد تو کریں، لیکن تلوار ہاتھ میں پکڑ کر باطل سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کو کافر کہہ کر ـــــ

وہ ایک زمانۂ دراز سے عُرس کر رہا ہے، نیازوں کے حلوے کھا رہا ہے، سُنّت کے نام سے سُرمے لگا لگا کر عقد کر رہا ہے ـــــ ڈھولوں پر قوالیاں سُن رہا ہے، اور حال کے نام پر بڑے بڑے موٹے اور بھدّے داڑھی والے مریدوں کو نچوا رہا ہے۔

اُس کا شعار ہے حکام کی خوشامد کرنا، مسلمانوں، ہندوؤں کو لڑانا

مخبری اور غداری کرنا، جھوٹے فتوے لکھنا، خلق اللہ کو اپنے پیٹ کی خاطر بصیرت سے محروم رکھنا، زنان بازاری، اور امردان خوش چشم سے ہاتھ پاؤں دبوانا، اور اُن تمام افعال کا کرنا جن سے دین کی بُنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں ———

یہ سچ ہے کہ وہ زبان سے الحاد کی تعلیم نہیں دیتا، کیونکہ اِس میں مردانگی کی ضرورت ہے، لیکن وہ تمام حرکات کرتا ہے، جو انسان کو مذہبیت سے نا قریب بنا دیتے، اور خدا سے اُس کا دل ہٹا دیتے ہیں۔

اِس کے علاوہ "مولوی" ہی وہ بھلا آدمی ہے جس نے خدا کے تصوّر و تخیّل کو اِس قدر پست کر دیا ہے کہ وہ الوہیت کے مقام بلند سے گر کر انسانیت کی عام سطح پر آ گیا ہے۔

ہندو نے اگر علم کا مندر چھوڑا
مُسلم نے بھی راستی کا ممبر چھوڑا
پنڈت نے اگر بنا دیا بُت کو خدا
مُلّا نے خدا کو بُت بنا کر چھوڑا

نشرِ الحاد کے سلسلے میں شعراء پر اظہار غضب کے بعد اُسی اخبار میں "مولوی" نے اِس بات پر بھی انتہائی تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ شعراء مذہب کی جانب کیوں رُجوع ہوتے ہیں، شاعری کو مذہب سے سروکار ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اور شاعری تو محض "گل و بلبل" کا نام ہے۔ حقائق و معارف سے اِسے علاقہ ہی کیا ہے۔

یہ ہے ہمارے مولویوں کا شعور!

یہ بیچارے صرف اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں، اِس سے زیادہ کی اِن سے اُمید ہی نہیں کی جا سکتی۔

اِن غریبوں نے آنکھیں کھولیں تو غزل کی فضا میں، جس کے اندر "گل و بلبل" "لیلیٰ مجنون" "یوسف زلیخا" "وامق و عذرا" "طور و موسیٰ" "وصل و ہجر" "رقیب و زاہد" اور "زلف و رُخ" کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔

اِن لوگوں میں اتنی گہرائی کہاں تھی کہ وہ یہ سمجھ سکتے کہ غزل تو شاعری کی محض نقالی ہے۔ اصلی اور حقیقی شاعری کو اِن امور سے کوئی تعلق ہی نہیں ——— اور اِسی کم فہمی اور بے بصری کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کہا جا رہا ہے کہ شاعری کو حقائق و معارف سے واسطہ ہی کیا۔

خدا کے اِن "نیک" بندوں سے کون کہے، اور کوئی کہے بھی تو یہ غریب سمجھیں کیونکر کہ شاعری کو زمین سے لیکر آسمان تک، عالم اجسام سے لیکر عالم ارواح تک، اور مادیات سے لے کر مجرد تصورات تک سے ایک ایسا قوی رشتۂ تعلق ہے جسے زمان و مکان کی کوئی قوت توڑ نہیں سکتی۔

شاعر صرف "گل و بلبل" کے واسطے نہیں پیدا ہوا ہے، وہ محض مطرب و مغنی نہیں ہے۔

وہ تو انسانیت کا راہبر، زندگی کا پیغامبر، کرۂ ارض کا امین، اور کائنات کا وارث ہوتا ہے۔

"مولوی" کو شاعری کی بے پناہ وسعت اور ہمہ گیری کا علم نہیں، وہ شاعری کو محدود سمجھتا ہے۔ شاعر کو صرف "حسن و عشق" کی داستان خیال کئے ہوئے، حالانکہ:۔

از زمین، تا بہ آسمان سخن است!

پامالِ غم انسان ہوا جاتا ہے
بیچارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو اُترا ہے فرشتوں کا جنوں
بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

جوش

تنہائی

(شیلے کی ایک نظم سے متاثر ہو کر)

دھوپ میں اس قدر تمازت ہے
خامشی برسرِ حکومت ہے
آسماں یوں ہے ابر سے خالی
جس طرح روشنی سے تاریکی
رقص کرتی ہے موج دریا کی
برق کی ہے ضیا بھی، شوخی بھی
دوپہر کا جلال چھایا ہے
ڈر کے سائے نے منہ چھپایا ہے
اس قدر ہے سُبک زمیں کی نمی
کہ شگوفے کھلا نہیں سکتی
ہے صدائے طیور میں نرمی
اور ہوائے بحور میں نرمی
شہر سے ہمہمہ نہیں اٹھتا
بند ہے سازِ زندگی کی صدا

سطحِ دریا ہے اس قدر ہموار
کہ نظر آرہی ہے تہ کی سوار
موجِ ساحل میں نور کا ہے وفور
نور پر ہو رہی ہے بارشِ نور
آہ اس وقت بھی میں تنہا ہوں
سر جھکائے خموش بیٹھا ہوں

بحر اوڑھے ہے برق کی چادر
بجلیاں گر رہی ہیں دل پہ ادھر
جنبش موج میں ترانہ ہے
بیت لب پر یہ عاشقانہ ہے
"کوئی کافر جو مہرباں ہوتا
اور ہی رنگ داستاں ہوتا"

میری ہمت جواب دیتی ہے
دل کی طاقت جواب دیتی ہے

نہیں آرام ہجر میں دم بھر
تہلکے میں ہے دل، فگار جگر

اب کہاں وہ سکون و صبر و قرار
جانِ اندوہگیں کا تھا جو شعار

ہیچ تھی ساری عشرتِ دنیا
رازداری میں غم کی تھا وہ مزا

دل کو ایک فتنہ گر نے لوٹ لیا
لطف کی اک نظر نے لوٹ لیا

آہ سرمایۂ اثر نہ رہی
لذتِ گریۂ سحر نہ رہی

ہے زمانے کو فکر شہرت کی
جاہ و حشمت کی عیش و راحت کی

میں ہوں اور اک جہانِ مایوسی
زندگی ترجمانِ مایوسی

اُن کو حاصل ہے لطف شربِ مُدام
زہر سے ہے لبالب اپنا جام

سر سے آخر گذر گیا طوفان
اب نہیں وہ کشاکشِ تن و جاں

خارِ حسرت کی وہ خلش نہ رہی
دل وہی ہے مگر تپش نہ رہی

غم، نہ اب انتشار رہتا ہے
موت کا انتظار رہتا ہے

مگر اُن کو خبر بھی ہو کہ نہ ہو
مژہ اشکوں سے تر بھی ہو کہ نہ ہو

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

تاریخ کو منقلب کر دینے والے کِرمہائے ضعیف

اسرائیل احمد خاں

وبائی امراض نے تاریخی واقعات کی رفتار میں زبردست انحرافات پیدا کئے ہیں! قرونِ مظلمہ میں ہمارے آبا و اجداد دیو پیکر شیاطین سے ڈرا کرتے تھے، آج ہم "خوردبینی اجسام" سے لرزہ براندام رہا کرتے ہیں! کمزور اعصاب کے لوگ ازمنۂ متوسطہ میں جب سو کر اُٹھا کرتے تھے تو اپنے بستروں کو پلٹ کر بھوتوں پریتوں کو دیکھا کرتے تھے! ٹھیک جس طرح کہ اک مشہور قصے کی ایک کردار مس مینٹی کرینفرڈ اپنے گدیلے کے نیچے مہیب نقب زنوں کی سُراغ رسانی کیا کرتی تھی! اک زندۂ جاوید تاریخی عمارت کی دیوار پر وہ نشان آج تک ثبت ہے جو اِس طرح بنا تھا کہ مشہور مسیحی امام غیر مقلدین مارٹن لیوتھر نے اپنی دوات اولادِ آدم کے سیاہ قلب "عدو مبین" ــــ شیطان الرجیم ــــ کے مُنہ پر کھینچ ماری تھی!

سینٹ پال کے گرجا کی عمارت کے کارہائے شکست و ریخت کے دوران میں ایک قدیم قسم کی ناس دانی ملی تھی۔ یہ کلیسائے مذکور کے اندر ہی بطور بزرگانِ سلف کے اک تبرک کے رکھ دی گئی۔ ین (ڈین انج) نے یہ کسی قدر اجتہادی رائے پیش کی کہ اِس ڈبیہ کی موزوں تر جگہ گرجا کا کتب خانہ ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا انکشاف یہ تھا کہ یہ ظرفِ حقیر عین وہی ناس دانی ہے جس میں سے ایک "فقیر کی چٹکی" لے کر حضرت سینٹ ڈنسٹن ابلیسِ لعین کی ناک میں چڑھا دیا کرتے تھے، جو وقتاً فوقتاً اُن کے اوقاتِ خاص میں آکر اُن کا ناک میں دم کرنا چاہتا تھا! ظاہر ہے کہ اس چیز کا تعلق سینٹ پال کی تاریخ سے تھا، اور کلیسا کا عجائب خانہ ہی اُس کا حقدار ہو سکتا تھا لیکن میرے ارکانِ جماعت نے میرے فتوے پر صاد نکیا۔ وہ تھوڑے سے تاریخی تخیل کی شئے لطیف سے عاری ثابت ہوئے۔

عہدِ حاضر کے مخصوص آثار و خصوصیات سے یہ بات شمار کئے جانے کے قابل ہے کہ ابھی حال میں ایک امریکی مصنف مسٹر زنسر نے پورے تین سو صفحے میں ایک کتاب شائع کی ہے جو "چوہے، مچھر، پسو اور اُن کا جنگنامہ!" ایسے مہتم بالشان نام و موضوع پر لکھی گئی ہے!! اس علمی واقعۂ نادرہ پر میرے ذخیرۂ دماغ میں اُس عہدِ پاستانی کی یاد تازہ ہو گئی، جبکہ ایسی ناگفتہ بہ مخلوق کا نام لینا بھی شائستہ آدابِ مجلس کے خلاف سمجھا جاتا تھا! ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا؟

چنانچہ کھٹمل کو استعارۃً "نارفک ہاورڈ" کہا جاتا تھا! ناگفتنی لفنگا "بگ" "جناب نارفک" کے اسم گرامی سے یاد کیا جاتا تھا، تاہم بہر حال اُن کی ناقابلِ برداشت شخصیت پر اک پردہ ضرور ڈال دیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ پردہ اک خوشنما نقاب ہی بن گیا تھا!

واضح رہے کہ اشرف المخلوقات حضرت انسان کے لئے ان حقیر و ناچیز کیڑوں مکوڑوں کی ہستی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں! مسٹر زنسر امریکی نے اس کسمپرس مخلوق کی نسبت یہ بلند بانگ دعویٰ پیش کیا ہے کہ انھوں نے تاریخ بشری کے عظیم الشان حوادث پر فرماں فرمائی کی ہے! اُن سارے

جبابرہ و فراعنہ اور اُن تمام قہرمان جرنیلوں اور جہاں سوز فاتحوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر جو تاریخ عالم کی تماشا گاہ پر نمودار ہوئے ہیں! طاعون کے چوہے زرد بخار کے مچھر، اور ٹائفس کے پسّو نے بڑے بڑے نمرودوں اور ہامانوں کی قاہر قوموں اور جرار لشکروں کو عرصۂ ہستی سے محو کر دیا ہے۔

اب یہ تاریخی نظریہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ سکندرِ اعظم "ٹائفس" کے خوردبینی جرثومہ ہی کا صیدِ زبوں بنا تھا۔

اگر اس چھوٹے سے "کرمِ ذلیل" نے اس "بطلِ جلیل" کو نہ نگل لیا ہوتا تو کیا آخر الذکر نے معلومہ دنیا کے باقی حصے کو بھی اپنی نوکِ شمشیر پر نہ اٹھا لیا ہوتا؟ معلوم ہے کہ سکندر اس جوانمرگی کے وقت صرف تینتیس سال کا تھا؛ وہ اک بے پایاں حوصلہ مندی اور اک لامحدود روحِ عمل کا خزینۂ برقی تھا: غالباً وہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین حربی قائد ہوا ہے! کم از کم اس میں تو شک نہیں کہ اُس نے عرصۂ عالم کی چیدہ ترین افواج کی کمان داری کی! اگر وہ زندہ رہتا تو سیاسیات عالم کے دوسرے میدانوں کو کیسا کچھ زیر و زبر نہ کرتا! لیکن ع

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود!

یا للعجب کہ عسکریت و حربیت کے اس دیو مہیب کو اک پسّو نے اپنی چٹکی میں لیکر مسل ڈالا! ؎

مرا اور ارسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

سکندرِ اعظم نے تمام یونانی مستعمرات کو ملا کر ساری دنیائے یونان کے علمبردار کی شان سے اپنے کو مشرق و مغرب کے سامنے پیش کیا تھا! اس صورتِ حال کے نتائج بہت ہمہ گیر ہوتے! چنانچہ سسلی کے یونانی وہاں سے اہلِ قرطاجنہ کو نکال باہر کرنے کی غرض سے "مقدونی پرچم" فتح کو ضرور دعوت دیتے! پھر جنوبی اٹلی کے یونانی قابض بھی نوزائیدہ "رومی خطرے" پر سکندر کی عنانِ توجہ کو موڑتے! ایک مشہور رومی قوم پرست نے یہ لاف زنی کی ہے کہ اہلِ رومہ کے مقابلے میں سکندر فیلقوسی کو منہ کی کھانا پڑتی۔ لیکن یہ صرف چھوٹا منہ بڑی بات ہے!

قرطاجنی ہینی بال روم پر فتح حاصل کرنے سے اس بنا پر ناکام رہا تھا کہ وہ اس عظیم شہر کی دیواروں کے سامنے محاصرے کے آلات اور قلعہ شکن اسباب کے بغیر آیا تھا۔ لیکن مخفی نہیں کہ سکندرِ اعظم نے دنیائے عتیق کے تین مہیب ترین قلعوں ——— صقلیس، ٹائر، گازا۔ کو گرد بنا کر اُڑا دیا! وہ یقیناً رومِ عظیم کی شہر پناہ کو ہفتہ عشرہ میں پاش پاش کر ڈالتا! اور پھر آپ کو خبر ہے کہ اُس کے دُور رس نتائج مابعد کیا ہوتے؟!

غالباً آج ہم یونانی زبان میں گفتگو کرتے سُنائی دیتے! کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ ایطالیہ کی سرزمین پر نہ رومۃ الکبریٰ کی تختگاہ بلند ہوتی نہ حضرتِ پاپائے اعظم کا حرمِ محترم!! ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

بوالعجبی یہ کہ صرف ایک کرمِ ضعیف اس تمام عظیم و ضخیم دفترِ تاریخی کو چاٹ گیا! تقدیرِ الٰہی کی ایک منحرف جنبشِ ابرو اقوام و ممالک کی تاریخ کو کس طرح زیر و زبر کر دیتی ہے۔

یہ قیاس بھی قریباً ایک مسلّمہ تاریخی نظریہ بن گیا ہے کہ "رومن ایمپائر" بھی اس وجہ سے تباہ ہوئی کہ "ملیریا کے مچھر" نے اس قصرِ سر بفلک کی بنیادوں میں سرنگ لگانی شروع کر دی تھی! ممکن ہے کہ منجملہ دیگر اسبابِ ہلاکت کے یہ بھی اک خانہ برانداز عنصر ہو! یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شہر ایتھنز جنگ پیلو پینیزین سے قبل ہی طاعون کی یورشوں سے بہت کچھ خستہ حال ہو چکا تھا، اور رومی سلطنت کی جمِ غفیر آبادیاں مارکس آریلیس اور جسٹنین قیاصرہ کے زمانوں میں عالم آشوب طاعونی دوروں سے غرقِ ہلاکت ہوئی تھیں!

چودھویں صدی کی وبا ——— "مرگِ سیاہ" ——— نے ایک رُبعِ رقبۂ سلطنت کو ویرانی کے منظرِ تاریک میں تبدیل کر دیا۔

اغلب یہ ہے کہ ایک ثلث آبادی براعظم یورپ کی اس قیامتِ صغریٰ میں لقمۂ اجل بنی!

اور صرف چند گمنام کرموں کی قتالیوں کے ہاتھوں!!

کرۂ ارض کے کتنے عظیم حصوں میں ان حوادث کے پھر معاشی مصائب نازل ہوئے ہوں گے!

خوردبینی اجسام نے بہت سی جنگوں کا "ثالث بالشر" بن کر فیصلہ کیا ہے! انہی جراثیم نے ایک خاص تاریخی موقعے پر بیت المقدس کو ویران کر دیا تھا، اگرچہ بعض دیندار مورخین اشوریوں کے قتل عام کو "ملک الموت" کی خون آشامی سے منسوب کرتے ہیں۔

"ہن یاجوج وماجوج" کے سیلاب نے بالکل ممکن ہے کہ ۱۴۲۵ ق.م. میں شہر قسطنطنیہ کو غرقاب کر ڈالا ہوتا۔ اگر طاعون نے پھوٹ کر اس طوفان کی عنان گیری نہ کی ہوتی۔

حروب صلیبیہ کی اکثر یلغاروں کو عربوں کی مدافعت کے بعد اگر کسی چیز نے لپ پا کیا تو وہ وبائی بیماریاں ہی تھیں جو صلیبی مجاہدوں کے کیمپوں پر حملہ آور ہوا کرتی تھیں۔

یورپ کی جنگ سی سالہ کے دوران کے دو معرکوں میں میدان کارزار میں اترنے سے پہلے ہی "ٹائفس" (تپ عفونتی) کے جرثومہ نے فریقین کی افواج کی صفوف کو خالی کر ڈالا تھا!

نپولین نے ہیٹی میں اک سیاہ رنگ کرم وبائی کی جنگی چالوں سے شکست فاش کھائی! واقعہ یہ ہے کہ ۲۵ ہزار فرانسیسی افواج میں سے پورے ۲۲ ہزار کا سُرخ خون تو زرد بخار کے کیڑے ہی نے بہا ڈالا۔

چند سال ہوئے میں نے جنگ عظیم کے نقصانات پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ جنگ عظیم ہی وہ پہلا محاربہ ہے ——— ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و پروشیا کے بعد! ——— جس میں جراثیم نے نسبتہ بہت کم خراج جان وصول کیا۔

جنگ ہفت سالہ (۱۷۵۶ء لغایت ۱۷۶۳ء) میں آسٹریا کی افواج کے نقصانات ۳۲ ہزار مقتول تیغ اور ۹۳ ہزار ۴ سو قتیل امراض پر مشتمل تھے۔

"حروب نپولینی" میں فرانسیسی اتلاف نفوس کے اعداد ناقابل اعتماد ہیں۔ نپولین کی شاہانہ دروغ بافیوں نے ان حسابات کو ساقط الاعتبار بنا دیا ہے۔

لیکن برطانوی افواج میں انہی ایام میں ۹ ۶ ۵ ۳۵ ہلاک اور ۱۹۳۸۵ فوت دکھائے گئے۔ بحری بیڑے میں بیس ہزار میدان کارزار میں اور ۲۰۰۰، بستر مرض پر نذر اجل ہوئے۔

جنگ کریمیا میں انگریزی فوج کے صرف ۴۶۰۲ آدمی میدان میں کھیت رہے۔ درانحالیکہ ۱۷۵۸۰ امراض کی قربان گاہ پر چڑھے! فرانسیسیوں کے نقصانات جنگ و مرض دونوں ذیل میں علی الترتیب ۲۰ ہزار اور ۷۵ ہزار تھے۔

بوئروں کی لڑائی میں ۷۵۳۴ برطانوی سپاہی ہدف تیغ و تفنگ ہوئے اور ۱۴۳۸۲ مختلف امراض کا لقمہ بنے۔

جراثیمی امراض نے بعض غیر ترقی یافتہ اقوام کو مدتوں گرفتار ہلاکت و مصیبت رکھا ہے۔ تاہم اب وہ طبی طور پر "مامون" (Immune) ہو گئی ہیں۔ ہنر پنامہ کا کاٹا جانا اک کوہکنی اور جوئے شیر بر آری سے کم نہ ہوتا۔ اگر قبل اس مہم کے آغاز کے ایک خاص قسم کے مہلک مچھر کے خلاف اک کامیاب معرکہ آرائی انجام نہ دے لی جاتی! وسطیٰ بر اعظم افریقہ کے وسیع خطے "مرض النوم" کا گہوارہ تھے۔ وہ بمشکل انسانی مسکن و مامن بن سکتے تھے۔ اگر وہاں بھی اسی طرح پیشگی طور پر متعلقہ حشرات ارضی و فضائی سے میدان صاف نہ کر لیا جاتا۔ جنوبی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کھونٹی کی شکل کا ایک کیڑا عرصے سے حملے کا ہدف بنا ہوا ہے، جو ان علاقوں کی خراب صحت کا اصلی سرچشمہ ثابت ہوا ہے، اگرچہ اک مدت تک یہاں کے باشندوں کی دائم المرضی کو ان کے ضعف قویٰ و فقدان توانائی سے منسوب کیا جاتا رہا۔

آسمان کے نیچے اک "بہشت ارضی" (Utopia) کی ممکن تاسیس و تعمیر کے سارے مبشرین اس کی فضا کو جراثیم امراض کے فتنے سے اک "حَرَماً آمناً" دکھاتے رہے ہیں۔ شیاطین کی خارج البلدی سے بھی پہلے اس غیر سماوی جنت کو جراثیم سے پاک کر لیا گیا ہے! میں کبھی حیرت سے سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے ستارۂ ارض کی ایسی تطہیر زمین کے مستقبل کے کسی مرحلے پر بھی ممکن ہے؟ تعمیر جنت سے یہ تخریب جہنم بہر حال دشوار تر ثابت ہوگی۔

بہت سے قدیم امراض بلاشبہ اپنی قدامت کی نذر ہو گئے ہیں، یا انکا خراج جان کم ہو گیا ہے۔ لیکن بمشکل کوئی بیماری گم ہو کر لاولد ثابت ہوئی ہے! عموماً بعض جدید تر امراض اس کے وارث بنے ہیں! تاہم وہ پرانی بیماریاں اپنی پرانی علامات و خصوصیات کے ساتھ ضرور روپوش ہو گئی ہیں۔ بعض تاریخی وباؤں کے حالات کافی صحت و احتساب کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں، لیکن موجودہ امراض میں سے کسی سے بھی وہ مماثل قرار نہیں دئے جا سکتے۔ مرض جذام مثلاً شائستہ ممالک سے قریباً معدوم ہو چکا ہے، چیچک اور سُرخ بخار بھی اپنے پیچھے اک "لوح سادہ" چھوڑ گئے ہیں، اور یہ "پسینہ" کون سا مرض تھا جس کا ذکر خیر کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے؟ اس کی اک عادت بد یہ تھی کہ وہ اہل فرنگ کو اپنی نظر انتخاب سے بہت نوازا کرتا تھا! ۱۴۸۵ء اور ۱۵۵۲ء کے درمیان ہمارے آبا و اجداد کو اپنی متواتر قدم رنجہ فرمائی سے بہت رنجور رکھا! لیکن پھر اک پُراسرار طور پر وہ یکقلم غائب ہو گیا! ہنری ہفتم کے اولین سنہ جلوس میں اس نے پایۂ تخت کے میر شہر اور ۶ ارکان بلدیہ کو ایک ہی ہفتے میں لقمہ بنا ڈالا! ہالنشیڈ کہتا ہے

کہ جو لوگ اس جانستان مرض میں مبتلا ہوتے تھے اُن میں سے ایک فیصد بھی بمشکل جانبر ہو سکتے تھے! بعض بعض شہروں میں نصف سے زیادہ آبادی ہلاک ہو کر اُنھیں نصفاً شہر خموشاں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ شروز بیری کے ایسے قصبے سے اُس نے چند دنوں کی مُہلتِ قلیل میں نو سو جانوں کا گراں قدر خراج وصول کیا۔

دوسری طرف، جیسا کہ مسٹر زنزنے اپنے اِستقصار سے معلوم کیا ہے، گزشتہ دو عشراتِ سنین میں تین جدید متعدی امراض نے ظہور کیا ہے! ایک مرض النیم ہے جس نے انگلستان میں مُبصرین کی توجہ کو زیادہ جذب کیا ہے۔

ایک پریشان کُن طبی نظریہ یہ ہے کہ "دوشیزہ سرزمینوں" کو یہ وبا سے زیادہ مَوردِ التفات بنایا کرتی ہے؛ اسی طرح جو خطے مکیاتی حفظِ ماتقدم کی تدابیر کے ذریعے اُسے خارج البلد کر کے "مامون" ہو جاتے ہیں، اک عرصے کے بعد اپنی "امینت" (Immunity) سے پھر غیر مسلح ہو جایا کرتے ہیں!

جزائر فیجی میں ۱۸۷۵ء میں ڈیڑھ لاکھ کی آبادی میں سے پورے چالیس ہزار چیچک کے ناگہانی حملے سے صاف ہو گئے۔ اگرچہ اُس سے پہلے یہ مرض دُنیا کے اس خطے میں قطعاً غیر معلوم تھا، سواحلِ آسٹریلیا سے جست کر کے وہ ان ٹاپوؤں پر آنازل ہوا۔

میکسیکو کے سُرخ ہندی چیچک کے سیاہ داغوں کی دستبُرد سے نابود ہو گئے۔

جزائر کینری کے "گانیچے" لوگ ایک نامعلوم وبا سے ایسے فنا ہوئے کہ اب اس پوری نسل کا ایک فرد بھی یا درفتگان میں رونے والا باقی نہیں۔

لیکن مسٹر زنز کی کتاب کے رومان کا ہیرو (رئیس القصہ) ٹائفس کا پسّو ہے! اس امر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ جب بےشمار کتابیں بنی آدم کے کثیر التعداد قاتلوں ـــــ چنگیز سے کر لینن تک[1] ـــــ پر لکھی گئی ہیں تو ایک رزمیہ روح کُش "ٹائفس" کی قتالیوں کی داستانِ خونیں پر کیوں نہ زیرِ قلم کیا جائے!

ٹائفس اب انگلستان میں قریباً ناپید ہے۔ تاہم ہر بڑی جنگ کے درمیان وہ عموماً کو دپڑا کرتا ہے، اور پلٹ کر حملہ کر کے گویا تیغ و تفنگ کی کمک کرنے لگتا ہے۔

اب یہ اندیشہ کافی سنگین بن گیا ہے کہ مستقبل کی جنگ میں مغرب کی متمدن مآب قومیں ایک دوسری کی غیر مُصافی آبادیوں میں مہلک امراض وبائی کے جراثیم کو پھیلانے کی خاص النخاص مسیحی سُنّت کو انجام دیں گی۔

شاید موجودہ بین الاقوامی ذہنیتوں کے ظہور سے قبل کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ واہمہ نہ آسکتا تھا کہ محسبۂ اُنس انسان ایسی بربریت اور شیطنت پر اُتر سکتا ہے۔ (ترجمۂ ڈین انج)

---

[1] "لینن تک" خوب کہا: "انکویزشن" کی "روایاتِ جمیلہ" رکھنے والے مسیحی مقتدایانِ کلیسا کا لینن اعظم کی "اصلاح بذریعہ اسلحہ" کے اس طرح مُنھ آنا اپنی معصوم بےخبری پر ہی دال ہو سکتا ہے: ؎
اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت + دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ!

ہر صاحبِ جوہر کو بیکس سر کر دے
فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کر دے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
سنبت مسلسل ہو تو کافر کر دے

جوش

نیند کی حقیقت

محمد یوسف کشور

اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کا وظیفۂ طبیعیہ مختلف ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے کان سنتا ہے، ہاتھ چھوتا ہے۔ ناک سونگھتی ہے۔ زبان چکھتی ہے۔ دماغ سوچتا ہے وغیرہ۔ ان ہی وظائف کے اختلاف سے ان اعضاء کے ملذذات و مرغوبات میں بھی اختلاف ہوجاتا ہے۔ آنکھ خوش رنگ پھولوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ کان کو نغمہائے شیریں خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ہاتھ نرم اور چکنی سطح پر پھسلنا چاہتے ہیں۔ ناک کو بوئے معطر سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ زبان کو غذائے لطیف سے ذوق ہے۔ دماغ دل خوش کن خیالات کا متلاشی رہتا ہے لیکن بدنی سکون اور آسائش و راحت خدا کی ایسی نعمتیں ہیں جن کے ساتھ تمام اعضاء کو دلبستگی ہے۔

بظاہر انسان کے بعض متیقظ یعنی بیدار اعضاء ہمیشہ اپنے وظائف میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ دل ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ شرائین کی حرکت ہمیشہ جسم میں تر و تازہ خون پہنچایا کرتی ہے۔ آلات تنفس کبھی معطل نہیں رہتے۔ لیکن درحقیقت ان کو بھی سکون و آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نبض کا ہر توقف ان کے غیر منقطع سفر کی منزل ہے، جہاں وہ آرام لیتا ہے۔ شرائین کے افعال بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ اس میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس وقت ان نازک رگوں کی دوڑ دھوپ بھی خدا کے اس فیض عام سے متمتع ہوتی ہے۔

نیند اسی راحت تام اور سکون کامل کا نام ہے۔ اس لئے وہ اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کو محبوب ہے اور اسقدر محبوب کہ اس کے لطف وصل کو رشک و رقابت منغص نہیں کر سکتے۔ بس اس سے ہر عضو ایک ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بستر خواب سے اٹھنے کے بعد تمام قوائے جسمانیہ کی تجدید ہوجاتی ہے جسم کے جو پرزے چلتے چلتے تھک گئے تھے وہ اپنی اصلی حالت میں آجاتے ہیں اور تمام جسم ایک مسرت تازہ، ایک نشاط نو اور ایک انبساط جدید سے مصلح ہوکر اپنے وظائف طبیعہ کے لئے از سر نو تیار ہوجاتے ہیں۔

ضرورت اختراع و ایجاد کی ماں ہے، اس لئے انسان کا دماغ ہمیشہ اپنے راحت و آسائش کے علل و اسباب کی جستجو میں سرگرم رہتا ہے۔ ادویۂ عقاقیر کے خواص و آثار اسی ضرورت نے دریافت کئے۔ انکشافات جدیدہ کے گنجینۂ پنہاں کی وہی کلید بردار ہے۔ زمین کے نشیب و فراز کو اس نے ہموار کیا۔ کل جو جنگل تھا وہ آج باغ ارم نظر آتا ہے۔ کل جن میدانوں میں درندوں کے جھنڈ نظر آتے تھے آج وہی متمدن انسانوں کا مسکن ہے۔ دریا کی سطح جو کل تک تلاطم خیز طوفان برپا کر رہی تھی آج انسان نے خود اس کو مسخر کر لیا ہے کل تک جو چیزیں پردۂ غیب کا چھپا ہوا راز سمجھی جاتی تھیں، آج وہ افسانۂ بزم انجمن ہیں لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیند کی حقیقت اور اس کے علل و اسباب کا قلعہ ضرورت کی اس فاتحانہ عقدہ کشائی سے اب تک محفوظ ہے جس طرح وہ اس وقت غیر متعین تھے۔ جیسا ایک وحشی انسان غفلت کی نیند سو رہا تھا اسی طرح وہ اب بھی مجہول و مشتبہ ہیں۔ جبکہ ایک متمدن انسان

اکتشاف واختراع کی دھن میں رات رات بھر جاگا کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کی جستجو بیکار تھی، وہ خواب وغفلت کا زمانہ تھا لیکن اس بیداری کے زمانے میں بھی ہیں اب تک اس کی کوئی تسکین بخش تجدید نہیں کی گئی۔ جدید دور انکشافات کے علم برداروں نے اس کے متعلق جو کچھ تحقیق وتفتیش کی ہے وہ بھی زیادہ قابل وقعت نہیں۔ تاہم منزل مقصود کا اڑتا ہوا غبار بھی شوقِ جستجو کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس لئے ہم کو اس افسانۂ خواب وخیال سے کم از کم لطفِ سماع تو ضرور اٹھا لینا چاہئے۔

بعض علمائے جدید کا خیال تھا کہ نیند خون کی اس کثرت مقدار کا نتیجہ ہے جس کی رو لیٹنے سے انسان کے دماغ میں دفعتاً پہنچ جاتی ہے۔ خون کی اس حرارت کا نتیجہ ہے کہ انسان سوتے وقت گرمی کے احساس سے کپڑا اتار دیتا ہے لیکن تجارب علمیہ اس خیال کی تائید نہیں کرتے، بلکہ اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی حالت میں دماغ کی معمولی مقدار خون بھی کم ہوجاتی ہے۔

ایک شخص ایام طفلی میں سر کے بل گر پڑا تھا۔ ہڈی کے ٹوٹنے سے اسکی پیشانی پچک گئی تھی لیکن جب وہ سوتا تھا تو پیشانی کا یہ پچکا ہوا حصہ اور بھی گہرا ہوجاتا تھا اور جاگنے کے بعد پھر ابھر آتا تھا۔ پس اگر دماغ حالتِ خواب میں بہ نسبت بیداری کے خون کی غیر معمولی مقدار سے لبریز ہوجاتا تو نتیجہ بالکل برعکس ہوجاتا۔

زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں، ہر شخص معمولی حالتوں میں اس کے خلاف تجربہ کرسکتا ہے۔ انسان اگر گھنٹوں چپ لیٹا رہتا ہے (خاص خاص حالتوں کے علاوہ) اس حالت میں نہ اس کو نیند آتی ہے اور نہ دماغ میں کسی جدید کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے بالکل اس کے برعکس رائے قائم کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عالمِ خواب میں دماغ خون کے معمولی حصہ رسدی سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ خون ہی دماغ کی غذا ہے جس سے وہ عمل کرتا ہے اور اسی کی حرارت سے فضلات دماغیہ کو تحلیل کرسکتا ہے۔ اس لئے خون کی اس قلت مقدار کی وجہ سے نہ تو اس کو خود خون کے اجزاء میں کسی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ وہ اس کے ذریعہ فضلات ہی کو دفع کرسکتا ہے، بلکہ بالکل بیکار محض ہوجاتا ہے۔ اس تعطل اور بیکاری کا نام نیند ہے۔

لیکن درحقیقت یہ خیال بھی قابلِ وثوق نہیں۔ تجارب سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے کے ساتھ ہی دفعتاً انسان کے دماغ میں معمولی مقدار سے زیادہ خون کی ایک رو پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیند کی حالت میں انسان کا چہرہ سرخ ہوجاتا ہے اور چہرہ کی سطح ظاہری بھی کسیقدر ابھر آتی ہے۔

بعض علماء نے آلات کے ذریعہ ایک آدمی کے دماغ میں خون کی مقدار زیادہ پہنچائی اور پھر اس کو کم کیا تو معلوم ہوا کہ نیند پر خون کی کمی یا بیشی کا کوئی اثر نہیں پڑتا...... ان دونوں خیالات کا دارومدار تمام تر اس پر تھا کہ نیند کا سبب خون کی مقدار کی کمی یا بیشی ہے لیکن بعض علماء کے نزدیک خون کی مقدار کا کوئی اثر خواب وبیداری پر نہیں پڑتا۔ بلکہ خون کی کیفیت میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہی نیند کی علت ہیں کبھی کبھی خون میں اسقدر حرارت اور روانی پیدا ہوجاتی ہے کہ دماغ اس پر قابو نہیں پاتا اور حرارت خون کی وجہ سے دماغ کے اعصاب کی رطوبت خشک ہوجاتی ہے۔ اس بنا پر دماغ کو جو چیز عمل کے لئے آمادہ کرتی تھی وہی اس کو بیکار کردیتی ہے اور اس تعطل کا نام نیند ہے۔

ان علماء نے مختلف علائم اور آثار سے اس کی تائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں تغیرات دمویہ کی وجہ سے جب انسان گہری نیند سے اٹھتا ہے تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا ہوتا ہے اور اس کی جلد میں بھی ایک ابھار سا پیدا ہوجاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اگرچہ اعصاب کے جال نے تمام اعضاء انسانیہ کو دماغ کے ساتھ مربوط کردیا ہے لیکن کبھی کبھی ایک خاص کیفیت عصبانیہ دماغ واعضاء کے ان ارتباطات وتعلقات کو منقطع کردیتی ہے جو دماغ واعضاء میں حرکت کرتے رہتے تھے۔ ان تعلقات کے منقطع ہونے سے تمام جسم انسانی معطل ہوجاتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام نیند ہے۔ لیکن اب تک اس پر کوئی یقینی دلیل قائم نہیں ہوئی ہے البتہ دوسرے علماء نے اس کے قریب قریب یہ رائے قائم کی ہے کہ جن اعصاب کا وظیفۂ طبیعہ تمام جسم میں خون کا پہنچانا ہے۔ ان میں اسباب خارجہ تغیرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اور یہی تغیر خواب ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان اسباب کو نشاط انگیز ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ نرم بستر کو دیکھنے کے ساتھ ہی نیند آجاتی ہے

اور شور و غل ہم کو دفعتاً بیدار کر دیتا ہے قصّوں کے سننے سے، بستر پر لیٹنے سے بچوں کو تھپکیاں دینے سے اس لئے نیند آجاتی ہے کہ یہ اسباب اعصاب میں ایک خوشگوار اور لطیف تموّج پیدا کر دیتے ہیں۔

درحقیقت اس رائے کا سلسلہ بھی ان لوگوں کے خیال سے جا کر مل جاتا ہے جو دماغ میں خون کی کمی کو نیند کا سبب قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان تمام موثرات خارجیہ سے اعصاب میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوتا ہے جو دوران خون کی سُرعت کو کم کر دیتا ہے۔ لیکن ان تمام مذاہب کا رد (جو خون کی کمیت کیفیت کو نیند کی علّت قرار دیتے ہیں) ایک دوسرے عملی تجربہ نے کر دیا ہے خود میرے ایک عزیز کے ہاں دو توام بچے پیدا ہوئے اُن میں ایک بیدار رہتا تھا اور دوسرا اسی حالت میں سوتا تھا حالانکہ دونوں کے خون کا ظرف ایک دوسرے سے متصل تھا، اگر خون کی کمیت و کیفیت اس کا سبب ہوتے تو دونوں کی حالت خواب و بیداری میں ضرور تلازم ہوتا۔

اسی طرح کیمسٹری کے اصول و قواعد نے نیند کی جو حقیقت بتائی ہے وہ ان خیالات سے کہیں زیادہ دلچسپ و اہم ہے۔ انسان کا جسم درحقیقت ایک ٹرین ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے لیکن جب کوئلہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ انجن میں راکھ بھر جاتی ہے تو اس کو مجبوراً رُک جانا پڑتا ہے یہی حال انسان کے دماغ کا ہے۔ جب تک اس کو ایندھن ملتا رہتا ہے اور اس میں راکھ نہیں بھرنے پاتی اس وقت تک اپنے وظائف طبیعہ میں سرگرم رہتا ہے لیکن جب ایندھن وغیرہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ فضلات جمع ہو جاتے ہیں تو انجن کی طرح وہ بھی دفعتاً رُک جاتا ہے اور اسی کو ہم خواب شیریں کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اعصاب دماغیہ اپنے وظائف عملیہ میں دو چیز کے محتاج ہوتے ہیں اوکسیجن (Oxygen) اور کروماٹوفیل (Chromatophill) اس لئے دماغ آکسیجن کا ایک معتد بہ ذخیرہ جمع کرتا رہتا ہے اور جس طرح اسٹیشن پر کوئلہ پانی لینے کو گاڑی ٹھہر جاتی ہے اسی طرح دماغ بھی آکسیجن جمع کرنے کے لئے ایک خاص وقت میں سو جاتا ہے، اس لئے نیند درحقیقت اس استعداد کا نام ہے جس کو انسان کا دماغ اپنے سفر کے لئے تیار کرتا ہے۔

کروماٹوفیل کی کافی مقدار ہمیشہ خلایائے عصبیہ میں جمع رہتی ہے اور نیند اس خزانے میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی ہے لیکن ریاضت شدیدہ اور اعمال شاقہ اس کو فنا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سخت محنت کے بعد انسان کو نہایت گہری نیند آتی ہے۔

تجاربِ عملیہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے دماغ کا طبّی معائنہ کیا گیا جو مدت سے نہیں سویا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کا دماغ کروماٹوفیل سے بالکل خالی ہے۔

لیکن جب انسان سرگرم عمل رہتا ہے تو صرف یہ اجزا فنا ہی نہیں ہو جاتے جو دماغ کے انجن کا کوئلہ ہیں بلکہ جس قدر فنا ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس میں فضلات بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئلہ جس قدر جلتا ہے انجن میں اسی قدر راکھ بھی بھر جاتی ہے۔

حالت عمل بیداری کے اندر اگرچہ دماغ میں اور بھی متعدد قسم کے زہر آلود فضلات پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی حقیقت اس وقت تک غیر متعین ہے۔ اب تک صحیح طور پر صرف کاربونک گیس کا علم ہو سکا ہے، جو سخت محنت کی حالت میں بکثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر نیند درحقیقت آکسیجن اور کروماٹوفیل کی قلت اور کاربونک گیس کی کثرت تولید کا نتیجہ ہے۔

نیند کی حقیقت کے متعلق یہی آخری مذہب ہے جو قرین صحت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے روزانہ تجارب بھی بظاہر اس کی تائید کرنے کے لئے تیار ہیں، ہر شخص کو صاف نظر آتا ہے کہ وہ کسان جو دن بھر ہل جوتتا رہتا ہے اُس شہری سے زیادہ نیند کا لطف اٹھاتا ہے جو لہو و لعب میں اپنے وقتِ عزیز کو ضائع کر دیتا ہے .... لیکن یہ مذہب بھی اب تک مشکوک اور اعتراضات سے خالی نہیں ہے عمل کیمیاویہ کے تمام نتائج لازمی ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئلہ کے ختم ہو جانے اور انجن میں راکھ بھر جانے سے گاڑی فوراً رُک جاتی ہے اور پھر اس حالت میں کوئی طاقت اس کو نہیں چلا سکتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو سخت محنت کے بعد بھی اضطراری نیند نہیں آتی۔ حالانکہ دماغ آکسیجن اور کروماٹوفیل سے خالی ہوتا ہے اور اس میں کاربونک گیس بھی بھر چکی ہے۔ علاوہ بریں سخت محنت کے بعد بھی قصداً جاگنے کی ہر شخص قدرت رکھتا ہے۔ حالانکہ عمل کیمیاویہ کا اثر اضطراری ہوتا ہے۔ اس سے قوی تر اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ مذہب صحیح ہے تو اس کا اثر خواب و بیداری کے اوقات پر بھی ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر ایک شخص آدھی رات کو سویا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سونے کے پاؤ گھنٹہ پہلے اس کے دماغ میں آکسیجن اور کروماٹوفیل کی

جگہ کاربونک گیس کا وہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جو نیند کا اصلی سبب ہے۔ لیکن اب سونے کے پاؤ گھنٹہ کے بعد ہی نیند کاربونک گیس کے ان تمام اجزاء کو فنا کر دے گی جو نیند سے پاؤ گھنٹہ پہلے پیدا ہو گئے تھے اور ان کی جگہ آکسیجن اور کروماٹوفیس کے اجزا پیدا ہو جائیں گے، جو بیداری کی علت ہیں۔ اس بنا پر اس شخص کو پاؤ گھنٹہ بعد ہی بیدار ہونا چاہئے۔ حالانکہ ہر شخص کا تجربہ اس کے خلاف شہادت دیگا۔

علماء موجودہ نے اس آخری مذہب پر بھی قناعت نہیں کی اور تحقیق جدید کے لئے دوسرے تجارب جمع کئے، چنانچہ انھوں نے چند کتوں کو مدت تک بیدار رکھا لیکن نہ تو ان کی جسم کی حرارت میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ کاربونک گیس کے اجزاء میں کسی قسم کا اضافہ ہوا اور نہ ہی آکسیجن کی تولید میں کوئی نمایاں فرق نظر آیا خون کی رطوبت اور اس کی کمیت اور کیفیت بھی اپنی اصلی حالت پر قایم رہی البتہ دس دن کے بعد ان کی یہ حالت ہوگئی کہ ان کے اعصاب بالکل بے حس تھے اور کسی قسم کے اسباب خارجیہ کا ان پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس حالت نے ان کے اعصاب میں ایک ایسا اضطراری تموج پیدا کر دیا تھا جو کسی دوسرے طریقہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ سو گئے اور پھر بیدار ہوئے تو یہ تموج عصبی بالکل زائل ہو چکا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دماغی اضطراب کی وجہ کیا ہے؟ تکان یا فضلات دمویہ کی تولید۔ اگر اس اضطراری نیند کا سبب خون کی کمیت و کیفیت اسباب خارجیہ کا اثر یا وہ فضلات دمویہ ہیں جن کو اوپر کے تمام مذاہب میں نیند کا سبب بتایا گیا ہے تو ہم ان کو آلات کے ذریعہ دوسرے حیوانات کے دماغ میں پہنچا سکتے ہیں اور اگر نیند ان کا لازمی نتیجہ ہے تو ان کو سو جانا چاہئے حالانکہ تجربہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔

چنانچہ ایک کتے کو چند دنوں تک بیدار رکھ کر اس کا خون حقنہ کے ذریعہ ایک دوسرے کتے کے جسم میں داخل کیا گیا اگرچہ اس احتقان سے اس کتے کی دوسری دماغی کیفیات اور آثار میں اختلاف پیدا ہوا لیکن خواب و بیداری کا اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس لئے خون کی کمیت اور کیفیت نیند کا سبب نہیں ہو سکتے۔

لیکن اس اعتبار پر بظاہر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ نیند کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے۔ اس بنا پر تمام جسم کا خون اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے انھوں نے ایک ایسے کتے کا خون جو چند دن بیدار رکھا گیا تھا ایک ایسے کتے کے دماغ میں پہنچایا جس کے اعصاب میں بیداری نے کسی قسم کا تغیر نہ پیدا کیا تھا۔ خون پہنچنے کے ساتھ ہی اس کتے پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ فوراً سو گیا۔ اس تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند کا سبب تکان یا وہ فضلات دمویہ نہیں بلکہ وہ سیال مادہ ہے جو مبدء اعصاب کے اطراف میں پھیلا ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس مادہ کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟ تو انین فطرت نے ابھی تک اس راز کو اپنے خزانہ میں محفوظ رکھا ہے۔

اک آگ سی رہ رہ کے بھڑکتی ہے ضرور
سینے میں کلی سی اک چٹکتی ہے ضرور
واقف نہیں میں خدا سے لیکن اُسے
دل میں اک پھانس سی کھٹکتی ہے ضرور

جوشؔ

ناگن بن کر پیچ نہ ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل
وہ بیچ پہل جاتا ہے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب بھی نہ برسنا بادل

جوشؔ

فیڈرل فنانس

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالیاتی تعلقات

عبدالرحیم شبلی
بی کام

گزشتہ سال کسی صاحب نے رسالہ "کلیم" میں ہندوستان کے نئے دستور اساسی پر ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا۔ لیکن قابل مضمون نگار نے آئین کے سب سے اہم جزو فیڈرل فنانس یا وفاقی مالیات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب چونکہ اپریل ۱۹۳۷ء سے جدید آئین حکومت نافذ ہو چکا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ایک مبسوط تبصرہ فیڈرل فنانس پر بھی حوالہ قلم کیا جائے۔

فیڈرل فنانس سے مراد وہ مالیاتی تعلقات ہیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان قایم کئے گئے ہیں۔ ان جدید تعلقات کو کما حقہ ذہن نشین کرنے اور ان کی تدریجی ترقی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان سے پیش از یں تعلقات پر ایک سرسری نظر ڈالیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں پائے جاتے تھے۔

اصلاحات ۱۹۱۹ء سے قبل

۱۸۳۳ء سے لیکر ۱۸۷۰ء تک تمام مالیاتی اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا یعنی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ہی تمام محاصل جمع کرتی تھی اور صوبوں کو ان کے مطالبے کے مطابق کچھ رقم اخراجات کے لئے دے دیتی تھی۔

اس طریق سے صوبائی مالیات میں فضول خرچی اور کافی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے بد اطمینانی پیدا ہوتی تھی۔ اور مرکزی بجٹ میں کسی رقم کے متعین نہ ہونے کی وجہ سے عدم تیقن پیدا ہوتا تھا۔

سر جون اسٹریچی کے الفاظ میں "سرکاری آمد کی یہ تقسیم ایک جذبہ مسابقت بن کر رہ گئی جس میں بلا لحاظ معقولیت سب سے زیادہ شور مچانے والے کو ہمیشہ فائدہ ہوتا تھا۔" جس سے مراد یہ ہے کہ جو صوبہ اپنے مطالبات زیادہ شد و مد کے ساتھ پیش کرتا اور کنویسنگ میں بڑھ جاتا۔ اس کو رقم بھی سب سے

---

[1] اس مضمون کی تیاری کے لئے میں نے مندرجہ ذیل کتب کی امداد لی ہے :-
(۱) "ہندوستان کی صوبائی مالیات" مصنفہ بنرجی
(۲) "صوبائی مالیات" مصنفہ ڈاکٹر امبیدکر
(۳) میسٹن کمیٹی رپورٹ
(۴) مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ
(۵) معاشیات ہند جتھاریری ۱۹۳۶ء ایڈیشن
(۶) سائمن کمیشن رپورٹ
(۷) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

[2] دیکھو کلیم ماہ جون و جولائی و ستمبر ۱۹۳۶ء

زیادہ وصول ہوتی۔

پھر اِس نظام کے مطابق صوبوں کے ہاتھ بالکل بندھ گئے تھے۔ وہ کوئی نیا کام بلا منظوریٔ مرکزی حکومت نہیں کرسکتے تھے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک مہتر بھی کسی صوبائی حکومت کو مقرر کرنا ہوتا تو اُس کی منظوری کے لئے مرکزی حکومت کو لکھنا پڑتا تھا۔ پھر جو روپیہ اُن کو دیا جاتا وہ بھی اُن کی ضروریات کے لئے قطعاً کفتی نہ ہوتا۔ اور وہ کسی معاشی ترقی کرنے سے معذور رہتے تھے۔

لارڈ میو نے اس نقص کو محسوس کیا۔ اور کوشش کی کہ صوبائی حکومتوں کی آسانی کے لئے کسی قدر عدم مرکزیت روا رکھی جائے یعنی کسی حد تک صوبوں کو مالی خودمختاری دے دیجائے تاکہ وہ اپنی اقتصادیات درست کرسکیں۔

۱۸۷۰ء میں اُس نے ایک "صوبائی بندوبست" مروج کیا جس کی رو سے بعض مقامی اہمیت کے محکمے از قسم پولیس۔ تعلیم۔ رجسٹریشن۔ ہسپتال جیل سڑکیں وغیرہ صوبائی حکومتوں کے سپرد کر دیئے اور اُن کے اخراجات کے لئے امدادی رقومات مقرر کیں جو کہ مختص صوبوں کو دیدی جاتی تھیں۔ اگر زائد روپیہ کی ضرورت ہوتی تو صوبوں کو اجازت تھی کہ وہ مقامی طور پر کوئی محصول لگا کر روپیہ جمع کرلیں، اس نئے انتظام سے صوبائی اخراجات زیادہ مفید مدّات پر صرف ہونے لگے اور اُن کو کسی حد تک مالیاتی آزادی بھی میسر ہوگئی۔

یہ انتظام ۱۸۷۷ء تک مروج رہا۔ آہستہ آہستہ اُس کے نقائص بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔ اِس سے صوبوں کو کافی روپیہ حاصل نہ ہوتا تھا۔ ہر سال جو گرانٹ مرکزی حکومت کی دی جاتی تھی وہ اُس کی اپنی ضروریات پر منحصر ہوتی۔ اگر فاضلہ کافی ہوجاتا تو گرانٹ بھی بڑھاری جاتی۔ ورنہ اگر مرکزی حکومت کو خود روپیہ کی ضرورت ہوتی تو گرانٹ بھی کم کردی جاتی تھی۔

اس بندوبست کے ماتحت صوبوں میں کفایت کا جذبہ بھی چنداں پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ اگر اُن کو زیادہ روپیہ کی ضرورت ہوتی تو وہ کوئی نیا ٹیکس لگا سکتے تھے۔ جو اُس زمانہ کے حالات کے مطابق غریبوں پر مزید بوجھ اور بار کا باعث بنتا۔

۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے اپنے وزیر مالیات سر جون سٹریچے کی امداد سے عدم مرکزیت کے اصول کو ذرا وسیع کیا۔ اُس نے باقی ماندہ مدّات کو بھی جو اکثر و بیشتر صوبائی طرز کی تھیں صوبائی مالیات میں منتقل کر دیا مثلاً مالگذاری جنگل۔ سٹیمپ۔ عام انتظام۔ قانون اور عدالت۔ سب مدّات صوبائی بنادی

لیکن گزشتہ محکمہ جاتی آمد اور سالانہ گرانٹ بھی برقرار رہی۔

اس انتظام کے ماتحت آمد دو حصوں میں منقسم کی گئی۔ مرکزی اور صوبائی۔ اگر صوبوں کی آمد میں کوئی فاضلہ ہوتا تو گورنمنٹ آف انڈیا اُس کے نصف کی حصہ دار بننے کی مجاز تھی۔ اِسی طرح اگر کوئی خسارہ پڑتا تو وہ نصف حصہ میں شریک ہوتی۔

باوجود اس کے معلوم ہوا کہ ہر سال امدادی رقومات کا دینا بھی ناگزیر تھا اور وہ اکثر اوقات جھگڑے کا باعث بنتیں۔ جن محاصل میں صوبجات کو حصہ نہ ملتا اُن کی تحصیل کے لئے وہ کسی سرگرمی یا جد و جہد کا مظاہرہ نہ کرتے۔

۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے میجر بیرنگ وزیر مالیات کی امداد سے ذرائع آمد کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ مرکزی۔ صوبائی و منقسمہ

مرکزی ذرائع آمد یہ تھے۔ افیم۔ نمک۔ درآمد برآمد تجارتی محاصل۔ وغیرہ۔

صوبائی ذرائع غیر مصارفی محکمہ جات اور مقامی محاصل وغیرہ تھے اور منقسمہ ذرائع میں جنگی۔ سٹیمپ۔ جنگلات۔ رجسٹریشن وغیرہ شامل تھے۔

بجائے مقررہ زرِ امداد دینے کے صوبجات کو مالگذاری کا کچھ فیصدی حصہ دیدیا جاتا تھا تاکہ اُن کی مالیات درست رہیں۔

اس نظام پر ہر پانچ برس کے بعد نظرثانی کی جاتی تھی۔

اِس طریق کا نقصان یہ ہوا کہ ہر پانچ سال کی نظرثانی سے مالیاتی دستور العمل میں یکسانیت نہ رہتی تھی۔ نیز صوبجاتی بجٹ میں اگر کوئی فاضلہ ہوتا تو اُس پر گورنمنٹ آف انڈیا قابض ہوجاتی تھی۔ پھر اگر کوئی صوبہ کفایت کرکے اخراجات میں کمی واقع کرتا تو اگلے سال کے لئے اُس کی گرانٹ اُسی کم خرچ کے معیار پر مقرر کی جاتی۔ اس طرح پر گویا صوبجات میں کفایت کی کوئی خواہش ہی نہ رہی۔

اِن نقائص کو دور کرنے کے لئے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۴ء میں بندوبست عارضی کو مستقل کر دیا۔ یعنی صرف اُس وقت اُس پر نظرثانی کی جاتی تھی جب بدلے حالات میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی یا جنگ اور قحط وغیرہ ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہوجاتے صوبجات کو بھی مرکزی گورنمنٹ کی مالی حالت کے مطابق مقررہ رقوم بغرض تعلیم۔ حفظانِ صحت اور پولیس وغیرہ بطور زرِ امداد دی جانے لگیں۔

۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ نے اس انتظام کو قریباً مستقل کر دیا اور ذرائع آمد کی مندرجہ ذیل تقسیم کی۔ مرکزی گورنمنٹ کے لیے افیم۔ ریلوے

درآمد برآمد۔ نمک۔ ٹکسال اور مبادلہ۔ ڈاک خانے اور تار گھر۔ فوجی محکمہ سے آمد اور دیسی ریاستوں سے خراج۔ صوبائی حکومتوں کے لئے جنگلات۔ چنگی۔ (صرف بمبئی اور بنگال میں) رجسٹریشن اور آمد از محکمہ جات تعلیم۔ قانون اور عدالت۔

علاوہ ازیں بعض ذرائع ایسے بھی تھے جن کی آمدنی مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی مثلاً مالگذاری۔ انکم ٹیکس۔ چنگی (سوائے بمبئی اور بنگال کے) آبپاشی اور اسٹیمپ۔ اخراجات کی تقسیم بھی کچھ اسی طرح ہی کی گئی صرف قحط کے مصارف کے لئے انتظام قدرے مختلف کیا گیا۔

الغرض یہ تھے مالی حالات جو ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے قبل مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان پائے جاتے تھے۔ ان میں مندرجہ ذیل نقائص تھے:۔

(۱) جن ذرائع کی آمدنی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کی جاتی تھی ان میں مرکزی حکومت گاہے بگاہے دخل اندازی کرتی رہتی جس کی وجہ سے صوبائی ترقی کو نقصان پہنچتا۔

(ب) چونکہ صوبجات کے لئے امدادی رقومات غیر متعینہ ہوتی تھیں اس لئے اُن کا اثر صوبائی مالیات پر چنداں خوشگوار نہ پڑتا۔

(ج) ہر صوبہ کو مختلف زرِ امداد ملتا اس لئے صوبوں میں مالیاتی عدم مساوات پیدا ہوتی۔

(د) صوبائی حکومتوں کو زائد روپیہ کے لئے از خود محصول بندی اور قرضہ جات اٹھانے کے اختیارات حاصل نہ تھے۔

(س) صوبائی آمد و خرچ پر مرکزی حکومت زائد از ضرورت ضبط رکھتی مثلاً صوبجات کو خسارہ کے لئے بجٹ بنانے اور فاضلہ کو آزادانہ صرف کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔

مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم ۱۹۱۹ء کے بعد

اصلاحات ۱۹۱۹ء کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان مالیاتی تعلقات کو بالکل بدل دیا گیا۔ چونکہ صوبجات کو کسی حد تک خود مختاری دی جاتی تھی اور مالیاتی عدم مرکزیت کے اصول پر عمل کیا جانے لگا تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ مقسومہ ذرائع آمد کو اڑا دیا جائے اور بجٹ کے اندراجات کو از سرِ نو کسی اور طریق سے ڈھالا جائے۔

چنانچہ آمد و خرچ کی تقسیم مندرجہ ذیل طریق پر کی گئی:۔

مرکزی ذرائع آمد:۔ افیم۔ نمک۔ درآمد برآمد۔ انکم ٹیکس ریلوے۔ ڈاک خانے اور تار گھر۔ فوجی محکمہ سے آمد۔

صوبائی ذرائع آمد:۔ مالگذاری (مع آبپاشی) ٹکٹ (عدالتی و تجارتی)۔ رجسٹریشن۔ چنگی اور جنگلات۔

اس تقسیم کے خلاف زیادہ تر بمبئی اور بنگال نے جو صنعتی صوبے تھے صدائے احتجاج بلند کی۔ کیونکہ انکم ٹیکس کو مرکزی ذریعۂ آمدنی بنا دینے کی وجہ سے اُن کو سخت نقصان ہوا۔ اور اُن کی صنعتی ترقی معرضِ خطر میں پڑ گئی۔

فیصلہ میسٹن

اصلاحات ۱۹۱۹ء کے مطابق مقسومہ ذرائع کو اڑا دینے اور مالگذاری اور اسٹیمپ ایسے ذرائع کو صوبائی بنا دینے کی وجہ سے مرکزی گورنمنٹ کو نو کروڑ تراسی لاکھ روپے کا خسارہ ہوا۔ اس لئے تجویز کی گئی کہ اس کمی کو صوبائی عطیات سے پورا کیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ میسٹن کے زیرِ صدارت ایک کمیٹی اس سوال اور متعلقہ مسائل پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ میسٹن کمیٹی کی تجاویز بالعموم میسٹن ایوارڈ یا فیصلہ میسٹن کے نام سے مشہور ہیں۔

اس فیصلہ کی رُو سے قرار پایا کہ ہر صوبہ اپنی اُس خوشحالی کی نسبت سے جو جدید تقسیم ذرائع آمدنی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ مرکزی گورنمنٹ کو کچھ چندہ دے تاکہ اُس کا خسارہ پورا ہو۔ مثلاً مدراس کی خوشحالی بقدر پانچ کروڑ چھہتر لاکھ روپے بڑھی۔

چنانچہ اُسے تین کروڑ اڑتالیس لاکھ روپیہ بطورِ چندہ مرکزی گورنمنٹ کو دینا پڑا۔ اسی طرح بمبئی کی خوشحالی صرف بقدر ترانوے لاکھ روپیہ بڑھی۔ اور اُسے اسی نسبت سے صرف چھپن لاکھ روپیہ گورنمنٹ آف انڈیا کو نذر کرنا پڑا۔

صوبائی عطیات کی تنسیخ

میسٹن ایوارڈ نے کسی کو خوش نہ کیا۔ ہر صوبہ میں اُس کے

خلاف ناراضگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مثلاً بمبئی اور بنگال تو انکم ٹیکس کی آمدنی کے ہاتھ سے نکل جانے پر غیر مطمئن رہے۔ اور مدراس۔ پنجاب اور یو پی ایسے زراعتی صوبجات نے اِن عطیات کو اپنی طاقت سے باہر سمجھا۔

صوبائی مالیات پر عطیات کا بار اِس لئے بھی زیادہ ہوگیا کہ میسٹن کمیٹی کی توقعات کے خلاف صوبائی بجٹوں میں بجائے فاضلہ کے خسارہ ہونے لگا۔ دوسرے جو ذرائع آمدنی اُن کو تفویض کئے گئے تھے یا تو مالگذاری کی طرح گنجائش نہ تھی اور یا صوبائی ضروریات کے لئے مکتفی نہ تھے۔

اندریں حالات صوبجات کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ اِن عطیات کو منسوخ کردیا جائے۔

اُدھر آہستہ آہستہ مرکزی حکومت کی مالی حالت سُدھرنے لگی، اور آخر ۱۹۲۵-۲۶ء میں پہلی دفعہ وزیر خزانہ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ مرکزی بجٹ میں فاضلہ دکھائے جس کے بعد یہ ضروری محسوس نہ ہوا کہ صوبائی عطیات کو برقرار رکھا جائے چنانچہ دو سال تک اِن عطیات کو آہستہ آہستہ کم کرکے ۱۹۲۷-۲۸ء میں ان کو بالکل اڑا دیا گیا۔

مسئلہ فیڈرل فنانس

صوبائی عطیات کی منسوخی سے بھی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعلقات کی بحث ختم نہ ہوئی۔ بمبئی اور بنگال ایسے صنعتی صوبجات کی شکایات تاحال موجود تھیں اور اُن میں سے بڑی شکایت یہ تھی کہ جہاں باوجود فوجی اخراجات اور مقروضات پر سود کے نسبتاً مقررہ رہنے کے مرکزی گورنمنٹ کے پاس انکم ٹیکس اور درآمد برآمد ایسے لچکیلے محاصل موجود ہیں وہاں صوبجات کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے علی الرغم اُن کو مالگذاری اور چنگی ایسے غیر لچکیلے ذرائع آمد تفویض کئے گئے ہیں جہاں سے اُن کو کافی آمدنی نہیں ہوتی۔

مثلاً لگان کا بوجھ پہلے ہی کافی تھا اُس میں اضافہ کی گنجائش نہ تھی چنگی سے آمدنی کے اُلٹا گھٹنے کا امکان تھا کیونکہ شراب نوشی وغیرہ کے خلاف پروپیگنڈا روز بروز بڑھ رہا تھا۔ جنگلات کی آمدنی جب ہی بڑھ سکتی تھی اگر اُن پر پہلے حکومت کافی سرمایہ لگاتی۔

ٹکٹ فروشی ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس کی شرح غالباً بڑھائی جاسکتی تھی لیکن اِس مد سے بھی غیر محدود آمدنی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

دوسری طرف صوبجات کو تعلیم۔ حفظانِ صحت۔ زراعت وغیرہ ایسے تعمیری محکمہ جات کی ترقی کا ذمہ دار بنایا گیا تھا جن کے لئے اُن کو از حد روپیہ کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ذرائع آمد کے کافی اور "زرخیز" نہ ہونے کی وجہ سے مہیا نہ ہو سکتا تھا۔

اِس مالی تنگی کو دُور کرنے اور صوبجات کو مالیاتی معاملات میں خود مختار بنانے کے لئے فنانشل اٹانومی یا مالیاتی خود مختاری کی داغ بیل ڈالی گئی جس پر ایک حد تک یکم اپریل [illegible] سے اور کچھ وفاق کے قیام کے بعد عمل کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں فیڈرل فنانس کا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح صوبجات کو مالی معاملات میں آزاد بنایا جائے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالیاتی تعلقات میں کیسے توازن قایم کیا جائے کہ مالی یکسانیت پیدا ہو۔

۱۹۱۹ء کے نظام میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ آمد کے جو ذرائع صوبائی حکومتوں کو دئے گئے تھے اُن کی آمدنی صوبوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر نہایت قلیل تھی۔ پس فیڈرل فنانس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اِس نقص کو دور کیا جائے اور صوبجات کی آمدنیوں کو ان کے اخراجات کے مطابق کیا جائے اسی طرح ۱۹۱۹ء کے نظام کی صورت میں مرکزی حکومت کے اخراجات اُن ذرائع آمدنی کے مقابلہ میں بہت کم تھے جو اُس نے اپنے قبضہ میں کر رکھے تھے۔ پس ضرورت تھی کہ اِن میں بھی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

جدید تفتیشات

مانٹیگو چیمسفورڈ کے ریفارمز کے مصنفین اِس دعویٰ میں سو فیصدی درست تھے کہ اگر صوبجات کو خود مختاری دینی ہے تو ہندوستان میں ایک ایسے مالیاتی وفاق کے مروج کرنے کی ضرورت ہوگی جس کے ماتحت کسی محققانہ معیار کے مطابق مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ذرائع آمد کی تعین و تحدید ہو سکے اور صوبجات کو اپنی ضروریات کے لئے کافی روپیہ بھی میسر ہو۔ لیکن ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کس قدر ناکام رہیں۔

بعد ازاں سائمن کمشن نے اس سوال کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اُس کے مشیر مالیات سر والٹر لیٹن نے ایک سکیم بنائی جو اسی کے نام سے مشہور ہے۔ اُس کی تجویز اِس قیاس پر مبنی تھی کہ دس سال کے عرصہ کے بعد

مرکزی گورنمنٹ کے بجٹ میں ساڑھے چودہ کروڑ روپیہ کا فاضلہ ہوگا جس کی وجہ سے صوبجات کی موافقت میں ذرائع آمد کی دوبارہ تقسیم کا امکان ہوسکے گا۔

اُس نے تجویز کی کہ ذاتی آمدنیوں پر محاصل کا نصف اور جنگی دشمولیت محصول نمک، اکا کچھ حصہ صوبجات کو ایک باقاعدہ پروگرام اور شرح کے مطابق منتقل کر دیا جائے اور یہ انتقالِ رقوم دس سال کے اندر ختم ہو۔ مزید براں صوبجات کو اپنے ذرائع کی توسیع کے لئے یہ اختیار دیا جائے کہ وہ بعض جدید ٹیکس لگانے پر قادر ہوسکیں۔ مثلاً زرعی آمدنیوں پر محصول یا انکم ٹیکس پر ایکسائز محصول یا اشیاء پر دستوری ٹیکس وہ لگا سکیں۔

یکسانیت قائم رکھنے کے لئے اُس کی تجویز یہ تھی کہ شرح چنگی کے رَدّ و بدل کا اختیار صوبجات کے وزیران مالیات پر مشتمل ایک بین الصوبائی مجلس کی سفارشات پر مرکزی گورنمنٹ کو تفویض کیا جائے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے سائمن کمیشن کے متعلق سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنے ایک مراسلہ کے دوران میں سر والٹر لیٹن کی تجویز کو ضرورت سے زیادہ خوش آئند قرار دیا۔ اور درحقیقت بعد میں آنے والی عالمگیر کساد بازاری نے سر لیٹن کے متوقع فاضلہ کو خاک میں ملا دیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر پیل[۵۱] سب کمیٹی (فیڈرل فنانس سب کمیٹی) متعین کی گئی جس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ جدید آئین حکومت کے ماتحت مالیاتی دستور العمل کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔

تاہم سنہ ۱۹۳۲ء میں پرسی[۵۲] کمیٹی یا فیڈرل فنانس کمیٹی کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ مالیاتی لائحہ عمل پر ایک رپورٹ پیش کرے جس میں اُس نے ڈرتے ڈرتے یہ توقع ظاہر کی کہ انکم ٹیکس کی آمدنی کو صوبجات میں تقسیم کرنے کا امکان ہوسکتا ہے اور سفارش کی کہ مرکزی گورنمنٹ کی امداد کے لئے صوبائی عطیات کو ازسرِنو مروج کیا جائے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں مشترکہ منتخبہ[۵۳] مجلس نے مذمومہ صوبائی عطیات کی تجدید کے خیال کو آخری بار کے لئے رَدّ کر دیا۔ اِس مجلس کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا اور وہ سندھ اور اُڑیسہ کے نئے صوبجات کے نتیجے میں خسارہ کا تھا۔ علاوہ ازیں ایک اور گتھی جو اُس نے سلجھائی تھی یہ تھی کہ اپنی حدود میں ایک وفاقی انکم ٹیکس لگانے کی اجازت دینے کے لئے ریاستیں تیار نہ تھیں۔ لہذا مجلس یہ سفارش کرنے پر آمادہ تھی کہ انکم ٹیکس کی جملہ آمدنی صوبجات کو دیدی جائے لیکن مرکزی حکومت کے لئے اِس قربانی کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔

آخر قرطاس ابیض میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انکم ٹیکس کی جملہ آمدنی مرکزی حکومت کو دیدی جائے جس میں سے ایک حصہ (جو پچاس فی صدی سے کم اور پچھتر فیصدی سے زیادہ نہ ہو) صوبجات کو عطا کر دیا جائے۔ لیکن فیڈرل گورنمنٹ کو یہ حق دیا گیا کہ وہ تین برس تک ایک رقم اپنے پاس رکھ سکتی ہے جس کو وہ سات برس کے عرصے میں صفر تک کم کر سکتی ہے۔ اُس کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ انکم ٹیکس پر ایک زائد محصول لگا سکے اور اسی قدر حصہ ریاستوں سے وصول کر لے۔

جائنٹ سیلکٹ کمیٹی نے زائد محصول والی تجویز تو رَدّ کر دی۔ لیکن قرطاس ابیض کی باقی تمام تجاویز کو منظور کر لیا۔ مثلاً صوبجات کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ زرعی آمدنیوں پر محصول لگا سکتے ہیں۔ اور مرکزی گورنمنٹ محصول برآمد، محصول نمک اور چنگیوں کی آمدنی کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر سکتی ہے

اِن تمام جدید تحقیقات اور بالخصوص جائنٹ سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (جدید آئین) میں جا بجا ظاہر ہے اور اب ہم اسی کی وضاحت کریں گے۔

آئین جدید میں مالیاتی دفعات

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں فیڈرل فنانس پر مندرجہ ذیل دفعات ہیں جن کا مفہوم سادہ زبان میں۔ قانونی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیان کر دیا گیا ہے:۔

دفعہ ۱۳۷ زرعی اراضی سے علاوہ تمام موروثہ جائیداد اور سٹیمپ۔ اور درآمد برآمد پر محاصل کی آمدنی مرکزی گورنمنٹ کی ملکیت میں نہیں ہوگی بلکہ وہ صوبجات اور ریاستہائے میں تقسیم کر دی جائے گی۔

دفعہ ۱۳۸ زرعی آمدنیوں کے علاوہ باقی تمام آمدنیوں پر محصول فیڈریشن یعنی مرکزی حکومت لگایا کرے گی۔ لیکن جمع کردہ رقم کا ایک مقررہ حصہ صوبجات اور ریاستہائے کو دے دیا جائے گا۔

Peel Sub-committee ۵۱

Percy committee ۵۲

Joint Select Committee ۵۳

دفعہ ۱۳۹ ۔ فیڈریشن کے قیام کے بعد دس سال سے قبل فیڈریشن کو یہ اختیار نہ ہوگا۔ کہ وہ کسی وفاقی ریاست پر کارپوریشن ٹیکس لگا سکے۔

دفعہ ۱۴۰ ۔ محصول نمک چنگی اور درآمد و برآمد کے محصول کو لگانے اور جمع کرنے کا اختیار فیڈریشن کو ہوگا۔

دفعہ ۱۴۱ ۔ ماسبق دفعات یا ایسے محاصل میں جن میں صوبجات کا نفع ونقصان ہو رد و بدل کرنے کے لئے کوئی مسودہ بلا اجازت وائسرائے فیڈرل اسمبلی میں پیش نہیں ہو سکتا۔

دفعہ ۱۴۲ فیڈریشن کے حصۂ آمد میں سے صوبجات کو حسب ضرورت زر امداد دیا جا سکے گا۔

آئین جدید کے ماتحت تقسیم ذرائع

آئین جدید کے ماتحت فیڈرل گورنمنٹ یعنی مرکزی حکومت مندرجہ ذیل ذرائع سے اپنی آمدنی پیدا کرے گی:۔

(۱) دستوری محاصل جن میں محصول درآمد اور تمباکو اور ہندوستان میں مصنوعہ دیگر اشیاء پر چنگی باستثنائے مندرجہ ذیل شامل ہیں۔

(ا) شراب

(ب) افیم۔ ہندوستانی بھنگ و دیگر منشیات

(ج) طبی اور دیگر نہانے دھونے کا سامان جس میں الکحل یا ب میں متذکرہ اشیاء کا جزو ہو۔

(۲) کارپوریشن ٹیکس

(۳) محصول نمک

(۴) انکم ٹیکس باستثنائے زرعی آمدنی

(۵) زرعی۔ ذاتی یا کمپنیوں کی اراضی کے علاوہ املاک کی قیمت سرمایہ پر ٹیکس۔

(۶) زرعی اراضی کے علاوہ دیگر جائداد کی وراثت پر ٹیکس

(۷) ہنڈیوں۔ چیکوں۔ پرامیسری نوٹوں۔ بل آف لیڈنگ۔ لیٹر آف کریڈٹ۔ بیمہ کی پالیسیوں اور رسیدوں وغیرہ پر ٹکٹ

(۸) ریل یا ہوائی جہاز کے ذریعہ منتقلہ مال ومتاع یا مسافروں پر سفر کے اختتام کا ٹیکس۔

(۹) ریلوں کے کرایہ یا محصول پر ٹیکس۔

صوبائی ذرائع آمد مندرجہ ذیل ہیں

(۱) مالیہ

(۲) مندرجہ ذیل اشیاء پر چنگی

ا۔ شراب

(ب) افیم۔ ہندوستانی بھنگ و دیگر منشیات

(ج) طبی اور دیگر نہانے دھونے کا سامان جس میں الکحل یا ب میں متذکرہ اشیاء کا جزو ہو۔

۳۔ زرعی آمدنیوں پر محصول

۴۔ اراضی عمارات۔ چولھوں اور کھڑکیوں پر ٹیکس

۵۔ زرعی اراضی کی وراثت پر ٹیکس

۶۔ کان کنی پر ٹیکس

۷۔ سرشماری کا ٹیکس

۸۔ ملازمتوں۔ تجارتوں۔ اور پیشہ جات پر ٹیکس

۹۔ جانوروں اور کشتیوں پر ٹیکس

۱۰۔ اشیاء کی فروختگی اور اشتہار بازی پر ٹیکس

۱۱۔ کسی شہر میں مال کے آنے پر محصول مقامی

۱۲۔ محصول تعیش جس میں تفریح اور جوئے کے ٹیکس شامل ہیں

۱۳۔ دستاویزوں پر ٹکٹ جن کا ذکر فیڈرل لسٹ میں نہیں آیا

۱۴۔ ملکی دریاؤں اور نہروں پر نقل وحرکت کرنے والے مسافروں اور اموال پر محصول۔

۱۵۔ سوائے عدالت کے اس فہرست میں کسی معاملہ پر فیسیں۔

وفادارانِ ازلی کا پیام[1]
شاہنشاہِ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے، اے عالم پناہ — اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار — بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے "حامیِ دینِ مبیں" — دورِ سیّد[2] کے "اولی الامر" و "امیر المومنین"

اے رئیسِ پاک دل، اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجے سلام

راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو — یوں نہیں رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نطق کی وادی میں بہ سکتے نہیں — آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور — ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں — تن پر اک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں
تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں — شکریہ اُن روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں
روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدام نے — آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے؟
آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا — کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا؟
صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام — کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟
آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قومِ نامراد — کھائے جاتا ہے اُسے خدامِ عالی کا عناد

---

[1] تقریباً پورا رسالہ طبع ہو جانے کے بعد یہ نظم شامل کی گئی۔ اس لئے فہرست مضامین میں نہیں آسکی۔
[2] سرسید احمد خاں آنجہانی

معدہ محرومِ غذا ہے، کیسہ ہے محرومِ زر
آپ کے عمال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر

آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج
آج اس بھارت کا سر ہے، اور تیغِ احتیاج

ہر جبیں پر ہے شکن، اس کج کلاہی کی قسم
ہر مکاں اک مقبرہ ہے، قصرِ شاہی کی قسم

آپ کے سر پر ہے تاج، اے فاتحِ روئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

ہم وفا کیش، آپ کی نظروں سے بھی گر جائینگے؟
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائینگے؟

ہم سے، باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات

ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے

نوجواں بپھرے ہوئے ہیں، بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں

کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

ہم وفادارانِ پیشیں، ہم غلامانِ کہن!
قبر جن کی کھد چکی، طیار ہے جن کا کفن

تند رَو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی اُمنگوں کو دبا سکتے نہیں

مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھوتا ہو اُپلی تلوار کی

آپ سے کیونکر کہیں ہندوستاں پُر ہول ہے
آپ کا نام آگ ہے، اور کانگرس پٹرول ہے

وہ سُرنگیں کھد رہی ہیں، الحفیظ و الاماں
صرف انگلستان کیا، یورپ سما جائے جہاں

نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی

آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی
ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بُو بارود کی

غور سے سن لیجئے اے خواجۂ عالی نژاد
آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد

کیجئے درماں میں عجلت، ورنہ دل ڈر جائیں گے
حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے، ہم مر جائیں گے

چونکئے جلدی، ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرّہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

جوش ملیح آبادی

مردِ مضحک (مسلسل)

اسرائیل احمد خاں

(۱۰)

کوئین این !

کوئین این - ملکۂ انگلستان - اک متوسط الحیثیت عورت تھی - اس کی سیرت میں تمام صفات وخصوصیات بَیْن بین واقع ہوئی تھیں ! جن میں سے کوئی بھی فضائل عالیہ یا شمائل شنیعہ کے انتہائی نقاط تک متجاوز نہوی تھیں ! وہ شگفتہ طبع وخوش خلق تھی - شاہانہ جلالتِ شان کی بھی چند شعائیں اُس کی ناصیۂ حکومت پر چمکتی تھیں ! تاہم عموماً اُس کے مزاج میں اک سطحیت اور ثقالت سی تھی ! اُس کی ادا میں اک بے ہنری نمایاں تھی - اور اس کی نیکی میں اک سادہ لَوحی ! بحیثیت بیوی کے وہ بے وفا بھی تھی - اور باوفا بھی ! — بے وفا اس معنی میں کہ اغیار وغیر محرم بھی اُس سے بَہْرہ ورِ التفات تھے ! اور باوفا اس تعبیر سے کہ شوہر کے ساتھ اُس کی وابستگی اور نباہ کی شگفتگی تازیست قائم رہی، ع

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است

بحیثیت اک مسیحی کے وہ مُلحد بھی تھی اور متعصب بھی ! توحید فی التثلیث والتثلیث فی التوحید ! حضرت مسیحؑ کی گلبانگِ محبت بھی اور حروب صلیبیہ کی شورشِ مبارزت بھی !

اس کی ساری جسمانی ہستی کے اندر صرف "ایک" "بے نظیر گوشۂ حسن تھا — یعنی اُس کی دل آویز گردن ! باقی اُس کے پیکر کے دیگر اعضاء معمولی تناسب سے بھی عاری تھے ! اُس کا ناز نخرہ بھونڈا تھا ! اُس کی جلد و رخسار اگرچہ سُرخ وسفید تھے، لیکن بیشتر اِس رُسوا کُن خوبی کے مصداق کہ ع

دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا !

ملکۂ این اِس چنپا کلی کے فیشن کے رواج کا شرف اوّلیت رکھتی ہے جو بڑے بڑے موتیوں کی سلک جواہر سے بنائی جاتی تھی اور جو گلے سے چسپیدہ کرکے پہنی جاتی تھی،

ملکۂ عالم کی پیشانی خیر سے تنگ واقع ہوئی تھی، رُخسار پُر گوشت تھے، آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں، اور لبوں کی ساخت شہوانی مزاج کی غمّاز ! آنکھوں کی کلانی کے باوجود وہ چشم بد دور کم نظر بھی تھی ! یہ کم نظری اُس کے دماغ تک وسیع تھی ! سُبہا ؤیہ تھا کہ کسی وقت بھی بیٹھے بیٹھے قہقہہ مار کر ہنس دیتی، اور پھر بے طرح گُم صُم بھی ہو جاتی ! اُس کے مُنہ سے الفاظ ایسے مبہم نکلتے تھے کہ سامع کے قیاس کو بہت کچھ خلا پُری کرنی پڑتی تھی ! وہ اک طُرفہ معجون تھی، جس میں اک نیک خو نسائیت اور اک شرارت پسند شیطنت دونو کے عناصر موجود تھے ! نسوانی فطرت کے اعتبار سے وہ عجائب پرست بھی تھی، مختصر یہ کہ این، اماں حوا کی کم وبیش سچی بیٹی تھی ! یہ سرشت اک عجیب اتفاق سے تخت وتاج کے ساتھ ہم رشتہ ہوئی ! — جس کے مزید

پیچیدہ نتائج پیدا ہوئے ! وہ مئے نوشی کی بھی عادی ہوگئی تھی۔
این کا شوہر اک عجیب الطرفین ڈینمار کی تھا، اپنے سیاسی مسلک میں وہ رجعت پسند واقع ہوئی تھی، تاہم حکومت وہ حزب الاُمراء کے اشتراک سے چلاتی تھی! الغرض وہ اک عورت تھی، اور پھر عورت کی طرح اک پاگل عورت !
جس بھونڈے طریقے سے وہ مہمات سلطنت کی سربراہی کیا کرتی تھی وہ اک ناگفتہ بہ منظر ہوتا تھا! واقعات و حوادث کی باگ اُس نے واقعات وحوادث ہی کے ہاتھ میں دے رکھی تھی! ان پر اپنے کسی انسانی تصرف سے کام لینا اُس کے دماغ کی رسائی سے پرے اک تصور تھا، اُس کے سارے اندازِ حکومت مجنونانہ تھے! اپنی کج روی، بد تمیزی، اور عاقبت نااندیشی سے وہ ذرا ذرا سے معاملات کو حادثات کی نزاکت میں تبدیل کر دیتی تھی! جب اقتدار پرستی کا بھوت اُس پر سوار ہوتا تو خواہی نخواہی کوئی سخت آتش افروزی کی حرکت کر بیٹھتی اور نتائج سے تلخ کام یا لطف اندوز ہوتی!
ملکۂ این اپنے عہد کے مشہور مذاق "تفنن" سے بھی بدقسمتی سے بہرہ یاب تھی! وہ ادبی ظرافت اور شاہانہ ستم ظریفی ہر دو سے شغل رکھتی تھی! اگر اپنا آدویتا پر بھی اسے اختیار حاصل ہوتا تو وہ اُسے بھی کوزہ پُشت بنا دیتی! لیکن پھر شاید وہ اُس کے مقامِ اُلوہیت کا خیال کر کے اُس کا معالجۂ پشت بھی کراتی، نسوانی رحم دلی کے اقتضا سے وہ کسی کو مایوس تو نکرتی تھی! لیکن زنانہ شوخ فطرتی کے ایما سے چھیڑتی ہر ایک کو تھی! کبھی کبھی کوئی دل خراش کلمہ اُس کی زبان سے نکل جاتا، لیکن پھر جلد ہی وہ عذر معذرت کر لیتی، اور یا دشس بخیر ملکۂ ایلزبیتھ کی طرح اپنی نیک نیتی اور صاف دلی کی قسم کھالیتی! ع
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند است!
کبھی وہ اپنی قبا کی جیب سے اک ڈبیہ نکالتی، جس پر اُس کا شاہانہ اسم گرامی حروف مقطعات (ہ، م، ا) میں منقوش تھا، اور اُس میں سے تھوڑا سا گلگونہ لیکر اُس سے اپنے لبوں کو رنگین کرتی، اور اس ہیئت کذائی سے پھر یکبارگی حاضرین کے سامنے آکر کھلکھلا کر ہنس پڑتی! لطف یہ کہ ملکۂ موصوفہ کو اپنی فربہی پر بھی ناز تھا! "ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است"!

ملکۂ این اگرچہ انگلستان کے حلقۂ زہاد میں داخل تھی لیکن باوصف اس کے تھیٹر کی دل دادہ واقع ہوئی تھی! اُس کے دربار میں اک مہمل سی قسم کی علمی مجلس موسیقی تھی، جس کے آداب و مشاغل میں فرانس کا اُلٹا سیدھا تتبع کیا گیا تھا! ۱۷۰۸ء میں ایک فرانسیسی فادر سُروشے نامی کو اپنی اک تجویز دربارۂ تعمیر سرکس کے معاملہ میں پیرس میں سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا، یہ شخص انگلستان آیا اور کوئین این کی بارگاہ کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا، ملکۂ معظمہ فوراً اس خیال کی مشتاق بن گئیں کہ لندن میں اک عظیم الشان تھیٹر بنایا جائے، جس میں مشینی آلات سے کام لیا جائے، اور جس کے اندر اک زرین اسٹیج شہنشاہ فرانس کے پایۂ تخت کے اسٹیج سے بھی زیادہ شاندار ہو!
لوئی چہاردہم کی طرح وہ سواری میں گھوڑوں کی جنون ساماں دوڑ سے لطف اندوز ہوتی تھی! بعض اوقات مُرکب شاہی لندن اور ونڈسر کے درمیان کی مسافت کو سوا گھنٹے سے بھی کم عرصہ میں طے کر لیتا تھا!
ملکۂ این کے آئین سیاست کے تحت کسی جلسے کے انعقاد کی اجازت دو اعزازی مجسٹریٹوں کی منظوری کے بغیر نہ مل سکتی تھی، اگر ایک درجن آدمی بھی کسی جگہ اس غرض سے بھی جمع ہوتے کہ وہاں شراب و کباب کا شغل کریں تو یہ مباح اجتماع بھی اس قدر قبیح و شنیع قرار پاتا کہ تمام حریفانِ بادہ پیما کی جائداد ضبط کر لی جاتی! ملکہ کا دورِ حکومت اگرچہ ویسے پُرامن و آشتی پسند واقع ہوا تھا لیکن ان ایام میں بھی برطانوی بیڑے کی مزید تعمیر اور بحری اقتدار کی روز افزوں توسیع کا کام شد و مد سے جاری رہا اس مسلسل حکمت عملی سے یہ فیصلہ کیا جانا چاہئے کہ انگلستان کی پبلک کے اک فرد پر "شہری" کے بجائے "رعیت" کے خطاب کا اطلاق اس زمانہ میں زیادہ موزوں تھا! صدیوں تک یہ ملک اُس ظلم رانی اور مطلق العنانی کا تختۂ مشق بنا رہا جس نے برطانوی "منشورِ حریت" کو اک تقویم پارینہ میں تبدیل کر دیا تھا، یہ کاروبار فرانس کے لئے بھی وجہ شکایت ہوتے رہے اور جن پر وقتاً فوقتاً وہ صدائے احتجاج بھی بلند کرتا رہا۔ فرانس کے دستور حکومت کو اس دور میں انگلستان پر فضیلت حاصل تھی، اگرچہ اس فضیلت کو اس بنا پر اک داغ لگ گیا تھا کہ جو استبداد انگلستان میں بحری قوت کے سلسلہ میں کیا جاتا تھا وہی فرانس میں بری حربیت کے معاملہ

میں روا رکھا جاتا تھا!

ملکۂ این اپنے ملک و قوم کی عموماً ہر دل عزیز تاجدار تھی، انگلستان زنانہ فرماں رواؤں کو محبوب رکھتا ہے، لیکن فرانس صنفِ نازک کے کمزور ہاتھوں میں عصائے حکومت دیکھنا پسند نہیں کرتا! انگریزوں کا قومی مزاج اس بارے میں دلچسپ تاریخی مظاہر رکھتا ہے، انگریز مؤرخین کی نظروں میں ایلزبیتھ شوکت و صولت کا پیکرِ کامل ہے، اور این خوش خوئی و نیک نہادی کا مظہرِ اتم لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں حکمران خواتین کی سیرتوں کے مرقعوں کے خطوط بھدّے اور بھونڈے واقع ہوئے ہیں، جن میں آن بان اور بانکپن نام کو نہیں! لیکن لاریب کہ ان ہر دو دختران حوا کا "بے داغ کیرکٹر" انگلستان کے لئے مایۂ نازش ہے! کسی کو اس میں مجالِ دم زدن نہیں! ایلزبیتھ اک سدابہار دوشیزہ تھی، جس کے گلِ دوشیزگی کو اسیکس اک نغمۂ نوبہار سنایا کرتا تھا، اور این اک منکوحہ شاہ بیگم تھی، جس کے حجلۂ عصمت پر بولنگ بروک کے ہاتھوں اک حجابِ خاص کی بافت عمل میں آئی ہے!

(۱۱)

ملکۂ این کو ڈچیز جوزیانہ کی ذات سے اک عناد سا تھا! اس کی دو وجہیں تھیں ایک یہ کہ ڈچیز موصوف اک حسین و جمیل پیکرِ نسائیت تھی۔ دوسری یہ کہ جوزیانہ کا منگیتر بھی مردانہ جمال و جلال کا اک بالا بلند بت تھا! رشک و حسد کے ایک بھوڑ دو دو سبب ایک عورت کے لئے کافی سے زیادہ ہیں! — اور اک بادشاہ بیگم کیلئے تو ایک بھی بہت ہے!! اس پر طرہ یہ کہ جوزیانہ این کی بہن بھی تھی، اور جذبۂ حسد کو اس خیال نے مزید تحریک باہم پہنچائی تھی کہ ایک ہی شاخِ خاندانی کے دو گل رنگ و بو میں ایسا غیر معمولی .... تفاوت رکھتے ہیں!

این عورتوں کی خوبصورتی سے چڑنے سی لگی تھی! اس کے نزدیک صنفِ نازک کا حسن، قبح میں داخل تھا! وہ عورتوں کے حسنِ صورت کو اُن کے حسنِ سیرت کے منافی سمجھتی تھی! اور خود چونکہ اس شے لطیف سے بے نصیب تھی اس لئے اسی بات کو اپنے اخلاقِ نسوانی کے لئے اک ضمانت شمار کرتی تھی! تاہم اگر قسامِ ازل کی تقسیم پر ملکۂ موصوفہ کو اختیار ہوتا تو اُس چیز کو وہ اپنے لئے کبھی منتخب نہ کرتی جو تقدیر سے اُس کے حصے میں "بستم" آ گئی تھی! بدصورتی کے ساتھ اُس کو جو حسن ظن ہو گیا تھا وہ اس کا کلمۂ ایمان سا بن گیا تھا! جوزیانہ جو جمالِ جسمانی اور حسنِ ذہنی کا عطر مجموعہ تھی، این کے لئے اک مستقل سامانِ کوفت تھی! تاجِ شاہی کے ظلِ الٰہی کے نیچے اک نامطبوع چہرہ بھی کیا طرفہ معصیت ہے!!

(۱۲)

بارکلفیڈرد!

لوگ جو جو کرتے رہتے ہیں اس سے واقفیت حاصل کرنا اک دلچسپ مطالعۂ علمی ہے! انسانوں کے کاروبار پر کم و بیش تجسس رکھنا معلوماتِ عامہ کا اک اہم شعبہ ہے!

جوزیانہ نے لارڈ ڈیوڈ پر اک چھوٹے سے آدمی کو نگراں مقرر کر دیا تھا جو اُس کا اک معتمد تھا، اُس کا نام بارکلفیدرڈ تھا، دوسری طرف لارڈ ڈیوڈ نے بھی اسی نام کا اک یکساں قابلِ اعتماد سراغ رساں ڈچیز جوزیانہ کے پیچھے لگا دیا تھا! لیکن تیسری طرف ملکۂ این نے لیڈی جوزیانہ اور لارڈ ڈیوڈ ہر دو کی حرکات و سکنات پر خاص اپنا اک جاسوس تعینات کر رکھا تھا لطف یہ ہے کہ اس تیسرے مخبر کا نام بھی بارکلفیڈرد تھا! کتنا دلچسپ مثلث سیاسیات! ع

عشق است و ہزار بدگمانی!

قمارِ عشق کی اس بساط پر جس کے گرداگرد ڈچیز جوزیانہ، لارڈ ڈیوڈ، اور ملکۂ این نشست رکھتے تھے اس عیار بارکلیڈرد کی انگلیاں مصروف کار تھیں، اک مرد، دو عورتوں کی باہمی ریشہ دوانیوں کے تار پود میں دو طرفہ ہم رشتہ تھا! اس طرفہ ماجرے میں کیا کیا دلچسپ صورتیں نہ پیدا ہوئی ہوں گی! کس طرح متعدد روحوں کی کاوشوں کے درمیان قدرِ مشترک ایک ہی وجود بنا ہوا تھا! بارکلفیڈرد کو عمر بھر ایسی نادر سعادتِ تثلیث نصیب نہوئی ہوگی کہ بیک وقت تین کانوں میں سرگوشی کرے! یہ شخص ڈیوک آف یارک کا اک قدیم الخدمت ملازم تھا، ایک وقت اُس نے سررشتۂ کلیسا کے اندر بحیثیت پادری کے داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بابِ حرم اس پر وا نہوا تھا، ڈیوک آف یارک جو اک مخلوط النسل انگریزی ورومی شہزادہ تھا، روما کی پاپائیت اور انگلستان کی سرکاری مسیحیت کا مجمع

البحرین واقع ہوا تھا! وہ دینِ عیسوی کے ہر دو مذاہب، رومن کیتھالک
اور پروٹسٹنٹ، کا حلقہ بگوش تھا، وہ بارکلیفیڈرد کو ان دونوں مسلکوں کے
گرجوں میں سے کسی نہ کسی کے منبرِ امامت پر پہنچا سکتا تھا، لیکن بارکلیفیڈرد خیر سے
شانِ نزول تھا اس آیت کی کہ لَآ اِلیٰ ھٰؤُلَآءِ وَلَآ اِلیٰ ھٰؤُلَآءِ!
یہ بارکلیفیڈرڈ جیمس دوم کے حالات بیان کر کر کے، شاہ جنت آشیانی
کا محبوب نام لے لے کر اس عہدِ میمنت مہد کے امراء کی وفا کیشیوں کے
"لطیف و دراز" قصے سنا سنا کے، اور دوسرے بہت سے اثر آفریں
نیز دردانگیز حرف و حکایات زیبِ داستان کر کر کے سامعین کو محظوظ کیا
کرتا تھا!

جوزیانہ کو اس آدمی سے بہت دلبستگی ہوگئی تھی، وہ ایک طرف
غربت و مسکنت اور دوسری طرف ذہانت و ظرافت کا اک مخلوط مظہر
تھا، اگرچہ ان دونوں عناصر کی یکجائی کم و بیش عموماً اک اجتماعِ ضدین کی
حیثیت رکھتی ہے!

لیڈی جوزیانہ نے بارکلیفیڈرد کو لارڈ ڈیوڈ کی خدمت میں پیش
کیا، اسے حاشیہ نشینانِ ملازمت میں داخل کر لیا گیا، اور محل کے اندر
اک گوشۂ عافیت اسے عنایت ہوا، جوزیانہ اس کے حال پر بہت نوازش
کرتی تھی، اور کبھی کبھی ازراہِ ذرہ نوازی اس سے ہم کلام بھی ہوا کرتی تھی!
بارکلیفیڈرد کا افلاس کافور ہو گیا، سردی و گرسنگی کے متعلق اس کے وارداتِ
قلب اس کی لوحِ دل سے دُھل گئے! رفیع الدرجات خاتون جوزیانہ کی
بندہ نوازی کا وہ غیر معمولی طور پر ممنون تھا، وہ اس سے ضمیرِ حاضر واحد سے
خطاب کیا کرتی! ع

یہ نصیب، اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

بارکلیفیڈرد کے لئے یہ رسائی و تقرب "کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب
رسید" کی سی معراج تھی وہ جوزیانہ کے "تو" اور "تیرا" اور "تجھکو"
پر اپنے تئیں "طورِ دربار کا کلیم" محسوس کرتا تھا! یہ وہ عزت اور مکرمت
تھی کہ بخیال اس کے "میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا" جوزیانہ
کے بارگاہِ ناز کی یہ باریابی بارکلیفیڈرد کے لئے اک بہشتی خواب تھی جسے وہ عالمِ
بیداری میں دیکھا کرتا تھا! بالکل اسی تشکیک آمیز تحیّر کے ساتھ کہ ع

انچہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب؟!

بارکلیفیڈرد ان وسائل سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اپنے رسوخ کے
حربے سے وہ اک نہایت بلند پایہ گاہ پر ضرب رسید کرنا چاہتا تھا! اس آخری
ہدف کو زد میں لانے کے لئے وہ اب شہنشاہ بیگم کی عرش گاہ تک صعود
کرنے کا ضرورتمند تھا! فی الحال اس منزلِ مقصود کا درمیانی مرحلہ چھیز
جوزیانہ کا آستانہ تھا جو ملکۂ آین کے دربار کا زینہ تھا! ریشہ دوانیوں کی زمین
دوز سرنگوں سے اگر وہ کام نہ لیا جائے جو اُن کی غایتِ مقصود ہے تو یہ ساری
سُبک انجام زحمت کشی "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے ہم معنی ہو گی!

(۱۳)

ایک دن بارکلیفیڈرڈ نے لیڈی جوزیانہ سے عرض کیا:

"کیا جنابِ عالیہ اس خاکسار ذرۂ بے مقدار پر کچھ مہربانی فرمائیں
گی؟"

"تیرا منشا کیا ہے؟"

"کوئی ملازمت!"

"ملازمت! تیرے لئے؟"

"جی ہاں! اور کیا؟"

"خوب! کیا خوب!! تو ملازمت مانگتا ہے، تو کہ کسی قابل
نہیں!"

"جی بس یہی تو وجہ ہے!"

جوزیانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی!

"اچھا جن کاموں کی کوئی اہلیت تجھ میں نہیں ہے اُن میں سے تو
کون سا کام چاہتا ہے؟"

"سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ کھولنے کا کام!"

جوزیانہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی!

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا مجھے بیوقوف بنا رہا ہے!"

"تو یہ کیجئے حضور!"

"خیر ہے تو یہ مذاق ہے، لیکن لطف لینے کے لئے میں متانت کا
کا لہجہ قائم رکھوں گی! اچھا مجھے بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ پھر کہہ!"

"سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ نکالنے کا کام!"

بادشاہوں کے ہاں کس چیز کی کمی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ

آیا اس نام کی کوئی نوکری شاہی سررشتۂ نظم ونسق کی دنیا میں وجود بھی رکھتی ہے؟!"

"ہاں، رکھتی ہے حضور!"

"اگر ایسا ہے تو میرے لئے یہ اک نئی خبر ہوگی!"

"حضور! ایسی نوکری کے وجود میں کچھ بھی کلام نہیں!"

"اچھا اپنی روح کی قسم کھا — اگرچہ ظاہر ہے کہ تجھ میں روح کہاں!"

"قسم ہے اپنی روح کی جو مجھ میں نہیں ہے!"

"مجھے اعتبار نہیں!"

"شکریہ!"

"اچھا تو پھر کہہ نا کہ تیری درخواست کیا ہے؟"

"حضور وہی سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ کھولنے کا کام!"

"مگر غالباً یہ بہت آسان کام ہوگا — قریباً ایسا ہی آسان جیسی کہ اس برنجی گھوڑے کی سائیسی کی خدمت جس کا ذکر ہم کہانیوں میں سنا کرتے ہیں!"

"جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے!"

"ہاں شاید اس میں قطعاً کوئی کام نہ ہوگا – اچھا ٹھیک ہی ہے، ایسا ہی عنقا صفت کار بیکاری تیرے لئے موزوں بھی ہے!"

"مگر قصور معاف، حضور کو معلوم ہونا چاہئے کہ بندہ بالکل ناکارہ بھی نہیں ہے اور بعض خاص کاموں کی خاص صلاحیت اس ہیچمدان میں موجود ہے!"

"اچھا یہ بکواس تو رہنے دے اور مجھے ٹھیک ٹھیک بتا کہ وہ نوکری کونسی ہے؟"

بارکلیفیڈرد نے معاً اک ممتاز قسم کا انداز متانت اختیار کر لیا!

"خاتون محترم!" اس نے کہا "سمندر میں تین قسم کی چیزیں ہیں: ایک تو وہ جو سمندر کی تہ میں ہوتی ہیں، دوسری وہ جو سطح آب پر تیرتی پھرتی ہیں، تیسری وہ جن کو سمندر کی موجیں ساحل پر پھینک دیتی ہیں!"

"اچھا پھر؟"

"یہ تین قسم کی چیزیں موضوع ہیں، تین سرکاری صیغوں کی جو برطانوی امیر البحر اعظم کے ماتحت ہیں!"

"اچھا آگے؟"

"اب آگے حضور خود سمجھتی ہیں!"

"ہرگز نہیں!"

"تمام تہ نشین چیزیں، تمام تیرتی ہوئی چیزیں اور تمام وہ چیزیں جنہیں سمندر نکال کر سواحل پر ڈال دیتا ہے، امیر البحر انگلستان کی ملک ہیں!"

"یہ سب چیزیں! سچ مچ؟! اچھا پھر؟"

"ان میں سے صرف ایک چیز مستثنیٰ ہے! — یعنی اسٹرجن مچھلی جو شاہ انگلستان کا حق خصوصی ہے!"

"میں تو سمجھتی تھی صرف وہی چیزیں اک واحد استثنا رہ جائیں گی جو سیارۂ نیپچون کی مملکت میں داخل ہیں!"

"اجی نیپچون تو محض اک احمق ہے! اس نے ہر چیز سے دستبرداری دے رکھی ہے، اور انگلستان کو موقع دیا ہے کہ تمام چیزوں کا مالک کل ہو جائے!"

"اسے جو کچھ تجھے کہنا ہے کہہ بھی چک!"

"ان چیزوں کا نام ہے "معادن بحر کے لعل و الماس"!"

"ایسا ہی سہی!" "گو ناخوش باش کہ ناگوش، احمق نہ ہیم"! — بہرحال مزید تفصیل؟"

"یہ ذخائر بے حد و بے پایاں ہیں! ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز سطح بحر پر تیرتی ہوتی ہے، اور کوئی نہ کوئی ساحل بحر پر پھینکی جاتی رہتی ہے! یہ وہ خراج ہے جو بحر اعظم - انگلستان کے خزانہ کو نذر کیا کرتا ہے!"

"آمَنّا وَصَدَّقْنَا! لیکن بس اللہ اس بات کو ختم کر، اور حرف مطلب پر آ!"

"آنحضور غالباً سمجھتی ہوں گی کہ اس سلسلہ میں سمندر نے خشکی پر اک مستقل سررشتہ قایم کر لیا ہے!"

"یہ تختۂ زمین کے کس گوشہ میں واقع ہے؟!"

"برطانوی امارت بحری کے اندر!"

"اس اعجوبۂ روزگار محکمے کا نام کیا ہے؟!"

"صیغۂ اموال بحر!"

"خوب!"

"اس صیغے کے تین شعبے ہیں، جو درجات سہ گانہ کی الگ الگ

اشیار سے متعلق ہیں، اور ہر شعبہ اک جداگانہ عامل کے سپرد ہے!"

"اس روداد کی کچھ اور تفصیلات یا عجائبات بھی ہیں؟!"

"بحر اعظم کا مصروفِ سفر جہاز پر اک افتاد کے بارے میں، اُن حکّام و عمّال کو تحریری اطلاعات دیتا رہتا ہے جو ساحل پر تعینات ہوتے ہیں! یہ اطلاعات مختلف جزئیات کے متعلق ہوا کرتی ہیں: مثلاً یہ کہ جہاز اس وقت فلاں عرض البلد میں ہے، یہ کہ اُس کو فلاں بحری درندے کا سامنا ہوا، یہ کہ اب اُس کو ساحل نظر آنے لگا ہے، یہ کہ وہ اب معرضِ خطر میں ہے، یہ کہ وہ عنقریب غرق ہونے والا ہے، یا یہ کہ وہ تباہ ہو چکا ہے، وغیر ذٰلک!......

اس اطلاع دہی کا طریقہ یہ ہے کہ کپتان (امیر جہاز) بوتل لیتا ہے اور اُس کے اندر وہ پرزۂ کاغذ رکھتا ہے جس پر اطلاعی تحریر لکھی ہوتی ہے، پھر بوتل کی ڈاٹ لگا دیتا ہے اور بعد ازاں اُسے امواجِ بحر کے حوالے کر دیتا ہے!........ اس بوتل کے تین حشر ہوتے ہیں: یا تو وہ ڈوب کر تہ نشین ہو جاتی ہے، یا سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے، یا کنارے پر جا لگتی ہے! ان ہر سہ صورتوں میں اُس کا تعلق شعبہ جات سہ گانہ کے متعلقہ افسروں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ہوتا ہے!"

"اچھا تو تو ساحل والے شعبے کا سپردار بننا چاہتا ہے؟"

"بس اُنہی کا!"

"اور غالباً یہی وہ لازمت ہے جسے تو "سمندر کی بوتلوں کے کاگ کھولنے" سے تعبیر کرتا ہے!"

"جی حضور! اور اس نام کا اک باضابطہ سرکاری عہدہ موجود بھی ہے!"

"میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس طرح جو بوتلیں وزارت بحری میں آتی ہیں کیا ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے؟"

"نہیں یہ بوتلیں ہوتی تو عموماً کم ہیں، لیکن اُن کے کم و زائد ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ محکمہ بہرحال قائم ہے اور دفتر بحری کی عمارت میں ایک کمرہ اُس کے نگران کار افسر کے لئے مخصوص ہے! اسی دفتر سے ملحق اُس کی سرکاری قیام گاہ بھی واقع ہوئی ہے!"

"لیکن جس نوکری میں کام اس طرح بمنزلہ صفر کے ہو اُس کے لئے خزانۂ شاہی کس طرح مستقلاً اک تنخواہ دیتا ہے؟!"

"تنخواہ اُس کی سو گنی سالانہ ہے!"

"تو اتنی سی حقیر رقم کے لئے تو مجھے تکلیف دینا چاہتا ہے؟!"

"میرا ظرف بھی تو اتنا ہی ہے نا؟!"

"لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ سو گنی سالانہ کی کیا ہستی ہے؟!"

"حضور کا فی منٹ جو شاہانہ خرچ ہے وہ اس بندۂ بے درم کا سال بھر کا بافراغت گزارہ ہے! غریبوں کو اپنی زندگی میں یہی تو فائدہ ہے!"

"اچھا تجکو یہ نوکری مل جائے گی!"

"ایک ہفتے کے اندر، لیڈی جوزیانہ کی نوازش و سفارش سے اور لارڈ ڈیوڈ کے اثر و رسوخ کے زور سے بارکلفیڈرو کو اپنی پُرمصیبت زندگی سے مخلصی مل گئی، وہ اپنی فاقہ کشی و بے نوائی سے نجات پا گیا۔ اس کے قیام و طعام کا سرکاری بند و بست ہو گیا۔ سو گنی سالانہ کی تنخواہ ملنے لگی۔ اور صیغۂ بحری کے اندر معلومہ منصب پر اُس کا تقرر ہو گیا!

سرِ روح میں باب کفر و ایماں مسدود
وہ فہم کی وحشت ہے یہ دانش کا جمود
بیکار ہے ایسا دماغ کمزور و علیل
بیزار ہے ایسی عقل ضعیف و محدود

جوش

حسین بھکارن

جس نظم یا مضمون میں آزادی کی خفیف سی جھلک بھی ہیں اس کے ادبی حسن و قبح سے بیگانہ ہو کر اس کی اشاعت پر مجبور ہو جاتا ہوں خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے

آسماں سے یہ گرا ہے ٹوٹ کر تارہ کوئی — آتشِ فطرت کا یا چمکا ہے انگارہ کوئی
یا سراپا ہے یہ سورج کی شعاعوں کا ہجوم — یا مجسم ہے محبت کی نگاہوں کا ہجوم
یا تجلی پاشِ عالم چودھویں کا چاند ہے — کہکشاں کی روشنی بھی جس کے آگے ماند ہے
موجزن ہے حسن کے دریا میں طوفانِ شباب — یا اتر آیا زمیں پر آسماں سے آفتاب
یا فضاؤں پر مسلسل ارتعاشِ نور ہے — یا نظر کے سامنے جنت کی کوئی حور ہے
اک سراپا حسنِ رنگیں اک مجسم رنگ و بو — اک پیامِ کیفِ دوشیں اک بہارِ روبرو
تھرتھراتی کپکپاتی جا رہی ہے اشکبار — ہے ہجومِ رنج سے اس کی جوانی سوگوار
دم بخود اور نیچی نظریں ہاتھ پھیلائے ہوئے — اپنی خودداری سے دنیا بھر کو ٹھکرائے ہوئے
ہاتھ میں جھولی بدن پر گرد آلودہ لباس — زہر کھانے تک کو اک پیسہ نہیں ہے اس کے پاس
اس کی نظریں کہہ رہی ہیں داستانِ زندگی — آہ یہ بھی ایک دن تھی گلستانِ زندگی
یہ بہارِ زندگی ہے زندگی کی لاج ہے — آج لیکن پیسے پیسے کے لئے محتاج ہے

آبرو اللہ ہی رکھیگا دماغِ حسن کی
تھرتھراتی ہے فضا میں لو چراغِ حسن کی

آہ اے ہندوستاں تجھ پر یہ نکبت کا اثر — آہ اے ہندوستان تجھ پر یہ ذلت کا اثر
آہ تیری صنفِ نازک اور یہ رسوائیاں — اف تری محکومیاں۔ اللہ رے ناداریاں
جس کو ہونا چاہئے تھا۔ انتخابِ زندگی — اف لٹاتی پھر رہی ہے وہ شبابِ زندگی
جس کو ہونا چاہئے تھا، نازشِ ورنگِ حیات — آہ وہ تسلیم کی جاتی ہے ننگِ کائنات
جس کو ہونا چاہئے تھا، نوبہارِ زندگی — زندگی ہے آج اس کی خارزارِ زندگی
جس کو ہونا چاہئے تھا، اہلِ عالم کا سکوں — آہ اس کو ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا سکوں
جس کو ہونا چاہئے تھا، بزمِ ہستی کا چراغ — اف ہجومِ یاس سے تاریک ہے اس کا دماغ

آہ اس کی ہر صدا ہے اک پیامِ انقلاب
چپکے چپکے ہو رہا ہے اہتمامِ انقلاب

رفیع احمد صبا متھراوی

ایک شکاری دوست سے

اے انیسِ دشت، اے میرے بہادر ہم معاش! شیرنی اور پھر دونالی سے گرا دی زندہ باش!
لیکن اس منظر سے میرا دل ہوا جاتا ہے شق اس جوانمرگی سے اس کی ہے مجھے بے حد قلق
اس کا یہ نازک شکم، یہ زرد مخمل کا گلو، آہ یہ چھکڑے کے پہیوں پر جوانی کا لہو،
اس کا نر فرقت میں اس کی باؤلا ہو جائے گا حال بچوں کا نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گا
بھیڑیا ہو، ریچھ ہو، چیتا ہو، یا خونخوار شیر، جنگلوں تک سورما ہیں نیستانوں تک دلیر،
یہ کبھی آبادیوں میں آ کے غراتے نہیں!! یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں!
دیکھ کس رفتار سے چلتی ہے نبضِ روزگار! اب ضرورت ہے کہ کھیلا جائے شہروں میں شکار
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں نہیں واقف ہے تو! چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہ رگ کا لہو
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو از کید وریا!! گھونٹ دیتے ہیں عدالت میں صداقت کا گلا!
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں بشکلِ راہبر دن دہاڑے لوٹ لیتے ہیں جو بیواؤں کے گھر
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو ظالم خرقہ پوش منبروں پر دندناتے ہیں بصد جوش و خروش
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو باصد احتشام کالجوں میں نوجوانوں کو بناتے ہیں غلام!
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو بن کر سرگروہ لیڈروں کے بھیس میں پھرتے ہیں باشان و شکوہ
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو پوشش دیکھکر اپنے مفلس ہمنشینوں سے چراتے ہیں نظر
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو عشرت کے لئے دام پھیلاتے ہیں بیواؤں کی عصمت کے لئے
ان سے بڑھکر وہ درندے ہیں جو زر کے واسطے باعثِ تکلیف ہیں نوعِ بشر کے واسطے

لاکھ حیواں ہوں اخوت کو یہ کھو سکتے نہیں
شیر چیتے ایسے بے انصاف ہو سکتے نہیں

احسان دانش (کاندھلہ)

ہندوستانی عورتیں

سیّد رضا قاسم مختار

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بلادِ اسلامیہ کی خواتین سے ہمارے ملک کی مسلمان عورتوں کا تقابل کیا جائے تو رات اور دن کا فرق نظر آئے گا۔ ہماری عورتیں چار دیواری کے اندر کولہو کے کیڑوں کی طرح قید رہ کر اسی کو ساری دنیا تصور کرتی ہیں۔ ہر شریف کا گھر گویا ان کی عورتوں کا قید خانہ ہے، جہاں اُن کو بے رحم مردوں سے کام پڑتا ہے۔ اور جب تک اسلامی ممالک کی تہذیب جو درحقیقت اسلامی تہذیب کا چربہ ہے ان میں نہ پھیلے گی اُن کی یہی حالت رہے گی۔

ہندوستانی مسلمان زیادہ تر اپنی عورتوں کے حق میں ظالم ثابت ہوئے ہیں۔ وہ یہ سمجھ کر کہ اُن کی عورتیں نہ کہیں جا سکتی ہیں، نہ کسی سے اپنا درد دکھ کہہ سکتی ہیں اور نہ معاملات دنیوی سمجھ سکتی ہیں۔ اُن کے حقوق غصب کر کے ان کی کمزوریوں سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھانے کو تیار رہتے ہیں اور اکثر خاندانوں میں تو ان کو اُن کے جائز ترکوں سے بھی محروم رکھ کر زبردست طور پر اُن کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ وہ کسی کام میں اپنی عورتوں سے مشورہ نہیں لیتے۔ اس میں شک نہیں کہ اب وہ کسی مشورے کے قابل بھی نہیں رہیں، کیونکہ ان کو ایسی تعلیم ہی نہیں دی جاتی کہ وہ مشیر کار بن سکیں۔ ان سے اگر کبھی مشورہ بھی لیا جاتا ہے تو صرف انھیں جاہلانہ رسوم کے نفاذ میں جو ہماری کمزوریوں کی بنیاد ہیں۔

طلاق اور عقدِ ثانی کی رسمیں ہمارے ملک میں رائج نہیں ہیں۔ لیکن ان رسوم کا دستورِ اسلام نے جن عیوب کے مٹانے کے لئے قائم کیا تھا وہ اب اس ملک میں کم و بیش گھر گھر پائے جاتے ہیں۔ طلاق نہیں دی جاتی کیونکہ یہ شرافت کے منافی ہے۔ مگر بے لطفی رہی تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ رہا عقدِ ثانی کا مسئلہ سو وہ تو بدترین عیوب کے مترادف ہے۔ یوں گھر میں چاہے کتنی ہی ناگفتہ بہ بدعنوانیاں کیوں نہ رونما ہوں اور انتہا درجے کے کریہہ عیوب کا عمل درآمد ہوتا ہو۔ مگر متذکرہ بالا دونوں حرکات یعنی طلاق اور عقدِ ثانی کا مرتکب ہونا ہی اصل شرافت کے اسناد سمجھے جاتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ جن باتوں پر اسلام نے زور دیا ہے وہی مسلمانانِ ہند نے چھوڑ دی ہیں اور جن باتوں سے منع کیا ہے وہی اختیار کر لی ہیں اور ہماری معاشرت میں اس قدر مغائرت پیدا ہو گئی ہے کہ ؎

گر سلف دیکھیں ہمارے زندہ ہو کر اب ہمیں
آئے نسبت اور قرابت سے ہماری ان کو عار

نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہماری عورتوں کے صرف شوہر ہی بے رحم نہیں ہوتے محض اُن کے بچے ہی اُن کی تعظیم میں کوتاہی نہیں کرتے بلکہ ان کے باپ بھائی وغیرہ بھی ان کے حقوق کی نگہداشت میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں اور ہمیشہ دندان طمع تیز رکھتے ہیں۔ مالی، ملکی، اعزازی غرض اُن کے کل حقوق غصب کئے جاتے ہیں۔ نتیجتہً معاشرت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور برائیاں محض عورتوں ہی تک محدود نہیں رہتیں۔ مائیں جب لونڈیوں سے بدتر حالت میں چوپایوں کی طرح گھر میں رہتی ہیں تو فطرتاً ان کی اولاد بھی وہی کمزور خیالات ان سے ورثہ میں پاتی ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے اس امر کا پتہ ملتا ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں زیادہ تر اپنی ماؤں ہی کی قابلیت کی وجہ سے آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکے۔ علاوہ ازیں یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ گہوارۂ مادر کی تربیت کا اثر آخر عمر تک باقی رہتا ہے۔ نیز تعلیم کے اثر پر غالب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات کے علم میں وہ رونق نہیں ہوتی جو دوسرے ملک کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

ایرانی، عراقی اور شامی عورتیں ہماری عورتوں سے بدرجہا اچھی حالت میں ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پا رہی ہیں۔ دنیا کا ہر علم سیکھتی ہیں۔ اُن کے معلومات کا دائرہ مردوں کے برابر وسیع ہوتا ہے، وہ اپنی سلیقہ شعاری کی بدولت ہماری عورتوں سے کہیں زیادہ عمدگی اور صفائی سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کی اعلیٰ تعلیم، آزادی اور سیاحت نے انھیں نہایت روشن خیال بنادیا ہے۔ وہ سماج میں نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ خود اپنے حقوق سے واقفیت رکھتی ہیں اور ان کے مردوں کو اُن کی حق تلفی کا کبھی کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا۔ گویا ان کی حالت اکابرینِ اسلام کی خواتین سے اشبہ ہے، زمانۂ سابق کی طرح یہ بھی اپنے مردوں کے ہمراہ دور و دراز کا سفر اختیار کرتی ہیں، حضر و سفر میں ساتھ رہتی ہیں، کل اصلاحی و معاشرتی امور میں اپنے مردوں کی معاون ہوتی ہیں۔ تاریخ داں حضرات پر ظاہر ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔

یہ روایت جو بیان کی جاتی ہے کہ "اسلام عورتوں کو چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا"، ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ اگر فی الحقیقت اسلام نے یہ حکم دیا ہوتا تو فریضۂ حج مردوں کے دوش بدوش عورتوں پر یکساں کبھی عاید نہ ہوتا۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلعم تو جنگ کے مواقع پر بھی اکثر اپنی ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کو اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ اسلام نے یقینی پردے کا حکم دیا ہے مگر اس کا مفہوم ہرگز وہ نہیں ہے جس پر مسلمانانِ ہند کاربند ہیں۔ ہمارے پردے کی نوعیت قطعی جداگانہ ہے جو مجموعی حیثیت سے اسلام کے احکام کی مطابقت تو درکنار بلکہ صریح طور پر ہادیانِ اسلام کی سیرت کے خلاف ہے۔ آیتِ پردہ سے کل نامحرموں کے سامنے بے تکلفانہ آمد و رفت کا نہایت سختی سے انسداد کیا گیا ہے۔ اس کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہماری عورتیں بیکار محض بن کر گھر کے اندر چچازاد، خالہ زاد وغیرہ بھائیوں اور دیگر ایسے غیر محرم اعزاء جلیس رہکر جن سے اسلام نے عقدِ مناکحت جائز قرار دیا ہے لایعنی گفتگو کیا کریں۔ ہماری موجودہ معاشرت میں ہماری عورتوں کا یہ رویہ پسندیدہ طور پر رائج ہونے کے باوجود شرعی و نیز اخلاقی نقطۂ نظر سے ہرگز مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس قسم کا طرزِ عمل اکثر و بیشتر نفسانی جذبات کی برانگیختگی کا محرک ہوا کرتا ہے، کیونکہ ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اس میں شک نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت بخیالِ تحفظ عصمت و عفت عورتوں کو چوکھٹ سے باہر کہیں نقل و حرکت کی اجازت نہیں دیتی اور محض اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اتفاقاً اگر ان کو کہیں آنا جانا بھی پڑتا ہے تو ڈولی محافہ وغیرہ کے ذریعے سے پردے کا زبردست اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں کسی انسانی نگاہ کا تو کیا ذکر ہوا کی آمد تک کا انسداد نہایت استحکام کے ساتھ کیا جاتا ہے، مگر اپنی چار دیواری کے اندر بہت سے ایسے افراد سے جن کو مذہب نے نامحرم قرار دے رکھا ہے اور جن سے پردے کا قطعی حکم دیا ہے کسی قسم کا پردہ تو کجا حجاب تک نہیں کیا جاتا۔ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہماری عورتوں کا موجودہ پردہ بالکل ویسا ہی ہے جس طرح بے وضو کی نماز یا نجاست کی حالت میں روزہ۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حامیانِ پردہ اس کے استحکام و بقا کے لئے دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں فصیح و بلیغ مقالے لکھتے ہیں۔ مگر اب تک کسی نے متذکرۂ بالا وبائی رواج کے انسداد کی کوشش نہ کی جو شریعت کے سراسر خلاف ہونے کے باوجود ہر شریف گھر میں پسندیدہ معاشرت متصور ہوتی ہے ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری عورتوں کے موجودہ پردے کی خوبی اور بہتری کی نسبت جو یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ "صرف یہی ایک ذریعہ ہے جو انھیں افعالِ شنیعہ و اعمالِ قبیحہ کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے" کہاں تک قابلِ اعتبار ہے۔ جبکہ تجربے سے اچھی طرح ثابت ہے کہ گھر کے اندر مقید رہنے کے باوجود جرائم شرعی و اخلاقی کا ارتکاب ہوتا ہے اور ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلا جاتا ہے۔

اس بحث سے ہمارا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ رسمِ پردہ بالکل اٹھا دی جائے

اور ہم اپنی عورتوں کو مغربی روشنی کے زیر اثر ہر قسم کی آزادی دیدیں۔ البتہ اتنی آزادی ضرور دیدیں جتنی شرع نے روا رکھی ہے اور پیغمبر اسلام نے جس قدر اپنی عورتوں کو دے رکھی تھی۔ ہماری موجودہ معاشرت میں یقیناً اصلاحات کی ضرورت ہے اور شرعی احکام کا لحاظ رکھتے ہوئے مروجہ پردے میں ترمیم نہایت ضروری ولابدی ہے۔

اسلام نے عورتوں کے حقوق کی جتنی حفاظت کی ہے اس کی نظیر کسی اور مذہب میں کم ملے گی۔ لیکن ہمارے ملک میں اُن کے جملہ حقوق صرف کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں، اور عملی زندگی میں شاید ہی کسی دوسرے ملک کی مسلمان عورت ایسی مظلومی اور بےکسی کی زندگی بسر کرتی ہوگی جیسی کہ ہماری عورتیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہر ملک کے ماحول کا اقتضار مختلف ہوا کرتا ہے، لیکن اسلام کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اس کے قوانین و اصول ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں اور یہی اس کی عالمگیر شہرت و دائمی اثر کا باعث ہے ہرگز کسی شخص کو اس کے احکام و قوانین میں رد و بدل کرنے کا مجاز نہیں، اس لئے اسلام کی اس اٹل خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی مسلمان ہندوستان کے موجودہ پردے کے متعلق یہ دلیل پیش نہیں کر سکتا کہ ہمارا موجودہ اصول محض ملکی ماحول کے اقتضار کا اثر ہے جس کو ہمیں مجبوراً برتنا پڑتا ہے، کیونکہ جب اس قسم کے پردے کو روا رکھا جاتا ہے اور شرعی نقطۂ نگاہ سے ہرگز کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تو پھر اُن مسلمانوں پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جو اپنے طرز معاشرت و مقتضائے ماحول کے زیر اثر ریش و بروت کی صفائی کو غیر شرعی تسلیم کرتے ہوئے محض رفتار زمانہ سے مجبور ہو کر بجا و روا قرار دیتے ہیں۔ یہ مسلہ ہے کہ کلیہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے، کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ مذہباً ایک غیر مذہبی شے کو روا رکھا جائے اور دوسری کو ناروا ؎

یا تو بیگانہ ہی رہئے ہوجئے یا آشنا
یہ ادا کیا آشنا گا ہے، گہے نا آشنا

اسی ضمن میں ہم اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ آج کل اس ملک کے مسلمانوں میں جس قسم کا معاشری پردہ رائج ہے وہ ہرگز واجب نہیں ہے اور نہ کسی حال میں اسلامی نقطۂ نظر سے اس قسم کے پردے کو مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ ہمارے خیال میں تو عورتوں کے حقوق غصب کرنے کا یہ ایک خود ساختہ قانون ہے جس کی رُو سے اُن کو پردے کے اندر رکھ کر کبھی چوکھٹ کے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔

تجربے سے ثابت ہے کہ مہذب قوموں میں ہمیشہ عورتوں کی عزت کی گئی ہے اور عزت کے ساتھ اُن کی آزادی اور بہبودی کا ہمیشہ خیال کیا گیا ہے، اور گری ہوئی قوم کی عورتیں ہمیشہ گری ہوئی حالت میں رکھی جاتی ہیں۔ اس بنا پر یقینی ہمارا موجودہ رویہ ہماری قومی نکبت کا سبب ہے اور جب تک اپنی موجودہ طرز معاشرت کو ہم مایۂ ناز سمجھتے رہیں گے اُس وقت تک ہماری حالت سنبھل نہیں سکتی۔

مزید برآں اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکتا ہے کہ ہر قوم کی ترقی اُس کی عورتوں کی ترقی پر منحصر ہے۔ اسلام نے بھی اسی اصول کو پیش کیا ہے اور شارع اسلام کا اسی پر عمل درآمد تھا۔ چنانچہ عرب میں جب تعلیم پھیلی تو مردوں اور عورتوں میں برابر پھیلی، اگر جہالت رہی تو دونوں میں۔ علم کا چرچا پھیلا تو دونوں میں۔

ہمارے ملک میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت اب تک قائم ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہم لوگ بانئ اسلام کے افعال و اقوال سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ تحصیل علم کے متعلق خود ارشادات نبوی ہیں کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ۔ اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔

چنانچہ آج کل جس طرح اسلامی ممالک کی عورتیں قومی علم دیا سلیقہ میں اُسی طرح مسلمان بیبیاں پہلے زمانے میں تھیں۔ اسی لئے اس قدر ترقیاں مسلمانوں نے کی تھیں جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ زمانۂ سابق میں مسلمان عورتیں محدث فقیہہ۔ شاعر۔ مدبر اور سبھی کچھ تھیں۔ سلطنتوں کے انتظام اُنھوں نے کئے ہیں۔ اور بڑے بڑے کارہائے نمایاں ان کی بدولت انجام پائے ہیں۔ مگر افسوس ہم نے تو اپنی عورتوں کو موم کی گڑیا بنا رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عالم کو جاہل بیوی سے کیا اُنس ہو سکتا ہے۔ ایک ذی علم شوہر کو کندۂ ناتراش عورت کے ساتھ کوٹھری میں بند کر دینا یقینی طوطی را با زاغ قفس کردن کا مصداق ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ خدا کی خدائی اور بندے کی بندگی بغیر علم کے دل پر نہیں جمتی۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ع

کہ بے علم نہ تواں خدا را شناخت

بعض ممالک اسلامیہ کی خواتین کی نسبت میرا ذاتی علم ہے کیونکہ عرصہ چار پانچ سال کا ہوتا ہے کہ راقم الحروف خود عراق و ایران وغیرہ گیا تھا۔ وہاں کی

عورتیں علاوہ اپنی مادری زبان فارسی و عربی کے ترکی روسی اور فرانسیسی زبانوں سے بالعموم واقفیت رکھتی ہیں، اور بعض تو انگریزی بھی جانتی ہیں اگرچہ وہ مصر اور ترکی کی عورتوں سے نسبتاً تعلیم میں پیچھے ہیں، تاہم ہماری عورتوں سے بدرجہا سلیقہ مند، ذی شعور اور فرزانہ ہوتی ہیں۔ سوسائٹی میں اُن کی عزت کی جاتی ہے۔ مالی، ملکی، اعزازی، غرض کسی امر میں اُن کے حقوق غصب نہیں کئے جاتے اور وہ کل معاشرتی و اصلاحی امور میں حصہ لیتی ہیں اور ہماری عورتوں سے کہیں اچھے درجے میں ہیں۔ مگر صد حیف ہم نے اپنی عورتوں کو بیکار محض بنا رکھا ہے مزید برآں ہم ان کو کسی شمار و قطار میں نہیں رکھتے، اُن کی ہستی کوئی ہستی نہیں سمجھی جاتی، ان کا وجود کوئی وجود نہیں خیال کیا جاتا، افسوس ؏

بہ حیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد بود

نظر بر امور بالا ہم کو اپنی موجودہ طرزِ معاشرت میں اصلاح کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ترقی کی طرف ہم قدم اُٹھا سکیں اور سب سے ضروری اصلاح یہی ہے کہ ہم اپنی عورتوں کی تعلیم میں کوشش بلیغ کریں اور ان کے موجودہ طریق پردہ میں جائز ترمیم کرکے حسب احکام شرعیہ رواج دیں اور ان کو پورے طور پر مذہبی آزادی دے کر ہم ان کے جملہ حقوق کو غصب کرنے سے کلیتاً اجتناب کریں اور اسی میں ہمارے لئے فلاح دارین کا راز مضمر ہے۔

ہم کو اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ ہماری بے زبان عورتیں نہایت صابر، مطیع، بچوں کی پرورش میں بے مثل ساعی اور شوہروں کی بے حد فرماں بردار ہوتی ہیں۔ مگر ان خوبیوں کے باوجود جب مردوں کا جاہلانہ و ظالمانہ برتاؤ ان کے ساتھ دیکھا جاتا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اعتدال ہر شے کا اچھا ہے۔ ہماری عورتوں نے ان خوبیوں میں حد سے تجاوز کیا ہے جس کی وجہ سے مردان کو جزو ضعیف سمجھکر ہر طرح اُن کے حقوق کو پامال کرنے کی فکر کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ مسلمانانِ ہند بیدار ہوں اور اب بھی اپنی آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھائیں، اپنی تنگ نظری کو روشن دماغی سے مبدل کریں اور اسلامی ممالک کے نقش قدم پر چل کر اپنے کو دنیا میں ایک زندہ قوم شمار کرانے کی جدوجہد کریں۔

ممکن ہے میری یہ تحریک بعض قدامت پرست حضرات کی نظروں میں ناگوار اور تکلف ثابت ہو، کیونکہ اگر عورتوں کو اتنی آزادی دے دی جائے گی جتنی کہ خدا نے اُن کے لئے حکم دیا ہے اور اکابر اسلام نے ان پر عمل پیرا ہوکر دکھایا ہے تو ایسی حالت میں مردوں کی حکمرانیوں اور آرام و آسائش میں خلل واقع ہونا لازمی ہے اور شاید وہ اس کو گوارا نہیں کریں گے۔ مگر اسلامی احکام کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ان کی مخالفت کو حرکت مذبوحی پر محمول کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر انقلاب میں کچھ نہ کچھ نقصان ہونا لابدی ہے مگر معمولی سے نقصان کو بڑے فائدوں کے حصول کے لئے نظر انداز کرنا ضروری ہے اور یہی دنیا کا اصول رہا ہے، ہم اس کلیے سے مستثنیٰ کیونکر ہو سکتے ہیں۔

اسلامی احکام عورتوں کے باب میں کیا ہیں؟ ہم اس کے معلوم کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے اور اگر کسی صورت سے معلوم بھی ہوجاتے ہیں تو ہم ان کے متعلق تاویلات پیش کرکے اپنی ہی خود ساختہ اور لغو معاشرت کا مظاہرہ کرنے اور اس کو بہترین ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف عمل رہتے ہیں اور جب کبھی کوئی حساس شخص قوم میں بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے تو شور و غوغا کے ساتھ مذہب کی مخالفت کا پرانا حیلہ پیش کرکے ہم اپنی بدبختی کا ثبوت پیش کرتے ہیں ؎

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

پھر دل میں کسی ہستی کا راج دیکھا میں نے
پھر فوجِ جنوں تیرا تاراج دیکھا میں نے
ہائے جب سفر ختم ہوا اک عمر کے بعد
اپنی جانب پھر آج دیکھا میں نے

احمد شمیم

قدرت کی فیاضیاں

جوش ملیح آبادی

(۱)

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

اُس کا سب سے پہلا احسان تو یہ ہے کہ اُس نے مجھے ایک ایسے نامور و مقتدر خاندان میں پیدا کیا جو مرتبے میں بلند، علم و ادب میں ممتاز، دلیری و سیر چشمی میں یکتا، صورت شکل میں نمایاں، سیرت و کردار میں بے نظیر، وجاہت و اقتدار میں لاثانی اور بذل و سخا میں بیباک و جری تھا۔ جو ہر صاحبِ حاجت کو سلام کرنے میں سبقت کرتا سوال سے پیشتر حاجت روائی کرتا، اور احسان کرنے کے بعد شرما جاتا تھا +

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۲)

بہتّر ماؤں سے زیادہ شفقت کرنے والے باپ نے میری طفلی کو اُس معصوم بچّۂ آہو کی طرح بنا دیا تھا جو جھومتی ہوئی گھٹاؤں کے لوٹتے ہوئے سائے میں چوکڑیاں بھرتا، اور پھولوں سے لدی ہوئی وادیوں میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے — جو محبت کے موقع پر مجھے سونے کا نوالہ کھلاتا، اور تربیت کے وقت شیر کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۳)

جب میں جوان ہوا تو اُس نے مجھے ایسی تند و تیز اور گرجتی گونجتی جوانی عطا فرمائی، جس کے سامنے طوفانوں کی سانس اُکھڑ جاتی، اور بپھرے ہوئے عناصر کی نبضیں چھُوٹ جاتی تھیں۔

اُس نے میری جوانی کو مناظر کے سپرد کرکے اُن سایہ دار راستوں سے گزارا جو باغوں، چشموں، اور برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی طرف مُڑتے ہیں۔ جہاں کوئلیں کُوکتی، مور ناچتے، ہوائیں گنگناتی، کلیاں چٹکتی، شاخیں جُھومتی، نالے شور کرتے ہیں۔ اور جہاں دوشیزگانِ صحرا اپنے غیر محسوس حُسن برشتہ کے نشے سے سرشار ہوکر برسات کی ہواؤں کے ساتھ جھُومتی ہوئی چلتیں، اور دُور کی تلخ و شیریں بانسری کی لے پر اس طرح سر دھنتی تھیں کہ اُنکی زلفیں بار بار سینے پر یوں لہرانے لگتی تھیں جیسے خون میں عنفوان شباب کی اُمنگیں، یا کسی دوشیزہ سینے میں ع "کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است" کا مبہم سا سوال —

اسی کے دوش بدوش اُس نے میرے شباب کو علم و بصیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر اِس نیلے آسمان، اور اس خاکی زمین پر ایسی درسگاہیں کھول دی تھیں جہاں کتابوں کے عوض طلوع و غروب کے اوراق، اور لالۂ و گل کی تحریریں تھیں ——

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۴)

وہ جن کا جمال فرشتوں کی پیشانیاں، اور حوروں کی آنکھیں جُھکا دیتا تھا، اور جن کے متعلق جواں مرگ عرفی ع "آہوان حرم را کفنند صید" کہہ چکا ہے، جب میرا شباب اُنکی جانب دیکھتا تھا اور اُن کے تیوروں سے مجھے پتا چل جاتا تھا کہ وہ سب "درآرزوئے ناوکِ صید افگن من اند" کے مصداق ہیں، تو دُنیا کے کسی جوان کا سر مجھے اپنے سر سے اونچا نظر نہ آتا تھا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۵)

لیکن کامران محبت کے ساتھ ساتھ اُس نے مجھے انسان بنانے کی خاطر میری حیات معاشقہ میں انتہائی دیدہ دری کے ساتھ ایسے دل میں ترازو ہو جانے والے تیر بھی رکھے تھے، جو سینے کو فگار، اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتے ہیں اُن تیروں نے مجھے عشق کی بےچینیوں، اور محبت کے آنسوؤں سے بہرہ مند کر دیا —— یہ کوئی کم احسان تھا ؟ اِس لئے کہ دردِ دل، اور اشکِ غم کے بغیر محبت ہی نہیں بلکہ خود حیات بھی ایک حیوانی کھیل، اور حیوانی جست و خیز کے سوا اور کوئی معنے نہیں رکھتی۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۶)

اِسی کے ساتھ اُس نے مجھے وہ رفیقۂ حیات بخشی جس میں زلیخا کی سی شیفتگی، اور چاند بی بی کا عزم ہے —— ہر چند وہ تُند خو اور شعلہ مزاج ہے، اور مجھے مقیّد رکھنے میں ایسے ہولناک مبالغے کے ساتھ مصر رہتی ہے کہ میری قوتِ برداشت کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ایک ایسا زبردست و جانکاہ بریک (Brake.) نہ ہوتی تو خدا جانے میں اپنی زندگی کی مشین کو کس چٹان سے ٹکرا کر کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۷)

سر سے شفیق باپ کا سایہ اُٹھتے ہی، عین اُس آن جبکہ یہ ننھا سا مگر حد سے زیادہ شریر ستارہ جسے دُنیا کہتے ہیں میری ناز و نعم میں پلی ہوئی نوجوانی پر وار کیا ہی چاہتا تھا، کہ یکایک مجھے ایک دور دراز مقام پر قصرِ شاہی میں پہونچا دیا گیا —— ہُنر شناس، اور معارف پرور سُلطان کے تاج کی کرنیں میری نوجوانی پر پڑیں، اور چشمِ زدن میں میری تقدیر کا آسمان جگمگانے لگا —— عصائے شاہی ہوا میں بلند ہوا، میرے ماحول کی چٹان پر ضرب لگائی —— اور پتھروں سے میٹھے پانی کے متعدد چشمے پھوٹ نکلے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۸)

میں ایک زمانۂ دراز تک قصرِ سُلطانی میں رہا۔ جہاں اربابِ حاجت کی خدمت میرا محبوب ترین مشغلہ تھا —— اور جب اُس نامعلوم قوت نے جو اس کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے، یہ دیکھا کہ قصرِ شاہی میں میرا مزید قیام مناسب نہیں رہا ہے تو مجھے دور بہت دُور ایک قطعی مختلف اور سراسر تنگ و تار ماحول میں بانوں ہاتھ پہونچا دیا۔ اوّل اوّل تو مجھے

اِس تبدیلی سے سخت وحشت ہوئی ——— میں گھبرا گیا۔ خوف زدہ ہوگیا۔ کیونکہ میں اُس وقت ع "چنداں کہ خدا اغنی ست امن محتاجم" کا کامل مصداق تھا— حکیمانہ مزاج، اور شاعرانہ بے نیازی اگر میرا بازو نہ تھام لیتی تو میں لڑکھڑا کر گر پڑتا، اور گرتے ہی چُور چُور ہو جاتا ——— لیکن اس سے پیشتر کہ تباہی مجھ پر بھرپور وار کر سکے، اور میں بیٹر یا سوسائٹی کا نوالہ بن جاؤں ایک قطعی غیر متوقع سمت سے ایک " مردِ غیب " رام وچھمن کے خاندان کا چشم و چراغ، عزیز مصر کی طرح نمودار ہوا، اور مجھے غلام بنا کر نہیں، بلکہ آقا و سردار بنا کر اپنے محل میں اُٹھا کرلے گیا۔

مہربان بادشاہ کے دربار سے اخراج کے وقت (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا منجنیق میں بٹھا کر مجھے دہکتی ہوئی آگ میں پھینکا جا رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی میں اُس آگ میں گرا، کیا دیکھتا ہوں کہ دہکتی ہوئی آگ مہکتے ہوئے پھولوں اور اُبلتی ہوئی شراب میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۹)

ابھی مجھے اپنے "عزیزِ مصر" کے جوار میں ایک سال ہی گزرا تھا کہ میری حیات کے افق پر دُور سے ایک سبز روشنی نمودار ہوئی ——— اور میں اُس روشنی کی طرف روانہ ہوگیا—

ابھی کچھ دُور ہی گیا ہونگا کہ ایک موڑ پر وہ روشنی غائب ہوگئی، اور ایک بھیانک غار سامنے آگیا ——— ایسا ہولناک غار کہ الحفیظ والامان ——— لیکن اس درماندگی کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ایک سانولے رنگ کا دوسرا "مردِ غیب" کرشن جی کی طرح مُرلی بجاتا ہوا سامنے آیا۔ اور خضر کی سی محبت کے ساتھ میرا ہات پکڑ کر مجھے وہاں لے آیا، جہاں سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں۔

(۱۰)

میں اُس سبز روشنی کے حلقے میں اپنے خضرِ راہ کے ساتھ ایک مدت تک انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ رہا۔ لیکن کچھ روز کے بعد میرے خضرِ راہ کے چہرے پر وحشت و رمیدگی کے آثار پیدا ہو چلے، اور اُس کے انفاس سے مجھے بے تعلقی کی بُو آنے لگی، میں نے اِن آثار کو وحشت کی نظروں سے دیکھا، اور ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اِس اثنا میں ایک صبح دیکھتا کیا ہوں کہ میرے خضرِ راہ کا حُجرہ خالی پڑا ہوا ہے اور وہ مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگ چکا ہے ——— لیکن ابھی میں آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ یکایک ایک جلوس کے باجوں کی آوازسے تمام فضا گونج اُٹھی، اور میں قافلہ سالار کے رفیقوں میں شامل ہو کر اس مقامِ تنگ و تار سے ایک گلستانِ رنگ و بو میں پہونچ گیا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں ؟

(۱۱)

خودستائی ایک بُری چیز ہے، مگر بولنے کے موقع پر چُپ رہنا اُس سے بھی بُرا ہے، اور بالخصوص اظہارِ شکر کے موقع پر بخشش کرنے والے کے ایک ایک احسان کو کھول کھول کر نہ بیان کرنا صرف بُرا ہی نہیں بلکہ ناشکری، کمظرفی، اور تنگدلی کی علامت ہے ——— اس لئے میں قدرت کے اُن احسانوں کو بھی بیان کرونگا جن کا تعلق میری سرشت اور میرے ضمیر سے ہے۔

میں اِس کہنے میں نہ جھجکوں گا کہ میرے پہلو کو او تاروں کا سا دل ودیعت فرمایا گیا ہے— وہ دل جو ہر جاندار و بے جان کی محبت سے معمور، اور جذبۂ نفرت سے قطعی بیگانہ ہے وہ دل جو دشمنوں تک پر قربان ہو جانے میں وہ انوکھی مسرت محسوس کرتا ہے، جو انسان کو اُس لمحۂ اول میں محسوس ہوتی ہے

جب کہ اُس کی کھوئی ہوئی بصارت یکا یک عود کر آتی ہے — اسی کے ساتھ ساتھ میرا دل دلیر بھی ہے اور بیباک بھی — جس پر دولت کا طنطنہ، سوسائٹی کا اقتدار، اور شاہوں کا دبدبہ ذرہ برابر بھی اثر نہیں کرتا — وہ دل جو بنی نوع انسانی کی المناکیوں پر ہر آن دھڑکتا رہتا اور وطن کی درماندگیوں پر خون کی بوندیں ٹپکاتا رہتا ہے۔

اِس کے علاوہ مجھے وہ زندہ دلی اور وہ خاطر مجموع عطا فرمائی گئی ہے جو ہر تلخی کو شیریں بنا دیتی ہے، ہر مصیبت کے ساتھ مسخرگی کرتی ہے، اور ہر بلائے آسمانی کی کلائی موڑ کر رکھ دیتی ہے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۱۲)

آخر میں اپنے جوہرِ ذاتی کا ذکر کرونگا — جس کا سلسلۂ نسب، نبوت و رسالت سے جا کر مل جاتا ہے — وہ جوہر، جسکا ہر جُزو، ارض و سما پر بھاری ہے — اور جو خاک میں اُلُوہیت پیدا کر دیتا ہے۔

یہ وہ جوہر ہے جو انسان کو وہاں پہونچا دیتا ہے جہاں اسمار و اشکال کے چہروں کی نقابیں اُٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ جہاں خیر ہے، نہ شر، پستی ہے، نہ بلندی، موت ہے، نہ حیات، روح ہے نہ مادّہ، اہرمن ہے، نہ یزدان، اور جہاں نہ بندہ ہے، نہ خدا —

یہ کیسا اُوہی استغنا رہے جو میرے سینے میں سانس لیتا رہتا ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارض و سما کے تمام خزانے میری ٹھوکروں کی زد پر ہیں۔ اور یہ سارا نظام شمسی میرے پاؤں چوم رہا ہے۔

ہاں سچ ہے کہ وہ چاندی سونے اور تانبے کے سکے جن پر ان زمین کے کمزور بادشاہوں کی تصویریں کندہ ہوتی ہیں، میرے پاس نہیں ہیں، لیکن کون یقین مانے گا کہ یہ مردِ مفلس اگر اپنی جیب کو جھاڑ دے تو روئے زمین پر زر و گوہر اور شمس و قمر کا مینہ برسنے لگے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟
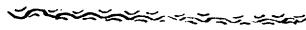
وہ کفر کی تکرار سے تھک جاتا ہے
یہ دین پہ اصرار سے تھک جاتا ہے
اب عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار سے تھک جاتا ہے

(جوش)

فلسفۂ کائنات

تشکیل مادّہ

سید علی اکبر (بھوپال)

مادّہ و روح کی زمانۂ حال کی تعریفات یا تشخیص ذاتی کے متعلق غور و فکر دراصل دماغی افکار کی بڑی پیچیدہ گتھیاں ہیں اور فطرت کا یہ سرکش فرزند (انسان) برف کی چٹانوں کے پاس بیٹھکر چقماق سے آگ نکالتے ہوئے طبیعات و مابعد الطبیعات میں اُلجھنے کے بجائے، ہاتھی اور گینڈوں سے زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ہزاروں برس تک انسان کو پیٹ بھرنے اور نسل بڑھانے کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ جسد و روح کا امتیاز اور حیات و موت کے متعلق اوسکے خیالات اِس قدر محدود تھے کہ دن رات ستارہ سمندر اور سب نقل و حرکت کرنیوالی ہستیاں اُسکے نزدیک زندہ اور حساس تھیں۔ گویا ہزاروں برس تک انسان علمی طور پر بالکل حیوان بنا رہا۔ کہ دفعتہً کرۂ ارض کے بعض گوشوں میں اُسکے دماغ نے نیا قالب اختیار کیا۔ اور اُسکے خیالات کی کایا پلٹ گئی۔ وہ غور کرنے لگا۔ کہ انسان کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کہاں ہے؟ یہ بیداری دو ہزار برس قبل مسیح ایک چھوٹے سے ملک یونان میں ہوئی (جو اُس وقت ایشیائے کوچک میں شامل تھا) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بیداری کی وجہ کیا تھی۔ دماغی ترقی کے اسباب کیا ہوتے ہیں اور کیوں دماغ تخلیات کا مرکز ہے۔ وہ بیداری یقیناً تدریجی ترقی کا نتیجہ نہ تھی۔ جو کسی نسل میں رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں دماغی قابلیت ترکہ اور میراث کے لحاظ سے کوئی وقیع چیز نہ تھی۔

بہرحال اس سوال کا جواب دشوار ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ بیداری مشرق و مغرب کے سنگم میں پیدا ہوئی۔ اور ٹھیک اُس وقت جب مصر کی بندرگاہیں یونانیوں کے لئے کھُلی ہوئی تھیں یونانی تجارت کو بڑی رونق حاصل تھی۔ اور مقابلتاً دنیا کے ہر حصہ سے وہاں کے بازاروں میں زیادہ چہل پہل تھی۔ یونانی جزائر اور ساحلوں پر خوبصورت بالوں والے شمالی وحشیوں سے۔ سیاح اور جہانگرد مصریوں سے۔ ہئیت داں اہل بابل سے اور سمندر میں گھومنے والے فونیشن سے یونانیوں کا اتحاد و اختلاط رہتا تھا۔ اور اسی چھوٹے سے قطع زمین اور اُسکے ملحقہ جزائر میں اہل یورپ سے ایشیائی باشندوں سے اور اہل افریقہ سے باہم میل جول اور شادی

بیاہ ہوتے تھے۔ غالباً دنیا کی تاریخ میں اُس سے قبل کبھی خیالات
کا ایسا تصادم اور بین الاقوامی ازدواج نہ ہوئے ہونگے۔

علم الحیات اور علم الاخلاق کے قانون کے مطابق بھی یقیناً
ایسے بین الاقوامی اتحاد اور میل جول کا نتیجہ ایسی ہی دماغی بلندی
اور اخلاقی پستی ہونا چاہیئے تھا۔ اور اسی مفروضہ سے ایسی اچانک
دماغی ترقی و تنزل کی تاویل ہوسکتی ہے۔

اہل مونگریل اکثر دماغ والے اور توی ہونیکے علاوہ بہت سی
حیثیتوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ لیکن بلحاظ قانون توریث انکی اولاد
سپوت نہیں ہوتی۔ اسی طرح 'جیکاگو' اور نیویارک میں ہم دماغی
نقل و حرکت کے ساتھ اخلاقی پستی اور ایسی صفات دیکھتے ہیں جو اگر
ایک نسل میں ظاہر ہوتے ہیں تو دوسری نسل سے معدوم ہوجاتے
ہیں۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں یونانی دماغ کی یہ زرخیزی
خاصکر بین الاقوامی میل جول کیوجہ سے تھی۔ اور یہ محض فطری طور پہ
نسلی ترقی کی ایک مثال یا نطفوں کے اختلاف کی پیدا ہوئی ذہانت اور
طباعی تھی۔ تاہم یہ بیداری بادی النظر میں جیسی معلوم ہوتی ہے ویسی
اچانک بھی نہ تھی۔ یونانی دماغ اِس کے لئے آمادہ تھا۔ یونانی زبان
اور یونانی علم الاصنام ایسی طباعی کا پتہ دیتے ہیں جو کافی ترقی یافتہ
ہو۔ اور یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل بابل اور اہل مصر کافی متمول
اور علم اقلیدس اور علم ہیئت میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ بہرحال
وجوہ جو کچھ بھی ہوں۔ یونان میں ایسے عالی دماغی، ایسی ذہانت اور
ایسی طباعی ظاہر ہوئی کہ دنیا کی تاریخ اُس سے نا آشنائے محض تھی
انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ماحول کو دیکھا۔ دیکھا اور حیرت
میں ڈوب گئے۔ اب ہاتھی اور گینڈے کے شکار کا شغل نہ تھا۔ اور
عالی دماغی کے ساتھ اُس سے کام لینے کی فرصت بھی مہیا تھی بابل۔
مصر اور ٹیپر وغرض جہاں کہیں بھی قدیم تہذیب رونما ہوئی۔ وہ مقامات
ہیں جہاں آب و ہوا کی جملہ خوبیاں میسر تھیں۔ اور یونانی فلسفی تو اس
خوبصورت قطعۂ زمین میں پیدا ہوئے جو بلحاظ آب و ہوا رہنے
دینا آپ ہی جواب تھی۔ جہاں ترقی کا موقع حاصل تھا۔ اور عقل
کو نشوونما پانے کی فرصت مہیا تھی۔ اب پرانے مقولے اُنکے افق علم
سے گر گئے۔ فرسودہ تفصیلات ساقط الاعتبار ٹھہریں۔ اور راز کا رنگ نہ
دیوتا اُن تشنگانِ صداقت کی پیاس بجھانے سے قاصر رہے۔ انھوں
نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ یونانی جزائر نیلے سمندر میں چمک
رہے تھے۔ متناسب الاعضاء اور سڈول مرد۔ پُرشباب عورتیں دیکھیں۔
اِسلئے انکی گہرائیوں میں احساس حُسن پیدا ہوچکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
انھوں نے حسین حسین مجسمے بنانے شروع کر دیئے۔ اور طویل طویل
نظمیں کہنی شروع کیں۔ وہیں ہومر، بھی پیدا ہوا وہیں فیڈیس، نے
بھی جنم لیا۔ وہیں یورپیڈس، وجود میں آیا۔ اور وہیں، سوفیکلس، کا
مسقط الراس قرار پایا۔ انہوں نے پھر بغور اپنے ماحول کو دیکھا۔
اپنے عقب میں پیدایش کو اور اپنے سامنے موت کو دیکھا۔ رازِ
ہستی کو سمجھنے کے لئے فلسفیوں کے گروہ پیدا ہونے لگے وہیں افلاطون
بھی پیدا ہوا۔ وہیں سقراط، بھی۔ وہیں، دیمقراطیس بھی ہوا اور
وہیں ہیری قلاطوس بھی۔

دراصل یہ ساز و سازندہ کا معاملہ تھا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار
برس سے انسانی دماغ وہاں موجود تھا۔ اور ایک لاکھ پچاس ہزار
برس سے ستارے اور سمندر ساز چھیڑے جانے کے منتظر تھے۔
لیکن ساز اب جاکے موسیقار کے قابل ہوا اس میں شک نہیں کہ
دورِ حجریت کا انسان بھی نقاشی اور صنعت و حرفت میں ماہر تھا
کیونکہ اس زمانہ کے ہرن۔ سانڈ اور ہاتھیوں کے مجسمے ہاتھی دانت
اور نیگو نیپر اکثر نظر آتے ہیں۔ لیکن دورِ حجریت افلاطون اور فیڈیس
کو پیدا نہ کرسکا۔ اسلئے کہنا پڑتا ہے کہ چھ سو برس قبل مسیح کا یونانی
دماغ تاریخ عالم میں ایک 'جدت' تھا۔ دورِ حاضرہ کا انسان اپنے
روز کے دھندوں میں مشغول رہتا ہے۔ اور بہت سی حیثیتوں سے
اُس کا دماغ ترقی یافتہ اور باخبر کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ستاروں
کی طرف سے وہ پھر بھی بے پروا نظر آتا ہے۔ وہ ان اشیاء
کے متعلق اپنے کمزور تجسس اور اشتیاق کو مطمئن کرنے کے لئے
کافی معلومات بھی رکھتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کی مشنری
اس سے غیر متعلق چیز ہے۔ لیکن یونانی فلسفی کے لئے یہ بات نہ تھی۔
اُسکے لئے دنیا عجیب و جدید شے تھی۔ اِس میں اُسکو راز ہی راز نظر

آتے تھے۔ اور وہ ان کو سمجھنے اور حل کرنے کے پاک جذبے سے بے چین تھا۔

سب سے پہلے جس معمہ نے یونانی دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ (Objective) معروضی تھا۔ جسکو ہم تھوڑے سے تغیر کے ساتھ "مادہ" کہتے ہیں اور جس سے مادی کائنات تعمیر ہوئی ہے۔

غالباً انسان نے اول اول مادہ کو محض حساس فرض کیا اور غالباً اسی وقت تک مادہ کے مجہول ہونے کی اختراع انسانی دماغ نے نہیں کی تھی۔ وہ مادہ اور اس کے خواص میں امتیاز نہ کرتا تھا (Subjective + Objective) نہ معروضی اور موضوعی، کے فرق سے آشنا تھا، لیکن رفتہ رفتہ مادہ، مادیت اور مابعد الطبیعات کا مجموعہ خیال کیا جانے لگا۔ یہ موخر خیال آیا صحیح اور قطعی ہو یا وہ ترقی یافتہ طبائع کے نزدیک قابل قبول ہو یا نہ ہو ہم یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ اس خیال کو اب بھی عام مقبولیت حاصل ہے۔ اور موجودہ مادہ کا یہی نظریہ تھا۔ جو یونان کے عہد زریں میں بھی مقبول تھا۔

تو پھر یہ مادہ اور وجود فی الخارج والا مادہ کیا شے ہے؟ جس سے جمادات۔ نباتات۔ حیوانات۔ فلکیات مرکب ہیں؟ دنیا کیا ہے جو قدیم ہے یا مخلوق؟ خوبصورت اور قدیم روایات سے اکتا کر ان فلاسفہ نے ماہیت اشیاء عالم کی نئی نئی توجیہات کرنی شروع کیں۔ مثلاً (Thales) تھیلس نے مصری فلسفہ سے متاثر ہو کر خیال کیا کہ موجودات کائنات کی اصل پانی ہے۔ اور اس کے شاگرد (Anaximander) اناکسی منڈر کا رجحان یہ قائم ہوا کہ اشیاء عالم کی علت مادی اور عنصر اولیہ Infinite "لا متناہی" ہے۔ (Theopharastus) تھیو فراسٹس لکھتا ہے کہ پراکسیادس کا بیٹا اناکس منڈر جو Militus ملیٹس کا رہنے والا اور Thales تھیلس کا ہموطن اور اس کے متعلقین میں تھا۔ اشیاء عالم کی علت مادی "اپنیتے" کو تسلیم کرتا ہے۔ اور وہ پہلا انسان ہے جس نے علت مادی کے لئے یہ نام روشناس کیا۔ وہ کہتا ہے کہ فلکیات اور جملہ عالم کی اصل نہ پانی ہے اور نہ

ان میں سے کوئی چیز ہے جسے ہم عنصر کہتے ہیں۔ بلکہ تمام عالم کی خلقت "لا متناہی" سے ہوئی ہے۔ در اصل یہ قول دور حاضرہ کے نظریہ Urstoff یعنی عنصر اولیہ کی بڑی دلچسپ دوربینی ہے (Apollonia) اپالونیا کا دیو جانس اور ملیٹس کا اناکسی منڈر اشیاء عالم کی حقیقت "ہوا" سے خیال کرتے ہیں۔ اس نظریہ سے "ہاروے" کے عہد تک علم الاجسام متاثر رہا۔ Theo-phrastus تھیو فرسٹس نے دیو جانس کے نظریہ کو یوں بیان کیا ہے: "اس کا قول ہے کہ کائنات کا عنصر اولیہ "ہوا" ہے۔ جو غیر محدود اور قدیم ہے جس کے عمل ترقیق و انجماد اور تغیر حال سے اشیاء عالم وجود میں آئی ہیں۔

ہرقلاطوس Heraclitus کائنات کا ماخذ "آگ" کو اور فیثا غورس نے "اعداد" کو تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ امپرالکس Empedocles ماخذ عالم اربعۂ عناصر یعنی آب و آتش خاک و باد کو مانتا تھا۔ اور اس نظریہ کو کم و بیش زمانہ حاضرہ تک مقبولیت حاصل رہی ہے۔

یہ نظریے ہمیں اب احمقانہ نظر آتے ہیں۔ لیکن صورت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اور وہ اکثر سنجیدہ، مستحکم، پرمغز فلسفیانہ استدلال پر مبنی ہیں۔ یہ کہ اعداد کائنات کا ماخذ ہوں ناممکن معلوم ہوتا ہو۔ لیکن اسی بیسویں صدی میں ریاضی دان طبقہ کی ریاضت نے مادہ اور مادیت کو محدود کر کے مساوات ریاضی سے کچھ ہی زیادہ ثابت کر دکھایا ہے۔ اور اسی طرح کائنات کا ماخذ "آگ" کا ہونا بھی محال معلوم ہوتا ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ "آتشین دھندلا" Nebulae ہی ہے جس پر موجودہ سائنس نے نظام شمسی کو مبنی قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ "حدت" اور "قوت" کا باہمی تعلق موجودہ سائنس کا وہ زبردست راز ہے، جس کا ابتک انکشاف نہیں ہو سکا۔ علاوہ بریں اگر ہرقلاطوس کا طرز استدلال دیکھیں تو حیرتناک حد تک اسکو مستحکم اور مدلل پائینگے۔ اسکا نقطہ نظر ایڈورڈ کلاڈ (Edward Clodd) نے اپنی کتاب پائیرس آف اوالیوشن Pioneers of Evolution

میں اس طرح بیان کیا ہے "حرکت ہی وہ نظام موجودات ہے جو ہر جگہ جاری وساری ہے۔ اور باوجود تضاد قوت Opposition of forces جو اشیار کو منظم کئے ہوئے ہے۔ موجودات میں ایک رابطۂ اتحاد قائم ہے۔ پھر یہی کائنات کے عنصر اولیہ کی جستجو کے وقت جس کے آثار مختلف اور نمایاں ہیں وہ آگ میں اوس کے صفات دیکھتا ہے۔ کیونکہ شعلہ کے اندر بہ آہستہ آہستہ جلتا ہے۔ اُسکی مقدار یکساں رہتی ہے اور شعلہ وہی ہے جسکو ہم ایک شے قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مادہ جس سے وہ مشتعل ہے۔ برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ برابر دھواں بنکر اُڑتا ہے اور اسکی جگہ اس ایندھن یا اس چیز سے پُر ہوتی ہے جس سے وہ روشن ہے۔ اگر دنیا کو ایک غیر فانی آگ تسلیم کر لیا جائے۔ تو ٹھیک یہی صورت کائنات پر منطبق ہوتی ہے۔ اور یہی نظام تمام اشیار میں جاری ہے جو تخلیق کے لحاظ سے نہ کسی انسان کا مرہون منت ہے۔ اور نہ کسی دیوتا کا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آگ کس طرح دیگر اشیار میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جبکہ دیگر اشیار ہمیشہ آگ میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں" یہ استدلال یقیناً مدلل مستحکم اور قرین قیاس ہے۔

آؤ اب یہ بھی دیکھ لیں کہ دیوجانس اپنے نظریہ 'ہوا' کی کیا توجیہ کرتا ہے۔ "وہ کہتا ہے میرا نظریہ اختصار کے ساتھ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ تمام چیزیں ایک ہی چیز کے اختلافات ہیں۔ لہذا ایک ہی چیز ہیں"۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ کیونکہ اگر آب و آتش و باد وخاک یا کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز دوسری سے مختلف ہوتی یعنی اس طرح مختلف کہ کسی چیز کے لئے کوئی مادہ مخصوص اسی کے لئے ہوتا۔ اور تمام اشیار ایک ہی شے کی اشکال مختلفہ نہ ہوتیں تو اشیار کا ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پانا ناممکن ہوتا۔ اور اُنکے ترکیب پانے سے جو مفید یا مُضر اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ وہ ناممکن ہوتے۔ لہذا انسان ہو، یا حیوان، نباتات یا کوئی اور شے اسکا وجود میں آنا اسوقت تک ناممکن تھا جب تک موجودات عالم بلحاظ حقیقت و اصلیت ایک شے قرار نہ پائیں۔ اُسی ایک شے سے تمام اشیار کی خلقت ہوئی ہے۔ بلکہ تمام اشیار ایک ہی شے کے اختلافات ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف اشکال اختیار کر لیتے ہیں۔ اور پھر اسی یعنی اپنے اصل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی میرے نزدیک یہ بھی مسلم ہے کہ وہ شے جو ماخذ کائنات ہو عظیم و برتر۔ قدیم و غیر فانی اور غیر محدود علم کی مالک ہے اگر ایسا نہ ہو تو ایسے صحیح تناسب کے ساتھ موجودات عالم میں اوسکا ہونا کہ گرمی۔ سردی۔ رات و دن۔ باد و باراں اور خوشگوار موسم کے توازن کا قائم رکھنا ناممکن ہوگا۔ نظام عالم ایسی تکمیل کے ساتھ قائم ہے۔ کہ جو شخص بھی نظر بالغ سے کام لے اور ماہئیت اشیار پر غور کرے۔ تو معلوم کر سکتا ہے کہ ممکن سے ممکن بہتر صورت میں وضع کی گئی ہیں۔

دیوجانس کا استدلال بھی یقیناً پرمغز۔ مدلل مستحکم اور منطقیانہ ہے۔ یونانی دماغ محض مادہ کی حقیقت ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مادہ کی فطرت اور تسلسل پر بھی غور کیا ہے۔

تسلسل مادہ کا سوال بادی النظر میں خالص فلسفیانہ اور منطقیانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں سے بہت سی ایسی علمی شاخیں پھوٹتی ہیں جنکے حل پر تقریباً تمام موجودہ سائنس کی کارگزاری منحصر ہے۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ مجموعی حیثیت سے یونانی فلسفہ اس نظریہ پر قائم ہے کہ مادہ ایسے غیر محدود اور ناقابل تجزیہ اور غیر مرئی ذرات سے مرکب ہے جس کے درمیان خلا رہے۔ اور قدیم یونانی فلسفہ میں کچھ نہ کچھ دور حاضرہ کے ذراتی نظریہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

گمپرز کہتا ہے کہ جب اناکسی مندر نے اپنے عنصر اولیہ کی اشکال کے اختلافات ذریعہ عمل ترقیق و انجماد بیان کئے ہیں اور جہاں اس نے سمجھایا ہے کہ عنصر اولیہ کی ابتدائی ہر تفسیر مابعد سے از خود گزرتی ہے تو لازمی طور پر اس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہی ہوگی کہ چھوٹے چھوٹے غیر مرئی ذرّات سرگرم عمل ہیں۔ جو کبھی ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں اور کبھی جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر جب ہرکیٹس نے اپنے نظریہ تسلسل تشکیل اشیار کی

اشاعت کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ ایک متاثر نہ ہونے والی انفرادی
ہستی کے وجود کی طرف جو ذہن منتقل ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت
ایک فریب ہے۔ جو جدید ذرات کو پیدا اپنے ذرات کی جگہ پر کرنے
کے تسلسل عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ تو یقیناً وہ مادہ کے غیر مرئی ذرات
کی موجودگی اور اُنکی غیر مرئی حرکت کو تسلیم کر رہا ہے۔ اور سب سے
آخر میں جب ایک عورت نے ہمارے احساسات کی کمزوری کی
شکایت کرتے ہوئے ہر جسم کو بیشمار Seeds یعنی چھوٹے
چھوٹے اجزائے اولیہ سے مرکب ظاہر کیا ہے۔ کہ ترکیب جسمی میں
اسی قسم کے اجزا کا غلبہ ہے۔ تو وہ بھی گویا مبہم الفاظ میں اُسی
نظریہ کو بیان کرتا ہے جس کے تنہا نتیجے ہیں اسکے دو پیشرو جنہیے
نظریہ کے مفہوم سمجھنے کے قابل بنا دیا۔

بہرحال ان فلاسفہ نے تو ذراتی نظریہ کے محض حوالے ہی
دیئے تھے۔ لیکن فصاحت کے ذراتی کلیہ قائم کرنا لوسی پس اور
ڈیماکرٹیس کے حصہ میں آیا۔ ارسطالیس کا بیان ہے کہ "ڈیما
کرسٹس اور لوپی لس کہتے ہیں کہ تمام اشیاء نا قابل تجزیہ
اجزائے مرکب ہیں۔ جو بلحاظ کثرت تعداد و اشکال غیر محدود ہیں
نیز الا اشیاء کا اختلاف اور عناصر کی نشست اور ترتیب پر
منحصر ہے جنسے وہ مرکب ہیں۔ Theophrastus
نے لوسی پس کے نظریہ کی اپنے الفاظ میں یوں تشریح کی ہے "وہ
بے شمار اور دائم متحرک ذرات کا جو atoms کہلاتے ہیں قائل
ہے اور چونکہ ان ذرات کی ایک ہی قسم کے ہونے کی کوئی وجہ
موجود نہ تھی۔ نیز اس لئے کہ اُسنے اشیاء اور اختلاف اشیاء کا
ایک تسلسل قائم دیکھا اُسنے ان ذرات کی بیشمار قسمیں کی ہیں۔
آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ 'شئے' کا وجود 'لاشئے' سے زیادہ
حقیقی نہیں ہے۔ اور تخلیق موجودات میں یہ دونوں برابر کے سبب
ہوتے ہیں۔ کیونکہ اپنے خیال کے مطابق وہ ان ذرات کو جب
وہ خلا میں ہیں اور ساکن ہوں تو 'شئی' کہتا ہے اور متحرک ہوں
تو 'لاشئی' سے تعبیر کرتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دور حاضرہ
کے ایتھر اور اُسکے تموّج سے کتنا ملتا جلتا ہے۔

غالباً ذراتی نظریہ کا موجد لوسی پس ہوا ہے۔ لیکن اوسکے
یہی چیدہ چیدہ اقوال ہیں۔ جو فی زمانہ دستیاب ہیں۔ اور نظریہ
تمام تر ڈیماکرسٹس کے نام کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے، جسنے
اپنے نقطۂ نظر کو کافی فصاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے
مسٹر لیف نے اوس کے بنیادی اصول حسب ذیل بیان
کئے ہیں:

(۱) کوئی شے نیست سے ہست یا عدم سے وجود میں نہیں
آسکتی اور جو موجود ہے (لہٰذا مادہ بھی) وہ فنا نہیں ہوسکتی
نیز ہر تغیر محض ترکیب پانے اور منتشر ہونے کا نام ہے۔

(۲) کوئی شے اتفاقات یا حوادث کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ہر شے کا
سبب اور ضرورت ہوا کرتی ہے۔

(۳) 'ذرات' اور 'خلا' کے علاوہ ہر چیز 'سبب' ہے 'وجود'
نہیں۔

(۴) مرئی کائنات ذرات کی حرکت۔ تصادم یا تنائج حرکت
سے وجود میں آتی ہے، جو بلحاظ تعداد و اشکال
غیر محدود ہیں۔

(۵) اشیاء کا اختلاف محض ذرات کے اختلاف ترتیب۔ تعداد
اور صورت کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ جن سے وہ مرکب
ہیں۔ نہ کہ اُن ذرات کے مزاجی اور خواصی اختلاف کی
وجہ سے جو ایک دوسرے پر دباؤ اور تصادم سے عمل
کرتے ہیں۔

(۶) جوہر مثلاً آگ گول چکنے۔ متحرک اور سریع السیر ذرات
سے مرکب ہے۔ جنکی حرکت سے زندگی ظہور میں آتی ہے۔

ان اصول میں چوتھا اور چھٹا اصول نہایت اہم ہے۔ اور
گو بالکل خام اور نظری ہیں۔ تاہم جن دعاوی پر موجودہ سائنس
کی بنیاد قائم ہے اُنکی پیشین گوئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دو
ہزار برس سے سائنٹیفک خیال اُن سے متاثر ہوتا چلا آرہا
ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کی سائنٹیفک تحقیقات و تصنیفات محض
اُن اصول کی فصاحت اور تشریح ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صرف

اسی زمانہ میں اُنکے فلسفیانہ مفہوم پورے طور پر روشنی میں آئے ہیں۔ اور دراصل اُن میں صداقت کی اتنی مقدار موجود ہے۔ جس تک صرف اس ترقی کے زمانہ میں سائنس کا دسترس ہوا ہے۔ اور سائنس نے اسی زمانہ میں دریافت کیا ہے۔ کہ مادہ میں اختلافات کا ہونا۔ عناصر اولیہ کے اختلافات پر مبنی ہونے کے بجائے۔ اُنکی ترتیب۔ حرکت۔ تعداد اور صورت کے اختلافات پر مبنی ہے۔

گیمرز کہتا ہے کہ اب "ذراتی" کے نظریہ کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے، Cognition کے نظریہ کی ترقی نے صفات اولیہ و ثانویہ میں امتیاز کو کمزور کر دیا ہے۔ بلکہ اختلافات و قدومات۔ شکل اور حالت دریافت کے ساتھ خواص و کیفیت کے اختلافات معلوم کرنے کی کوشش مادہ کے متعلق تمام نظریوں میں اختلاف رائے اور اور اختلافات کو پیچھے چھوڑ کر رہے گی۔ دراصل رازِ فطرت کو بے نقاب کرنے کی صحت کلیۃً اس کوشش پر منحصر ہے۔ کہ کیفیت کو کمیت میں تبدیل کر دیا جائے۔ یا زیادہ درست الفاظ میں دونوں کے درمیان معین تعلق قائم کر دیا جائے۔ دو ہزار سال کے بعد گلیلو اعظم نے بھی اسی خیال کی تائید کی چنانچہ کہتا ہے۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں ذائقہ۔ شامہ۔ اور آواز پیدا کرنے کے لئے جسامت شکل۔ مقدار اور سست یا تیز حرکت کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت ہو"۔

بعدازاں Hayghem نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ 'اجسام' متجانس الاصل مادہ سے مرکب ہیں جنمیں کیفیت کے بجائے محض مقدار جسامت شکل اور حرکت پائی جاتی ہے۔

اب دورِ حاضرہ میں جیسا ہمنے دیکھا ہے اور آیندہ دیکھینگے یہی دعویٰ موجودہ سائنس کا مرکز ہے۔ وہی گیمرز کا قول دوہرانا پڑتا ہے۔ "عناصر میں کرنا فطرت کے بہت سے سربستہ رازونکی کنجی ہے۔ جس سے بہت سے عقدے حل ہو چکے ہیں۔ اور بہت سے آیندہ ہونگے۔

بقول 'گمپلے' کے کہ "موجودہ سائنس کی ترقی کی ایک وجہ تو بالکل ظاہر ہے۔ اور وہ علم ہندسہ کے مخصوص اصول کو چھوڑ کر باقی تمام سائنٹیفک اصولونکو چھوڑ کر باقی تمام سائنٹیفک اصولونکو 'ذرات مرکبہ' کے قالب میں ڈھالنے کا عام رجحان یعنی مادہ کے ذرات کو جاذبیت۔ مدافعت۔ حرکت اور یکسانیت میں تبدیل کرنے کی طرف عام میلان طبیعت۔

ڈیماکریٹس نے کبھی نہیں کہا کہ محض ان نظریونکو قائم کیا ہو۔ بلکہ بڑی طباعی کے ساتھ اپنے نظریہ کو فصاحت اور تفصیل سے بیان بھی کیا ہے۔ اور موجودہ کیمسٹری کے اصول کی توقعات بھی قائم کی ہیں۔ چنانچہ اُسنے خیالی ذرات کی بہت سی تصویریں لی ہیں۔ جن میں اُن ذرات کو زنجیر۔ ہک۔ حلقہ وغیرہ اشیاء سے باہم مربوط کرکے پیش کیا ہے۔ اوستے ذرات میں ملنسار اور غیر ملنسار کا فرق بھی دکھایا ہے۔ یعنی وہ ذرات جو آپس میں آسانی سے فصل ہو جاتے ہیں اور وہ جو سہولت سے متحد نہیں ہوتے، یا موجودہ اصطلاح میں جامد Inert اور کیمیکل عناصر کا فرق بتایا ہے۔ اوس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ کہ بعض ذرات میں پیوست ہونے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور بعض میں کم۔ یا بعض میں چپکنے اور ربط پانے کے متعدد مقام ہوتے ہیں۔ اور بعض میں ایک۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ Elementary chemistry کے اصولونکا بھی اُسے اندازہ تھا۔

ڈیماکریٹس کے بعد Empedocles پیدا ہوا جو کوہ اِٹنا کا رہنے والا تھا۔ اوس کا خیال تھا کہ ذرات کی حرکت ترکیب۔ انتشار۔ محبت ونفرت پر مبنی ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس زمانہ میں Affinities کے قائل ہیں۔ بلکہ اسکی دوربین نگاہ تو یہانتک پہونچی ہے کہ ادائے نظام اولیہ میں تنازع للحیات ہو کر غالبًا اور زیادہ اہل باقی رہ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تباہ شدہ اور نا اہل اشکال کی جو تصویریں اسنے لی ہیں۔ وہ بہت دلچسپ ہیں۔ ایک جگہ دکھایا ہے کہ بہت سے سر دوش سے جدا اچھلتے ہوئے اور بہت سے ہاتھ شانوں سے محروم اور بہت سی آنکھیں پیشانی کی جستجو میں اوپر نیچے پھرتی ہوئی۔ کچھ جاندار مع اپنے بہنوں کے مختلف سمت میں دیکھتے ہوئے پیدا ہونا دکھائے گئے

ہیں۔ کہیں بیلوں کے انسان کا چہرہ لگا دیا ہے۔ تو کہیں انسان کے بیلوں کا سر لگا دیا ہے۔ لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز اُسکا نظریہ غیرفانی ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ ذرات جن سے اشیاء عالم مرکب ہیں وہ کسی حال میں فنا نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ کہتا ہے "میں ایک اور بات بھی کہتا ہوں۔ کوئی چیز جو بظاہر معدوم ہوجاتی ہے۔ فنا نہیں ہوتی نہ کسی چیز پر حقیقی موت طاری ہوسکتی ہے۔ بلکہ موت نام ہے اس اجزاء کے مرکب کا منتشر ہو جانا۔ اور اپنی اصل میں مل جانا۔ (چکبست نے اس فلسفیانہ خیال کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ ؎ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا -

وجود میں آنا ایک لفظ ہے۔ جو انسان کی اختراع ہے۔ لیکن جب عناصر بطور کسی انسان کے مرکب ہوجاتے ہیں۔ یا وحشی درندوں۔ پرندوں۔ اور نباتات کی صورت اختیار کرلیتے ہیں تو انسان اس عمل کو 'وجود' میں آنا کہتا ہے اور یہ اجزاء جب منتشر ہوجاتے ہیں تو رسم کے مطابق اُس کو افسوسناک موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں خود بھی ایسا ہی کہتا ہوں اور رسم کا پابند ہوں۔ . . . .

. . . . احمق ہیں۔ کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ ظاہری وجود میں آنے سے قبل کوئی چیز موجود نہ تھی۔ یا موت کے بعد کوئی چیز فنا ہوجاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ 'نیست' سے کوئی چیز نیست نہیں ہوسکتی۔ یا عدم سے وجود میں نہیں آسکتی اور جو موجود ہے وہ بالکل فنا نہیں ہوسکتی۔ بلکہ مرنے کے بعد جس مناسب مقام پر وہ پہونچا دی جاتی ہے۔ وہاں ہمیشہ موجود رہتی ہے - جو شخص سمجھتا ہے اور بالغ نظر رکھتا ہے۔ وہ کبھی کسی طرح کسی ہستی کے قید جسم میں رہنے کے زمانہ کو 'زندگی' یا وجود نہیں کہے گا - وہ اب بھی ہے اور جس طرح وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی اسی طرح موت کے بعد باقی رہے گی"۔

یقیناً یہ قول اور نظریہ حکمت پر مبنی اور قرین عقل ہے -

مسمسعنیرع کا بھی ذراتی اصول کے تحت میں تذکرہ کیا جا[illegible] ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بے شمار ذرات غیر محدود خلا میں برابر نمو و نما کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض ذرّات کبھی اپنے مقررہ راستہ سے بھٹک کر ادھر آپڑے جو کائنات کا باعث ہوئے۔ اور جن کے امتزاج سے دنیا کا وجود ہے۔

لیکن قدیم نظریہ ذرّات کا موجد اپی کیورس کا شاگرد اور روم کا شاعر اعظم کرسٹس تھا۔ جس نے اپنے خیالات کا نہایت تکمیل کے ساتھ سائنٹیفک استعمال کیا ہے۔ جس نے ذرات کے نظریہ کو بڑے حسن کے ساتھ اس طرح مزے سے اور متاثر ہوکر جس کو قریب قریب مذہبی جوش کہنا چاہئے۔ نظم کیا ہے۔ لوکرسٹس کے لئے ہمیں جداگانہ باب وقف کرنا پڑے گا -

(ترجمہ)

نکلی لبِ گل سے آہ خوشبو بن کر سر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سر سے گئی دل میں انکی تصویر لئے تصویر ٹپکنے لگی آنسو بن کر

جوشؔ

فیضانِ ساقی

آجکل پھر بخششِ پیرِ مُغاں کی دھوم ہے / دولتِ بیدار و بختِ کامراں کی دھوم ہے

پھر خروشِ مطربان و جوشِ یاراں کے طفیل / لحنِ رنگین و شرابِ ارغواں کی دھوم ہے

باغ میں پھر جلوۂ گُل سے ہے اک محشر بپا / بزم میں پھر شوخئ چشمِ بُتاں کی دھوم ہے

پھر فلک پر ابرِ گوہر بار کے ہیں غُلغلے / پھر زمیں پر کاکلِ عنبر فشاں کی دھوم ہے

بزم میں پھر خندۂ عُشاق کے ہیں زمزمے / باغ میں پھر بلبلِ افسانہ خواں کی دھوم ہے

حلقۂ رنگینِ یارانِ محبّت پیشہ میں / پھر کسی کے التفاتِ بیکراں کی دھوم ہے

پھر مچلتی چاندنی کے نُقرئی آغوش میں / پیچ و خم کھاتے ہوئے آبِ رواں کی دھوم ہے

پھر کہیں رُکتا نہیں رخشِ مزاجِ دلبری / پھر کسی نو شہسوارِ خوش عناں کی دھوم ہے

پھر گھنی پلکوں کے آئینِ تکلّم کا ہے شور / پھر سیہ آنکھوں کے اندازِ بیاں کی دھوم ہے

آدم و حوّا کے جُرمِ اوّلیں کی یاد میں / جشنِ زیرِ تاک و رقصِ گُل رُخاں کی دھوم ہے

عطر سے مہکے ہوئے ایوانِ رقص و رنگ میں / لمسِ شیرینِ حریر و پرنیاں کی دھوم ہے

پھر کھنکتے ہیں پیالے، گنگناتا ہے شباب / پھر شرابِ کُہنہ و حُسنِ جواں کی دھوم ہے

جوش کے انفاس سے مہکی ہوئی ہے زندگی
دُور تک اِس شاعرِ ہندوستاں کی دھوم ہے

جوش

غزل گوئی

نقاد

جناب حکیم آزاد انصاری نے رسالۂ جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۶ء میں اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی تقریب سے اک مقدمہ نما مضمون "غزل کی حمایت" میں شایع کرایا ہے۔ میرا زیرِ آغاز تبصرہ اسی کی تنقید پر مبنی ہے۔

"غزل کی حمایت"! ——— کیا میں عرض کروں کہ یہ فقرہ زبان کا غلط استعمال ہے؛ حقیقتہً جو الفاظ قابلِ اطلاق ہیں وہ "غزل کی حمایت" کے بجائے "غزل کا قصیدۂ مدحیہ" یا "غزل کا مرثیہ المیہ" ہیں! لیکن قصیدت کی روح پروری ہو، یا مرثیے کا ایصالِ ثواب، کوئی تدبیر بھی اب "پیرزالِ غزل" کو شعر کی عروس رعنا نہیں بنا سکتی! شاید عالمگیر اعظم کے ہمزبان ہو کر ہمیں کہنا چاہیئے کہ دربار ی موسیقی کی طرح، مشاعروں کی متعارف غزل سرائی کے تابوت کو بھی اتنا گہرا دفن کرنا چاہیئے کہ اُس کے "حشر جسد" پر مُہر ہو جائے! خس کم جہاں پاک!

زیرِ تنقید مضمون کی نقل سے پہلے مُدیر جامعہ کا یہ مختصر تعارفی نوٹ ہے:۔

"ذیل کا مضمون حکیم آزاد انصاری صاحب کے مجموعۂ کلام کے مقدمے کا اک حصہ ہے جو ہنوز زیرِ طبع ہے:"

میں "مجموعۂ کلام" کی عبارت سے بھی تعرض کرنا چاہتا ہوں! ——— مجموعۂ کلام، یا صرف دیوانِ غزلیات! پھر اس ایڈیشن کا "مقدمہ" یا "معذرت"؟

حقیقت یہ ہے کہ مُدۃ العمر کی غزلیاتی یا "تغزلیاتی" یاوہ گوئی کو اک پشتارۂ ردی میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنا فطرتاً ناقابلِ برداشت تھا! کوئی انسان اپنے تمامی ماضی کو اِس طرح یکسر ضایع و دور از کار تسلیم کر لینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا! اِتنا خود شکن جگر وہ کہاں سے لائے کہ بے تکلف کہہ ڈالے کہ ع ایں دفتر بےمعنی غرقِ مےِ ناب اولیٰ! شُعراء اپنے مجموعۂ غزلیات کو اپنا "ادبی صدقۂ جاریہ" بنا کر اپنے پیچھے چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔ اُسے اپنا سیاہ اعمالنامہ بنانا نہیں چاہتے! یہ انقلاب اتنا عاجلانہ نہیں ہو سکتا! غزل گو شعراء کی غالباً تیسری پُشت اِس پُشتارۂ زٹل پر لعنت بھیجنے کے لئے تیار ہو سکے گی! یہ حجابِ غلیظ اِس سے پہلے چھٹتا دکھائی نہیں دیتا!

آزاد صاحب کا جلالی افتتاحِ کلام اِس طرح ہوتا ہے:۔

"بعض کور مذاق، اپنی زبان اور اپنے شعر و ادب کے دشمن، کچھ عرصے سے اِس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ غزل کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا جائے!"

نازم بریں "خوش مذاقی"! ——— "کور مذاق، دشمنِ زبان و ادب، قاتلِ غزل"! ——— چھوٹتے ہی گالیوں کا یہ "سہ غزلہ"؟! ہم نے سُنا ہے کہ آزاد صاحب کے تراوشِ قلم میں "ذَم کا پہلو" اک ازلی ناگزیری کے ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے! کیا یہ زبان و خطاب اُسی کا ثمرِ اوّلین ہے؟!

پھر "صفحۂ ہستی سے" کی ایک ہی کہی! کیا دلی و لکھنؤ کے ناگفتہ بہ مشاعروں کی تنگ و تاریک گلیاں پورے "صفحۂ ہستی" کی ہم وسعت ہیں کہ وہاں

کی مقام گیر چیز کی بچکنی کے لئے ایسی آفاق گیر معرکہ آرائی کی ضرورت لاحق ہو؟! مغالطے کی بھی اک حد ہوتی ہے۔ غزل، اُردو ہندوستان کے ماضی کے قصۂ پارینہ کا اک ورقِ کرم خوردہ ہے، کسی جنگی جہاز کا عرشہ نہیں! لوگ بھی اپنی کیسی کیسی خود ساختہ جنتوں میں رہا کرتے ہیں!

مروجہ غزل گوئی جن اعتراضات و ایرادات کی ہدف ہے اُن کی ملخص فہرست پیش کرتے ہوئے بزرگ منش صاحبِ مضمون فرماتے ہیں:۔

"یہ دلائل بظاہر تو نہایت وزنی اور قطعی مسکت نظر آتے ہیں [illegible] حقیقت بالکل بے وزن، بعید فریب دہ، اور محض لچر و لوچ ہیں، اور پیداوار و نتیجہ ہیں صرف مغرب زدگی کا"!

یہ ایک ہی سانس میں مرعوب اعتراف اور تحدی خیز ابطال کی غیر متوازن زبان و بیان کا اک دلچسپ مظاہرہ ہے، جو غالباً خمیازہ ہے غالی "مشرق زدگی" کا! کیا "مغرب زدگی" ہی کی عامیانہ دُہائی آزاد صاحب کے معرکہ آراو بلند آہنگ رَدّ کا طبلِ غازی ہے؟! اس کلام میں علانیہ "رَوشنی" سے زیادہ "گرمی" نظر آتی ہے! لیکن یہ اپنے زور میں خود بھیچڑ جانے کا طریق گستی ہے! ؎

دلیل قوی باید و معنوی

نہ رگہائے گردن زغصہ قوی!

عام اُردو غزل گوئی کی مصطلحہ زبان میں مُذکر ضمائر و افعال کے بدنام استعمال کے جواز میں حکیم صاحب کی دلیلِ اول یہ ہے:۔

"مرد صنف قوی ہے، اور عورت صنفِ نازک، اور ہر امر میں صنفِ قوی کا لحاظ زیادہ رکھا جاتا ہے"! فلہٰذا پیامِ شادی میں بھی اک مرد، بتقاضائے تقدمِ مردمی، اک مرد ہی کو ترجیح دے گا! شاید دُنیا کی سب سے زیادہ مردانہ شریعتِ اسلام بھی "کُفو" کی اس بے پناہ وسعت کی تاب نہ لاسکے گی۔ چاہے اُس کی مسندِ صدارت پر خدا اور رسول دونوں ہی مرد کیوں نہ ہوں! تاہم اِس میں شک نہیں کہ تغزل کی پیشانی پر "اد.بی لِوَاطَت" بخطِ جلی و لبیا ہی غلیظ لکھی ہوئی نظر آتی ہے! اور "صنفِ قوی" کا "ہر امر میں" کتنا ہی لحاظ رکھا جائے عملی خلاف وضع فطری ارتکاب کبھی شریعتِ شعر کے بابِ رُخصت" میں نہیں آسکتا! صنفِ قوی جب اپنی قوتِ صنفی سے ایسا مجرمانہ فائدہ اٹھانے لگے تو اُس کا "لحاظ" کہاں تک رکھا جائے گا! کیا خود اس صنفِ ثقیل کو اپنے وقار کا احساس نہیں؟ کیا اُس نے اپنا شعورِ شرم صنفِ لطیف ہی کے حوالے کر رکھا ہے، اور خود چھوٹ ہو کر یہ نعرۂ مردانہ لگانا چاہتا ہے کہ:۔

"حیا چہ کُتی ست کہ پیشِ مردان بیاید"!

آزاد صاحب اِس تقریر کے ضمن میں آگے لکھتے ہیں:۔

"اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو افعال و صفاتِ مؤنث پر ترجیح ہے، اور یہ دونوں صنفوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں"!

گویا اِن "دونوں صنفوں" کی رعایت غزل گویانہ گفتگو میں ضروری ہے! اور بداہتہً اس لئے کہ اِس کار و بارِ ناگفتہ بہ کا اک ناگزیر شعبہ امرد پرستی ہے! کتنی حسبِ حال ہے یہ چیز "غزل" کے جس کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے کہ وہ عبارت ہے "عورتوں کے ساتھ حرف و حکایات" سے! آزاد صاحب اک خطرناک قسم کے وکیل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی "مؤکلہ" کے لئے عصمتِ کامل کے دعوی کے ساتھ اُٹھتے ہیں لیکن مدعی سے زیادہ چُست بن کر اک مزید سنگین تر الزام کا اقبال کرنے لگتے ہیں! کیا ہر دوست سچ مچ اک قابلِ پناہ طلبی دشمن ہی ہوا کرتا ہے؟!

مزید گلفشانی ملاحظہ فرمایئے:۔

"جب کوئی ایسا عام حکم دیا جاتا ہے جو مرد و عورت دونوں کو حاوی ہو اُس وقت بھی افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس جملے میں کہ "جو شخص اس رستے سے گزرے گا اُس کو دس روپیہ جرمانے کی سزا دی جائے گی"، فعل مُذکر ہی استعمال ہوا ہے، مگر صرف اِس بنا پر کہ اِس حکم میں فعل مونث "گزرے گی" استعمال نہیں کیا گیا عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا"!

آزاد صاحب کو یہی نہیں کہ صحیح جواب معلوم نہیں، انھیں صحیح اعتراض کی بھی خبر نہیں! اعتراض یہاں عورت کے عدمِ امکانِ شمول پر نہیں، مرد کے غلبۂ قیاس شرکت پر ہے! آپ فرماتے ہیں کہ عورت کو غزل گوئی کے عمومی، حاوی بر صنفین بیانات و مخاطبات سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عرض یہ ہے کہ مرد بھی کب مستثنیٰ رہ سکتا ہے؟! فرق صرف اتنا ہو گیا کہ "لونڈا" "ہیجڑے" سے بدل گیا! یا اس دو طرفہ ابہام و اشتباہ میں خنثائے مشکل نے! استدلال کا یہ نتیجۂ صریح ہمارے خیال میں صورتِ حال کو کچھ بہتر نہیں بناتا، اُسے پیچیدہ تر یا شاید شنیع تر کر دیا ہے!

اور سُنیے:۔

"یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانینِ حکومت میں تمام و کمال افعال وصفات مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں جو مرد و عورت دونوں پر اثر انداز ہوتی ہیں"

کتنی قانون نواز دلیل ہے! گویا تغزل کا ادب لطیف تعزیراتِ ہندکی زبان میں لکھا گیا ہے! جس کا ناگفتہ بہ متغزلانہ استعارہ ——— خلافِ وضع ——— کافی بدنام ہے! اللہ، اللہ، دفترِ غزلیات اور ہندا بیئہ تعزیرات ایک ہی ملزمانہ کٹہرے میں؟! کیوں نہو! ہم بھی غزل کو کچھ ایسا ہی مجرمانہ ادب سمجھتے ہیں! آزاد صاحب کا انتقالِ ذہنی معنی خیز ہے! غزلیات اور تعزیرات! خوب! ع

"بلبل" ہمیں کہ قافیہ "گل" شود بس ست!

اسی ترنگ میں اور :-

یہی سبب ہے کہ عورتیں بھی جب غزل کہتی ہیں، تو وہ بھی افعال وصفات مذکر ہی کو ترجیح دیتی ہیں۔"

منقولۂ بالا بیان میں اگر وہ شدید پہلوے ذم موجود نہوتا جو قارئین پر پڑا بے نقاب و رسوا ہو لیا ہوگا تو ہمارے لئے جواب دینا زیادہ آسان ہوتا! بہرحال جواب سنئے! ——— جناب والا! عورتوں کا علانیہ دبٹ مہا بانہ غزل سرائی کرنا، اور قیس و کوہکن کی شان سے عشقبازی کے اکھاڑے میں آنا، اور مردانہ زبان وضمائر استعمال کرنا سب اسی طرح یکساں مضحکہ خیز ہے، اور ہمارے مرد شعراء کی لغویت کا مقتضی! جو لوگ اپنے نام و تخلص اور اپنے معاملۂ تعشق کی رازداری کرنی نہیں چاہتے وہ اپنے موضوعِ عشق کی صنف وجنس کی پردہ داری پر کیوں مصر ہیں؟! پھر پردہ داری بھی ایسی جو حقیقتہً پردہ دری سے بدتر ہے۔ یعنی ایک نہایت سنگین نوع کا خلطِ مبحث!

آزاد صاحب یہاں تک بخیالِ خویش، فاتحانہ قلم فرسائی فرما کر اک مختصر جشنِ فتح منانا چاہتے ہیں! فرماتے ہیں :-

"اگر یہ کہا جائے کہ جناب! آپ کے استدلال کو افعال وصفاتِ مذکر کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر . . . . ."

کامیاب وکالت کے اس سرٹیفکٹ پر جو حضرتِ آزاد نے حضرتِ آزاد کو ارزانی فرمایا ہے سوائے اک ترحم آمیز تبسم کی اور کیا کیا جا سکتا ہے! جناب! آپ پہلے اپنی مدافعت سے تو عہدہ برآ ہو لیجئے، اس کے بعد حریفوں کے دعاوی سے ہمدردی کا اظہار کیجئے گا! ع

توکارِ زمین را نکو ساختی؟
کہ با آسماں نیز پرداختی!

آزاد صاحب اپنے منقولۂ بالا قضیئے کو یوں مکمل فرماتے ہیں :-

اگر یہ کہا جائے کہ جناب! آپ کے استدلال کو افعال وصفات مذکر . . . . . مگر ستم یہ ہے کہ غزل میں "سبزہ خط"، "دستار" "ترک بچہ" اور "ہندو بچہ" وغیرہ جیسے مخصوص بہ صنفِ قوی الفاظ بھی تو پائے جاتے ہیں . . . ؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت! آپ یسے مرد کا مرد کے ساتھ عشق جتانا کیوں کہتے ہیں؟ ممکن ہے اس میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کئے گئے ہوں! بالفاظِ دیگر کوئی معشوقہ، مادرِ مشفقہ بن کر اک "ہندو بچہ" یا "ترک بچہ" سے سرپرستانہ عشق فرما رہی ہو! یا کوئی دلدادہ ملانی کسی ملا جی کے بیچاک دستار کے عشق پیچاں میں پھنس گئی ہو! یا کسی نازنین رقیبہ نے سبزہ خط سے خطاب کرکے اپنی حسرمان نصیبانہ آہ کا اسے پرتو قرار دیا ہو جس کا انتقام اب آمدِ خط کی معشوقانہ "سرد بازاری" کے بعد وہ اپنی "کسبت" کی گرم بازاری کے ذریعے لینا چاہتی ہو! اور اپنے چیلنج کا یوں فاخرانہ اعلان کر رہی ہو کہ ع

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد کیا بازارِ دوست!

آزاد صاحب احتساب فرماتے ہیں، کہ :-

" ایسے اشعار کو برے معنی پہنانے کس کا قصور ہے؟ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک مرد نے اک مرد کے حسن کی تعریف کر دی ہے، اور بس!"

"اور بس" نہیں! یہ معاملہ ہر برس کے جیلخانے تک طوالت پذیر ہو سکتا ہے! پھر اس اصول کی وسیع المنزلی کے تحت گئے، بندر کے ساتھ تشبیب بھی قابلِ قبول ٹھہرے گی، اس لئے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ کسی "شگفیا" یا بندریا کا دل اپنے ہمجنس "شیتان" پر نہ آگیا ہوگا، اور اردو کے کسی ترجمانِ انس وجن اور ہمزبانِ وحوش وطیور غزل گو نے ان نیکبختوں کے جی میں اپنا جی ڈال کر ان کے وارداتِ دل کی تصویر کھینچ دی ہوگی! اردو غزل گوئی کا یہ ممکن ارتقاء اس "ڈارونیت" کے ظہور کی بشارت ضرور دے رہا ہے!

آزاد صاحب اسی گفتگو کی تقریب سے ایک جگہ جل کر کہتے ہیں :-

"آپ اس عیب (تعشق مابین زن و مرد یا مرد و مرد!) کو اپنی دیگر اصنافِ سخن، مثنوی اور نظم وغیرہ میں، تو جائز رکھیں، اور بیچاری "غزل" ہی کو اس بنا پر کشتنی وگردن زونی قرار دے دیں؟!"

بلاشبہ بڑا اللّٰہی بُغض ہے! اسی "بیچاری غزل" کے طفیل میں تو ہم "بیچارے شاعروں" کی شاعری قائم ہے! ہم کو "حضرت" کا سہل الوصول اور "اُستاد" کا بلند بانگ خطاب ملا ہوا ہے! ورنہ عجائب زارِ ہندکے سوار دئیے زمین کا کونسا خطہ ہے جہاں تُکبندی، شاعری کہلاتی ہو!! لیکن ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ غزل سرا اساتذۂ کرام سے غزل کو اِسی طرح چھین لینا چاہیئے جس طرح جاہل وجامد علمائے سوء سے امامتِ نماز اور علمبرداریٔ وعظ کو! آج نماز باجماعت اور مشاعرہ، محرابِ مسجدِ جامع اور کرسیٔ صدارتِ محفلِ شعراء، آمین اور واہ وا ڈو ڈو یکساں متقابل شرمناکیاں، بازی گریاں، اور شکارآفگنیاں ہیں! دورِ جدید کی صبحِ صادق جلد از جلد اس شبرگانہ شبستانِ عشرت کی بساط اُلٹ دے گی!

آزاد صاحب کی اک ترمیم سُنیئے:-

"اگر مرد جذباتِ عشق ظاہر کرے تو اُس کو افعال وصفات مؤنث ہی استعمال کرنے چاہئیں، مگر غزل میں نہیں، بلکہ دیگر اصنافِ سخن، مثنوی و نظم، وغیرہ میں!"

گویا غزل گوئی میں خلطِ مبحث، دوغلیت، مخنثیت، ہیجڑیت غزل کا ناگزیر سمجھا ؤ ہیں! غزل کو کم از کم "نہ ادنیٰ زنان نہ ہائے مردان" کا مصداق ضرور رہنا چاہیئے! کیا غزل گو شعراء کی مجہول الحال جنسیت کو اس ابہام دایہام سے کوئی خاص ربط ہے!!

آزاد صاحب کی "دلیلِ چہارم" چرخِ چہارم تک پرواز کرگئی ہے! فرماتے ہیں:-

"دُنیا بھر جانتی ہے کہ متغزلین کی شاعری، مجازی شاعری تک محدود نہیں ہوتی۔ اُن کو حقیقی شاعری یعنی متصوفانہ شاعری بھی کرنی پڑتی ہے، اور معشوقِ حقیقی مذکر ہے، اُسے مؤنث نہیں بنایا جاسکتا، اس لئے غزل میں افعال وصفاتِ مذکر کا استعمال صرف بہتر ومناسب ہی نہیں، ضروری وناگزیر بھی ہے!"

کیوں نہو! غزل گوئی کا ہرجائی پن تو لونڈے بازی سے لے کر ع

فرشتہ صید، پیمبر شکار یزداں گیر

تک وسیع ہے! ؎

بجنگے زدیم وسرِ انا الحق شد آشکار!

مارا ازیں گیاہ "ضعیف" ایں گماں نبود!

تاہم شکریہ ہے کہ اس سلسلے میں "اللہ میاں کی صنفیت" کی تحقیق پوری طبیبانہ تشخیص کے ساتھ ہوگئی! پھر ضمناً یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خدا یگانہ مردمی اس درجہ غیر متزلزل واقع ہوئی ہے کہ اُسے کسی طرح مؤنث نہیں بنایا جاسکتا!

غزل کے مطالب کی فرسودگی وپامالی کے متعلق حکیم صاحب کی حکیمانہ معذرت یہ ہے:-

"آخر بیچارے غزل گو حضرات نئے جذبات واحساسات لائیں کہاں سے؟ بڑے سے بڑا متغزل بھی صرف اتنا ہی کرسکتا ہے کہ اُنہی جذبات واحساسات کو اپنی قوتِ متخیلہ اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے مدد لے کر اک نئی، انوکھی، دلکش اور حسین ترصورت میں پیش کردے اور بس، اِسی کا نام شاعری اور کمالِ شاعری ہے"!

تُف برایں شاعری! ولعنت برایں کمالِ شاعری!! ...... آہ "بیچارے غزل گو حضرات"! یہ حضرات جب تک پیرفرتوت بنے رہیں گے۔ کوچۂ عشق وجانبازیٔ عشق کی رزمگاہ میں قدم نہیں رکھ سکتے! اگر رکھیں گے بھی تو اُن کے ممکنات اس سے زیادہ وقیع نہیں ہوسکتے کہ بخیالِ مولانا حالی ع

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کُند دلّالی! اِن بزرگوں کو قال سے پرے کوئی حال نصیب نہیں! لیکن حقیقی ونفس الامری شخصی احوال وواردات کے ساتھ تو رنگِ تنوع لازم وملزوم ہے! جو لوگ دوسروں کے حجابہائے عروسی کی داستانیں بیان کیا کرتے ہیں اُن کی وابستگی دوسروں کی روایات کے ساتھ ناگزیر ہے! ــــ "اُستاد اِسی طرح باندھ گئے ہیں" کی بانگِ بے ہنگام میں ہم بھی "ہز ماسٹرز وائس" ہی سُنا کرتے ہیں! یہ کیسے قاہر وقاتل اُستاد ہیں جنھوں نے ہمارے شعرائے کرام کے چشم وگوش، زبان ودہان، دل وروح، اور اُن کے حرمِ خلوت تک پر پہرے بٹھادیئے ہیں! ہم تو اس کے قائل ہیں کہ ؎

میانِ عاشق ومعشوق رمزیست

کراماً کاتبیں راہم خبر نیست!

اگر غزل سرا عشاق کو سچ مچ کسی نگارِ دلجو کی معیت نصیب ہوتی تو "ہر لحظہ برنگِ دِگر آں یار برآمد" کی جدت وندرت قدم قدم پر مسموع ہوتی مگر یہاں تو۔

اُن کی حالت وہ ہے جیسے کوئی بزدل خواب سے

"چور آیا"، "چور آیا"! چیختا ہو چونک کے

اور گھر کے جس قدر پیر و جواں ہیں زور زور
اپنے اپنے بستروں پہ چیختے ہوں "چور" "چور"!!

آزاد صاحب چیلنج فرماتے ہیں:۔

"غزل اگر صفحۂ ہستی سے محو بھی کر دی جائے تو بہر حال اِن جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنفِ شعر تلاش کرنی پڑے گی۔ جب ایسا ہے اور ضرور ایسا ہی ہے، تو پھر غریب غزل ہی نے کیا قصور کیا ہے جو آپ اُس کو حلال کر ڈالنا چاہتے ہیں؟"

جواب سنیئے:۔ یہ دوسری صنفِ سخن اپنے بیرونی قالب میں اپنے اندرونی قلب کے ساتھ فطری ربط رکھے گی اور غزل کی مطلوبہ اصلاح عمل میں آجائے گی! غزل و تغزل کو مٹانا یا اُس کو حلال و حرام کر ڈالنا کون چاہتا ہے؟ ہم کی روح و جسم کو تو متشاعر بخلعت عجیب غزل گو شعرا ہی مسخ کر رہے ہیں، ہیروئن کے بیکر پر سے جو کرتا کا لباس اُتروا کر اُسے "تک عروسِ تمثیلِ لباسِ حریر" کی ہیئت میں اُڑ دینا کیا کوئی ضروری و اہم اصلاحِ ادب نہیں؟!

آزاد صاحب کا شکوہ ہے کہ:۔

"دشمنانِ غزل ہیں کہ ان تشبیہات (غنچۂ دہن، موئے کمر، شمشاد قد، صراحی گردن وغیرہ) کا اک خوفناک مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم غزل سے نفور ہو جائیں!"

خاطر جمع رکھیئے جناب! مروجہ مسخ غزل سے آپ اُس وقت تک نفور نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کی یہ مُختل و مضحکہ خیز نظرت آپ کے شاملِ حال ہے! نیز جب تک کہ غزل گویا نہ تُکبندی کو شاعری بلکہ اُستادی کی آسان فتحمندی نصیب ہے! تاہم یاد رہے کہ آپ گزشتہ نسل ہی کے باقیات سیات کے اندھوں کی محفلِ مشاعرہ میں شمع مشاعرہ بن سکتے ہیں! اندھوں میں کانوں کا راج اب کئی دن کا مہمان ہے! "ہمدوشِ پیمبری شاعری"، کب تک ردیف و قافیہ کی بازیگری کے ہم معنی بنی رہے گی؟! ؎

دانِ یار کجا و زبانِ سُوسن کو،
نہ ہر گلے کہ بخندد، مُقرری داند!

اک طرفہ نکتہ سُنیئے:۔

"شعراء کے ساتھ متشاعرین (غزل گو) کا وجود بھی اسی طرح لازم و ضروری ہے جس طرح نور کے ساتھ ظلمت کا"۔

گویا غزل کی لغویتیں، غزل کی دُلربائیوں کو نمایاں کرنے کے لئے ارادۃً قایم رہنی چاہئیں؛ اک حسینہ کی نکٹی ناک بقیہ خط و خال چہرہ کو چمکانے کے لئے شاید اک کلیدِ مشاطہ گری ہے!

آزاد صاحب فرماتے ہیں:۔

"متشاعرین کے برخلاف حقیقی شعراء ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں.... بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیغمبروں کی طرح عند الضرورت کبھی کبھی مبعوث ہوا کرتے ہیں"!

کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ! ردِ غزل گوئی میں جوش نے جن حشرات الارض کے ہم تعداد شعراء کا حوالہ دیا ہے وہ شاید عہد عتیق کے سارے انبیائے سابقین ہیں جو ختمِ نبوت کے علی الرغم اُبل پڑے ہیں! "ہر صدی کا آغاز" ایک طرف، ان بیحد و ہزار انبیاء کے حصے میں تو فی نبوت ایک ایک لمحہ بھی نہیں پڑے گا! پھر آپ اِن میں سے کس کس کو مفتری و دجال کہہ سکیں گے؟ مشاعرے کی لنکا میں کسی کی پیمائش باون گز سے کم نہیں!!

آزاد صاحب مسندِ صدارتِ مشاعرہ سے شمعِ مشاعرہ کی روشنی میں تنبیہ فرماتے ہیں:۔

"ایسے بلند فطرت شعراء کو پست خیالی اور بوالہوسی کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دینا چاند سورج کو نشرِ ظلمت کا ذمہ دار ٹھہرانے سے ہرگز کم نہیں"۔

ہم تو بلا شبہ اِنہیں بوالہوسی سے بھی متہم نہیں گردان سکتے! بھلا ہفتاد سالہ استادانہ غزل سرائی کے اندر بھی ہوس کی بھی کہاں گنجائش ہے؟ سوائے شیطان کی مار کے! ٹیگور نے پیری کے نزولِ اجلال پر اک خیر مقدمی سپاسنامہ لکھا ہے جس کے اک سادہ اردو ترجمے کے بعض شعر یہ ہیں:۔

دریائے زندگی میں بلا کا تھا پیچ و تاب	دھارے پہ جا رہی تھی مری کشتیٔ شباب
امواج کی کشاکشِ پیہم سے چشمِ شوق	مُعذورِ دید تھی بایں نظارہائے آب
جتنے قوائے جسم تھے، یکسر تھے مُشتعل	آرام کی تھی سُدھ، نہ خیالِ سکون خواب
اب ختم ہو گئی ہر جوانی کی کشمکش	وہ شورشِ شباب ہی بالکل سکون آب
یاں دورِ جسم ختم ہوا، دورِ جاں ہے یہ	آیا ہے اب "دماغ" مرا بر سرِ شباب!
زیرِ حجاب جتنے معانی تھے اِس سے قبل	وہ اب نگاہِ شیب کے آگے ہیں بے نقاب!
پیری کو میں سمجھتا تھا ہے شامِ زندگی	اُس نے کیا ہے ایک شبستان کا فتحِ باب
دریائے پُرخروشِ شباب اب ہے اک سراب	طالع ہے ابرِ تیرہ سے تابندہ آفتاب!
صد شکر، دن وہ بیت گئے جب بفرطِ شوق	ہر صبح اضطراب تھی، ہر شب تھی اک عذاب!
وابستہ دماغ ہوں اب دل کو چھوڑ کر •	اب تُہ سے آشنائی ہے ساحل کو چھوڑ کر!

اگر تفاوتِ رہ کو دیکھنا ہو کہ از کجاست تا بکجا" ہے تو اک ایرانی غزل گو شاعر، اک صیدِ زبونِ ہوس کا حسبِ ذیل نسخۂ اعادہ شباب ملاحظہ فرمائیے!:- ؎

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر   تا سحر گہ زکنارِ تو جوان برخیزم!

آزاد صاحب کی شاعرانہ مردم شماری کی رپورٹ کا اک اقتباس سنیے!:-

زمانہ حال کے بلند فطرت اور بلند خیال شعراء کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

جنابِ بیخود دہلوی، حضرت جگر مراد آبادی، مولانا وحشی شاہجہانپوری، مولانا حسرت موہانی جناب آرزو لکھنوی، جناب صفی لکھنوی .... جناب سالک مدیر انقلاب لاہور!

استغفر اللہ! استخوان فروش استادانِ عتیق، حضرت بیخود دہلوی کو عہدِ حاضر کے شعراء خدانخواستہ اپنا میرِ مشاعرہ کیوں بنانے لگے! آزاد صاحب کی طرف سے اس تجویزِ صدارت میں خود بعد میں معتمد اعزازی بنجانے کی پیشبندی کا کام کر رہی ہو تو اور بات ہے! لیکن دوسروں کے لئے حضرت بیخود کی تاجپوشی کیونکر طالبِ اطاعت ہو سکتی ہے؟ حضرت آزاد اور حضرت بیخود کے درمیان یہ سمجھوتا بالکل قدرتی بات ہو گی کہ ع

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو!

پھر وحشی، آرزو، صفی، حتّٰی کہ حسرت کو بھی کون عہدِ جدید کا شاعر کہتا ہے؟ یہ سب اُسی کہنہ مقبرِ قدیم کے مجاوران جدید ہیں! اپنے موسم کی خود رو روئیدگی "گلِ نخستین بہار" نہیں ہو سکتی! رہا جناب سالک، مدیرِ انقلاب کے سر استادی کا سہرا، تو ممکن ہے کہ یہ اُس حسابِ دوستاں در دل کی داد و بستد ہو کہ جناب سالک نے شاید بلا اخذ اُجرت اشتہار حضرت آزاد کے بعض غزلیاتی پوسٹر شایع کئے ہیں۔

جناب آزاد نے اس سلسلۃ الذہب میں حضرت فانی بدایونی کا نام نامی بھی لیا ہے! ہم حیران ہیں! ارے لوگو، کیا فانی بھی! مرگھٹ کا رونے والا فانی بھی!! ع

دریغا آبروئے شعر گر فانی سخنور شد!

البتہ حضرت جوش پر منت کرم داشتن کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی! ؎

ہر کسے را نام معشوقے کہ ہست
می برد، معشوقِ ما را نام نیست!

جوش پُر خروش کے نزولِ اجلال کی تاب بھلا یہ دقیانوسی بزرگ کیا لا سکیں گے! ؎

ہوشیار! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار!
اے خلش نا آشنا پیری و شیبِ ہرزہ کار!

غزل کا قصیدہ سے

"غزل کا ہر شعر بجائے خود اک مختصر نظم ہوتا ہے!"

غزل کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو بھی کیوں نہ دست و گریباں کیا جائے، اور کیوں نہ ہر مصرعے کو بجائے خود اک مختصر تر نظم بنالیا جائے!: جی ہاں، اُستادوں کا تو اک اک حرف اک جہانِ معنی اپنے اندر رکھتا ہے! ہمیں خوف ہے کہ متغزلین کا یہ اختصار و ایجاز، یہ اشارے اور کنائے اپنے آئندہ ارتقائے بلاغت میں کہیں گونگوں کی "غائیں غائیں" نہ بن جائیں! اور ہر حرفِ ناتمام کہیں "صد بس ہزار داستان در آغوش" نہ ہونے لگے! ـــــ داستان اُن کی تتیوں غیر ناطقی کی!

آزاد صاحب کا کہنا ہے کہ اختصارِ بیان کے لئے ہم نے تقریباً ایک درجن اصنافِ سخن میں سے صرف غزل کو چُن لیا ہے!

ہم نے مانا، لیکن سوال یہ ہے کہ تفصیلِ بیان کے لئے کون کون سی کثیر التعداد اقسامِ نظم کا انتخاب عمل میں آیا ہے؟ جو فہرست پیش کی گئی ہے وہ برائے بیت ہے! قطعہ، مثنوی وغیرہ یہ متقدمین کا میدان تھا، یا موجودہ غیر متغزلین کا! غزل گویوں کو تو ہم غزل ہی کے ساتھ وابستہ دیکھتے ہیں! وہ غزلیات کا پورا دیوان۔ از ردیفِ الف تا یا ـــــ اینٹا کر ڈالتے ہیں، اور اگر عمر اور تضیعِ اوقات کی ہمت رفاقت کرتی ہے تو بارِ دگر اک دوسرا دیوان سیاہ کر ناشروع کر دیتے ہیں! حضرتِ فانی کا تو اولاً ایک دیوان ضائع ہی ہو گیا تھا، لیکن غزل نویسی میں اُن کی روانی و "اختصار بیانی" دیکھئے کہ انھوں نے جلدی جلدی اک دوسرا دیوانِ غزلیات دھر گھسیٹا! اور گزشتہ معنی خیز حادثۂ تقدیری کو چیلنج کرتے ہوئے اُس کا نام "باقیاتِ فانی" رکھا! جو شاعر اپنے زندہ دل و جگر کے اک پوری ارژنگِ چین کو "فانیاتِ فانی" تسلیم کرلے، معلوم ہے کہ "باقیات" کی بھی اُس کی نظر میں کیا وقعت ہو گی! اجی گھر کی کھیتی ہے خود رو اُگتی ہے! اگر تھوڑی گاؤ خورد ہو گئی تو پروا کیا ہے!

آزاد صاحب غزل کی مزعومہ خصوصیت، ایجازِ بیان، پر زور دیتے نہیں تھکتے۔ لیکن حرف و حکایاتِ تغزل میں اور اجمالِ بیاں؟ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ع "افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت۔" والی حکایتِ لذیذ بھی کیا اس قابل نہیں کہ اُس کے بیان میں "دراز تر گفتن" سے کام لیا جائے؟! خدا جانے "مکالمہ با معشوقہ" دغزل کے راوی اپنی زندگی کی دلچسپ ترین سرگزشت کی تفصیل سے کیوں اس قدر گریز کرتے ہیں! اختصار و ایجاز کا پردہ وہ کس خشک یا ناگفتہ بہ واردات پر ڈالنا چاہتے ہیں؟! کیا ہم فرض کریں کہ اس بے سر و پا بیانی کا راز

یہ ہے کہ ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے ؛
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں ۔ ؟

تاہم آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو غزل کے اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں!

وائے برحالِ شاعری و قادر الکلامی' جو قافیے کے رحم پر ہو! پھر کہنے والے کیا غلط کہتے ہیں کہ غزل میں صرف ردیف و قافیے کے لئے مطالب و مضامین لائے جاتے ہیں نہ کہ مطالب و مضامین کے لئے ردیف و قافیہ!

مثنوی کی تعریف و تنقیص بیک وقت ملاحظہ فرمائیے! ارشاد ہوتا ہے:

"مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر و کارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے بڑے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات، بلکہ افسانوں، داستانوں، اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور ایسی تمام اصنافِ سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ منظوم کئے جاتے ہیں یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں"

سبحان اللہ! "طویل یا حقیر خیالات و واقعات"!؟ —— مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزارِ نسیم، مثنوی معنوی، فردوسی کا شاہنامہ، ہومر کی ایلیڈ حقیر خیالات و واقعات کا پشتارہ ہیں!؟ آپ کی خبط دبے ربط غزلیں کوئی نکے سیر بھی نہیں پوچھتا، حالانکہ مذکورہ بالا مثنویاں بین الاقوامی ادبیات کے شاہکار کہلاتے ہیں، اور یہ مثنوی گو شعراء "پیمبرانِ شعر"!

پھر ہم حیران ہیں کہ ابھی چند صفحات اُدھر تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ نظم بخلافِ غزل کے "تقسیم طاقتِ خیال" اور "پستیٔ مرتبہ شعریت" کا خمیازہ رکھتی ہے۔ لیکن اب وہ "ہمہ گیر صنف" ہو گئی؟ اور انتشارِ قوتِ خیال اور زوالِ منزلتِ شعر "اک آمد ایجاد" بن گئی! —— یہ "فقدانِ حافظہ" کبر سنی کا نتیجہ ہے یا کسی اور علت کا لازمہ؟!

پھر سوچئے تو کہ "بابا رگزشتہ افسانۂ شب" کی روایت بالا ایجاز آخر کیا معنی رکھتی ہے؟! ؎

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

ہمارے جذبۂ حیرت کو کسی طرح تسکین نہیں ہوتی کہ ایجاز و اختصار کے لئے منتخب کیا جاتا ہے غزل کو؟! گویا "حکایتِ لذیذ" کو کوتاہ بیانی کے لئے! لیکن پھر اسی ایجاز و اختصار کا انتقام آپ اک بے پناہ تکرار و اعادہ سے لیا کرتے ہیں، اور دو غزلہ و سہ غزلہ کی درازنفسی شروع کر دیتے ہیں! بلکہ الف سے لے کر یا تک ساری ابجد کے وسیع میدان کو اپنے ماشاء اللہ "مختصر دواوین" میں قطع کر ڈالتے ہیں! پھر غیر سے دیوان پر دیوان کا طومار تیار ہوا کرتا ہے! یہ ایجاز و بلاغت ہے یا بے نتیجہ بے معنی گوئی؟! جس سے آپ کا مضمون برابر تشنہ رہتا ہے اور آپ کو "ٹمیٹڑی" کی طرح بار بار غزل کے تالاب میں سر مارنا پڑتا ہے؟! آپ کے ہاں یہ "دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" کی کیا بوالعجبی ہے؟! آیا شعراء کرام خود بھی اپنے حقیقی وارداتِ قلب سے آگاہ ہیں؟!

خیال کا اک دلچسپ پلٹا دیکھیے! فرماتے ہیں:

"ہم مانتے ہیں کہ کسی خیال کو شرح و بسط کے ساتھ مسلسل ادا کرنے میں جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے، اور جزئیات کا احاطہ بھی کوئی آسان کام نہیں"!

یہی "جزئیات کے احاطے" کا "کارے دارد" کا کارنامہ ہے جس کی نسبت آزاد صاحب قبل ازیں یہ طعن فرما چکے ہیں کہ "نظم گو شاعر بھی کون سا تیر مارتے ہیں"! کیا استادانہ اصولِ جنگ بھی یہی ہے کہ اپنے اور فریقِ مقابل ہر دو کے دلائل یا دقائق مختلف کام لیا جائے؟! کیا جس مورچے کو آپ بزعمِ خویش مسمار کر چکے ہیں اُسی کے پیچھے اب پناہ لینا چاہتے ہیں؟! ہاں ٹھیک ہے: "غزل گو شعراء کی غزل کے مختلف اشعار کا جس طرح مسلسل و ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں اسی طرح اُن کے شاعرانہ استدلال کا باہم مربوط ہونا بھی کیوں لازمی ہو؟ بقول جگر کے "غزل کا مقام زمان و مکان سے پرے واقع ہوا ہے"!

اب حضرت آزاد اک صفِ ماتم پر منتقل ہو جاتے ہیں اور اس طرح بین کرتے ہیں:

"ماتم کرنے کی جگہ ہے کہ مغرب زدگی نے مخالفینِ غزل کے ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم کو اس درجہ مسخ و مفلوج کر دیا ہے کہ . . . . . ."

بلاشبہ مروجہ غزل و تغزل ماتم کرنے کی چیز ہے! "مغرب زدگی" کی پیٹنٹ دلیل سے کام نہ چلے گا! ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ "مشرق زدگی" اس سے زیادہ شیطان کی مار ہے! مغرب تو صرف اک جنون سامان جوان ہے، لیکن پیر مشرق تو اک متعفن لاش ہے! ع

مغرب خراب و مشرق ازاں بیشتر خراب!

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ!

آزاد صاحب اک ماہرِ مشرق و مغرب بلکہ لیکن اک مغرب ہی کی ساختہ معنکہ

لگا کر فرماتے ہیں :۔

"خدا جانے یہ حضرات غزل کو جو اک خالص ایشیائی چیز ہے، مغربی عینک لگا کر کیوں دیکھتے ہیں "

غرض یہ ہے کہ غزل اگر حرف و حکایت محبت ہے تو وہ اک مشرقی و مغربی، آفاق گیر انسانی متاعِ دل درد ہے، اور ہندوستان یا ایشیا کے اندر مقید نہیں بشرطیکہ ایشیا کے براعظم کے حدود اربعہ، غزل گویانہ جغرافیے میں دلی و لکھنؤ کی چند گلیاں نہوں، جو مشاعروں کے اڈے ہیں ! سبحان اللہ محبت کی گفتگو اور تغزل کا شغل اور خالص، بلاشرکتِ غیرے، اک ایشیائی چیز !! سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مشرق، بالخصوص ہندوستان، ہی اپنی مروجہ مجلسی معاشرت کے نتیجے میں اُن صحبتوں اور رنگین مکالموں سے بیگانہ ہے جو تغزل کا سازوبرگ، اور آب ورنگ ہیں ! ؏

گرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ !

حکیم آزاد صاحب کے، شاید بحیثیتِ طبیب کے بعض خاص تجربات سنیئے :۔

"خاص خاص حالتوں میں اکثر مشاہدے میں آیا ہوگا کہ انسان وقتِ واحد میں رو بھی رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے"! (بتقریب توجیہہ انتشار بیانی غزل !)

"ایسا انسان" ہماری تشخیص میں تو کوئی بڑا ہی عجیب الخلقت حیوان ہے جسے کسی نے کبھی کبھی کسی "دار المجانین" یا "باغ وحوش" میں دیکھا ہوگا !

اسی ضمن میں آزاد صاحب ہمیں مزید دعوتِ نظر دیتے ہیں کہ "اکثر دیکھا ہوگا کہ جب بچھڑے ہوئے دو عزیز مدت کے بعد ملتے ہیں تو بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں، اور جب تک دلوں کی بھڑاس نکل نہیں جاتی اس گریہ مسرت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا"!

تاہم ہم نے کبھی یہ نہ دیکھا ہوگا کہ گلے ملنے والے ایک ہی سانس میں روتے بھی ہوں اور ہنستے بھی ! غالباً یہ مشاہدہ بھی غایت درجہ غیر اغلب ہے کہ وہ ایک سانس میں آہ کرتے ہوں، اور دوسری سانس میں واہ ! یہ اختلاطِ جذبات نہوگا، اختلالِ حواس ہوگا ! رونے والے جب تک روئیں گے تو روئیں گے ہی اور جب ہنسیں گے تو ہنسیں گے ہی ! ہم انسانی جذبات کی ہمواری سے تو واقف لیکن "متداخل جذبات" سے نہیں ! ہمارے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ ؏

خندہ در دہن و گریہ در گلو باشد !

تاہم "دہن و گلو" کا مکانی فصل اور نتیجۃً زمانی وقفہ بہرحال باقی رہے گا ! خود آزاد صاحب بے خبرانہ اس حقیقت سے باخبر ہونے کا اظہار کرتے ہیں جبکہ وہ اس شعر کا التزام کرتے ہیں کہ "جب تک دلوں کی بھڑاس نکل نہیں جاتی" !

—— لیکن اگر بفرضِ محال خدانخواستہ غزل والا معاملہ ہونے لگے تو شرطیہ ایک گروہ گردن مچھڑا کر بھاگ جائے گا ! ؏ تکلف برطرف تھا، اک اندازِ جنوں وہ بھی ! اِن نفسیاتی حرکاتِ مذبوحی کی آئندہ رفتار کا تماشا دیکھئے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

"ہم اک ایسا شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے اک انسانی دل و دماغ بیک وقت چار چار یا چار سے بھی زیادہ متضاد خیالات و جذبات کے مشتول ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے "!

نہایت ادب کے ساتھ ہم محض بتقاضائے اعلانِ حقیقت، اس تلخ نوائی پر مجبور ہیں کہ چار کیا چالیس خیالات وجذبات کا بوقتِ واحد کسی ماؤف دماغ پر مسلط ہو جانا طبی امکانات سے خارج نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے دماغوں کی دستیابی "امراض دماغی کے اسپتالوں" سے باہر بھی ممکن ہے؟ آپ اک "شعر" کو اپنا سنگِ بنیادِ حجت بنانا چاہتے ہیں، لیکن اک فرسودہ و کرم خوردہ "استادِ غزل" کی نفسیت، انسانی دماغ کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ! ان بزرگوں کے دماغ مختل کے سازِ شکستہ کے ایک ایک پھٹے پردے سے بیکوقت اگر ۲۰، ۲۰، ۳۰، ۳۰ "صبیں پون" نکلنے لگیں تب بھی محلِ تعجب نہیں !

آزاد صاحب اک لاجواب سوال قایم کرتے ہیں :۔

"اگر بوقتِ واحد ایک سے زیادہ خیالات وجذبات کسی انسانی دل و دماغ میں نہیں سما سکتے تو فرمایئے کہ اتنے کیفیات کا حامل یہ منقولۂ بالا شعر کیونکر موزوں ہو گیا "!

کتنی قابلِ رحم خوش فہمی ! گویا شعر ردیف و قافیہ کے بہم پہنچ جانے سے "موزوں" ہو گیا ! آپ سے کون کہے کہ "ذہنی ہمنوائی کے علاوہ اک ذہنی ہم آہنگی بھی ہوا کرتی ہے جو شعر ایک طرف، نثر کے جملے کے لئے بھی ناگزیر ہے ! اچھا فرمایئے آپ استادِ ناسخ کی اس "بیتِ موزوں" میں کونسا عروضی سقم نکال سکتے ہیں ؟ ؎

ٹوٹی دریا کی کلائی، زلف الجھی بام میں !
مورچہ مخمل میں دیکھا، آدمی بادام میں !

ارشاد ہو کہ یہ شعر آپ کے پیش کردہ شعر سے کچھ "کم موزوں" ہے ؟

لعنت بریں موزونیت !!

آزاد صاحب کی اک دلیل دوئیم ملاحظہ فرمائیے :-

"یہ کہ غزل صرف ایک سانس یا آنِ واحد میں تو لکھ نہیں دی جاتی، اس کے کہنے اور لکھنے کے لئے بعض اوقات دس دس دن، پندرہ پندرہ دن کی طویل مدت درکار ہوتی ہے"!

اللہ اللہ! ہمارے کہنہ مشق و قادر الکلام اساتذہ کرام ۱۰، ۱۵ دن کے فاقوں میں ایک غزل فرمایا کرتے ہیں! اگر مشاعرے کا تازیانہ نہ ہوتا تو تلاشِ مضمون میں وہ شاید عمر بھر ایک غزل کی تکمیل بھی نہ کر سکتے! اُن کی غزل کی پس پشت کوئی "فسانۂ آں شبے کہ بایار گزشت" تو ہوتا نہیں، اُس کے پیشِ نظر تو غوغائے آں بزم ہی ہوتا ہے جو "درمشاعرہ گزشت"! ــــ یا للعجب! انسان، اور شاعر ایسے ہمہ تن شعور انسان، کے نصف نصف مہینے کے بیشمار و گوناگوں واردات و کیفیات، اور سب ایک واحد غزل کی تنگنائے میں سر کھپائے پڑے ہوئے ہوں! محض اس وجہ سے کہ ایک ہی ردیف و قافیہ کے "مزے اور موٹے" باندھ دیئے گئے ہیں! مناسب ہو کہ ہمارے شعرائے متغزلین اپنی غزل کو معلق ہی رکھا کریں اور کبھی اُس کا مقطع نہ لکھا کریں! کیوں نہ پندرہ دن کو ممتد کر کے ساری عمرِ طبیعی پر وسیع کر دیا جائے، اور اپنے جشنِ ولادت، جوانی، جوبلی، اور وفات حسرت آیات سب کو ایک ہی غزل میں سمیٹا جائے! ــــ پھر یقیناً اُس کا ایک ایک مصرعہ "ہزار داستان درآغوش" ہوگا!

آزاد صاحب کا اسی سے پیوستہ فقرہ یہ ہے :-

"جب ایسا ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہے، تو اس سے بالبداہت ثابت ہوتا ہے کہ ... "

اس "فی الواقع ایسا ہی ہے" سے داعیینِ مشاعرہ کو اندازہ کر لینا چاہیئے کہ محفلِ شعراء کے انعقاد سے کتنے دن پہلے انھیں "مصرعِ طرح" کا اعلان کر دینا چاہیئے! "بالبداہت" یہ مدت نصف ماہ سے زیادہ ہونا چاہیئے! شعرائے عظام کی دماغ سوزی اور ذہنی فاقہ کشی اور صرف ایک عدد مولودِ غزل کے ایامِ حمل و وضعِ حمل کی کم از کم مدت ۱۵ دن ہے! طُوْبیٰ لَکُمْ یَا تَلَامِیْذَ الرَّحْمٰن!

علیم آزاد صاحب کی، اپنے ہی دل و دماغ کی تشخیص دامتحان ملاحظہ فرمائیے!

"انسانی خیال مطلق بے لگام و بے مہار ہوتا ہے! ... ... بے لگامی اور بے مہاری اُس کی فطرت میں داخل ہے! اگر اُس کو بجبر و کوشش روکا نہ جائے تو ایک ثانیہ کے لئے بھی وہ ایک مرکز پر قایم نہیں رہ سکتا!

متعارف غزل ہی حقیقتہً اک "بادہوائی تیر اندازی" ہے جہاں ردیف و قافیہ کی چہار طرفہ ہوائیں مختلف ابیات کو شش جہت میں پھینکتی رہتی ہیں! پس بے لگام گھوڑا اور بے مہار شتر ہوگی آپ کی غزالۂ غزل، نکہ خدانخواستہ انسانی خیال و دماغ! ایسے انتشارِ ذہنی کی حالت میں کوئی شاعر نکہ مارے "قلم چھوئیگا نہیں، تا آں کہ اُس کی فکر یا اُس کا احساس ایک نقطہ ماسکہ پر مرکوز ہو کر نزدہ جائے، جس سے اُس کو اک طویل سیر حاصل نظم لکھنے کے بعد بھی بمشکل نجات ملتی ہے! آغازِ خامہ فرسائی سے قبل شاعر کی نفسی یکسوئی اور قلبی جذب و انجذاب کا عالم یہ ہوتا ہے: (جوشؔ کی دو دوامی نظموں کے مطلعے!)

(۱)

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں! اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں!

(۲)

اُف! دفعتہً یہ کس سے ہماری نظر ملی! مدت کے بعد لذتِ زخمِ جگر ملی!

دل و روح کی یہ گرفتاری اُس آوارگی اور ہرزہ گردی کا موقع کہاں دے سکتی ہے جو گردِ مشاعرہ غزل بازِ شعراء کی مصیبت ہے؟! غزل ساز متکبند دل کا نفسی تازیانہ سوائے مشاعرے کے اعلان کے کوئی اور چیز بھی ہو؟! یہ ہمارے "پیمبرانِ سخن" کا خیر سے "لمحۂ شاعرانہ" ہے! جس کی بشارت ۱۵ دن پہلے سے مل جانی چاہیئے! اور ع

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار!

غالبؔ نے جس شاعرانہ "کانِ جواہر" اور جس "معدنِ جگر" کا ذکر[1] کیا ہے اُس کی متاع کُش مخز ہمارے عام متغزلین کے ہاں یہ ہے: (بروایت جناب آزاد!)

"ہر ادیب کو، خواہ وہ ناظم ہو یا ناثر، کبھی معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں اور کبھی الفاظ کے لئے معانی"!

گویا اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا، صرف فضول گوئی کے لئے فرضی مافی الضمیر کا اک ڈھونگ ہوتا ہے! کیا معنی و خیال کی یہی وہ بازیگری ہے

---

[1] سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے؟
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو! — غالب

جو غزل کے ایک ایک مصرعے کو "ہزار داستان در آغوش" بنا دیتی ہے؟!
ـــــ ہزار داستان در آغوش، یا دس ہزار باطل بردوش؟!

الغرض ساری سخنگوئی ردیف و قافیہ ہی کی ہے اور اپنی تمامی تعدیلوں اور تحریفوں میں اُنہی کے رحم پر! شاعر اُن کا محض اک بے جان آلۂ کار کہ خود یہ الفاظ و کلمات اُس کے اسلحہ خانہ نہیں؟! پھر شعر گفتن چہ سود؟! و خیال پختن چہ حاصل؟! مطلب یہ ہے کہ شاعر کو جانا کہیں بھی ہو، چلنا پڑیگا اُسے شعر کے قوافی و خواتم کی ہی پیشگی طے شدہ راہوں پر؟! پھر چاہے وہ اُسے اپنے گھر پہنچا دیں، یا کسی جنگل میں "اندھا بھینسا" بنا کر چھوڑ دیں! . . . . یہ شاعری "بالِ جبریل" ہوگی یا غولِ بیابانی؟!

ہمارے غزل طراز اساتذہ کے لئے تو بھوتوں کا ہی جگر "پیمبری شعر" ہے! ع

ہزار روزگارِ سفلہ پرور را تماشا کن!

آزاد صاحب کہتے ہیں:-

"ایک اعتراض غزل پر یہ ہے کہ غزل کا وجود فارسی و اُردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا"!

بلاشبہ یہ اعتراض ہے، لیکن مُطلقاً غزل پر، اپنے وسیع ترین تصوّر میں، نہیں! بلکہ متعارف و مُتداول غزل پر! بے ربط و بے آہنگ غزل پر! متضاد و باہم متصادم غزل پر!، موئے کمر و کوہ سُرین والی غزل پر!، اپنے ہجرِ دوام اور رقیبِ روسیہ کے غلبۂ مدام والی غزل پر! قاتل شیوہ و قصّاب پیشہ محبوب والی غزل پر! ـــــ نہ کہ اُس غزل پر جو ہے ع   افسانۂ آں شب کہ بپایا گزشت! ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست!

غزل کے بیشمار رقیبوں اور اُن کیساتھ دن رات جوتی پیزار کے "معاملۂ رنگین" کی تاویل آزاد صاحب اِس طرح فرماتے ہیں:-

"بات یہ ہے کہ انتہائے عشق میں عاشق کے احساسات بہت نازک ہوجاتے ہیں۔ وہ انسان تو انسان، ہوا، گھٹا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج باغ، صحرا، طوطا، مینا، کنگھی، آئینہ وغیرہ وغیرہ جس جس چیز کی طرف معشوق کی نگاہِ التفات جاتی ہے، سب کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے!"

محبوب کے "اسبابِ خود بینی" کی طول طویل فہرست کی اِس مہیب صف آرائی سے اتنا کانپنے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی! کیا غزل گو شاعر و عاشق کالی گھٹا اور بے ہنگم پہاڑ سے بھی بڑھ کر سیاہ فام و بدہیئت واقع ہوا ہے؟!! اور طوطا مینا سے بھی زیادہ ناچار دبلے پر؟! سارے ہجوم عاشقان میں وہی کیوں محروم ترین، مظلوم ترین، مقہور ترین، مجبور ترین مبغوض ترین، اور مغضوب ترین، پایا جاتا ہے؟! کیا غزلگوئی میں کوئی ایسی ازلی و ابدی سیہ بختی و سوختہ نصیبی ہے جو اُس کی قسمت کی بآمادی پر مُہر کر دیتی ہے؟! دراصل یہ غزل کی روایاتی میراثِ جنیت ہے جو اک متغزل عشق باز کے سارے عاشقانہ مطلعے کو تاریک کر دیتی ہے! اِس ل یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل باز عاشق کا "رقیب روسیہ" شاید یہی کالی گھٹا ہے جس سے یہ بیچارہ غالباً ایسا ہی ڈرتا رہتا ہے جیسا کہ رفیو بی بارش سے تاہم دریا اور چاند، شانہ و آئینہ کے اندر تو شاید کوئی تاریک پہلو نہیں! مگر غزل گوئی کی تلقینِ بزدلی شاعر کا دل دہلاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے سایئے ڈرنے لگتا ہے، نہ کہ اُس سائے سے جس کا ذکر ہم یہاں پاتے ہیں کہ ـــــ

باسایۂ ترانمی پسندم   عشق است و ہزار بدگمانی!

غزل کی اِنہی "رکیک مضامین" کی "داد" حکیم آزاد یوں دیتے ہیں:-

"شاعر کوئی فلسفی یا مورخ نہیں ہوتا کہ اُس کے کلام میں یکرنگی و توافق کا نہ پایا جانا عیب میں داخل ہو"!

لیکن وہ کوئی فاتر العقل ہستی بھی نہیں ہوتا کہ مربوط و ہم آہنگ گفتگو کی اُس سے توقع نہ کی جائے! شاعر فلسفی نہو لیکن فلسفی سے بمراحل زیادہ عارفِ کائنات ہوتا ہے! مورخ نہو، لیکن مورخ سے بدرجہا زیادہ مایہ دار حقائق اور نباضِ حوادث ہوتا ہے! دماغی چولوں کے ایسے ڈھیلے ہونے کی صورت میں شاعر وہ ژرف نگاہی اور بالغ نظری کہاں سے لائے گا جو شاعری کو "جزوے از پیغمبری" بناتی ہے؟!

آزاد صاحب اک اور توضیح پیش کرتے ہیں:!

"چوتھا اعتراض یہ ہے کہ غزل گو، غزل میں اپنے اصلی جذبات پیش کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اُس کو یہ جذبات یا تو اپنے اوپر بہ تکلف طاری کرنے پڑتے ہیں۔ یا پھر اُسے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات حوالۂ قلم کرے"!

ہم کہتے ہیں کیوں نہ کرے؟ "اساتذۂ سلف و خلف" ایسا ہی "باندھ گئے ہیں"! اساتذہ نے تو محاورات و ضرب الامثال کے علاوہ

اُن کے عشق، انتخابِ معشوق، مخصوص پسندیدہ خط و خال، "رقیب روسیہ" کی دائمی سُرخ روئی اُن کی اپنی مستقل لعنتِ ہجر و حرماں، اور سارے وارداتِ عشق اور تمامی تقدیرِ عاشقانہ کو معین و مقدر کر دیا ہے! اب ہمارا غریب "غزل گو" "ہزاسٹر زداشن" کو اس لب و لہجہ Reproduce میں نہ کرے تو کیا کرے کہ ؎

دریں پردہ چو طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ اُستادِ ازل گفت ہمائی گویم!

لیکن ازاد صاحب کے "دوگونہ جواب" کا جزوِ اول یہ ہے :-

"اول تو یہ غلط ہے کہ غزل گو غزل میں اپنے جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا"!

انکار کس طرح ممکن ہے! ردیف و قافیہ اور شاعرِ متغزل کے درمیان قبل ازیں، سارا اقدام و اختیار اول الذکر کے لئے تسلیم کر لیا گیا ہے!

جواب کا جُزِ دُوم سُنیئے :-

"شاعر کو ترجمانِ عالم کہا گیا ہے، اُس کے لئے اُس کے اپنے خیالات و احساسات تو اک پیش پا اُفتادہ چیز ہیں! اُس کو تو چرند و پرند ....
... غرض ہر چیز کی زبان سے بولنے کی قدرت ہوتی ہے"!

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو یہ امر مسلّم ہے کہ شاعر متغزل اپنی ذاتی ترجمانی نہیں کیا کرتا! بلکہ "چرند و پرند" کی عشقبازیوں میں اُن کی عاشقانہ مراسلت کی وکالۃً کتابت کیا کرتا ہے، اور ایسے کمالِ "نقل مطابق اصل" سے کہ بھیڑ بکری، طوطا مینا ہر جانور کی بولی بولتا ہے! پھر آپ "حیوانِ ناطق" کی اِسے کوئی تیسر نزدلی ورجعتِ قہقری نہ سمجھئے! یہ شاعرانہ "قدرتِ کلام" کا طغرائے امتیاز ہے! ؏

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

پھر غزل سازنکبند اور "ترجمانِ عالم"!! ـــــ اے سبحان اللہ! مینڈکی کو بھی زکام ہوا! ؏

آنچہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب!!

کبھی آپ نے اِس منصبِ بلند کا خواب بھی دیکھا ہے؟ یا یہ غزل طرازی کی اُس سُنتِ ادبی کی طرف کنایہ ہے جو "سرقۂ مضمون" کا عنوانِ جلی رکھتا ہے؟ لیکن اک حقیقی شاعر کی متاعِ نغز تو غزل گو ریزہ چینیوں کی "کمند کوتہ" اور "بازوئے سست" کی رسائی سے کہیں "بلند اک بام" پر محفوظ ہے!

"ترجمانِ عالم" بھی شاید آپ نے سُن پایا ہے! لیکن آپ بزرگوں کو کون بتائے کہ محفلِ مشاعرہ کی طفلانہ خودنمائی اور عالم کی حکیمانہ ترجمانی کے مابین کتنا ناقابلِ عبور خلا واقع ہے! ؏

تصور عرش پر ہے، اور سر ہے پائے ساقی پر!

کیا ہمارے غزل گو شعرائے عظام مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی زبان کا یہ خراجِ تحسین قبول فرمائیں گے .

حب اُن پہ ہوتا ہے مضمونِ مُبتذل وارد تو گویا عرش سے اُتری چمار کو بیگار!
ہے نابدان میں پڑا اک سڑا ہوا پتّا اور اُس پہ تیر رہا اک پتنگ ناچار!
وہ پتنگ خود کو سمجھتا ہے اک امیرِ جہاز اور نابدان کو کہتا ہے قلزمِ زخّار!

آزاد صاحب نے مولینا حالی علیہ الرحمۃ کا نام اپنے مضمونِ زیرِ تنقید میں کئی جگہ استشہاداً لیا ہے کیا ہم فرض کریں کہ آزاد صاحب غزل گوئی کی پامالی و پستی کی طرح اپنے استادِ معظم کے مسلکِ ادبی کی بلندی و پاکیزگی سے بھی واقف نہیں؟! بہر حال اگر حکیم صاحب مولینا حالی کی زبان کھلوانا چاہتے ہیں تو ذرا جگر تھام کر بیٹھ جائیں! ہم اُن کا محاکمہ نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں حالی مرحوم فرماتے ہیں :-

خلف اُن کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہورِ ہندوستاں ہیں وہ کچھ ہیں تو لے دے کے اِک غزل خواں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کی "غزلیں" مجالس میں گائیں!

مولینا حالی ہی کی نظروں میں شعرائے متغزلین کا جو مصرف ہے وہ بھی سُن لیجئے :-

جو سقے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب
ہو میلا جہاں گُم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب
جو تھڑ جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے!

"نقاد"

میں دیکھ رہا ہوں

ضیاءالدین احمد سلہری

میں دیکھ رہا ہوں
اس دُنیا میں
مہذب و ترقی پسند دنیا میں
امراء کی وجاہت
اور اُن کا طمطراق
اُن کی رنگینیاں اور اُن کا سامانِ تعیش
اور اُن کی فلک بوس عمارات
جس کی ایک ایک اینٹ
اُن کی عزت کا نشان ہے۔
لوگ بھی انھیں دیکھ رہے
قدر اور منزلت کے جذبے کے ساتھ
اور سراہ رہے ہیں
اُن کے مذاقِ سلیم کو
اُن کے اعلیٰ طرزِ معاشرت کو
مگر اُن کی آنکھیں
اِن اینٹوں کی پیوستگی میں
اُس مسالے کو نہیں دیکھ سکتیں
جن میں ایوانوں کی استواری
اور محرابوں کی مضبوطی کا راز مضمر ہے۔
آہ وہ مسالہ عبارت ہے
غریبوں کے پگھلے ہوئے گوشت سے
اور اُن کے بہتے ہوئے خون سے۔
ہاں ان محلات کا استحکام
اُس کی شان
مزدوروں اور اپاہجوں کی رگوں سے خون خشک کرنے پر
قایم ہے ———
یہ عمارتیں نہیں
غربا کے جسموں کے ڈھانچے ہیں
یہ موسیقی کی لے نہیں۔
اُن کی آہوں اور چیخوں کا ایک غلغلہ ہے۔

~~~~~~

دُنیا اندھی ہے
جو ان مکانوں کے مکینوں کو
اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ حسنہ کا جامع قرار دیتی ہے۔
~~~~~~

یہ جبار و قہار
فخر و غرور کے پروردہ
کوچوں پر نہیں
بلکہ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے
سینوں پر بیٹھے اُن کا دم گھونٹ رہے ہیں۔
اور میں دیکھ رہا ہوں
انھیں عماروں کے عقب میں
اور شمالی جانب
شام کے جھٹپٹے میں
ایک مفلوک گروہ کو آتے ہوئے
جانوروں کا ایک گلا
لہنگوں میں ننگی عورتیں
اور دھوتیوں میں عریاں مرد
سروں پر ٹوکریاں اور پھاوڑے لٹکائے ہوئے
اُن کے چہرے قبر کی مٹی کی طرح افسردہ ہیں
جن میں نہ رنگ ہے
اور نہ جان
عورتوں کی خشک چھاتیوں سے چمٹے ہوئے بچے
کمزوری سے خاموش ہیں
دودھ پینے کی مردہ خواہش کو دبائے ہوئے۔
ماں
ایک غریب مزدور ماں
جس کی آنکھیں عدم کا نشان ہیں
جس کے پپوٹے غبار سے اٹے ہوئے ہیں
اور جس کے آنسوؤں میں اتنی نمی باقی نہیں
کہ پلکوں سے اتر کر گالوں پر بہہ سکیں
آہستہ آہستہ
اپنی زندگی کے آخری سہارے کو
آہوں کی لوریاں دئے چلی جا رہی ہے۔

اور میں دیکھ رہا ہوں
ان انسانوں کی جھونپڑیوں میں
قبروں کی ایک لامتناہی قطار کو
ایک خوش نصیب کٹی میں
جس کا چولھا گرم ہے
چند لڑکے باہر کھڑے ہیں
آنکھیں پھاڑے ہوئے
اُن بھوکے اور مریل کتوں کی طرح
جو گھروں کے باہر ڈی پر آس لگائے بیٹھے ہیں
امرا بھی جی رہے ہیں
اور یہ غربا بھی جی رہے ہیں
قدرت! اور یہ ستم ظریفی!
اور میں دیکھنے کو زندہ ہوں
دو انسانی گروہوں کی زندگی
اور ایک خالق کی حکومت کو!
یہ کیسا عدل ہے؟
یہ کیسی خدائی ہے!

کاغذ مہنگا ہوگیا یعنی تقریباً ایک روپیہ فی ریم قیمت بڑھ گئی۔ اس کی تلافی کی صرف دو صورتیں ہیں یا تو چندہ بڑھایا جائے یا خریداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے۔ ناظرین اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم نے توسیع اشاعت کے لئے اب تک کوئی درخواست نہیں کی لیکن اب ہم یہ گذارش کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر مئی اور جون میں خریداروں کی تعداد اتنی نہ بڑھ گئی کہ اس نقصان کی تلافی ہو سکے تو ہم یکم جولائی سے چندہ بڑھا دیں گے۔ لہٰذا ہمارے وہ کرمفرما جو یہ چاہتے ہوں کہ چندہ نہ بڑھے اس کی کوشش کریں کہ ان دو مہینوں میں کلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار پیدا کئے جائیں۔ نیز وہ حضرات جو خریدار بننے کا خیال رکھتے ہوں مہلت سے کام لیکر چھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ انھیں اضافہ شدہ چندہ ادا کرنا پڑے۔

پیرِ مغاں — دیکھ!

ہاں دیکھ، ہر اک ذرہ ہے اک باغِ جہاں دیکھ
ہر خارِ مغیلاں پہ ہے جنت کا گماں دیکھ
گلشن پہ ہے گھنگھور گھٹاؤں کا دھواں دیکھ
اور اس پہ یہ لب تشنگیِ بادہ کشاں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

یوں سایۂ کاکل میں ہے، اک روئے کتابی
جس طرح گھٹاؤں میں جھلکتی ہو گلابی
دے جام کہ ایماں کی نہو خانہ خرابی!
تسنیم کی سوگند سوئے تشنہ لباں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

دن ڈوب چلا، مشعلِ امید جلا دے
اٹھ پائے صراحی پہ جبینوں کو جھکا دے
کہہ قلقلِ مینا سے کہ تکبیر سنا دے!
ہے وقتِ اذاں وقتِ اذاں وقتِ اذاں دیکھ!!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

ہر دیدۂ گریاں میں تبسم ہے پرافشاں
کیوں کشمکشِ سود و زیاں سے ہے پریشاں
ہر درد کے آغوش میں ہے لیلئ درماں!
ہر چاک ہے اک کارگہِ بخیہ گراں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

مانا کہ مناظر ہیں تبسم ہی تبسم
گو دید کے قابل ہے یہ جلووں کا تلاطم
لیکن جو مناسب ہو تو از راہِ ترحم

اس سمت بھی اے قبلۂ صاحب نظراں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

ہر آن ترانے سے برستا ہے ترانہ
بیتاب ہے، بدمست ہے بیخود ہے زمانہ
کوکو ہے اُدھر اور اِدھر چنگ و چغانہ

یہ نغمۂ نوخیز، وہ گلبانگ جواں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں، پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

ہم چپ ہیں تو مدہم ہیں حسینوں کے بھی جلوے
ہم چہکیں تو چٹکیں گے یہ گلرنگ شگوفے
دانا ہے تو پہلے ہمیں دو گھونٹ پلا دے

پھر عشوۂ ترکانۂ خوبانِ جواں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

خورشید طرب ہے اُفقِ گل سے نمودار
گاتے ہیں ہواؤں سے لچکتے ہوئے اشجار
آتی ہے گھنی چھاؤں سے پازیب کی جھنکار

رنگِ چمن و عربدۂ زہرہ وشاں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

خود پی کے حریفوں کو بھی اک جام پلا دے
وہ جام کہ تفصیل کو اجمال بنا دے
گلرنگ کی اک سامنے دیوار اٹھا دے

کونین کو آ نیم عیاں، نیم نہاں دیکھ
ہاں پیر مغاں، پیر مغاں پیر مغاں دیکھ
ہاں پیر مغاں دیکھ

اب نیم نفس بھی نہیں تاخیر گوارا
ہاں جلد پلا، جلد پلا، جلد خدارا
بھرنے ہی پہ ہے ابلقِ ایام ترارا

قبلے سے برستا ہوا آتا ہے وہ پانی!
شوخی ہے، شرارت ہے، روا رو ہے روانی
ہر سو ہے جوانی ہی جوانی ہی جوانی

مستوں کی طرف ہیں ترے مستوں کی نگاہیں
ہاں بہرِ خدا کھول بھی دے رقص کی راہیں
بے جام تو کج ہوں گی نہ رندوں کی کلاہیں!

نغموں سے کوئی ماہ لقا جھوم رہی ہے
شانوں پہ گھنی زلف دوتا جھوم رہی ہے!
یا سروِ خراماں پہ گھٹا جھوم رہی ہے

آموں کی گھنی چھاؤں ہے، کوکو کی صدائیں
سرشار فضا، مست چمن، سرد ہوائیں!
پستی میں گل و لالہ، بلندی میں گھٹائیں!

مڑنے ہی پہ ہے قافلۂ عمرِ رواں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

گردوں کی نظر ہے سوئے گیتی نگراں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

بانکا ہے تو ایمائے خمِ آبِ رواں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

آ نہرِ جناں، باغِ جناں، حورِ جناں دیکھ!
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

برنائی سلمائے جہانِ گزراں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

جوش ملیح آبادی

نقد و نظر

ادارہ

(۱) **مجلۂ عثمانیہ** (جشن سیمیں نمبر) :- اُردو و انگریزی مخلوط- ضخامت تقریباً ۳۷۰ صفحات-

مجلۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا یہ جوبلی نمبر عین شایانِ شان اور قطعاً اسم با مسمی واقع ہوا ہے! چنانچہ صفحۂ لوح بھی نقرئی روشنائی میں لکھے ہوئے نام و نقش سے مزین ہے! مجلہ ایک روشناسِ ہندوستان و بیرونِ ہندوستان رسالہ ہے، اور اِس اعتبار سے کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں، صرف جشنِ سیمیں کی تقریبِ سعید سے اُسکا یہ خاص نمبر خاص اعتناء کا طالب ہے۔ مضامین و مقالات کی بلند ترمنزلت و اہمیت کے علاوہ جو چیز مُستزاد ہے وہ یہ ہے کہ اِس میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی نو خیز نشأۃِ ادبی و علمی اور دکن و پایۂ تخت دکن کی عام تمدنی تاریخ کو موضوعِ ذکر و فکر بنایا گیا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کا ذکر خیر قدرۃً اُسکی ضخامت کے بیشتر حصے پر حاوی ہے۔ "نطق ہمایونی" اور "پیامِ شہزادہ ولیعہد بہادر" جوبلی نمبر کا مناسب و مبارک فتح باب کرتے ہیں! "پیامات" بھی بجائے خود ایک عنوان جلی ہے، جو عثمانیہ یونیورسٹی کی مخصوص تعلیمی و ثقافتی تحریک کی عظمت و ندرت کے اعترافات اور اِس مبارک علمی تجربۂ عظیم کے اثمار شیریں کے ذکر کی ترزبانی پر مشتمل ہے! "جامعۂ عثمانیہ کے مزدور"، "ارضِ جنت"، "اُردو ڈرامہ کا دورِ جدید اور حیدرآباد"، "عہد عثمانی میں ملک سرکار عالی کی دیہی تنظیم"، اور "حیدرآباد کا ایک یادگار مباحثہ" گرانقدر اور نادر مقالات ہیں! شہریار دکن خلد اللہ ملکہٗ کے گذشتہ ۲۵ سالہ خیرالقرون کے ہمہ جہت ارتقائے تمدنی کی داستانِ شیریں کے علاوہ ہم زیرِ تنقید نمبر مجلہ میں حیدرآباد کی ماضیٔ قریب میں منعقد ہونے والی "سائنس کانگریس" کی دماغی عرق ریزیوں اور علمی فیض باریوں کی اہم روئداد میں بھی پاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیرونِ حیدرآباد کے بعض نامور علمی ادارات کی تاریخ نے بھی تھوڑا اُٹھ کر حیدرآباد کے اِس جلوس عظمت و نہضت میں شرکت کر کے اُسے یادگار تر بنانے کی سعادت انجام دی! مسٹر مہندر راج سکسینہ بی ایس-سی (عثمانیہ) کا مقالہ علاوہ موضوع اور شوکتِ اسلوب کے اعتبار سے قابل داد ہے۔ اُردو زبان و انشاء کا جو اعلیٰ ذوق و معیار اُس سے نمایاں ہے اور صاحب مضمون کے ہندو اور سائنسداں ہونے کی علی الرغم، اسکی روشنی میں وہ مستحق شکر یہ بھی ہے! مجلہ کے انگریزی شعبے کا مضمون "حیدرآباد کی صحافت" مطالعۂ حقائق کی علمی بیباکی، اور اعلان حق کی نوجوانانہ جرأت ہر دو کی بناء پر ایک روشن مستقبل کا غماز نظر آتا ہے! الغرض "جشن سیمیں نمبر" صوری و معنوی ہر اعتبار سے "دوقتِ ادب" کا ایک بہترین گلدستہ ہے! (ا-ا-خ)

(۲) **منتخب دیوان غالب**: تقطیع چھوٹی کتابی، ضخامت ۱۸۲ صفحات، کاغذ وکتابت وطباعت اوسط، مولفۂ جناب نوراللہ محمد نوری، شائع کردۂ غلام دستگیر، تاجر کتب، چار کمان، حیدرآباد دکن۔ قیمت درج نہیں ہے۔

غالب بھی اب ہماری ادبیات کی وہ رومانی ہستی ہوگیا ہے جسکے ساتھ اک علمی و تنقیدی انتساب ہمارے پیر و جوان مصنفین کا اک "فیشنیبل مذاق" بنگیا ہے! لوگ غالب پر خامہ فرسائی کرکے خود اُس پر اسقدر روشنی نہیں ڈالتے جسقدر کہ خود اپنے سامنے "شمع مشاعرہ" لانا چاہتے ہیں، ظاہر ہے کہ معاملہ جب "بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم" کی اس نوبت کو پہونچ جائے تو اصل موضوع کی خدمت کا کتنا عنصر باقی رہجا سکتا ہے! زیر تنقید انتخاب غالب "مشرح" کو ہم اس "علمی طلب منفعت" (Literary exploitation) کی اک افسوسناک مثال پاتے ہیں! انہی صاحب نے "داغ" لکھی ہے اور خاصی لکھی ہے لیکن "منتخب دیوان غالب مع شرح" کو جیسا سرسری ٹالا ہے خود غالب کی روح اور جوہرادبی نے بھی اُنہیں ایسا ہی ٹالا ہے! معلوم ہوتا ہے غالب سے اُنہیں دلچسپی نہیں، صرف اپنی کُلاہ تصنیفی میں اک طُرے کا اضافہ کرنے کے لئے غریب غالب کو مورد التفات فرما لیا گیا ہے! غالب وہ چیز نہیں کہ اسکی محراب عظمت اُن لوگوں کا سجدہ قبول کرسکے جنکا مُنہ بوقت باریابی اُس کے قبلۂ عظمت کی طرف سے پھرا ہوا ہو!

غالب کا اک بھاگتا ہوا ۳ ½ صفحی خاکۂ زندگی، اور اُسکے بعد مارا ماری اسکی غزلوں کی ایسی نقل وتشریح، جسمیں اسکے ایک ایک "لفظ" کے "گنجینۂ معنی کے طلسم" کا ایسا برق رفتار تماشا دکھایا گیا ہے کہ پورے پورے "جہانِ معنیٰ" شعر پر بعض جگہ بس دو دو تین تین سطریں رسید کردی گئی ہیں، غالبِ اعظم کے ساتھ ایسا گستاخانہ سلوک ہے جس پر اک خوش مذاق انسان مشتعل ہوجاتا ہے! کسی روح پرور نگار خوبی کی نسبت ایک سانس میں یہ کہہ جانا کہ اُسکی ناک یہ ہے، مُنہ یہاں، آنکھیں اِس جگہ وغیرہ وغیرہ، حُسن کی نقاشی اور ترجمانی نہیں، اُسکی بے ادبی ہے! نوراللہ صاحب نوری نے "لسان الغیب غالب" پر جو روشنی ڈالی ہے وہ ماشاء اللہ ایسی ہی "نورٌ علیٰ نور" واقع ہوئی ہے! ہم صرف ایک مثال سے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرینگے۔ غالب کا اک مشہور شعر، جو سہل ممتنع کی بڑی سادہ و پُر کار نظیر ہے، یہ ہے۔ ؎

موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

سارے "منطقی قدموں" کو لیتے ہوئے اِس شعر کی جو مختصر ترین تفسیر کیجا سکتی ہے وہ یہ ہے:

عاشقانہ زندگی کے مصائب، یا انسانی حیات کے شدائد، سے تنگ آکر میں خودکشانہ موت کی دُعا کرتا ہوں۔ لیکن یہ دُعا یا بد عا اس لئے درِ قبول کو نہیں پہونچتی کہ قضائے موت کے نفاذ کے لئے امروز و فردا کا دن کافی نہیں۔ وہ، وہ دن ہے جو میری موت کے ظہور کے لئے روزِ ازل میں تقدیرِ آلٰہی نے مقدر و معین کردیا ہے، اور ضرور نہیں کہ وہ دن آج کل ہی ہو! اچھا میں نے مانا، لیکن اگر "موت" اسلئے نہیں آتی کہ اُسکا "دن" نہیں آیا ہے تو کم از کم مجھے "نیند" تو ہر "رات" آجایا کرے، اسلئے کہ نیند کے لئے اِسی طرح ہر رات مقرر ہے! لیکن نہیں، میرے لئے لوحِ تقدیر کا منقوش یہ منطق سود مند نہیں! مطلب یہ ہے کہ میرے رفعِ اذیت کے معاملے میں جو مقدراتِ فطرت میرے خلاف واقع ہوئے ہیں وہ تو پورے میرے خلاف پڑتے ہیں، لیکن اِسی اصول پر جو قوانینِ قدرت میرے مُفید مطلب واقع ہوئے ہیں وہ میرے لئے مفید ثابت نہیں ہوتے یعنی حیات و کائنات کی تمام مخالف و موافق تو تیں میرے "خلاف ہی" صف آرا ہیں اور عذابِ زندگی سے نجات دینے کے لئے نہ "قاطعِ عمر" موت آتی ہے اور نہ اُس سے اک "عارضی ووقتی مخلصی" دلانے کے لئے نیند آتی ہے! ؎

نہ دُرد می رود از دیدہ تاب می آید + نہ صبح می شود امشب نہ خواب می آید!

اب جناب نوراللہ صاحب "نوری" کی "دریا در کوزہ" شرح ملاحظہ فرمایئے:

"موت تو اپنے وقت مقررہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ اُس کے لئے جو دن مقرر ہے وہ اُسی دن آئیگی۔ لیکن نیند جو ہر رات آنے والی ہے وہ رات رات بھر کیوں نہیں آتی؟ اِس کی کیا وجہ ہے؟ کیا اِس کے لئے بھی موت کی طرح کوئی وقت مقرر ہے؟ کہ وہ اُسی وقت آئیگی!"

آپ نے دیکھا! یہ تشریح گشتہ ہی نہیں، مسخ بھی ہوگئی ہے،

خاصکر اپنے آخری مرحلۂ استدلال میں، جہاں غالب کا اصل نکتۂ نغز ہاتھ میں آکر پھر کھو دیا گیا ہے! ایسے سخن سنج بزرگ غالب کے درپے ہوگئے ہیں! کیا ایک یورپین نقاد کا یہ قول کوئی مبالغہ ہے کہ "ہر موضوع پر ایک ضخیم تصنیف لکھنے کے لئے وہی لوگ تیار ہوجاتے ہیں جو اسپر قلم اٹھانے کے سبب سے زیادہ نااہل ہوتے ہیں"! (ا۔ا۔خ)

(۳) داغ چھوٹی کتابی قامت، ۲۱۰ صفحات ضخامت، کاغذ وکتابت وطباعت اوسط،

مؤلفۂ جناب نور اللہ محمد نوری، مراکز بہم رسانی: (۱) غلام دستگیر، چار کمان، حیدرآباد، (۲) مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد، قیمت عہ

نور اللہ صاحب کی یہ کتاب، داغ دہلوی کی زندگی اور اُنکے غزل گویانہ امتیازات وعام ادبیانہ خدمات پر فرار واقعی بلند آہنگی والتزام تنقیدی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یہ "اُستاد داغ" پر ایک سیر حاصل، ہمہ جہت تبصرہ ہے، جو قابل داد سلیقہ و اہتمام سے انجام دیا گیا ہے۔ داغ کے کلام کا تجزیہ، بلحاظ اصنافِ سخن وبلحاظِ مضامین، داغ کا فلسفۂ زندگی ومسلک ادبی، داغ کی شاعری میں مقامی عنصر، داغ کا اسلوب بیان، داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصہ، ایسے عنوانات ہیں جنکی تصور میں ندرت بھی ہے اور جنکا اثبات بھی معقولیت ومتانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں شعرار کی سوانح نگارانہ زندگی کے لئے جدید العہد سیرت نویسوں کی رہنمائی کے واسطے یہ ایک اچھا نمونہ ہے، اور ہم ایک مخلصانہ احساس خوشگواری کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں!

داغ کا مقام اُردو شاعری میں کیا ہے؟ لوگ اُن کو "دورِ متاخرین کا خاتم الشعرا" کہتے ہیں۔ لیکن وہ اجمالاً عہد جدید کی شاعری کا جزءٔ فتح یاب کرنے والے بھی ہیں! یہ خیال قدرے مستبعد معلوم ہوگا، لیکن داغ یقیناً اِس خراج تحسین کا حقدار ہے! پہلی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے زمانۂ زوال واضمحلال کی ایک جولاں ورقصاں • وخنداں ہستی تھا۔ ادب میں اِس حیات پرور روح کی سرایت اُس کو ایک جاں داری وجاں بخشی عطا کرتی ہے! اِسی وصفِ سیرت کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ داغ اپنے تغزل میں اخلاص مندی، بیباکی، اور سرمستی کا ایک خوش سماع آہنگ رکھتا ہے! اُردو غزل کو اُنھوں نے کوئی نیا ساز و برگ نہیں دیا، لیکن ایک تازہ بتازہ نو بنو آب ورنگ ضرور بخشا! ہمارے خیال میں میر کا "اول" داغ کی "آخر" کے ساتھ ایک "نسبتِ" خاص رکھتا ہے۔ دونوں اپنے قلب وزبان میں مخلص، وبے تکلف واقع ہوئے ہیں، قطع نظر اس سے کہ ایک جگر خوار "سوز" ہے، اور دوسرا ایک دل نواز "ساز"! غالباً اِسی رنگِ اخلاص کا تقاضا تھا کہ داغ نے "مثنوی" و "قطعہ" کی قدیم اصناف کو اپنے قلم پر تازہ کیا، اگرچہ یہ چیزیں ہمارے شاغلِ غزل اساتذۂ جامد کے ہاں عملاً ٹکسال باہر ہوچکی تھیں! داغ کے یہ عناصر، جدید العہد فطری شاعری کے لئے درجہ اول کے جواہر بہم پہونچاتے ہیں، اور یہ بات محض ایک اتفاق نہیں کہ اُردو شاعری کا بلند بانگ فاتح باب اقبال، داغ سے کسب فیضان کرتا ہے! داغ کا سارا راز اور امتیاز اقبال ہی کی زبانی سُنئے:

لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت؟
ہو بہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون
مرگیا ناوک فگن، ماریگا دل پہ تیر کون

(ا۔ا۔خ)

(۴) داستان: ناول سائز، مجلد، ضخامت ۲۷۴ صفحات، کاغذ وکتابت وطباعت بدرجۂ دوم، مترجمہ "خاکسار مترجم"، نشر کردۂ ہاشمی بک ڈپو، ریلوے روڈ، لاہور۔ قیمت درج نہیں:

داستان —— "دنیا کا سب سے رنگین رومان"! —— اُنیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے ایک سرمستِ شباب فرانسیسی ادیب "پیر لوئی" کے شاہکار "افروڈائٹ" کا اُردو ترجمہ ہے۔ کتاب بلا شبہہ بڑی رنگ پاش اور رومان چکاں ہے، اور اِس گلستان رنگ وبو کو سرزمینِ فرانسیسی سے ارضِ ہندوستانی میں نقل ونصب کرنے کی مترجمانہ "قلم کاری" بھی غالباً قابل داد ہے!

ناول کا موضوع "عہد عتیق کے اسکندریہ" کی رندانہ زندگی وتمدن کی پوست کندہ نقش طرازی ہے۔ فرانسیسی روماں نگاروں کا یہ محبوب مضمون ہے، جس سے وہ سیر ہوتے نظر نہیں آتے! ع

جاہ وجلال عہد وصال بُتاں نہ پوچھ!

تو ٔ نے ہمیں زندگی کی مسرتوں سے دوچار کرنے کی صناعانہ

کوشش کی ہے۔ اُس نے اک رومانی دُنیا تخلیق کی ہے، جس میں داخل ہو کر ہم کچھ دیر کے لئے اپنی بے کیف زندگی کی اکتا دینے والی ساعتوں کو بھول جاتے ہیں"!

توئی کا اک ہمعصر نقاد لکھتا ہے:

"اس کتاب کی فنکاری بیمثال ہے! زبان بیداغ ہے، اور اُسلوب بیان پُختہ کارانہ! اُسکے ایک ایک لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے یونانی اور لاطینی ادبیات کا سیر ہو کر دودھ پیا ہے! باوجود اسکے تکلف و تصنع اُس سے چھُوا بھی نہیں ہے! کتاب دراصل اک حقیقت کی مظہر ہے، اک صداقتِ اصیل کی تمثیل!"

توئی اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی ادبی حلقوں میں شمعِ محفل بنگیا، لیکن اِس پُختہ مغزانہ سلامتِ ذوق کو دیکھ کر کم و بیش اُس کے بعد ہی اُس نے اپنے رہوار قلم کی عنان روک لی اور بالکل دم بخود ہو گیا، اگرچہ اُسکی دو ایک ہی ابتدائی جُنبشہائے قلم نے اُسکے جلوس عظمت کو شہرتِ دوام کی شاہراہ پہ ڈال دیا!

ترجمے کا "نقاب" بھی اِس "شوخ" کے مُنہ پر کچھ کم نہیں "کھلا"! - ضرور پڑھئے! (ا - ا - خ)

(۵) آیاتِ جلی: تقطیع کتابچہ: مجلد، ضخامت ۶۲ صفحات، کاغذ آرٹ پیپر،

کتابت خطاطانہ، طباعت (بلاک) صناعانہ، مُرتبہ و شائع کردہ "ادارۂ علیگڈھ" وزیر آباد، قیمت عہ،

"آیاتِ جلی" کے نام سے اگر اِس کتاب کی ضخامتِ (عظیم) کے بارے میں کوئی واہمہ قارئین کو لاحق ہو تو اُسے اپنے دماغ سے نکال ڈالیں! تاہم یہ کتابی گلدستہ "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کی اک دلپسند مثال ہے! اور لفظ "قیمت" بھی یہاں "قیمت" اور "قدر و قیمت" دونوں مدلولات پر مُشتمل ہے۔

"آیاتِ جلی" حضرتِ علیؓ کے اقوالِ حکیمانہ اور فرموداتِ مرشدانہ کی اِک "دُرج جواہر" ہے، جسکو مولٰنا جامی علیہ الرحمۃ نے ساختہ و پرداختہ کیا ہے، اور جسکی فنکارانہ کتابت اک نامور تاریخی کاتب شیخ نظام نے کی ہے، اور انواح و جداول کا سلسلۃ الذہب (زنجیر ہائے زریں) اک نادرہ کار صناع ابن شیخم کا تشاہکار ہے! طباعت میں اِن سارے خط و خال کی نوک پلک اور آب و رنگ بجنسہٖ منتقل ہو گیا ہے، چنانچہ اب "زیور انطباع پوشیدہ" کے بعد بھی وہ خطاط و نقاش کے اصلی قلم، وہو قلم کا تازہ و زندہ مجموعۂ خطوط و نقوش محسوس ہوتا ہے!

شروع میں ایک طویل الذیل مقدمہ اصل کتاب اور اُس کے قلمی نسخے کی دستیابی، اُس کی تاریخی زندگی، کاتبِ متن و جدول نگار کی صناعانہ منزلت، ادبیاتِ عالم میں "مقولوں" کی اہمیت و نوعیت، اور حضرت علیؓ کی حیاتِ طیبہ و سیرتِ مُبارکہ پر داخلِ کتاب کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد اصل کتاب کا متن ہے۔ مولانا جامی نے یہ التزام کیا ہے کہ حضرت کے ہر عربی جواہر پارۂ حکمت کے عنوان کے بعد بصورتِ قطعہ اُسے فارسی میں معناً ترجمہ کر ڈالا ہے۔ "باب مدینۃ العلم" کی مشہور "نوائے ایمان بالغیب" — لوکشف الغطاء ما ازددت یقیناً — کو اِس طرح فارسی میں منتقل کیا گیا ہے:

همه خلد و جحیم و النعیم   بیقین آنچنان که می باید
که حجاب از میانه بردارند   بر یقین ذرۂ نیفزاید

کتاب بیک وقت خطاطی، نقاشی، حکمت، ادبیت، اور حسنِ طباعت، و جلائے جلد بندی کا ایک بوقلموں مرقع ہے اور ہر خوش مذاق لائبریری کے لئے ناگزیر سامانِ زینت! (ا - ا - خ)

رفتار وقت

ادارہ

بنیادی حقوق اور کانگریس!

"کیمونل ایوارڈ" راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے "حلقۂ تسر" سے پھینکی ہوئی سب سے مکروہ استخوانِ نزاع تھی! قدرتاً وہ اپنے فتنہ افروزانہ مقصد میں کامیاب ہوئی، اسلئے نہیں کہ اُس نے اقوام ہند کی کسی ضروریات کو بہم پہونچایا، بلکہ اسلئے کہ سرکار کی زبان، چاہے وہ کیسی ہی ازلی وابدی فریب ہو، اُن عوام کالانعام کے کانوں میں بشاراتِ آسانی سے کم نہیں ہوا کرتی جن کی خیرگیٔ سماعت و جہالت اُسی سرکارِ مکر مدار کی پیدا کردہ ہے!

لطف یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی میقاتِ کراچی منعقدہ ۱۹۳۱ء کا اعلانِ تعینِ حقوق اہلِ ہند، رسوائے زمانہ کیمونل ایوارڈ پر زمانتاً مقدم بھی ہے، معناً ہمہ گیر بھی، اور سنداً بمراحل زیادہ قابلِ اعتماد بھی، لیکن یہ حقیقتی "منشورِ حریت" اک صدا بصحرا ثابت ہوا، اور ڈراسن کا جرتا چل گیا!

کانگریس کو حقوق بین الملل کا احساس حکومت سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ "کیمونل ایوارڈ" تو "وہائٹ پیپر" کے کسی تاریک گوشے ہی کا مضمون ہوگا، لیکن یہ اعلان نیشنل کانگریس کے دستور اساسی کا سنگِ بنیاد ہے! اول الذکر، اغیارِ فریب کار کا اک وقتی منصوبہ و سازش ہے، کانگریس کا یہ ایمانِ وطن ہے، جو اک زندہ و پائندہ چیز ہے! فرقہ دارانہ تقسیم نا ئرہ حقوق، مسٹر جناح کے ۱۴ نکات اور اسی قبیل کے جتنے اغراض و مصالح ہیں کانگریس نے اُن سب کے صالح اصول، اساسی اور وطن نوازانہ عناصر کو کبھی کا اپنے آئین مستقل میں تجذب کر لیا ہے، اور آج وہ بلا خوف تردید کہہ سکتی ہے کہ ؎

من زقرآں مغز را برداشتم استخواں پیش سگاں انداختم!

تاہم، مبادا کہ ہم بھول نہ جائیں، کانگریس کے صدر دفتر واقع الہ آباد کا تازہ پمفلٹ (بزبان اردو) ملخصاً یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ وہ لوگ جنہوں نے یہ عہد نہیں کر لیا ہے کہ "قائل ہونگے ہی نہیں"، اس سے اپنا اطمینان کر لیں، اور نیشنل کانگریس کی عظیم و جلیل تحریک میں شریک ہوں، (ا-ا-خ)

بنیادی حقوق اور فرائض

(۱) ہر باشندہ ہندوستان کو حقوق ذیل حاصل ہوں گے۔ یعنی اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنا، اور اشتراک عمل و باہمی اختلاط میں مکمل آزادی، اور امن کے ساتھ بغیر اسلحہ کے ایسی اغراض کیواسطے مجتمع ہونا جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہوں

(۲) ہر باشندہ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی۔ اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکے گا۔ اور اپنے مذہب

کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکے گا۔ بشرطیکہ اس سے انتظام عامہ اور اخلاق میں کوئی نقص نہ واقع ہو۔

(۳) ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اُن کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہونگے نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبار اختلاف زبان کے قائم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔

(۴) تمام باشندگان ہندوستان بلا امتیاز مذہب و مسلک یا ذات و قوم یا جنسیت کے قانون کی نظر میں برابر ہونگے۔

(۵) کوئی باشندہ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بوجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت یا پیشہ سے ممنوع نہیں سمجھا جائیگا۔

(۶) تمام باشندگان ہندوستان کو متعلق استعمال آب چاہ اور تالابوں کے نیز تعلیم گاہوں اور مقامات تفریح عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جن کی برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ (ڈسٹرکٹ و مینوسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیویٹ اشخاص نے پبلک کے فائدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو مساوی حقوق حاصل ہونگے۔

(۷) ہر باشندہ ہندوستان کو ہتھیار رکھنے اور لگانے کا حق اُن قواعد و ضوابط کے تحت میں جو اس بارہ میں مقرر کر دیئے جائیں حاصل ہوگا۔

(۸) کسی شخص سے اوس کا حق آزادی چھینا نہیں جا سکتا اور نہ اوس کے کسی مکان یا جائداد میں مداخلت کی جا سکتی ہے اور نہ وہ ضبط اور قرق کی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ قانون کے مطابق ہو۔

(۹) مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ (حکومت وقت) غیر جانبدار رہے گی۔

(۱۰) حق رائے دہندگی ہر عاقل و بالغ کو حاصل ہوگا۔

(۱۱) مفت جبری ابتدائی تعلیم کا انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے ہوگا۔

(۱۲) اسٹیٹ (حکومت وقت) کی جانب سے کوئی خطاب نہیں ملیگا۔

(۱۳) ہر باشندہ ملک کو حق حاصل ہوگا کہ ملک بھر میں جہاں اوس کا جی چاہے جائے، نیز یہ کہ جہاں اوس کا جی چاہے سکونت اختیار کرے۔ جائداد حاصل کرے یا کوئی تجارت یا پیشہ وہاں کرے۔ اور اوس کے خلاف تادیبی کارروائی یا اوسکا قانونی تحفظ ہندوستان کے ہر حصہ میں مساوی طور پر ہوگا۔

مزدوری پیشہ اشخاص

(۱) (الف) مزدوری پیشہ جماعتوں کا اقتصادی نظام اصول انصاف کے مطابق ہوگا جس کی سب سے بڑی غرض یہ ہوگی کہ ایسے اشخاص کے طرز رہائش کا معیار اب سے بہت بہتر ہو جائے۔

(ب) اسٹیٹ (حکومت وقت) کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرتی رہیگی اس طور پر کہ مناسب توانین کے ذریعہ سے نیز اُن کے سوا دوسرے ذرائع سے اون لوگوں کے لئے ایک معقول مزدوری، اُنکی صحت کا مناسب انتظام، کام کرنے کے مقررہ گھنٹے، اور مناسب انتظام درصورت نزاع درمیان مالکان کارخانہ اور کام کرنے والوں کے منضبط ہو جائیگا۔ نیز یہ کہ بوڑھاپے بیماری اور بیکاری کی صورت میں ایسے لوگونکی امداد کس طریقہ سے کیجائیگی۔

(۲) بیگار اور ایسی مزدوری کہ جو بیگار کے قریب قریب ہو بالکل بند کر دی جائے گی۔

(۳) مزدور عورتوں کے تحفظ کا خاص خیال رکھا جائیگا۔ علی الخصوص زمانہ زچگی کی رخصت کا خاص انتظام کیا جائے گا۔

(۴) تعلیمی سن کے بچے کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۵) کسانوں اور دیگر مزدوری پیشہ لوگوں کو پورا حق حاصل ہوگا کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے واسطے یونین (اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے انجمنیں) قائم کریں۔

رفتارِ وقت

یورپ اک عالمِ رستخیز میں!

جمہوریت یا فاسیت؟

عملاً تمام یُورپ اک گرم و رتیق میدانِ کارزار میں تبدیل ہوگیا ہے۔ فرزندان و دُخترانِ آدم خدا کی اِس دنیا میں اک قابلِ سکونت جگہ کے لئے کشمکش کر رہے ہیں!

اُنکا جہد و جہاد اِس نزاع پر مرکوز ہے کہ وہ بیرحم ریاستوں کی بیدست و پا رعایا نہ بنائے جائینگے! بجیس مشینوں کے بیجان پُرزوں کی اُنہیں صورت نہ دیجا سکیگی!، قہار و جبار ڈکٹیٹروں کے غلام بیدام ہو جانا اُنکے لئے گوارا نہوگا!، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ اُس آیندہ محاربۂ عظیم کے صید زبون نہ بنینگے جو شاید اک قیامتِ صغریٰ ثابت ہونے والا ہے!!

یہ کسی قدر بلند بانگ الفاظ معلوم ہوتے ہیں، لیکن جو "طوفانِ خون" پردۂ غیب میں ہے اور مستقبل قریب میں عالم بشری کے سر سے گزر جانے والا ہے، اُسکا اک سادہ تصور پیش کرنیکے لئے یہ کمترین کلماتِ تعبیر ہیں!

یُورپ کی عام خلق اللہ بھی مغرب کے عفریتہائے طاقت و طلبِ منفعت کی شاید اُس سے دوسرے ہی نمبر کی مظلوم و محروم ہے جسکا تختۂ مشق رنگین اقوام کے اعالی و آدانی ہر دو کو بنایا گیا ہے! یورپ کے مزدور کی عرقریزی اور کاشتکار کی خوں سوزی بھی تاریخ کی طویل صدیوں میں کچھ کم نہیں رہی ہے!
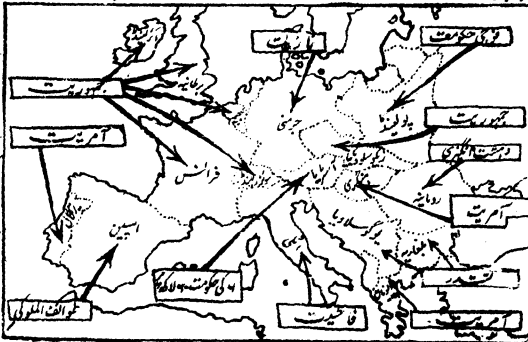
آخرکار عمومیت و جمہوریت کی تحریکوں نے یورپ کے مختلف گوشوں سے اپنا پرچم بلند کرنا شروع کیا۔ عوام الناس کی سطح میں قدرے بلندی تو پیدا ہوئی لیکن وہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ اب وہ عہد جاگیرداری کے "مویشی" نہ سمجھے جاتے تھے!

قبل ازیں وہاں بھی انکی امیر و غریب کی ہجوار جنت و دوزخ کچھ یونہی واقع ہوئی تھی کہ:

گلستاں میں جو بن گُل و یاسمن کا — سماں زلفِ سنبل کی تاب شکن کا
قدِ دلبرِ بانسر و اور نار و تن کا — رُخِ جاں فزا لالۂ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہر رنگ و بو سب — کِیڑوں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رو سب

تاہم بیسویں صدی کے آغاز تک بیشتر ممالک یورپ جمہوریت کی شاہراہ پر آگئے تھے۔ عوام الناس نے اک راحت کی سانس لی تھی، جہالت کے جو اندھیرے گوشے، اور فلاکت کے جو تاریک غار ارضِ قومی میں بکثرت نظر آتے تھے اُنکی تنویر و خلا پر ہونے لگی تھی اور اجتماعی مساوات — سیاسی نیز معاشی — کی کافی سطح مستوی پیدا ہونے لگی تھی۔

بلاشبہہ کار دبارہ جمہوریت کے لئے بعض اقطاعِ یورپ — روس،

اسپین، جرمنی، اٹلی وغیرہ، اتنے سازگار نہ ثابت ہوئے۔ وہاں نارسائی فہم تھی، فقدانِ مہارتِ کار، ادارات و اختیارات کا غلط وناجائز استعمال، طبقۂ بالا کا تسلط و اجارہ، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اتنی جدائی ناگزیر تھی! یہ اک دَورِ عبوری تھا! یہ وہ قیمت تھی جو عوام کو عمومیت کی ادا کرنی تھی!

جمہوریت کی یہ تخریب بعض لوگوں کو اصولی طور پر سنگین نظر آئی۔ اُنھوں نے عمومیت اور طوائف الملوکی کو لازم و ملزوم محسوس کیا۔ اب اُنکی زبانوں پر، باختلافِ مقامات و حالات، دو نعرے جاری ہوئے: فاسیت یا قومی اجتماعیت!

مصیبت یہ ہے کہ ہم نے جمہوریت کا غلط استعمال کیا، اور فاسیت و قومی اشتراکیت کو غلط تعبیری کا نشانہ بنایا! آخر الذکر سیاسی مسلکوں کے اندر مجلسی و معاشی مساوات کے جو جراثیم ہیں اُنکے انکار ناممکن ہے! فاسیت و نازیت نے بعض خدمات بھی انجام دی ہیں، اور چند اُن امراض کا علاج کیا ہے جنکے کم از کم "غیر معاشی" جمہوریت عہدہ برآنہ ہوسکی تھی۔ ان تحریکوں کے بعض علمبردار طبقۂ عوام سے اُٹھے بھی ہیں!

تاہم نظریتہً یہ دونوں سیاسی مذاہب غلط ہیں! اِن میں استبداد کی روح جاری و ساری ہے! اُنھوں نے لوگوں سے بڑے بڑے کام بلاشبہہ لئے ہیں، لیکن یقیناً اُنہیں جانوروں کے پابزنجیر گلّے بناکر!

اُنھوں نے عامۂ خلائق کو اپنے پاؤں کی جوتی بنا ڈالا، لیکن خود اُنکے طفیل میں دیوتا ہوگئے ہیں! وہ انسانی آزادی و ترقی کے جلوسِ رواں میں سنگِ گراں بن گئے ہیں! وہ بین الملی جنگ و جدل اور غرور و تفاخر کی سُنتِ دیرینہ تازہ کر رہے ہیں! انسانی انفرادیت و شخصیت ختم ہورہی ہے، اور بنی آدم ریاست کی آہنی کارگاہ کے پُرزے بن رہے ہیں!

پھر اِس چیز نے رونما ہوتے ہی اک سرکشی اور شانِ مبارزی شروع کردی! جبر و جنگ، غضب و نہب اُنکا اوڑھنا بچھونا ہے! اُنھوں نے روم، برلن، اور ویانا کو ایک ہی حصارِ حربیت کے تین بُرجوں میں ڈھال لیا ہے! اُنھوں نے بحرِ شمال سے لیکر بحرِ متوسط تک اور بحیرۂ اسود سے لیکر بحرِ اطلانطک تک اک طوفان خیز مَدّ و جزر تموج برپا کر رکھا ہے!

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اکمیہ کے یہ دہشتناک مناظر اُن جلیل الشان طَربیہ کا پیش خیمہ بننے والے ہیں! وسیع المشرب، انسانیت نواز سیاسی مسلکوں کی مزاحمت میں تنگ نظر اور تنگ دل قومی و وطنی تحریکیں ہمیشہ صف آرا ہوئی ہیں! وہ قوم پرست ہونگی، لیکن عوام کُش بھی ضرور ہوتی ہیں! موجودہ کشمکش اسقدر قوموں اور حکومتوں کے درمیان نہیں جسقدر کہ غیر ارضی نظریاتِ حیات کے مابین ہے!

یورپ اِسی دَور سے دوچار رہے! بر اعظم کے عمومی میدان جنگ کے محاذ اگرچہ متعدد ہیں، لیکن "جنگ" ایک ہی ہے!

(یونان — وہ قدیم گہوارۂ عمومیت! — اُسپر ابھی حال میں اک آمریت مسلط کردی گئی ہے! بلغیریا میں معدودے چند فوجی افسر اور تعلیمیافتہ لوگ غالب آگئے ہیں، اور عوام الناس کے سیلابِ حریت و طاقت کو بزورِ شمشیر روک دینے کی قسمت آزمائی کر رہے ہیں! رومانیا میں تو اک چنگیزی وحشت و بربریت کا بازار گرم ہے: اخبارات جلائے گئے ہیں، بپردۂ شب میں قاتلانہ حملے کئے گئے ہیں، یہودیوں کو تختۂ مشقِ ستم بنایا گیا ہے، مزدوروں اور کاریگروں کو ہیبت زدہ کیا گیا ہے، عسکریت کے جلوسوں کی قاہرانہ نمائش کی گئی ہے تاکہ عوام دم بخود ہوجائیں! یوگوسلاویا میں یہ ہنگامہ پورے ۸ برس سے برپا ہے، جس کی نذر ایک تاجدار بھی ہوچکا ہے! آجکل یہ فتنہ اپنی معراج پر ہے! پولینڈ کا ماجرا بھی اپنی ستم ظریفی میں کسی سے کم نہیں، ایک مختصر فوجی جتھے نے ۳۰ ملین کی اک قوم کو مسلوب الاختیار کر ڈالا ہے! آسٹریا میں ۶ آدمیوں کا راج ۶ ملین خلقت پر ہے! اٹلی، جرمنی، اور اسپین کا حال تو بالائے عَلَم ہے ہی!)

اس عظیم میدان کارزار کے دونوں فریقوں میں سے کسی کا جھنڈا ابھی نہ بالکل سفید ہے، نہ یکسر سیاہ! بعض اوقات کمیونزم کی ادائیں فاشزم کے جلوے سے بُری طرح ملنے لگتی ہیں! تاہم تنقیح اپنے عمومی خط و خال میں صاف واضح ہے: عمومیت یا استبدادیت؟

۳- ان دو تریکی آب آرپار ٹھن گئی ہے! اک چیلنج ہے جو پیغمبرانہ للکار کی قطعیت و متانت سے گردش زدہ ہو رہا ہے! یورپ کیسے اب یہ ناممکن ہے کہ نیم آزاد رہے اور نیم غلام! آویزش شدید ہی نہیں ہے، جماعت کے ایک ایک کوچے اور گوشے میں سرایت کر گئی ہے! یہ ہمہ گیر لڑائی ہر فرد بشر کا مقدمہ بن گئی ہے! ع ہو چکے حشر کہیں قصہ ہو یکسو اپنا!

ا-ا- خ- (ماخوذ)

۱۔ **ہمایوں** اتنا پابندِ وقت ہے کہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لے کر (جب یہ جاری ہوا تھا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی۔ اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲۔ **ہمایوں** آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب "ہمایوں" مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے، اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حُسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدِ نظر نہیں رکھی جاتی۔

۳۔ **ہمایوں** کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر۔ اور مخربِ اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جا سکتا ہے۔

۴۔ **ہمایوں** کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے، اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ تنوّع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ "ہمایوں" کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔

۵۔ **ہمایوں** کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہمایوں اپنی نظیر آپ ہے۔

۶۔ **ہمایوں** صحتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷۔ **ہمایوں** میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے۔ پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸۔ **ہمایوں** ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے اور ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

۹۔ **ہمایوں** کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ **ہمایوں** کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زاید قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ صہ اور ششماہی ۳ (مع محصول) ہے

خاکسار۔ منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

بنام قوت وحیات

کلیم

آ گئے کئی صدیوں سے فسانہ اپنا
بہروں کو سنانے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ گورنمنٹ پیسو و پٹیالہ

قیمت فی پرچہ نو آنے

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ کیم

سالانہ چندہ چھ روپے

ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

دہلی

جلد سوم | فہرست مضامین جون وجولائی ۳۷ء | نمبر ۶ و ۱

اشارات

عالمگیر اخوّت کا فریب

(جوشؔ ملیح آبادی)

(۱) ہندوستان کے بعض خدا و ناداں دانشں ہمارے نوجوانوں کو یہ تعلیم دیا کرتے ہیں کہ "حب وطن" تنگ نظری اور پست مبنی کی پیداوار ہے اس سے روگردانی کر کے "عالمگیر اخوت" کے نظریّے پر عمل پیرا ہونا چاہیئے

میں اس تعلیم کے خلاف سخت احتجاج کرنا چاہتا ہوں ———

اور یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یاران طریقت کی یہ ایک نہایت ہی خوشنما اور خوش آہنگ سیاسی چال، اور گمراہ کن شاطرانہ لفاظی ہے۔

ہر پھل اپنے موسم ہی پر اچھا ہوتا ہے۔ اور ہر بات اپنے زمانے اور اپنے وقت ہی پر بھلی معلوم ہوتی ہے۔

میں ہر چند "عالمگیر اخوت" کا زبردست حامی ہوں، اور میرے تفکّر کے افق پر اولیں آفتاب اسی "عالمگیر اخوت" کا طلوع ہوا تھا۔ لیکن سر دست اسے عملی شکل میں دیکھنے کو میں برداشت نہیں کر سکتا ———

کیونکہ اس سے ہندوستان کو سخت نقصان پہنچ جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

اِس وقت دنیا کی تمام قومیں جس سیاسی بحران میں مبتلا ہیں، اُس سے ہر عاقل اخبار بیں واقف ہے ——— آجکل یہ عالم ہے کہ ہر قوم اپنی تعمیر و توسیع، اور دیگر اقوام کی تخریب و ہلاکت کی زبردست سازشوں میں اُلجھی ہوئی ہے ——— بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں اقوام عالم کے درمیان ایک ایسا آندھی میں لگی ہوئی آگ کی طرح شعلۂ جنگ یکایک بھڑک اٹھے کہ کمزور قوموں کا وجود ہی صفحۂ ہستی سے فنا ہو کر رہ جائے۔

اِن حالات میں "عالمگیر اخوّت" کے دھوکے میں آکر اگر کوئی قوم حب وطن سے بے اعتنائی برتنے لگے گی، تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جنگ کی تمام طیاریوں سے غافل ہو کر ایسی کمزور ہو جائے گی کہ طبل جنگ پر پہلی چوب پڑتے ہی سب سے پہلے اسی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

چوروں کے محلہ میں رہتے ہوئے اپنے گھر کی اس خیال سے حفاظت نہ کرنا کہ چور تو میرے ہمسائے ہیں، کہاں کی دانائی ہے؟ اور خونخوار قوموں کے درمیان رہتے ہوئے محض اس نظریّے کی بنا پر کہ دنیا کا ہر شخص ہمارا بھائی ہے، اپنے کو غیر مسلح رکھنا، کون سی دانشمندی ہے؟ آدمی تو بڑی چیز ہے، میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ جانور تک ہماری محبت کا مستحق ہے ——— اور جو لوگ جانوروں کا شکار کرتے ہیں وہ قتل عمد کے مجرم ہیں۔ لیکن میں جب جنگل میں جاؤں گا تو مسلح ہو کر جاؤں گا ——— کیونکہ میں اسے کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ بھیڑیئے اور شیر مجھے اپنی خوراک بنالیں۔

عالمگیر اخوت کا راگ ہم اس وقت چھیڑیں گے، جب انسانیت کے مطلع پر آفتاب حکمت کی گلابی روشنی نمودار ہو کر اس رزمگاہ عالم کو بزمگاہ میں تبدیل کر دے گی ——— کیونکہ اگر اس میدانِ جنگ میں جہاں توپیں چل رہی ہیں، ہم عالمگیر اخوت کا راگ چھیڑیں گے تو وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوگا ——— اور ہم بے وقت

کی راگنی الاپنے کے جرم میں ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

میرا یہ ایمان ہے کہ کبھی نہ کبھی ہم تمام کرۂ ارض کو ایک وسیع مکان، اور تمام نوعِ انسانی کو ایک دور تک پھیلا ہوا خاندان تسلیم کر کے رہیں گے، مگر یہ اُس وقت ہوگا جب یہ قدرت کا شریر ترین بچہ یعنی انسان اپنی شقاوت و خوں آشامی کی تمام حسرتیں جی کھول کر نکال چکا ہوگا

اور اسی کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تمام خونی ہنگاموں کے بعد عالمگیر اخوت کا آوازہ صرف اس قوم کے مفکرین بلند کریں گے جو دنیا کی تمام کمزور قوموں کا خون پی کر موٹی ہو چکی ہوگی۔

اس لحاظ سے بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ عالمگیر اخوت کا علم صرف آپ ہی کے ہاتھوں میں آئے، اور اس زبردست پیغام کے آپ ہی پیغمبر بنیں، تو سب سے پہلے اپنے دل کو حبِ وطن سے معمور فرما لیجئے، اور یہ سمجھ لیجئے کہ ہماری قوم کے سوا دنیا کی اور کسی قوم کو سرفرازی و برتری کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اگر حبِ وطن کا یہ جذبہ، اور قوم پرستی کا یہ شعور آپ میں پیدا ہو گیا تو دنیا کی وہ کون سی سورما قوم ہے جو آپ سے آنکھ ملانے کی تاب لا سکے گی؟ اور دنیا کی وہ کون سی قوت ہے جو آپ کو آقائے بحر و بر اور خداوند شمس و قمر بننے سے روک سکے گی؟ اور جب دنیا میں آپ ہی آپ ہوں گے تو اس وقت عالمگیر اخوت کی پیغمبری کا شرف آپ کے سوا اور کسے حاصل ہو سکے گا۔

یاد رکھئے حبِ قومی کی جراحتیں ہی ایک نہ ایک دن حبِ انسانی کے گلستاں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور عشق و محبت کی صبحیں، عداوت و نفرت کی سب سے اونچی چوٹیوں ہی سے طلوع ہوا کرتی ہیں۔

کاش کوئی سمجھے اور محسوس کرے، جو سمجھ لے گا، وہ زندہ ہو جائے گا۔ اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور جو نہ سمجھے گا، وہ مر جائے گا اور کبھی زندہ نہ ہو سکے گا۔

کچھ اپنے متعلق

(۲) ایک غلغلہ بلند ہے، ایک غوغا ہے، میرے باب میں کہ میں خدا کا منکر اور الحاد کا منادی ہوں لیکن حقیقت سے کوئی آگاہ ہی نہیں۔

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
واز درونم کس نجست اسرارِ من

ہماری شرمناک سوسائٹی ہزاروں خوفناک امراض کے ساتھ سوءظن کی وبا کا بھی سختی کے ساتھ آشکار رہے — جس قوم کو سوءظن، بدگوئی اور غیبت کی چاٹ پڑ جاتی ہے، پھر وہ حسنِ ظن اور حسنِ فکر کے قریب بھی نہیں پھٹکتی —— یہ بدگمانی اور عیب جوئی کا مرض ہم بدبخت ہندوستانیوں پر اس قدر قابو پا چکا ہے کہ اب ہمیں اس مذموم مشغلے میں روحانی لطف آنے لگا ہے۔

کسی دن امتحان کر کے دیکھ لیجئے۔ یعنی کسی شخص کے محاسن پر تقریر شروع کر دیجئے، مشکل سے دو چار منٹ تو لوگ برداشت کر سکیں گے لیکن اگر آپ نے اپنی تقریر کو ذرا بھی طوالت دے دی تو لوگ اُکتا کر محفل سے اُٹھ جائیں گے۔

اس کے برخلاف کسی محفل میں ذرا بلند آواز سے یہ کہہ کر دیکھیے کہ "صاحب سنا فلاں صاحب تو چھپے رستم نکلے" بس یہ سنتے ہی مجمع میں ہلچل پڑ جائے گی، چہرے دمک اُٹھیں گے، اور پوری محفل کی کرسیاں آپ کے قریب آ جائیں گی۔

گوشت خوار جانور کو گوشت میں جو مزا آتا ہے، وہ اور کسی غذا میں آ ہی نہیں سکتا۔ انسان چونکہ گوشت خوار جانور ہے۔ اس لئے یہ بھی گوشت کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ اور چونکہ غیبت کے معنی ہیں اپنے بھائی کا کچا گوشت کھانا، اسی لئے خونخوار و برادر کش انسان کو غیبت سے بیحد اُنس پیدا ہو گیا ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ میں سوسائٹی سے کبھی خوف نہیں کھاتا۔ سوسائٹی جب مجھے اپنی طرف پکارتی ہے، میں جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتا —— سوسائٹی کا تصور میرے ذہن میں یہ ہے کہ وہ کیچڑ اور دلدل میں کمر کمر تک اُترا ہوا ایک گروہ ہے جو ایک دوسرے پر غلاظت اُچھال رہا ہے۔ اور جب کوئی خدا کا بندہ سامنے سے گذرتا نظر آتا ہے تو وہ اُسے بھی دلدل میں پھنس جانے کی کُھلے پھاڑ کر دعوت دینے لگتا ہے۔ اور جب وہ اس کی دعوت کو رد کر دیتا ہے تو تمام مجمع اس

پر سب و شتم کرنے لگتا ہے۔

یہی حال آجکل میرا اور سوسائٹی کا ہے۔ سوسائٹی اپنی دلدل سے مجھے آواز دے چکی ہے۔ کہ "بھائی آؤ ہماری بہشت میں داخل ہو جاؤ"، اور میں حقارت سے مسکرا کر گزر چکا ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا گروہ مجھے چلا چلا کر برا بھلا کہہ رہا ہے۔

مجھے سوسائٹی سے کوئی سروکار نہیں، اُسے اپنی کیچڑ مبارک ہو میرا روئے سخن صرف ان چند افراد کی طرف ہے جو رسا ذہن اور بالغ نظر رکھتے ہیں، اور انھیں کی خاطر میں چاہتا ہوں کہ اپنے "الحاد و انکار" کی شرح کر دوں۔

ایک صاف گو اور بیباک انسان کی طرح میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں ہنوز اس قدر "صاحب دل" نہیں ہو سکا ہوں کہ "خدا" کا اقرار کر لوں، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں ہنوز اس قدر "صاحب دماغ" بھی نہیں ہو سکا ہوں کہ "خدا" کا انکار کر دوں"۔

اقرار وہ کرے جو "خدا" کا مشاہدہ کر چکا ہے۔ اور انکار وہ کرے جو حقیقت الحقائق سے روشناس ہو چکا ہے۔

میں غریب ان دونوں نعمتوں سے محروم ہوں ——— میں کس منہ سے اقرار و انکار کا آوازہ بلند کر سکتا ہوں۔

میں بیچارہ تو اس وقت تک اس سے بھی ناواقف ہوں کہ یہ خاک کے ذرات جنھیں میں روز جوتوں سے روندا کرتا ہوں در اصل ہیں کیا ——— جسے ایک ذرۂ خاکی تک کی معرفت کا شرف حاصل نہیں اس کی کیا مجال ہے کہ وہ "خدا" کے باب میں لب کشائی کر سکے۔

میں تو صرف ایک شاعر ہوں، بڑے بڑے حکمت و سائنس کے عالم اس کوچے میں عامی و جاہل نظر آتے ہیں۔

"خدا" تو فکر انسانی کی انتہائی پرواز کا مقام ہے۔ اسے جانے ہی دیجئے، میں ایک نہایت ہی معمولی سی بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ تمام عالم کے طبیب۔ وید اور ڈاکٹر اپنی متفقہ کوشش سے اسی کا جواب دے دیں کہ چٹکی لینے سے درد کیوں ہوتا ہے؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہ جواب دے سکیں گے کہ چٹکی سے چونکہ مسامات غیر طبعی طور سے کھنچنے لگتے ہیں۔ اس لئے درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ اگر میں ایک قدم اور بڑھوں، اور یہ پوچھ بیٹھوں کہ مسامات کے غیر طبعی کھچاؤ سے درد ہی کیوں ہوتا ہے ہنسی کیوں نہیں آتی، تو وہ بیچارے کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

اسی طرح اگر ان سائنسدانوں سے جو بجلی کو لونڈی بنا چکے ہیں یہ دریافت کیا جائے کہ بجلی در اصل ہے کیا، تو وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکیں گے۔

غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اب تک سیکھا ہی کیا ہے، ہزاروں برس کے مسلسل تجربوں اور لاکھوں برس کے مستقل ارتقا کے باوجود آج ہم صرف اس قابل ہو سکے ہیں کہ بعض اشیائے عالم کے اسمار اور اُن میں سے بعض کے خواص اور ان کا طریق استعمال معلوم کر سکے ہیں۔

ہر بالغ نظر جانتا ہے کہ کسی قوت کا مزاج داں ہو کر اس سے کام لے لینا اور بات ہے، اور اس کی حقیقت کا سمجھ لینا دوسری بات ہے۔

ہمارا یہ دور اسمار و خواص کا دور ہے، ابھی ہم حقیقت آشنائی کی منزل سے بمراحل دور ہیں، معلوم نہیں ہم اس اسمار و خواص کے مرحلے کو کتنی بے شمار صدیوں میں طے کرنے کے بعد حقائق اور حقیقت الحقائق کی منزل تک پہنچ سکیں گے، اس لئے اس جہل و ظلمت کے عہد میں "خدا" کے انکار یا اقرار کا مسئلہ چھیڑنا بے وقت کی راگنی اور غیر مستحسن و بے محل عجلت پسندی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

ابھی تو ہم اُن "مادی" چیزوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں جنھیں ہم اپنی زندگی کی روزانہ مصروفیتوں میں ہر صبح و شام چھوتے چکھتے، سونگھتے، دیکھتے، سنتے اور استعمال کرتے ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی ان پیش پا افتادہ چیزوں کی معرفت ہمیں کب حاصل ہو سکے گی؟ اور اس مرحلے کے سر کرنے کے بعد کسے معلوم ہے کہ ہمیں اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنے میں کتنے ہفتخواں طے کرنا پڑیں گے۔

البتہ ہم جب ان تمام عقدوں کو سلجھا چکیں گے، اس وقت بے شک ہم اس قابل ہوں گے کہ "خدا" اور "متعلقات خدا" کے الفاظ زبان پر لائیں، اور اس میدان میں تحقیقات شروع کریں۔

ہم سب ایک نہایت ہی تنگ و تاریک خانے میں پیدا ہوئے ہیں، اور پیدائش سے لے کر اب تک اسی میں بند ہیں۔ ہم میں سے

کسی نے بھی آج تک اس تہ خانے سے باہر قدم بھی نہیں نکالا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے تہ خانے اور تہ خانے کے متعلقات کو بھی ابھی تک نہیں پہچانا ہے۔ لیکن ہم بڑی دیدہ دلیری سے اس پر مباحثہ کرتے ہیں کہ تہ خانے کے اوپر فلاں شے ہے اور فلاں شے نہیں ہے۔ اور حیرتناک مصیبت تو یہ ہے کہ "تہ خانے کی چھت پر فلاں شے ہے، اور فلاں شے نہیں ہے" پر صرف مباحثے ہی نہیں ہوتے، اس سلسلے میں مکابرے مجادلے، اور مقاتلے تک کی نوبتیں آتی رہتی ہیں۔

تہ خانے کی چھت پر اب تک نہ تو "مومن" ہی جا سکا ہے "نہ کافر" لیکن تہ خانے کی چھت پر پہنچنے کے تمام ضروری مساعی چھوڑ کر یہ دانا و بینا "مومن" و "کافر" ایک دوسرے کا خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔

آپ ان دو شخصوں کی اصابت رائے اور پختگی عقل کے باب میں کیا فیصلہ کریں گے، جنہیں کوٹھے پر چڑھنا تو کجا، ابھی تک کوٹھے کے زینے تک کا کوئی ادنیٰ سا سراغ نہیں ملا ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کو مارے ڈال رہے ہیں، ایک تو یہ کہتا ہے کہ بالا خانے پر ہیرے کا چراغ جل رہا ہے، اور دوسرا لال پیلا ہو کر کہہ رہا ہے کہ نہیں وہاں تو صرف ایک کالی بھینس بندھی ہوئی ہے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو یہ فیصلہ کر کے مایوس ہو چکے ہیں کہ عرفانِ حقائق انسان کے بس کی بات نہیں، میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ یہ انسان ایک نہ ایک دن ممکن ہے اسے لاکھوں اور کروڑوں برس گزر جائیں، ایک ایسے منارۂ بلند پر چڑھ کر دم لے گا۔ جہاں سے حقائق کے تمامی جزو و کل کو وہ دیکھنے کی طرح دیکھ، اور سمجھنے کی طرح سمجھ لے گا۔ —— لیکن یہ منزل ابھی اتنی دور ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور جب تک انسانی فکر کی اس منزلِ آخر کا سواد سامنے نہ آجائے ہمارے واسطے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم "خدا" کے متعلق ایک حرف بھی زبان سے نکالیں۔

میں نہایت ہی روشن الفاظ میں پھر ایک بار یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت اس مقامِ حیرت میں ہوں، جہاں نہ تو "خدا" کا اقرار ہی کیا جا سکتا ہے۔ نہ انکار —— کس کے دماغ میں حقائق کا اس قدر بے پایاں ذخیرہ موجود ہے کہ وہ خدا کا اقرار کر لے، اور کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ انکار کر دے۔

میں اپنے اس وصف یا عیب پر بہت نازاں ہوں، کہ میں حق بات کہنے میں نہیں جھجکتا، اور مجھے اپنے ملک کے اربابِ نظر پر کم سے کم اس قدر اعتبار ضرور ہے کہ وہ مجھے ایک صاف گو انسان سمجھتے ہیں، اس لئے میں انھیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلسل کئی برس سے "حقیقت" کی تلاش اور "اسرارِ کائنات" کی جستجو میری سب سے بڑی روحانی مسرت اور ذہنی کاوش بنی ہوئی ہے —— "اسرارِ کائنات" کی تلاش و جستجو میرے واسطے اس قدر محبوب شے بن چکی ہے کہ اب میں اسے شاہد و شعر و شراب پر بھی ترجیح دینے لگا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ شبِ قدر میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے کہ آسمان و زمین سربسجود ہو جاتے ہیں، اس وقت جو بھی دعا مانگی جائے قبول ہو جاتی ہے —— اگر وہ لمحۂ اجابت اور اس لمحۂ اجابت کا ایقان مجھے میسر آجائے تو آپ کو معلوم ہے میں کیا دعا مانگوں گا؟

سونے چاندی کے پہاڑ، زر و جواہر کا انبار، شباب و حیات کی عشرتیں، تخت و تاج کے طنطنے، شہرت و ناموری کا افتخار، حسن و جمال کی برنائیاں، چشمۂ خضر و عمرِ نوح کی نعمتیں، نہیں، میں ان میں سے ایک شے بھی طلب نہ کروں گا —— میں ان میں سے ایک چیز کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا —— میں تو اس وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاؤں گا اور کہوں گا کہ اے وہ "خدائے بزرگ و برتر" جسے میں بالکل نہیں پہچانتا، مجھے بدسے بدتر اور بدسے بدترین حالت میں پہنچا دے مجھ سے میری صحت، عمر، شاعری، شہرت اور وہ ہر شے جو نوعِ انسان کو جان کے برابر اور جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر اے "ربّ العزت" اے حکیم مطلق" عطا فرما دے وہ ابدی نعمت اور بخش دے وہ دولت بیدار جسے "اسرارِ ذات" اور "رموزِ کائنات" کی آگاہی و معرفت کا نام دیا جاتا ہے۔

بہر حال میں کعبۂ معرفت کی زیارت کے لئے گھر سے نکل چکا ہوں اگر سیدھے راستے پر پڑ گیا اور

مقامِ عشق، مقامے بسے خطرناک است
معاذ اللہ اگر رہ بجامے نبری

سے عہدہ برآ ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچ گیا، تو کلاہِ فخر کج کرکے تمام دنیا کی شاہنشاہیوں پر مسکراؤں گا۔ اور اگر راستہ بھٹک کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا، پھر بھی کعبۂ معرفت کے ایک "گمراہ" نہیں "گم کردہ راہ" زائر کی طرح دل میں یہ اطمینان لئے ہوئے مروں گا کہ میں خنجرِ تحقیق کا شہید ہوں، جو تحقیق کے خنجر سے شہید ہو جاتا ہے اسے کبھی موت نہیں آسکتی

کشتگانِ خنجرِ تحقیق را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است!

قارئین ملاحظہ فرمائیں

"کلیم" کو جاری ہوئے غالباً سولہ مہینے ہو چکے ہیں۔ اس تمام مدت میں میں نے اس کی توسیع اشاعت کے لئے صرف دو دورے کئے تھے، اور وہ بھی اجرائے کلیم کی ابتدائی سہ ماہی میں۔ اور ان دو دوروں کے بعد ہی میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اب میں رسالے کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں تمام عمر ایک بار بھی جنبش نہ کروں گا۔ جس پر آج تک قائم ہوں اور تا دمِ مرگ قائم رہوں گا۔

جس کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کسی شخص سے یہ کہتے ہوئے میری روح پر چوٹ لگتی ہے کہ آپ میرے رسالے کی خریداری منظور فرمالیں۔

(۲) مروت کے خریدار مستقل خریدار نہیں ہوتے، حقیقی خریدار وہ ہیں جو اپنے ذوق سے مجبور ہو کر خود خریداری پسند کریں۔

(۳) مروت کے خریدار، ایڈیٹر کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں سے دیکھتے ہیں گویا انھوں نے اس کی سات پشتوں کو خرید لیا ہے۔

(۴) رسالے کی سرپرستی کے سلسلہ میں بعض اکابر و "امرا" اپنی تعلیم و تربیت کی خامیوں کا ایسے چھچھورے اور خوشامد طلب انداز میں مظاہرہ کرتے ہیں کہ مجھے ایک ہی وقت میں ان پر ترس بھی آتا ہے اور غصہ بھی۔

(۵) میں تاجرانہ ذہنیت سے اس قدر بیگانہ واقع ہوا ہوں کہ جتنے چندے حاصل کرتا ہوں اس سے چوگنا اپنی جیب سے صرف کر دیتا ہوں۔

(۶) اور میری طبیعت اتنی ناقابل علاج حد تک لاابالی واقع ہوئی ہے۔ کہ لوگوں سے رسالے کا چندہ وصول کرنے کے بعد جب گھر پر آکر ان کی فہرست مرتب کرتا ہوں، تو ان میں سے بعض کے نام لکھنا بھول جاتا ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خریدار چندے ادا کرنے کے بعد بھی رسالے کی زیارت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ لکھنؤ کے بعض حضرات کو یہ شکایت ہے کہ وہ چندہ دے چکے ہیں لیکن اب تک رسالہ ان کے نام جاری نہیں ہوا ہے۔

میں ان حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اور میری ان کی خدمت میں درخواست ہے کہ براہ کرم پہلی فرصت میں وہ مجھے اس سانحے سے مطلع فرما کر شکریے کا موقع دیں تاکہ پرچہ ان کے نام جاری کر دیا جائے۔

اس سرِ حیات کو سمجھا ہوں میں یہ راز
حزن از انجام ہے تو انبساط آغاز
دیتا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی
دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

جوش ملیح آبادی

شعر کی آگ

میری نظمیں آتشِ سوزاں کا ہے جن پر گماں
سُننے والے، یہ تو ہیں بھیگی ہوئی چنگاریاں

فکرِ بے پروا نے سینے سے نکالا ہے جنھیں
ناطقے نے برف کے سانچے میں ڈھالا ہے جنھیں

اُن کا اک پرتو بھی آ سکتا نہیں اشعار میں
سانس لیتے ہیں جو شُعلے اِس دلِ بیدار میں

یہ مرے نغمے نظر آتے ہیں جو تپتے ہوئے
سب کے سب ہیں شبنمِ الفاظ سے بھیگے ہوئے[1]

کیا ملے گی میری نظموں کے خس و خاشاک میں
وہ سُنہری آگ، روشن ہے جو میری خاک میں

کیا کہوں، وہ آگ، جو رگ رگ کو پگھلاتی ہوئی
دوڑتی پھرتی ہے اِس سینے میں بَل کھاتی ہوئی

الاماں وہ سوزِ پنہانی جو میرے دل میں ہے
آہ اُس شُعلے کی عُریانی جو میرے دل میں ہے

ولولے اِس رُوح کے آتے ہیں جب ہیجان میں
سنسناہٹ آنچ کی آتی ہے میرے کان میں

بجلیاں میری اگر کھنچ آئیں میرے راگ میں
ناطقہ تبدیل ہو جائے دہکتی آگ میں

سُننے والے جل اُٹھیں، شورِ فغاں اُٹھنے لگے
پڑھنے والے کی رگ و پے سے دُھواں اُٹھنے لگے

نقطہ نقطہ برقِ خاطف بن کے ضَو دینے لگے
حرف گل جائیں لبِ گفتار لَو دینے لگے!

جوش ملیح آبادی

[1] میں ایطا کا پابند نہیں۔

معصوم گناہ گار

مست و مے نوش مجھ کو کہتے ہیں　　　معصیت کوش مجھ کو کہتے ہیں

ہر قدم پر گناہ کرتا ہوں　　　اور پھر بے پناہ کرتا ہوں

میں ہوں اور مطربانِ عشوہ طراز　　　روزہ کیا شے ہے اور کہاں کی نماز

نہ غلامی میں اور نہ طاعت میں　　　لطف ہے تو فقط بغاوت میں

کعبے کتنے ہی ڈھا دیئے میں نے　　　سیکڑوں بت بنا دیئے میں نے

منزلِ عمر تھی بہت بھاری　　　بتکدوں میں گذار دی ساری

آبِ کوثر سے مجھ کو نفرت ہے　　　آتشِ تر سے دل کو رغبت ہے

میری نظریں ہیں روئے فطرت پر　　　گامزن ہوں رہِ مشیت پہ

رات دن خوب ڈٹ کے پیتا ہوں　　　ڈٹ کے پیتا ہوں اور جیتا ہوں

میرا ماضی و حال ہے مخمور　　　جسم کا بال بال ہے مخمور

میری فردِ عمل سیاہ سیاہ　　　جس طرف دیکھئے گناہ گناہ

پھر بھی دل میرا داغ دار نہیں　　　میں کسی طرح شرمسار نہیں

دل میں رکھتا نہیں کسی سے عناد　　　میرے ذمہ نہیں حقوقِ عباد

مجھ کو آتی نہیں ریاکاری　　　مجھ سے ممکن نہیں دل آزاری

روح میری لطیف و طاہر ہے　　　جیسا باطن ہے ویسا ظاہر ہے

مطمئن ہوں کہ "دیندار نہیں"
"آدمی کا گناہ گار نہیں"

ص ۔ کنبو

انقلاب

صہبائی، بی اے۔ (آنرز)

انسانی سوسائٹی میں ایسے نازک دَور بھی آتے ہیں جب "انقلاب" ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے۔ نئے نئے خیالات سوسائٹی کے افراد میں پیدا ہو جاتے ہیں، جو عمل کے لئے میدان ڈھونڈھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی نظری و تخئیلی ہیئت کو زندگی کا حقیقی اور عملی مفہوم بنا دینا چاہتے ہیں۔ ہر سمت سے وہ لوگ ان نظریات اور تصورات کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ جن کی اغراض کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ قدیم نظام ہی برقرار رہے۔

رفتہ رفتہ نظام کار، نظامِ حکومت اور نظامِ اخلاق، مسلمہ قوانین سماجی توازن، انسانوں کے اقتصادی، ازدواجی اور سیاسی رشتے، کوئی شے بھی نکتہ چینی اور تنقید سے محفوظ نہیں رہتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے وضع کردہ آئینِ اخلاق اور سوشل نظام کی عظمت و وقعت میں بتدریج کمی آجاتی ہے، عام لوگ گھروں میں، سڑکوں پر، ہوٹلوں میں اور اخبارات و مفکرین بھی یہی وطیرہ اختیار کر لیتے ہیں۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی ادارے کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ سوسائٹی کا پورا خاکہ ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ گویا دنیا انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں رہی ہے۔

کھلم کھلا ایک نئی زندگی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آئینِ اخلاق جو لوگوں کی روزانہ زندگی میں سب سے زبردست حاکمانہ طاقت ہوتے ہیں۔ اب ناکافی نظر آتے ہیں، جو امر پہلے مبنی بر انصاف تھا وہی اب مثلاً ظالمانہ ناانصافی قرار دیدیا جاتا ہے۔ سابقہ اخلاقیات اب محض بد اخلاقی کے آئینہ دار بن جاتے ہیں اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں جدید نظریات اور پرانی رسوم کا تصادم شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ باپ کے خلاف گھر میں بیٹا انھیں امورِ غیر فطری اور رجعت پسندانہ ظاہر کرتا ہے۔ جن کو اُس کا باپ اب تک شاہراہ عمل بنائے رہا تھا۔

عوام کا ضمیر کبھی متمول لوگوں کے اعمال و اقوال پر احتسابی نظر ڈالتا ہے۔ اُن کی حرکات و سکنات اب گناہ تصور کی جاتی ہیں۔ جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا حساب ہو رہا ہے۔ بڑی بڑی تنخواہیں لینے کے لئے آرام کے ساتھ دولت سمیٹنے کے لئے، اپنے تجارتی اور کاروباری تحفظ کے لئے اپنے مفاد کا جائز و ناجائز خیال رکھنے کے لئے لوگ "قانون اور آئین" کی آڑ لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جو جدید نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جو نئے خیالات کی ترویج چاہتے ہیں جو آئینِ اخلاق کو پاش پاش کر کے اُس کی جگہ کو نئے ضابطۂ اخلاق سے پُر کرنا چاہتے ہیں جو سماج کی ناانصافیوں کو دور کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس بات سے آگاہ کئے جاتے ہیں۔ بلکہ جمہور کی جانب سے مجبور کر دئے جاتے ہیں کہ وہ سوسائٹی جس کی تشکیل موجودہ بنیادوں پر ہوئی ہے اُن کے خیالات کی ترجمان نہیں بن سکتی۔

انقلابی عنصر کے دلائل

انقلابی عنصر کے دلائل یہ ہوتے ہیں کہ اقتصادی اور معاشی ادارے جن کے قبضے میں پیداوار اور تبادلے کی خدمات کے انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ سوسائٹی کے لئے رفعت، بہبودی، روٹی اور امن کا قرار واقعی انتظام نہیں کر سکتے جس کی پوری ذمہ داری اُنھیں پر ہے۔ بجائے اُن داماں کے وہ ایک عام اضطراب کی وجہ بن گئے ہیں۔ "خوشحالی" کے بجائے اُن کی لائی ہوئی برکت افلاس ہے۔ بجائے مفاہمت کے جنگ۔ بجائے ترقی کے انحطاط اور بجائے ترقی کے لوٹ مار اُن کی خصوصیات بن گئی ہیں۔

سوسائٹی روز بروز دو بڑے حریف طبقوں میں تقسیم ہوتی جا رہی ہے "سرمایہ دار اور مزدور" ـــــــ غریب اور مفلس مزدور کسان بھی ہوتا ہے اور صنعتی مزدور بھی جس کی محنت کا ثمر سرمایہ دار ہضم کر جاتا ہے۔ سرمایہ دار ایک قلیل طبقہ ہوتا ہے، جو دولت کو کبھی وراثت میں، کبھی جائداد کی شکل میں اور کبھی کرنسی یا زیور کی شکل میں تجارت اور تبادلہ سود اور منافع سے حاصل کرتا ہے۔ تاہم ایک چیز اپنی جگہ پر اٹل ہوتی ہے کہ سرمایہ کی پیداوار میں جو محنت صرف ہوئی ہے وہ اُس کثیر التعداد طبقہ کی ہے جو مزدور یا مزدور کسان ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنی محنت کے پورے معاوضہ کو سرمایہ کی طاقت کے مقابلہ میں حاصل کرنے میں ناکام ہوتا ہے۔ یہیں ایک عظیم الشان اکثریت اور حقیر اقلیت کے مفاد کا تصادم ہوتا ہے جس میں محروم و مظلوم اکثریت ہوتی ہے اور اس فرسودہ اقتصادی نظام کو برداشت کرتے کرتے اُس میں "روح انقلاب" پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر کبھی دو بڑے حریف طبقے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے خلاف اپنے مفاد و اغراض کی جنگ جاری رکھتے ہیں اس جنگ سے تھک کر سوسائٹی ایک جدید آرگنائزیشن کی تلاش کرتی ہے، بہ بانگِ دہل جائداد اور وراثت کے مروجہ نظام کی از سرِ نو تنظیم چاہتی ہے۔ پیداوار تبادلہ اور تمام اقتصادی تعلقات نئے قائم کرنا چاہتی ہے، جن کی رو سے زیادہ سے زیادہ پسماندہ انسان زیادہ سے زیادہ خوشحال ہو سکیں۔

حکومت میں انقلاب سے پہلے

ایسے اسباب میں حکومت کی مشینری جو موجودہ سماجی نظام کو برقرار رکھنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اگرچہ اب بھی اپنی ذمہ داریاں انجام دیتی رہتی ہے، لیکن اُس کا مسلسل جاری رہنا رفتہ رفتہ دشوار ہونے لگتا ہے اور اُس کی خرابیاں جو عام بے اطمینانی کا سبب ہوتی ہیں اطمینان پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ ہر صبح ایک نئے مطالبہ سے شروع ہوتی ہے۔ "اس کی اصلاح کرو، اُس کی اصلاح کرو"۔ یہی آوازیں ہر سمت سے سنائی دیتی ہیں۔ جنگ، آمدنیات، محاصل۔ عدالتیں، پولیس ہر شعبۂ حکومت کے متعلق مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اُسے نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے اُس کی تنظیم و اصلاح از سرِ نو ہونی چاہیئے۔ باوجود اس کے بھی ہر شخص جانتا ہے کہ صرف اِن مطالبات سے عام بے اطمینانی کو دُور نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شے کی مطلوبہ تنظیم جدید پیمانہ پر ہوتا، اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک ایک کا دوسرے سے اندرونی تعلق قائم و برقرار ہے۔ اس طرح ہر چیز کا بیک وقت دوبارہ نظام قائم کرنا ضروری ہو جائیگا اور اس مقصد کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں، جب تک دو بڑی حریف جماعتیں "سرمایہ دار اور نادار" موجود ہیں اور اس طرح ایک کی بے اطمینانی کا ازالہ دوسرے کی بے اطمینانی کا سبب بن جائے گا۔

حکومت ہر اصلاح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ساتھ ہی وہ یہ جرأت بھی نہیں رکھتی کہ کھلے الفاظ میں اپنی رجعت پسندی کا اعلان کر دے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ "اصلاح" اور رجعت پسندی کے بین بین راستہ اختیار کرتی ہے جس سے کوئی جماعت مطمئن نہیں ہوتی اور ایک نئی اور عام بے اطمینانی کا جس کے اندر نفرت و حقارت ہو آغاز ہو جاتا ہے۔ متوسط طبقہ کے رجعت پسند جو اس مرحلہ پر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیکر اُسے سنبھالنے کی ذمہ داری لیتے ہیں صرف ایک خیال اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں یقینی یہ کہ اپنے آپ کو آنے والی مصیبت سے محفوظ رکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ محفوظ و مامون بنا لیں۔ اس لئے وہ بیدریغ دولت سمیٹنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب ہر چہار جانب سے اُن کی دست درازیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے تو وہ نہایت بھدے پن سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ غلطیوں پر غلطیوں کا ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نجات کے آخری زینہ کو بھی شکست کر دیتے ہیں۔ حکومت کی آن یا "پرسٹیج" کو ان کے ناشائستہ اعمال اور ناواجب طریقۂ کار سے سخت دھکا لگتا ہے اور اُن کی نالائقی سے ہر طبقہ میں حکومت ہدفِ تحقیر و ملامت بن جاتی ہے، ایسے دَور میں سوسائٹی انقلاب کا مطالبہ کرتی ہے اور انقلاب حقیقی مفہوم میں ایک سوشل اور ذاتی ضرورت بن جاتا ہے۔

امریکہ اور فرانس کے انقلابات

اگر ہم دنیا کے بڑے بڑے انقلابات کے تاریخی اسباب کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ واقعی انقلاب ناگزیر تھا۔

مثال کے طور پر ۱۷۸۹ء سے پہلے فرانس کی حالت دیکھئے۔ انقلاب

فرانس کو ایک آتش فشاں پہاڑ کی مشتعل حالت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس نے یورپ کے ہر ہر گوشہ کو لرزہ براندام کر کے اُن قدیم خیالات اور دقیانوسی اصولوں کو پاش پاش کر دیا جو اُس وقت تک تاجدارانِ یورپ کے تخت و تاج کے محافظ تھے۔ تاریخ کا یہ یادگار واقعہ اُن خرابیوں کی پیداوار تھا جن میں فرانس کی مخلوق مدت سے گرفتار تھی اور تقریباً دو صدیوں سے شخصی حکومت کے استبداد اور چیرہ دستیوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ یہ خرابیاں مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت دکھائی جا سکتی ہیں۔

(۱) مطلق العنانی کی خرابیاں۔

ایک بدچلن اور بدکردار مغرور اور سرکش فرمانروا کے عہد میں (جیسا کہ لوئی شانزدہم کا عہد تھا) حکومت انتہائی غیر محتاط اور ظالمانہ اصولوں پر کی جا رہی تھی۔

(۲) غیر مساویانہ سوشل نظام۔

جس میں فرانس کی سوسائٹی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور ان کو "مستفید" اور "غیر مستفید" کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے معنی میں یوں کہنا چاہیئے کہ ایک جماعت دولت آفرین تھی دوسری دولت سے فائدہ اُٹھانے والی۔

(۳) فیوڈل سسٹم یا جاگیرداری۔

جاگیردار اور سردار بھی نہ تو درباری لالچیوں سے زیادہ حیثیت رکھتے تھے نہ اُن کا رویہ ہی بہتر تھا۔ وہ کسانوں سے محاصل بے انتہا سختیاں کر کے وصول کرتے تھے۔

(۴) مذہبی پیشوا۔

رومن کیتھولزم جو فرانس کا عام مذہب تھا اس زمانہ میں حد درجہ بداخلاقی کا آئینہ بنا ہوا تھا اور بشپ و چرچ کے دیگر اعلیٰ عہدہ دار بڑی بڑی تنخواہیں پا رہے تھے اس لئے وہ بھی مستفید طبقہ کے شریک تھے اور تموّل کی وجہ سے انتہائی عیش و فراغت بلکہ بدچلنی کی زندگی گزار رہے تھے۔

(۵) محاصل میں عدم تناسب۔

درباری امراء، جاگیردار اور مذہبی پیشوا سب محاصل سے بری تھے۔ صرف غیر مستفید ہی ایسا تھا جو بادشاہ کو، جاگیردار کو اور کلیسا کو علیحدہ علیحدہ محاصل ادا کرتا تھا اور اس بوجھ میں دبا جا رہا تھا۔

(۶) قومی ذلت۔

علاوہ ازیں ایک وجہ وہ قومی ذلت بھی تھی جو "ہفت سالہ" جنگ میں شکست ہو جانے کی وجہ سے حامیانِ انقلاب کی بیداری اور شخصی حکومت سے علانیہ بیزاری کا سبب بن گئی تھی۔

دوسری مثال انقلاب امریکہ کی بھی ہمارے سامنے ہے یہ انقلاب امریکہ میں بصورتِ جنگِ آزادی رونما ہوا۔ اور اس کے اسباب بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ انگلستان نے نوآبادیات پر محاصل کا نفاذ کرنا چاہا تھا۔ امریکی نوآبادیات نے ان محاصل کی مخالفت کی۔ فرانس نے (جو انگلستان کا حریف اور اس وقت اس ملک سے برسرِ جنگ تھا) درپردہ نوآبادیات کی پوری پوری مدد کی، آخر کار لارڈ کارنواس کو ۱۷۸۱ء میں بمقام یارک ٹاؤن مکمل شکست ہوئی، انقلاب کامیاب رہا۔ اور ۱۷۸۳ء میں معاہدہ ورسائی کی رو سے امریکہ کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا۔

انقلابِ روس

روس کا انقلاب اکتوبر بھی انقلاب فرانس کی کڑی ہے۔ زار کی حکومت تقریباً تین صدیوں سے مطلق العنانی اور استبداد کی ایک بدترین مثال تھی۔ دربار قطعاً بداخلاقیوں اور سازشوں کا مرکز تھا۔ زار نکولس دوم نے اپنے باپ الگزینڈر سوم کی روایات اور پالیسی کو برقرار رکھا تھا، حکومت نہ تو آئینی حکومت تھی نہ اُس کے اندر مسلمہ قوانین ہی موجود تھے۔ زار کی شخصیت مختارِ مطلق تھی۔ لبریزم اور آزاد خیالی کی ہر علامت انتہائی تشدد کے ساتھ ختم کر دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ انفرادی طور پر بھی کوئی انسان قید و بند کے خطرات سے محفوظ نہ تھا اور ہاں فن لینڈ کے باشندے غلامی اور امپیریلزم کی زنجیروں میں تڑپ رہے تھے۔ اس ملک کو ۱۸۰۹ء میں فتح کیا گیا تھا۔ لیکن الگزینڈر اول کے عہد ہی میں اس کو ایک آئین عطا کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ آئین بھی چھین لیا گیا۔

روس کے اس جابرانہ نظم و آئین میں ظاہر ہے کہ مظلوم اور رعیت کے حرف تشدد ہی سے خاموش کئے جا سکتے تھے۔ فراغت اور اطمینان کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ انھیں حالات میں ۱۹۰۴ء کے اندر روس نے جاپان کے ہاتھوں بدترین شکست کھائی شخصی حکومت کا وقار اس شکست نے ختم کر دیا۔ لوگوں میں عام طور پر آئینی حکومت، آزادیٔ تحریر، آزادیٔ پریس، اور آزادیٔ تقریر کی

جہاں اجتماعات پر سے پابندی اُٹھا لینے کا مطالبہ عام ہوگیا۔ مطالبہ کی نوعیت اتنی شدید تھی کہ قومی جماعت (منسویک پارٹی) نے جس میں کیمونسٹ اور تمام انتہا پسند شامل تھے ۱۹۰۵ء میں مسلح انقلاب کرنے کی کوشش کی۔ انقلاب پسندوں کو اگرچہ کامیابی نہ ہوسکی۔ لیکن زار کو مجبور ہو کر ۱۹۰۶ء میں ایک نمائندہ اور آئینی مجلس کی تشکیل کرنی پڑی۔ لیکن دوسرے ہی سال اس اسمبلی (ڈوما) کے حلقہ رائے دہندگی کو بالکل محدود کر دیا گیا اور ڈوما بجائے ایک مجلسِ قانون ساز ہونے کے ایک استصوابی جماعت رہ گئی۔ اس طرح عوام کی سیاسی جدوجہد اگرچہ ختم سی ہو گئی لیکن بے اطمینانی ہمیشہ کی طرح اب بھی افقِ ملک پر چھائی ہوئی تھی۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو روس نے جنرل فان ہنڈنبرگ کے ہاتھوں ۱۹۱۵ء میں بڑی ہی ذلیل شکست کھائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں روسی افواج کے ایک لاکھ آدمی قتل اور زخمی ہوئے۔ عوام نے اس ناکامی کو بھی زار کی حاکمانہ خرابیوں پر محمول کیا اور ظاہر ہے کہ غریب عوام سوائے حکومت کے کسی سے شکایت نہیں کرسکتے ہیں۔ اب پھر روس بھر میں ایک عام مطالبہ نظام کی فوری تبدیلی کے متعلق پیدا ہوا۔ زار نے توجہ نہ کی جس نے آخرکار انقلاب ۱۹۱۷ء کی شکل اختیار کرلی۔ آخری زار نکولا دوئم تخت سے دستبرداری پر مجبور ہوا۔ روس اب ایک سماجی نظام سے دوسرے سوشل سسٹم میں منتقل ہو رہا تھا۔ ملوکیت سے اشتراکیت تک کا زمانہ جو "دورِ انتقال" کہا جاتا ہے انارکزم، بے آئینی فوجی حکومت اور اخلاق سوز عہد نظر آتا ہے۔ لیکن لینن اور ٹراٹسکی نجات دہندہ بن کر آئے اور بالشوزم ملک کا آئندہ نظام قرار پایا۔ ہزاروں سوویٹ یعنی پنچائتیں جو مزدوروں، سپاہیوں، اور کسانوں پر مشتمل تھیں ملک کی حاکمانہ طاقتیں تسلیم کی گئیں۔ اور پرولتاریہ جماعت کی ایک ڈکٹیٹرشپ قائم کر دی گئی۔

ہسپانیہ میں خلافتِ امویہ کا خاتمہ

ہسپانیہ میں مسلمانوں کی سلطنت کا حشر بھی ایسے ہی اسباب پر مبنی تھا۔ ہسپانیہ ہمیشہ سے ایک مسیحی اور یورپین ملک ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ عیسائیوں پر مشتمل رہا ہے۔ مسلم آبادی کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ یا تو وہ لوگ مسلمان تھے جو ابتدائی زمانہ میں آئے تھے، یا وہ جو مسلمانوں کی ساڑھے چارسو سال کے دورِ حکومت میں مسلمان ہو گئے تھے۔ مطلق العنانی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے آخری دور میں عیش و عشرت کا وہ دور طاری تھا کہ اُنھیں دن اور رات کی بھی خبر نہ رہی تھی۔ ملک کی عام آبادی بھوک پیاس سے "الجوع الجوع" پکار رہی تھی اور تمام عیسائی آبادی خلافت غرناطہ کے آخری حاکم کے خلاف بغاوت اور انقلاب کی سازشوں میں مصروف تھی۔ آخرکار ہمسایہ عیسائی حکومت کا زبردست اور طاقتور فرمانروا عیسائیوں کی تائید و حمایت کا سہارا لیکر چڑھ دوڑا، اور ۱۴۹۲ء میں فرڈیننڈ ڈیوک آف اراگن نے غرناطہ کی خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد پھر اسپین کے گزشتہ چھ سالہ واقعات پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہم کو ایسے ہی حالات نظر آئیں گے۔ جنگِ عظیم کا ردِ عمل اور اقتصادی پستی کا نازک دور اگرچہ اسپین میں بیکاری اور افلاس کا ذمہ دار تھا، لیکن شاہ الفانسو کی حکومت حالات کا مقابلہ نہ کرسکی۔ انقلاب کی کھچڑی اندر ہی اندر پکی اور ۱۹۳۲ء میں یہ آگ سوشیلسٹ اور جمہوریت پسندوں کے تعاون سے ایک کامیاب انقلاب کی شکل میں بھڑک اُٹھی اور شاہ الفانسو کو فرار ہو جانا پڑا۔

انقلابِ ٹرکی اور سلطنتِ عثمانیہ

یوں تو انقلابِ ٹرکی کی اصل بنیاد جنگِ کریمیا (۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۶ء) سے پڑتی ہے۔ جبکہ صحیح معنے میں، خلافتِ عثمانیہ کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے یورپ کی بڑی بڑی حریف طاقتیں "مسئلہ ترک" پر برسرِپیکار آئیں اور اسی کے بعد ۱۸۷۶ء و ۱۸۷۷ء کی دو بڑی لڑائیاں روس اور رومانیہ سے ہوئیں، اسی وقت سے یورپین طاقتیں سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں برابر دخیل رہیں۔ اس دخل درمعقولات کے خلاف اور حکومت کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے صحیح انقلاب کا جذبہ ۱۹۰۸ء میں "نوجوان ترک" کی تحریک سے شروع ہوا۔

اس انقلابی لیکن آئین پسند جماعت نے ۱۹۰۸ء میں خلیفہ عبدالحمید ثانی کے تعیش، درباری بدنظمیوں، اقتصادی اور سیاسی کمزوریوں اور فوج کی بے عنوانیوں کے خلاف شدید احتجاج کیا اور رعایا کے بہت بڑے طبقے کی تائید و حمایت سے ایک مؤثر لیکن غیر مسلح انقلاب کامیابی کے ساتھ

کرا دیا اور سلطان عبدالحمید ثانی کو مجبور کیا کہ وہ ایک آئین کی منظوری دے، آئین منظور کر لیا گیا۔

چار سال تک "نوجوان ترک" آئین کی رُو سے ترکیہ کے سیاہ و سفید کے مختار رہے۔ لیکن حقیقتاً یہ جماعت جمہوری جماعت کہلانے کے باوجود بھی عام اقتصادی بے اطمینانی کو رفع نہ کر سکی۔ علاوہ ازیں مذہبی اعتبار سے بھی اس جماعت کی پالیسی نہایت مذموم رہی۔ سیاسیات میں مذہب کا داخلہ ہمیشہ ایک قوم کی متحدہ تنظیم کے لئے خراب اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوا ہے۔ سلطنتِ ترکیہ اس وقت بلقان کی چھوٹی چھوٹی بہت سی ریاستوں اور قوموں پر اقتدار و قبضہ رکھتی تھی۔ "نوجوان ترک" جماعت نے اتنے مختلف عناصر کو ایک اسلامی اور ترکی سانچہ میں ڈھالنا چاہا۔ محکوم قومیں بے طرح تشدد کا شکار تھیں۔ اُن کے اقتصادی حقوق چھین لئے گئے تھے۔ مقدونیہ اور البانیہ کی ریاستوں پر اُن کے مظالم خاص طور پر شدید تھے، اس غیر ضروری تشدد نے جو زیادہ تر مسیحی رعایا پر ہو رہا تھا ٹرکی کی تمام محکوم اقوام میں ایک عام بے اطمینانی پیدا کر دی۔ تمام عیسائی سلطنتیں ٹرکی کے خلاف متحد ہو گئیں، اور اس سے فائدہ اُٹھا کر اطالیہ نے ۱۹۱۱ء میں اعلانِ جنگ کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ "مردِ بیمار" کے ہاتھوں سے طرابلس کا پورا علاقہ نکل گیا۔

دیگر ریاست ہائے بلقان نے بھی اس عام بے اطمینانی کے پیش نظر ٹرکی کے خلاف متحدہ اعلان کر دیا۔ مانٹی نگرو، سردیا۔ بلغاریہ اور یونان نے مسیحی رعایا پر مظالم کا بہانہ کر کے ہر چہار جانب سے یورش کر دی۔ یہ طاقتیں مقدونیہ کو ترک کر کے آہنی پنجہ سے نجات دلانا چاہتی تھیں۔ ترکوں کو تقریباً ہر جگہ شکست ہوئی اور غالباً دو ماہ میں سلطنت عثمانیہ یورپ کے اندر صرف قسطنطنیہ کے آس پاس محدود رہ گئی۔ یورپ کی بڑی طاقتیں جو جنگ کریمیا وغیرہ میں ترکی کے معاملات کے اندر دخیل ہوتی تھیں خاموش رہیں۔ لیکن صلحنامہ لندن کی رُو سے ۱۹۱۳ء میں ٹرکی کو قسطنطنیہ کے گرد اتنا علاقہ دیدیا گیا کہ وہ بندرگاہ اور شہر کو محفوظ رکھ سکے۔

"نوجوان ترک" ۱۹۰۸ء سے برسر اقتدار ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں جنگِ طرابلس کے بعد اُن کا زوال ہو گیا۔ گویا اب پھر ترکی اندرونی انقلاب کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اُس کے اقتصادی ذرائع اور ذرائع پیداوار محدود ہو گئے تھے اور رعایا میں اب بھی ایک عام بے اطمینانی نمایاں تھی۔ اسی اثنا میں ۱۹۱۴ء کی کسی جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ اس جنگ نے ترکی کو ایشیائی مقبوضات اور مصر پر جو اقتدار تھا اُس سے بھی محروم کر دیا۔ شخصی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کمزور کو زیادہ کمزور دیکھکر اتحادی طاقتیں تو یہ چاہتی تھیں کہ ترکی کا صفحۂ ہستی ہی سے خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن "کمالی انقلاب" نے ترکی کو بچا لیا۔ ۱۹۲۱ء کی جنگ جو سمرنا کے مقام پر یونانیوں کی مکمل شکست میں ظاہر ہوئی ٹرکی کی قسمت کا پلٹا تھی اس کے بعد کمال کی انقلابی حکومت نے اقتصادی پروگرام پیش کیا۔ بلاقید نسل و مذہب ترک رعایا کے روٹی کا سوال حل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور وہ کامیاب رہا۔ آج یورپ کا "مردِ بیمار" یورپ کی طاقتوں کے سامنے باوجود غیر ملکی مقبوضات نہ ہونے کے بھی برابری سے سر اُٹھا سکتا ہے۔ انقلاب ٹرکی ۲۱-۱۹۲۲ء کامیاب رہا اور ردِ انقلاب کامیاب تر۔

ہندوستان میں انقلابی ذہنیت

ہندوستان اب تک غیر ملکی ملوکیت کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور اپنی مکمل نجات حاصل نہ کر سکا ہے۔ لیکن قوم پرست ہندوستان میں بھی ایک عجیب انقلابی ذہنیت بیدار ہو گئی ہے۔ نہ صرف ترقی پسند مزدور

لہ فروری ۱۹۳۶ء تک ۱۹۳۱ء کے انقلاب کے بعد ہسپانیہ کی سیاسی حالت بہت ہی غیر متوازن اور نازک رہی ہے۔ انقلاب کے بعد پارلیمنٹری آئین رائج کر دیا گیا۔ اور ہسپانوی پارلیمنٹ یا (Cortes) میں متعدد سیاسی جماعتیں طاقت حاصل کرنے کی کوشاں رہیں۔ جن میں سب سے اہم جماعتیں دیما کریٹک نیشنلسٹ، ملوکیت پسند، فیسسٹ اور کیتھولک ایک جتھہ میں شامل تھیں دوسرے گروہ میں کمیونسٹ، سوشیلسٹ اور تمام انتہا پسندانہ جماعتوں کا شمار کرنا چاہیئے۔ فروری ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں پارلیمنٹ کے اندر آخر الذکر جماعتوں کو بڑی بھاری اکثریت نصیب ہوئی اور امید بندھنے لگی کہ اب ہسپانیہ میں ایک نوعیت کا نظام استوار بنیادوں پر رائج ہو جائیگا لیکن محروم و ناکام جماعتوں نے مسلح انقلاب کے ذریعہ جنرل فرانکو کی سرکردگی میں آئینی حکومت کو اُلٹ دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور فیسسٹ ممالک جرمنی اطالیہ و پرتگال فرانکو کی
[illegible]

اداروں اور کسانوں کی انجمنیں اس کا ثبوت دے رہی ہیں۔ بلکہ گزشتہ پچاس سال میں عموماً اور بیس سال میں خصوصاً ایک غیر مسلح قوم میں جو امپیریلزم کے استبداد کا شکار ہو عدم تشدد کے عجیب فلسفہ نے ایک تحریک عامہ کی شکل اختیار کر لی ہے جس کو کسی طرح نیم انقلابی کیفیت سے تعبیر کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

ہندوستان اپنے مذہبی اور معاشرتی اختلافات کے باوجود اور رجعت پسندانہ طاقتوں کی ایک عظیم الشان مزاحمت کے مقابلہ میں جس تیز رفتاری کے ساتھ اپنی آزادی اور سیاسی و اقتصادی محکومی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہا ہے وہ اُس کے سفید فام آقاؤں کے لئے بھی ایک زبردست درس عبرت ہے۔ اور یقیناً اُس انقلاب پسندانہ مکمل تبدیلی کا نتیجہ ہے جو ہر محکوم اور افلاس سے ماری ہوئی قوم میں پیدا ہونا ضروری ہے۔

سیاسی وقار اور سیاسی اقتدار بھی ایک آزاد قوم کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی بھوک سے بلکتی ہوئی ۳۵ کروڑ آبادی کا سب سے اہم اور سب سے جلد طے کیا جانے والا مسئلہ اُس کی عام بے روزگاری۔ عام افلاس اور عام اقتصادی و معاشی مشکلات ہیں اور یہی وہ محرکات ہیں جو ہندوستانی سماج کے ہر ہر فرد کے اندر ایک انقلابی ذہنیت کو بیدار کرکے ملوکیت کے پنجۂ آہنی سے ملک کو جلد از جلد نجات دلا دینا چاہتے ہیں۔

انقلاب کا مشترک پہلو

ان انقلابات کے مجمل حالات پر گہری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک مشترک پہلو ہے جو "اقتصادی اور معاشی" بے اطمینانی کی غیر متوازن پیداوار ہے۔ ایک ملک میں جب اندرونی انقلاب ہوا ہے اقتصادی بے اطمینانی اس کا اہم عنصر رہی ہے۔ ترکی اور ہسپانیہ کے انقلابات میں اگرچہ ایک مذہبی پہلو بھی شامل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت سطحی ہے۔ ان انقلابات کا بھی اگر کامل تجزیہ کیا جائے تو یقیناً اقتصادی بنیاد مستحکم اور استوار نظر آئے گی۔ ہسپانیہ میں خلافتِ غرناطہ کی زیادہ آبادی عیسائی تھی۔ بلقان میں بھی ترکوں کے زیر اثر تمام عیسائی تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ صرف حکومت کے اسلامی ہونے کے باعث ساری آبادی افلاس نا استبداد کا شکار بن جائے۔ اور اپنے حال پر قناعت کرکے خاموش رہتی۔ اقتصادی حیثیت سے جب قومیں زوال کے آخری مرحلے طے کرتی دکھائی دیتی ہیں، اُسی وقت اُن میں بیداری اور ذہنی انقلاب کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کلیہ ہے کہ کائنات کی اُس مخلوق کو جو "اشرف المخلوقات" کہلاتی ہے۔ سب سے پہلے روٹی۔ پھر امن۔ پھر آزادی "جملہ ضروریاتِ زندگی سے اہم معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ بہر طور حاصل کرنے کے لئے فطرتاً مجبور ہے۔ ایک گھر میں انھیں ضرورتوں کا معاملہ اولاد کی بغاوت کا سبب ہوتا ہے۔ سوسائٹی میں افراد اسی بنا پر اپنی احتجاجی آواز بلند کرتے ہیں اور حکومتوں میں انقلاب اسی بنا پر ہوتا ہے۔

لوگوں کی حالت انقلاب سے پہلے

انقلاب سے پہلے عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ حکومتِ وقت کا ہر کام اُن کے نزدیک قابلِ اعتراض ہوتا ہے۔ وزارتوں کی تحریکات اور ارکانِ حکومت کے مرتبہ قوانین انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتے وہ ایک مسلسل شکایت محاصل میں اضافہ کی کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ لگان کی ادائگی کو ایک عذابِ الٰہی سے کم تصور نہیں کرتے۔ شہر کے بیکار گرانی کے اور کسان ارزانی کے شاکی ہوتے ہیں۔ گاؤں کے چوکیدار کی حیثیت بادشاہ سے کم نہیں ہوتی، حتیٰ کہ پوسٹ مین تک کی ذمہ دار حکومت ہی قرار دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ایسے حالات جس قدر بڑھتے جاتے ہیں لوگ یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ "ظلم زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں رہ سکتا"

قول و عمل کا فرق

لوگوں کی ان زبانی دلیلوں میں اور انقلاب میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی ہے، وہ خلیج عقل و عمل، خیال اور عزم کے الفاظ سے ظاہر کی جا سکتی ہے۔ لیکن دیکھو یہ خلیج کس طرح پُر ہوتی ہے؟ کیا وجہ ہوتی ہے کہ وہی لوگ جو ابھی کمروں میں بیٹھے ہوئے جن افسرانِ حکومت کو برا کہہ رہے تھے اُن کے سامنے انھیں کی خوشامد اور تعظیم و احترام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں؟ لیکن اسی کے برعکس اس کی وجہ کیا ہوتی ہے کہ چند دن کے بعد پھر یہی لوگ انھیں افسرانِ حکومت پر حملہ آور ہوتے ہیں؟ کیا باعث ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو ہواؤں میں غائب ہو جایا کرتے تھے اب عمل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

جواب آسان ہے۔

یہ خود عمل ہے — عمل — نہ تھکنے والا عمل — مسلسل عمل، اس تبدیلی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جرأت اور عزم خلوص اور قربانی کا جذبہ بھی یقیناً ویسا ہی متعدی ہے جیسا خوف و ہراس، بزدلی اور تسلیم و رضا کا شیوہ ہے۔ اب ایک سوال اور یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ عمل کونسی شکل اختیار کرتا ہے؟ تو اس عمل کی صورتیں حسب ضرورت اور مناسب موقع پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسی عمل کے نتائج دردناک ہوتے ہیں بعض اوقات احمقانہ، کبھی یہ عمل محض انفرادی ہوتا ہے کبھی اجتماعی۔ لیکن عمل کا مسلک کسی ذریعہ اور وسیلہ کو ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ایک مسلسل سعی جاری رہتی ہے تاکہ بے اطمینانی اور بغض کا سخت و شدید یا نرم و نازک الفاظ میں اظہار ہوتا رہے۔ ایسا پروپگنڈا اور احتجاج جس سے جمہور کی آزادیٔ خیال متحرک ہو اور جذبۂ انقلاب کی نشو و نما ہو سکے۔

کسی ملک میں حالتِ انقلاب

کسی ملک میں جب انقلابی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو قبل اس کے کہ انقلابی روح عامۃ الناس میں پھیلے اور اُس کے نتیجہ میں زبردست نظری اور عملی مظاہرات واقع ہوں صرف عمل کی قوت ہی ایک بہت قلیل طبقہ اور محدود جماعت سے شروع ہو کر احساسِ آزادی کو ملک کے ہر ہر فرد میں بیدار کر دیتی ہے اور یہی کیفیت انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

صاحبِ جرأت اور اولوالعزم لوگ جو صرف الفاظ سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو عملی کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ نذر اور قربانی کے پیکر بن کر کامیابی کی امید میں آگے بڑھتے ہیں یہ لوگ تعداد میں کم ہوتے ہیں لیکن فی الاصل یہی لوگ عوام کی عزتِ نفس اور احساسِ خود داری کے علمبردار ہوتے ہیں وہ میدان میں اُس وقت سے تنہا نکل آتے ہیں جبکہ جمہور کے دماغ کی انقلابی تعبیر بھی پوری نہیں ہوتی ہے۔ وہ اکثر حالتوں میں باقی بھی نہیں رہتے لیکن اُن کا لگایا ہوا پودا سرسبز اور بارآور ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ وہی پارٹی جو زیادہ سے زیادہ انقلابی پروپگنڈا کرتی ہے "عمل کے دن" سب سے زیادہ طاقتور اور لشت پر ہزاروں عملی ہاتھ رکھتی ہے۔ اس کے خلاف وہ جماعتیں جو انقلاب کی راہ میں موانع پیدا کرتی ہیں شکل ہی سے عوام کی تائید حاصل کر سکتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو اُن کو اپنا پروگرام چلانا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ عمل کے دن وہ میدان سے ہٹا دی جاتی ہیں۔

یہ تاریخ کا دیا ہوا سبق ہے کہ کس طرح مختلف ممالک نے "عزائم انقلاب" کو پیدا کیا اور اُنھیں کامیاب بنایا۔

انقلاب کیوں ہوتا ہے؟

کسی خطۂ زمین کی حالت انقلاب سے پہلے کیا ہوتی ہے؟ اور

انقلاب کی تعریف کیا ہے؟

اس کے لئے دنیا کے زبردست انقلابی لینن کی وضع کردہ توضیح کافی ہے۔

(۱) ایک حالت یا نظام میں (خواہ وہ نظام، نظامِ سیاسی ہو یا نظامِ سماجی یا وہ نظام اخلاق ہو) زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لئے اقتصادی بغض یا معاشی مشکلات انقلاب کا باعث ہوتی ہیں۔

(۲) ایک خطۂ زمین کا ہر ہر فرد انقلاب سے پہلے وہاں کے نظمِ حکومت نظم کارہ اور نظمِ اخلاق سے متنفر ہوتا ہے اور

(۳) ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی کا نام انقلاب ہے جس کی صفت یہ ہے کہ اُجڈپن سے پیش آئے خواہ یہ رویہ اہلِ علم کی حسیاتِ نازک پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گزرے جنھوں نے سرمایہ دار غاصبوں کے تمدن میں نشو و نما پائی ہے۔

ساقی نے جب لبوں پہ ساغرِ سرشار رکھ دیا
دل میں نئے جنونِ شوق میں وار دیا

دیکھا جب تشنہ جیسے آمیزشِ تری کی
بیچا کے پھر انگلیوں کو چھلکا دیا

آ۔ لکھنوی

نالۂ جرس

اے کہ تری نگاہ میں حسنِ بتانِ آزری
اے کہ ترے دماغ میں موجِ شرابِ خودسری

اے کہ ترے بیان سے وجد میں روحِ آرزو
اے کہ ترے کلام سے رقص میں حورِ شاعری

فطرتِ موج ہے بلند اور مزاجِ بحر تند
پست نہ ہو کہیں ترا حوصلۂ شناوری

لے کے نشانِ حریت تیز چل اور تیز چل
حُسن کے خط و خال پر ڈال نگاہِ سرسری

سنتِ رفتگاں کو چھوڑ جادۂ نو تلاش کر
شوق ہے خضرِ راہ خود شوق کی کر نہ رہبری

دل ہے ترا "یہ کیا کہا" کشتۂ نازِ مہوشاں
کشتۂ نازِ مہوشاں! ننگ ہے تیری شاعری

جورِ خزاں چمن چمن خونِ وطن لگن لگن
اور تری گرمیٔ سخن وقفِ حدیثِ دلبری

دودِ چراغِ عقل سے ایک نئی سحر بنا
قسمتِ دہر سے سیاہ صورتِ زلفِ کافری

چشمِ یتیم سے ٹپک بن کے وہ دُرِ بے بہا
جس کی چمک سے خیرہ ہو نورِ نگاہِ جوہری

فاقہ کشوں کو دے نجات پنجۂ روزگار سے
ضربِ نظر سے چور کر قصرِ بلندِ قاہری

گرمیٔ سوز و ساز سے شعلۂ آرزو اٹھا
جھونک دے روحِ مردہ میں سوز و گدازِ شاعری

ہاتھ سے آفتاب کے چھین لے نیزۂ شعاع
چھین لے اور چاک کر سینۂ چرخِ چنبری

مثلِ غبارِ راہ چل وقت کے قافلے کے ساتھ
تیرے لئے رُکے گی کیوں گردشِ چرخِ اخضری

احسن احمد اشک کلکتہ

شہزادہ خرمؔ

از آسکر وائلڈ

مترجمہ
(مظہر علی شاہ)

شہر کے وسط میں محلہ کے سب سے اونچے مینار پر شہزادہ خرم کھڑا تھا، اس کا جسم سنہری اوراق سے مزین تھا، خوبصورت آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سوتی جڑے ہوئے تھے، تلوار کے دستہ پر ایک ہیرا لگا ہوا تھا۔

مُرغِ بادنما کا سا خوبصورت ہے" وزیر شہر نے ایک دن اپنے مشیروں سے اس کی تعریف کرتے ہوئے نقادِ فن ہونے کا ثبوت دیا، پھر مجسمہ کے علمی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا۔ "گو اتنا مفید نہیں" جس پر مشیرانِ خاص نے سر ہلائے۔

"تم کو بھی شہزادہ خرم بننا چاہیئے، دیکھو وہ کبھی روتا ہے؟" ایک حسینہ اپنے لڑکے کو تلقین کر رہی تھی۔

"میں خوش ہوں کہ دنیا میں کوئی تو خوش ہے" ایک مایوس نوجوان اس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"فرشتہ معلوم ہوتا ہے" یتیم بچوں نے اس کے نیچے سے گزرتے ہوئے کہا۔ وہ ہر صبح معبد سے سرخ و سفید پیرہن پہن کر عبادت کر کے پلٹتے تھے "تم کو کیا علم ہے کہ فرشتہ کیسا ہوتا ہے؟!" ریاضی کے معلم نے بچوں سے پوچھا وہ فرشتوں کی ہستی کا قائل نہ تھا۔ ایک بچے نے شہزادے کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم خوابوں میں ان کے ساتھ کھیلتے ہیں" معلم نے ناک بھوں چڑھا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ بچوں کے خوابوں کا قائل نہ تھا۔

شہزادہ خرم ہر ایک کے لئے نمونۂ زندگی تھا۔

پھر ایک رات ایک ابابیل شہر کی طرف آئی چھ ہفتہ پیشتر اس کے ہمجولی موسم سرما کے لئے عربستان کی طرف چلے گئے تھے۔ اُسے ایک بنسی نے باندھ رکھا تھا جس کی مفارقت اسے گوارا نہ تھی۔ موسم گرما کے آغاز میں ہی وہ ایک شام دریا کی سیر کر رہا تھا کہ اسے بنسی کے تنگ دہانے اور پتلی کمر نے لبھا لیا تھا وہ مچل گیا اور بلا توقف اُس سے اظہارِ محبت کرنے لگا۔ اس کا ننھا سا دل ضبط کی تاب نہ لا سکا "کیا میں تجھ سے محبت کر سکتا ہوں" یہ گاتا ہوا وہ اس کے گرد گھومنے لگا۔ بنسی نے شرما کر گردن جھکا لی، وہ اپنے بازوؤں کو سطحِ آب پر پھڑ پھڑاتا، اور چاندنی راتوں میں سنہری لہروں کے ہار بنا بنا کر اسے پہناتا۔ یہ اس کا آغازِ محبت تھا، اس کے ہمجولی اس کا مذاق اڑاتے۔ "بنسی مفلس ہے، مگر عزیز و اقارب کتنے ہیں۔ اک خاندانِ مفلساں"۔ مگر ابابیل کے لئے وہ سب کچھ تھی۔

موسم کے بدلتے ہی سب ساتھی چلے گئے، اور وہ تنہا رہ گیا، اب وہ گفتگو کو ترسنے لگا۔ بنسی کے زبان نہ تھی اس لئے وہ اپنا حال اشاروں سے بتاتی۔

جب ہوا چلتی تو بنسی ہوا میں جھومتی تو ابابیل کا جی جلتا "جب یہ معذور ہے تو ہوا کے ساتھ اتنی بے باک کیوں ہے؟ یہ ناز و غمزے کیسے" مگر اس بنسی کے رویے میں کچھ فرق نہ آیا۔

سیاحت کی عادت اسے تنگ کرنے لگی، اس کے پر پھڑکنے لگے۔
وہ سوچتا کہ سیاح کی ملکہ بھی سیاح ہونی چاہیئے، بنسی کا جمود پسند نہ

کرتا تھا، مگر کبھی کچھ کہنے کا حوصلہ نہ پڑتا۔

آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا: "کیا تم میری ساتھ چلو گی" ہنسی نے نفی میں سر ہلا دیا، اُسے اپنے وطن اور عزیزوں سے بہت لگاؤ تھا۔

"تو بہت ناقدر شناس ہے، تیرے پاس دل ہی نہیں، اچھا خدا حافظ"۔ ابابیل نے یہ کہتے ہوئے ہنسی کے لبوں پر آخری بوسہ دیا۔ مایوس محبت کی آنکھوں میں دو آنسو آگئے، اور اس نے عربستان کا رُخ کیا، اور ہوا کے ساتھ آنسوؤں کو خشک ہونے دیا۔

جب وہ شہر میں وارد ہوا تو اُسے شب باشی کی فکر ہوئی اس نے سوچا کہ شاید شہر والوں نے میری آمد کا حال سن لیا ہوگا، اِدھر اُدھر منڈلاتا رہا۔ جب شہزادہ خرّم کے قریب آیا تو بہت خوش ہوا کھلا اور محفوظ مقام سمجھ کر مجسّمے کے دونوں پاؤں کے درمیان آبیٹھا۔ سنہری خواب گاہ میں شاہی آداب کے مطابق جلد ہی سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اپنا سر بازوؤں میں چھپا کر لیٹ رہا۔

یکے بعد دیگرے پانی کے دو تین قطرے اس پر گرے۔ اس کی آنکھ کھل گئی، دیکھا نہ بادل ہے، اور نہ بارش کے آثار۔ حیران ہو رہا تھا کہ شمالی یورپ کا موسم کتنا بے اعتبار ہے۔ پھر اُسے ہنسی کی یاد آئی، جسے پانی بے حد پسند تھا۔

پھر پانی کے چند قطرے ٹپکے، وہ غصّے میں چلاّ اُٹھا "اس مجسّمے سے کیا فائدہ جب یہ بارش نہیں روک سکتا۔ ضرور مجھے کسی مکان کی ڈیوڑھی میں رات بسر کرنا ہوگا" ابھی وہ بازو تول ہی رہا تھا کہ پانی کے قطرے پھر گرے۔ اوپر نگاہ کی تو دیکھا کہ شہزادہ خرّم کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا ہے۔ اُس کا خوبصورت سنہری چہرہ ابابیل کو چاند کے سامنے بھلا معلوم ہوا۔ اُسے رحم آگیا، اس سے پوچھا، "تم کون ہو اور روتے کیوں ہو؟ تم نے مجھے بھی تو تر کر دیا"۔

شہزادے نے کہا: "میں شہزادہ خرّم ہوں، جب میں زندہ تھا میرے پہلو میں بھی انسانی دل تھا۔ میں اُس شاہی محلّہ میں رہتا تھا وہاں رنج و محن کا گزر نہیں، میں نہ جانتا تھا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ دن بھر وزیرزادوں کے ساتھ باغ کے صحن میں کھیلتا تھا۔ اور رات کو شہزادہ دلفریب" بن کر جشن رقص میں محو رہتا تھا، میرے پاس دلچسپی اور عیش کے بہت ذرائع تھے، اگر فی الواقعہ انہیں چیزوں کا نام مسرت ہے تو میرے درباری مجھے شہزادہ خرّم کہنے میں حق بجانب تھے، شاہی محل کے اردگرد ایک بہت موٹی دیوار ہے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ میں اسی طرح جیا اور اسی طرح مرا۔ اس کے بعد لوگوں نے مجھے یہاں اتنی بلندی پر لا کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اپنے شہر کے تمام رنج و محن دیکھتا ہوں۔ گو میرا دل سیسے کا ہے۔ مگر مجھے روئے بغیر چارہ نہیں" شہزادے نے نظر دوڑاتے ہوئے کہا، "وہ دیکھو اُس گلی میں جو ٹوٹا ہوا مکان ہے اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ جس میں سے گھر کا سب نقشہ نظر آتا ہے۔ ایک عورت بیٹھی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی ہے۔ اس کے رخسار زرد ہیں۔ دونوں ہاتھ سرخ ہیں۔ سوئی کی نوک نے انھیں چھلنی کر دیا ہے۔ سنہری لباس جس پر کہ وہ پھول بنا رہی ہے۔ ملکہ کی سالگرہ پر جشن شاہی میں "ملکۂ شب" کے لئے ہے، جو رقص اول کا افتتاح کرے گی، دوسرے کونے میں اس کا لڑکا بیمار پڑا ہے۔ بخار کی تپش اسے جلا رہی ہے، اور وہ سنگترے کے لئے ضد کر رہا ہے، اس کی ماں کے پاس دریا کے پانی کے سوا کچھ نہیں، ننھے ابابیل، میرا ایک کام کر، اس تلوار کے دستے میں سے ہیرا نکال کر اس عورت کو دے آ، اس کے پاس کچھ بھی نہیں، میں کیا کروں میرے پاؤں ہل نہیں سکتے"۔

ابابیل نے کہا: "میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ دریائے نیل کے کناروں پر کنول کے پھولوں کو چوم چوم کر مست ہو رہے ہیں، پھر وہ "شہنشاہ گلستاں" کے مزار پر جائیں گے، جس کا کفن پھولوں کی پتیوں سے بنا ہوا ہے، اور اودی اودی ریشمی ڈوریاں اس کے گرد لپٹی ہیں۔

شہزادہ خرّم نے بڑی التجا کی، "آج رات تم میرے مہمان رہو میرے قاصد بن جاؤ، دیکھو وہ لڑکا چلاّ رہا ہے، اس کی ماں کتنی مایوس نظر آتی ہے۔

ابابیل نے سر ہلاتے ہوئے کہا، "مجھے لڑکے اچھے نہیں لگتے، گذشتہ سال انھیں دنوں جب میں دریا کے کنارے رہتا تھا، زمیندار کے دو گستاخ لڑکے مجھے پتھر مارا کرتے تھے۔ گو مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچا، مگر

میری توہین تو ہے۔"

شہزادہ خرّم کے چہرے پر مایوسی چھاگئی، اور اس نے کچھ اس انداز سے آہ کی کہ ابابیل کا دل کانپ گیا۔ "اچھا تمہارا حکم ہے تو ضرور جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دستے میں سے ہیرا نکالا اور اڑ گیا، راستے میں اسے گرجا ملا جس کے گنبد پر فرشتوں کی تصویریں تھیں، شاہی محل سے گزرا تو وہاں سے گانے کی آواز آئی، جہاں ایک دریچے پر خوبصورت ملکۂ شب "اپنے عاشق سے ہم آغوش تھی، جو ستاروں اور محبت کی دلفریبی کی کہانی کہہ رہا تھا۔ حسینہ اپنے جشن شاہی کے لباسِ رقص کے نامکمل رہنے پر کشیدہ کار عورتوں کی شکایت کر رہی تھی، ابابیل دریا عبور کر کے جہاز کے مستولوں سے گزرتا ہوا یہودی کے نمار خانے سے گزرا۔ جہاں سونا لوہے کی ترازو میں تولا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ اس گھر کے قریب آیا اور اندر جھانکا بچہ بستر پر تڑپ رہا تھا اور عورت تھکن سے مغلوب ہو کر دہیں پڑی تھی، ابابیل اندر گیا اور ٹوٹی ہوئی میز پر کشیدے کی سلائی کے پاس ہیرا رکھ کر چارپائی کے گرد گھوم کر اپنے پروں سے بچے کو ہوا دینے لگا۔ لڑکا گہری نیند سو گیا۔

واپس آکر شہزادہ سے سب ماجرا کہا۔ "اس سردی میں مجھے پسینہ آرہا ہے۔"

شہزادہ نے مسکرا کر کہا "اس لئے کہ تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔"

ابابیل نیکی بدی کے مسئلہ پر غور کرنے لگا۔ اور سو گیا۔ فکر ہمیشہ اسے نیند لاتی تھی۔

دوسرے دن علی الصباح ابابیل دریا پر گیا۔ اور غسل کیا۔ حیوانات کے پروفیسر نے اسے دیکھا اور حیران ہوا۔ کہ سردی کے موسم میں یہ پرندہ کہاں سے آگیا۔ ایک طویل خط اس کے متعلق مقامی جریدے کو لکھا اور مدیر جریدہ نے ایک صفحہ اس داستان سے پُر کیا۔

چونکہ آج رات سفر کا ارادہ تھا۔ اس لئے ابابیل شہر کے یادگار مقاموں کو دیکھتا رہا۔ ایک مسجد کے گنبد پر بیٹھا۔ جہاں چڑیوں نے اسے اجنبی سمجھ کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ جب چاند طلوع ہوا تو وہ شہزادے کے پاس آیا۔ "اچھا اب رخصت، نہیں دریائے نیل کا کوئی تحفہ چاہیے" اس نے مجسمے کے شانے پر بیٹھ کر پوچھا۔

شہزادے نے کہا "ننھے ابابیل آج کی رات اور ٹھیرو۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میرے دوست میرے منتظر ہونگے کل وہ وادی بہار میں جائیں گے۔ جہاں دودھ کی چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ سفید دیوتا سیاہ تخت پر بیٹھا ہے۔ وہ ساری رات تارے گنتا ہے اور جب ستارۂ صبح طلوع ہوتا ہے تو وہ ایک لمبی آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دوپہر کو سادھو آتے ہیں، ان کے ساتھ شیروں کا گلہ ہوتا ہے جن کی گرج آبشار سے بھی زیادہ مہیب ہے۔"

شہزادہ نے چلّا کر کہا "دیکھو! شہر کے اس کونے میں ایک کوٹھری کے اندر وہ نوجوان بوسیدہ لباس پہنے کھڑا ہے۔ اس کے میز پر کاغذات بکھرے ہوئے ہیں، گلدان میں گلاب کا پھول سوکھ گیا ہے، اس کے سنہری چمکدار بال پریشان ہیں۔ باریک ہونٹ مونگے کی طرح سرخ ہیں، آنکھیں گہری خواب آلودہ ہیں۔ وہ ملکہ کی سالگرہ کے لئے نظم لکھ رہا ہے، سردی اور بھوک کے مارے اس سے کچھ نہیں کہا جاتا۔ اس کے پاس روٹی اور لکڑی کے لئے کچھ نہیں۔"

ابابیل جو فطرتاً حساس طبیعت تھا بولا، "اچھا لاؤ ایک ہیرا اسے دے آؤں۔"

"میرے پاس کوئی ہیرا نہیں رہا۔ میری آنکھوں کے موتی ہزار ہا سال پیشتر ہندوستان کے ساحل سے لائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نکالو اور اسے دے آؤ۔ اس کی ضرورت پوری ہوجائے گی۔"

"شہزادے! مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا" ابابیل نے چلا کر کہا، اور جب اس کی نگاہ چمکدار آنکھوں پر پڑی اس کے آنسو نکل آئے۔

"تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا" شہزادے نے کرخت لہجہ میں کہا۔

ابابیل نے بائیں آنکھ سے موتی نکالا اور اڑ گیا، اس تاریک کوٹھری میں چھت کے سوراخ کے ذریعہ سے داخل ہوا۔ نوجوان اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ موتی کو آہستہ سے گلدان میں رکھ دیا، جب اس نے سر اٹھایا تو موتی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور کسی امیر کی حوصلہ افزائی کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "اب یہ نظم مکمل ہوجائے گی" اس نے ابابیل کے پروں کی آواز نہ سنی تھی۔

دوسرے دن ابابیل بندرگاہ میں جہاز کے بڑے ستون پر بیٹھا رہا، مزدور جہاز کے سامان اتار رہے تھے، لوہے کے بڑے بڑے صندوق زنجیروں سے باندھ کر کھینچ رہے تھے، ملاح بحری گیت گا رہے تھے، ابابیل نے بھی چلا کر کہا "میں بھی دریائے نیل کی طرف جاتا ہوں"۔ مگر کسی نے نہ سنا۔ آخر جب چاند طلوع ہوا تو وہ شہزادۂ خرم کو الوداع کہنے آیا۔

شہزادہ خرم نے دردآمیز لہجہ میں کہا، "ننھے میرے پاس آج کی رات اور ٹھیرو بڑی مہربانی ہوگی"۔

"سردی کا موسم ہے۔ عنقریب برفباری شروع ہوجائے گی۔ مصر میں کھجوروں کے سبز پتوں پر سورج کی کرنیں کھیلتی ہیں۔ مگرمچھ کیچڑ میں پڑے ادھر اُدھر تکتے ہیں۔ میرے ہمجولی بابل کے مندر میں گھر بنا رہے ہیں۔ سرخ و سفید کبوتروں کے جوڑے شغل بوسہ بازی میں مصروف ہیں"۔

ابابیل نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "مگر جب میں واپس آؤں گا تو تمہارے لئے ایک ہیرا اور ایک موتی ضرور لاؤں گا۔ وہ ان سے جو تم نے لوگوں کو دیئے ہیں کہیں زیادہ قیمتی ہوں گے"۔

شہزادہ نے کہا "نیچے چوک میں وہ لڑکی کھڑی رو رہی ہے، دیاسلائی کی ٹوکری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بدرو میں بہ گئی ہے، اب اس کے پاس فروخت کرنے کے لئے کچھ نہیں، جب وہ خالی ہاتھ گھر جائے گی اس کا باپ مارے گا۔ اس کے سر اور پاؤں ننگے ہیں۔ ننھے ابابیل! میری دوسری آنکھ سے بھی موتی نکال اور اُسے دے آ"۔

ابابیل نے منہ پھیر کر کہا "مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ میں آج کی رات اور رہ سکتا ہوں۔ مگر موتی نہیں نکالوں گا"۔

"مگر میرا حکم ماننا ہوگا" شہزادہ نے چلا کر کہا۔

اس نے موتی نکالا اور لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ آیا، لڑکی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور وہ مسکراتی ہوئی گھر چلی گئی۔

"اب تم بالکل اندھے ہو، میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا"۔ ابابیل نے شہزادے سے کہا۔

"ننھے ابابیل اب تم عربستان جاؤ۔ تمہارے دوست راہ تکتے ہوں گے" شہزادے نے کہا۔

"ہرگز نہیں" ابابیل نے آہستہ سے کہا اور اس کے پاؤں کے درمیان آکر سوگیا۔

دوسرے دن تمام دن وہ شہزادے کے شانے پر بیٹھا رہا۔ اور اس سے ان عجائبات کا ذکر کرتا رہا جو اس نے دنیا کے خطوں میں دیکھے، اس نے کہا کہ خانہ بدوش قوم کی جوان لڑکیاں جب مچھلی کے شکار کے لئے آتی ہیں تو کیا کیا آزاد گیت گاتی ہیں اور کیونکر ناچتی ہیں، ریگستان کا مجسمہ جو دنیا سے بھی پرانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ عربی سوداگر جو کاروانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لمبی لمبی آبنوسی تسبیح ان کے سرخ گلے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ "کوہستان ماہ" کا شہنشاہ آبنوس کی مانند سیاہ ہے اور سفید مجسمے کی پرستش کرتا ہے۔ سبز اژدھا کھجور کے درخت میں رہتا ہے جسے بیس جوان راہب دودھ اور شہد پلاتے ہیں۔ بالشتئے جو بڑے بڑے پتوں پر جھیلوں میں تیرتے ہیں اور ہمیشہ تتلیوں سے برسرِپیکار رہتے ہیں۔

"ننھے ابابیل" شہزادہ خرم نے کہا "یہ سب کچھ حیرت انگیز ہے۔ مگر نوعِ انسانی کے دکھ اور صبر سے بڑھ کر کچھ بھی حیرت انگیز نہیں۔ بدبختی سے بڑھ کر کوئی بڑا بھید نہیں۔ جا! میرے شہر پر گھوم آ اور مجھے بتا کہ اب کیا حال ہے؟"

وہ شہر پر گھومتا رہا۔ امیر عالیشان مکانوں میں عیش کر رہے تھے، مفلس اور فقیر ان کے دروازوں پر بیٹھے تھے۔ وہ تنگ گلیوں میں گیا جہاں فاقہ کش بچوں کے زرد چہرے نظر آرہے تھے۔ ایک پل کے نیچے دو بچے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے لیٹے ہوئے تھے۔ بھوک نے ان کی آنکھوں میں حلقے ڈال دیئے تھے۔ چوکیدار نے انہیں دیکھا۔ اور ان کی طرف دوڑا۔ بچے ڈر کر بارش میں بھاگ نکلے۔ ابابیل نے شہزادۂ خرم سے سب حالات بیان کر دیئے۔

شہزادے نے ابابیل سے اپنے جسم کے سب سنہری اوراق اتروا کر بچوں کو دلوائے۔ مجسمے کا جسم بھدا اور سیاہ ہو رہا تھا۔ بچوں کے چہروں پر رونق آرہی تھی۔ وہ باہر کھلے میدانوں میں کھیلتے پھرتے تھے۔

پھر برف پڑنی شروع ہوگئی۔ شہر سفید چادر میں ملبوس تھا، سورج کی سہمی ہوئی کرنیں مکانوں کو نقرئی لباس پہناتی معلوم ہوتی تھیں

سب چھوٹے بڑے سمور کا لباس پہنے ہوئے تھے، بچے بھی سرخ سرخ ٹوپیاں پہنے برف پر کھیل رہے تھے۔

ابابیل سردی کے مارے روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی پسلیوں اور سینے میں درد رہنے لگا۔ وہ اُڑ کر نان بائی کی دُکان تک نہ جا سکتا تھا۔ جہاں سے پس خوردہ ذرات مل جاتے تھے۔ شہزادہ خرم کی محبت نے اسے باندھ رکھا تھا۔ اس کی جدائی ناقابل برداشت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ موت قریب آ رہی ہے۔

ایک دن جب وہ زندگی سے مایوس ہو گیا۔ تو اُڑ کر اس کے شانے پر آ بیٹھا اور نحیف آواز میں کہا: "خدا حافظ، شہزادہ خرم۔ کیا تمہارے ہاتھ کو بوسہ دے سکتا ہوں؟"

"میں خوش ہوں کہ آخر تم عربستان کو چلے ہو۔ تمہارا قیام بڑا خوشگوار تھا۔ میرے ہاتھ کو نہیں۔ میرے لبوں پر بوسہ دو مجھے تم سے محبت ہے" شہزادے نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"نہیں میں سیاہ خانۂ مرگ کو جاتا ہوں۔ موت بھی تو نیند کی بہن ہی ہے" ابابیل نے اتنا کہا۔ اس کے لبوں کو چوما۔ اور نیچے گر پڑا۔ اسی لمحے مجسمے کے اندر دھماکے کی آواز آئی۔ سیسہ کا دل دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔

دوسرے دن علی الصباح وزیر شہر اسی چوک میں سیر کر رہا تھا۔ شہر کے معزز مشیر جلو میں تھے، جب اس نے مجسمے کو دیکھا تو تعجب سے کہا: "شہزادہ کتنا بدصورت ہے"

"کتنا بدصورت ہے" مشیران خاص نے یک زبان تائید کی

وزیر نے مجسمے کے قریب آ کر پھر کہا۔ "تلوار کے دستے میں ہیرا نہیں۔ آنکھوں میں موتی نہیں۔ اور سونے کے اوراق بھی تو نہیں۔ حقیقتاً گداگر سے کچھ بہتر نہیں"

"گداگر سے بہتر نہیں" مشیروں نے پھر یک زبان تائید کی۔

"اور یہ دیکھو پرندہ بھی یہیں مرا پڑا ہے، محکمہ حفظان صحت کو خبر کرو" یہ کہتے ہوئے مجسمے کے گرانے کی تجویز ہونے لگی۔

شاہی آرٹسٹ نے رائے دیتے ہوئے لکھا۔ "جو چیز خوبصورت نہ رہے وہ بیکار ہو جاتی ہے"

وہ مجسمہ بھٹی میں ڈال دیا گیا۔ اس دھات کے استعمال کے متعلق جو قیاس آرائیاں ہوئیں وہ وزیر اور مشیران خاص کے مجلسوں تک محدود نہیں، مگر اختلاف رائے سے کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ کارخانہ کا مستری اس سوچ میں تھا کہ سیسہ کا دل کیوں نہیں گلتا۔ وہ اسے بار بار تیزاب میں ڈال کرتا تا مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ تنگ آ کر اُسے گڑھے میں پھینک دیا۔

وہاں ابابیل کی لاش بھی پڑی تھی، نوع انسان کی محبت جس دل کو توڑ ڈالتی ہے آگ اُسے جلا نہیں سکتی۔

ایک دن خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے لئے دنیا سے دو بہترین تحائف لاؤ۔ ایک فرشتہ وہی سیسے کا دو نیم دل اور ابابیل کی ننھی سی لاش لے کر حاضر ہوا۔ چاروں طرف سکوت چھا گیا۔

"بے شک تمہارا انتخاب صحیح ہے" خدا نے اس پر رحمانی تبسم برساتے ہوئے کہا: "یہ ابابیل میرے گلشن فردوس میں تا ابد گیت گاتا رہے گا۔ اور میرے روپہلی محل میں یہ شہزادہ خرم ہمیشہ رقصاں و غزلخواں رہے گا"

ہیچ تھی گلزار سے عشرت کی مستی
بن جائے جو بے حسی کا پیکر ہستی
جب آتی تری یاد تو یوں شہ پایا
چھپ جاتا ہے مرے سر کی تجلی کی مستی

(راشد لکھنوی)

مذہب و سائنس

(ضیاءالدین احمد۔ لدھیانہ)

مذہب کا آغاز اسی وقت ہوا، جب انسان نے ابتدائے آفرینش میں یہ معلوم کیا کہ کائنات میں بعض ایسے حوادث ظہور میں آتے ہیں جن پر اس کو کوئی دسترس حاصل نہیں، اس کو معًا یہ خیال آیا کہ ضرور کوئی بعید از فہم طاقت ان واقعات کی تشکیل کی ذمہ دار ہے۔ اس لئے اس طاقت کا نام "خدا" رکھ لیا، چونکہ وہ اس خدا کو عقل و ادراک کے ذریعہ نہیں سمجھ سکا، لازمًا اس نے توہم کے ماتحت ایک تخیل قائم کر لیا، جب رفتہ رفتہ ذہن انسانی پختہ تر ہو گیا اور انسان کے منتشر تجربات نے ایک منضبط شکل اختیار کر لی جس کا نام سائنس رکھا گیا تو اس نے حوادث کے اسباب کا عمیق تر ادراک کرنا چاہا، پہلے انسان ہر واقعہ کو ایک قوت اعلیٰ کا متعلق الفعل سمجھتا تھا، لیکن سائنس نے بتایا کہ دنیا میں علت و معلول کا اک غیر مختتم سلسلہ جاری ہے، اس نے تصور باری تعالیٰ پر بھی تنقیدی نظر ڈالی اور بتایا کہ اس اعتقاد کو کہاں تک صداقت حاصل ہے، اب یہ بات ظاہر ہے کہ مذہب نے جس کام کو شروع کیا تھا، سائنس نے اس کو انتہا تک پہنچایا یعنی مذہب پہلا قدم تھا اور سائنس آخری، اس لئے سائنس کی تاریخ مذہب کی تاریخ ہے، یا مذہب کی تاریخ سائنس کی تاریخ، کیونکہ دونوں ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان نے تصور الٰہی میں کس طرح بتدریج ترقی کی ہے، دونوں انسان کے لطیف ترین ادراکات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

الغرض معلوم ہوا کہ سائنس کی تاریخ گویا مذہب کی تاریخ سے ہمرشتہ ہے۔ کیونکہ سائنس دانوں کی تمام تگ و دو بھی خدا ہی کی جستجو میں تھی۔ سائنس کی تاریخ انسان کی اس خواہش کی شہادت دیتی ہے جو اسے روز ازل سے اپنے خالق کی تلاش پر مجبور کرتی رہی ہے، انیسویں صدی کے آخر میں سائنسداں دہریت کی طرف جانے لگے تھے، اور کوئی شاغل سائنس عزت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا جب تک کہ وہ "برادری" کے رواج کے مطابق مذہب کی تحقیر و تضحیک نہ کرلے، لیکن وہ سائنس کا آغاز تھا اور جس طرح ایک بچہ اپنی تازہ علمی دسترس پر ناز کیا کرتا ہے اسی طرح اس زمانہ کے سائنسداں سائنس کے چند ابتدائی مرحلے طے کر کے پھولے نہ سماتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم نے سائنس کے انکشافات و فتوحات سے مذہب کو مہمل ثابت کر دیا ہے، جسے انسان کے نزدیک توہم اور جہالت سے زیادہ وقعت نہ ہونی چاہیئے، لیکن پچھلے تیس سال میں سائنس کا طفل شیرخوار اک جوانِ تنومند ہو گیا ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ (جو کہ "عہد سائنس" کہلاتا ہے)، کے ماہرین سائنس وہ جو کہ بلا شک و شبہ تیس برس پہلے کے سائنس دانوں سے زیادہ علمی روشنی کے مایہ دار ہیں مذہب کا ذکر حقارت سے کرنے کی جسارت نہیں کیا کرتے، بلکہ موجودہ زمانہ کے ایک سائنسداں کا تو یہ اعتراف ہے کہ "دہریت کے لئے موجودہ سائنس کی مملکت میں کوئی جگہ نہیں، صرف بے وقوف یا کج فہم ہی دہریہ ہو سکتا ہے" کیپلر، گلیلو، نیوٹن اور بہت سے دیگر اقطاب سائنس نہ صرف خدا پر ایمان رکھتے تھے بلکہ اس بات پر نازاں بھی تھے کہ اُن کی ذہنی کد و کاوش کے نتیجے میں خدا کی عظمت و جلالت پہلے سے زیادہ آشکارا ہو گئی ہے۔ پس ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب اور سائنس دو ہم وظیفہ ادارے ہیں، سائنس اور مذہب کا معارضہ اک لفظِ مہمل کی طرح کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر بامعانِ نظر

دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب میں کوئی بنیادی اختلاف نہ نکلے گا۔ بلکہ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ سائنس اور مذہب ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں، یا ایک ہی ورق کے دو صفحے، جیسے ایک ورق کے دونوں صفحے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے اسی طرح سائنس اور مذہب آپس میں وابستہ و پیوستہ واقع ہوئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں۔ سائنس کے بغیر مذہب تشنۂ شرح صد رہ جاتا ہے اور مذہب کے بغیر سائنس یک چشم، غرضکہ دونوں ایک دوسرے کے متمم ہیں۔

سائنس اور مذہب کا اشتراک ہماری نظروں سے اس لئے اوجھل ہے کہ ہمارے ذہن میں سائنس کے متعلق غلط فہمیاں گھر کر گئی ہیں۔ روزمرہ کی سائنس اور خاص کر ہمارا تعلیمی نصاب سائنس اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا سائنس کو انسانی جذبات سے دور کا بھی سروکار نہیں۔ بہت سے لوگوں کا یہ کہنا کہ سائنس داں خشک دماغ اور مردہ دل ہوتے ہیں، اور کسی خوبصورت چیز سے محبت نہیں کر سکتے، مثلاً ان کے لئے ایک حسین عورت یا عروس برشگال کا رخسار کوئی سامان لذت و کیفیت نہیں رکھتا سراسر تعصب پر مبنی ہے، ایسی قیاس آرائی ان کی علمی مطالعہ کی دلیل ہے۔ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ سائنس داں بھی ہماری طرح انسانی جذبات سے عاری نہیں ہوتے، وہ ایک حسین چیز سے اسی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں جیسے کہ ہم، کسی نے کیا خوب کہا کہ " سائنس کی طرف ہمیں وہی چیز دعوت نظر دیتی ہے جو ایک شاعر کو پیام طبع آزمائی"۔

ہم ایک سائنس داں کے تجربات سے اسی طرح مستفید ہو سکتے ہیں جس طرح کہ کسی شاعر کی نظم سے۔ کیونکہ سائنس اور ادب دونوں انسانی دل و دماغ کی پیداوار ہیں اور ان کا امتیاز محض اعتباری ہے، کیپلر اور بعض دیگر محققین فلکیات اس غرض سے ستاروں کا مطالعہ کیا کرتے تھے کہ نظام ثوابت و سیار میں حسن ترتیب اور جمال نظم کے فن لطیف کا مشاہدہ کیا جائے۔

جس طرح سائنس اور ادب کا امتیاز سطحی ہے، اسی طرح سائنس اور مذہب کا اختلاف بھی ایک "مشہور حرف غلط" ہے، کیونکہ دونوں کے مقاصد اور منتہائے نظر ایک ہیں۔ دونوں کائنات کی مختلف النوع اشیا کی رنگا رنگی میں ایک عمیق یکسانی کے جویا ہیں۔ جو دونوں فطرت میں حسن و زیبائی اور یگانگی و ہم آہنگی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ دونوں کے اغراض و مقاصد ظاہری و معنوی طور پر ایک ہیں۔ صرف ان کے مشترک قبلۂ مقصود تک پہنچنے کا راستہ جداگانہ ہے۔ سائنس اپنی منزل کو "ارتقا" کی شاہراہ سے پہنچا چاہتی ہے۔ اور مذہب "تخلیق" کا کلمہ گو ہے۔ لیکن درحقیقت ارتقا اور تخلیق میں کوئی حقیقی آویزش نہیں۔ اصطلاح "ارتقا" ایک طریق کار یا ایک سرگزشت تاریخی پر دلالت کرتی ہے۔ درانحالیکہ عقیدہ "تخلیق" کا تعلق ہے "ایک ہستی عاملہ" کے ساتھ، اور ایک ہستی عاملہ طریق کار کی وساطت سے بھی کام کر سکتی ہے، اور اس سے بے نیاز ہو کر بھی۔

بقیہ رفتار وقت صفحہ ۲۷۵ سے

رقص مذبوحی کی صورت میں مسلم لیگ کو کوئی پیام اشتراک عمل دینا اک مایوسانہ شغل سمجھی گئی! تاہم جدید ایکٹ کی فیڈریشن ردف ق، والی جزو کے تو مسٹر جناح بھی غیر آشتی طلب شان سے خلاف تھے لیکن اب یہ یکسر عشق اصلاحات کا سودا کیا معنی رکھتا ہے؟! کیا جناب کو اپنے دل و دماغ سے بھی بنیادی اختلافات ہیں؟! ع

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا!

لیکن ہو تو کیونکر ہو؟ مجلس کی ممبری، حکومتوں کی وزارت، کینٹنوں کی رکنیت، وائسرائے اور گورنروں کی دعوتوں پر لبیک اور ضیافتوں میں شرکت، ایسی چیزیں نہیں کہ ان بزرگوں کو متزلزل نہ کر دیں جن کی کانگریس کے ساتھ "بنیادی اختلافات" ہیں! ؎

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے!

بہارِ امروز

پھر جوش پر بہار فروزاں ہے آجکل روشن ہر ایک شمعِ شبستاں ہے آجکل

شیریں نوائیاں ہیں فضاؤں میں منتشر ہر سمت شورِ مرغِ غزلخواں ہے آجکل

ہر گوشۂ چمن سبق آموزِ روح ہے ہر برگِ گل صحیفۂ عرفاں ہے آجکل

رنگینیِ شبابِ گلستاں کو دیکھ کر ہر گل چمن میں دیدۂ حیراں ہے آجکل

شعر و شرابِ و شمع و شکر، شاہد و شباب پر کیف کتنی محفلِ رنداں ہے آجکل

ہر رندِ لم یزل کا ہے رخ سوئے میکدہ توبہ شکن فضائے گلستاں ہے آجکل

رعنائیوں میں حال کی کھوئی ہوئی ہے عقل فکرِ مآل سر بگریباں ہے آجکل

دل میں نئی امنگ، نیا جوشِ انقلاب جدت نواز گردشِ دوراں ہے آجکل

تقدیرِ خاکِ پاکِ وطن ہے عروج پر فطرت اداشناسِ غریباں ہے آجکل

ہشیار باش دورِ قناعت نہیں ہے یہ حصہ بقدرِ وسعتِ داماں ہے آجکل

(از حکیم محمد حسین مسیح بنارس)

مالیات ہند کے متعلق سر آٹو نیمیر کی رپورٹ

(عبد الرحیم شبلی)
(بی۔ کام)

اپریل ۱۹۳۷ء سے جدید آئین حکومت نافذ ہو چکا ہے۔ اس کے ماتحت صوبجات کو مالی و انتظامی خود مختاری عطا کی گئی ہے۔ اس نئی ذمہ داری کی وجہ سے اُن کو کثیر روپیہ درکار ہے۔ جس کو مہیا کرنے کے ذرائع تجویز کرنے کے لئے سر آٹو نیمیر کو گذشتہ سال مقرر کیا گیا تھا۔ صاحب موصوف جنوری ۱۹۳۶ء میں ہندوستان تشریف لائے، اور تین ماہ تک صورت حال کے مشاہدہ و مطالعہ کے بعد ۳۰ اپریل ۳۶ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی

تفتیش کے مقاصد

سر آٹو نیمیر کے اپنے الفاظ میں اس تحقیقات کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں یہ بات جا بجا تسلیم کی گئی ہے کہ صوبائی خود مختاری کے افتتاح کے وقت صوبجات کے لئے ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ وہ مالیاتی توازن برقرار رکھنے کے اہل ہو سکیں، اور بالخصوص اس خسارہ کا خاتمہ ہو سکے جو ان کو ہو رہا ہے۔

میرا مطمع نظر یہ رہا ہے کہ میں صوبجات کی موجودہ اور متوقع مالی حالت کا معائنہ کروں۔ اور یہ دیکھوں کہ متذکرہ بالا مقصود کو حاصل کرنے کے لئے خاص امداد کی کس حد تک ضرورت ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات پر غور کرنا ہے کہ مرکزی حکومت اپنی مالی حالت کو معرض خطر میں ڈالے بغیر کس حد تک صوبجات کو امداد پہنچا سکتی ہے۔

"آخر میں مجھے مستقبل کے متعلق سفارشات کرنی ہیں کہ مرکز کے لئے کس حد تک یہ ممکن ہو سکے گا کہ انکم ٹیکس کی آمد سے صوبجات کے سپرد مزید ذرائع آمد کئے جا سکیں۔"

سر آٹو کی سفارشات

سر آٹو نیمیر کی مرکزی سفارش یہ ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا انکم ٹیکس کی پچاس فیصدی یافت صوبجات کے درمیان بطور امداد تقسیم کرے اور اس کے لئے معیار کچھ تو آبادی ہوگا، اور کچھ لوگوں کی سکونت۔

سر آٹو کا خیال ہے کہ جدید انتظامات کے ماتحت (یعنی برما کی علیحدگی کے بعد) مرکزی حکومت کو انکم ٹیکس سے بارہ کروڑ روپیہ وصول ہوگا۔ جس کا نصف یعنی چھ کروڑ روپیہ صوبجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن مرکز کو اپنی مالی حالت کے استحکام کیلئے ضرور ہوگا کہ وہ وفاق کے ابتدائی پانچ سال تک اس آمد کو اپنے استعمال میں لائے، دوسرے پانچ سال میں چھٹے سال سے شروع ہو کر یہ آمد صوبجات کو ادا کی جا سکتی ہے تاکہ دس سال کے عرصہ کے بعد صوبجات کو اپنا پورا حصہ میسر ہو سکے۔ مرکز یہ روپیہ صوبجات میں تقسیم نہیں کرے گا۔ جب تک اس کے پاس ریلوے کی

طرف سے عطیات شامل کرکے کم از کم تیرہ کروڑ روپیہ نہ ہو جائے۔

سر آٹو کی تجویز ہے کہ صوبائی خود مختاری کے آغاز سے ہی بعض صوبجات کو مالی امداد دی جائے۔ اور یہ امداد بعض صوبوں کو زرِ نقد کی صورت میں بعض کو بالمقطع مقروضات کی تنسیخ کی شکل میں اور بعض کو پٹ سن کے محصول بر آمد سے ۱۲½ فی صدی کے عطیہ کی صورت میں دی جائے۔

مسٹر موصوف نے لکھا ہے کہ بنگال۔ بہار، آسام، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور اڑیسہ کے تمام بالمقطع مقروضات منسوخ کر دیئے جائیں اور سی۔ پی کے بارے میں ۱۹۳۶ء سے قبل نہ ۱۹۲۱ء کے قبل کے دو کروڑ روپیہ کا قرضہ منسوخ کر دیا جائے۔

سالانہ زر نقد کی تفصیل حسب ذیل ہوگی۔

صوبجات متحدہ	پچیس لاکھ روپیہ	صرف پانچ سال کے لئے
آسام	تیس لاکھ روپیہ	
اڑیسہ	چالیس لاکھ روپیہ	
شمال مغربی سرحدی صوبہ	ایک کروڑ روپیہ	پانچ سال کے بعد بشرط
سندھ	ایک کروڑ پانچ لاکھ	نظرثانی دس سال تک کم کیا جائے

کل سالانہ امدادی رقومات کا اندازہ سر آٹو کے نزدیک درج ذیل ہے۔

بنگال	پچھتر لاکھ روپیہ
بہار	پچیس لاکھ روپیہ
صوبجات متوسط	پندرہ لاکھ روپیہ
آسام	سینتالیس لاکھ روپیہ
شمال مغربی سرحدی صوبہ	ایک کروڑ دس لاکھ "
اڑیسہ	پچاس لاکھ روپیہ
سندھ	ایک کروڑ پانچ لاکھ "
صوبجات متحدہ	پچیس لاکھ روپیہ

مرکز کو ایک کروڑ بانوے لاکھ روپیہ کا زائد دوامی خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔ اڑیسہ کو انیس لاکھ روپیہ اور سندھ کو پانچ لاکھ روپیہ کی مزید غیر مستقل امداد ملے گی۔

انکم ٹیکس کی بانٹ حسب ذیل شرح سے صوبجات میں تقسیم کی جائے گی۔

مدراس	۱۵ فیصدی
بمبئی	۲۰ "
بنگال	۲۰ "
صوبجات متحدہ	۱۵ "
پنجاب	۸ "
بہار	۱۰ "
صوبجات متوسط	۵ "
آسام	۲ "
شمالی مغربی سرحدی صوبہ	۱ "
اڑیسہ	۲ "
سندھ	۲ "

اب ہم دیکھتے ہیں کہ صوبجات کو مندرجہ بالا امداد کس بنا پر دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں صوبہ جات کے استحقاق کا مطالعہ کرنا ہے۔

سندھ۔ سر آٹو نیمیر کے الفاظ میں سندھ اور اڑیسہ جدید صوبجات ہیں۔ اور ان کے اپنے مخصوص مسائل ہیں۔ سندھ کا مستقبل اور زر امداد کا اس کی مالیات کے بطور جزو ہونا لائیڈ براج کے (LEOYD BARRAGE) مالی مستقبل پر منحصر ہے۔ اس بات پر غور کرنے کے لئے کہ مرکز کو براج کے مصارف کس حد تک برداشت کرنے چاہئیں مجھے یہ فرض کرنا ہوگا کہ براج کی سکیم کو اسی طرح دیگر سکیموں کی طرز پر چلایا جائے گا۔ اور جو سہولتیں وہ بہم پہنچاتی ہے اس کے لئے کافی شرح قیمت وصول کی جائے گی۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھکر میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ سندھ کو دس برس کے لئے ایک کروڑ ۵ لاکھ روپیہ بطور زر امداد دیا جائے، یہ امداد بیس برس تک پچیس لاکھ روپیہ سالانہ آیندہ پانچ برس کے لئے چالیس لاکھ روپیہ سالانہ، اس سے آیندہ پانچ برس کے لئے پینتالیس لاکھ روپیہ سالانہ اور اس کے بعد پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کر دی جائے۔ حتیٰ کہ براج کا جملہ قرض ادا ہو جائے جب یہ سب قرض ختم ہو جائے یعنی ۱۹۷۲ء سے قریباً چالیس برس تک تو اس کے

بعد یہ زر امداد بہرحال بند کر دیا جائے۔"

اڑیسہ۔ اڑیسہ کے بارے میں سر آٹو لکھتے ہیں۔ "اس بات کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے کہ اڑیسہ کا موجودہ معیار خرچ بہت کم ہے۔ اور مستقبل قریب میں صوبہ کے ذرائع میں کسی قسم کی وسعت کا امکان نہایت محدود ہے۔ اندریں حالات میرے خیال میں امداد کا معیار ذرا بلند رکھنا چاہئے اور میں تجویز کرتا ہوں کہ اس کے لئے تقریباً پچاس لاکھ روپیہ مخصوص کر دیا جائے۔ میں یہ بھی سفارش کرتا ہوں کہ سہولت کی خاطر گورنمنٹ آف انڈیا دس لاکھ روپیہ اڑیسہ کے جنرل فنڈ میں بطور امداد مزید کے دے تاکہ اس مد میں اڑیسہ آرڈر ان کونسل کی مجوزہ امداد کا روپیہ ملا کر کل دس لاکھ روپیہ ہو جائے۔ ۵ لاکھ روپیہ اس غرض کے لئے پہلے ہی دیا جا چکا ہے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا انتظام ۳۷-۱۹۳۶ء کے اڑیسہ بجٹ میں کیا گیا ہے۔ اس لئے صرف چار لاکھ روپیہ مزید کی ضرورت ہوگی۔ آخر میں یہ ظاہر ہے کہ نئے معوبجات کے لئے عمارتوں وغیرہ کی تعمیر کے لئے ساڑھے ستائیس لاکھ روپیہ سے کچھ زائد کی ضرورت ہوگی۔ جو گورنمنٹ آف انڈیا اپنے ۳۶-۱۹۳۵ء کے بجٹ میں مخصوص کر رہی ہے۔ میرے خیال میں پندرہ لاکھ روپیہ کی مزید رقم اس مقصد کے لئے کافی ہے۔ اور یہ پہلے پانچ برس میں تین لاکھ روپیہ سالانہ کے حساب سے دی جانی چاہئے، اڑیسہ کے کل امدادی رقم جو میں تجویز کرتا ہوں، ۵ لاکھ روپیہ پہلے سال میں، ۵۳ لاکھ روپیہ دوسرے چار سالوں میں اور اس کے بعد پچاس لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔"

آسام: آسام کو متفقہ طور پر خسارہ کا صوبہ تسلیم کیا جا چکا ہے، اس لئے اسے امداد ضرور ملنی چاہیئے، زر امداد کی تعداد آسام کی آیندہ مالی حالت اور موجودہ خسارہ کے ناگزیر ہونے پر مبنی ہے، علاوہ ازیں صوبائی خود مختاری اور مرکز کے ساتھ بعض اخراجات کے حساب کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا۔ مثلاً آجکل آسام رائفلز کے اخراجات کا ایک حصہ مرکزی گورنمنٹ برداشت کرتی ہے۔ جو پندرہ لاکھ روپیہ کے کل خرچ میں سے بارہ لاکھ روپیہ سے کم نہیں مستقبل میں مرکزی گورنمنٹ سنی پور تبلین کے اخراجات تو جو قریباً تین لاکھ روپیہ ہیں، بہرحال برداشت کرے گی، آسام کی بقیہ فوج کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا سات لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور اس رقم کو خاص صوبائی ضروریات کے لئے امداد سے علیحدہ رکھے گی۔ میرے خیال میں یہ منصفانہ تجویز ہے۔

آسام گورنمنٹ نے آسام کے تیل پر چنگی کی آمد کو حاصل کرنے کے لئے بھی اپنا ایک مطالبہ پیش کیا تھا۔ اگرچہ صاف ظاہر ہے کہ اس محصول کا بار صوبہ پر نہیں پڑتا لیکن میرے خیال میں اس مطالبہ کے حق میں کوئی اقتصادی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس مطالبہ کی کسی اور مقام پر اس طرح کے دعادی کے ساتھ کوئی مماثلت ثابت کی جا سکتی ہے۔" (سر آٹو)

شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ "شمال مغربی سرحدی صوبے کو ۱۹۳۲ء سے لے کر اب تک ایک کروڑ روپیہ سالانہ مرکز کی طرف سے بطور امداد ملتا ہے، اور یہ امداد ہر وقت زیادہ کی جا سکتی ہے۔ تاہم کچھ برس کے لئے مرکزی اور صوبائی نقطۂ نظر سے اس امداد کا متعین کرنا ضروری ہوگا۔ گزشتہ اور متوقع میزانیہ کی حالت کا مطالعہ کرنے کے بعد میری سفارش یہ ہے کہ صوبہ کو موجودہ ایک کروڑ روپیہ کی امداد کے علاوہ دس لاکھ روپیہ سالانہ اور دیا جائے۔ اور یہ رقم پانچ برس کے لئے متعین رہے۔ جس کے بعد صورت حال کا مطالعہ کر کے اس پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے۔ نظر ثانی سے میری مراد یہ نہیں کہ ضروری طور پر اس میں اضافہ کیا جائے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اس پنج سالہ مالیاتی انتظام کی روشنی میں نظر ثانی کی جائے۔" (سر آٹو)

مرکزی گورنمنٹ کی پوزیشن

اس کے بعد سر آٹو نیمیر اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا مرکزی گورنمنٹ قریباً دو کروڑ کے اس مزید بوجھ کو برداشت کر سکے گی؟ اور یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ یاد رکھیں کہ صوبائی خود مختاری کے افتتاح کے ساتھ ہی صوبہ برہما ہندوستان سے الگ کر دیا جا چکا ہے۔ جس کی وجہ سے مرکز کو کم از کم دو کروڑ پچھتر لاکھ روپیہ سالانہ کا خسارہ ہوگا۔

پس ظاہر ہے کہ ۳۸-۱۹۳۷ء کے بجٹ میں یہ مدات میزانیہ کے دو بھاری مسائل ہونگے جن کو حل کرنا ضروری ہے۔

لئے تمام صوبجات نے سکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کو اس بارے میں طویل مراسلات بھیجے۔ اور مرکزی گورنمنٹ نے بھی ان تمام اعتراضات کا اپنی طرف سے خلاصہ کرکے سکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کو اپنی رائے سے مطلع کر دیا۔

عجیب بات ہے کہ جہاں صوبجات زر امداد کی شکایت کرتے تھے۔ وہاں مرکز کو شکایت تھی کہ اسے صوبہ جات کو بھاری امدادی رقومات دینا پڑیں گی۔ جن کا بجٹ متحمل نہیں ہو سکتا۔

تاہم بورڈ زٹلینڈ نے اپنے مراسلہ مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کے ذریعہ سے گورنمنٹ آف انڈیا کو اطلاع دی کہ برطانوی گورنمنٹ کو نیمیر کی سفارشات بکمال و تمام منظور ہیں اور موجودہ حالات میں وہ اس تصفیہ کو نہایت منصفانہ گردانتی ہے۔

اسی مراسلہ میں سکرٹری آف سٹیٹ نے تجویز کی کہ صوبائی خود مختاری یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ کر دی جائے۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء کو ذرائع آمد و اخراجات کی تقسیم سے متعلق ہنگامی فرمان جاری کر دیئے گئے۔ اور یکم اپریل ۳۷ء سے نیا دستور اساسی عمل میں آچکا ہے۔

نیمیر رپورٹ پر ایک نظر

جیسا کہ میں نے اپنے گزشتہ مضمون "فیڈرل فینانس" میں واضح کیا تھا کہ صوبہ جات اور مرکز کے درمیان محاصل و اخراجات کی تقسیم و تعیین کا جھگڑا کوئی نیا نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً ذرائع آمد کی کسی منصفانہ تقسیم کے متعلق کمیٹیاں مقرر کی جاتی رہی ہیں۔ جہاں نظری طور پر منطقی تقسیم و تعیین کا امکان ہو سکتا ہے۔ وہاں عملی طور پر اس بات میں بہت سی مشکلات ہیں۔

اگر ہم نیمیر رپورٹ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سر آٹو کی سفارشات خشک تھیوری اور "جو ہونا چاہیے" کے اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ نہایت عملی اور "جو ہو سکتا ہے" کے اصول پر ان کی بنیاد ہے۔

اس بات کا ثبوت ہمیں بالخصوص زر امداد انکم ٹیکس اور محصول برآمد کے طریقہ تقسیم سے ملتا ہے۔

اگر تمام صوبجات ان سفارشات سے غیر مطمئن ہیں تو یہ سر آٹو نیمیر

سر آٹو نیمیر کو توقع ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بجٹ ۳۷-۱۹۳۶ء کے متوقع فاضلے سے دو کروڑ روپیہ کا ریزرو فنڈ اس غرض کے لئے مخصوص کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ صوبجات کو ۳۷-۱۹۳۶ء میں امدادی رقومات نہ دے دی جائیں۔

صوبجات پٹ سن کے مطالبات

پٹ سن کی برآمد پر محصول لگانے سے جو آمدنی ہوگی اس کا پچاس فی صدی حصہ صوبجات پٹ سن کو دینا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں پہلے ہی منظور کیا جا چکا ہے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس ڈیوٹی کا بار صناعین پر پڑے گا لیکن سر آٹو نیمیر کا بیان ہے کہ اول تو اس کے ثبوت میں کوئی اعداد و شمار پیش نہیں کئے گئے، اور دوسرے کوئی ٹیکس ایسا نہیں ہوتا جو سب باشندگان ملک پر مساوی یا نزاتراً نافذ ہو۔ ضرور ہے کہ کوئی نہ کوئی حصہ آبادی اس کے بڑے اثرات محسوس کرتا رہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کی آمدنی سے بھی فائدہ نہ اٹھائیں۔

بہرحال سر آٹو نیمیر کا خیال ہے کہ پٹ سن پر یہ محصول برآمد جائز ہے۔ اور اس نے سفارش کی ہے کہ صوبجات کو اس میں مزید حصہ دیا جانا چاہیے۔ یعنی بجائے پچاس فیصدی کے ان کا حصہ ساڑھے باسٹھ فی صدی کر دیا جائے۔

اس ساڑھے بارہ فیصدی کے اضافے سے صوبجات کی آمدنی میں مرکزی مصارف کے دوش بدوش حسب تفصیل ذیل اضافہ ہوگا۔

بنگال ۴۲ لاکھ۔ بہار ½۲ لاکھ۔ آسام ½۴ لاکھ۔ اڑیسہ ½۲ لاکھ سے کچھ زائد۔

دوسرے الفاظ میں علاوہ اس بوجھ کے جو برما کی علیحدگی اور صوبجات کی امداد سے مرکزی میزانیہ پر پڑے گا۔ یہ نصف کروڑ سے زائد کا خرچ بھی مرکز کو برداشت کرنا پڑے گا۔

نیمیر رپورٹ کی منظوری

نیمیر رپورٹ کی اشاعت پر ایک ہمہ گیر صدائے احتجاج بلند ہوئی صوبہ متوسط کے سوا کسی صوبہ نے نیمیر کی سفارشات کو قابل قبول نہ سمجھا۔ اس

کی رپورٹ کے غیر جانبدار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

صوبائی شکایات

بعض صوبہ جات کو شکایت ہے کہ دوسرے صوبہ جات کے مقابلہ میں ان کو جو زرِ امداد دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ مثلاً اڑیسہ کا خیال ہے کہ جہاں سندھ کو ایک کروڑ پانچ لاکھ روپیہ بطور امداد دیا گیا ہے وہاں اُسے صرف پچاس لاکھ روپیہ دیا جائے گا۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ امداد کی تقسیم استحقاق کے عوض صوبہ جات کی حقیقی ضرورت کو مدنظر رکھکر کی گئی ہے اس لئے قدرتی طور پر یہ تقسیم مستبدانہ اور غیر منصفانہ ہے، دوسرے الفاظ میں جن صوبوں نے اپنی مالیات کا انتظام نہایت کفایت اور قابلیت سے کیا ہے ان کو فضول خرچ صوبہ جات کی نسبت بہت کم رقم بطور امداد دی جائے گی۔ اور یہ سراسر ناانصافی ہے۔ مثلاً بمبئی کو شکایت ہے کہ کفایت اور اقتصاد کے بارے میں اس کی گذشتہ سولہ برس کی انتہائی مساعی کی کاوش کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس کا مطالبہ ہے کہ انکم ٹیکس کا ایک معتدبہ حصہ اسے دیا جائے، کیونکہ ۲۵ فیصدی محصولِ آمدنی احاطہ بمبئی میں سے ہی وصول ہوتا ہے۔ اور بمبئی نے صنعتی آبادی کی کئی ضروریات کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے بمبئی گورنمنٹ نے اس خیال کو بھی رد کیا ہے کہ سندھ کی علیحدگی کے بعد اسے کچھ مالیاتی سکھ نصیب ہوا ہے۔ پھر بمبئی گورنمنٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر بنگال کو پٹ سن کے محصولِ برآمد کا حصہ دیا جا سکتا ہے تو بمبئی کو روئی کے محصولِ برآمد کا حصہ کیوں نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح مدراس گورنمنٹ کا خیال ہے کہ اسے انکم ٹیکس کا زیادہ حصہ ملنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ نیمیر رپورٹ کی رو سے اسے صرف بیس فیصدی حصہ دیا گیا ہے۔ دراں حالیکہ آبادی کی رو سے اسے چوبیس فیصدی کا حق حاصل تھا۔

بہار اپنے آپ کو سب سے مفلس اور غریب صوبہ بتا کر مطالبہ کرتا ہے کہ امداد کی تقسیم کم از کم آبادی کے لحاظ سے ضرور ہونی چاہیئے تھی۔

پنجاب کو خطرہ ہے کہ اگر نیمیر رپورٹ پر عملدرآمد کیا گیا تو اُسے مرکز سے اب کی نسبت ۵ لاکھ روپیہ سالانہ کم ملے گا۔

صوبہ متحدہ کو بنگال اور بمبئی کے بڑے بڑے حصوں پر رشک ہے، اور اس کی خواہش ہے کہ اسے زیادہ رقم دی جائے۔ خواہ اس کے لئے صنعتی صوبہ جات کے مفاد کو قربان کرنا پڑے۔

ان تمام شکایات کا جواب سر آٹو غالباً یہ دیں گے کہ ان سب کی بنیاد نظریات پر ہے، ورنہ عملی طور پر جو تقسیم کی گئی ہے اس سے اچھی تقسیم کا معرض عمل میں لانا موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ سر آٹو کی سفارشات میں قومی فائدہ کو انفرادی فائدہ پر ترجیح دی گئی ہے، اور اگر وہ صوبہ جات کو مزید زرِ امداد دینے کی سفارش کرتے تو اس زائد بوجھ کو بہرحال مرکز کو ہی برداشت کرنا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اجتماعی مفاد کے خلاف ہوتا۔

مرکز کی ضروریات

چونکہ صوبجات کو تعمیری اور ترقی کرنے والے قومی محکمہ جات تفویض کئے گئے ہیں اس لئے ان کو عام حالات میں مرکز کی نسبت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے، لیکن سر آٹو نیمیر کا یہ خیال بھی درست ہے کہ اس مرحلہ پر مرکزی بجٹ کے استحکام کا خاص رکھنا اشد ضروری ہے۔

مرکز کو بعض اہم جمعیتہ ہند مقاصد کے لئے کثیر رقم درکار ہوگی۔ مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا (مرکز) کا یہ فرض ہے کہ ملک کو خارجی حملوں سے محفوظ رکھے۔ اندرونی شورش کا قلع قمع کرے۔ اور نقد اور قرض کے بارے میں ملک کی ساکھ قائم رکھے۔

علاوہ ازیں جب تک مرکز کی مالیاتی حالت مستحکم نہ ہوگی ریاستیں وفاق میں شامل ہونے سے تامل کریں گی۔ پھر جدید دستور اساسی کے سلسلے میں مرکز کو فیڈرل کورٹ وغیرہ بنانے کے لئے روپیہ کی اشد ضرورت ہے۔

اندریں حالات اگر مرکز صوبجات کو زیادہ امدادی رقومات دے تو دوسرے الفاظ میں وہ اپنی مالیاتی حالت کو معرض خطر میں ڈال رہا ہوگا۔

یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ جہاں تک فوجی اور بحری اخراجات کا تعلق ہے موجودہ صورت حالات میں ان میں کسی قسم کی کمی کی امید رکھنا

عبث ہے۔

یہ تسلیم ہے کہ حکومت کے بعض موجودہ اخراجات ناروا ہیں۔ لیکن سر آٹو نیمیر نے جو سفارشات کی ہیں وہ موجودہ اخراجات کی تقسیم کو صحیح اور جائز فرض کر کے کی ہیں۔ اس لئے الزام [illegible] موصوف پر نہیں آسکتا۔ یا تو آپ کو حکومت ہند کی مالیاتی پالیسی کو [illegible] بدلنا پڑے گا۔ اور یا سر آٹو کی موجودہ سفارشات پر مہر تصدیق ثبت کرنا پڑے گی۔

مجوزہ اسکیم کی کامیابی

چونکہ انکم ٹیکس کی بابت کی تقسیم [illegible] ملک کی آمدنی کے ساتھ شروع ہوتی ہے اس لئے مجوزہ سکیم جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر ریلیں نہایت کامیابی کے ساتھ چلائی جائیں۔ اس کے لئے ریلوں کے اخراجات پر نظر ثانی اور ریل اور لاری کا اتحاد وغیرہ تجاویز ہیں۔

علاوہ ازیں یاد رکھنا چاہیئے کہ انکم ٹیکس کی آمدنی ابھی دس سال سے قبل صوبہ جات میں تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ اس عرصہ میں صوبجات کو تخفیف اور کفایت کے اصول پر عملدرآمد کرنا ہوگا۔

پھر وفاقی مالیات کی کامیابی کا انحصار بین الاقوامی حالت کی بہتری پر بھی ہے۔ جب تک اقتصاد عالم اپنی عام حالت کو نہیں آتا ہندوستان کی مالی حالت میں بہتری کی توقع رکھنا بھی مشکل ہے۔

خدمتِ وطن

آؤ کچھ باہمی صلاح کریں
آؤ کچھ کوشش فلاح کریں

آؤ عزمِ خیالِ کار کریں
آؤ فکرِ مآلِ کار کریں

آؤ غمخواری حیات کریں
آؤ سعی ترقیات کریں

آؤ بابِ شفا تلاش کریں
آؤ دُکھ کی دوا تلاش کریں

آؤ درہائے جہل بند کریں
آؤ علمی نوا بلند کریں

آؤ تا منزل مفاد بڑھیں
آؤ تا غایت مراد بڑھیں

آؤ فکرِ حیاتِ ملک کریں
آؤ سعی نجاتِ ملک کریں

آؤ جو گر رہے ہیں اُن کو اُٹھائیں
آؤ جو مر رہے ہیں اُن کو جلائیں

آؤ کچھ خدمت وطن کر جائیں
آؤ اس دشت کو چمن کر جائیں

مانو آزاد کا کہا مانو
فرصت کار مغتنم جانو
کام کا موقع و محل سمجھو
ورنہ بربادیاں اٹل سمجھو

حکیم آزاد انصاری

غزل مسلسل

حضرت کیفی کی یہ مسلسل غزل جس وقت شرفِ صدور لائی۔ اُس وقت میری طبیعت کسی حد تک موزون تھی، ہر چند قلب پر وہ ناقابلِ شرح حالت تو طاری نہ تھی، جو انسان کو بیخود بنا کر شعر کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تاہم ایک خفیف سی امنگ ضرور موجود تھی اور وہی امنگ اِس ترجمے کی خالق ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اصل اور ترجمے میں زیادہ بُعد نہ ہونے پائے، معلوم نہیں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ جوش

فارسی

ہاں بیا تا ایں جہاں را عالمِ دیگر کنم
شش جہت را از طلسمِ جذبِ دل ششدر کنم
قطرہ را آبِ گہر بخشم ز نیسانِ بسر شک
ذرہ را از سوزِ دل ہم پرتوِ خاور کنم
من خلیلِ عہدِ حاضر ہستم اے اربابِ دین
کعبۂ تازہ بنا در سینۂ آذر کنم
خونِ فاسد تا بریزد از رگِ اہلِ فساد
ہر نفس نفسِ سخن را ہمدمِ نشتر کنم
ضدِ تسکین و قناعت ہست دورِ انقلاب
قلبِ تسکین و قناعت را بیکے مضطر کنم
در ازل قلبِ مرا شانِ قیادت دادہ اند
اندریں طوفانِ گمراہی کرا رہبر کنم
در دلم حُبِّ جہاں۔ در چشمِ من ہر شئے حسین
جنگِ حسن و عشق را بر نوعِ تازہ سر کنم
پردہ دارِ روح و جاں گشتہ دلِ صد چاکِ من
زاہدا ایں خرقۂ صد رنگ چوں در بر کنم
چشم از جذبِ نگاہِ مستِ ساقی شد فراخ
سر چرا اندر ہوائے چشمۂ کوثر کنم
گم شود یکسر ز عالم امتیازِ کفر و دیں
گر حدیث از وارداتِ قلبِ کیفی سر کنم

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

ترجمہ

آ کہ اِس کون و مکان کو عالمِ دیگر کروں
شش جہت کو جذبِ دل کے سحر سے ششدر کروں
قطرے کو نیسانِ چشمِ تر سے دوں آبِ گہر
ذرے کو سوزِ جگر سے خسروِ خاور کروں
ہاں خلیلِ عصرِ حاضر ہوں میں اے اربابِ دین
کعبۂ نو سے نہ کیوں روشن دلِ آذر کروں
خونِ فاسد تا ٹپک جائے رگِ اشرار سے
ہر نفس انفاسِ سخن کو ہمدمِ نشتر کروں
ضدِ تمکین و قناعت ہے زمانِ انقلاب
قلبِ تمکین و قناعت کو نہ کیوں مضطر کروں
دل مرا روزِ ازل سے ہے قیادت آشنا
دل سا قائد چھوڑ دوں تو پھر کسے رہبر کروں
دل میں ہے حُبِّ جہاں آنکھوں میں ہے ہر شئی حسین
کیوں نہ جنگِ عشق کو بر وضعِ تازہ سر کروں
پردہ دارِ روح و جاں ہے قلبِ صد پارہ مرا
شیخ اِس صد رنگ خرقے کی ہوس کیونکر کروں
دیدۂ دل ہے نگاہِ مستِ ساقی سے فراخ
کس بنا پر آرزوئے چشمۂ کوثر کروں
امتیازِ کفر و دیں اُٹھ جائے بزمِ دہر سے
جوش شرحِ وارداتِ قلبِ کیفی گر کروں

جوش ملیح آبادی

ہم ان پر ماتم نہ کریں گے، ان دنوں پر جو گذر گئے،
بد انجامی کے سایہ تاریک کی چادر سیاہ اُن پر پڑ گئی، غم سے
ان ایامِ رفتہ میں اک طوالت پیدا ہوتی ہے۔ اور تلخ کامی سے
وہ تلخ تر ہوتے ہیں۔

ان کے ہموم و غموم کے ہجوم اک دل بادل تھے، اور ان
کی خال خال خوشیاں اور خرمیاں اک چشمک برق اور تبسم شرار!
تاہم اب، جبکہ ان کی پرچھائیاں ہم پر سے گذر چکی ہیں، آؤ ہم اس
منظر مستقبل کا خیر مقدم کریں جو مطلعے پر بے نقاب ہو رہا ہے۔ ہم نے
محبوب امیدوں کو آغوش میں پالا ہے، ہم نے دلیرانہ عزائم کی "سازشیں" کی ہیں
ہم ان کا تعاقب کرتے رہے تا آنکہ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ سب پُر فریب
خواب تھے!۔

خزانِ دولت اک برف کی قاش کی طرح ہمارے ہاتھ کی گرم گرفت میں
پگھل کر رہ گئے، اور جو اقدامات ہم نے کئے ذرات ریگ کی طرح گریز پا ثابت ہوئے
تاہم، کیا ہم مایوس ہو جائیں گے، جبکہ ہنوز تندرستی ہماری ہے
اور جبکہ ہنوز ہماری عزت و حرمت پر حرف نہیں آیا ہے!

ہاں کیا ہم مایوس ہو جائیں گے۔ جبکہ کتاب وقت کے صفحات اب بھی
شاندار کارناموں کے آب زر سے لکھے ہوئے نوشتوں سے روشن ہیں۔ جبکہ ان
عصاہائے ہمت و عزیمت سے دستگیری حاصل کر کے جو عصائے شاہی سے
بھی زیادہ طلائی واقع ہوئے ہیں، ہم قدیم شہداء کے قدم بقدم گامزن
ہو سکتے ہیں۔

جبکہ شرف بشریت آج بھی ایسے حقائق کی سرگوشیاں ہم سے کر رہا ہے
جن کا خطاب دل سے ویسا ہی ناقابل رد ہے، جیسا کہ نغمے کا سامعہ سے ہوا کرتا ہے
ہاں کیا ہم مایوس ہو جائیں گے، جبکہ ہماری چشم نظارہ ہنوز باز ہے۔ اور ارض و سما
بر و بحر کے مناظر اس پر بے نقاب ہیں، جبکہ آفتاب عالمتاب کی شعاعیں خوابگاہِ
قلب کی بہجت و مسرت کو جگاتی ہیں، اور آسمان کے ستارے ظلماتِ شب میں آبِ حیات
کے حباب چمکاتے ہیں۔

جبکہ سازِ کائنات کا ایک ایک آہنگ ہماری خلوتِ دل میں وجد و کیف کی بارش
کر دیتا ہے!

ہاں اللہ! ہمیں اپنی یہ بے سود ماتم گری ختم کرنے دیجئے، ان ایام زریں
پر جو غروب ہو گئے اور ان نظارہ ہائے رنگیں پر جو سیاہ پڑ گئے،
بلکہ ایمان راسخ کے ساتھ جس کی عروۃ الوثقیٰ کا اعتصام کبھی ہمارے ہاتھوں پر حرام
نہ ہو اور ایسی جرأت آزمائی اور عزیمت پختگی کے ساتھ جسے مصیبت و صعوبت متزلزل نہ کر سکے
امید کے لہراتے ہوئے "پرچم" پر ہماری نظریں مرکوز ہیں۔
اور اگر قسمت آخر لمحے تک بھی جفاکار اور فریب کار ثابت ہو، ہم
ہمیں وسیع و رفیع افق مستقبل (ہی) پر نظر رکھنی چاہیئے، "قبر ماضی" میں کبھی جھانکنا نہ چاہیئے۔ (ترجمہ از انگریزی)

سپاہی کی موت

ڈرامہ

علی سردار جعفری

افراد:

سپاہی	ہندوستانی
نرس	فرانسیسی
ڈاکٹر	انگریز
سارجنٹ	انگریز

منظر:

اکتوبر ۱۹۱۴ء کی ایک شام

فرانس کی مشرقی سرحد پر ایک چھوٹے سے اسکول کی عمارت جواب ایک فوجی اسپتال میں تبدیل ہو چکی ہے ایک کمرہ جو مجروح سپاہیوں سے بھرا ہوا ہے دروازے کے قریب ایک ہندوستانی سپاہی جس کے سر میں گولی لگی ہے کمزوری کی حالت میں پڑا ہے۔ ایک فرانسیسی نرس جس کی عمر مشکل سے بیس بائیس سال کی ہوگی اس کے سرہانے خاموش کھڑی ہے۔

سپاہی۔ ہندوستان میں میرا گھر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہے .... ایک چھوٹا سا گھر دریا کے کنارے .... گنگا اس دریا کا نام ہے۔ میری ایک بیوی ہے جو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں مجھے آج تک یاد ہیں۔

نرس۔ (گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اپنا منہ سپاہی کے منہ کے قریب لے آتی ہے) تمہیں ڈاکٹر نے زیادہ باتیں کرنے کی ممانعت کر دی ہے دیکھو ورنہ تمہاری تکلیف بڑھ جائے گی۔

سپاہی۔ مجھے گھر سے آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔ وہ روز میرا انتظار کرتی ہوگی میں نے اسے آج تک کوئی خط نہیں لکھا۔ وہ سمجھتی ہوگی کہ میں لڑائی میں مار ڈالا گیا۔

نرس۔ نہیں وہ ایسا نہیں سمجھتی ہوگی۔

سپاہی۔ میرے ایک چھوٹا سا لڑکا بھی ہے۔ جب میں آیا تھا اُس وقت وہ دو مہینے کا تھا۔ اب تو پاؤں پاؤں چلنے لگا ہوگا ....

نرس۔ کیوں نہیں۔

سپاہی۔ .... دن بھر مجھے آواز دیتا ہوگا۔ اس وقت میری بیوی خیال کرتی ہوگی کہ میں اُسے بھول گیا۔

نرس۔ نہیں وہ یہ خیال کرنے کے عوض کہ تم اُسے بھول گئے یہ سوچتی ہوگی کہ تم اُسے ہر وقت یاد کرتے ہو۔

سپاہی۔ وہ خیال کرتی ہوگی کہ میں اسے بھول گیا .... تالاب کے اس کنارے کو بھول گیا جہاں وہ صبح سے شام تک لکڑیاں چُنا کرتی تھی اور جب میں کھیتوں سے واپس ہوتا تھا تو ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر آتے تھے۔

نرس۔ (آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں) سنو میں تمہیں اپنے بچپن کا ایک قصہ سناؤں (سپاہی کمزوری کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہے۔ نرس سمجھتی ہے کہ وہ قصہ سننے کے لئے چپ ہو گیا ہے) میں بچپن میں ایک گاؤں میں

رہا کرتی تھی۔ میرے گھر کے پاس ہی ایک بڑھیا رہا کرتی تھی۔ میں اُس سے کہانی سننے کے لئے اس کے پاس جایا کرتی تھی، مگر میری ماں مجھے وہاں جانے سے ہمیشہ روکتی رہتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ بڑھیا جادوگرنی ہے ----------

سپاہی ۔ (بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے) آہ! میرے سر میں کتنی تکلیف ہے جب کبھی گھر پر میرے سر میں درد ہوا کرتا تھا تو میری بیوی اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میری کنپٹی دبایا کرتی تھی۔ اس کی نرم نرم انگلیاں میری سخت ہڈیوں سے درد کھینچ لیا کرتی تھیں۔ اس کی صندلی انگلیاں میرے سر کے درد کا کتنا اچھا علاج تھیں۔

نرس ۔ (محبت سے) لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔

سپاہی ۔ نہیں میرے سر کو ہاتھ نہ لگانا، وہ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے، اس میں گولی پیوست ہوچکی ہے اور جب تک وہ نہ نکلے گی تکلیف کم نہ ہوگی۔

نرس ۔ تم بھی کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارے گولی نہیں لگی ہے۔ صرف ذرا سی چوٹ آگئی ہے۔ اب تم بالکل اچھے ہو۔ (اپنی مخملی انگلیاں اُسکی پیشانی پر آہستہ آہستہ پھیرتی ہے)

سپاہی ۔ تم مجھے دھوکا دے کر بہلانا چاہتی ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پرسوں شام کو ایک گولی میرے سر میں لگی تھی، ڈاکٹر نے اس کو ابھی تک نہیں نکالا ہے۔

نرس ۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔

سپاہی ۔ خواب نہیں۔ توپوں کے گرجنے کی آواز اور گولیوں کی سنسناہٹ ابھی تک میرے دماغ میں گونج رہی ہے۔ اُف کس قدر ہولناک جنگ ہے۔ گولیاں اولوں کی طرح برستی ہیں، انسانوں کی جان کی کوئی قیمت باقی نہیں، جیسے وہ اسی لئے پیدا ہوئے تھے۔

نرس ۔ (سپاہی کا خیال بٹانے کے لئے) دیکھو دروازے سے باہر کتنی خوبصورت شام ہے۔

سپاہی ۔ ہندوستان کی شام زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ گرم ملک کی گرم شام ---------- وہاں میرے کھیت ہیں، ہندوستان میں، تم سمجھتی ہو کچھ! اب تو وہ بیکار پڑے ہوں گے۔ کوئی انہیں جوتنے والا بھی نہ ہوگا۔

نرس ۔ جب تم اچھے ہوکر یہاں سے ہندوستان واپس جاؤ گے تو میں وہاں کی شام کا لطف اُٹھانے کے لئے تمہارے ساتھ چلوں گی۔

سپاہی ۔ (مسکراتا ہے) وہاں میری بیوی موجود ہے۔

نرس ۔ تو کیا حرج ہے؟

سپاہی ۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔

نرس ۔ کوئی میں تم سے شادی تو کروں گی نہیں، میں تو ہندوستان میں گھوم پھر کر واپس آجاؤں گی۔

(سپاہی کوئی جواب نہیں دیتا اور اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ جیسے غنودگی طاری ہو رہی ہو۔ نرس اس کی نبض دیکھتی ہے اور اطمینان کا سانس لے کر کھڑی ہو جاتی ہے، اور دوسرے زخمی سپاہیوں کے دیکھنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر داخل ہوتا ہے، نرس کو انگلی کے اشارے سے دروازے کے قریب بلاتا ہے)

ڈاکٹر ۔ ایک سارجنٹ زخمی ہوکر آیا ہے۔

نرس ۔ لیکن یہاں تو بالکل جگہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر ۔ ہمیں اس کے لئے تو جگہ پیدا کرنی پڑے گی۔

نرس ۔ کیا سارجنٹ کی حالت امید افزا ہے؟

ڈاکٹر ۔ اس سے کوئی بحث نہیں۔

نرس ۔ اگر اس کی حالت اس قابل ہو کہ وہ بچ جائے تو کوئی انتظام کیا جائے۔

ڈاکٹر ۔ (نرس کے الفاظ کی پروا کئے بغیر) یہاں کے زخمیوں میں سب سے زیادہ کس کی حالت خراب ہے؟

نرس ۔ جس کے پیٹ میں گولی لگی ہے اُسے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا، اب اُس کے بدن میں زہر پھیل گیا ہے۔

ڈاکٹر ۔ اور یہ ہندوستانی سپاہی جس کے سر میں گولی لگی ہے؟

نرس ۔ یہ تو بچ سکتا ہے اگر گولی اس کے سر سے نکل جائے۔

ڈاکٹر ۔ میرے خیال میں اس کی جگہ خالی ہو سکتی ہے۔

نرس ۔ کیسے؟

ڈاکٹر ۔ اسے زہر دے دو۔

نرس ۔ زہر؟ کیوں؟

ڈاکٹر ۔ ہمیں ایک جگہ کی ضرورت ہے آخر سارجنٹ کو کہاں رکھیں؟

نرس ۔ اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ ایک مرتے ہوئے سارجنٹ کے لئے ایک زندہ سپاہی کو زہر دیدیا جائے؟

ڈاکٹر ۔ ہندوستانی وارڈ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ یہاں انگریزی وارڈ میں لایا گیا تھا اب ایک انگریز سارجنٹ آگیا ہے، اس لئے ہندوستانی سپاہی کو جگہ خالی کر دینی چاہیئے۔

نرس ۔ یہاں سوال موت اور زندگی کا ہے۔ انگریز اور ہندوستانی سے کیا مطلب۔

ڈاکٹر ۔ تمہیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ تمہیں صرف میرے حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے۔

نرس ۔ میں یہ نہیں کرسکتی۔

ڈاکٹر ۔ تمہیں کرنا پڑے گا (ڈاکٹر چلا جاتا ہے۔ نرس خاموش کھڑی رہ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں اس کی پریشانی ظاہر کر رہی ہیں۔ ہندوستانی سپاہی آہستہ سے کراہتا ہے۔ نرس اس کے قریب آجاتی ہے)

سپاہی ۔ (اپنی دیہاتی زبان میں) دیکھو ہمرے مُوڑ ما ابھی لے گولی (ک) نسان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم بڑے دن ہواں رہین تو ہیں بسرٹن ناہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ٹھو نرس ہمرے ساتھ آدت رہی مُلا ہم ناہیں لائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس تو ہری کھائر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُو بڑی نیک رہی مُلا ہم کہہ دیا کہ تو ناہیں جائے سکتا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (نرس اُس کی باتیں نہیں سمجھتی وہ ٹمٹماتے ہوئے لیمپ کی طرف دیکھ رہا ہے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے دادا (اپنے ہاتھ سے سر پر بندھی ہوئی پٹی نوچنے لگتا ہے)

نرس ۔ (جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) تم کیا کر رہے ہو؟

سپاہی ۔ (اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے) آہ! میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سے کہو کہ گولی نکال دے ورنہ میں مر جاؤں گا۔ (نرس اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں سہلاتی ہے) بتاؤ ڈاکٹر گولی کب نکالے گا؟

(نرس خاموش ہے) بولو میرے سر میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔

نرس ۔ تم ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (زبان لڑکھڑاتی ہے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک خوراک دوا پی لو۔ کیوں؟ پیوگے؟

سپاہی ۔ اس سے کیا ہوگا؟

نرس ۔ تمہاری تکلیف رفع ہو جائے گی۔

سپاہی ۔ بغیر گولی نکلے تکلیف کم نہیں ہوسکتی، اس کا وزن میرے دماغ میں محسوس ہو رہا ہے ۔ (نرس سپاہی کو چھوڑ کر کمرے سے باہر جانے لگتی ہے) تم کہاں جا رہی ہو؟

نرس ۔ (مڑکر) تمہارے لئے دوا لے آؤں۔

سپاہی ۔ نہیں رہنے دو۔ مجھ سے بیٹھ کر باتیں کرو۔ تمہاری باتوں سے میری تکلیف بہت کم ہو جاتی ہے (نرس بغیر جواب دیئے ہوئے چلی جاتی ہے) اس دوا سے کیا ہوسکتا ہے۔ میں تین دن سے دوا پی رہا ہوں۔ یہ سب میرے سر کا آپریشن کیوں نہیں کرتے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف کس قدر اندھیرا ہے۔ کمرہ بالکل تاریک ہو رہا ہے۔ آج لیمپ بھی نہیں جلا۔ موت کا سا ڈراؤنا سناٹا۔ اُف، خدا کی پناہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سکوت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔

وہ ابھی تک نہیں آئی۔ میری باتوں سے گھبرا گئی شاید۔ وہ خفا ہو گئی ہوگی، میں نے اُسے ہندوستان لے جانے سے انکار کردیا جب میں گھر واپس جاؤں گا تو اپنی بیوی کو یہ سب قصہ سناؤنگا۔ (نرس ایک چھوٹے سے گلاس میں دوا لے کر آتی ہے۔)

نرس ۔ لو میں آگئی۔

سپاہی ۔ میں دوا نہیں پیوں گا۔

نرس ۔ دیکھو میرے ہاتھ سے پی لو۔ ابھی تکلیف کم ہو جائے گی۔

سپاہی ۔ تم بڑی اچھی ہو۔

نرس ۔ تم اس پر بھی میرا کہنا نہیں مانتے۔

سپاہی ۔ اچھا دوا لاؤ (اپنا منہ کھول دیتا ہے۔ نرس کانپتے ہوئے ہاتھ سے دوا اُس کے مُنہ میں اُنڈیل دیتی ہے۔ گلاس چھوٹ کر سپاہی

کی گردن پر گر پڑتا ہے۔ نرس دروازے کی طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ سپاہی کے تیز تیز سانس اور ہاتھ پاؤں ٹپکنے کی آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے تو انگلیاں دے لیتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سپاہی کی بیوی اور چھوٹے سے معصوم بچے کی شکل پھر جاتی ہے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے لیکن اب بھی اندھیرے میں تصویریں مٹتی اور بگڑتی نظر آتی ہیں)

(ڈاکٹر داخل ہوتا ہے اُس کے ساتھ دو آدمی اور ہیں)

ڈاکٹر۔ (نرس کا شانہ پکڑ کر ہلاتا ہے) یہاں کھڑی ہوئی کیا کر رہی ہو۔

نرس۔ (گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہے) اس غریب کو زہر تو دید یا اب کیا کروں؟

ڈاکٹر۔ اس کو یہاں سے فوراً اُٹھوا دو تاکہ سارجنٹ کو لا کر کوئی فوری تدبیر کی جائے۔ اُس کے سینے کا خون ابھی تک بند نہیں ہوا۔

نرس۔ (ڈاکٹر کے ساتھ والے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھتی ہے) اس کو اُٹھالے جاؤ۔ (ادھر یہ آدمی مرے ہوئے سپاہی کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں ادھر دو آدمی سارجنٹ کو لے کر داخل ہوتے ہیں۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی ہے اور سارے کپڑے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اسے بستر پر لٹا کر جلدی جلدی اس کے کوٹ کے بٹن کھولتا ہے۔ سینے پر بائیں طرف دل کے قریب ایک زخم نظر آتا ہے جس سے خون چشمے کی طرح اُبل رہا ہے) یہ تو بس تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔

ڈاکٹر۔ ہمیں اس سے کیا ہمارا کام تو صرف کوشش ہے۔

نرس۔ (طنزیہ) اور کیا!؟

(سارجنٹ کے ہاتھ پاؤں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوتی ہے۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور سینے کا خون خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اُٹھ کر باہر چلا جاتا ہے۔ نرس سارجنٹ کے قریب آتی ہے اور تھکے ہوئے ہاتھوں سے اُس کے کوٹ کے بٹن لگانے لگتی ہے)

کتب خانے سے خطاب

اے صحافت گاہِ دنیا مخزنِ علم و ادب
مرکزِ اخبارِ عالم، معدنِ علم و ادب

اے نشاطِ روح اے سرمایہ دارِ چشمِ شوق
تجھ پہ ہے سو جان سے قربان نگاہِ اہلِ ذوق

اے مجسم علم و حکمت، پیکرِ نقش و نگار
اے فروغِ بزم، اے زینت دہِ لیل و نہار

سارے عالم میں نمایاں ہیں تری عالی صفات
فیض پاتی ہے ترے مرکز سے ساری کائنات

درس لیتے ہیں کتابوں سے تری دل اور دماغ
روشنی پاتا ہے تجھ سے علم و حکمت کا چراغ

فلسفی کیا، منطقی کیا، اور کیا اہلِ زباں
تجھ سے وابستہ ہے ہر اہلِ نظر نکتہ داں

اک کتب خانہ ہے تو یا آئینہ خانہ ہے تو
کون سے جلوے ہیں تجھ میں کس کا کاشانہ ہے تو

کاش اس سے بھی سوا ہو تیرا رتبہ تیرا نام
دور کر دے کاش جہلِ ہند کو تیرا پیام

اب بھی پنہاں تجھ میں تیرے ارتقا کا راز ہے
اب بھی مستقبل سے وابستہ ترا آغاز ہے

سید مشتاق علی مشتاق
لائبریرین موتی لال پبلک لائبریری جھانسی

سرمایہ داری اور اُس کے اثرات

جوگندر سنگھ چھیبہ ۔ لائل پور

افلاس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ افلاس کی لعنت غریب آدمی کی قوتِ احساس کو فنا کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ خود غریب بذاتِ خود اِس وبا کے پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔ (برنارڈ شا)

ہر وہ مزدور جو اپنی جماعت کو من حیث الجماعت ترقی یافتہ دیکھنے کا متمنی ہو اُس میں دور اندیشی کا مادہ پیدا ہونا چاہیئے۔ اور ایسی دور اندیشی حاکم جماعت کے تصورات سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ (ڈبلیو۔ ڈبلیو کریک)

ہم نہایت ہی نجس ماحول میں گرفتار ہیں۔ ہم غریب اور پسماندہ ہیں۔ کیونکہ ہم جاہل اور نجس ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم جاہل اور نجس ہیں، اس لئے غریب اور پسماندہ ہیں۔ حقیقت بہر کیف ایک ہی ہے۔

وہ جماعت جسے زندگی کے مادّی لوازم میسر ہیں، اُسے زندگی کے غیر مادی ذرائع بھی حاصل ہیں، اور واقعہ ہے کہ نوعِ انسان کا وہ محدود گروہ جس کے قبضۂ اختیار میں۔ زمین۔ مکان و ریلیں۔ جہاز اور کارخانے ہیں۔ حقیقتاً اسی کے پنجۂ اقتدار میں مکاتب۔ کلیسا۔ اخبارات اور تفریح گاہوں کی عنانِ انصرام ہے۔ تا آنکہ وہ متذکرہ صدر چیزوں پر کامل قدرت حاصل کر سکے۔

اگر نظرِ تعمق سے دیکھا جائے تو ان تمام عناصر سرمایہ کی تباہی کے ذرائع بھی ہماری بے زری اور جہالت میں پنہاں ہیں۔ بحیثیت ایک انسان ہونے کے ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم سرمایہ داری کے خوف کو اپنے دلوں سے نکال باہر کریں۔ جب مزدور، دانا بینا اور توانا ہو جائیں گے تو یہ لاینحل مسئلہ خود بخود سلجھا ہوا نظر آئے گا۔

سرمایہ داری صرف اقتصادیات اور سیاسیات کا مرکب ہی نہیں ہے، بلکہ اُس کی ہیئت ترکیبی میں نفسیات اور احساسات کو بھی شامل کیا گیا ہے، سرمایہ داری براہِ راست ہماری ذہنیت کی غلامی اور ہماری جسمانی قوتوں کی موت کا باعث بنتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سرمایہ داری ہماری روحانیت کو ہمارے جسم سے زیادہ اور مستقل نقصان پہنچاتی ہے۔

سرمایہ داری ہمیں اپاہج کر دیتی ہے، اندھا کر دیتی ہے، فاقہ کش بنا دیتی ہے، ہمارے جسموں میں زہر کی طرح سرایت کر دیتی ہے، یہاں تک کہ ہمیں ہلاک کر ڈالتی ہے، اربابِ بصیرت دیکھتے ہیں کہ آج فرزندانِ آدم کی ایک معتد بہ جماعت غیر قدرتی موتوں کو ترجیح دیتے ہوئے عدم کی ابدی نیند سو جاتی ہے۔ ہر روز کے خونچکاں حادثات جو بے شمار جانوں کے اتلاف پر مختتم ہوتے ہیں۔ ہمارے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں، اور اُن کا سدِّ باب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ ہم موت کو اُس زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو ہمیں سرمایہ داری کے آہنی چنگل میں گرفتار رہنے پر مجبور کر دے۔

سرمایہ داری کی تباہیاں اور ہلاکت آفرینیاں اسی امر سے واضح ہو جاتی ہیں کہ ہر سال بے شمار کان کن۔ کارخانوں میں کام کرنے والے اور دیگر مزدور اپنی عزیز جانیں سرمایہ داری کی قربانگاہ کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ جن کے یتیم بچوں اور بے گھر، بیواؤں [illegible]

پرسانِ حال نہیں رہتا۔ یہی نہیں بلکہ ہزاروں آدمی تپِ دق سے مر جاتے ہیں، اور اکثر معصوم جانیں اپنی سالگرہ تک پہنچے بغیر والدین کو داغِ مفارقت دے جاتی ہیں۔

علیٰ ہٰذالقیاس۔ مزدور کے بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی موت کا دیو اُن افلاس کدوں پر مسلط نظر آنے لگتا ہے، اور افلاس کا ہر حزیں اُمید قضا کی برقِ تیز کا ہدف بنا رہتا ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کے ظلمت کدوں کے نصف سے زیادہ چراغ اجل کی بادِ صرصر سے پانچویں برس میں قدم رکھنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں۔

دنیا کے اُس قیامِ امن میں جو سرمایہ داری کے توسل سے ہوتا ہے اُسی طرح اور اتنی ہی تعداد میں ہماری جانیں، ہماری ذاتیں اور ہمارے وجود قربان کئے جاتے ہیں جتنے کہ ایک عام جنگ کے فرد کرتے ہیں۔ سرمایہ داری وہ لعنت ہے جو ہمارے اعضا کو معطل اور ہمارے قویٰ کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اور ہمارے جسم میں ایک مستقل مہلک مرض کو اس طرح کر دیتی ہے جو آہستہ آہستہ ہماری غم زدہ جانوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ایک فاقہ کش مزدور کے لئے یہ انقطاعِ حیات آیا اجل کی مہربانی ہے یا نامہربانی۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ سرمایہ داری براہِ راست ہماری جسمانی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اس سے زیادہ ہماری روحانی موت کی وجہ بنتی ہے۔

سرمایہ داری ایک طرف تو ہمارے لئے زہریلی خوراک مہیا کرتی ہے اور دوسری طرف ہمارے دماغ میں پراگندگی پیدا کرتی ہے۔ انھیں اثرات کے ماتحت ہمارے نظریاتِ حیات۔ ہمارا نصب العینِ زندگی، اوجِ ثریا سے تحت الثریٰ پہ آگرتا ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے جسمانی نظام کو تباہی کے ہلاکت آفریں غار میں ڈھکیلتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہمارے دماغی اور احساساتی عالم میں بھی لغزشیں پیدا کرتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا دماغی جذام ہمارے جسمانی جذام سے کہیں زیادہ بُرے نتائج کا حامل ہوتا ہے، اور ہماری سیاسی جہالت، ہماری کور علمی سے کہیں زیادہ تباہ کُن ہے۔

سرمایہ داری مزدور طبقے کو صرف گمراہ ہی نہیں کرتی۔ اُس کے عقلی قواعد اور احساسات کو بھی معطل کر دیتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ مزدور کے عقلی قوا معطل کئے جاتے ہیں تاکہ اُسے گمراہ کیا جا سکے۔

سرمایہ داری نہ صرف مزدوروں کو براہِ راست تباہ کرتی ہے بلکہ اُنھیں تعلیم دیتی ہے کہ وہ اپنے کو لٹوا دیں۔ اپنے رہزنوں کی تکریم کرتے ہوئے اُنھیں اپنا نمائندہ بھی بنائیں ——— اور تباہ و برباد ہو کر بھی نہایت مسرت سے کہیں کہ ؎

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اور یہی وجہ ہے کہ امرا صرف مزدوروں کو طعام بخشنے سے ہی انکار نہیں کرتے، بلکہ اُن کا منتہائے مقصود ہے کہ یہ بچارے زیورِ علم سے بھی آراستہ نہ ہونے پائیں۔ اور شاید اِن کے اصولِ تعلیم کے رستے میں اسی لئے سنگِ گراں رکھے جاتے ہیں کہ اُن کے خوراک کے مطالبے کو پائے حقارت سے ٹھکرایا جا سکے۔

ایک مشاق اور پُرکار راہزن کی طرح سرمایہ دار پہلے اپنے شکار کے حواس پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور بعد میں اُس کے املاک کی طرف بھرپور ہاتھ مارتا ہے۔ مزید برآں امرا کا طبقہ نہ صرف اپنے مزدور غلاموں کو تباہ کرتا ہے، بلکہ سرمایہ کے بل پر ایسے غلام مزدور صفِ کارزار میں لاکر کھڑا کرتا ہے جو بذاتِ خود مزدوروں کے مقابلے میں اک آہنی جماعت ثابت ہوتی ہے، اور اس طرح کوشش کی جاتی ہے کہ غریب مزدوروں کی فلک دوز آہوں کو خنجروں کی آب سے اُن کے حلقوم میں ہی روک دیا جائے۔

سرمایہ داری ہماری دولت کی نسبت ہمارے دلوں اور دماغوں پر زیادہ تسلط اور اقتدار قائم رکھنا چاہتی ہے۔ سرمایہ داری اپنے کارکنوں کے سروں میں "سرمایہ دارانہ دماغ" اور اُن کے منہ میں "سرمایہ دارانہ زبان" پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک اٹل صداقت ہے کہ سرمایہ داری نہ صرف ہماری بے زری، تباہی، بیکاری اور خانماں خرابی کی بنیادی وجہ ہے، بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ یہ ہم مزدوروں کو تعلیم دیتی ہے کہ ہم ظالم اور بدترین دشمن سرمایہ داروں کی دل و جان سے عزت بھی کریں اور اُن کے ہر فعل کو عقل و دانش کے ارفع معیار کے مطابق سمجھیں۔ سرمایہ داری ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اپنے گلا کاٹنے والے ہاتھوں پر محبت اور عقیدت کے بوسوں کی مہریں بھی ثبت کریں اور یہ جھونپڑیوں کے باسیوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے تن، من، دھن سے محلوں اور بنگلوں میں رہنے والوں کی خدمات بجا لائیں

ہماری نجات کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ جب تک غریب مزدور خود اپنی بے مائگی اور بے بسی کا صحیح معنوں میں احساس نہ کریں گے دنیا کی کوئی قوت انھیں نہیں جگا سکتی۔ اور تاوقتیکہ وہ اپنی حقیقت اور شخصیت سے کما حقہٗ شناسا نہ ہو جائیں گے، اور انھیں اپنے مستقبل کی تعمیر کا خیال پیدا نہ ہوگا وہ قطعاً سرمایہ داری کے سنہری لیکن مضبوط جال سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہماری دنیا ابھی تک تعیس ہے کیونکہ دنیا کے بنانے والے مزدور اپنی حقیقتوں سے بے خبر اور جاہل پڑے ہیں۔ اور یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ظالم آقا مظلوم غلام پیدا نہیں کرتے، بلکہ زیادہ تر مظلوم غلام ظالم آقاؤں کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں، اس لئے وہ ہر بلا جو مزدور کے کاشانے پر نازل ہوتی ہے، صرف اُس کی اپنی غلامی اور بےحسی کی دعوت سے آتی ہے۔

واقعہ ہے کہ مزدور کی زندگی اور لطفِ حیات کے درمیان جو چیز حائل ہوتی ہے وہ صرف مزدور کی جہالت اور گم کردہ راہی ہے۔ مزدور دل کو یقین کر لینا چاہیئے کہ ایک درخشندہ اور تابندہ دنیا اُنھیں اپنی آغوش میں لینے کے لئے بیقرار ہے۔ اور عادل قدرت اُن کے عمل اور جنبش کی بیچینی کے ساتھ منتظر ہے۔

موت

موت سے نادان لرزاں کیوں ہے — تیرا مرنا آساں کیوں ہے

تجھ میں ایسی کیا شے کم ہے — جس سے مٹ جانے کا غم ہے

ربطِ جسم و جاں ہے ہستی؟ — یہ کب اے نادان ہے ہستی!

موت یہاں تک بڑھ سکتی ہے! — تیری جاں تک بڑھ سکتی ہے!

جسم نکما ہو سکتا ہے! — اس کا جوہر کھو سکتا ہے!

لیکن اس سے آگے غافل — اس کو بار نہیں ہے حاصل

اطمینان ہو حاصل دل کو — دوڑ اور جا لے اُس منزل کو

جس میں نیکی اور آزادی — دونوں ہوتے ہیں بنیادی

نیکی مالا مال کرے گی — آزادی استقبال کرے گی

نیکی اور آزادی مل کر — دل کی گہرائی میں بس کر

افشا سارے بھید کرے گی
ہستی کو جاوید کرے گی

لطیف انور گورداسپوری

ل نون کا اعلان یہاں غلط ہے۔

رقص یا جانکنی؟

آئی ہے بصد ہزار حسرت　　اسٹیج پر اک ادھیڑ عورت
گھبرا گھبرا کے آنکھ اٹھاتی　　تقدیر پہ پیچ و تاب کھاتی
ہنگامۂ فتح، آب و گل میں　　احساسِ شکستِ فاش دل میں
کھلتی ہوئی عمر کی کمانی　　پیری کی گرفت میں جوانی
بجھتی ہوئی رُخ پہ مشعلِ ناز　　لہجے میں شکستِ دل کی آواز
چشم و رُخسار پر یہ عبرت　　پیری کے نشانِ پا کی ہیبت
تھرّائی ہوئی شباب کی لَو　　رخسار پہ جھرّیوں کا پرتَو
اُڑتی ہوئی خاک سی جبیں پر　　اشکوں کا تصوّر آستیں پر
سر پہ پیری، کریہ، کھڑی　　ابرو کی کمان اُتری اُتری
رُخ پر غازہ، عرق جبیں پر　　ما بینِ امید و بیم تیور
موہوم سی لب پہ سرد آہیں　　کھوئی، نیچی، جھکی نگاہیں
سہمی سی نظر کی ترکتازی　　شرمائی ہوئی نگاہ بازی
ہر بال میں محوِ پرفشانی　　گزری ہوئی شامِ نوجوانی
پھیکی سی لبوں پہ مسکراہٹ　　پیری کے قدم کی دل میں آہٹ
ماتھا، دھڑکن سے سیلا سیلا　　انگڑائیوں کا کھچاؤ ڈھیلا
رُکتی ہوئی سانس آرزو کی　　عشوے پیاسے، نگاہ بھوکی
کب سے ہے شباب، گرمِ رحلت　　اللہ ری نزع کی طوالت

بےچین ہے، گو تنی ٹھنی ہے
یہ رقص نہیں ہے جانکنی ہے

جوش ملیح آبادی

آئینِ حکومت

یہ ایک سامنے قوتِ استبدادی مفکر، اسی لیے کہ قدیم رسالے کا ترجمہ ہو "مانٹسکیو" کو قانون کے افادی رُخ کے مقابلے میں اُس کے فلسفیانہ پہلو سے زیادہ دلچسپی تھی۔

اُس نے ہر موجودہ قانونی اہمیت کا مطالعہ کرنے کی خاطر تمام یورپ کی سیاحت کی تھی اور کامل مطالعہ کے بعد اس شاہکار "روحِ قوانین" کی تیاری میں پورے بیس برس صرف کئے تھے۔

اس مضمون میں اُس نے ہر قدیم و جدید ضابطۂ قانون کی جانچ پڑتال اور اُن کے تمام حسن و قبح کا جائزہ لینے کے بعد یہ تجویز پیش کی ہے کہ انگریزی دستور ایک ایسا صحیح نمونہ ہے جسے تمام عالم کو اختیار کر لینا چاہیے۔

اس مضمون نے دور دور تک حیرت انگیز اثر پیدا کیا۔ اس کے ذریعے سے اُس تحریک کو بھی بہت مدد پہونچی جسے "انقلابِ فرانس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور اُن دوسری قوموں کو بھی جو خود مختاری اور حکومتِ عامہ کے درمیان کسی صحیح راستے کی تلاش میں تھیں اس کی ترغیب پیدا ہوئی کہ وہ انگریزی پارلیمنٹری دستور کو قبول کر کے اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنالیں۔

ہندوستان کے اربابِ سیاست کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس پر ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈال کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

ادارۂ کلیم

(۱)

حکومتِ عامہ

(عمومیہ)

حکومت کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) حکومتِ جمہوری۔

(ب) حکومتِ شاہی۔

(ج) حکومتِ استبدادی۔

(الف) جمہوری حکومت میں عامۃ الناس، یا عامۃ الناس کے ایک جزو کو شاہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

(ب) حکومتِ شاہی میں صرف ایک فرد حکومت کرتا ہے۔ لیکن اُس کی حکومت ایک معیّن و محکم قانون کی پابند ہوتی ہے۔

(ج) اور حکومتِ استبدادی میں بھی صرف ایک ہی شخص حکومت کرتا ہے لیکن اس کی حکومت کسی ضابطے اور قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مرضی کے مطابق حکمرانی کرتا ہے۔

جب جمہوری حکومت میں تمام شاہی قوتیں عامۃ الناس کے ہاتھوں میں آجاتی ہیں تو وہ حکومتِ عامہ بن جاتی ہے۔

اور جب یہ شاہی قوتِ عامۃ الناس کے صرف ایک طبقے سے تعلق

ہوتی ہے تو اُسے حکومتِ امرار (ARISTOCRACY) کے نام سے پکارتے ہیں۔

حکومتِ عامّہ میں عامۃ الناس بعض حیثیتوں سے شاہی اختیارات کے حامل ہوتے ہیں۔ اور دیگر طرز ہائے حکومت میں اُن کا مرتبہ رعیّت سے زیادہ نہیں ہوتا۔

عامۃ الناس دوٹوں کے بغیر حکومت نہیں کرسکتے اور اس حالت میں جو قوانین کہ حق رائے دہی کا تعین کرتے ہیں، وہ بنیادی طور پر مانے جاتے ہیں۔

عامۃ الناس کا جنھیں اس طرزِ حکومت میں شاہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو کاروبارِ حکومت کو خود ہی چلائیں۔ اور جو امور کہ وہ نہ کرسکیں انھیں وزرار پر چھوڑ دیں۔

عامۃ الناس کے وزرار اس وقت تک اُن کے قابلِ اعتماد وزرار نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ خود انھیں منتخب نہ کریں۔ اسی لئے اس طرزِ حکومت کا یہ ایک بنیادی اصول ہونا چاہئے کہ وزرار صرف انتخاب ہی کے ذریعے سے مقرر کئے جائیں۔

عامۃ الناس میں اتنی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ ایسے وزرار منتخب کریں جن پر وہ اپنی اہم ذمہ داریوں کا بار ڈال سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں اس کا علم بھی ہوتا ہے کہ شہریوں میں سے کون سا شخص میدانِ کارزار کا تجربہ رکھتا ہے اور کسے سپاہدار بنانے میں ملک کی فلاح مضمر ہے۔

نیز اُنھیں اِس سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ کون سا جج سرگرم اور مستعد جج ہے۔ اور اُسی کو وہ بیرسٹر بنا سکتے ہیں

یہ تمام متذکرۂ بالا اُمور ایسے حقائق ہیں جن کا علم بادشاہ کو اپنے قصرِ زرنگار میں اس قدر نہیں ہوسکتا جس قدر کہ عامۃ الناس کو کوچہ و بازار میں ہوسکتا ہے۔

لیکن کیا عامۃ الناس میں اس قدر صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اُمورِ حکومت کو چلا سکیں۔ حالات کا مطالعہ کرسکیں اور مواقع سے فائدہ اُٹھا کر اچھے حکام بن سکیں؟ — نہیں ——

یہ درست ہے کہ شہریوں کی اکثریت اس قابل تو ضرور ہوتی ہے کہ وہ کثرتِ رائے سے دوسروں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرسکے لیکن وہ اتنی کافی لیاقت نہیں رکھتی کہ خود اُسے کثرتِ رائے سے کوئی کام سپرد کیا جاسکے۔

اور ہر چند کہ مخلوق میں اتنی صلاحیت ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے نظم و نسق کے باب میں کوئی نقادانہ رائے قائم کرکے حذر دہ گیری کرسکے، لیکن وہ اس کے شایاں نہیں ہوتی کہ خود نظم و نسق کا بار اُٹھا سکے۔

مخلوق کا تو ہمیشہ یہ عالم رہا ہے کہ یا تو وہ نہایت ہی تیز رفتاری سے کام کرتی ہے یا انتہائی سست رفتاری کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ ہزاروں، بلکہ لاکھوں ہاتھوں کی قوت کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے کام کو انجام دیتی ہے، اور بعض اوقات ہزاروں لاکھوں پاؤں کے باوصف، وہ ایسی سست رفتاری سے حرکت کرتی ہے جیسے زخمی عنکبوت۔

ہر دلعزیز حکومتوں میں عامۃ الناس مختلف طبقوں میں منقسم کر دئے جاتے ہیں اور اسی طبقاتی تقسیم کی بنا پر "حکومتِ عامّہ" کی عمر اور فلاح بنی ہوتی ہے۔

سرتاپا ایلکشن پر انحصار ہو جانا "حکومتِ عامّہ" کا طریقہ سیاست ہے، اور سر اسر افراد کا منتخب کرنا "حکومتِ امرار" کا دستور ہے۔

ایلکشن کا طریقہ ہر شہری کے دل میں امید پیدا کرتا ہے کہ اُسے اپنے وطن کی خدمت کا موقع مل سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک غلط طریقہ ہے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جسے درست و ہموار کرنے کے سلسلے میں زبردست اُن عناں قانون نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔

مثال کے طور پر "سولن" کو لیجئے، اُس نے ایتھنس میں تمام فوجی مناصب کے لئے تو یہ طریقہ جاری کیا تھا کہ لوگوں کو انتخاب کے ذریعے سے نامزد کیا جاتا تھا۔ اور ججوں اور سینیٹروں کے واسطے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ ایلکشن کے ذریعے سے قائم کئے جاتے تھے۔

اور اُسی کے ساتھ ساتھ اُس نے یہ قاعدہ بھی مقرر کیا تھا کہ جو لوگ ایلکشن کے واسطے اپنے کو نامزد کریں پہلے اُن کی قابلیت کا امتحان لے لیا جائے۔ جو امتحان میں پورے نہ اُتریں اُن کے نام فہرست سے خارج کر دئے جائیں۔ اور اس ترکیب سے اُس نے بخت و اتفاق اور تجزیۂ و انتخاب، دونوں کی سرحدوں کو ملا دیا تھا۔

شاہی اور استبدادیت کو اپنے قائم رکھنے میں زیادہ دیانت

دراست بازی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ ایک ہاتھ میں مہیب قانون اور دوسرے میں خوفناک تلوار اُن کی سلطنت کے تمام نظام کو محکم و استوار رکھنے کے لئے کافی ضمانت ہوتی ہے۔

لیکن حکومتِ عامہ میں ایک بڑی حد تک تمام امور افراد کے سیاسی محاسن پر مبنی ہوتے ہیں۔

جب کوئی حکومتِ عامہ، حبِّ وطن، سلامت روی، اور جذبۂ مساوات سے محروم ہو جاتی ہے، تو وہ حرص و آز کے ہاتھوں بہت جلد پاش پاش ہو کر رہ جاتی ہے۔

حکومتِ عامہ کا بنیادی اصول صرف اسی بات سے متزلزل نہیں ہوتا کہ افراد میں رُوحِ مساوات کی کارفرمائی باقی نہیں رہتی، بلکہ جس وقت اس فقدانِ جذبۂ مساوات کے ساتھ ساتھ ہر شخص یہ انتہائی خواہش بھی کرنے لگتا ہے کہ وہ اُن تمام اعیان کے ہمسایہ سمجھا جائے جو قوم کی منتخبہ رائے سے ملک کے اربابِ حلّ و عقد بنائے گئے ہیں، تو اُسی وقت حکومتِ عامہ دم توڑ دیتی ہے۔

جس وقت کہ بڑے بڑے معرکے سر کئے جا چکے، اور بڑی بڑی فتح مندیاں حاصل ہو چکی ہوتی ہیں، جن میں عامۃ الناس کا بڑا حصہ ہوتا ہے اُس وقت افراد کا غرور اُس بلندی پر پہونچ جاتا ہے کہ کوئی کسی کو اپنے سے اونچا دیکھنے پر طیار نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ فتح ایران کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنس کی جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا اور ایتھنس کو فتح کرتے ہی سیراکیوز فنا ہو کر رہ گیا۔

اس لئے حکومتِ عامہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو مندرجۂ ذیل دو افراطوں سے ہمیشہ بچائے رہے۔

(الف) عدمِ مساوات کا جذبہ، جو حکومتِ عوام کو حکومتِ اُمرا کے اصول پر لے آتا ہے۔

(ب) انفرادی استبداد، اور حد سے گزری ہوئی مساوات کا میلان، کیونکہ ان چیزوں کا استبدادیت پر جا کر خاتمہ ہوتا ہے۔

(۲)

حکومتِ امرا

حکومتِ امرا میں شاہی قوت اشخاص کے ایک گروہ خاص سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہی وہ گروہ خاص ہے جو قانون بناتا اور اسے جاری کرتا ہے اور باقی ماندہ انسان اس گروہ خاص یا یوں کہیئے اس طبقہ اعیان کی رعیت ہوتے ہیں۔

جب امرا و اعیان کثیر تعداد میں ہوتے ہیں اُس وقت امورِ سلطنت کی استواری و بقا کی خاطر اس کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ ایک سینیٹ (مجلسِ فضلاء) ترتیب دی جائے اور اُس کے ذریعے سے قوانین نافذ اور معاملات طے کئے جائیں۔ اس طرح سینیٹ کے ساتھ تو حکومتِ اُمرا وابستہ رہتی ہے اور حلقۂ امرا پر حکومتِ عامہ مبنی ہوتی ہے اور عامۃ الناس کے واسطے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔

بہترین حکومتِ امرا اسے کہتے ہیں جس میں عامۃ الناس اس قدر محرومِ اقتدار اور خاموش ہوں کہ اربابِ اقتدار کو اُنھیں ستانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

یہی وجہ ہے کہ جب انٹی پیٹر نے ایتھنس میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ جن کی آمدنی دو ہزار سے کم ہے وہ ووٹ دینے کے حق سے محروم کئے جاتے ہیں تو اس قانون سے حکومتِ امرا کی ایک بہترین صورت پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہ ہلکی سی شرط شہریوں کے ایک نہایت ہی قلیل حصے کو متاثر کر سکی تھی۔ اور کوئی نمایاں فرد رائے دہی کے حق سے محروم نہیں رہا تھا۔ اُن نمائندوں کو جو حکومتِ امرا پر مشتمل ہوں، عامۃ الناس سے ہر ممکن صورت سے وابستہ ہونا چاہیئے۔

حکومتِ امرا جس قدر بھی حکومتِ عامہ سے مشابہ رہے گی، اُسی قدر کامل ہوتی چلی جائے گی۔ ایسی حکومت کے تمامی امور میں سب سے زیادہ ناقص امر یہ ہے کہ اعلیٰ طبقے پست طبقوں کا گلا گھونٹے رہیں۔

حکومتِ عامہ کے مقابلے میں حکومتِ امرا کے اندر زیادہ قوت موجود ہوتی ہے۔

اُمرا و اعیان ایک جماعتِ خواص بنا لیتے ہیں جو اپنے اختیاراتِ خصوصی اور مفادِ ملکی کے واسطے عامۃ الناس پر نگاہ رکھتی ہے۔ لیکن اس جماعتِ خواص کے واسطے اپنے ارکان پر پابندیاں قائم کرنا، اور اُن کے حوصلوں پر نگاہ رکھنا اس قدر آسان نہیں ہے، جیسا کہ عامۃ الناس

کے معاملے میں ہوتا ہے۔

عامۃ الناس کو تو جرائم کی سزا ملتی ہے، اور خواص کو بھی۔ اگر وہ بالکل علانیہ طور سے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، پاداش بھگتنا پڑتی ہے۔ لیکن امراء و اعیان کے پوشیدہ جرائم سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی جاتی ہے۔

اس نوعیت کی جماعتِ خواص دو طرح سے اپنی اصلاح کر سکتی ہے۔

(۱) یا تو ایک اعلیٰ سیاسی دمعت کی رُو سے اُمراء عامۃ الناس کو اپنا ہم مرتبہ سمجھکر ایک وسیع جمہوریت کی شکل پیدا کر لیں۔

(۲) یا اس سے کمتر سیاسی وسعت سے کام لے کر اپنے اقتدار و منصب کو اعتدال کے سانچے میں ڈھال لیں۔

حکومتِ امراء اُس وقت ایک مذموم حکومت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جب کہ امراء کے اقتدار میں مطلق العنانی کی بُو آنے لگتی ہے۔

جب تک اُمراء کے خاندان اپنے وضع کردہ قوانین کو ایک ایسی شاہنشاہی سمجھتے رہتے ہیں جو متعدد بادشاہوں پر مشتمل ہے اُس وقت تک کسی فساد کا اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس صورت حال میں تمام شاہنشاہیاں ایک محکم قانون کی زنجیر سے جکڑی رہتی ہیں۔ لیکن جب کہ یہ قانونی پابندی اور دستوری نظر باقی نہیں رہتی تو حکومت اُمراء میں مطلق عنان شاہی، اور امراء میں مطلق العنان بادشاہوں کی سی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

اور یہ صورتِ حال، حد سے گزری ہوئی خرابی کا سرچشمہ اس وقت بن جاتی ہے جب امارت، وراثت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پوتڑوں کے رئیس پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ یہ موروثی اور پوتڑوں کے رئیس اپنے اقتدار کے استعمال میں اعتدال برتنے پر قادر ہی نہیں ہوتے۔

جس زمانے میں امراء کی تعداد قلیل ہوتی ہے ان کے اقتدار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اُن کا شخصی اعتبار گھٹنے لگتا ہے۔ اور جس عہد میں اُن کی تعداد کثیر ہو جاتی ہے اُس وقت اُن کے اقتدار میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اُن کا شخصی اعتبار بڑھ جاتا ہے۔

حاکمانہ اقتدار کا ہمیشہ رو بہ ترقی، اور شخصی اعتبار کا ہمیشہ رو بہ تنزل رہنا ایک ایسا سلسلۂ عمل ہے جو ایک مطلق العنان بادشاہی پر جا کر ختم ہوتا ہے ایسی مطلق العنان بادشاہی پر ختم ہوتا ہے جس کی طاقت بھی ویسی ہی وسیع ہوتی ہے جیسے اُس کے خطرے۔

موروثی حکومتِ امراء کے اندر امراء و اعیان کی فراوانی پنجۂ حکومت کی گرفت کو نرم کر دیتی ہے۔ موروثی امراء چونکہ سیاسی اوصاف سے محروم، ذہنی برکتوں سے ناواقف۔ احساسِ فرائض سے بے خبر۔ اور محنت و مشقت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کی حکومت یتیم ہو کر موت کے گھاٹ اُتر جاتی ہے۔

حکومتِ امراء اگر ایسے قوانین مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائے جو عیش و عشرت کے عوض، اُمراء کو حکومت کی تلخیوں، جہانبانی کے خطروں اور حکمرانی کے خون آشام ہنگاموں سے آشنا کر دیں اور اعیان میں اس کا احساس پیدا کر سکیں کہ اگر انھوں نے صحیح انسان بن کر حکومت نہ کی تو اندرونی بغاوتیں اور بیرونی حملے اُن کے املاک اور اُن کے خاندانوں کو تباہ کر ڈالیں گے، تو بیشک اصلاح و ترقی کی ایک نمایاں صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

کسی حد تک اعتماد و اعتبار کے پیدا ہو جانے سے بادشاہی میں جاہ و جلال اور استحکام و استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جمہوریت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ تو عدم اعتماد اور خطرات سے نشو و نما حاصل کرتی ہے۔

ایرانیوں کے حملوں کے خوف نے یونانی جمہوریت کو بیدار رکھا تھا۔ اور اسی خوف کی بدولت یونان کا ہر فرد جمہوری قوانین کی پابندی سے روگردانی کا تصور کرتے ہوئے بھی کانپنے لگتا تھا۔

ہرچند یہ عجیب بات ہے، لیکن واقعہ یہی ہے کہ حکومت امراء اور حکومت عامہ کی مثال پانی کی سی ہے۔ جسے اگر ایک مدت تک نہ چھیڑا جائے اور جو ایک زمانے تک نہ بہہ سکے تو اُس سے فساد کی بُو آنے لگتی ہے۔

(۳)

شاہی

تمام درمیانی، ماتحت اور پابند قوتیں مل کر شاہی حکومت کا قوام طیار کرتی ہیں۔ جس میں ایک فردِ واحد، بنیادی قوانین کے مطابق حکومت کرتا ہے، شاہی حکومت کی درمیانی اور ماتحت قوتیں، قدرتی طور سے امراء و اعیان کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ امارت، شاہی حکومت کا ایک لاینفک جزو ہے، اور اور اس وجہ سے یہ ضرب المثل عالم وجود میں آئی ہے کہ اگر شاہی نہیں ہے تو امارت بھی نہیں۔ اور امارت نہیں ہے تو شاہی بھی نہیں۔

یورپ میں بعض افراد ایسے ہیں جو امارت کو قطعی طور سے معدوم کر دینا چاہتے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ یہ وہی شے ہے جسے سترہویں صدی میں خود پارلیمنٹ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ناکام رہی۔

شاہی حکومت میں امرا، اعیان، علما اور شرفا کے مخصوص اختیارات کو اگر معطل و معدوم کر دیا گیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ایک خالص پر لغزش حکومت کی بنیاد پڑ جائے گی، یا پھر مطلق العنان بادشاہی کا دور جسے استبداد کہا جاتا ہے شروع ہو جائے گا۔

میں علما (یا پادریوں) کے مخصوص اختیارات کا زیادہ حامی نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُن کے اختیارات ایک حد پر لا کر ہمیشہ کے لئے متعین ضرور کر دیئے جائیں۔

جمہوری حکومت میں پادریوں کا اقتدار خطرناک ہو سکتا ہے لیکن شاہی حکومت میں اسے بہ آسانی برداشت کیا جا سکتا ہے اور خصوصاً ایسی شاہی حکومت میں جس کا میلان استبداد کی طرف پایا جاتا ہو۔

آزادی کو ترقی دینے کی خاطر، انگریزی قوم نے اُن تمام درمیانی قوتوں کو برباد کر دیا ہے جو اُن کی شاہی کی تشکیل کرتی ہیں۔ اور اس آزادی کی حفاظت کرنے کے اُن کے پاس معقول دلائل بھی ہیں۔ اگر کبھی انگریز اس آزادی کو تلف کر دیں گے تو وہ دنیا کی ایک بدترین غلام قوم بن کر رہ جائیں گے۔

صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ شاہی حکومت میں درمیانی مناصب قائم رکھے جائیں۔ بلکہ اُسی کے ساتھ یہ بھی اشد ضروری بات ہے کہ قوانین کی ... [illegible] امانت سیاسی مجلس قانونی ہی کے اندر پائی جا سکتی ہے، کیونکہ یہی وہ مجلس ہے جو قوانین کا اعلان کرتی ہے اور جب وہ فراموش ہونے لگتے ہیں تو انھیں دوبارہ حافظوں میں واپس لاتی ہے۔

اُمرا کی کاہلی، بے پروائی، بے نیازی اور جہالت اس کی مقتضی ہے کہ ایک ایسی سیاسی مجلس ضرور مسلط رہے۔ جو قوانین کو اُس زمین سے مسلسل کھود کھود کر باہر نکالتی رہے جس میں اُمرا انھیں دفن کرتے رہتے ہیں۔

جس طرح حکومتِ عامہ سینیٹوں، مجسٹریٹوں اور ججوں کے اختیارات کی قطع و بُرید کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حکومتِ شاہی اعلیٰ طبقے کے خصوصی حقوق، اور شہروں کے رعایتی اختیارات کے رفتہ رفتہ کم ہو جانے سے برباد ہو جایا کرتی ہے۔ کیونکہ اعلیٰ طبقے کے حقوق کے مجروح ہو جانے سے عامۃ الناس کی استبدادیت رُونما ہوتی ہے اور شہروں کے رعایتی اختیارات کے سلب ہو جانے سے فرد واحد میں استبدادی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

قدیم زمانے کے لوگ آج کل کی سی شاہی حکومت سے بہت کم واقف تھے جو امرا کی قوت پر مبنی ہوتی ہے، اور اس سے تو بالکل ہی ناواقف تھے کہ شاہی حکومت مجلس قانون اور پارلیمنٹ کے ماتحت رہتے ہوئے کیونکر قائم ہوتی ہے۔

اگر ٹیکیٹس کے قابلِ تعریف تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا جائے، تو پتا چل سکتا ہے کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی دستور کا چربہ اُسی سے تیار کیا ہے۔

انگریزوں کا سیاسی دستور تین قوتوں کی علیحدگی پر مبنی ہے (۱) قانونی اختیارات (۲) عملی اختیارات (۳) اور عدالتی اختیارات۔

(الف) قانونی اختیارات پارلیمنٹ کے ہات میں رہتے ہیں۔

(ب) عملی اختیارات بادشاہ کے ہات میں۔

(ج) اور عدالتی اختیارات مجسٹریٹوں کے ہات میں۔

اگر کوئی جماعت، یا امرا، یا خود عامۃ الناس، ان تینوں متذکرۂ بالا قوتوں کو اپنے ہات میں لے لیں تو اُسی روز انگریزوں کی آزادی کا خاتمہ ہو جائے۔

اپنے دستور رضا مندگی کی بدولت انگریزوں نے قدیم جمہوریت کے بدترین عیب سے نجات حاصل کر لی ہے۔ جس کی رُو سے عامۃ الناس کو حکومت کے معاملات میں عملی حصہ لینے کے حقوق حاصل تھے۔

ہر سلطنت میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو پیدائش (دولت) یا اعزاز کے باعث دیگر افراد سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اگر انھیں عامۃ الناس میں شامل کر لیا جائے اور اُن کا بھی ایک ہی ووٹ شمار کیا جائے، تو یہ آزادی، اُن کے حق میں غلامی سے بدتر ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی قومی آزادی کی حفاظت میں کوئی حصہ نہ لیں گے۔

اس لئے مناسب ہے کہ انھیں کچھ مخصوص حقوق اور خاص اختیارات ضرور بخشے جائیں۔

اسی وجہ سے انگلستان میں مجلسِ قوانین براہِ راست انھیں پر

مشتمل ہے اور اُسی کی رُو سے عامتہ الناس پر اُن کا ایسا ہی اقتدار ہے، جیسا خود عامتہ الناس کو اپنے اوپر حاصل ہے۔

دارالامراء (　　) کا موروثی ہونا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کا موروثی ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اور اس کے علاوہ موروثی ہونے کے باعث اُس کے اختیارات خصوصی کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ ورنہ دوسری شکل میں اُن کے واسطے خطروں کا پیدا ہو جانا ایک بدیہی سی بات ہے۔

دارالامراء کے موروثی ہونے میں صرف ایک خرابی واقع ہو سکتی ہے وہ یہ کہ رکنیت کے موروثی ہونے کے باعث امراء فرائض منصبی کے ادا کرنے میں کوتاہیاں اور خود غرضیاں شروع کر سکتے ہیں۔ سو اس کا علاج یہ ہے کہ روپے پیسے اور حقوقِ خلائق کے تمام اُمور میں اُنھیں بے دست و پا کر دیا جائے۔

(۴)

حکومتِ استبدادی

استبدادی حکومت کی فطرت پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ مستبد حکومت کا انتظام دوسرے کے سپرد کر دینے پر مجبور ہے۔

خدا کا وہ قابلِ رحم بندہ جس کے پانچوں حواس اُس سے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہوں کہ وہی سب کچھ ہے اور اُس کے سوا اور کوئی نہیں۔ قدرتی طور پر کاہل جاہل ناکارہ عشرت پسند اور احمق ہوتا ہے اور اُسی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ امورِ سلطنت کی باگیں ہات سے چھوڑ کر دوسروں، یا کسی دوسرے کے سپرد کر دے۔

اگر وہ کاروبار کو مختلف لوگوں کے سپرد کرتا ہے تو اُن میں باہمی آویزشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور مستبد یا مطلق العنان فرمانروا کو اُن کے جھگڑے چکانے کی زحمت گوارا کرنا پڑتی ہے۔ جسے وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس لئے مطلق العنان فرمانروا کے واسطے آسان یہی ہے کہ وہ کسی ایک وزیر کو تمام سیاہ و سفید کا مالک کر کے اپنے جسم کے انبار کو نرم گدّوں پر پڑے سہنے کے واسطے چھوڑ دے۔

وزارت کا قیام، استبدادی حکومت کا ایک بنیادی قانون ہے، جسے نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔

مطلق العنان فرمانروا کو جس قدر زیادہ افراد پر حکومت حاصل ہوتی ہے، اسی قدر وہ اُن پر حکومت کرنے میں کاہلی کو دخل دیتا ہے اور کاروبارِ حکومت جس مقدار سے وسیع ہوتا رہتا ہے اُسی مقدار سے اُس کی بے نیازی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

استبدادی حکومت ابتدا ہی سے خرابی کی طرف مسلسل قدم اُٹھائے چلی جاتی ہے، کیونکہ اُس کی عین فطرت ہی خراب واقع ہوئی ہے۔

اُن حالتوں میں بھی جب کہ بعض اتفاقی اُمور استبداد کی امداد کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ استبداد اندر ہی اندر سڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔

اگر آب و ہوا، مذہب اور مواقع کی مساعدت اور بعض قابل اور قانون پسند افراد کے مساعی کی بدولت اتفاقی طور سے موافق حالات پیش آ جاتے ہیں۔ یا آتے رہتے ہیں تو استبدادی حکومت کسی نہ کسی طرح چند روز تک ضرور چل سکتی ہے۔ لیکن یہ مندرجہ بالا موافق امور استبداد کو چند روز چلا تو سکتے ہیں، مگر اُس کی غیر فطری فطرت کو تبدیل کر دینے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور ہر چند یہ تمام اتفاقی امور دیو استبداد کو کچھ دن کے لئے ہلکی سی زنجیر سے باندھ تو سکتے ہیں مگر اُس کی شورش، ہلچل، کشمکش درندگی اور زنجیر شکن زور آزمائی کے طبعی میلانات کو فنا کرنے کی طاقت کبھی نہیں رکھ سکتے۔

[illegible]

[illegible]

رہ گذر

(محمد وجاہت علی سندیلوی بی اے)

اے خدا! اس دنیا میں تو دشمن کو بھی حساس دل نہ دے۔!

دن بھر کی خیال بازی اور تخیل نوازی کے بعد رات کو میں اپنے گھر سے باہر نکلا۔ پلنگ پر پڑے پڑے اور شراب و شباب و رباب و رومان، انصاف و انقلاب کے خواب دیکھتے دیکھتے طبیعت اکتا چکی تھی۔ اب اپنی خیال کی نگری سے متنفر تھا۔ اور اصلی زندگی کے لئے بےچین، خواہ وہاں سے ہیں دھکے دے کر ہی کیوں نہ نکال دیا جاتا۔

رات سرد تھی اور تاریک، میرے گھر کے سامنے سڑک پر ادھر اُدھر کہیں کہیں بجلی کے لمپ آنکھیں جھپکاتے نظر آرہے تھے، میں بازار پہنچا، رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ لیکن بازار کی رونق ابھی باقی تھی، دکانیں کھلی ہوئی تھیں، اور سڑک پر راہ چلتیوں اور سواریوں کی ابھی کافی چیخ پکار تھی۔ میں سارے منظر کا ایک خاموش تماشائی بن کر سڑک کے ایک ناکے پر کھڑا ہوگیا۔ بازار کا ایک بہت محدود حصہ میرے پیش نظر تھا۔ میرے سامنے آراستہ و پیراستہ امپیریل ہوٹل میں ایک تنومند صاحب اپنی توند پر ہاتھ پھیر پھیر کر کھانا تناول کر رہے تھے۔ بار بار ہوٹل میں ان کی بارعب آواز گونج جاتی تھی۔ "شاہی ٹکڑے"!

"پلاؤ" وغیرہ۔

اور ساتھ ہی ساتھ ہوٹل کے خادم چیخ اٹھتے، "بہت اچھا سرکار"

"ابھی لایا حضور"

ہوٹل کے دروازے پر ایک بڑھا بدصورت میلا کچیلا فقیر اپنی آواز کو دردناک بنا بنا کر چیخ رہا تھا، "کوئی اللہ کے نام پر"۔ ہوٹل والے شاید اس کی آواز نہیں سن رہے تھے۔ ان کے کان تو بس "قورمے کی پلیٹ" "مچھلی کباب" "مزعفر" "بریانی" "پراٹھا" پر لگے ہوئے تھے۔

میرے سامنے کھانے والے تنومند صاحب نے ڈکاریں لیتے ہوئے "بل لاؤ" کہا اور ہاتھ دھونے لگے۔

"بہت اچھا سرکار" کہتا ہوا ہوٹل کا خادم منیجر کے پاس دوڑا۔

"ایک روپیہ چودہ آنے حضور"

تنومند صاحب نے بڑی حقارت سے دو روپے جیب سے نکال کر میز پر پھینک دیئے، اور بڑی شان خودداری کے ساتھ اپنا سر دائیں بائیں ہلاتے اکڑتے اٹھلاتے ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

"تانگہ" انہوں نے ہوٹل کے برآمدے سے آواز دی، آس پاس کے تانگے دوڑ پڑے۔

"کہاں چلئے گا حضور"

"آیئے سرکار"

"چوک چلئے گا؟"

تانگے والے بکا کئے اور تنومند صاحب بے پروائی سے سگریٹ

سلگایا کئے، پھر بڑی رعونت سے پوچھا، کیا لو گے؟

"کہاں چلیے گا سرکار" تینوں تانگے والے ایک دم سے بول اٹھے

"قیصر باغ، بولو جلدی کیا لو گے"؟

"آٹھ آنے ہوں گے حضور" دو تانگے والے بولے۔

"سات ہی آنے دیجئے گا سرکار" تیسرا تانگے والا بولا۔

"پانچ آنے دیں گے، چلنا ہو تو چلو" یہ کہہ کر تنومند صاحب بڑی بے اعتنائی سے داہنی جانب مڑنے لگے۔ تانگے والے دوڑ پڑے، "اچھا چھ آنے دیجئے گا سرکار"

"بس پانچ آنے ایک کوڑی زیادہ نہیں" یہ کہتے ہوئے تنومند صاحب نے قدم بڑھائے، دو تانگے والے چلے گئے، تیسرا کھڑا رہا۔ تنومند صاحب بیس ہی قدم گئے ہوں گے کہ وہ چلایا "آیئے صاحب"

"بس پانچ آنے" کہتے ہوئے تنومند صاحب ایک المیتانی کلفکار کے ساتھ تانگے پر بیٹھ گئے، بلکہ اپنی ملکیت بلا شرکت غیرے دکھانے کے لئے لیٹ گئے، اور تانگہ انھیں لے کر سڑک کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

سڑک کی داہنی جانب اکے تانگوں کا اڈا تھا، ایک پولیس والا کسی تانگے والے کا مذاق اڑا رہا تھا، اور اس کے ساتھ قریب قریب سب اکے تانگے والے مذاق میں حصہ لے رہے تھے، اور بار بار اس کا منشا پا کر قہقہہ لگا اٹھتے تھے، خدائے "چالان" کو ہر طرف سے بیڑی پان پیش ہو رہے تھے، اور وہ بہت اطمینان سے ایک تانگے پر لیٹا اپنی بیہودہ گندی باتوں پر خراج تحسین وصول کر رہا تھا ایک چائے والے نے جا کر اسے ایک چائے کی پیالی پیش کی۔ "طبیعت نہ خوش کر دی ہو تو میرا نام نہیں" سب ایک دم سے قہقہہ لگا اٹھے

اب دوکانیں بند ہونا شروع ہو گئی تھیں، اور بازار میں روپے آنے پائی کا خدا آخری سسکیاں لے رہا تھا، ہر دوکان پر روپے گنے جا رہے تھے، بڑی دوکانوں پر زیادہ۔ چھوٹی پر کم، فقیروں کی صدائیں کم ہوتی جاتیں، اور وہ سڑک کے کونوں میں ادھر ادھر دبک رہے تھے، اور کچھ کھا پی کر سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے، ہٹو بچو۔ پوں پوں، بھوں بھوں کی آوازیں رفتہ رفتہ خاموشی میں ڈوبتی جا رہی تھیں، لیکن اب بھی غریب راہگیر سڑک کے کنارے چل رہے تھے، اور موٹر تانگوں پر سوار روپے والے دندانہ بیچ سڑک پر نکل جاتے تھے، اور سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھتے تھے کہ وہ کس دنیا کے باشندے ہیں۔

"سر دتا کہاں بھول آئے نند لال" حلق پھاڑ پھاڑ کر گاتا ہوا ایک سن چلا نکل گیا۔

"گرم چائے"

"گرم گرم گرم رم رم چا آ آٹ" کی بے ہنگام آوازیں بھی آ رہی تھیں

دو حسین نوجوان چمپئی رنگ کی لڑکیاں ایک بڈھے مرد کے ساتھ تانگے پر نکلیں، سارا بازار گھوم گھوم کر انھیں دیکھنے لگا، ہر شخص انھیں اس محویت اور ہوس پرستی سے دیکھ رہا تھا جیسے شرم و حیا اور عصمت کے الفاظ صرف اس کی ماں بہن بیٹیوں کے لئے بنے ہیں، باقی دنیا کی ہر عورت کو ہر وقت وہ دعوت بے حیائی و بے شرمی اور معصیت دے سکتا ہے، میں تانگہ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک دوکاندار کے برآمدے سے چیخ پکار گالی گلوج کی آواز سنائی دی میں موقع پر پہنچا، "بڈھے مزدور" ٹھوکریں مار مار کر جگائے جا رہے تھے، ان کا گناہ یہ تھا کہ وہ بدقسمتی سے بیچ راستے میں سو گئے تھے۔

اب بازار رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔

دو میلی کچیلی کالی کلوٹی لیکن خوب جوان لڑکیاں چاٹ والے کے خونچے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں، کئی اوباش جن میں بڈھے جوان دونوں شامل تھے ان کے گرد جمع ہو گئے، اور طرح طرح سے انھیں چھیڑنے لگے، ان کے کپڑے جسم ڈھانکنے کیلئے ناکافی تھے، اور وہ سردی سے کانپ رہی تھیں، "یہ کچوری پیسے کی دو گے" بڑی لڑکی نے پوچھا۔

"چار" چاٹ والے دوکاندار نے جواب دیا۔

دونوں بہنوں نے بڑی حسرت سے خونچہ دیکھا اور جانے لگیں کئی آدمیوں نے بڑھ بڑھ کر انکے لئے کچوریاں خریدیں اور انکو اپنے ساتھ لے لیا، اکثر نے اپنی جیبیں کھنکائیں اور لڑکیاں انھیں دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

اب اس وقت کون مذہب آکے بھوکے پیٹوں کو نیکی و بدی کا خشک مسئلہ سمجھاتا انسانی فطرت کے قوانین کا سب سے بڑا حاکم پیٹ ہے، ایک منچلے نے چھیڑ دیا "بریلی کے بزار میں جھمکو گرو رے"۔۔۔۔ "بریلی کے بزار میں"۔۔۔ میں مغموم سر جھکائے

مردِ مضحک (مسلسل)

اسرائیل احمد خاں

(۱۴)

بارکلفیڈ رو کی زیرِ زمین سُرنگ کنی!

ایک چیز انسان کا سب سے بڑا فرضِ عین ہے ——— اور وہ ہے محسن کشی! آدمی اپنے محسن کو اسی طرح فنا کر دینا چاہتا ہے جس طرح کہ ایک سارق ایک بچے کے جسم پر سے زیور اُتار کر اُسے کنوئیں میں ڈال دیتا ہے۔

بارکلفیڈ رو اس فریضۂ انسانی کی ادائی سے قاصر نہ تھا۔ جوزیانہ کی طرف سے صدہا عنایات کا مورد بننے کے بعد اُسے ہر ساعت ایک ہی فکر لاحق رہتی تھی ——— یعنی اُس سے اس ناقابلِ معافی احسان کا انتقام لینا! قسامِ ازل کی جب اس بیرا تقسیم کو ہم سامنے رکھتے ہیں، کہ جوزیانہ حسین و جمیل، پُرشباب و حشمت مآب، لائق و فائق، اور ہمہ صفت موصوف واقع ہوئی تھی، اور بارکلفیڈ رو بدہئیت و کوتاہ قامت، مائل بہ کہولت، گرفتارِ فلاکت و محرومِ شہرت، ہدفِ حسرت و نذرِ حقارت، ——— تو کہنا پڑتا ہے کہ تقدیر کا یہ حصہ وار معاف کئے جانے کے قابل نہ تھا! اک کور باطن خفاش، آفتابِ عالمتاب کی کیونکر تاب لا سکتا ہے؟!

بارکلفیڈ رو آئرلینڈ کا باشندہ تھا، مگر وہ اپنی شریف مادرِ زمین کا اک ناخلف فرزند تھا!

"سمندر کی بوتلوں کے ڈاٹ نکالنے" کا کام فی الحقیقت اتنا مضحکہ خیز نہ تھا جتنا کہ بارکلفیڈ رو اُسے دکھانا چاہتا تھا! جہازوں کی غرقابی، انگلستان کی بڑی بڑی تفکراتِ قومی سے ہے! جہاز رانی اور بحر پیمائی اُس کی حیاتِ ملی کا سب سے سرگرم وظیفہ ہے! پس بحری و آبی حوادث اُس کے روزمرہ کے واردات ہیں! انگلستان سمندر کی طرف سے شب و روز کی ہر ساعت میں اک اندیشہ و دغدغہ میں مبتلا رہتا ہے! وہ حقیر سی بوتل جس کی ارسال و ترسیل امواجِ بحر کیا کرتی ہیں، غایت درجہ اہم اطلاعات کی حامل ہوتی ہے۔ گردابِ ہلاکت میں آئے ہوئے جہاز کی طرف سے وہ آخری "صدائے مدد" سُناتی ہے: وہ اہلِ جہاز کے خطرات بحرِ اعظم کے طوفان، کُرۂ ہوائی برہمی جلال وغیرہ وغیرہ گوناگوں سنگین تفصیلات کے بارے میں نہایت نازک پیامات گوش زد کیا کرتی ہے!

جس عہدے کو بارکلفیڈ رو نے پُر کیا تھا وہ اب ایک صدی سے منسوخ ہو چکا ہے۔ لیکن اُس کے متعلقہ فرائض ہنوز عملاً باقی ہیں۔ اس لئے کہ اُس کا مصرف و ضرورت ناقابلِ ترک ہے۔ جو شخص اس خدمت پر مامور ہوتا تھا وہ تجارتِ بحری کے اسباب و اموال کا اک گونہ جزرُ امین ہوتا تھا۔

قسم قسم کی پیام رساں بوتلیں، شیشیاں، اور دوسرے ظروف، جنھیں سمندر کے مدّ کی موج سواحلِ ملک پر لا ڈالتی تھی، سب سے پہلے اُسی کے ملاحظے میں پیش ہوتے تھے۔ . . . .

. . . . وہی سب سے پہلے اُن کی مُہریں توڑا کرتا تھا، اور وہی سب سے پہلے ان کے سربمہر رازوں سے آشنا ہوا کرتا تھا! وہ اُن پر بعد ازاں اپنے دستخط ثبت کیا کرتا تھا، اور اُنھیں معلومہ ترتیب سے مقررہ جگہوں پر رکھ دیا کرتا تھا۔

سطحِ بحر پر تیرتے ہوئے یہ پیامات بعض اوقات تو اپنے وقتِ ارسال سے چند ساعت کے اندر ہی اپنی ساحلی منزلِ مقصود کو پہونچ جاتے تھے، لیکن کبھی کبھی وہ سالہا سال کے بعد کنارے لگتے تھے! اس تعجیل یا تاخیر کا دارومدار امواجِ بحری و ہوائی کے رُخ پر ہوا کرتا تھا۔ سمندر میں ان بوتلوں کے ڈالنے کا طریق کم و بیش اُسی قسم کا تھا جیسا کہ عہدِ قدیم میں قربانگاہوں پر نذر چڑھانے کی رسم ادا ہوا کرتی تھی! وہ زمانہ دینداری کا تھا، اور ایسے نازک ساعات میں جبکہ گرفتارِ طوفان و دوچارِ موت انسانوں کے قلوب میں انتہائی رقت و خشیت پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے آخریں لمحاتِ حیات میں اپنے دل و روح کے آخری واردات جنمیں خدا اور انسان دونوں مخاطب ہوا کرتے تھے۔ بوتلوں میں سربند کرکے پیامبر امواج کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ بعض ماہ و سال میں امارتِ بحری کے دفتر میں ان پیامات بردار ظروف کا انبار لگ جاتا تھا! دفاترِ بحری کی اک فردِ پر ارل آف سفوک، میر خزانہ و توشہ خانۂ انگلستان کے دستخطوں اور تصریحات کے ساتھ یہ کیفیت مسطور پائی جاتی ہے کہ صرف ایک سال (۱۶۱۵ء، بعہد شاہ جیمس اول) میں پورے باون پیام رساں قرابے وزیرِ بحر کے دفتر میں موصول و مندرج ہوئے!

دربار کی اکرام و انعام گویا نوازشہائے آسمانی ہوا کرتی ہیں جو طرفتہ العین میں انسان کو فلک الافلاک پر پہنچا دیتی ہیں۔ اور "بگشتے کہ در آں کو گدایاں خداوند" یہ اک معمولی بات ہے کہ اک ناکام و گمنام "متعمال" بیک گردشِ قلم وزارتِ عظمیٰ کا "ساحل" بن جائے! بارکلفیڈ رڈ والی خدمت پر جس شخص کا تقرر ہوتا تھا وہ ہمیشہ اک شاہی معتمدِ خاص ہوا کرتا تھا۔ ملکہ ایلزبیتھ نے اپنے اک فرمانِ خسروانہ میں خاص تاکید

کے ساتھ اسی منشا کا حکم صادر فرمایا تھا۔ شاہی درباروں کی لغاتِ مصطلحات میں "اعتماد" اور "ساز باز" مترادف کلمات ہیں! پھر ساز باز کے "افعال و خواص" میں "ترقیِ مراتب" لکھا ہوا نظر آتا ہے! الغرض صیغۂ بحری کے اس منصبدار کے سر کے گرد اک "ہالۂ عظمت" بننا شروع ہو گیا تھا! وہ اگرچہ محض اک کلارک (محرر یا متصدی) ہوتا تھا، لیکن اُس کا مرتبہ شاہی لنگر خانے کے دو بالائی منصرموں کے بعد سمجھا جاتا تھا! اُس کو شاہی محلات، حتیٰ کہ سلطانی خوابگاہ کے اندر جانے کا حق بھی حاصل تھا! ــــــ اگرچہ باریابی کا یہ پیرایہ حسبِ دستور وہی نیاز مندانہ و غلامانہ ہوا کرتا تھا!

منجملہ دیگر فرائض کے اس نوکرشاہی کا ایک کام یہ بھی تھا کہ بعض نہایت اہم و عجلت طلب اُمور کی اطلاع بر وقت حضورِ شاہی میں پہنچائے! یہ معاملات بعض اوقات بڑے نازک اور نادر ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کسی مایوسِ جانبری انسان کی "آبی بسترِ مرگ" پر کی وصیت، مادرِ وطن (انگلستان) کے نام الوداعی خطابِ عقیدت، جہازوں پر بارشدہ اموال کی فہرستیں اور رسیدیں اُن جرائم کی بالا بالا مخبری جن کے ارتکاب سے بعض لوگ سطحِ بحر پر "تردامن" ہوا کرتے تھے! یا بعض ممکن شاہی میراث و املاک کے متعلق جاسوسانہ اطلاعات، وغیرہ وغیرہ۔

اس عہدہ دار کے تعلقات براہِ راست دربارِ شاہی سے تھے، وہ وقتاً فوقتاً شاہ یا ملکہ کی جناب میں ان "قرابہ بند اسرار" کو لیکر بذات خود حاضر ہوا کرتا تھا! یہ سررشتہ محکمۂ بحریہ کا گویا صیغہ "پرچہ نویسی" تھا

قصۂ مختصر، ان ذرائع و مواقع سے فائدہ اُٹھا کر اس "موشِ شریر" (بارکلفیڈ رڈ) نے زمین کے نیچے ہی نیچے، دور تک اپنا رستہ کاٹ لیا۔ اور آخرکار ملکۂ معظمہ کی بارگاہِ عالی تک رسائی حاصل کر لی ــــ یہی اُس کی غرض و غایت تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس غایت کی کیا غایت تھی۔ ــــ دولت و جاہ؟ نہیں! اچھا حریفوں کی تخریب و تذلیل؟ جی ہاں، یہی! ــــــ اس دوسری شئے میں اُس پہلی چیز سے زیادہ لطف و کیف ہے! رقیب کے جگر کو مجروح کرکے جو خون نکالا جاتا ہے وہ اپنی جراحتِ دل کے لئے مرہم الالتیام ہوا کرتا ہے!

اس عقرب نیشی کی سعادت ہر اک کے حصے میں نہیں آتی! بارکلفیڈ رڈ کے اندر یہ ملعون جذبہ اس درجہ شدید واقع ہوا تھا کہ باوجود مستقل و مسلسل

شغلِ ایذارسانی کے وہ تشنۂ تسکین ہی رہتا تھا! اُس کو اپنے معدۂ روح کے لئے دائماً اس تغذیہ کی ضرورت تھی۔ جب تک اُس کے مردم دَر دانتوں کی گرفت میں کوئی شکار رہتا تھا۔ دُنیا و مافیہا کی کوئی نعمت اُسے درکار نہ ہوتی تھی! —— لیکن اُس کے بعد ہی اُس کا نفسِ لعین صدائے "ہل من مزید" لگانے لگتا تھا۔

وہ زمہریری سردی میں لرزہ بر اندام کھڑا رہنا پسند کرتا، بشرطیکہ اُس کا ہمسایہ اُسی وقت پڑا کانپ رہا ہو! یہ بغض للّٰہی کسی انسان کے لئے کیا خداداد عذاب ہے! وہ جنت کی ساری دولت کی لذت خناس پر اپنے سینے کی اِس نارِ جہنم کو ترجیح دیتا تھا! دولت و نعمت عبارت ہے اُس چیز سے جس سے اپنے دل کو مزہ آئے! ابلیسانہ جذباتِ قلب کی مردم آزارانہ آسودگی اس سے کہیں خوشتر لذت اندوزی ہے کہ اپنے معدے کو الوانِ نعمت سے، یا اپنی جیب کو زر و جواہر سے پُر کیا جائے! کیڈبی نے، جو گائی فاکس کا شریکِ سازش تھا اپنی یادگارِ سیاسی و دینی سازش کی سرگرمیوں کے دوران میں بجزدانہ اک دفعہ کہا تھا کہ "پارلیمنٹ کے تہ و بالا ہونے کا ہولناک منظر کچھ اس درجہ باصرہ نواز واقع ہوا ہے کہ میں اس کیفِ جاں نواز کو ایک ملین پاؤنڈ میں بھی دینے کے لئے تیار نہیں!" —— ان وارداتِ نادرہ کو کچھ "اہلِ حال" ہی جان سکتے ہیں!

بارکلفیڈرو رشک و حسد اور بغض و عناد کا اک ایسا ہی عجیب الخلقت پتلہ تھا۔

اس شخص میں اپنی فطرت کے ہم جنس دوسرے تمام عیارانہ خصائص بھی پائے جاتے تھے۔ وہ ہر جگہ مردود و ملعون سمجھا جاتا تھا۔ بجز اُن حلقوں کے جن کی تفریح و دلبستگی کا وہ سامان تھا! وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ جو لوگ اُس کی ذات سے لطف اندوز ہوا کرتے ہیں اُن کی نظروں میں بھی وہ ذلیل و خوار ہی ہے! لعنتِ عام کے اس حصارِ سخت میں وہ بالکل نعل در آتش رہا کرتا تھا! وہ اندر ہی اندر خون درجگر تھا۔ اس کے سینے میں اک آتشکدہ مشتعل رہتا تھا —— صرف چہرے کی بیرونی سطح متبسم نظر آتی تھی! وہ در و دیوار سے ناخوش تھا۔ گویا در و دیوار اُس کے اس تنفس سے عذر خواہ ہیں! وہ بڑے درجے کا منافق تھا۔ بظاہر ہر اک سے شیر و شکر رہتا۔ لیکن دل کے اندر زہر آلود خنجر چھپے ہوئے تھے! اُس کا چہرہ اُس کے "رازہائے سینہ گداز" کا مسود "لاف زنِ تمکین" تھا! وہ ہر ایک کے سامنے بے تکلف خاکِ مذلت پر لوٹتا، لیکن دل کے اندر یہ پیچ و تاب کہ اگر موقع ملے تو اُن کے سر کو پامال کرکے رکھ دے! خدا ہر ایک کو ایسی بید صفت ریڑھ کی ہڈی عطا نہیں کیا کرتا جو ہر کہ و مہ کے سامنے رکوع و زمیں بوس میں پوری لوچداری ثابت ہو! تاہم ایسے تیرہ باطن لوگوں کی اک معتدبہ تعداد دنیا میں موجود ہے۔ وہ اتنے نادر الوجود نہیں جتنا کہ ہمارا خیال ہے! یہ افعی و عقرب ہر طرف سے ہمارا محاصرہ کئے ہوئے ہیں! محفلِ قدرت میں ان بدنفس ہستیوں کا کیا مصرف ہے؟ یہ اک نازک سوال ہے، اور "شموماً لایخل"! صرف شعر آئے ادراکات احیاناً اِس کنہ سے مَس ہو جاتے ہیں، لیکن کوئی فلسفی اُس کی توجیہہ آج تک نہ کرسکا۔

بارکلفیڈرو کا عام نقشہ یہ تھا کہ اُس کا بدن پُرگوشت تھا، اگرچہ چہرہ بالکل استخوانی! اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں گرہ دار تھیں اور ناخن چھوٹے چھوٹے، انگوٹھے چپٹے تھے۔ بال موٹے اور کھُردرے! کنپٹیوں کے درمیان بہت فصل تھا اور پیشانی قاتلوں کی طرح نگوں سار! متفنی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں، اور گھنی ابرُوں کی کنجوں کی کمینگاہوں سے تاکا کرتی تھیں!۔ ناک پتلی اور لمبی تھی، قریب قریب منہ تک پہنچی ہوئی! بارکلفیڈرو جب اپنے غصے میں ہوتا تو اک ٹھاکر معلوم ہوتا۔ لیکن اُس کی ٹھکرائی ہو یا ٹھاٹھ، بر ہر دو لعنت! اُس کے سارے خط و خال موٹے اور بھدے تھے۔ جس وقت وہ مخلّی بالطبع بیٹھا ہوتا تو اُس کا بالائی لب اوپر اُٹھکر زاویۂ حادہ بناتا تھا، جس کی وجہ سے دو دانت دکھائی دے جاتے تھے۔ یہ "دندانِ سگ" سامنے کے آدمی کو اک خاص اندازِ "گزندگی" سے تاکا کرتے تھے! ان دانتوں کی "تاک جھانک" کُنجِ دہن سے بڑی معنی خیز نظر آتی تھی۔ لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ جس طرح بعض اوقات آنکھوں سے دانتوں کا کام لیا جاتا ہے، دانت بھی کبھی آنکھوں کا وظیفہ انجام دیا کرتے ہیں!

بارکلفیڈرو کم سُخنی و خود ضبطی، متانت و سنجیدگی، شائستگی و خوش خلقی، خاطر و مدارات، صبر و ثبات، امانت و دیانت کا بظاہر اک مجسمۂ کامل تھا۔ لیکن ان پسندیدہ خصائل و شمائل کو اُس سے جو مصنوعی انتساب تھا اُس سے ان اخلاقِ حمیدہ کی گویا توہین ہوتی تھی!

چند روز کے بعد بارکلفیڈرو کی رسائی دربارِ شاہی تک ہوگئی۔ جہاں اک سوسمار کی طرح اُس نے اپنے پنجے جمالئے۔

(۱۵)

سُلطانِ محبت اور شیطانِ عداوت

ملکۂ این کے صیغۂ مخبری کے متعدد ارکان تھے، از آنجملہ ایک بارکلفیڈرڈ تھا:

ملکۂ معظمہ کے کان وہ ہمیشہ بھرتا رہتا تھا ——— لیڈی جونیانہ اور لارڈ ڈیڈوڈ کے خلاف اک مستقل سازش کی پرورش عمل میں آرہی تھی۔

قارئین کو معلوم ہے کہ بارکلفیڈرڈ کی زہر چکاں سرگوشیوں کا نشانہ تین کان تھے۔ بسوائے تاریخ ڈیجنیر کو یہی تسلط دو کانوں پر حاصل تھا! یہ شخص لوئی چہاردہم اور ہینریٹیا کے درمیان گھس گیا تھا! شہنشاہ اس ساحرہ کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ہینریٹیا اس کی سالی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ سالی بھی "دولہا بھائی" سے محبت کے پینگ بڑھا رہی تھی! انہی ایام میں، اور انہی تعلقات کی نشو و نما کے دوران میں حریف ڈیجنیر شاہِ فرانس اور اُس کی معشوقہ کا محرمِ راز اور میر منشی تھا! لطف یہ کہ دونوں اُس کی اس دوگونہ حیثیت سے قطعاً لاعلم تھے! عشقبازِ فریقین کے دوطرفہ پیامات و جوابات ایک ہی مشترک کاتب لکھا کرتا تھا! ع

عشق است و ہزار "خوش گمانی"!

بارکلفیڈرڈ اس قدر زندہ دل و بذلہ سنج واقع ہوا تھا، اور بظاہر مختلف لوگوں کی "بندشوں" میں اتنا "بے لگاؤ" اور ناروا معاملات کی "آلائشوں" سے اتنا "پاک"، ——— نیز اتنا "بدشکل" کہ یہ بالکل اک قدرتی امر تھا کہ شاہی خاندان کے لوگوں کو اُس کی صحبت کے بغیر چین نہ آئے! ملکۂ این جب ایک دفعہ اُس کی روغنِ ناز کی مالش سے لذت یاب ہو لی تو پھر اُس کے بعد سے اُسے کوئی ندیم اپنے حضور میں درکار نہ تھا۔ بارکلفیڈرڈ کا فلسفۂ خوشامد وہی تھا جو لوئی اعظم کے درباریوں کا تھا ——— یعنی حریفوں اور ہمچشموں کی غیبت و مذمت! مادام مانٹ شیوریل کا قول ہے کہ "جب بادشاہ جاہل ہو تو اہلِ دربار مجبور ہیں کہ علماء و اشراف کا مذاق اُڑائیں!"

وقتاً فوقتاً نیشِ زنبور میں زہر بھرتے رہنا اپنے موقلم کو رنگ طراز رکھنا ہے: یہ فنِ لطیف اپنی تخلیقی پیداوار کو ہمیشہ سرسبز رکھنا چاہتا ہے۔

دربار و محلات کے تعلقات بڑے پیچ در پیچ ہوا کرتے ہیں۔ بارکلفیڈرڈ اپنی ساری بے وقری و کم مائگی کے علی الرغم سارے دربار کا محور بنگیا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بعض مشینوں میں سب سے چھوٹا پُرزہ ہی ساری مشین کا قلب ہوا کرتا ہے!

بارکلفیڈرڈ کو دل و دماغ کی دنیاؤں میں وہ انکشافات کرنے کی دستگاہ حاصل تھی جس کے زور پر چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچایا کرتے ہیں! تاریک راستوں پر اُس کی رفتار بے آواز، چکردار اور نظر باز ہوا کرتی تھی! وہ ایک مادر زاد جاسوس تھا۔ جو جلاد کی سنگدلی اور محقق کی جگر کاوی سے مل کر بنا تھا: بلاشبہ وہ پیدائشی درباری تھا، مردم شناسی، معاملہ فہمی، کاربرآری، دلیشہ دوانی کے فن میں اُس کی بصیرت و فراست قطعاً وہبی واقع ہوئی تھی! ہر ایک درباری شب گرد ہوا کرتا ہے! راتوں کی آوارہ گردی پر اُس کے دن کے دَور دورے کی بنیاد ہوتی ہے! اُس کا مقولہ یہ ہوا کرتا ہے کہ "جو سوئے گا وہ کھوئے گا۔ جو جاگے گا وہ پائے گا"!

شبِ تار کے اس صیادانہ سیر و گشت میں اُس کے ہاتھ میں اک "چور لالٹین" ہوا کرتی ہے! جس موقعے کا اُس کو جائزہ لینا اور معائنہ کرنا ہوتا ہے اُسے وہ اپنی روشنی کے نقطۂ ماسکہ میں لے لیتا ہے، اور خود اک گوشۂ تاریک میں بیٹھکر محوِ تجسس ہو جاتا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اُس کا ہدفِ تفتیش اک ازلی احمق ہوا کرتا ہے؟ ——— ہمارا روئے سخن خود بادشاہِ سلامت کی طرف ہے!: ع

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

ملکہ این کی نظرِ نوازش روز بروز بارکلفیڈرڈ پر بڑھتی جا رہی تھی! شاہی اکابر کو کچے تاگے سے باندھ لینے والے کی حیثیت سے تاریخ یورپ میں سارہ جیننگز بہت زیادہ روشناس شہرت ہے، لیکن ہمارا بارکلفیڈرڈ پردۂ گمنامی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی شخصیت کی اہمیت بڑی طرح نظر انداز کی گئی ہے! کم از کم اُس کا نام تاریخ کے پیامبر نے ہم تک نہیں پہنچایا لیکن شاید یہ کوئی تاریخی اعجوبہ نہیں ہے! تاریکیٔ شب میں اگر کوئی کور موش نہ پکڑا گیا تو چنداں تعجب کی بات نہیں!

بارکلفیڈرڈ نے اپنی ابتدائی بیچمیرز حیثیت سے اُبھر کر اب قریباً تمام

مسائل و معاملات میں کافی دخل و درخور حاصل کر لیا تھا۔ مگر صرف سطحی معلومات پر اکتفا کرنے سے کوئی معتدبہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا کرتا۔ جو شخص ہر علم و فن میں دخل در معقولات کیا کرتا ہے "ہر فن مولا بن" سے زیادہ "سادہ لوحی" کسی طریق الکتساب میں نہیں پیش آیا کرتی۔ ایسے انسان کی درست و بازنی طلب الکل فوت الکل کی مصداق بن کر رہ جاتی ہے؛ تحصیل علم میں یہ مسلک عمل بڑی شکست انجامی پر ختم ہوا کرتا ہے؛ علمار کے دماغ اس سے شور و عقیم ہو کر رہ جاتے ہیں؛ بارکلفیڈ رو نے اپنے دماغ میں جو رطب و یابس بھر لیا تھا، اس نے بھی اس کی لوح ذہن کو "نتیجۃً" کورا ہی رکھا تھا۔

آدمی کا دماغ مع اپنے خیالات و عزائم کے اک "ترکش" کے مشابہ ہے؛ بارکلفیڈ رو نے اپنی بد باطنیوں کے سارے لفظی اسلحہ خانے کا ہدف جوزیانہ کی ذات کو بنا رکھا تھا۔ انسان کے دل کا اک ارادۂ بد اور اک قرابین یکساں چیزیں ہیں؛ جوزیانہ اب بارکلفیڈ رو کے تمامی کارخانۂ سامانِ حرب و ضرب کا نشانہ تھی۔

کیسی بوالعجبی ہے! اک معصوم چڑیا نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم اس پر فیر کرنا چاہتے ہو؟ تم کہتے ہو کہ "ہم اس کا قلیہ کریں گے"۔ ——————

ناکردہ گناہ جوزیانہ کے خلاف بارکلفیڈ رو کے شرارت آمیز منصوبوں کی ماہیت بھی بالکل ایسی ہی ستم ایجادی تھی؛

تاہم جوزیانہ کے دل کو تسخیر بنانا آسان نہ تھا! انسان کی ساری ہستی کے اندر یہی وہ جگہ ہے جو تمام اسرار و خفایا کا نہاں خانہ ہے! البتہ جوزیانہ کا فرقِ نازک زد میں لایا جا سکتا تھا! یعنی اس کے جذبۂ عزور د نخوت پر ضرب لگانی ممکن تھی۔ مگر اسی موقعے کو جوزیانہ سب سے زیادہ محفوظ و متحصن مقام سمجھتی تھی۔ تاہم یہی اس کے محاذ کا کمزور ترین نقطہ تھا! —————— اور بارکلفیڈ رو نے اسی نقطے کو تاک لیا تھا۔

اگر جوزیانہ کو معلوم ہو جاتا کہ بارکلفیڈ رو کے متبسم چہرے کی کمینگاہ کے پیچھے کیسا خوفناک عندیہ پوشیدہ ہے، تو اس نازپروردہ خاتون کا دلِ نازک کانپ جاتا! مگر وہ اک "جہالت کی جنت" میں تھی: اپنی بےخبری کے طفیل میں وہ بےغل و غش تھی، ورنہ اس کے ہوش پراں ہو جاتے اور اس کا خواب و خور حرام ہو جاتا!

رشک و حسد کی فضا سے ناگہانی آفات کا قدرتی نزول ہوا کرتا ہے!

عداوت و عناد اک ہولناک شے ہے جب اک کرم حقیر کے سینے میں بھی اس کی تخم ریزی ہو جاتی ہے تو وہ اک عفریت مہیب بن جاتا ہے۔ اک فیل کوہ پیکر کو بھی اگر اک مور ضعیف اپنے خبث و لغض کی زد میں رکھ لے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہاتھی کی خیر نہیں!

اس درد انگیز کار شنیع کے ارتکاب سے پہلے ہی بارکلفیڈ رو اس کی قبل از وقت لذت محسوس کرنے لگا۔ اس نے ابھی تک یہ طے نہیں کیا تھا کہ جوزیانہ کو کس حربے کا نشانہ بنانا چاہیئے۔ مگر بالاجمال یہ عزم مصمم ہو گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ وار کرنا ضرور ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اور اس ابہام کی یکسوئی اس کے لائحۂ عمل کا ایک اہم قدم تھا۔

جوزیانہ کو بالکل پامال کر ڈالنا اک نادر کارنامہ ہوتا، مگر بارکلفیڈ رو کو اتنی توقع نہ تھی۔ سردست وہ اپنی تشنگی کی اتنی تبرید کو بھی کافی آسودگی سمجھتا تھا کہ جوزیانہ کے طرۂ طرار کو ذرا جھٹکا دے، اُن کی مژگانِ نازک کو تھوڑا "سرشک آلودہ" کر دے۔ اس کی خاطر عاطر کو قدرے مکدر کر دے؛ وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہمہ تن اپنے مقصد کے حصول میں منہمک ہو گیا ہے، اپنے دست و دماغ کی ایک ایک حرکت و کاوش کو اس غایت کے لئے اس نے وقف کر دیا ہے۔

وہ ایسی ویسی چیز نہ تھا۔ فطرت نے اس کو بیکار نہ بنایا تھا! وہ خوب سمجھتا تھا کہ جوزیانہ کے طلائی جوشن و چار آئینہ کے اندر کونسا روزن و رخنہ ہے! اور اس تدبیر میں بھی پورا یدِ طولیٰ رکھتا تھا کہ اس نقطے کو شست میں رکھ کر کس طرح اس کے سینے سے اک فوارۂ خون نکالنا چاہیئے!

مگر بارکلفیڈ رو کو اس فی سبیل اللہ کوہکنی سے آخر کیا حاصل ہونے والا تھا؟ بظاہر تو اک شیطان کی مار ہی تھی! لیکن پھر دیکھئے تو اک عظیم الشان مطمح نظر اس میں مضمر تھا —————— یہی کہ جس نے اپنے اوپر احسان کیا ہے، اُس سے اس احسان کا انتقام لینا! قتل الانسان ما اکفرہ!

حاسد آدمی بھی کیا طرفہ بلا ہوتا ہے!! احسان شناسی کا احساس اُس کے لئے اک دلدوز خلش ہوا کرتا ہے! وہ اُسی ہاتھ کو کاٹ ڈالنا چاہتا ہے، جس کا وہ مرغِ دست پروردہ ہوتا ہے! ؎

باہر کہ دوستی رخود اظہار می کنم خوابیدہ دشمنے ست کہ بیدار می کنم!

جو خوابِ شیریں بارکلفیڈرد کو اپنے کیف سے بیخود کئے ہوئے تھا، اُس کا منظر کیا ہے! اُف، جوزیانہ کا تنِ نازک اک تختۂ قصاب پر لٹایا ہوا ہو، اور قطع و بُرید کے دشنۂ تیز کا تختۂ مشق ہو! خنجرِ خونخوار ہو اور اُس کا گلوئے حسین! نشترِ آبدار ہو اور اُس کی جلدِ نازنین؟!

یہ معرکہ آرا شکار مارنے کے لئے خود بھی کچھ ہاتھ سے دینے کی ضرورت تھی۔ بارکلفیڈرد خوشی سے اس قربانی کے دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ ممکن ہے کہ اپنی چٹکی سے ہم اپنا ہی چمڑا نوچ لیں؛ ہوسکتا ہے کہ اپنا چاقو بند کرتے ہوئے ہم اپنی ہی انگلیاں کاٹ لیں! مگر مضائقہ کیا ہے! جوزیانہ کو جو عذاب بارکلفیڈرد دینا چاہتا تھا، اگر ناگزیر طور پر اُس کے ایک حصے میں اُسے بھی شریک ہونا پڑے تو اُس سے گریز کرنا "کھلاڑی پن" کے آداب کے خلاف تھا۔ جب جلاد اک سرخ گرم تیشے سے کسی کشتنی مجرم کی گردن الگ کرنے کو اُٹھتا ہے تو اپنے آلۂ سوزندہ کے تھوڑے بہت داغ سے پرہیز نہیں کرتا۔ محض اس تصور سے کہ دوسرے کی اذیت اپنی تکلیف سے زیادہ ہے اپنی تکلیف بمنزلۂ راحت کے محسوس ہوتی ہے۔ اختہ دار پر اپنے دشمن کے ہاتھ پاؤں کے پیچ و تاب کھانے کا تماشا اپنے رگ و ریشے کے سارے درد کو نکال دیتا ہے!

اس ساری دہشتناک نضا میں جوزیانہ اپنے کو مامون و مصئون سمجھے ہوئے تھی! خطرات سے وہ اپنے شاہانہ جسم و جان کو بالاتر شمار کرتی تھی۔ وہ کسی اندیشے کے واہمے سے اپنی تحقیر کرنی نہ چاہتی تھی؛ صنفِ نازک کی شانِ کبریائی بھی کتنی دیدنی ہوتی ہے۔ بارکلفیڈرد، ڈچیز جوزیانہ کی نظروں میں ایسی حقیر و ناچیز ہستی تھا کہ اگر کوئی اُس کے مستقل وجود بالذات کا بھی ذکر اُس کے سامنے کرتا تو اُس کے لئے یہ امر خاصا موجبِ تعجب ہوتا! وہ اُس کے سامنے بلاتکلف آتی جاتی۔ اور ہنستی کھیلتی! وہ اُن ناشدنی منصوبوں سے کانوں کان خبر نہ تھی۔ جن کی زہر چکانی بارکلفیڈرد کی درندگانہ آنکھیں کرتی رہتی تھیں! وہ کسی عین موزوں لمحے کا جویا تھا، اور وہ اُس کے انتظار میں چشم براہ!

جتنا وہ انتظار کرتا تھا اُس کا ارادہ گہرا ہوتا جاتا تھا، اور جتنا اُس کا مقصد معرضِ التوا میں پڑتا تھا اُس کا جوشِ کاوش المضاعف ہوتا جاتا تھا۔ وہ وقت کی تاخیر کا انتقام اک سود خوار کی طرح لینا چاہتا تھا! اپنے مقصود کی دُوری و گریز پائی اُس کی گرفتِ تعاقب کو تنگ تر کرتی چلی جاتی تھی۔

به دورگردی من از غرور می خندد
حریفِ سخت کمانے که در کمیں دارم!

پھر وہ اپنے نکردہ اراووں کے لئے خود ہی دلائلِ جواز بھی پیش کرتا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یہ کورباطن لوگ عزتِ نفس کے شعور سے خالی ہوتے ہیں! وہ پوری سنجیدگی و بلند آہنگی سے اپنی پاکیزگی کے دعوے کیا کرتے ہیں: وہ معمولی "نکیلے" نہیں ہوتے! ------ اُیں! جوزیانہ نے اُسے مُوردِ کرم بنایا! وہ اس کی خیرات و صدقات کا ہدف بنایا گیا! اُس نے اپنے خوانِ کرم کے چند ریزے اُسے "ریزہ چین" جانکر اُس کی طرف پھینکے! ------ پھر اُس نے اُس کو اک ایسی ذلیل خدمت سے پابزنجیر کیا جو اُس کی شان سے بالکل فروتر واقع ہوئی تھی! ------

کیوں نہو! بارکلفیڈرد میں تو ماشاءاللہ اک پادری کی اہلیت و فضیلت ودیعت کی گئی تھی! نہیں نہیں، اُس میں تو حق یہ ہے کہ اک "اُسقفِ اعظم" کی سی جلالتِ علمی پائی جاتی تھی! اللہ اللہ، ایسا کامل و اکمل اور مُستجمع جمیع صفاتِ انسان، اور ساحلِ بحر پر اُس سفال شماری کا مہمل کام میں ڈالا جائے! وہ اک ذلیل دفتری عمارت کے اندر، جو اپنی ہیئت کذائی میں اک "اصطبل" سے بہتر نہ تھی۔ اپنی حیاتِ عزیز کے دن گذارنے پر مجبور رہو! سمندری بوتلوں کی حاملِ حماقت پارسلیں اپنے شریف ہاتھوں سے کھولا کرے! ------ وہ بوتلیں جن پر بلانوشِ بحرِ اعظم کی ساری غلاظتیں تھپی ہوئی ہوں! جن کے بوسیدہ چرمی پارچوں کی مبہم و مشکل الفہم تحریروں کی قرأت و تفسیر اُسے کرنی پڑے۔ یہ ساری زحمت انگیزیاں اور اہانت باریاں جوزیانہ کی فردِ جرم کے سیاہ اندراجات تھے!

ہاں وہ اُسے "تو" اور "تیرا" سے خطاب کرے! اُس نے سمجھا کیا ہے! کیا اُسے انتقام کا حق نہیں؟ کیا ایسی بدتمیزی قابلِ معافی ہے؟

بےخبر جوزیانہ اِن تمام خون آشام عزائم کے جواب میں زبانِ حال سے شاید یہ کہتی معلوم ہوتی تھی کہ ع

رسمِ اُمید مبادا زجہاں برخیزد!

(سر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم منثور کا اُردو ترجمہ)

ہر چند ترجمے میں اصل کی سی شگفتگی اور خوبی نہیں آسکتی، پھر بھی چونکہ اس ترجمے کی اصل اچھی ہے، اس لئے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ ایڈیٹر

شاعرِ پیرانہ سال اب دن کہاں ہے شام ہے　　　سر کے بالوں کی سفیدی مطلعِ انجام ہے
جائزہ لے اپنی اس خاموشیٔ تخئیل کا　　　کیا سنائی دے رہی ہے تجھکو عقبیٰ کی صدا؟

شام ہو میں شام کے انجام سے غافل نہیں　　　شاعر اپنی دھن سے اپنے کام سے غافل نہیں
یہ دھندلکا شام کا میں راز اندر راز ہوں　　　گاؤں والوں کی صدا پر گوش بر آواز ہوں
کیا عجب پھر وقف ہوں ہیں کام آنے کے لئے　　　گاؤں بھر بے چین ہو میرے بلانے کے لئے

سوچ میں بیٹھا ہوں وہ گم کردہ منزل دل نہیں　　　اور پھر مستی فروش آنکھوں کے دو جوڑے ملیں
سب یہ چاہیں کیوں رہیں لب بستہ مہرِ سکوت　　　توڑ دیں مہرِ سکوت اب مثلِ تارِ عنکبوت
لب کشائی پر جو ہوگی ان کو نغموں کی تلاش　　　جب جمودِ فکر خود پیدا کرے گا ارتعاش

ڈھال دے گا نظم کے سانچے میں کون ان کے خیال!
کس کے رنگیں شعر ہوں گے ترجمانِ حال و قال

میں اگر ساحل نشینِ زندگی ہو جاؤں گا　　　فکرِ سوت و آخرت میں سر بسر کھو جاؤں گا

راہِ شب میں شام کا پہلا ستارہ گرد ہے　　اب چِتا کی آگ ندی کے کنارے سرد ہے
چاند ہے روشن کیے اپنی پریشاں روشنی　　ابتری کا پیش خیمہ رنج ساماں روشنی
ایک ویرانے کا صحن اور اس کا وحشتناک حال　　ہیں سگانِ راہ ہم آہنگ غوغائے شغال

بھول کر رستہ اگر کوئی مسافر آئے گا　　رات کی کیفیتوں پر جب نظر دوڑائے گا
سر جھکا کر جب سنے گا نغمہ ہائے تیرگی　　پائے گا خود اپنی ہستی کو مجسّم بیخودی
اس مسافر سے کرے گا کون اب سرگوشیاں　　کون اُسے سمجھائے گا رازِ حیاتِ جاوداں

میں اگر دروازہ اپنا بند کر لوں شام سے
فکر یہ ہو دنیوی فکروں سے آزادی ملے

کچھ نہیں غم ہو گئے ہیں بال اگر سر کے سفید　　ہر زمانے میں رہوں گا میں رہا بے بند و قید
میں جواں سے بھی جواں ہوں پیر سے بھی پیر ہوں　　اس نگر کے ہر جوان و پیر کی تفسیر ہوں

بعض ہونٹوں کے تبسّم میں ہے شیریں سادگی　　بعض آنکھوں کی چمک عیّاریوں کی مقتضی
بعض آنسو ہیں کریں چشمے کے چشمے جو رواں　　بعض آنسو ہیں کہ تاریکی میں ہو جائیں نہاں
میں سمجھتا ہوں کہ ان سب کو ضرورت ہے مری　　فکرِ عقبیٰ کی مجھے فرصت نہیں اے زندگی

ہر نوائے ساز پر میں ہمنوائے ساز ہوں　　نسبتاً ہر فرد کا ہم عمر ہوں ہمراز ہوں
سر کے بالوں کی سفیدی کی ہے کیا پروا مجھے
دیکھنے کی طرح سے دیکھے اگر دنیا مجھے

(آغاز برہانپوری)

رازِ دہر

ہیکل کا شہرۂ آفاق صحیفۂ عقلیت!

تلخیص از قلم جوزیف میکیب

ڈارون کی "منبع الانواع" (ORIGIN OF SPECIES) ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ ارتقاء کا جو نظریہ اُس میں پیش کیا گیا تھا بمجرد سماعت آرنسٹ ہیکل نے اُس پر "آمنّا و صدقنا" کہا: یہ وہ وقت و ساعت تھا کہ حکیم موصوف اپنے علمی معرکۂ حیات میں قدم ہی رکھ رہا تھا! چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ہیکل کی اولین اہم تصنیف مسئلۂ ارتقاء پر ــــــ "اجسام نامی کے عمومی تغیرات و تحولات" ــــــ اشاعت پذیر ہوئی۔ اسی موضوع پر اُس کی دوسری تصریحات اُس کی اک دوسری کتاب "تخلیق کی تاریخ طبیعی" (شائع شدہ ۱۸۶۸ء) میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ اور تصنیفات جو اِسی مذاکرے پر مشتمل ہیں وہ ہیکل کی "حلقۂ آخرین" (۱۸۹۸ء) اور "معمائے کائنات" (۱۹۰۰ء) ہیں یہ غائت درجہ قبول عام حاصل کرنے والی کتاب کم از کم سترہ زبانوں میں بصورتِ ترجمہ منتقل ہوئی ہے! اُس کے انگریزی پیراہن کا خیاط جوزیف میکیب ہے۔ یہ کتاب ہیکل کے نظریۂ "وحدۃ الوجود" کی ترجمانی کرتی ہے، جس کے ذریعے سے اپنے دعوے کے بموجب اُس نے ایک شخصی خدا کے عدم وجود کو ثابت کیا ہے! نیز مسئلۂ قدر اور انسان کی حیات بعد ممات کی نفی کی ہے!! "رازِ دہر" مسلکِ "عقلیت" کا مسلمہ صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔

نشو ونمائے انسان کی داستان (۱)

اُنیسویں صدی میں علوم و معارف نے جو حیرت ناک تقدم حاصل کیا، اُس کی فتوحات کے نتیجے میں اب اتنا مسالہ پیدا ہو گیا ہے کہ کائنات کے متعلق جو ہمارا عمومی فلسفیانہ تصور ہے اُس کا قرار واقعی آب و گِل بہم پہونچ جائے۔ علم و حکمت کے "مردانِ یکفن" (SPECIALISTS) کچھ اس طرح مختلف شعبجاتِ نظر و تحقیق کی تنگناؤں میں محبوس رہے ہیں کہ عالم کائنات کے عظیم تر عمومی مسئلے غریب علمائے مابعد الطبیعات ہی کی فکر و کاوش کے حوالے رہے ہیں، جو اپنے گوشۂ خمول میں اس "سعیٔ ناشکور" کے لئے وقف رہے ہیں: اربابِ سائنس کی اس تنگ ذہنی مرکزیت کے خلاف ایک طرف، اور مجرد فلسفیانہ طریقِ فکر کی "عقیمیت" کے خلاف دوسری طرف میں نے ہمیشہ احتجاج کیا ہے! اس مقالے میں میرا مقصود یہ ہے کہ اب تک میدانِ تحقیق میں جو انکشافات عمل میں آچکے ہیں اُن کا ماحصل پیش کروں۔ اور اُس کی روشنی میں یہ جائزہ لوں کہ کائنات و حیات کے مہمات مسائل کے حل میں ہم کس منزل پر پہنچ چکے ہیں!

جدید العہد سائنس نے دو خاص عظیم حقائق کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے۔ پہلی حقیقت مادے کا لقا یا استمرار، اور توانائی کی دوگونہ حقیقت ہے، اور دوسری ارتقا کا ناموس کبیر ہے!

اب یہ حقیقت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ جملہ اشیائے عالم کی

کی بیچ دنیا میں جو شے واقع ہے وہ غیر فنا پزیر ہے۔ مزید برآں وہ اک عمل نشو و نما کے تحت دائمًا اپنے اشکال و صور کو بدل رہی ہے: سائنس ہم کو اُس حقیقت کی طرف دعوتِ نظر دیتی ہے۔ جسے اُس شے لامحدود کی ازلی نقاب افگنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو تمام مظاہر مرئی کے نیچے واقع ہے: پس آج ہم شاید اک واحد عظیم معمائے کائنات سے دوچار نظر آتے ہیں: "آیا کائنات میں دو جداگانہ متمائز عناصر موجود ہیں۔ مادہ اور روح۔ جیسا کہ اہلِ ثنویت کا خیال ہے۔ یا ہم ان دو مختلف مظاہر کو کسی ایک اساسی حقیقت میں تحلیل کر سکتے ہیں"!

موخر الذکر قضیہ، جسے میں وحدۃ الوجود کی اصطلاح سے ادا کر رہا ہوں میری نظر میں صحیح تعبیر ہے۔

جہاں تک کہ انسان کے جسمانی پیکر کا تعلق ہے اِس وقت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں اِس امر کی صداقت میں شک ہو کہ وہ نشو و نمائے نامی کے اک متدارج طولانی عمل کا ثمر آخرین ہے! علم تشریح البدن تمامی دنیائے حیوانات کے اندر ایک ہی نمونے کی حیرت انگیز یکسانی و تسلسل کو بے نقاب کرتا ہے۔ پھر انسان کا بدن بھی، سارے جانوروں کی طرح۔ لکھو کھا خلیات سے مرکب ہے!

جب ہم انسانی ڈھانچے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ریڑھ کی ہڈی والے تمام جانوروں کی خصوصیات رکھتا ہے۔ اُس کے اعضاء و جوارح کا اک غائر تر تقابل "ذات الثدایا" کے ساتھ کرنے سے مزید اس حقیقت پر سے بھی پردہ اُٹھتا ہے کہ انسان اپنے جوہر واصل میں اک "چوپایہ" واقع ہوا ہے! دودھ پلانے والے جانوروں کے طبقات عالیہ کی طرف جاتے ہوئے ہم، بذریعۂ مطالعۂ متقابلہ بھی یہی حقیقت معلوم کرتے ہیں کہ انسان اک اصیل و نجیب "چوپایہ" ہے! اور آخر میں ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ "بن مانس" کے ساتھ اُس کے قریبی رشتۂ نسب کا سراغ لگالیں! آدمی کے اور بڑے قد و قامت کے بن مانسوں کے نظامِ استخوانی کے درمیان جو فرق پائے جاتے ہیں وہ ان کی باہمی بیشمار مشابہتوں کے مقابلے میں نہایت خفیف اور ناقابلِ اعتناء واقع ہوئے ہیں!

جسمانی ڈھانچے سے اب ہم اُن کے حیاتیاتی وظائف پر آتے ہیں!

عضویات نے اعمالِ حیات کی توجیہہ میکانکی اصول پر کرنے میں اب اتنے مراحل طے کر لئے ہیں کہ ہم اُس قدیم عقیدۂ "نفخ روح" کو مسترد کر دینے پر مکلف ہیں جس کا منشاء یہ ہے کہ حیات اک توانائی ہے غیر مادی ماہیت کی! علم وظائف الاعضاء کے نقطۂ نظر سے جب انسان کا جائزہ لیا جاتا ہے تو پھر آدمی "پستان دار" حیوانات ہی کے عنوان کے تحت آتا ہے، اور بالاتر انواع کے بن مانس اُس کے "اعزہ و اقرباء" نظر آتے ہیں۔

انسان کا جنینی نشو و نما اس بیان کی توثیق کرتا ہے۔ انسان کا اپنے تخم رحمی سے ارتقاء عین ابتدائی منازل میں بھی دوسرے حیوانات کی طرح ہوا کرتا ہے! اپنے مراحل مابعد میں بھی انسانی جنین نوبت بہ نوبت جانوروں کے بعض ادنیٰ انواع سے اس درجہ مشابہ پایا جاتا ہے کہ علم الحیات کا اک ماہر خصوصی ہی دونوں کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے!

یہی مظاہر تشابہ و تقابل ہیں۔ جن کی نہایت موزوں تعبیر ڈارون اور لامارک نے اپنے انکشاف کردہ ناموس ارتقاء کے اثبات کی صورت میں کی ہے! چارلس ڈارون نے اپنے تصورِ انتخاب طبیعی کے ذریعے اس نظریۂ ارتقاء کے لئے اک سائنٹفک اساس بہم پہنچایا، اور اپنی مختلف تحقیقی تصنیفات کے اوراق میں میں نے اُس کے خیال کو علمی جامہ پہنانے کی اس طرح کوشش کی ہے کہ مختلف انواع حیوانات کے شجر ہائے نسب ترتیب دئے ہیں! یہ شجرے حجریات۔ علم الجنین، اور تقابلی تشریح البدن کی مجموعی شہادتوں پر مرتب کئے گئے ہیں! یہاں ہم پھر انسان کو بن مانس کی بالاتر انواع سے ہم رشتہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۹۴ء میں تو ہم نے سچ مچ اُس "حلقۂ مفقود" (گمی ہوئی کڑی) کے حقیقی آثار دستیاب کر لئے جس کے فراق میں ہم عرصۂ دراز سے تھے! یہ ہڈیاں آج ایک ایسے وجود کی باقیاتِ صالحات سمجھی جاتی ہیں جو ادنیٰ ترین انسان اور اعلیٰ ترین بن مانس کے ٹھیک بین بین واقع ہوا تھا ——— یعنی Pithecanthropus یا "جاوا کا بن مانس"!

(۲)

دماغ کا ظہور!

جب ہم جسم کے ارتقاء سے دماغ کے ارتقاء پر آتے ہیں تو اس

باہمی مطابقت کی نمود کم ہونے لگتی ہے : مذہبِ وحدت الوجود اور نظریۂ ثنویت یہاں بُری طرح باہم دگر معارض پائے جاتے ہیں۔ ہمارا وحدۃ الوجودی مکتب اس تصور کو پیش کرتا ہے کہ انسان کا دماغ یا نفس یا روح اک مظہرِ فطرت ہے، جو عملِ ارتقار کے پیرائے میں ادنیٰ حیوانات کے دماغ سے ترقی پذیر ہو کر بنا ہے۔ ہم اس کو اعمالِ دماغی کی اک پوری فہرست کے سرنامے کی حیثیت دیتے ہیں۔ جو تمام دیگر مظاہرِ فطرت کی طرح اک مادی تحتانی طبقے پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ اب عقیدۂ ثنویت کا قائل اس کا مدعی ہے کہ نفس اک روحانی شے ہے جس کا وجود عناصرِ جسم کے انفصال کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

مسئلۂ وحدۃ الوجود کا حل اس وجہ سے اور بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ اُس میں نفسیات کے قیاس آرا طریقوں سے ہمیں کام لینا پڑتا ہے! خلطِ مبحث کے اس سمندِ ناز پر اک اور تازیانہ اس طرح لگا ہے کہ بعض نہایت ممتاز اساطینِ فکر و فلسفہ مثل کانٹ، ورشو، ڈیو باے رمیانڈ وغیرہم اپنے آخری ایامِ حیات میں اپنی ماقبل تر زندگی کے مسلکِ وحدۃ الوجود سے تائب ہو گئے۔

ہم کو اس مسئلے تک زیادہ ایجابی راہوں سے رسائی حاصل کرنی چاہئے۔ ان طریقوں میں سب سے اہم تقابلی نفسیات کا طریقہ ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ انسان کے نفسی قویٰ کا ادنیٰ حیوانات کی دماغی طاقتوں سے موازنہ کیا جائے! اگر، جیسا کہ ہمارا یقین ہے کہ اک فردِ حیوان کی نشو و نما کم و بیش اُس تمام سلسلۂ اشکال کی تکرار کیا کرتی ہے جو گویا متعلقہ شجرۂ نسبِ اجداد کی شاخ و برگ ہیں، تو اک بچے کے دماغ کی تدریجی ترقی اپنے اندر ہمارے لئے اک معنی خیز درسِ حقیقت رکھتی ہے۔

اک دوسرا نہایت عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہم بشریت کی ادنیٰ نسلوں کے درمیان اک مطالعۂ متقابلہ عمل میں لائیں! تاہم بہترین نتائج اسی طرح حاصل ہوں گے کہ نفسیاتِ حیوانات کا اک تقابلی جائزہ لیا جائے۔

اس تقریب سے عالمِ حیوانات کا تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں مدارجِ نفسی کا اک مسلسل زینہ سا ملتا ہے، جو متدارج نظامِ انواع کے بالمقابل واقع ہوا! ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ تمام انواعِ حیوانات کی وحدت کا سُراغ لگائیں تحقیق کا سر رشتہ یہاں اس طرح ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ دماغ کی تمام "مادی زمین" میں بھی اک وحدت ہی پائی گئی ہے! فنی اصطلاح میں اس دماغی زمین کو (Psychoplasm or Nerve-plasm) کہتے ہیں: اسی شے پر تمام نفسی زندگی کی اساس قائم ہے۔ خوردبینی اقسامِ حیوانی کی زیریں ترین سطح پر مایۂ دماغی کی یہ مخصوص صورت ابھی جداگانہ طور پر ظہور یافتہ نہیں ملیگی۔ تمامی حیات اصولاً یکساں طور پر حامل ادراک واقع ہوئی ہے۔ بلند تر مرحلے پر عصبی خلیات، حیوانِ متعلقہ کے تختۂ دماغ کی عین بالائی سطح پر نمودار نظر آتے ہیں۔ اور اس سے بھی بالاتر جا کر یہی موقعے متعارف آلاتِ حواس کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں! ساتھ ہی ساتھ اک اندرونی خلیاتی مجموعۂ مبادیاتی دماغ بنا لیتا ہے۔ مزید ارتقار کا آئندہ قدم نظامِ عصبی کا استقلال و تکمیل ہے۔ اب مرکزی حصۂ مغز اور اُس کی بالائی سطح کے اعضار کے مابین اک زیادہ موثر سلسلۂ رسل و رسائل پیدا ہو جاتا ہے : اس ترقی یافتہ عضوِ مرکزی کے ظہور و بُروز کے ساتھ مختلف اعضار کے جداگانہ ارتسامات کا امتزاج کرتے ہوئے ہم "ادراکِ شعوری" پر پہنچ جاتے ہیں۔

جس طرح شعور کی بلند تر نشو و نما انسان کے اندر خاص طور پر ترقی یافتہ پائی جاتی ہے۔ اُس طرح ملکۂ "تعقل" انسان کے ساتھ علی الاطلاق محدود و مخصوص نہیں ہے! وہ دودھ پلانے والے جانوروں، حتیٰ کہ اونچے درجے کے بہت سے کیڑوں تک میں پایا جاتا ہے۔ نطق و زبان اور جذبات بھی ادنے حیوانات کے کم ترقی یافتہ انواع میں اپنے مظاہر رکھتے ہیں! لیکن آزادیٔ ارادہ، جس کا دعویٰ بلاشرکتِ غیرے انسان کے لئے کیا جاتا ہے۔ اُس کا انکار نہ صرف یہ کہ بہت سے نفسئین و طبعیین نے کیا ہے بلکہ یہ چیز بہت سے جید قسم کے مذہبی متکلمین کی مسندوں سے بھی سندِ تصدیق حاصل نہیں کر سکی ہے۔

ہم کو عالمِ حیوانات میں دماغی ارتقا کے خطِ رفتار کا تتبع بہت کچھ اُسی طریق پر کرنا ہے جس طریق پر کہ ہم جسم کی نشو و نما کا جائزہ لے چکے ہیں! اس غرض کے لئے ہمیں حجریاتی دفاتر کی ورق گردانی کرنی ہوگی، ادنیٰ حیوانات کے جنین کے مختلف مراحل کے درمیان موازنہ کرنا ہوگا، اور پھر اس پر انہی انواع کے درمیان آپس ہی میں اک تقابل کا اضافہ کرنا ہوگا۔ صحیفۂ ارتقار کے یہ تین بڑے بڑے اوراقِ شہادت ہیں!

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی وجود کا تخم واحد الخلیہ خوردبینی

حیوان کے مقابل واقع ہوا ہے! ــــــ جو صرف اک ایسا ادراک اپنے اندر رکھتا ہے جو اس کے رگ و ریشہ میں گویا مضمر ہے! یہ واحد تخم خلیہ اس کے بعد شق ہو کر اک گیند نُما مرکز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ اُن بعض خاص حیوانات کی ساخت و حیات کے مماثل واقع ہوا ہے جو متعدد خلیات کی تعمیر رکھنے والی پست ترین سطح حیات پر واقع ہوئے ہیں۔ اس مرحلۂ ارتقاء پر ہم اک "جماعتی روح" ایسی شے سے دوچار ہوتے ہیں! ــــــ اس لئے کہ ہر خلیہ اپنی انفرادی روح کو باقی رکھتا ہے! تخم کے خلیے اب متحد ہو جاتے ہیں اور پھیل کر مغز کے منسوجات بناتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ اک "قومی روح" کا حامل ہے! جس مفہوم میں ہم روح کو لیتے ہیں ــــــ یعنی نفسی اعمال کی میزان کل! ــــــ

اُس مفہوم میں ہم کو اک روح پودوں اور درختوں کے لئے بھی تسلیم کرنی پڑیگی! اور حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ جدید العہد تحقیقات نے دنیائے نباتات کے اندر اک محیر العقول ادراک کی پرچھائیاں دیکھی بھی ہیں!

تاہم حیوانی جنین میں، جیسا کہ انسانی جنین کا بھی معاملہ ہے، اب بعض خلیے نشو پذیر ہو کر اعصاب بننے لگتے ہیں! یہاں ہم اُس منزل کے بالمقابل آجاتے ہیں، جو مونگے یا "جیلی مچھلی" کا مرحلۂ ارتقاء ہے! آلات حواس اب سر کے اندر ظہور کرتے ہیں، اور جسم اک کیڑے کی طرح لمبا ہونے لگتا ہے۔ جو انسانی شجرۂ نسب میں دوسرا مرحلہ واقع ہوا ہے! اک عصبی رسن پشت کے اندر نمودار ہوتی ہے۔ اک مچھلی وار ــــــ اور بعد میں استخوانی ــــــ غلاف اُس کے اوپر حفاظت کے لئے منڈھ جاتا ہے بالائی سرا پھیل کر مغز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اور اس طرح ہم ریڑھ کی ہڈی والے زیریں ترین نوع حیوانات تک پہنچ جاتے ہیں۔ اصطلاحاً یہی مچھلی کے نظام جسمانی والا مرحلۂ ارتقا کہلاتا ہے۔

اس سے اوپر اُٹھکر ہم دو عنصری حیوان، اک ابتدائی قسم کے رینگنے والے جانور، اور اک کنگرو کی مشابہت کے نمونۂ حیوانی کے مراتب سے گزرتے ہوئے، ادنیٰ نوع کے بن مانسوں پر آتے ہیں، ذرا بلند تر سطح پر بہتر بن مانس ملتے ہیں، جس کے بعد عاقبۃ الامر ہم انسانی کرسی ارتقاء پر پہنچ جاتے ہیں! ــــــ آدمی اور اونچے درجے کے بن مانسوں کے درمیان مغز کی ساخت اور استعداد نفس کے فروق اُس سے زیادہ خفیف ہیں، جتنے کہ آخر الذکر اور "لیمر" نامی حیوان کے درمیان پائے جاتے ہیں!

اب ہم اُس عمل ارتقاء کا مشاہدہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں جس کے نتیجے میں انسانی دماغ کا ظہور ہوا کرتا ہے!

ہمارے اس بیان کی توثیق اُسی وقت ہوتی ہے جب کہ ہم شعور کے بالذات مطالعے پر آتے ہیں۔ اب ہم ڈیکارٹے کے نظریئے کو قبول نہیں کرتے جس کا منشا یہ ہے کہ شعور انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے جس کا منبع وہ کاسہ سر کے (PINEAL BODY) میں واقع ہے۔ شخصی طور پر میں ہر اُس جگہ کو شعور کا موقع تسلیم کرتا ہوں۔ جہاں کہ اک مرکزیت یافتہ شیرازۂ عصبی موجود ہو! اس سطح سے نیچے میں نفسی عمل کو غیر شعوری خیال کرتا ہوں! ــــــ اور صرف اسی مفہوم میں روح کو خلیہ اور نیز جزو لا یتجزیٰ کے ساتھ بھی منسوب کرتا ہوں!

حال کی تحقیق نے بتایا ہے کہ انسان کے اندر ارتقائے شعور ہمرشتہ واقع ہوا ہے بھورے رنگ کے عصبی مواد کے اُس حلقے کی نسبتہً کلاں تر قامت اور پیچیدگی سے جو مغز پر محیط پایا جاتا ہے! سادہ طور پر، اس سطحی پرت کا وہ حصہ جو پیشانی کے بالائی حصے کے نیچے واقع ہے، اہم ترین مرکز معلوم ہوتا ہے: جب ہم امراض مغز کے اُس اثر کا مزید مطالعہ کرتے ہیں جو دماغ پر مترتب ہوا کرتا ہے۔ نیز مسکرات و مخدرات کا، تو ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "شعور" محض عبارت ہے مادۂ مغز کے فعل و وظیفے سے ــــــ اس سے زیادہ کچھ نہیں!

(۳)

مسئلۂ کائنات

اب جبکہ ہم انسان کو حقیقت ارتقاء کی واقعیت کا اثبات کر کے، کل کائنات کی وحدت کے دائرے میں لے آئے ہیں، تو اپنے سے یہ سوال کرنے کا موقع پیدا ہو گیا ہے کہ اپنے حاصل کردہ وسائل علم کی بنا پر ہم اُن وسیع تر مسائل پر کونسی روشنی ڈال سکتے ہیں جو ہمارے معمائے کائنات کے عناصر ترکیبی ہیں؟ پہلا مسئلہ اِن میں "بقائے روح" کا قضیہ ہے!

قدیم یونان کے بعض اکابر فلاسفہ، اور اٹھارہویں صدی کے بکثرت

فرانسیسی مفکرین نے روح کی بقا کی نفی کی ہے۔ مواد مغز کے متعلق ہمارے علم نے جو اہم منازل و مراحل طے کئے ہیں۔ اُس نے، اور تجرباتی علم وظائف الاعضا نے بشمول نظریۂ ارتقا کے، اس انکار بقائے روح کو اب اک سائنٹیفک اساس بخشی ہے!

قطع نظر اس سے کہ ہم روح کے متعلق کونسا تصور قائم کرتے ہیں—— عام اس سے کہ وہ عامیانہ عقیدے کا کم و بیش مادی طریقہ ہو یا روحانی فلاسفہ کا مابعد الطبیعیاتی اصطلاحات والا پیرایہ، پھر خواہ اُسے ہم ایتھر کے مشابہ سمجھیں، خواہ گیس کے۔ خواہ اک خالص حقیقت مجردہ قرار دیں، وہ بہرحال مادۂ مغز ہی کا وظیفہ رہے گی۔ جو نظام مغز کے درہم برہم ہو جانے کے بعد خود بھی منتشر ہو جاتی ہے! بقائے روح کی تائید میں تقریباً سارے دلائل کا سرچشمہ اس ماجرے میں ہے کہ انسان اپنے دوام و قیام کے لئے اک مخصوص جذباتی شیفتگی رکھتا ہے!، یا محض اک بے بنیاد عقیدے کے داعیہ کے تحت ایسا سمجھتا ہے!

جب ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دماغی افعال کس طرح مادی اور کیمیاوی اعمال پر مبنی واقع ہوئے ہیں، نیز یہ کہ ادنیٰ تر حیوانات کے دماغوں تک نفس انسانی کا سُراغ ارتقا کس طرح لگاتا ہے—— تو ہم کو یہ عقیدہ ترک کرنا پڑتا ہے کہ "ہمارے اندر کوئی ایسی شے موجود ہے جو جسم کی فنا کے بعد باقی رہے گی"!

ہمیں یہ دماغ عام کائنات کی وحدت کے سر رشتے سے ہم رشتہ کرنا ہے، اور اب اس وحدت کا تصور، حال کے انکشافات کی روشنی میں کرنا ہے۔ عالم کی تلخیص، جیسا کہ آغاز گفتگو میں میں نے کہا ہے۔ عام طور پر مادۂ مستمرہ اور توانائی متحرکہ کی دو عظیم حقیقتوں کی صورت میں عمل میں آئی ہے۔ تاہم یہ حقائق و قوانین کائنات کے دو مختلف پہلوؤں ہی سے تعلق رکھتے ہیں! وحدۃ الوجود کے نقطۂ نظر سے وہ گویا ایک ہی واحد جوہر کے دوگونہ اطلاقات ہیں—— جسے میں "ناموس ہیولیٰ" کہتا ہوں۔

حکیم اسپینوزا اور گوئٹے کے تتبع میں ہم تمامی کائنات ہستی کو اک بنیادی و اساسی، لافانی و مستمرہ شے کی حیثیت میں دیکھتے ہیں: مادہ اور رُوح اِسی ہُوالکل شے کے صرف دو اعراض یا صفات ہیں! دماغ کی تحلیل فطرت کی معمولی توانائیوں کی صورت میں کرائی گئی ہے۔ جو انسانی مغز کے اندر مرکوز ہوا کرتی ہیں۔ پھر یہ توانائیاں اپنی باری میں، جدید طبیعیات کے ذریعے اک واحد اساسی توانائی کی صورت میں تحویل ہو گئی ہیں۔ ٹھیک جس طرح کہ اُسی کے ذریعے سے مادے کے تمام اشکال اک واحد بنیادی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں!!

اس بنیادی شے کی ماہیئت پر ماضیٔ قریب کی طبیعیات کی تحقیق جدید نے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔

جو نظریہ واقعات کے ساتھ سب سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے، نیز جو علم الکیمیات کی تعبیرات و توجیہات میں خوب کام دیتا ہے، وہ وُہ ہے جو جواہر فردہ کو اک ایسی شے بسیط و لطیف کے انجمادات کی حیثیت دیتا ہے جو کائنات کے تمام خلا کو پُر کئے ہوئے ہے!——اک غیر منقسم تسلسل کے ساتھ! یہ مرکزیت یافتہ مراکز اُس شے کے جواہر فردہ بناتے ہیں جو "قابل وزن مادہ" کہلاتی ہے! لطیف تر فضا جو اُس کے گرد محیط ہے "غیر قابل جائزہ ایتھر" سمجھی جانی چاہیئے! اس ایتھر پر انجماد کے ذریعے جو "فشار" پڑا کرتا ہے وہ تمام اقسام توانائی کا مخرج بنتا ہے۔ "ایتھر" غالباً "لوچ دار جیلی" کی ماہیئت کی اک چیز ہے، جو جواہر فردہ کی صورت میں منقسم نہیں ہے، اور خلائے کائنات کے تمامی پہنائے لامحدود کو لبریز کئے ہوئے ہے!!

اس شے کے آغاز وجود اور نشو و نمائے مابعد کے سوال میں ہم تمام کائنات کے مسائل کا عظیم ترین "مسئلۃ المسائل" پاتے ہیں: عام طور پر یہ یقین کیا گیا ہے کہ ہم کو اشیا کی آفرینش اک ماجرائے تخلیق سے منسوب کرنی چاہیئے۔ حقیقتہً ارتقا نے اس کرشمۂ تخلیق کو اب محدود کر دیا ہے۔ اب شاید ہی کوئی اہل سائنس ایسا ہو گا جو کاروبار تخلیق کے اک سلسلے کو تسلیم کرتا ہو—— جیسا کہ کیوویئر کے ناگہانی حادثۂ خلق[1] یا انجیل کے "باب پیدائش" میں پیش کیا گیا ہے! اہل کلام کا ایک گروہ یہ مفروضہ بھی پیش کرے گا کہ عالم غیر نامی اور دُنیائے حیات کے لئے جدا جدا اعمال تخلیق بروئے کار آئے! لیکن علمی دنیا کا عام میلان اب بھی قیاس ہے کہ اولاً کائنات کا آب و گل کسی ایک عمل تخلیق سے معرض وجود میں آیا۔ اور پھر اُس کے بعد ارتقائے طبیعی کا اک عمل جاری ہو گیا جس نے حیات، نفس، اور کائنات ہستی کے تمام دیگر موجودات و مظروفات کو پیدا کیا!

[1] کُن فیکون

ہمارا نظریۂ وحدۃ الوجود عقیدۂ تخلیق کو قبول نہیں کرتا ———— اِس معنی کہ ایک چیز "نیست سے ہست" ہوگئی ———— اک فوق الفطرت انداز میں: "قانونِ ہیولیٰ" کا معنوی اقتضا یہ ہے کہ مادہ اور حرکت نہ پیدا کئے جاسکتے ہیں نہ فنا! فلکیات نے نئی نئی دنیاؤں کے نشو و ارتقا کے بارے میں جو جو مناظر مُدہشہ دکھائے ہیں وہ اِس خیال کی زبردست تصدیق واقع ہوئے ہیں! یہ ماجرائے شگفت صرف اک لامحدود وسعت کی طرف انگلی اُٹھا دیتا ہے جو اک ازلی ارتقا کے احوال و منازل سے گزر رہی ہے! اس ہیولائی ہیولیٰ کا انجماد و تکثیف ہی ہمارا استعارہ "مادہ و توانائی" بہم پہنچاتا ہے۔ پھر قابلِ وزن مادہ "سدیم" کی صورت میں مجتمع ہونے لگتا ہے جو اپنی باری میں پھر انجماد پذیر ہوکر فضائے سماوات کے آفتاب و شموس بناتا ہے، جو اپنے حگر شق کرکے اپنے "حگر پاروں" کے سیارات اپنے نطاقات کی فضا میں اُچھال دیتے ہیں۔

جب ایک ایسا سیارہ کافی ٹھنڈا پڑجاتا ہے تو اُس پر رطوباتِ آب ٹھہرنے لگتی ہیں اور منصۂ شہود پر اولین مبادیاتی اشیائے ذی حیات نمودار ہوجاتی ہیں۔

ان اعمالِ حیات کو میکانکی اور کیمیادی توانائی کی صورت میں تحویل کرنے میں سائنس نے اب اس حقیقت کا اعتراف ہمارے لئے ممکن بنا دیا ہے کہ حیات افروزی کا اک "خود کار طریقہ" معرضِ عمل میں ہے۔ علمِ وظائف الاعضاء کی متعلقہ کیمیا نے ذی حیات اشیاء کو فطرت کی معمولی توانائیوں میں تحلیل کرڈالا ہے، اور اس تقریب سے اس دلچسپ حقیقت پر ہمیں مطلع کیا ہے کہ "کاربن" ———— جو اپنے اندر امتزاج و ائتلاف کے محیر العقول اوصاف رکھتی ہے ———— طبیعی ارتقائے حیات کی کارگاہ کا مرکزی کارفرما عنصر واقع ہوئی ہے۔ میکانیکی توجیہہ ———— مادہ و توانائی کے پیرائے میں تعبیر ———— نے ظہورِ کائنات کے معاملے میں خالقانہ ارادۂ دینیت کے قدیم تر تصور کو بے دخل کردیا ہے! بلاشبہ زندہ اجسامِ نامی کے اندر اک مقصد و منصوبہ ضرور مضمر ہے۔ لیکن وہ اُسی معنی میں جس معنی میں کہ مشینوں کے اندر پایا جاتا ہے ———— نہ کہ اُس معنی میں جس میں کہ اُن کے اندر اک پُراسرار "رُوحِ حیات" فرض کی گئی ہے۔

اس طرح ہم اب آخری عظیم کائناتی مسئلے پر آجاتے ہیں ———— ہمارا روئے سخن خدا اور دُنیا کے تعلق فیما بین کی طرف ہے! تاریخ انسانی کے جملہ مذاہب و ادیان، شرکِ کثرت کے ہر رنگ و نوع کے مشربوں سے ترقی کرکے تصورِ توحید پر فائز ہوئے ہیں! مذہب کے بلند تر مقامات میں ذاتِ معبود کے متعلق یہی تخیل پایا جاتا ہے کہ وہ اک روحِ مجرد واقع ہوئی ہے۔ تاہم اُس کے کاروبار کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کے متعلق جو راسخ الاعتقاد عقیدہ اب تک رائج ہے وہ اک انسان کے سے اعمال سے مُنزہ نہیں نظر آتا! ———— "ہمہ اوست" یا وحدۃ الوجود کا مذہب اُس خدا کی نفی کرتا ہے جو عالم سے جدا واقع ہوا ہے! پس اس طرح یہ مسلک اشیائے عالم کی رفیع ترین وحدت کے مقام تک صعود کرجاتا ہے!

"ہمہ اوست" کا خیال ابتداءً عہدِ عتیق کے ہندوؤں میں پیدا ہوا۔ لیکن یہی تصور یونانِ قدیم کے حکماء کی مجالس میں بھی افسانۂ بزم و انجمن تھا! ———— اور اب ہمارے دورِ جدید میں اسی نظریے نے اسپنوزا اور گوئٹے کی لسانِ حکمت پر اعلان پایا! یہ ہمارے نظریۂ وحدۃ الوجود سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ خدا کا انکار اسی نظامِ فکر کا سلبی پہلو ہے! چنانچہ بقولِ شوپنہار ہمہ اوست، انکارِ خدا کی اک مؤدب کوشش آواز ہے۔

(۴)

دینِ حق کیا ہے؟

تمام صالح سائنس کی غایت، حقیقت کا علم حاصل کرنا ہے۔ یہ علم اپنے زیرین ترین طبقے میں جاکر اُن ارتسامات سے مرکب ثابت ہوتا ہے جو ہمارے آلاتِ ادراک عالمِ خارجی سے حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے اِن مُدرکات پر ہمارے آلاتِ ادراک کی مُہر ہوتی ہے! وہ اُنہی کی ماہیت سے محدود ہوتے ہیں! حکیم لاک کا قول ہے کہ "عقل میں کوئی رگ و ریشہ ایسا پایا نہیں جاتا جو ابتداءً ہمارے حواس اولیہ موجود نہ تھا!" تاہم اک مفکر انسان تنہا اُس ناقص علمِ دنیائے خارجی پر قانع نہیں رہتا، جس کا سرچشمہ یہ ناقص آلاتِ شعور واقع ہوئے ہیں! وہ ان مبادیاتی نقوشِ ذہنی کو "خیالات و تصورات" کی صورت میں بحث و تمیز کیا کرتا ہے۔ پھر اس علم میں جو خلے رہ جاتے ہیں وہ اُس شے سے پُر کرتا ہے جو وسیع مفہوم میں "ایمان" کہلاتی ہے: سائنس بھی اس ایمان کے بغیر کوئی تقدم حاصل نہیں کرسکتی! ———— البتہ اس

تعلیم کا اثر ہندوستان میں

سنتے ہیں کہ تعلیم سے ہو جاتے ہیں پیدا — انسان کی فطرت میں صفاتِ ملکوتی

رکھتی ہیں جو اقوام درندوں کے خصائل — تعلیم کی برکت سے سُدھر جاتی ہیں وہ بھی

ہیں آج صفِ اولِ تہذیب ہیں وہ مُلک — کل تک جو گنے جاتے تھے آوارہ و وحشی

جن قوموں کا شیوہ تھا ہمیشہ جدل و جنگ — تصویر ہیں اب آشتی و صلح و صفا کی

جن لوگوں کی فطرت تھی نفاق و حسد و بغض — اب ہو گئی تعلیم سے کایا پلٹ اُن کی

اب نورِ محبت سے فضا سب ہے وہ معمور — تفریق و تعصب کی جہاں چھائی تھی بدلی

رہتا تھا جہاں خون کا بازار سدا گرم — اب امن و اماں کی ہے پرستار وہ بستی

تھا غارت و تاراج سدا جن کا طریقہ — اب صلح پسند اُن سے زیادہ نہیں کوئی

لڑتے تھے جو باہم گر اب ہو گئے سب ایک — دشمن تھے جو آپس میں وہ سب بن گئے بھائی

ہیں سامنے امریکہ و یورپ کی مثالیں — کرتی ہیں جو اس قول کی تائید بدیہی

دیکھو تو حقیقت میں ہے تعلیم کا صدقہ — ورنہ یہ وہی ”اَن سویلا ئزڈ“ ہیں وحشی

ہیں آج ترقی کی یہ جس آخری حد پر — دنیا میں مثال اس کی کہیں مل نہیں سکتی

یہ ان کی امارت یہ حکومت یہ سیاست — یہ اُن کا تمدن یہ ترفع یہ تعلّی

باہمدگر ان کا یہ خلوص اور یہ ایثار — یہ عزمِ جری اور یہ ارادوں کی بلندی

القصہ یہی ماننا پڑتا ہے بالآخر — تعلیم اثر اپنا دکھاتی ہے یقینی

ہو جاتا ہے لیکن ہمیں اس وقت تحیّر — جب ہند کی حالت پہ نظر جاتی ہے اپنی

جو چیز ہے دنیا کے لئے باعثِ رحمت — افسوس کہ ہے اپنے لئے وجہِ تباہی

اُس شمع سے ہے اپنا مکاں تیرہ و تاریک — جس شمع نے ہے نور فشاں محفلِ گیتی

جس شہد سے ہیں کام و دہن خلق کے شیریں
اس شہد میں ہے اپنے لیے صبر کی تلخی

جس نہر سے سرسبز ہیں دنیا کی زمینیں
اس نہر کے پانی سے یہاں خشک ہے کھیتی

دنیا میں ہے تعلیم و تعلم کی بدولت
اعمال کی اصلاح خیالوں کی درستی

اور ہند میں تعلیم کی برکت سے ہے ہر سمت
افلاس میں، ادبار میں، نکبت میں ترقی

طوفان ہے اک فتنہ و افساد کا برپا
نازل ہے جدھر دیکھئے اک قہر الٰہی

ہیں نت نئے اسلوب قتال و جدل و جنگ
ہر لحظہ ہے اک معرکۂ نو کی منادی

دامن سے چھٹا تھا نہ محرم کا ابھی خون
میدان میں صف آ کے دسہرے نے جمادی

ہولی ابھی بیٹھی بھی نہ تھی خاک اڑا کر
پٹنے لگی ہر سمت بقر عید کی ڈگی

مسجد کے نمازی ہیں کہیں مستعد جنگ
آمادۂ خوں ہیں کہیں مندر کے پجاری

تبلیغ جمائے ہے کسی سمت اکھاڑا
میداں میں صف آرا ہے کہیں لشکر شدھی

ہے ایک طرف دین کی خدمت بھی مقدم
ہے ایک طرف دھرم کا پالن بھی ضروری

بھولے سے بھی شاید نظر آئیں گے نہ دو دن
ایسے کہ بہم جن میں نظر آئے صفائی

دلسوزی و ہمدردی و اخلاق کا کیا ذکر
یا بندۂ اغراض ہیں یا سب متفنی

چاہے بھی اگر کوئی فریقین میں سلجھاؤ
اک دوسرے سے بڑھ کے نظر آئے گا ضدی

پھر لطف یہ ہے ان میں جو ہیں پیشرو ملک
سب وہ ہیں کہ تعلیم ہے جن کی بہت اونچی

بی۔ اے بھی بہت ان میں ہیں ایم۔ اے بھی بہت ہیں
ایسے بھی ہیں لائے ہیں ولایت سے جو ڈگری

سائنس کے ماہر بھی ہیں قانون کے بھی مرد
ہیں منتہی فلسفہ و نحو و ادب بھی

لیکن انھیں تعلیم سے پہنچا ہے یہی فیض
کرتے رہیں آپس میں یوں ہی تفرقہ سازی

ہر شخص نکالے گا یہی اس سے نتیجہ
تعلیم تو اک جوہر خالص ہے یقینی

ہوتا ہے مگر ہم پہ جو اس کا اثر الٹا!
ہے اصلی سبب اس کا فقط اپنی غلامی

(محمد مصطفیٰ خاں مداح (احمق) پھپھوندوی

فسانۂ آدم

میں تھا ضمیرِ مشیت میں ایک عزمِ جلیل — ہنوز شوق کی کروٹ بھی لی نہ تھی میں نے

کہ دفعتہً متحرک ہوئے لبِ تخلیق — پکڑ لی صورتِ ظاہر وجود کی میں نے

وہ صبحِ عالمِ حیرت وجلوہ زارِ بہشت — ہوا چمن کی لگی آنکھ کھول دی میں نے

وہ تربیت گہِ ذوقِ نظر وہ وادیٔ نور — جہاں سے پائی محبت کی روشنی میں نے

وہ عنفوانِ تمنا وہ ابتدائے جنوں — وہ اک خلش جسے سمجھا تھا زندگی میں نے

کیا سرور نے اک عالمِ دگر پیدا — چرا کے پی جو مئے سرکشِ خودی میں نے

خودی کے نشہ میں اللہ رے بیخودی میری — بدن سے چادرِ عصمت بھی پھینک دی میں نے

ہوا حدودِ نظر سے نکل کے آوارہ — ہوائے شوق میں جنت بھی چھوڑ دی میں نے

فرشتے رہ گئے حیرت سے دیکھتے مجھ کو — نہ کی قبول مشیت کی رہبری میں نے

دلیلِ راہ بنی میری گرمیٔ پرواز — کہ طاقتِ پرِ جبریل چھین لی میں نے

بڑھیں ستاروں کی دنیا میں میرے لینے کو — اتر کے عرش سے نیچے نظر جو کی میں نے

مگر زمیں کی کشش نے سوئے زمیں کھینچا — کیا پسند یہ زندانِ عنصری میں نے

جگہ ملی جو تڑپنے کی بے قراری کو — تو پھر حدود میں وسعت کی داد دی میں نے

ہر ایک ذرہ نے ہستی میں کروٹیں بدلیں — چھڑک دی خاکِ بیاباں میں زندگی میں نے

نمو کے جوش سے سودائے رنگ و بو نکلا — زمیں کے دل کی تمنا نکال دی میں نے

بھٹک بھٹک کے کئے ہر دیار میں سجدے　　　بھٹک بھٹک کے حقیقت تلاش کی میں نے
ہوئیں جہانِ عمل میں شریعتیں پیدا　　　خدا کے نام پہ برپا جو کی خودی میں نے
کبھی جلائی اندھیرے میں شمعِ علم و عمل　　　کبھی بجھا دی ہدایت کی روشنی میں نے
کبھی بگاڑ کے رکھ دیں ثواب کی شکلیں　　　کبھی بدل دی حقیقت گناہ کی میں نے
بڑھا تو رہ گیا پیچھے مرے زمانۂ حال　　　رکا تو وقت کی رفتار روک دی میں نے
ہوا میں شوق کے فتنے سلا دیئے سر سو　　　فضا میں نیند کی مستی بکھیر دی میں نے
کبھی جگا دی قیامت نفس کی ٹھوکر سے　　　اٹھا کے صورِ سرافیلِ زندگی میں نے
اٹھیں محیطِ فنا سے حیات کی موجیں　　　اجل کی گود میں انگڑائی ایسی لی میں نے
جنوں کے جوش میں پردے نظر کے چاک کئے　　　نقاب پھاڑ کے فطرت کی پھینک دی میں نے
قبائے لیلیٔ تہذیب چاک کر ڈالی　　　ردائے مریمِ عصمت اتار لی میں نے
نظامِ فطرتِ کبریٰ کا کر دیا برہم　　　کلائی فتنۂ دوراں کی موڑ دی میں نے
مزاجِ آتشِ سوزاں کو کر دیا ٹھنڈا　　　مچا دی بزمِ عناصر میں کھلبلی میں نے
لیا شہنشہِ خاور سے روشنی کا خراج　　　کیا اسیرِ طبیعت کو برق کی میں نے
نفس سے چھیڑ کے اپنے مزاجِ آہن کو　　　ہوا کی گرمیِ پرواز بخش دی میں نے
بلندیوں کا تہور بھی رہ گیا پیچھے　　　پہنچ کے اتنی بلندی پہ سانس لی میں نے
ٹھٹک گئیں جو نگاہیں قریبِ حجلۂ قدس　　　پسِ حجابِ ادب یہ ندا سنی میں نے
کہ اے حریفِ مشیت بہ وعدہ گاہِ ازل　　　ٹھہر ٹھہر تری پرواز دیکھ لی میں نے

ملی جو داد جھکا دی غرور کی گردن
کیا لحاظِ تقاضائے بندگی میں نے

جمیل مظہری کلکتہ

اقبال اور پیامِ اقبال

(کشاف)

علامہ اقبال بلاشبہ ہمارے ملک کی ایک ادبی عظمت ہیں لیکن ہم اس ادعا کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ تنقید وجائزہ سے بالاتر واقع ہوئے ہیں۔ ایسا دعویٰ قولاً تو کسی نے نہیں کیا ہے لیکن جو خیالات وعقائد فضائے ادب پر کندہ ہوگئے ہیں ان کی زبانِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔ میرا خیال ہے خود اقبال کی نظر میں اس قدر نقادگی وسرافگندگی کی کوئی حقیقت نہ ہوگی، خوشامد——— اور ادبیات کا دربار اس صنفِ سخن سے خالی نہیں، ———ممکن ہے اپنے ممدوح انسان کو متنفس نہ کرے لیکن وہ اُسے مسرور بھی نہیں کرتی، وہ ایک صیدِ زبوں ہوتی ہے، جو از خود دام میں آجاتا ہے، ورنہ بیباکانہ کد وکاوش اور دَوا دوِش، جو ساری شکار رنگینی کا طلسمِ لذت اپنے اندر مضمر رکھتی ہے، خارج البلد ہو جاتی ہے، آج ہم اقبال پر، مرعوبیت اور نیز تعصب سے خالی ہو کر، خالص تنقید کی غرض وغایت سے، ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ کام کی دشواری ہیں، اجتہاد رائے کی عام نزاکت کے علاوہ ایک اور خاص عنصر جس نے اضافہ کیا ہے اقبال کے متعلق معلومہ "حرفِ غلط" کی غیر معمولی "شہرت" جس نے لوگوں کی قوتِ نقد ونظر پر ایک حجابِ غلیظ پیدا کر دیا ہے، خواہ کتنی اس کی لپیٹ میں ہیں، لیکن ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں   جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے!

اقبال ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے ملک کی محفلِ ادبی میں داخل ہوئے، اور اس بلند آہنگی سے کہ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے   باقی ہے لیکن اب تک ہندوستاں ہمارا

لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اقبال کے سازکے اس پردے کا سازِ موت بج گیا، اور وہ ایک گوشۂ تخصیص میں آکر، بڑے واضح وقاطع اسلامی شاعر بن گئے اور ان کے بعض ہندو ہمصفیرانِ سخن اپنی زبانوں پر اس کلمے کی بیتاب تکرار لئے ہوئے تڑپتے ہی رہ گئے کہ ع

"اقبال پھر سنا دے ہندوستاں ہمارا"

اسلامیت کا اختصاص بجائے خود اصولاً اس کوئی "ہذا فراق بینی وبینک" کا ذمہ دار نہ ہو سکتا تھا، اسلام کی وابستگی کو ان کے مشرب میں مزید وسیع دامانی پیدا کرنی چاہیئے تھی، اور برادرانِ وطن کی طرف سے بجائے شکایتہائے رنگین کے پرجوش تر خراجِ تحسین وصول ہونے کے اسباب پیدا ہونے زیبا تھے، اسلامی مسلک ادبی کو اقبال کی وطنیت میں زائد پہنائی پیدا کرنی تھی۔ نہ کہ کچھ اور! ع

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس طرح بعض ادیان وشرائع ومکاتبِ فلسفہ سے بعض الہامات قبول کرتے ہیں، خود انھیں بھی اپنے بعض داعیات بخشا کرتے ہیں۔ ادارات وتحریکات کا قبول واختیار حقیقۃً ایک "دوطرفہ عمل" ہوا کرتا ہے۔ ذاتی عنصرِ انفعالیت کے بجائے کبھی اتنی دُور رس جاذبانہ فعالیت کا مظاہرہ کیا کرتا ہے کہ بقول اقبال ہی:

تراشیدم صنمے بر صورتِ خویش   بشکلِ خود خدا را نقش بستم!
مرا از خود بروں رفتن محال است   بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم!

بہرحال اقبال نے وطن کو خیرباد کہا اور اس نفرت کے ساتھ اس "مایۂ شر" کو خانہ بدر کیا کہ اب اس "رسوا سر بازار" کے ماتھے پہ یہ کلنگ کا ٹیکا ہے ؂

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے!

اگر اقبال نے یورپ کی "جارحانہ قوم پرستی" کی بنا پر ایسا کہا تب بھی ہمارے خیال میں ٹھیک نہیں کہا، یورپ کے اس مسلکِ سیاست کا صحیح نام "قیصریت" یا "جہانگیریت" ہے، نہ کہ قومیت یا وطنیت ---- قومیت یا وطنیت کا غلط استعمال یورپ نے کیا، اور "قیصریت و جہانگیریت" کا غلط تسمیہ ہم نے! کیا اگر کوئی سارق یا قزاق فرار ہوکر مسجد میں پناہ لینا چاہے گا تو خود مسجد کمینگاہ ہو جائے گی اور مستوجب آتش زنی و انہدام، دیکھنا یہ ہے کہ مسجد کے اندر یہ مجرم "دراندازانہ" کی حیثیت سے خود گھس آیا ہے، یا کہ خود مسجد نے اُسے یہ پیام الفت دیا ہے کہ ؂

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

قدم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

سچ یہ کہ حرمِ وطن یہاں ہمدردی کا مستحق تھا، نہ کہ دشمنی کا، صفائی کا حقدار تھا، نہ کہ اس بے محل بدگوئی کا کہ :-

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

ہماری توقع تھی کہ اک ایسے جلیل القدر حکیم مجتہد کو ایسے عامیانہ مغالطے سے بہت بالا و برتر ہونا چاہئے تھا!

پھر دیکھئے کہ "عملی سیاسیات" میں اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ یورپ کی جہاں سوز "سلطنت گردی" تو معصوم بن جائے گی اور غریب ایشیا کی مظلوم "وطن دوستی" بدنام! ع

ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی؟!

یہ غایت درجہ غیر طبعی موقف اس درجہ ناقابلِ برداشت تھا کہ خود اقبال نے اسے کم از کم ایک جگہ مسترد کر دیا ہے، اور وہ جاذبۂ حبِ وطن سے بیتاب ہوکر کہہ اٹھا ہے کہ :

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں!

ہم کہ اس نظریئے کے تسلیم کرنے میں بھی تامل ہے کہ اقبال کی مذمت قومیت کا راز قومیت کی بدعت و تحریف میں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ "جارحانہ وطنیت" کے "جارحانہ پن" کو اتنا ملعون نہیں سمجھتے، جتنا کہ اس کی "وطنیت" کو مبغوض رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان سے محض "ہندوستان و کفرستان" ہونے ہی کی وجہ سے بیزار ہیں۔ اقبال کے کلام کے بعض کنائے اس شبہ کو اک خوش بنیاد الزام قرار دیتے ہیں! سرورِ کائنات کے حضور میں، جہاں اقبال نے اپنا سینۂ بے کینہ بالکل آئینہ کر دیا ہے، یہ التجا کہتے ہوئے کہ ع "آرزو دارم کہ میرم در حجاز" جب اس کی وجہ سوجھ پر آتے ہیں تو بیان فرماتے ہیں کہ :

مسلمے، از ما سوا بیگانۂ تا کجا زنجیریٔ "بت خانۂ"؟

حیف چوں او را سر آید روزگار پیکرش را دیر گیرد در کنار!

اللہ اللہ! "خواجۂ خواجگان" حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ "طاب اللہ ثراہ" کا جسدِ اطہر تو تا قیامت غائب ہند ---- "اجمیر وار العلم" ---- میں آسودۂ خواب رہ سکتا ہے، لیکن جناب "ابو الجلال" اقبال کا "پیکرِ قدس" اس تمامی خطۂ وحریمِ "ارضِ مبارکہ" پر بھاری ہے کہ ع

"میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے"!

اسی خاکِ پاک میں اقبال ہی کے قلم الہام رقم کے کنائے ہوئے کتنے اکابرِ اسلام کتنے اولیائے کرام ---- اور از روئے مسلمہ عقیدۂ قرآنی کتنے کثیر التعداد انبیائے عظام محوِ خوابِ نوشیں ہیں لیکن حضرت اقبال کے لئے یہاں کی سرزمین کی تدفین کا تصور ہی کیسے کا بوسِ پُر ہول کا محرک ہے! ؂

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

آؤ ہم "زندِ زندیق" جوش کی زبان سے، بیک "لغزشِ بیباکانہ" ان ساری "توفیق یافتگیوں" اور "رشد فرمائیوں" کی تصحیح کرالیں! وہ کہتا ہے، اور کیسی سرمستی در روشن ضمیری کے ساتھ کہتا ہے :

اے وطن، پاک وطن، روحِ روانِ احرار! اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگِ بہار!

اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار اے کہ ہر ذرّہ ناچیز ترا رشکِ نگار!

ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں

ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں!

پس "ارشادِ نبوت" "حبِ وطن" اس سے کچھ اور نہ تھا، جو کہ صالح "گفتار سیاست" میں واقع ہوا ہے! اقبال کو اس عامیانہ منطق سے بہت اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیئے تھا

جس کا لب و لہجہ یہ ہوتا ہے کہ "نہیں بھائی، یہ اور بات ہے، وہ اور بات ہے!"
اقبال کے لئے یہ استدلال مشکل شایانِ شان ہے کہ ؎

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے!

انبیاء کی زبان، انسانیت کا فطری و طبعی تعلق ہُوا کرتی ہے، تا آنکہ کسی مختلف تعبیر کے لئے کوئی خاص وجہ نہ ہو، ہاں یہ وہی حبِ وطن تھا جو محمدؐ عربی کی زبان پر "من الایمان" تھا، اور جس نے شبِ ہجرت بین "حلقومِ عبد اللہ" سے یہ خراجِ محبت وصول کیا تھا کہ "مکہ! تو مجھے بڑا عزیز تھا، لیکن کیا کروں، تیرے فرزند مجھے تیرے دامن میں رہنے نہیں دیتے"! ـــــــ اور جس نے یوسفؑ مصری کے "سینۂ کنعان آئینہ" کو "وادی النیل" کے تختِ فراعنہ پر ایسا خون در جگر بنا رکھا تھا کہ:

حب الوطن از ملکِ سلیماں خوش تر   خارِ وطن از سنبل ریحاں خوش تر
یوسفؑ کہ بمصر پادشاہی میکرد   میگفت گدا بودنِ کنعاں خوش تر

پھر یہی نہیں کہ اقبال کی وطن بیزاری ان کا کوئی شخصی توہّم ہے جسے شاعرانہ تخیل کی وارستگی کہہ کر ہم اس سے عفب گزار ہو جائیں، حقیقت یہ ہے کہ ناآشنائی وطن کی یہ نفسیت خود فراموش مسلمانانِ ہند کی اک عام بیماری تھی۔ جب قوم کے رہنما دل و دماغ اسی عامیت کی تصدیق اپنی تعلیم و تلقین سے بھی کرنے لگیں تو حالت جیسی مایوسانہ ہو جا سکتی ہے ظاہر ہے، یہ کہہ دینا اطمینان بخش نہیں کہ "اقبال، بزمِ سیاستِ عملی میں کسی نشست کے مکین نہیں، اس لئے اُن کے اس قسم کے اقوال عملاً مضرت رساں نہیں"، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج تمامی اسلامی پنجاب کی سیاست ان کی ذات کے پرتو سے "ماؤف" ہے، اور جس کے خفیف تراشے کے سائے میں سارا شمالی ہند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس سمیّ عنصر کی فساد پروری کی پوری پیمائش سے عہدہ برآ ہی نہیں ہوتے ہیں، اقبال کو جو اقتدار بزمِ ادب میں حاصل ہے، وہ رزمِ سیاست میں ان کا اعتماد بن گیا ہے! وہ اس اعتماد سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اسلامی عوام و خواص کو نقصان پہنچا رہے ہیں! مولینا محمدؐ علی مرحوم کی آخر عمر کی سیاسی برہمی، اور مسٹر محمدؐ علی جناح کی اس شامِ زندگی میں بے راہ روی ان دونوں مظاہرِ سیاست کا سراغ، بلاواسطہ یا بالواسطہ ڈاکٹر اقبال ہی کے کلام و پیام و نظام و پروگرام تک لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا محمد علی رح کا ہندوستان کو اک "اچھتے کے ڈھیلے کے ہموزن" کہہ دینا اور علامہ اقبال کا اسے اک "ذرۂ بے بخش" فرمانا، ایک ہی شعر کے دو مصرعے ہیں، پھر مولانا شوکت علی کا کبھی کا یہ نعرہ کہ "سوتی لال کی آنکھ ٹیڑھی ہے، ہم اسے انگلی ڈال کر نکال ڈالیں گے"، اور حیر سے مسٹر محمدؐ علی جناح کا یہ واہمہ کہ "ہم آنند بھون کے سنگِ آستان پر سجدہ نہ کریں گے" یہ بھی اسلامی سیاسیات ہند کی حرکتِ مذبوحی کی دو ہم آہنگ ہی جنبشیں ہیں! اب سے آخر "پاکستان" کی پاکیزہ تحریک نوا اقبال کی شاعرانہ صلائے الفت و ائتلاف کی "اختراعِ فائقہ" ہی ہے! یہ جدید العہد ہندوؤں سے دامن کشی ہے، یا دقیانوسی ہندوؤں کی سنتِ دیرینہ کی اقتدا؟ اب ماشاء اللہ مسلمانانِ ہند گویا اپنا اک عظیم "پولیٹیکل چوکہ" تعمیر کریں گے، جو "ملکش" کانگرسیوں کے "ناپاکستان" کی چھوت سے بالکل مامون ہوگا! ع مبارک شاخِ گل کو شاخِ نخلِ طور ہو جانا

پس اقبال کو اک بے ضرر دماغ و قلم کہنا صحیح نہیں بلکہ اک خطرناک بیجزی ہے، اور یہ کیونکر ممکن ہے؟ اقبال اک "کلیمِ بے عصا" (INEFFECTUAL ANGEL) ہوتے اگر وہ اپنے سامعین کی عقل کی فضا میں اک جنبش بھی نہ پیدا کر سکتے! انہیں، خود بقول اقبال غلط گو شاعر کا نی غلط کاری کی پرورش کر سکتا ہے، آخر ان ابیات (اسرارِ خودی) کے کیا معنی ہیں:

وائے قومے کز اجل گیرد برات   شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش   در جگر صد نشتر از نوشینہ اش
ماہی و از سینہ تا سر آدم است   چوں بناتِ آشیاں اندیم است
از نوا بر ناخدا افسوں زند   کشتیش در قعرِ دریا افگند
درِ یم اندیشہ اندازد ترا   از عمل بیگانہ می سازد ترا
جوئے برقے نیست در نیسانِ او   یک سرابِ رنگ و بو بستانِ او
قلب مسموم از سرود بلبلش   خفتہ مارے زیرِ انبارِ گلش!

از خُمِ و مینا و جامش الحذر!
از مئے آئینہ فامش الحذر!

اے دلت از نغمہایش سر و جوش   زہرِ قاتل خوردہ از راہِ گوش!
لا جرکیں جوہرِ آئینہ اش   ناتوانی ہمدمِ دیرینہ اش!

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد!
در حرم زائید و در بتخانہ مُرد!

حقیقت یہ ہے کہ اقبال میں اک خالی قسم کا "ثقافتی تعصب" پایا جاتا ہے! ہم اپنی زشت اندیشیوں کو حسنِ کلام سے خوب عقائد کا غازہ نہیں دے سکتے!

عوام الناس کے اندر ـــــ اور ان عوام الناس میں غیر نا قدِ مزاج و مذاق کے خواص بھی عملاً شامل ہیں! ـــــ یہ کامیابی ممکن ہے لیکن مہذب دماغوں کے رو برو اس قبولِ عام کا سخت خمیازہ کھینچنا پڑتا ہے، ہماری شاطرانہ شعبدہ گری یہاں اک عریاں رسوائی منتج ہے پس شاعر کو نہ تو عوام پر اعتماد کرنا چاہیئے، نہ تیسرے درجے کی ہر دلعزیزی پر، نہ کسی آنی و فانی جذبہ پنچایتی پر، اُس کو اپنا سرمایہ مستقبل کے بینک میں جمع کرنا ہے، اور اُس کی ساری دارالضرب، بنیادی و اساسی حقائقِ حیات و کائنات، مجتہدانہ افکار و خیالات، دُور رس تصورات، وسعتِ نظر، بین الاقوامی مقاصد و مسائل، بین البشری محبت و اخوت کے ذکر و فکر پر تعمیر ہونی چاہیئے! بلا شبہ اگر وہ کوئی مذہبی آدمی ہے تو اُسے اپنا مذہب ترک کر کے کسی روحانی غداری کا ارتکاب نہ کرنا چاہیئے، لیکن اسی طرح اُسے کسی شاعرانہ نفاق کی اجازت بھی نہ دی جائے گی، اگر وہ شاعر ہے تو پہلے شاعر ہے، پیچھے کچھ اور! اُس کا اگر کوئی دین ہے، اس دین کو چاہیئے کہ اس کے مولود دختر کو مادرانہ اپنی گود میں لے کر اس کی شکم سیر شیر خورانی کرے، لیکن اگر اس کا روحانی مشرب اُس کی دخترِ شعر کو اک سوتیلی اولاد سمجھتا ہے، شاعر مکلف ہے کہ دو چیزوں میں سے ایک چیز کو ضرور خیر باد کہہ دے۔ یا اپنے مذہب کو، اور یا اپنے مسلکِ شعری کو! دونوں سے وابستہ رہنا، خلوص و منافقت کا اک نہایت غیر شاعرانہ، نیز اک نہایت غیر دیندارانہ معجونِ مرکب ہوگا ـــــ نہ دماغ شعر چکھے گا، نہ دلِ ایمان فروغ پائے گا: ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالک را

خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم!

شاعری کو کسی مسلکِ حیات یا تفسیرِ کائنات کا ترجمان بنانا "پیمبرِ شعر" کو مرید بنانا ہے، اور مرید کو پیر دکیل، اور دکیل کو پھر ایجنٹ! شاعری کے پاس خود اپنا اک مشرب اور منصب مستقل طور پر، واضح و قاطع صورت میں، موجود ہے اس سے شاعری کی "دوسری وفاداریاں" ہمنوائی تو کر سکتی ہیں، لیکن خود شاعری کو بجز اپنے کسی اور ذہنی فلسفے یا جماعتی ادارے کے ساتھ "یا بدست دگرے دست بدست دگرے" نہیں کیا جا سکتا!

اقبال کی اساسی و اصولی شاعرانہ غلطی ـــــ گو اجتہادی سہی ـــــ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے ملائے اسلام یا اسلامِ ملا کا پانی بھرتی ہے! انھوں نے عروسِ شعر کو "پابزنجیر" کر لیا ہو تو کر لیا ہو، اُسے کوئی "پازیب" تو نہیں پہنائی "خدا کے فضل سے حوروں کا شوہر" ہونا بہت بڑا شرعی فتح باب ہوگا، لیکن شاعری کا حجلہ ناز تو دریں مقفل ہو جائے گا جس کے اندر دوشیزۂ شعر اپنی پنکھڑی ایسی آنکھوں کو بھینچ کر بیٹھ جائے گی، ـــــ یہ "گربہ کشتن روزِ اول" تو ہوگا، لیکن حسن و شعر کی "خانہ نا دبیٔ زلف" نہ ہوگی! ؎

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن!

اقبال کو جو نفرت اغیار سے ہے اس کا اک اندوہناک عنصر خوف ہے! مغربی تہذیب، ہندو تمدن، عجمی اثر پرستی، یونانی تفلسف کے الارم کیا ہیں؟ اپنی ہی کمزوری کے احساس کے غمازیں! تعجب ہے، اسلام ان سب سے ڈرتے، ان میں سے کوئی اسلام سے نہ ڈرے، حالانکہ مختلف عناصر ثقافت کا اختلاط فوری ترشیک کو غلبہ دیا کرتا ہے، یہاں اک "تنازع للبقا اور بقائے اصلح" کے ماجرے کی سی نظیر ہوا کرتی ہے، پھر اس کشمکش کو بھی عالمِ فطرت کے اکھاڑے میں "اندھی نیچر" کا کوئی بے دردانہ انسان کش لعب نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ مادرِ فطرت کا اسے اک "دوستانہ پیچ" سمجھنا چاہیئے! نامور مغربی شاعرِ فطرت ورڈز ورتھ کے جوامع الکلم کا یہ فقرہ اک پورے صحیفۂ فطرت کا عنوانِ جلی بن سکتا ہے کہ "آسمان ہماری والدہ ہے اور زمین ہماری دایہ"، مسلمانوں کو اس کار و بارِ الٰہی کی حقیقت انقلابِ اسلام کے افتتاح کے روزِ اول ہی بتا دی گئی تھی، قرآنِ حکیم میں اس کشاکشِ مشکلاتِ باہمی کی تشخیص "بلاءً حسنا" کے طغرائے حکمت سے کی گئی ہے، عہدِ حاضر میں گوناگوں تمدنوں کے اس بوقلموں اجتماع کو ثقافتوں کی گویا "آزاد تجارت" کا بین الاقوامی بازار سمجھنا چاہیئے، اس دلچسپ آمیزش و آویزش میں کمزور کے لئے بلا شبہ خطرہ ہے، لیکن طاقتور کے لئے مزید فتوحات کے بھی موقعے ہیں۔ اسلامی دین و تمدن اپنے کو کس زمرے میں شمار کرتا ہے؟ ع

از تو پرسم قطرۂ یا گوہری؟!

ندی میں بہتا ہوا کچی مٹی کا ہی برتن اپنے ہمسفر فلزاتی ظروف سے دامن کشاں ہوا کرتا ہے، کاش وہ اپنی خام گِلی سے کنارہ کش ہوتا! نہ صرف یہ کہ یہی روش انسب ہے، بلکہ اگر کوئی اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو یہ کم و بیش خطرناک فضا اس کے لئے بہترین، عین مطلوبہ، سامانِ پرورش بہم پہنچائے گی ع

زیستن اندر خطرہا زندگی ست!

اقبال اپنی عملی سربراہی میں اپنی ذہنی رہنمائی کے کیوں نقیض واقع ہوا ہے؟

اک فلسفی کے لئے یہ بے ربطیٔ خیال بڑا منطق ہے، اور اک مرشد طریقت کے لئے قال وحال کی یہ دو رنگی اک سوئے سلوک!

پھر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ اپنے ضعف کی واقفیت کی صورت میں بھی اپنے تحفظ کا یہ کتنا دور از کار طریقہ ہے کہ سب سے الگ تھلگ رہنے کے لئے کاوش کی جائے، اپنی کمزوریوں اور ناقابل مدافعت ہونے کی حالتوں کی یہ تشہیر تو خطرات کو اپنی آخری سنگینی تک پہنچا دینے والی ہے، یہ گویا اپنی نحیف بولی بول کر شکاریوں کو خود دعوت دستبرد دینا ہے، فلسفۂ زور آزمائی کے علمبردار اقبال سے تو ہمارا اک قدیم عہد زبوں غزل گوئی کا استاد زیادہ "رمز حیات" کی آشنائی کا ثبوت دیتا ہے جبکہ وہ کہتا ہے کہ ؎

تو رہے یہ خبر اڑ کے نہ صیاد کو پہنچے
اچھا نہیں چرچا مری بال و پری کا

لیکن اقبال کی وحشت زدہ واویلا کو سنیئے:

عہد نو برق ہے آتش زن ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا، نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا، اقوام کہن ایندھن ہے
ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن ہے!

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے ٹیپ میں یہ کہہ کر کہ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اپنے ہول دل کی کچھ تسکین کرنی چاہی ہے۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ مطلوبہ شرط کی بہم رسیدگی سے مایوس ہے، بلکہ اس کا مزعومہ خطرہ بھی ملت اسلامی کی "اسلامیت" سے اس قدر متعلق نہیں جس قدر کہ اس کی "نامسلمانیت" سے ہے! "ملت ختم رسل" "اقوام کہن" کی "ہیٹش لسٹ" میں کیسے آسکتی ہے؟! اور اگر آسکتی ہے تو "ملت ختم رسل" کیونکر ہو سکتی ہے؟! "کہنگی" تو اک معمولی زندہ قوم کے لئے بھی ننگ ہے، مسلمان کیا اک "قوم کہن" کی طرح اپنی "ترکی تمام" کر دینے کے بعد بھی یہ نعرہ مستانہ لگا سکتے ہیں کہ ؎

رونق از ما گردش ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را!

پھر دیکھیے کہ یہاں بھی "عہد نو" کی "برق" کی خاطفیت اور اس کی "آتش" کی "خرمن سوزی" اصل مصیبت نہیں ہے، بلکہ سوختنہ اقوام کے اجسام نامی ولحمی واستخوانی کا کہنہ "ہیزم" "ایندھن" میں تبدیل ہو جاتا ہے، خس وخاشاک، برق و آتش کی کیا شکایت کرتے ہیں، ہمارے خیال میں آتش و برق احسان کرتے ہیں خس وخاشاک پر کہ ان کو "خس کم جہاں پاک" کی با احترام تجہیز وتدفین بخشتے ہیں، پس اصل ماتم کی چیز ہمارے "اسلامی دل زندہ" کی ربودگی ہی ہے نہ کہ کچھ اور!

رونا نہیں اس کا کہ وہ ساماں نہ رہا
ترکی ہوا تاراج کہ ایران نہ رہا
ہے اصل میں اس بات کا رونائے تجوش
میں ہیبت کفر سے مسلماں نہ رہا!

پھر یہی نہیں کہ "عہد نو" ہم کو کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچاتا جس سے بدتر زبونی میں ہم اپنے تئیں خود نہیں ڈال چکے ہیں، بلکہ وہ ہم کو ایسا فائدہ پہنچاتا ہے جس سے گراں قدر تر فیض عظیم ہمیں کسی دوسری شے سے حاصل نہیں ہو سکتا، یہ آگ یہی نہیں کہ زندگی و استقامت کی موجودگی میں "آتش زن" نہ بنے گی بلکہ "انداز گلستاں" پیدا کرے گی!

ہم کو کس چیز کو خوفناک اور قابل نفرت سمجھنا چاہیئے، "عہد نو" کو یا اقوام کی "کہنگی" کو، نیز ہم کو کون سا کام کرنا چاہیئے: "عہد نو" کے خلاف جہاد کرنا یا اس سے اپنے قومی جسم پیری میں اعادہ شباب کی تقلیم کرانا، ہم کو "نار نمرود" کو بجھانے کی جتنی کد ہے ـــــ اور وہ بھی پھونکوں سے! ـــــ ان "براہیم کا ایمان" پیدا کرنے کا عزم نصیب نہیں! "دور حاضر" کے خلاف تبرّی بازی کر کرکے، اور اس کے سامان سے مقدس صحائف ـــــ بال جبرئیل و ضرب کلیم ـــــ کے انبار تعمیر کرنے سے کہیں بہتر تھا کہ ہم اس کی "کیمیا ساز آگ" میں خوب تپتے، اور "قائم النار" ہو جاتے! ؎

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زانکہ در آتش نکو نشست!

بلاشبہ مسلمان کمزور ہیں، اور ان کی کمزوری کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے، لیکن یہاں ہم علاج کو مرض سے بھی مہلک تر پاتے ہیں۔ کمزوری کے گرداگرد اک حصار حفاظت کھینچ دینا چاہیئے، یا اسے کھلے اکھاڑے کے بیچ کھیت کھڑا کر دینا چاہیئے؟ کمزوری کا کوئی تحفظ اس سے محفوظ تر نہیں کہ اسے ہلاک کر دیا جائے، ظالم بیشک ظالم ہوگا، لیکن اس مظلوم سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو کمزور بن کر قوی کو ظلم رانی کی اک عملاً ناقابل رد دعوت دیتا ہے۔ لاریب کہ کمزوری ہی "البادی اظلم" ہے!

بخلاف اس کے ظالم اک بے بدل خادم ہو سکتا ہے ـــــ وہ تھوڑی سی "متاع کارواں" چھین کر کارواں کے دل میں "احساس زیاں" کی دولت بیدار

پیدا کر جاتا ہے۔ اگر ہم تھوڑے نکتہ رس ہوتے تو دشمنوں کے لئے دعائیں کرتے: ؎

نکال لیتے ہیں ظالم دلوں کو سینوں سے
خدا بچائے نہ پھر کبھی مجھے حبیبوں سے!

نوعِ بشری کا ازلی و ابدی "عدوٌ مبین" ——— شیطان لعین ——
بھی ہمارے نظامِ ارتقائے انسانی کا ایک ناگزیر عنصر ہے جسے اہتمام والتزام سے اُسے پیدا کیا گیا ہے، بغیر اجتناب سے یہ شغل اپنے اندر ایک نگین خلا پاتی ہے ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں "دارد" و "شیطاں" ندارد

افسوس ہے ہمیں اقبال کو اُنھی کے اقوال یاد دلانے پڑتے ہیں! کیا ہم کم و بیش اُن ہی کی زبان میں ان سے التجا کریں کہ ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خودی کا ترجماں ہو جا

مستعار "تحفظاتِ سیاسی" سے بڑھ کر کوئی "تارِ عنکبوت" نہیں! حضرت عمرؓ نے تو فاتحِ ملکِ مصر کے ایک سرحدی موقعے پر اسلامی فاتح و گورنر کے مجوزہ قلعے کی تعمیر کو یہ کہہ کر ترک کرا دیا تھا کہ اپنی بہادری اور بیداری کو شامل کر اپنی حفاظت و حراست کا کام فصیلِ شہر یا حصارِ لشکر کے سپرد کرنا تحفظ کا بڑا طریقہ ہے!
پھر اگر ہم میں کچھ جان ہے تو دوسروں کے ساتھ مل جانا کوئی نقصان دہ نہیں ہو سکتا، علیحدگی و کنارہ کشی کی دعوت ایک شاعرِ انسانیت کے لئے بڑا ہی ناپسندیدہ پیام ہے! ؎

تو برائے "وصل" کردن آمدی؟
یا برائے "فصل" کردن آمدی؟

اقبال کا عذر یہ ہے کہ: ؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچہ کو صحبتِ زاغ!

ہم پوچھتے ہیں، یہ کیسا "شاہین" تھا، جو ایک تیرہ بال و پر زاغ کا "صید زبوں" بن گیا؟!
پھر اگر اسلام ایسی ہی جمیل و جلیل تحریکِ بشریت ہے جیسا کہ ہمارا دعویٰ ہے تو اُسے ہجومِ مخالفین سے ڈرنے کی کیا ضرورت ——— ہے؟

بھیڑوں کے ریوڑ کو اکیلا شیر "خوفناک اکثریت" نہیں کہا کرتا! اس کے لئے یہ منظر ایک "عید نظارہ" ہوا کرتا ہے! ہم اپنے کو حضرت خالدؓ بن الولید کے روحانی سلسلۂ نسب سے ہم رشتہ سمجھتے ہیں، جن کا یہ کلمہ رجز تاریخ کے صفحات سے گونجتا ہے کہ "قسم خدا کی اگر میرے گھوڑے کے سُم ذرا درست ہوتے تو میں رومیوں کے ٹڈی دل لشکر کو اجازت دے دیتا کہ وہ خوشی سے اپنی تعداد دوچند کر لیں!" (بموقع جنگِ یرموک)۔

اس گئے گزرے چودھویں صدی کے زمانے کے ہندوستان کی ماضی قریب ہی کی تاریخ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک مردِ حق ——— مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ ——— نے کھڑے ہو کر سارے دیو بند کی "نحیف" بیداریاں کر دی! پھر ان کے خلیفۂ رشید، مولانا حسین احمد مدنی متعنا اللہ بطولِ حیاتہ، نے تنِ تنہا "دار العلوم قاسمیہ" کے حصارِ استبداد میں اُس وقت کود کر کہ وہ "بازایں بیت الحرم بتخانہ شد" کا مصداق ہو رہا تھا، چند ہی گردشِ سال و سنین کے اندر، اپنے وجودِ قدسی سے، اُس کی تطہیر کر ڈالی، اور جن بزرگوں نے بزعمِ خویش خود انھیں اپنے اندر جذب کیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ اُن کی ساری "ساحرانہ لکڑیوں" کو ایک "واحد عصائے موسوی" کا اژدہا نگل گیا! ؎

ذرۂ عشقے جہانِ عقل را غارتگر است!
پنبہ گر صد تودہ باشد آتشِ یک اخگر است!

پس اگر اس ہندوستان میں کچھ "باطل" بھی موجود ہے ———
بشرطیکہ "حق و باطل" کی تقسیم ہم سرکاری مردم شماری کے "اسلام و غیر اسلام" سے نہ کریں! ——— تب بھی کیا ۲۲ - ۲۴ کروڑ ہندوؤں کے مقابلے میں ۷ - ۸ کروڑ مسلمانوں کا تختۂ زمین پر سب سے بڑا "دار السلام" اپنی انفرادی ثقافتی ہستی بھی قائم رکھنے کے قابل نہیں؟ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے کانگریس میں شریک ہو کر کانگریسی حلقے اور خود ہندو سوسائٹی کے اندر ایک قابلِ رشک اسلامی نیک نامی کے آثار چھوڑے ہیں۔ مولینا ابو الکلام آزاد مدظلہ العالی کے خالص اسلامی منصب کا اتنا اقتدار ہند و بنگال پر خصوصاً، اور ہندو ہندوستان پر عموماً ہے کہ کثیر التعداد ہندو اکابر آج ان کے "ترجمان القرآن" کو اپنے محبوب و محترم مطالعے کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔ خان عبد الغفار خاں ——— سرحد کا وہ مردِ مجاہد مسلمان ———

—— کانگریس سے سرشتہ ہوکر پہلی دفعہ اپنے مظلوم وطن کی سرزمین بے آئین کو کم وبیش آزادی کا اک تحفہ دلوا چکا ہے! ؎

ز اتفاق مگس شہد می شود پیدا
خدا چہ لذت شیریں در اتفاق نہاد!

حافظ شیرازؒ —— جن کی روح شعری پر اقبال نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" کے اولین ایڈیشن میں اس قدر لے دے کی تھی! —— کم از کم اپنی روح انسانیت میں اقبال سے کسی طرح کم نہیں! اک ایرانی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے اک "ترک شیرازی" ہی کا دلدادہ ہے لیکن اس کی جو اوالعزمی سمرقند و بخارا کا خراج جمال وصول کرتی ہے وہ اس کا خال ہندو ہی ہے! اس نے اپنا دل "ترکان سمرقندی و سیہ چشمان کشمیری" کو نصف نصف نذر کیا ہے! وہ "کنارِ آب رکنا باد" کو گنگا کے گھاٹوں سے ہم ساحل کرکے وہاں سے ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کی گلبانگ محبت بلند کرتا ہے! اور پھر اپنی پوری وسیع المشربی کا یہ دل رُبا جلوہ دکھاتا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا!

ہندوستان جنت نشان کی گذشتہ اسلامی تاریخ میں مسلمان شعرائے ہند کی جو اولین روش نظر آتی ہے وہ بھی "اسلام و شعر" دونوں کے شایانِ شان ہے، حضرت امیر خسروؒ تو ہندوستان کی نہ معلوم کتنی "ہزار اداہائے دلبری" کے شیدائی ہیں، پنجاب ہی میں جہاں اقبال کی خوش نظری کو سوائے "صحبت زاغ" کی "تخریبوں" کے کچھ نظر نہ آیا! امیر خسروؒ —— وہ فقیر کوچہ حسن! —— محض اک دہقان زادی "گجری" کی سُندرتا کے سنگھاسن کے سامنے یہ "بھینٹ" پیش کرتا ہے:

گجری! کہ تو در حسن و لطافت چو مہی
واں دیگِ دہی بر سرِ تو چترِ شہی!
از ہر دو لبت شیر و شکر می ریزد
ہر گاہ کہ گوئی "دہی لیو دہی"!

یوروپین تہذیب پر بھی اقبال نے جا بجا جو ایرادات کئے ہیں وہ بھی کج نظری، غلط تعبیری، بالقصد داغ زنی سے خود مجروح ہیں! ہم اس ذیل میں سیر حاصل بحث کو تو اس مضمون کی آیندہ قسط پر ملتوی کرتے ہیں لیکن بطور مشتے نمونہ از خروارے، مغربی تمدن کی اک جدید پیداوار کی جو تصویر انھوں نے کھینچی ہے اس سے تعرض کرتے ہیں، عام طور پر تہذیب یورپ کا جو مرقع انھوں نے کھینچا ہے یہ ہے:-

عشق گردید ہوس پیشہ و ہر بند گسست
آدم از فتنۂ او صورت ماہی در شست
رزم بر بزم پسندید و سپاہی آراست
تیغ او جز بہ سر و سینۂ یاراں ننشست
رہزنی راکہ بنا کرد جہانبانی گفت!
ستم خواجگی او کمر بندہ شکست!
بے حجابانہ ببانگ دف و نے می رقصد
جامے از خون عزیزان تنک مایہ بدست!

کیا سچ مچ یہ یوروپی تہذیب کا منظر ہے؟ اقبال نے یوروپی ثقافت اور یوروپی سیاست و حربیت کو باہم مخلوط کر دیا ہے! کسی تمدن کے ترجمان اُس کے علماء، مفکرین، مجتہدین، مصلحین، اساتذہ و مصنفین ہوا کرتے ہیں نہ کہ سیاسیین، فاتحین، امرائے لشکر، تاجر وغیرہ! آپ اگر یہ سوال کریں کہ اس آخر الذکر زمرے کو کس سرچشمے سے منسوب کیا جائے گا؟ تو جواب یہ ہے کہ کسی سے بھی نہیں! یہ لوگ جسم تہذیب کے اعضاء و جوارح کے بجائے اُس کے امراض و عوارض ہیں، بلکہ اس کے دُنبل اور سرطان! اقبال اپنے سامنے فلسفے اور فضیلت تاریخی پر ظلم کرے گا اگر اپنی اس تمدنی "تشریح البدن" پر اصرار کرے گا۔ یہ مریضانہ علامات و مظاہر کم و بیش ہر تمدن کی زندگی میں رُونما ہوا کرتے ہیں، لیکن بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ مفرط لحم و شحم، پرخوری و شکم براری، سینے کی کلانی اور ٹانگوں کا ہزال، فشار خون و صلابت عروق، اجتماع مادہ فاسد و ظہور درد و سوزش وغیرہ وغیرہ! جسم میں یہ غیر صالح نشو و نما دماغ کی اعصابی حکومت سے حواس و اعیات بدن کے آزاد ہو جانے کی وجہ سے رونما ہوا کرتی ہے، جسم تہذیب میں غلط کار مدبرین، شتر بے مہار فاتحین، دلدادہ عسکریت فوجی قائدین، گرد طلب منفعت تاجرین، رشوت خوار سرکاری ملازمین، کارخانہائے حرفت کے خون آشام بانیین وغیرہم اسی قسم کے مریضانہ مظاہر کے بالمقابل واقع ہوئے ہیں! کوئی تمدن ان مجہول النسب ذریات کو ایجاباً پیدا نہیں کیا کرتا، البتہ سلبی طور پر اگر وہ ان عوارض کے تدارک و تداویہ سے غفلت برتے تو اُس وقت اُس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے، ہم اس گوشۂ عمل میں بھی یورپ کا جائزہ لیں گے، لیکن بحث کی اس منزل پر ہمارے مخاطبین کو لامحالہ یہ حقیقت تسلیم ہی کرنی پڑے گی کہ کسی تمدن کی صدارت انجمنی علماء کو دی جائے گی، ارباب سیاست و حربیت و تجارت وغیرہم کو نہیں! اگر یوروپین تہذیب کے نمایندے حقیقۃً مسٹر لائڈ جارج، موسیو کلیمنشو، فان کہلمان، ایم سازونات

اور سو آمیزی ہیں، نہ کہ علی الترتیب) برٹرنیڈ رسیل، رومان رولان، آئنشٹائن، ٹالسٹائی، اور مارکونی، تو اسی کے ناگزیر منطقی نتیجے کے طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شرقی شائستگی کے حامل محمود غزنوی، سلطان عبدالحمید، شاہ ناصرالدین قاچار اور محمد شاہ رنگیلے تھے، نہ کہ البیرونی، مدحت پاشا، جمال الدین افغانی اور نظام الملک آصف جاہ اول! ـــــ گویا یورپ میں لوئی شانزدہم، نہ کہ والٹیئر، اور مشرق میں یزید، نہ کہ امام حسینؓ!!

بلاشبہ ایک چیز یورپ کی جدید تمدنی میں طبعی طور پر پیدا ہوئی ہے جس سے اس نظامِ تہذیب کو بری الذمہ نہیں رکھا جا سکتا، ہمارا روئے سخن سرمایہ داری کی طرف ہے ـــــ مع اُس کے سارے مفاسد و شدائد مابعد کے، لیکن ایک لمحہ تامل یہاں بھی دیجئے! مغربی نظام میں سرمایہ داری اُس کا کوئی مخصوص ایجاد کردہ عنصر نہیں ہے۔ عہدِ سابق کی تقریباً ساری تہذیبوں کا سنگِ بنیاد سرمایہ داری ہی رہا ہے، جس کی خشتِ اول شخصی ملکیت کا اصول ہے۔ یورپ کی جدید تہذیب نے ازمنۂ عتیق کے اس معاشی مسلک کو انقلاب فرانس کے بعد صرف باقی رکھا! ـــــ اُس کو "پیدا" نہیں کیا! یہاں بھی اُس کی ایک اہم، کم از کم نیم انقلابی، اصلاح سے انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ یعنی اُس نے اتنا تو کیا کہ نظام جاگیرداری کا سازِ موت بجا دیا، جو سرمایہ داری سے براصل بدتر لعنت تھی۔ لیکن یقیناً اس کو تسلیم کیا جائے گا کہ سرمایہ داری بھی کچھ چھوٹا سرطانِ تمدن نہیں ہے۔ اور جو تہذیب اسے مجہولاً برداشت بھی کرتی ہے، بشریت کی کچھ کم مجرم نہیں ہے!

تاہم حق یہ ہے کہ پوری حقیقت یہ بھی نہیں! جدید العہد تاریخی دورِ یورپ کے مجلسی نظام کا اصل الاصول ـــــ جمہوریت یا صحیح تر عمومیت ـــــ نے جب سرمایہ داری اور اس کے مایۂ اصلی، ملکیت شخصی، کو ایک غیر مضر دستورِ قدیم کی حیثیت سے چلنے دیا، تو دراصل اُس نے خود فراموشی کی ایک دلچسپ حرکت کی! شاید یوں کہنا چاہیے کہ اُس سے ایک "اتفاقی غلطی" سرزد ہوئی، نہ کہ کوئی اصولی بے راہ روی! عمومیت و مساواتِ "سیاسی" کے لئے مساواتِ "معاشی" ایک شرطِ ناگزیر تھی، "زور" اور "زر" استبداد کے دو نمایاں تاریخی آلے رہے ہیں۔ جب بادشاہ و امراء کو زور سے زور چھین لیا گیا تو ملوک التجار اور رؤسائے زر سے زر بھی کیوں نہیں چھینا جانا چاہیے تھا، یہ "افعی را کشتن و بچہ اش نگاہ داشتن" کی مضحکہ خیزی تھی، تاہم ہم

بار دگر کہتے ہیں کہ، یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہ ایک محض اتفاقی، تفصیل کی غلطی تھی۔ عمومیت کا اساسی تصور ملکیتِ شخصی کے تخمِ خبیث کا بصحت نفس و ثباتِ ہوش ایک لمحے کے لئے روادار نہ ہو سکتا تھا، الغرض متداول عمومیت کے نو آغاز دور میں جب مشین کی ایجاد کے مزید تازیانے نے اِس سقم کے نتائج کو بہ پیمانۂ کبیر نمایاں کرنا شروع کیا تو عمومیت کو ہوش آ گیا! اصولاً انکار کی تو کوئی گنجائش تھی ہی نہیں، لیکن شخصی ملکیت کی ازلی قدامت اور عمومیت کی ابتدائی لغزش کے نتیجے میں اِس "مارِ آستین" کے بچ جانے کی سنت ـــــ ان دو چیزوں نے عمومیت ہی کے حلقے کے اندر ایک صفِ مخالفین کھڑی کرا دی، مجبوراً جدید الانکشاف تکمیل ـــــ سیاسی نیز معاشی ـــــ عمومیت کو خواہ مخواہ اپنا ایک الگ نام ـــــ "اجتماعیت" یا "اشتراکیت" ـــــ رکھنا پڑا!

مختصر یہ: مغربی تمدن کے نظام نے اپنے جسم سے اس "جسمِ خارجی" کو نکال ڈالا اور تسلیم کرنا چاہیے کہ سرمایہ داریت و جہانگیریت و استعماریت مع اپنی آفاق گیر عالم آشوبی کی کم از کم دو صد سالہ تاریخ زشت و زبوں کے تھی صرف "انقلاب فرانس" کی ایک چھوٹی سی "انقلابی نظر اندازی" کا سارا کرشمہ! تاہم بہرحال عمومیت کا ضمیر اس میں مجرم نہ تھا، اب سوشیلزم یا کمیونزم کا پرچم بلند ہو گیا، اور اس کے زیر سایۂ عاطفت فرش زمین پر پہلی "جنت ارضی" ـــــ آدم کی "فردوسِ گم گشتہ" کے بعد کی "فردوس باز یافتہ" ـــــ قائم ہو گئی! بشریت کے لئے یہ کتنے مہتم بالشان یادگار جشن کا یوم سعید تھا، لیکن اقبال کو دیکھیے (جس کی یہ کراہ ہم نے سنی ہے کہ ع معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا!) کہ وہ آفتاب سمائے دنیا کے اِس زریں ترین طلوع کی صبح سعادت میں کارل مارکس کے اس کارنامے پر یہ سرد مہرانہ داد دیتا ہے کہ ؎

"بر مساواتِ شکم دارد اساس!"

ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہی طعن، بمراحل سنگین تر صورت میں حضرت صدیق اکبرؓ کے مسلک پر پڑتا ہے جن کا فرمودہ "فتنۂ ارتداد" کے وقت یہ تھا کہ "قسم خدا کی! اگر یہ لوگ ـــــ نماز گزار و روزہ باز و حج کناں و کلمہ گویاں لوگ! ـــــ زکوٰۃ میں گائے دیں گے لیکن، بخلافِ معمولِ سابق "گائے کی رسی" نہ دیں گے تب بھی میں ان پر جہاد کروں گا۔ انہوں نے سمجھا کیا ہے! یہ بدبخت "صلوٰۃ و زکوٰۃ" کے درمیان فرق کرتے ہیں؟!"

بقیہ صفحہ ۵۵۶ پر

ہمارے "سند یافتہ جہلاء"

مدیر

جب علامہ طباطبائی مرحوم کے پنشن پا جانے کے بعد جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ ترجمہ و تالیف میں میرا تقرر "ناظر ادبیات" (   ) کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا، اُس وقت میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ حکومتِ آصفیہ نے اس جگہ کو قائم کرکے محض اپنے اسراف کا ثبوت دیا ہے، کیونکہ جس شعبے میں ہندوستان اور انگلستان کے منشی فاضل، منشی کامل، بی اے۔ بی اے آنرز، ایم اے، ڈبل ایم اے، اور پی۔ ایچ۔ ڈی، کام کرتے ہوں، وہاں کسی کا اس غرض سے مقرر کیا جانا کہ وہ ان فضلاء کے ترجموں کو ادبی نقطۂ نظر سے حیثیت، اور لسانی زاویۂ نگاہ سے درست کرے، اپنے اندر کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

لیکن جب مسودے میرے سامنے آنے لگے، اور میں اُنھیں غور سے پڑھنے لگا تو یہ دیکھکر مجھے انتہائی قلق اور اُسی کے ساتھ ساتھ بے پایاں استعجاب بھی ہوا کہ کسی مسودے کا ایک ورق بھی اغلاط سے پاک نہ تھا۔

میں نے ان مسودوں میں اغلاط کی وہ تمام قسمیں پائیں جو اربابِ علم کے حلقے میں معروف ہیں، اور مجھے یہ ظاہر کرتے ہوئے صدمہ محسوس ہو رہا ہے کہ اغلاط کے تمام اقسام کی خانہ پُری کرنے کی خاطر فاضل مترجمیں نے اغلاطِ املا کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔

ان اغلاط کے وزن، اور اُن کی تلخی میں اس حقیقت کے نمایاں ہو جانے کے بعد ناقابلِ برداشت شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ تمام مسودات عربی، فارسی، ترکی، انگریزی یا سنسکرت کے نہیں، بلکہ اُردو اور صرف اُردو کے تھے۔ اور اس ناقابلِ برداشت شدت کو اس واقعے کا علم اور بھی شدید بنا دیتا ہے کہ اِن مسودوں کے لکھنے والے تمام حضرات کی مادری زبان اردو اور صرف اردو ہے۔

جس قوم کے ایم اے اور پی، ایچ، ڈی، دوسری دوسری زبانوں کو تو چھوڑیے، خود اپنی زبان میں دو حرف صحیح نہ لکھ سکتے ہوں، اُس کے غیر تعلیم یافتہ گروہ کی جہالت کس درجہ مہیب و عظیم ہوگی۔

سُنتا ہوں کہ میرے بعد اِس عہدے کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ کتنا ہولناک اقدام ہے، اور اس کی ہولناکی اُس وقت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ ظاہر ہوگی، جب شعبۂ ترجمہ و تالیف کے ترجمے "زیورِ طبع سے مزین" ہو کر اپنے کثیر اغلاط کے باعث "رسوا سربازارے" کی صورت سے ہر علمی و ادبی حلقے میں وزنی اعتراضوں، اور طویل قہقہوں کا موضوع بن کر رہ جائیں گے۔

اب اُن چند مسودوں وغیرہ میں سے چند اغلاط ملاحظہ فرمائیے جن کے نوٹ اتفاق سے میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں۔

اصل عبارت	اصلاح
(۱) اگر ایران کی حالت اِس قدر تباہ حال نہ ہوتی۔	اگر ایران کی حالت اِس قدر تباہ نہ ہوتی۔

اصل	تصحیح
	("حالت" کا "تباہ حال" ہونا قابلِ داد ہے۔)
(۲) براہِ سمندر	بحری راستے سے
(۳) جبراً اپنی پالیسی پر چلنے پر مجبور کرے۔	جبراً اپنی پالیسی پر چلائے۔ ("جبراً" مجبور کردینا کیسی نادر اختراع ہے۔)
(۴) تاکہ لوگوں کو اس بات میں یقین آجائے۔	تاکہ لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے۔
(۵) اب تک تو ایران کی اذکار رفتہ افواج سے مقابلہ ہونے سے فتح آسانی سے حاصل ہوجاتی تھی۔	اب تک تو ایرانی افواج کے اذکار رفتہ ہونے کے باعث بہ آسانی فتح حاصل ہوجاتی تھی۔ ("اذکار" کو "ذکر" کی جمع کی صورت میں "اذکار" لکھنا کتنا بڑا املائی کارنامہ ہے۔)
(۶) ساحل کے قریب قریب ہوتا ہوا واپس ہوا۔	سمندر کے کنارے کنارے واپس ہوا۔ ("ساحل کے قریب قریب ہوتا ہوا" کی داد نہیں دی جاسکتی۔)
(۷) سوسا کو سکندر نے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔	سوسا کو سکندر نے اُسی کے حال پر چھوڑ دیا۔
(۸) یونانیوں کے مُنھ میں پانی آتا تھا۔	یونانیوں کے مُنھ میں پانی بھر آتا تھا۔
(۹) اور صفوں کے سامنے بھالوں کے نوک اس قدر ملے ہوتے تھے۔	اور صفیں بھالوں کی نوکوں کو اس قدر ملا لیتی تھیں۔
(۱۰) وسیع تر مجموعے کا ارتباط	وسیع تر مجموعے کی ترتیب
(۱۱) اگر ہم مجموعے کے طور پر اُن کا تصور کریں۔	اگر ہم مجموعی طور پر اُن کا تصوّر کریں۔
(۱۲) وہ بادل، رفتہ رفتہ اُٹھتے جاتے ہیں۔	وہ بادل رفتہ رفتہ چھٹتے جاتے ہیں۔

اصل	تصحیح
(۱۳) عرصۂ دراز	مدّتِ دراز ("عرصہ" مدّت کے معنی میں اُردو ہے، اس لئے اضافت غلط ہے)
(۱۴) اُمرائیت	امارت
(۱۵) جو جذبات ایک محدود طبقے میں جاگزیں تھے، وہ رفتہ رفتہ عموماً شائع ہوگئے	جو جذبات ایک مختصر طبقے تک محدود تھے رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئے۔
(۱۶) سخت جسمانی تکلیف پر بھی جبیں پر شکن نہ آیا۔	سخت جسمانی تکلیف سے بھی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔
(۱۷) ازراہِ تمسخر مذاق اُڑایا ہے	مذاق اُڑایا ہے۔ ("یہ" ازراہِ تمسخر مذاق "کس کی سمجھ میں آسکتا ہے؟)
(۱۸) یہ تمام مصنّف شاعر تھے، اور اُن کا کلام بحر قوافی میں ہے۔	یہ تمام مصنف شاعر، اور بحور و قوافی کے پابند شاعر تھے۔ ("بحر قوافی" کا جواب نہیں ہوسکتا)
(۱۹) اُس عمارت کا محلِ وقوع بادشاہت کے اطراف جاری ہوا تھا۔	اُس عمارت کا محلِ وقوع ممالکِ محروسہ کے باہر واقع ہوا تھا۔
(۲۰) یگانگت	یگانگی
(۲۱) بادشاہت	بادشاہی
(۲۲) اطالیہ کی باخود جنگوں میں	اطالیہ کی خانہ جنگیوں میں ("باخود جنگوں" کے قربان جائیے)
(۲۳) بادشاہ خود رایانہ مرضی سے کام نہیں کرتا تھا۔	بادشاہ خود رائی سے کام نہیں کرتا تھا۔
(۲۴) اُن کے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ بجائے محکومیت کو چپکے سے تسلیم کرلینے کے اینتھنی اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر نیست و نابود ہوگئے ہوتے۔	اُن کے خیال میں محکومی کو چپکے سے تسلیم کرلینے کے عوض یہ کہیں بہتر تھا کہ ایتھنز والے اپنی آزادی پر قربان ہوجاتے۔
(۲۵) اُس کا ساحل، سمندر کے ہر جگہ	سمندر کے تھپیڑوں نے جگہ جگہ خشکی

خشکی میں گھس آنے سے خمیدہ ہو گیا تھا۔	کا حصہ کاٹ کاٹ کر اُس کے ساحل میں خم پیدا کر دیا تھا۔
(۲۶) اور بادشاہ کی جگہ دستور اساسی میں دو مجسٹریٹوں نے لے لی جنھیں کانسل کہتے تھے۔	دستور اساسی میں دو مجسٹریٹوں نے جنھیں کانسل کہتے تھے شاہی فرائض اپنے ذمے لے لئے تھے۔
(۲۷) اُن کی حکومت کا دوران اچھا نہ تھا۔	اُن کی حکومت کا زمانہ اچھا نہ تھا۔
(۲۸) جس سے یونانیوں کو یہ خواب و خیال پیدا ہوا۔	جس سے یونانیوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔
(۲۹) آزادی کو ایسا بُرا استعمال کیا کہ اُن کی حرکت سے رُومی برافروختہ ہو گئے۔	آزادی کو اس بُری طرح استعمال کیا کہ اُن کی حرکتوں سے رومی برافروختہ ہو گئے۔
(۳۰) اُن کی تعلیم زبانی ہوتی ہے حالانکہ رومیوں کی دل سے ہوتی ہے۔	یہ صرف زبان سے اور رومی دل سے تعلیم دیتے تھے۔
(۳۱) اس عہد کا دوسرا آدمی، ماقبل آدمی سے متضاد تھا۔	اِس عہد کا دوسرا آدمی، اِس دَور کے پہلے آدمی کے برعکس تھا۔
(۳۲) میں پیدا ہوا دوسرے عہد میں اور میری زندگی گزری دوسرے عہد میں۔	میں پیدا ہوا ایک عہد میں اور میری زندگی گزری دوسرے عہد میں۔
(۳۳) اثنا رجنگ میں	اثنائے جنگ میں۔
(۳۴) مگر اس تحریک کو قبول کرنے کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔	مگر اس تحریک کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔
(۳۵) وضاحت	توضیح
(۳۶) سوائے ملک گیری کے	ملک گیری کے سوا
(۳۷) اتحاد ثلاثانی	اتحادِ ثلاثہ
(۳۸) دوستوں کو اپنے لطائف الحیل سے خوش رکھتا تھا۔	دوستوں کو لطائف سے خوش رکھتا تھا۔ (لطائف کو "لطائف الحیل" فرمایا ہے، قربان جائیے۔)
(۳۹) کلاڈیسی کے افعال و حرکات	کلاڈیسی کی حرکتوں سے چشم پوشی

کی چشم پوشی ممکن ہے	ممکن ہے۔
(۴۰) نیرو کی فراری	نیرو کا فرار
(۴۱) جو کچھ اُن کو خیال تھا غارتگری یا فوجی عزّت حاصل کرنے کا تھا۔	اُنھیں صرف غارتگری اور فوجی عزت حاصل کرنے کا خیال تھا۔
(۴۲) اُس کے خلاف میں سازش ہوئی	اُس کے خلاف سازش ہوئی
(۴۳) فلسفہ اور مذہب کے پیچیدار مسائل میں اُسے کاوش تھی۔	فلسفے اور مذہب کے پیچیدہ مسائل میں اُسے شغف حاصل تھا۔
(۴۴) وہ حلیم طبیعت کا آدمی تھا۔	وہ حلیم الطبع تھا۔
(۴۵) مذہب مسیحی کے دبانے میں اُس پر مظالم عاید نہیں کئے جاسکتے۔	مسیحیت کو کمزور بنانے کے سلسلے میں اُس پر ظلم کرنے کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔
(۴۶) بہت کم بادشاہ موت سے مرے ہیں۔	بہت کم بادشاہ طبعی موت سے مرے ہیں۔
(۴۷) وہ دونوں دست بگریباں ہو گئے۔	وہ دونوں دست و گریباں ہوگئے ("دست بگریباں" لڑائی کتنی اچھی اور محفوظ لڑائی کی قسم ہے جس میں دونوں فریق خود اپنے اپنے گریبانوں کو پکڑے نظر آتے ہیں)
(۴۸) حرفتی عنصر نے بالتخصیص کامل و مرفہ الحال نشوونما حاصل کر لیا تھا	صنعتی عنصر نے خصوصیت کے ساتھ حقیقی و کامل نشوونما حاصل کر لی تھی۔
(۴۹) اپنی حفاظتِ ذات کے لئے	ذاتی حفاظت کے لئے
(۵۰) یہ انتظام جاری رکھا۔	یہ انتظام قائم رکھا۔
(۵۱) ہر اُس شخص کو عہدے سے نکال دیں۔	ہر اُس شخص کا عہدہ چھین لیں۔
(۵۲) جب اِس کشمکش کے نقطۂ بازگشت کا وقت آیا۔	جب یہ کشمکش، انقلابی نقطے پر پہنچی۔
(۵۳) حرکت بہ جانب شاہی سلطان الفنان	مطلق العنان بادشاہی کی جانب میلان،
(۵۴) حکومت کا اعلیٰ عضو	حکومت کا اعلیٰ رکن
(۵۵) وہاں بُت پرستوں کے سرغنے	وہاں بت پرستوں کے سردار بھی

بھی موجود تھے۔	موجود تھے۔ (”سرغنہ“ یہاں موزوں نہیں معلوم ہوتا، واضح رہے کہ سرغنہ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں سرغنہ ہی رہتا ہے)
(۵۵) اُس پر مزید طرفہ یہ تھا	اور اُس پر یہ طرّہ تھا۔
(۵۶) بتوں کے مندروں میں	بُت خانوں میں
(۵۷) ہنگامۂ قتل مچ گیا	ہنگامۂ قتال برپا ہوگیا
(۵۸) جن میں کبھی صلح وآشتی رہتی ہے، اور زیادہ تر مخالفت	جن میں صلح شاذ، اور جنگ بیشتر رہتی ہے۔
(۵۹) اطالیہ کا دَور لگاکر	اطالیہ کا چکّر لگاکر
(۶۰) اُس کی معقولیت کا اور انسانیت کا اُن کے دل پر نقش ہوگیا۔	اُس کی معقولیت وانسانیت اُن کے دلوں پر نقش ہوگئی۔
(۶۱) بہت سے مرد اور عورت	بہت سی عورتیں اور مرد
(۶۲) تعلیم وزراعت اُن کے ہاتھوں میں آگئی۔	تعلیم وزراعت اُن کے ہاتھ میں آگئی۔
(۶۳) واپس لوٹنا پڑا	واپس ہونا پڑا۔ (معلوم نہیں یہ ”واپس“ کیونکر ”لوٹنا“ پڑتا ہے)
(۶۴) قابلِ گردن زنی قرار دیا	گردن زدنی قرار دیا (”گردن زدنی“ کے ساتھ ”قابل“! سبحان اللہ!)
(۶۵) طلاق دے دیا۔	طلاق دے دی
(۶۶) بادشاہ نے شکایتوں سے موثر ہوکر	بادشاہ نے شکایتوں سے متاثر ہوکر۔
(۶۷) جاگیریت کے اصول مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں متغائر رہے ہیں	جاگیری اصول مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں متغائر رہے ہیں۔
(۶۸) وہ سربرآوردہ شہر تھا۔	وہ ایک ممتاز شہر تھا۔
(۶۹) بلحاظ دولت وشانداری	دولت، اور شان وشکوہ کے لحاظ سے

(۷۰) علالت	بیماری
(۷۱) بادشاہ کے مفاد کے مدنظر	شاہی مفاد کے نقطۂ نظر سے
(۷۲) اُس کے خلاف میں چال چلا	اُس کے خلاف چال چلا
(۷۳) مجرم پیشہ	جرائم پیشہ (مترجم صاحب! ”مجرم“ کوئی شغل یا فعل نہیں ہوتا)
(۷۴) چھوٹے چھوٹے رئیسوں کو سرزنش کا موقع ملا، اور اُنھوں نے آزادی کا دعویٰ کردیا	چھوٹے چھوٹے رئیسوں کو سرتابی کا موقع ملا، اور اُنھوں نے آزادی کا اعلان کردیا۔
(۷۵) انگریز اقتدار پاپائی سے مشتبہ ہوگئے۔	انگریز پاپائی اقتدار سے بدظن ہوگئے۔ (”مشتبہ“ اسم مفعول ہے)
(۷۶) اس عبارت کی مفاہمت بالکل واضح ہے	اس عبارت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔
(۷۷) سطوط وجبروت	سطوت وجبروت (”سطوت“ کا املا ”سطوط“، معاذ اللہ!)
(۷۸) فاتحان کا ضمیر	فاتحوں کا ضمیر
(۷۹) نو ماموره جامعہ	جدید البناء جامعہ
(۸۰) تردیدی اصلاح	اصلاحِ معکوس
(۸۱) عقل وسمجھ	عقل ودانش (”سمجھ“ اور واوِ عطف!)
(۸۲) ہنری پاپائے روم کو بھی ہمدرد کرلیتا ہے	ہنری پاپائے روم کو بھی ہمدرد بنالیتا ہے۔
(۸۳) عطیۂ سمندر	عطیۂ بحر
(۸۴) تشددی احکام	احکامِ تشدد
(۸۵) جنگ شروع ہونے کے پہلے دھمکیاں ہونے لگیں	جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے لگے۔
(۸۶) اُس نے کہا اگر میری دستخط لینا چاہتے ہو تو میرے پیچھے کی طرف آؤ۔	اُس نے کہا اگر میرے دستخط لینا چاہتے ہو تو پشت پر آؤ۔

اصل	اصلاح
(۸۸) رچلو نے بیچ میں ٹانگ اڑا کر مذہب کو بچا لیا۔	رچلو نے درمیان میں پڑ کر مذہب کو بچا لیا۔
(۸۸) فرانس کے قدم کو روکنے کے لئے۔	فرانس کے اقدامات روکنے کے لئے۔
(۸۹) ولد الحرام اولاد کی انا	حرامی بچوں کی انا ("ولد الحرام اولاد" پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے)
(۹۰) فرانس کے مخالف جتھا میں شریک ہوگیا۔	فرانس کے مخالف جتھے میں شریک ہوگیا۔
(۹۱) اوائل سترہویں صدی میں	سترہویں صدی کے اوائل میں
(۹۲) دونوں ملکوں کو اتحاد میں قائم کیا اور رکھا۔	دونوں ملکوں میں اتحاد پیدا کرکے اُسے قائم بھی رکھا۔
(۹۳) لوگوں کو دین بدر کیا	لوگوں کو بے دین قرار دے دیا
(۹۴) جہاز کی نجاری کا کام سکھایا	جہاز بنانا سکھایا
(۹۵) کوئی اولاد اُس کو نہ تھی	اُس کے کوئی اولاد نہ تھی
(۹۶) سورماؤں میں اُس کا نام شریک ہوگیا۔	وہ سورماؤں میں شمار ہونے لگا
(۹۷) رسل رسائل قائم نہیں رکھی جا سکی	مراسلت قائم نہیں رہ سکی
(۹۸) رسومات	رسوم
(۹۹) بادشاہ اُس عضو کو اِدھر اُدھر کرتا رہا۔	بادشاہ اُس رکن سلطنت کو ٹالتا رہا۔ ("شرم نہیں آتی" بادشاہ اُس عضو کو اِدھر اُدھر کرتا رہا)
(۱۰۰) بادشاہ زیست و بقا کے لئے بر سر پیکار تھا۔	بادشاہ جینے مرنے کی لڑائی لڑ رہا تھا۔
(۱۰۱) مضامین و کتابیں	مضامین اور کتابیں
(۱۰۲) اسباب و بواعث	اسباب و علل
(۱۰۳) وہ تمام دنیا کا سیاح تھا	وہ ایک ایسا سیاح تھا جو تمام دنیا کو دیکھے ہوئے تھا (سیاح کو "سیاہ" لکھنا عمر بھر کی رُو سیاہی کے لئے کافی ہے)
(۱۰۴) راشی انجمن	مرتشی انجمن ("راشی" اسم مفعول ہے۔)
(۱۰۵) اُس نے خود کو بادشاہ کے پاس بھی مقبول بنا لیا	اُس نے خود کو بادشاہ کی نظروں میں بھی مقبول بنا لیا۔
(۱۰۶) متلاشی امن	جویائے امن ("تلاش" عربی لفظ نہیں ہے)
(۱۰۷) وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ شہروں کے نشو و نما کی رنگوبیت اُن میں وہ سربراہی کرے۔	وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ شہروں کے نشو و نما میں روح پھونک دے
(۱۰۸) مشاورتی ایوان	ایوانِ شوریٰ
(۱۰۹) شورشی امرا	شورش پسند امرا
(۱۱۰) بادشاہ کے سامنے نظرانوں کی ادائی لازمی تھی۔	بادشاہ کے سامنے نذریں پیش کرنا لازمی تھا۔ ("نذر" کا املا "نظر" افسوس۔ اور پھر "ادائی" اللہ ری زبان سے کج ادائی)
(۱۱۱) کم ظرفی	کم ظرفی (ایسی غلطیاں تو بچے تک نہیں کرتے)
(۱۱۲) مذحکہ	مضحکہ
(۱۱۳) حارث کے مکان کے رُخ چلنے لگا	حارث کے مکان کی طرف روانہ ہوگیا۔
(۱۱۴) قابل بھروسہ	قابلِ اعتماد
(۱۱۵) حزیمت	ہزیمت
(۱۱۶) یہ سہرۂ تفاخر	یہ فخر کا سہرا
(۱۱۷) اہلِ کوفہ کے مختار کے خلاف خروج کی تیسری صبح کو	مختار کے خلاف اہلِ کوفہ نے جب خروج کیا، تو اُس کی تیسری صبح کو

کلیم دہلی

بھی موجو

ے لئے آمادہ

	ہر وقت جنگ کے لئے آمادہ ہے ("جنگ کے لئے" اور "آمادۂ پیکار" سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ)
(۱۱۹) عائدین	عائد
(۱۲۰) یہ لشکر میں جاتا اور پکارتا کہ تمہاری گھنی زُلفیں مجھے عاریت دیدو	یہ لشکر میں جاتا تھا، اور پکارتا تھا کہ اپنی گھنی زلفیں مجھے عاریتہً دے دو۔
(۱۲۱) ایسی گڑبڑ پڑی کہ سڑک کے ناکے پر ایک پر ایک چڑھا پڑتا تھا۔	ایک ہنگامہ ہوا کہ ناکے پر ہر شخص ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔
(۱۲۲) وہ بیوی کے سامنے ہتھیار کھول کر کھڑا ہو گیا	وہ بیوی کے سامنے سپر انداختہ ہو گیا۔ ("بیوی کے سامنے" اور "ہتھیار

کھول کر" کھڑا ہو گیا!! سبحان اللہ ماشاء اللہ!

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

اس کے دوش بدوش آخر میں ایک جملہ اور سُن لیجئے جو اس تمام تحریر کی جان ہے، اور جو ایک بہت بڑے رُکن کی زبان سے اُس وقت نکلا تھا جب وہ صدارتی تقریر کے واسطے کھڑے ہوئے تھے۔

وہ کہنا چاہتے تھے کہ میں آپ حضرات کا تھوڑا سا وقت لینا چاہتا ہوں۔

لیکن اُردو دانی کی یہ انتہا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا "حضرات! میں آپ کی تھوڑی دیر لینا چاہتا ہوں۔"

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون!

ظاہر میں عیاں کیا ہے، یہ بھید سمجھ
باطن میں نہاں کیا ہے، یہ بھید سمجھ
ہیں ہر دو جہاں کے راز سے واقف جو
رازِ دو جہاں کیا ہے، یہ بھید سمجھ

حکیم آزاد انصاری

دنیا کا مزاج کیا ہے، یہ بھید سمجھ
کل کیا تھا اور آج کیا ہے، یہ بھید سمجھ
اے ملتفتِ ایام سے شکوہ سنج
اس دکھ کا علاج کیا ہے، یہ بھید سمجھ

حکیم آزاد انصاری

جلال وجمال

(The sublime and Beautiful)

یہ مشہور ادیب اور معروف سیاست داں، ایڈمنڈ برک کا شاہکار ۱۷۵۶ء میں شائع ہوا تھا، جس کی پوری سرخی ہے "جلیل و جمیل کے باب میں مبادی خیالات کی فلسفیانہ تحقیقات":

ہرچند بعض حیثیتوں سے اس مقالے کے تکمیلے میں کمی رہ گئی ہے لیکن اس کی اشاعت نے ملک اور بیرون ملک ایک خاص وقعت حاصل کرلی تھی، اور جس کا جرمنی پر زبردست اثر پڑا تھا، اور اس کے جمالیاتی اسکول میں ایک ہلچل سی ڈال دی تھی۔ اور آج بھی جرمنی و امریکہ کے جمالیاتی تصورات اسی مقالے سے وابستہ ہیں۔ اور جدید نظریات جلال وجمال کی بنیادیں اسی پر قائم ہیں۔

ادارہ

---

(۱)

ذوق کیا شے ہے؟

(WAHT is TASTE)

ہم اپنے استدلال اور دلچسپیوں کے باب میں خواہ ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف رکھتے کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں، لیکن یہ تقریباً ایک یقینی بات ہے کہ استدلال اور ذوق کا معیار تمام نوعِ انسانی میں ایک ہی شے ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی کے باہمی تعلقات و معاملات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔

یہ امر عام طور سے مسلّم ہے کہ کذب و دروغ کے متعلق ہمارے پاس ایسے معیار موجود ہیں جو ہر پہلو سے تسلیم کئے جاتے ہیں، اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ذوق کی منطق کا گہری مطالعہ کیا جائے تو اس سے جمال کے متعلق ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نفاست معیار پیدا ہو جائیں۔

توہمات کے متعلق آئین وضوابط کا اختراع کرنا، اور ایک قانون ساز وہم وگمان کی حیثیت سے ان قوانین کا مدوّن و مرتب کرنا کس قدر مہمل سی بات ہے ——— اگر "ذوق" کے محکم اصول مرتب نہ ہو چکے ہوتے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہم متذکرہ بالا مہملیت میں ضرور مبتلا ہو جاتے۔

"ذوق" (TASTE) کی اصطلاح ایک تصوری و تمثیلی اصطلاح ہے جس میں قطعیت وصحت کو زیادہ دخل نہیں ہے، اور اسی وجہ سے یہ اصطلاح عدم صحت و انتشار کا سبب بن جاتی ہے ——— لیکن میرے ذہن میں اس اصطلاح کی کسی ایسی تعریف (Defenition) کا کوئی خاص وعظیم تصور نہیں ہے جو اس اصطلاح سے پیدا ہونے والے انتشار کو یقینی طور سے دفع کرسکتا ہو۔

میں جب "ذوق" کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ہوتی ہیں نفس انسانی کی وہ صلاحیتیں اور استعدادیں جو تخئیل اعمال، اور دل پذیر فنون لطیفہ سے متاثر ہوتی ہیں۔

میرا مقصد اس امر کا معلوم کرنا ہے کہ "ذوق" کے متعلق آیا ایسے اصول موجود بھی ہیں جو نوع انسانی میں اس قدر مشترک، اور اس کے ساتھ ساتھ اس درجہ محکم وقطعی ہوں کہ ان سے ایسے ذرائع بہم پہنچ جائیں، جن کی مدد سے ہم ان کے متعلق قابل اطمینان استدلال قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہماری جملہ فطری قوتیں، جنھیں خارجی اشیائے عالم سے واسطہ

رہتا ہے، تمامتر ہمارے حواس خمسہ، ہمارے تخیل، اور ہماری قوت فیصلہ پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک کہ حواس خمسہ کا تعلق ہے، چونکہ اُن کے آلات تمام انسانوں میں تقریباً یکساں ہوتے ہیں، اس لئے ہم پر یہ فرض کرلینا واجب ہے کہ خارجی اشیاء کا مطالعہ و مشاہدہ بھی تمام انسانوں میں کم و بیش ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہوگا۔

جو شے ایک آنکھ کو سفید نظر آتی ہے، وہی شے دوسری آنکھ کو بھی سفید ہی نظر آتی ہے۔ اور جو شے ایک کے کام و دہن کو شیریں معلوم ہوتی ہے ہوتی ہے ——— اگر اس کے خلاف ہوتا تو ہم ایسی تشکیک میں مبتلا ہوجاتے کہ ہمارے ہر قسم کے دلائل دور از کار اور مہمل ہو کر رہ جاتے۔

اس کے علاوہ یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہر چیز اور ہر شے تمام نوع انسانی میں ایک یکساں قسم کی کیفیت لذت و کرب کو برانگیختہ کرتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کے واسطے شیرینی باعث لذت، اور تلخی موجب کرب ہوتی ہے۔

اس شیرینی و تلخی کے معاملے میں وہ لوگ مستثنیٰ سمجھے جائیں گے، جن کا کام و دہن خاص عادات یا امراض کی بنا پر مسموم ہوچکا ہے۔

اسی طرح روشنی تمام افراد کو تاریکی سے زیادہ مرغوب، اور بہار تمام مخلوق کو خزاں سے زیادہ مطبوع معلوم ہوتی ہے۔

حواس خمسہ کے علاوہ ہم میں تخیل بھی ہے، اور یہ تخیل، ذہانت، تصورات و اختراع وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تخیل کا یہ ملکہ، ہر چند کوئی قطعی طور سے جدید شے پیدا نہیں کرسکتا، لیکن ان خیالات کے مزاج میں اختلاف تفاوت ضرور پیدا کردیتا ہے۔ جو حواس خمسہ کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں دریں تخیل کا دائرہ، لذت و کرب کا خاص میدان ہے، کیونکہ اسی حلقے میں ہم خوف و امید اور دیگر جذبات سے دوچار ہوتے ہیں۔

تخیل مشابہت کا خوگر ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے یہ تشبیہ، استعارہ کنایہ، اور تمثیل کی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ہم انسانوں کو فی الفور متاثر کردینے کی طاقت رکھتی ہیں۔

برخلاف اس کے، اندازہ و رائے کا تعلق زیادہ تر اختلافات سے ہے۔ اور جس چیز کو ہم اختلافِ مذاق کہتے ہیں، اس کا خاص سرچشمہ وہ اختلاف ہے، جو نافذانہ و مجتہدانہ علم کے معاملہ میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ تخیل کا حواس خمسہ پر مدار ہے اس لئے یہ بھی لازمی ہے کہ جس طرح تمام نوع انسانی کے حواس میں تطابق ہے اسی طرح تخیل میں بھی تطابق ہو۔ اور جس حد تک کہ تخیل کا ذوق سے تعلق ہے اسی لحاظ سے ذوق کے اصول بھی تمام انسانوں میں یکساں ہونا چاہئیں۔ لیکن ذوقی امور میں، اشیاء کے متعلق اندازہ و رائے قائم کرتے ہوئے افراد کے اندر، ایک حقیقی عدم تطابق پیدا ہوجاتا ہے۔

تخیل کے بہت سے اعمال، صرف اشیائے محسوس کی نمائندگی اور جذبات کی برانگیختگی تک ہی محدود نہیں رہتے، بلکہ آگے بڑھ کر ان کا تعلق انسانوں کے آداب و اطوار، سیرت و مزاج، گفتار و کردار اور محاسن و معائب سے بھی پیدا ہوجاتا ہے، اور اس صورت سے انسانی تخیل اندازہ و رائے کے حدود میں داخل ہو کر تناسب توجہ اور مخصوص استدلال کی عادت کی بدولت ترقی پذیر ہوجاتا ہے۔

اسی لئے "بورکیں" چاہتا ہے کہ ذوقی امور میں بصیرت و ہدایت حاصل کرنے کی خاطر ہمیں فلسفے کے مدارس اور دنیا کی تماشاگاہ میں داخل ہونا چاہیئے، اس لئے کہ جسے ذوق یا مذاق کہا جاتا ہے وہ محض ایک سادہ سا خیال نہیں، بلکہ اس کے برخلاف ذوق یا مذاق کی تعمیر ہوتی ہے ایک تو ابتدائی لذاتِ حواس کے مطالعہ سے، دوسرے ثانوی لذاتِ تخیل کے مشاہدہ سے، اور تیسرے ملکۂ استدلال کی قوت استنباط و استخراج کے ذریعہ سے، قوتِ مدرکہ کی کمی، فقدانِ ذوق کی طرف لے جاتی ہے، اور اندازہ و رائے کا ضعف بدمذاقی پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

(۲)

لذّت و کرب

لیکن اب ہمیں جلیل و جمیل کے سرچشمے کے مسئلے کی جانب رجوع ہونا چاہیئے۔

انسان کا اولین اور سادہ ترین جذبہ، جذبۂ تجسس و تحقیق یا بالفاظ دیگر ندرت کی تلاش، اور ندرت سے لطف اندوز ہونے کا میلان ہے۔

بچے ہمیشہ کسی نہ کسی نئی چیز کے پیچھے دوڑا کرتے ہیں۔ یہ بھوک بہت تیز ہوتی ہے، مگر بآسانی آسودہ ہو جاتی ہے۔

ندرت کی کسی مقدار کا موجود رہنا ذوق کے ہر معاملے میں ایک لاینفک عنصر ہے۔

جو مقاصد ہمارے جذبات کو حرکت میں لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اُن میں کسی نہ کسی حد تک جدت اور کسی قدر لذت و کرب کے ابھارنے کی قوت بھی ضرور ہونا چاہیئے۔

اب لذت و کرب کو لیجیے، یہ صرف مجرد تصورات ہیں جن کی تعریف (Definition) نہیں کی جا سکتی۔

اکثر افراد غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ لذت کے دفع ہو جانے سے کرب یقینی طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح کرب کے سلسلے کے منقطع ہو جانے سے لذت کا پیدا ہو جانا ایک ناگزیر امر ہے۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے کیونکہ انسانی نفس اکثر و بیشتر ایک بے خبری، بے نیازی اور خواب آلودگی کے عالم میں رہا کرتا ہے۔ جسے لذت و کرب کا احساس و تصور تک نہیں ہوتا، اور اسی بے نیازی و خواب آلودگی کے عالم سے وہ گاہ گاہ لذت و کرب کے احاطے میں آ جاتا ہے۔

انسان کے اندر لذت سے ملتا ہوا ایک خاص جذبہ ہے جو کرب کے دفع ہونے کے وقت بیدار ہوتا ہے، اور اس اضافی لذت کو ہم "انبساط" کے نام سے پکارتے ہیں۔

اکثر و بیشتر وہ خیالات جو نفس کو لذت یا کرب سے متاثر کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، "ذاتی صفات" اور "سوسائٹی" کے اصول پر مشتمل ہوتے ہیں۔

جذبہ "حفاظتِ ذات" کا تعلق سب سے زیادہ کرب اور خطرے سے ہوتا ہے ——— اور دنیا کی ہر وہ شے جو کرب یا خطرے کے خیالات کو کسی نہ کسی طرح ابھار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، یا اس طور سے عمل کرتی ہے کہ اس کا عمل دہشت سے مشابہ ہو جاتا ہے، درحقیقت جلال کا سرچشمہ ہوتی ہے، جس سے ایسے قوی ترین جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ ان سے قوی تر جذبات کا پیدا کرنا نفسِ انسانی کے امکان میں نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ان جذبات کی بنیاد لذت پر ہوتی ہے جن کا تعلق سوسائٹی سے ہوتا ہے، خواہ وہ جنسی سوسائٹی ہو یا وہ معروف تر سوسائٹی جو آدمیوں، حیوانوں اور غیر ذی روح اشیاء پر مشتمل ہوتی ہے۔

جنسی محبت کے پیشِ نظر حسن ہوتا ہے، اور حسن وہ مجلسی وصف ہے جو ہمیں ہمارے اہو رموانست سے وابستہ کر دیتا ہے۔

سوسائٹی کے مختلف جذبات میں سے ہمدردی، نقالی، اور بلند حوصلگی اولین اہمیت رکھنے والے جذبات ہیں۔

ہمدردی سبب ہے اس لذت کا جو ہمیں "حزنیہ" (TRAGEDY) سے حاصل ہوتی ہے، جس کے مشاہدے کے وقت ہمیں ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ اس کی تمام پریشان حالیاں، اور زبوں انجامیاں محض فرضی ہیں۔

نقالی وہ جذبہ ہے جو ہمیں آداب و رسوم سکھاتا، ہماری رایوں میں استواری پیدا کرتا، اور ہماری حیات کو محکم بناتا ہے، اور اسی بنا پر اسے سوسائٹی کی سب سے زیادہ مضبوط کڑی کہا جا سکتا ہے۔

بلند حوصلگی ایک مجلسی جذبہ (SOCIAL PASSION) ہے کیونکہ یہ افراد کے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی طرف مائل کرتا ہے ———

(۳)

عناصرِ جلال

اس جذبے کو جو عظیم و جلیل اشیا کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے حیرت کہتے ہیں۔ اور حیرت، روح کی اس مخصوص حالت کا نام ہے جب کہ اس کے تمام وظائف ایک گونہ دہشت زدگی کے باعث معطل ہو جاتے ہیں۔

اس موقع پر وہ چیز جو حیرت کا باعث ہوتی ہے انسانی نفس پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیتی ہے کہ آدمی کوئی دوسری بات سوچ ہی نہیں سکتا، اور نہ اس قابل ہی ہوتا ہے کہ خود محرکِ حیرت شے کے متعلق کوئی استدلال قائم کر سکے۔

جلال اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر حیرت پیدا کرتا اور اپنی درمیانی حالت میں داد و ستائش اور عقیدت و احترام کے جذبات کو ابھار دیتا ہے۔

دنیا کے تمام جذبات میں جذبۂ دہشت ہی وہ جذبہ ہے جو نفس کو اس کی تمام عملی و استدلالی قوتوں سے یکسر محروم کر دیتا ہے، اور یہ

وہ شے جو نگاہ کو دہشتناک معلوم ہو جلیل ہوتی ہے۔

یہ امکان سے خارج ہے کہ ہم کسی دہشت انگیز یا خطرناک شے کو سبک و حقیر خیال کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم خوفناک اژدہے کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں جلالت کے تصورات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بحر ذخار کی جلالت کی بھی یہی بنیاد ہے، کہ وہ کسی معمولی سی دہشت کا حامل نہیں ہوتا ہے۔

جلالت و دہشت میں کتنا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

کسی شے کو بیحد دہشتناک بنانے کے لئے عام طور پر ابہام ایک ضروری عنصر معلوم ہوتا ہے یعنی اگر کسی شے کو مہیب بنانا منظور ہو تو اس کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی تفصیل نہ کی جائے، اور اس پر ایسے پردے ڈال دیئے جائیں کہ وہ ہماری بصارت و بصیرت، دونوں کے واسطے ایک معمہ بنکر رہ جائے کیونکہ جب ہم کسی خطرناک شے کو قریب سے دیکھ کر اس کے پورے حدود معلوم کر لیتے ہیں تو اس کی ہیبت و دہشت ہمارے دل سے اٹھ جاتی یا بہت ہی کم ہو جاتی ہے۔

رات کی تاریکی بھوتوں کے خوف کو قوی کر دیتی ہے ـــــ تمام طاغوتی سند ظلمت میں لپٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ـــــ اور استبدادی حکومتوں کے ظالم بادشاہ، مخلوق کی نظروں سے اوجھل رہنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ انشا پردازی کا بھی یہی حال ہے، کسی چیز کو بالکل کھول کر بیان کرنے سے صفائی تو ضرور پیدا ہوتی ہے، مگر حسن پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک ایسے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں جو معانی کو اس طرح پوشیدہ کر لیں جیسے ہلکے ابر میں ماہتاب، اس وقت تک انشا پردازی میں حسن کا عنصر پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ضرورت سے زیادہ صفائی اور مکمل تفصیل ہر بات کی دلربائی کو برباد کر دیتی ہے۔

شاعری کو مصوری پر اسی لئے ترجیح حاصل ہے کہ شاعری میں ایک مبہم طور سے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی قوت موجود ہے۔

جتنا ہم جس چیز سے ناواقف ہوں گے اسی مقدار جہل سے ہم اس کو سراہینگے اور اسی مقدار سے ہمارے جذبات میں برانگیختگی پیدا ہوگی۔

مثال کے طور پر ملٹن کی شاعری کو لیجئے، جس کے اندر عظیم الفاظ اور زبردست نقوش ایسے پُراسرار طرز بیان کے پردوں میں مستور ہیں اور ان کے گرد رومان و ابہام کا اس قدر ہجوم ہے کہ ہمارے جذبات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

شاعری کے مجسمے ہمیشہ دھندلے ہوتے ہیں ـــــ کسی شے کو مکمل طور سے دیکھ لینا اس کے تمام حدود کا احاطہ کر لینا ہے۔ اور کسی چیز کے حدود کا احاطہ کر لینا اسے لامحدودیت کے احاطے سے نکال دینے کے برابر ہے۔

اسی لئے ایک صاف خیال کا دوسرا نام ہے حقیر خیال۔

جلالت اپنے حلقے میں دہشت کے تخیل کے ساتھ ساتھ قوت کا تصور بھی رکھتی ہے۔

لذت بسا اوقات ارادے سے پیدا ہوتی، اور ایسی بے شمار چیزوں سے متاثر ہوتی ہے، جن کی قوت ہماری قوت سے کم درجے کی ہوتی ہے۔ لیکن کرب ہم پر ایک ایسی قوت کے ذریعہ سے طاری ہوتا ہے جو ہماری قوت سے اونچے درجہ کی ہوتی ہے۔

توانائی، استبداد، کرب اور دہشت ایسے تخیلات ہیں جو پیدا ہوتے ہی ہمارے نفس پر چھا جانے کی قوت رکھتے ہیں۔

بہائم کی جلالت، ان کی قوت اور درندگی پر مبنی ہوتی ہے، اور چونکہ بادشاہوں کے رعب و داب کا مدار بھی خوفناکی اور بہیمیت پر ہوتا ہے، اسی لئے ہم انھیں "حضرت دہشت پناہ" کا خطاب دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مجھے ایسے بہت سے لوگ معلوم ہیں جن کا یہ قول ہے کہ جب تک ہیبت و خوف کی آمیزش نہ کی جائے، خدا کے تخیل کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر میں اس متذکرہ بالا قول کے متعلق مناسب الفاظ میں کچھ کہنا چاہوں تو صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اس تمام معدلت گستری کے باوجود جو خدا سے منسوب کی جاتی ہے، اور اس تمام رحمت و کرم کے باوصف جسے خدا سے نسبت دی جاتی ہے ہمارے واسطے یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہم اس خدا کا دہشت و ہیبت کے خیال سے معرا ہو کر کوئی تصور قائم کر سکیں۔ جس کا کوئی قوت مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عقلاء کا یہ بھی قول ہے کہ دراصل یہ ہیبت، دہشت، سطوت

اور خوف ہی ہے جس نے انسان کے اندر خدا کا تصور پیدا کیا ہے۔

تمام عمومی محرومیاں عظیم ہیں، کیونکہ وہ سب کی سب وحشتناک ہوتی ہیں، خلا، تاریکی، تنہائی اور خاموشی، یہ سب وحشتناک محرومیاں نہیں تو اور کیا ہیں۔

اس کے ساتھ ہر طویل، وسیع، عمیق، اور بلند شے کے اندر بھی جلالت جلوہ فروش ہوتی ہے، کون ہے جو قطب مینار اور اہرام مصری دیکھے، اور جلالت محسوس نہ کرے۔

صرف یہی نہیں بلکہ مسطح اور ہموار زمین کے مقابلے میں زمین کا وہ حصہ ہمارے دل پر زیادہ اثر ڈالتا ہے جو کھردرا ہو، جس میں جابجا شگاف پڑے ہوتے ہوں، اور قطعی طور پر ناہمواریوں کا آئینہ دار ہو، کیونکہ ایسی ہیئت ناہمواریوں اور جو ننا اک بلند و پست کے اندر جلالت کروٹیں لیتی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے دوش بدوش یہ معلوم کرکے بھی حیرت ہوتی ہے کہ تصغیر کے انتہائی نقطہ پر بھی جلالت پائی جاتی ہے، کیونکہ تقسیم بھی جمع کی طرح غیر محدود ہوتی ہے۔

لامحدودیت انسانی نفس کو اس قسم کی خوشگوار دہشت سے معمور کردیتی ہے جو جلال کا صحیح ترین معیار ہے۔

اجزا کی یک رنگی، ترتیب اور ان کا تناسب جس سے ایک مصنوعی لامحدودیت رونما ہوتی ہے، فن تعمیر میں جلالی اثر پیدا کردیتا ہے۔

عمارات میں جلالت پیدا کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ اس کا عرض و طول عظیم ہو۔

ہرچند عمارات کے وہ نمونے جو محض لابنے اور چوڑے ہی ہوتے ہیں معمولی اور نسبت تخیل کا نمونہ ہوتے ہیں۔

فنون لطیفہ کا کوئی عمل اس وقت تک عظیم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ کوئی فریب نظر یا فریب حواس کا سامان نہ پیدا کرے۔

حیوانات کے بچوں میں بھی ایک قسم کی لامحدودیت پائی جاتی ہے، جس سے لذت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ انہیں دیکھکر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہونہار بچے کیا سے کیا بن جانے والے ہیں۔

اکثر نا تمام خاکے، مکمل خاکوں سے زیادہ لذت پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں، اور دشوار شے آسان شے کے بالمقابل زیادہ دل کش اور اہم ہوتی ہے۔

ایک بالذات اعلیٰ و گراں پایہ اشیا کی حامل عظمت و شوکت، یقیناً جلیل ہوتی ہے، اور ایسی جلیل جیسے تاروں بھرا آسمان جس کی صولت کو، اس کے ستاروں کی صوری بے ترتیبی، اور بھی دوبالا کردیتی ہے۔

صولت آمیز جلالت تک صرف شعرا ہی کو رسائی حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ وہ ایسے خیرگی پیدا کردینے والے الفاظ کی دولت بیدار، اور ایسے نگارنگ نقوش فراواں کی نعمت غیر مترقبہ سے کام لیا جانتے ہیں۔ جو اور کسی کو میسر نہیں ہوسکتی، یہ صحیح ہے کہ پھیل جانے کے بعد ہر رنگ میں عظمت کے لشورات کے پیدا کردینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے ـــــ اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر رنگ، روشنی کا نتائج ہوتا ہے، نیز یہ بھی درست ہے کہ آفتاب کی شعاعیں اور بجلی کی چمکتیں نوبت با بانی کے باعث دلوں پر کافی اثر ڈالتی ہیں ـــــ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ تاریکی، روشنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ جلیل ہوتی ہے۔

ہمارے جلیل القدر شعرا کا یہ تصور کہ الوہیت، پرشوکت تاریکی کے حلقے میں مستور ہے، صرف ایک شاعرانہ خیال ہی نہیں، بلکہ فلسفیانہ حیثیت سے بھی درست ہے۔

(۴)

عناصر جمال

جمال کو جب میں جلال سے علیحدہ کرکے بیان کرتا ہوں تو اس وقت میری نظر ہوتی ہے اجسام کے اس مخصوص وصف، یا ان نمایاں اوصاف پر جو دیکھنے والوں کے دلوں میں عشق و محبت یا عشق و محبت سے مشابہ جذبات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور اس کے ساتھ میں عشق و محبت، اور اس عاشقانہ آسودگی کو بھی جو جمال کے مطالعہ و تصور سے حاصل ہوتی ہے نفسانی خواہش سے علیحدہ رکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ نفسانی خواہش صرف ایک ایسی نفسی قوت کا نام ہے جو ہمیں صرف بعض خاص مقاصد کی طرف کھینچے کھینچے پھرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جمال کن چیزوں پر مشتمل ہے؟

اس سوال کا یہ جواب بالعموم دیا جاتا رہا ہے کہ جمال بعض اجزا کے تناسب پر مشتمل ہوتا ہے۔

لیکن میں تو اس خیال تک کو کہ جمال، اجزا کے تناسب سے کوئی دور کا بھی علاقہ رکھتا ہے، شدید اشتباہ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

تناسب تو اضافی و اعتباری مقدار کا پیمانہ ہوتا ہے لیکن جمال کو تناسب و مساحت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ اگر ہم نگاہِ حقیقت آشنا سے دیکھیں گے تو صاف طور سے معلوم ہو جائے گا کہ پودوں اور حیوانوں کے جمیل اجزا ہمیشہ کسی خاص ناپ تول اور کسی مخصوص تناسب و مساحت کی وضع پر نہیں پائے جاتے۔

پھولوں کو دیکھئے کہ وہ متعدد شکلوں، اور مختلف ہیئتوں میں نمودار ہوتے ہیں اور ہر چند ان کی شکلوں اور ان کی پتیوں کی وضع میں ایک خاص ہیئت و نظام پایا جاتا ہے، لیکن جس وقت ہم اپنی نگاہ کو قدرے ترچھا کر کے انھیں جمالیاتی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس طرح ان کی خاص ہیئت، اور ان کا خاص نظام ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اس وقت بھی پھولوں کا جمال سابق ہی کی طرح تر و تازہ نظر آتا ہے، بط کی لانبی گردن اور چھوٹی دُم میں اگر جمال آمیز تناسب پایا جاتا ہے تو مور کی چھوٹی گردن اور لانبی دم بھی اس تناسب سے محروم نہیں ہوتی۔

آپ انسانی جسم کے حصوں کے واسطے کسی خاص تناسب کا تصور قائم کر کے کسی مصور کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ آپ کے تصوری تناسب کا پابند ہو کر ایک تصویر بنائے لیکن یہ ہر وقت مصور کے اختیار میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو آپ کے ہر تناسب کا پورا پورا پابند رہ کر بھی ایک نہایت ہی بدشکل و مکروہ تصویر بنا دے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی اس کے اختیار میں ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے ہر تناسب سے روگردانی کر کے وہ ایک نہایت ہی حسین و جمیل تصویر طیار کرے۔

ارباب تناسب کا یہ خیال بالکل ناقص ہے کہ اگر کم رُوئی کو دفع کر دیا جائے تو لازمی طور سے خوش روئی و خوبصورتی پیدا ہو جائے گی۔ وہ شاید اس پر غور نہیں کرتے کہ کم روئی، خوش روئی و خوبصورتی کی نہیں بلکہ معروف خط و خال کی تکمیل کی ضد واقع ہوئی ہے۔ اور خوبصورتی ہمیں اس وجہ سے متاثر کرتی ہے کہ وہ معروف خط و خال سے مختلف ہوتی ہے۔

خوبصورتی کی حقیقی ضد بدصورتی و بدہیئتی ہوتی ہے، نہ کہ کم روئی کم روئی تو صرف ایک برزخ یا خطِ فاصل شے ہے، جو جذبات کے متاثر کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیتی۔

مطابقت و موزونی یا افادیت سے بھی جمال نہیں پیدا ہوتا —— کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ موزونی یا افادیت سے جمال پیدا ہوتا ہے تو پھر لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ دھنسی ہوئی سی بے نور آنکھوں والی بط کی آنکڑے کے شل چونچ جو زمین کھودنے اور کیچڑ میں ڈوبنے کے واسطے نہایت ہی مفید و موزوں واقع ہوئی ہے، یا سور کی تھوتھنی جو اسے غذا حاصل کرنے میں بہت مدد دیتی ہے حسن و جمال کے شاہکار کے سوا اور کچھ نہیں۔

بعض جانور ایسے بھی ہیں جن کے اعضا کی ساخت بندر سے کمتر درجہ کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بندر سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

معدہ اور جگر دونوں اپنے وظائف کے تکملے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ پھر بھی انھیں خوبصورت کون کہہ سکتا ہے؟

تناسب و توازن کو دیکھ کر توصیف و تحسین کا جذبہ تو ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن محبت پیدا نہیں ہوتی۔

مزید براں تکمیل کو بھی جمال کا خالق نہیں کہہ سکتے —— کیونکہ انتہائی جمال جس کا صنفِ نازک میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے اندر ناتمامی و ناتوانی کے تصورات رکھتا ہے۔

نفس انسانی کو جو اوصاف اس قدر محبوب ہیں کہ دل ان کی جانب کھنچتا رہتا ہے وہ آبگینے کی طرح شفاف نازک اور پھولوں کے شل رنگین و ملائم اوصاف ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ فرحت کی حریم ناز میں ہم بلند اوصاف احباب کے عوض، رنگین اور نازک رفیقوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

اسی پر قیاس کر کے خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ حسن کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟

جمال اپنے کو مختصر اشیا کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔

ہر زبان میں حدیث جمال، مختصر، رنگین اور ملائم الفاظ ہی

دوہرائی جاتی ہے۔

تحسین و توصیف، اور عشق و محبت میں بہت بڑا فرق ہے ــــ ہم جلال کی تحسین اور جمال سے محبت کرتے ہیں۔ جلال کا عظیم و دہشتناک چیزوں سے تعلق ہوتا ہے۔ اور جمال مختصر، ملائم اور لذت آفریں چیزوں میں پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ہر قابلِ محبت وجود میں صفائی، چکنا پن، نرمی، لچک اور لوچ، وہ اوصاف ہیں جو کبھی اور کسی حالت میں بھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔

درختوں کی کونپلیں، وادیوں کی ڈھالیں، جنگلوں کی ندیاں، چڑیوں کے پر، ہیرے کے تراشے ہوئے نگینوں کی سطح، اور حوا کی لڑکیوں کے رخسار کی جلد ــــ ان میں کون سی ایسی چیز ہے، جو صاف، ملائم، چکنی اور نرم نہیں ہوتی؟ اور اسی طرح ہرے بھرے پودے، کلیلیں کرتے ہوئے آہوانِ وحشی، اور "خودی کہ خرام و خود از دست می رود" کی ادا سے اٹھلاتے ہوئے شاہدانِ گل پیرہن، ان میں سے کون ہے جس میں بلا کا لوچ اور قیامت کی لچک نہیں پائی جاتی؟۔

حسین و جمیل اجسام کے اجزا کبھی زاویوں میں تقسیم نہیں ہوتے اور نہ اُن کے حصے خطوطِ مستقیم کی طرح ایک ہی سمت میں بڑھتے ہوئے پائے جاتے ہیں، بلکہ اس کے برخلاف وہ ہر آن اپنا رخ بدلتے، اور ہر لحظہ تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قوت اور شہ زوری کی اگر ادنیٰ سی جھلک بھی پیدا ہو جائے تو جمال تباہ ہو جاتا ہے،

جمال تو وہ شے ہے جس کی جلو میں نازکی و نرمی ہی نہیں، اک نوع کی نقاہت بھی ہوتی ہے، اور نقاہت کے اندر ایک ایسی جھلکتی ہوئی نیم غم آلودہ مسکراہٹ پائی جاتی ہے، جو دلوں کو آنِ واحد میں توڑ ڈالتی ہے۔

اب رہا محبوب وجودوں کا رنگ ـــ ڈوب، سوائے کسی حالت میں بھی خاکی، یا مکدر نہ ہونا چاہیے، محبوب شے کے رنگ میں صفائی اور تابانی ضروری شے ہے۔ لیکن اس کی تابانی میں شدت و شوخی کے عوض ایک ایسی آن ہونا چاہیے جسے ملائم اور نیمی روشنی کہا جاتا ہے۔

اگر کہیں رنگ میں شوخی و شدت کا عنصر آگیا ہے تو اس میں نرمی اور سٹھاس کو اس تناسب سے سمویا ہوا ہونا چاہیے کہ رنگ کی شوخی و شیرینی کے امتزاج میں اس کا اندازہ ہی نہ ہونے پائے کہ کونسا عنصر کم، اور کون سا زیادہ ہے۔

(۵)

اسبابِ جمال

جمال و جلال میں ایک نمایاں تقابل پایا جاتا ہے ـــ لیکن کبھی اور کسی عالم میں بھی ایک دوسرے کی ضد واقع نہیں ہوسکے ہیں۔ اور گاہ گاہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک ہی چیز میں جلوہ فروشی کرتے ہیں۔

جہاں تک ان کے اسباب و علل کا تعلق ہے اُن کی حقیقتِ آخر کے سمجھنے میں ہماری کوئی سعی بھی مشکور نہیں ہو سکتی، پھر بھی ہم بعض قریبی اسباب و علل کا پتا ضرور چلا سکتے ہیں۔

خوف یا کرب کے موقع پر اعصاب کا غیر فطری تشنج، شعورِ جلال کا سرچشمہ ہوتا ہے، اور یہ غیر فطری تشنج اس موقع پر بھی رونما ہو سکتا ہے جب جسم اور چہرے کے ذریعے سے خوف یا الم کے جذبات کی نقالی کی جاتی ہے۔

انسانی جذبات، اعصابی و جسمانی تبدیلیوں سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

دہشت کے موڈ (MOOD) یا ذہنی کیفیت کو نظامِ جسمانی کے نازک اجزا کی اُس ورزش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جو اُن اجزا کو تکلیف دہ بار سے سبکدوش کر کے ضمنی طور سے نشاط کا باعث ہو جاتی ہے؛

بینائی و وسعت، آنکھوں کے اعصاب پر دباؤ ڈال کر شعورِ جلال کو بیدار کرتی ہے۔ اور اس مصنوعی لامحدودیت کے جلال کے موقع پر بھی جو مرئی اشیا کے تواتر کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں رونما ہوتی ہے۔

ہم جسمانی توجیہ ہی کو پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں، تاریکی بھی تذکرہ بالا سبب ہی سے دہشتناک معلوم ہوتی ہے۔ ہم سب جانتے

ہیں کہ جب روشنی باقی نہیں رہتی تو آنکھ کا تل پھیل جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جب تاریکی شدید ہو جاتی ہے تو ہم ایک اعصابی تشنج میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہر صورت میں شعورِ جلال، اعصابی کیفیات کرب ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور صرف جلال ہی نہیں بلکہ شعورِ جمال کا سرچشمہ بھی ایک ایسے ہی اعصابی سلسلے کے اندر مستور رہتا ہے۔

جمال سے بھی انسانی جسم، جلال ہی کی طرح متاثر ہوتا ہے کیونکہ جس وقت کوئی حاصل جمال و دلربائی منظر ہمارے پیش نظر ہوتا ہے تو ہم اپنے تمام جسم کے اندر ایک عجیب آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ ایسی آسودگی جو ایک اندرونی عشرت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔

اس سے نتیجہ نکالنے پر ہم مجبور ہیں کہ جمال، تمام نظامِ جسمانی میں ایک ترقی پیدا کر دیتا ہے۔

نقاشی میں خطوط کا مناسب اتار چڑھاؤ اور رنگوں کی لطیف شوخی جو جمال کے واسطے موزوں ہے، ہمارے شعور کو لوریاں دے کر لذت کے خواب نوشیں سے سرشار کر دیتی ہے۔

آخر میں ان الفاظ کے اثر کی جانب رجوع ہونا چاہیے جو جذباتِ جلال و جمال کا اظہار کرتے ہیں۔

عام طور سے یہ بات مسلم ہے کہ الفاظ کی قوت کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ جس مفہوم کے واسطے استعمال کئے گئے ہوں، سامع کے دل میں اس مفہوم کا صحیح تصور پیدا کر دیں۔ لیکن یہ مسلمہ خیال "خیر" اور "احترام" کے سے الفاظ پر صادق نہیں آتا، کیونکہ ان الفاظ کو سن کر کسی کے دل میں وہ نمایاں تصورات نہیں پیدا ہوتے جن کی یہ الفاظ نمایندگی کرتے ہیں۔ اس موقع پر یہ الفاظ ایک اثر انگیز آواز تو ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن ان کے اندر جو مفہوم پنہاں ہے اس کی نمایندگی کے حق سے عہدہ برآ نہیں ہوتے۔

لفظ سامع پر تین قسم کے اثر ڈال سکتا ہے — آواز۔ تصویر۔ روحانی تاثر۔ لیکن "عزت" اور "آزادی" کے سے الفاظ ان تین قسم کے اثرات میں سے صرف دو، یعنی پہلا اور تیسرا اثر تو پیدا کرتے ہیں لیکن دوسرا اثر پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس کے برخلاف "نیلا" "پیلا" "ٹھنڈا" اور اس سے بھی زیادہ "گھوڑا" اور "آدمی" کے الفاظ ہیں، جو ہرچند تینوں اثرات تو ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن ان کا عام اثر، ان کی تصویر سازی سے پیدا نہیں ہوتا۔

شاعرانہ تخیل کی قوت اس امر پر مبنی ہوتی ہے کہ شاعر کے الفاظ کی آواز فی الفور روح میں ایک تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔

غور فرمایئے ملٹن کے مندرجہ ذیل اشعار کی قوت کا سرچشمہ کیا ہے، جس میں اس نے اُن فرشتوں کے سفر کا حال بیان کیا ہے جو اپنے وطن سے نکل کر اِدھر اُدھر آوارہ پھر رہے ہیں۔

"کتنے ہی تاریک اور ہولناک غاروں سے۔ کتنی ہی اُداس سرزمینوں سے۔

کتنے ہی یخ بستہ، اور آتش فشاں پہاڑوں سے، کتنی ہی چٹانوں، جھیلوں دلدلوں۔ گڑھوں، کیچڑوں اور غاروں سے۔

اور کتنی ہی روح فرسا پرچھائیوں کے اندر سے، اُن غریب فرشتوں کو گزرنا پڑا۔

ہیبت کا ایک کرۂ جلیل! موت کی ایک کائنات عظیم!!"

حقائق

سامانِ قیامِ زندگی لایا ہوں
مضبوط نظامِ زندگی لایا ہوں
اے ملکِ اجل گزشتہ اے شورشِ بد
خوش ہو کہ پیامِ زندگی لایا ہوں

(آزاد انصاری)

نیند

حکیم رضوان احمد

منی کے رسالہ میں محمد یوسف صاحب کشور کا ایک مضمون اسی موضوع پر شائع ہوا تھا، مندرجہ ذیل مضمون حکیم خواجہ رضوان احمد صاحب پروفیسر طبیہ کالج دہلی نے تحریر فرمایا ہے، چونکہ آپ کے نزدیک مذکورہ بالا مضمون غلط بیانیات پر مبنی تھا۔ اس لئے آپ نے اس مضمون میں نیند کی صحیح حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ ایڈیٹر

نیند کی تعریف

حیوان کی وہ حالت ہے جس میں نفس بیرونی حواس اور اختیاری حرکات سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی نیند میں حیوان کی روح نفسانی (وہ روح جس کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے اور حیوان میں اسی کے ذریعہ جملہ اقسام کے احساس اور تحریکات رونما ہوتی ہیں) تمام اعضاء سے واپس ہو کر دماغ میں چلی جاتی ہے۔ لہٰذا وقتی طور پر جملہ تحریکات و احساسات بند ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسی تحریکات جن کے بغیر حیوان کی زندگی ناممکن ہے، باقی و جاری رہتی ہیں۔ مثلاً تنفس کے حرکات۔ قلب کی تحریکات، معدہ و آنتوں کی حرکت دودیہ وغیرہ۔

نیند کی ضرورت

دنیا کا یہ قانون چلا آرہا ہے کہ جس جاندار شے میں حرکت موجود ہو، اُس کو آرام و سکون کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر اس میں حرکت ہی حرکت جاری رہے تو وہ شے بہت جلد کالعدم ہو جائے۔ لیکن اگر حرکت کے ساتھ ساتھ مناسب سکون بھی موجود ہو تو پھر اُس کا قیام ایک عرصہ تک رہ سکتا ہے، اسی اصول کے ماتحت حیوان کی نیند بھی ہے کہ جب جاندار ایک عرصہ تک تھک جاتا ہے تو پھر آرام و سکون کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً جب عضلات زیادہ دیر تک کام کرتے ہیں تو اُن کی حرکت بند کرکے آرام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جب دماغ زیادہ دیر تک کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اُس کو بھی آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ جب آرام کرتا ہے تو اُس کو نیند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ تبلا دینا بھی ضروری ہے کہ نیند سے صرف دماغ ہی اپنا بدل ماتحلل حاصل نہیں کرتا، بلکہ جسم بھی نیند سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ جس کو ہم آئندہ چل کر بیان کریں گے۔ اس طرح پر ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ **نیند جاندار مخلوق کے لئے بقا و صحت کا ذریعہ ہے** یہی وجہ ہے کہ جب انسان دن بھر محنت و مشقت کرنے کے بعد رات کو آرام سے سو رہتا ہے تو صبح کو بالکل تازہ دم ملتا ہے۔ اور ان کاموں کو نہایت آسانی و سہولت کے ساتھ انجام دے سکتا ہے جو اُس کی معاشرت کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے وہ آرام نہ کر سکے تو پھر دماغی و جسمانی امراض کا شکار ہونا ضروری و لابدی ہے جس کی طرف ہم آئندہ اشارہ کریں گے۔

نیند کے فلسفہ کو آپ اس طرح پر سمجھ سکتے ہیں کہ جب تک اعضاء حرکت کرتے رہتے ہیں تو جو اجزاء غذائیہ ان میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ

برابر خرچ ہوتے رہتے ہیں۔ اگر یہ حرکت برابر جاری رہے، تو ایک وقت ایسا آئے گا جبکہ عضو میں کوئی غذائی حصہ باقی نہ رہے گا۔ اور ممکن ہے کہ یہ وقت موت عضو سے تعبیر کیا جاسکے۔ برخلاف ازیں جب اس متحرک عضو کو سکون و آرام نصیب ہوتا ہے تو اس عرصہ میں آس پاس کے اعضار سے غذائی حصّوں کو جذب کرکے کچھ اپنی غذا میں صرف کرکے تازہ دم ہوجاتا اور کچھ کو بطور ذخیرہ اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔ اگر یہ تناسب نہ ہو تو پھر رفتہ رفتہ تغذیہ اور پرورش میں کمی پیدا ہونی شروع ہوجائے گی۔ اسی لحاظ سے محققین نے اندازہ لگایا ہے کہ نیند چوبیس گھنٹہ میں چھ گھنٹے (¼ حصہ) ضروری ہے۔ ہاں اس میں موسم اور مزاجی اعتبار سے کسی قدر کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً بچوں میں نشوونما اور پرورش کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ان میں چھ گھنٹہ کافی نہیں ہوتے، بلکہ وہ تقریباً دس گھنٹے آرام کرکے جسم میں افزائش اجزار کرتے ہیں۔ اور بوڑھے بلغم شور اور گلے کی خراش کے باعث زیادہ دیر نہیں آرام کرسکتے چنانچہ وہ بالعموم ۴ سے پانچ گھنٹے تک سوتے ہیں۔

انسان کے جسم پر اگر آپ غور کریں تو بعض اعضار دن رات کام کرتے ہوئے پائیں گے۔ مثلاً قلب ہر وقت کام کرتا ہوا ملے گا۔ اور عضلات تنفس ہر وقت حرکت کررہے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ ان پر غور سے نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قلب سولہ حصوں میں سے آٹھ حصے آرام کرتا ہے اور آٹھ حصے حرکت کرتا ہے۔ جس کا اندازہ ذیل کے نقشے سے بآسانی ہوجائے گا۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹							
پہلی آواز					پہلا وقفہ	دوسری آواز			دوسرا وقفہ						

اگر آپ قلب پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں تو آپ کو دو حرکات معلوم ہوں گی جن میں سے ایک کو پہلی آواز جو سولہ حصّوں میں سے تین درجے لیتی ہے اس کے بعد معمولی وقفہ ہوتا ہے، جو ایک درجے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری آواز تین درجے اور دوسرا وقفہ سات درجے کا ہوتا ہے جس کو اس طرح واضح کیا جاسکتا ہے۔

پہلی آواز $\frac{۵}{۱۶}$ دوسری آواز $\frac{۳}{۱۶}$

پہلا وقفہ $\frac{۱}{۱۶}$ دوسرا وقفہ $\frac{۷}{۱۶}$

یہی حال عضلات تنفس کا بھی ہے کہ وہ بہ نسبت قلب کے پانچ گنا زیادہ آرام کرتے ہیں۔

نیند کیوں پیدا ہوتی ہے؟

اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اس کی ساخت پر طائرانہ نظر ڈال لی جائے، چنانچہ ماہرین منافع الاعضار (   ) نے بتلایا ہے کہ انسان کا جسم نہایت چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنا ہوا ہے جن کو ایک خاص قسم کا مادہ آپس میں ملائے ہوئے ہے۔ اب چونکہ انسانی جسم میں مختلف قسم کے نظام موجود ہیں اور ہر ایک علیحدہ علیحدہ اپنا کام انجام دیتا ہے۔ مثلاً گوشت کے ذرّے آپس میں مل کر عضلات بناتے اور حرکت پیدا کرتے ہیں۔ خونی ذرّات ہر ایک جگہ پہونچ کر تغذیہ بدن کرتے ہیں۔ اعصابی ذرات عضلات کے اندر حرکت پیدا کراتے ہیں۔ چونکہ نیند پیدا کرنے میں ہمیں ان تین ہی نظاموں سے بحث کرنی ہے، لہذا ہم بقیہ نظام جسم کو علیحدہ کرکے ان ہی پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں، تاکہ نیند کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہوجائے۔

۱- نظام عضلات

عضلات کے اگر کسی حصّے کو باریک سے باریک کاٹ کر خوردبین میں دیکھا جائے تو ذرات کی نہایت منظم دیوار معلوم دے گی۔ اب اگر یہ ذرات عالمِ حیات میں ہیں تو ان میں انقباضی و انبساطی کیفیت بھی موجود ہوگی اور یہی سکڑنے و پھیلنے والی طاقت قوی ہوکر ہماری بدنی تحریکات کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

۲- نظام اعصاب

عصبی نظام کے دو حصے ہیں۔ ایک مرکزی اور دوسرا محیطی۔ مرکزی نظام میں دماغ۔ حرام مغز اور چھوٹی چھوٹی گرہیں شامل ہیں۔ یہ گرہیں زیادہ تر احشار صدر و بطن میں پائی جاتی ہیں محیطی نظام میں وہ باریک باریک شاخوں کا جال شریک ہے جو ان تینوں حصوں سے نکل کر تمام جسم میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ نظام بدن میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اگر اس میں

ذرا سی بھی خرابی پیدا ہو جائے تو پھر بدنی امور کا پورا ہونا نہایت دشوار و مشکل تر ہو جائے۔

اس نظام کے مرکزی حصے کے ذروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا جیسے کہ چند شلغم آپس میں ملا کر رکھ دئے گئے ہیں شلغم کا ایک حصہ پتوں والا ہوتا ہے جو زمین سے باہر ہوتا ہے اور دوسرا مدخون اور موٹا ہوتا ہے۔ اس موٹے حصے کے آخری سرے پر اگر غور کیا جائے تو ایک باریک نوک سی آخر میں نکلی رہتی ہے۔ یہی نوک زمین اپنے ریشے پھیلا کر قیام و بقا کا باعث بنی رہتی ہے۔ یہی حال ہمارے دماغی، نخاعی اور عقدی ذروں کا بھی ہوتا ہے۔ ان ذروں کا بالائی حصہ آپس میں مل کر جال بناتا ہے۔ اور زیریں حصے سے جو نوک برآمد ہوتی ہے وہی آخر میں پٹھے کی شکل اختیار کرتی ہوئی تمام جسم میں پھیل جاتی ہے۔

پٹھوں کی تعداد ہمارے جسم میں اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ہم ان کو شمار میں نہیں لا سکتے۔ لیکن وہ بہ حیثیت افعال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ان میں گرمی و سردی، درد و تکلیف، اور لمس کے فعل کو انجام دیتا ہے اور دوسرا اعضا میں ان احساسات کے مطابق حرکت پیدا کراتا ہے۔ ان میں سے پہلے کو عصب حس اور دوسرے کو عصب حرکت کہتے ہیں۔ عصب حس کا کام یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے بدن کی جلد اور دیگر اعضا پر وارد ہو۔ اُس کی کیفیت دماغ کو پہنچاتا رہے۔ اور جب یہ کیفیت دماغ پر کسی قسم کا اثر پیدا کر کے حرکت کرنی چاہے تو اعصاب حرکت کے ذریعہ عضلات کو سکیڑ دے یا پھیلا دے جیسا کہ تصویر سے ظاہر ہوتا ہے۔

نظام عصبی عضلات کے ہر ایک ریشے میں پھیل کر سکیڑنے اور پھیلانے کا کام انجام دیتا ہے، اور رگوں میں پھیل کر اُن کے قطر کو کم و بیش کر کے خون کی مقدار کو گھٹاتا بڑھاتا رہتا ہے۔

۳۔ نظام دموی

یہ بھی ہمارے بدن کے ہر ایک حصہ میں پھیل کر اُس کی پرورش کرتا رہتا ہے۔

نظام عصبی پر جو کچھ بھی وارد ہوتا ہے ان سب کی اطلاع اعصاب حسیہ کے ذریعہ دماغ کو ہوتی رہتی ہے اور اسی کے ماتحت مناسب حرکات سطح بدن پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ عصبی ذرات ایک وقت تک کام کرنے کے بعد تھک جاتے یا جمع شدہ طاقت کو صرف کرنے کے بعد دوبارہ طاقت پیدا کرنے کے لئے آرام و سکون کے طالب ہوتے ہیں، اور جس وقت یہ آرام و سکون کے عالم ہوتے ہیں، یعنی دماغ کی طرف نہ کوئی حس جاتی ہے اور نہ وہاں سے حرکت واپس آتی ہے تو اسی کو عرف عام میں نیند کہا جاتا ہے

اس اصول کے ماتحت اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جو افراد ان ذرات سے شدید کام لیتے ہیں ان کو زیادہ مکمل آرام و سکون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو فرد دن بھر ورزش کر کے رات کو سوتے ہیں اُن کو بہت زیادہ گہری نیند آتی ہے پھر مذکورہ بالا اصول کے مطابق چونکہ ذرات نیند کے ابتدائی حصہ میں زیادہ تھکے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے ان کی نیند اول حصہ میں گہری ہوتی اور بعد میں چونکہ ذرات تھوڑی تھوڑی طاقت اور حس و حرکت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے نیند بھی کم گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور جس وقت کھوئی ہوئی طاقت مکمل طور سے واپس آجاتی ہے تو انسان معمولی تحریک سے بیدار ہو جاتا ہے۔

نیند پیدا ہونے کا صحیح اصول یہی ہے اور اس پر جب ہم اختیاری طور سے بھی عمل درآمد کریں مثلاً ایک عرصہ تک چپ چاپ آنکھیں بند کئے اندھیرے میں لیٹے رہیں اور اعصاب بھی کچھ تھوڑے بہت تھک چکے ہوں تو نیند آنی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اعصاب بالکل نہ تھکے ہوں تو پھر ہم چاہے کتنی ہی دیر آنکھ بند کئے ہوئے لیٹے رہیں مگر نیند نہیں آئے گی۔

نیند کے متعلق مختلف نظریات

اور دماغ میں خون کی کمی کے متعلق چند دلائل

حکمائے قدیم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب انسان کے دماغ میں خون کی کمی پیدا ہو جاتی ہے تو بے ہوشی لاحق ہوتی ہے اور اگر خون کی زیادتی ہوتی ہے تو سبات یا نیند پیدا ہوتی ہے، اسی لئے وہ خیال کیا کرتے تھے کہ نیند کی حالت میں دماغ کے اندر خون کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور اس پر یہ دلیل دیا کرتے تھے کہ سونے میں چونکہ کھانا ہضم ہو کر خون بن جاتا ہے لہذا خون کی مقدار یقینی طور پر بدن میں بڑھ جاتی ہے جس کا اثر دماغ پر بھی پڑتا ہے مگر متاخرین نے اس خیال کو غلط قرار دیا اور بتلایا کہ دماغ میں خون کی آمد

دو اغراض پوری ہوتی ہیں اولاً دماغ کی پرورش، دوئم اپنی موجودگی سے ذرات دماغ میں یہ طاقت پیدا کرنا کہ وہ اپنے افعال پورے طور پر انجام دے سکیں۔ اب آپ غور کریں کہ نیند میں چونکہ ذرات کوئی کام نہیں کرتے اس لئے مزید خون کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری دلیل خون کی کمی پر یہ ہے کہ نیند بالعموم کھانا کھانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جس میں دماغ کے اندر خون کی مقدار کم ہونا ضروری ہے۔ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جب انسان غذا چبانے کے لئے منہ میں حرکت پیدا کرتا ہے تو اس تحریک سے جبڑوں کے قرب وجوار میں دورانِ خون کی زیادتی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ اصول کلیہ میں سے ہے کہ جو عضو زیادہ حرکت کرے گا اُس میں خون کی مقدار زیادہ ہو جائے گی۔ پھر جب غذا منہ سے معدہ اور امعاء میں چلی جاتی ہے تو وہاں پر اُس کی تحریکات کو قائم رکھنے کے لئے خون کا زیادہ ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ خون کی مقدار کا تناسب بدن میں اوسطاً ایک ہی رہتا ہے۔ لہذا زیریں مقام پر خون کی زیادتی بالائی مقام کی کمی مقدار کا باعث بن جاتی ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ جب ہم غذا چباتے ہیں تو منہ میں رکھی ہوئی گلٹیاں ایک قسم کی رطوبت خارج کرتی ہیں جس کو تھوک کہتے ہیں۔ اس رطوبت کا اگر کیمیاوی طریقہ پر امتحان کیا جائے تو یہ کھار ہوتی ہے۔ یہ کھاری حصہ جب معدہ میں پہونچتا ہے تو معدہ کی سطح پر ایک خاص قسم کا خراش پیدا کرتا ہے جس سے مقامی گلٹیاں تیزابی رطوبت بنا کر معدہ میں خارج کیا کرتی ہیں اور وہ تیزاب اس کھار کو باطل کر کے اپنا عمل ہضم جاری کرتا ہے۔ اب آپ غور کریں کہ یہ رطوبات سوائے خون کے کسی دوسرے حصہ سے حاصل نہیں ہوتیں اور جب تک خون کی مقدار یہاں پر زیادہ نہ ہو اس وقت تک ڈیڑھ دو سیر رطوبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ تیزابی رطوبت آنتوں میں پہونچکر کھاری سیال پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ جس کا اخراج بھی خون ہی سے ممکن ہے۔ اس طریقے سے بھی آپ کو معلوم ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد جو نیند پیدا ہوتی ہے اس میں دماغ کے اندر خون کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ جو نیند تھکاوٹ کے باعث پیدا ہوتی ہے اُس میں بھی دماغ کے اندر خون کی مقدار کم ہو جانی لازمی ہے، اس لئے کہ شریانوں میں پھیلنے والے اعصاب جب کام کرتے کرتے تھک جاتے اور سست پڑ جاتے ہیں تو رگوں کے عضلی ریشے ڈھیلے ہو کر عروق کو پھیلا دیتے ہیں جس سے خون ثقل نوعی کے باعث نیچے کی طرف چلا آتا ہے۔ پانچویں دلیل یہ ہے کہ ایک شخص ایام طفولیت میں سر کے بل گر گیا اور سر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لیکن اس پر جلد کا استخارہ موجود رہا۔ یہ شخص جب سوتا تھا تو اُس کی جلد اندر کو پچک جاتی تھی جس سے معلوم ہوا کہ مقامی دورانِ خون میں کسی قدر سستی پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر اُس کا تجربہ نہایت آسانی کے ساتھ ان بچوں میں بھی کیا جا سکتا ہے جن کے سر کا تالو ابھی تک ہڈی میں تبدیل نہ ہوا ہو۔ ان میں اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت و سرعت کے ساتھ عالم بیداری میں عریانی کیفیت معلوم ہوتی ہوتی ہے اتنی طاقت و رفتار کے ساتھ خواب کی حالت میں نہیں پائی جاتی جو مقامی دورانِ خون کی کمی کا بیّن ثبوت ہے۔ چھٹی دلیل یہ ہے کہ محققین نے مقیاس الکثافۃ (اعضاء میں دورانِ خون کی کمی وبیشی کو معلوم کرنے والا آلہ) کے ذریعے ایسے شخص کے سر کا دورانِ خون معلوم کیا جو نہایت گہری نیند سو رہا تھا۔ پھر اس دورانِ خون کا اندازہ اُس شخص کو نیم بیدار کر کے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ گہری نیند کے وقت خون کی مقدار زیادہ تھی، اور جونہی اُس کو پریشان کیا گیا تو خون کی مقدار میں کمی پیدا ہو گئی اس سے معلوم ہوا کہ نیند سے جوں جوں محرکۃ العروق اعصاب کے مراکز طاقتور ہوتے گئے اور اعصاب میں شریان کو سکیڑنے کی طاقت پیدا ہوتی گئی۔ ویسے ویسے زیریں دورانِ خون میں کمی پیدا ہوتی گئی۔ اس تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دماغ میں خون کی جو کمی پیدا ہوتی ہے وہ نیند کے اسباب سے نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ سونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ہاول کا خیال ہے کہ جو نیند شکم سیر ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ کیمیاوی تحریک کے باعث پیٹ کی رگیں پھیل کر احشا میں خون کی مقدار کو زیادہ کر دیتی اور دماغ میں کم کر دیتی ہیں، اور تھک جانے کے بعد جو نیند پیدا ہوتی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ اعصاب محرکۃ العروق کے مرکز تھک جانے سے جلدی وسطحی عروق پھیل کر یہاں کے خون میں زیادتی کر دیتی ہیں۔ اور اس زیادتی سے دماغی خون میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر روبرسس ٹینر

نے نیند کا سبب کیمیاوی نظریہ بیان کیا ہے، چنانچہ وہ تحریر کرتا ہے کہ

بیداری کے عالم میں بعض ایسے تیزابی مادے پیدا ہوتے ہیں جو دماغ پر منوم
اثر ڈالتے ہیں۔ برخلاف ازیں نیند کے عالم میں ایسے کھاری مادے پیدا
ہوتے ہیں جو دماغ میں نیند پیدا نہیں ہونے دیتے۔ لیکن یہ خیال صرف نظریہ
کی حد تک ہی ہے۔ تجربات کی کسوٹی پر اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

ڈاکٹر گولگی

نے نیند کا نسیجی نظریہ پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جب انسان کو کلوروفارم
وغیرہ عصبی مخدر اشیا رسے بے ہوش کیا جاتا ہے اور اس کے اعصابی ذرّے
کو بغور دیکھا جاتا ہے تو وہ عالم بیداری سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت

ڈاکٹر ڈیمور

نے جانوروں کو کافی عرصہ تک کلوروفارم کے ذریعے بے ہوش رکھ کر عصبی
ذروں کا خوردبینی امتحان کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ذرے گرہوں میں تبدیل
ہوگئے تھے۔ اس چیز کا جب پورا تجربہ کرلیا گیا تو نیند کا ایک خاص نسیجی نظریہ
بن گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ بیداری کے عالم میں اعصاب ایک
دوسرے سے ملے رہتے اور عصبی احساسات و تحریکات کو ایک کیسے سے دوسرے
کیسے میں تبدیل کرتے رہتے ہیں جس سے خیالات وافعال برابر پیدا ہوتے
رہتے ہیں۔ لیکن سونے کی حالت میں یہ جال بالکل علیحدہ علیحدہ ہوجاتا ہے، اور
اُس کی وجہ سے عصبی ذرے علیحدہ ہوکر خیالات وافعال پیدا نہیں ہونے
دیتے۔

ڈاکٹر لوگارو

مذکورہ خیال کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مخدر اشیا رعصبی ذروں
کو گرہوں میں تبدیل نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ اُسے بے ہوش جانوروں میں اس
چیز کا پتہ ہی نہ چلا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نیند کی حالت میں عصبی ذرات کا جال
ذروں کے زیادہ موٹے ہوجانے کی وجہ سے زیادہ گھنا ہوجاتا ہے اور
اندرونی راستے زیادہ کشادہ ہونے سے عصبی ذرے علیحدہ علیحدہ ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہملٹن رائٹ

نے خرگوش اور کتوں کو ایتھر اور کلوروفارم کے ذریعے آدھ گھنٹے سے نو
گھنٹے تک بے ہوش رکھا۔ دورانِ عمل میں خرگوش جلد بیہوش ہوگیا اور
کتا بہت بعد بیہوش ہوا۔ بیہوش ہونے کے بعد جب عصبی ذرات کا امتحان
کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خرگوش کے ذرات آدھے گھنٹے میں متغیر ہوگئے اور کتے
میں چار گھنٹے کے اندر وہ تغیر پیدا ہوا۔ اس کے بعد اُس نے ڈاکٹر گولگی
کے طریقہ پر عصبی ذرات کو الگ کرکے دیکھا تو اُس کو چھوٹے چھوٹے عصبی ابھار
دکھائی دیتے۔ اور جس قدر زیادہ دیر تک جانور کو بیہوش رکھا گیا اُسی قدر
یہ اُبھار بڑے ہوتے گئے۔ حتی کہ نو گھنٹے تک مسلسل بے ہوش رکھنے کے بعد
جب مخدرات کا اثر ہٹا لیا گیا تو یہ گرہیں رفتہ رفتہ پتلی پڑنی شروع ہوگئیں۔
اور جب اُس کا اثر بالکل زائل ہوگیا تو ذرات بھی اپنی طبعی حالت پر واپس
آگئے۔

زیادہ سونا عقل کو خراب اور کند کر دیتا ہے

اس نظریہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب عصبی ذرّے پھول کر گرہ دار
ہوجاتے ہیں تو وہ اپنا طبعی فعل انجام دینے کے لائق نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے
کہ جب انسان زیادہ سوتا رہتا اور کاہلوں کی طرح پڑا رہتا ہے تو اُس کے
خیالات موٹے ہوکر صحیح فعل انجام نہیں دیتے۔ اور وہ بلید العقل اور کند ذہن
ہوجاتا ہے۔

کلوروفارم سے بیہوشی کیوں پیدا ہوتی ہے

ڈاکٹر مورا اور رروف کا خیال اس بارے میں یہ ہے کہ جب انسان
کو کلوروفارم سونگھایا جاتا ہے تو وہ عصبی ذرات کے مواد زلالیہ (پروٹین)
پر اثر کرتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ تنفس کے ذریعہ کلوروفارم پھیپھڑے
کے خون میں شریک ہوتا اور ذرات خون کے مواد زلالیہ کے ساتھ مل کر ایک
نازک قسم کا مرکب بناتا ہے۔ یہ مرکب جب دورانِ خون کے ذریعے عصبی
ذرات میں پہونچتا ہے تو اُس کے مواد زلالیہ میں مل کر افعال کو سست
وبیکار کرنا شروع کردیتا ہے۔ پھر کیمیاوی طریقہ پر تجربہ کرنے سے یہ ثابت
ہوچکا ہے کہ کلوروفارم بہ نسبت پانی کے خون میں بہت جلد حل ہوجاتا
ہے جس کی تصدیق مسٹر اورٹن نے بھی کی ہے وہ کہتا ہے کہ اڑنے والے
مخدرات کو چربی دار مادہ بہت جلد جذب کرلیتا ہے یا یہ مخدرات اُس

مادے میں جلد جذب ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہی ہے کہ جسم انسان کے ہر ایک ذرے میں چربی دار مادہ کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ مخدر چیز خون کے ذریعہ عصبی ذرات تک پہونچتی ہے تو وہ عصبی ذرے میں جذب ہونا شروع ہو جاتی ہے، اور اسی اعتبار سے ذرہ میں انتفاخی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ حتی کہ وہ اپنی مقدار سے بہت زیادہ پھول جاتے ہیں۔ اگر کلوروفارم ان ذرات کے پھول کر پھٹنے سے پیشتر بند کر دیا گیا تو چربی دار مادہ اس شئے کو جلد جلد اپنے اندر سے خارج کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حتی کہ جب اُس کا اثر قطعی زائل ہو جاتا ہے، تو خلیہ بھی اپنی اصلی حالت پر لوٹ آتا ہے۔ لیکن اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ ذرہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کا اثر محیطی کناروں پر پڑتا ہے جس کی مثال اس درخت کی سی ہوتی ہے کہ جس کی جڑ کو آبپاشی نہیں ہوتی اور اُس کی انتہائی شاخیں کمہلانا اور مرجھانا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اعصاب بھی مرکز کے خراب ہونے سے بیرونی طور پر وارد ہونے والے اجزا کا احساس نہیں کرتے، اور جب مکمل طور پر احساس نہیں ہوتا، تو پھر اس کو ہم کامل بے حسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی حالت ہماری نیند میں بھی ہوتی ہے کہ دن بھر کی تھکن سے جو خلیات پھول جاتے ہیں اُن میں احساس کی طاقت کم ہو جاتی ہے، اور جس درجہ کی انتفاخی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی درجہ کا احساس بھی باطل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ حضرات نے دیکھا ہوگا کہ جو افراد دن بھر شدید محنت کرتے ہیں اُن کو نیند میں معمولی چیزوں کا احساس قطعی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ریل و موٹر جیسی شدید آوازیں انسان کو بیدار کرنے کے لئے ناکافی ہوتی ہیں۔ بعض افراد کے متعلق تو یہ بھی سنا گیا ہے کہ میدانِ جنگ میں توپوں کی آوازوں کے اندر وہ اپنی نیند کو پورا کر لیتے تھے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اعصاب کے مراکز نیند اور بے حسی میں معطل ہو جاتے ہیں تو پھر قلب و تنفس کے حرکات کیوں باقاعدہ جاری رہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ محققین نے اس بارے میں بہت زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔ لیکن یہاں پر اس قدر بتلا دینا کافی ہے کہ قلب کے ریشوں کی ترکیب ایسی نوعیت سے رکھی گئی ہے کہ اگر کسی ایک ریشے میں تحریک پیدا ہو جائے تو پھر تمام ریشوں کا متحرک ہونا ضروری ہے۔ دوسرے اُس کو تحریک دینے والے جو اعصاب ہیں اُن کے مراکز خود قلب کے بالائی چوڑے حصے میں رکھے ہوتے ہیں۔ اُس کے علاوہ جو اُس کا تعلق دوسرے اعتبار سے دماغی اجزا سے ہوتا ہے، وہ بذات خود دماغ میں نہیں ہے، بلکہ مبدا النخاع (سرحرام مغز) میں موجود ہے۔ جہاں سے تحریکات روانہ ہو کر اُس کو متحرک کیا کرتی ہیں۔ یہی حال تنفس کا بھی ہے کہ اُس کا مرکز دماغ میں نہیں بلکہ مبدا النخاع میں ہے۔ چنانچہ اگر حرام مغز اور دماغ دونوں کو تباہ کر کے سرحرام مغز کو باقی رکھا جائے تو تنفس بند نہ ہوگا۔ برخلاف ازیں صرف مبدا النخاع میں کسی قسم کا نقصان پہونچا یا جائے۔ تو تنفس بند ہو کر موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا احساس اگرچہ باطل ہو جاتا ہے لیکن قلب و تنفس کی حرکات برابر جاری رہتی ہیں۔ اور یہ صورتیں دماغ کی مکمل بے حسی میں بھی موجود رہتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ بے حسی یا نیند میں ان چیزوں کے اندر کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوا کرتا تو شاید زندگی کے لئے ہر وقت خطرہ کا سامنا رہتا۔ پھر قدرت نے تنفس کا ایک حصہ ہمارے قبضے میں دیا ہے جس کی وجہ سے ہم جب چاہیں سانس بند کر سکتے اور جاری کر سکتے ہیں۔ لیکن قلب کا کوئی حصہ ہمارے قبضۂ اقتدار میں نہیں۔ اُس کی حرکات نہ ہم بند کر سکتے اور نہ بند ہونے پر دوبارہ جاری کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ نیند کس طرح پیدا ہوتی ہے اور اُس کی حقیقت کیا ہے۔ پھر نیند میں جسم انسانی کے اندر کیا کیا تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں نیند اور بے حسی میں کیا فرق ہے اور ان میں کیمیاتی اعتبار سے کس قدر مناسبت ہے۔ اس کے علاوہ جو نیند دماغ میں دورانِ خون کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے وہ نیند میں شریک نہیں۔ بلکہ بے ہوشی اور مرضی صف میں داخل ہے۔ لہٰذا اُس کا بیان کرنا ہماری حدود سے باہر ہے۔ اب ہمیں اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ نیند میں خواب کس طرح نظر آتا ہے۔ یا بعض لوگوں میں نیند کے اندر ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو عوام میں نہیں ملتیں۔ ان کے اسباب کیا ہوتے ہیں ان سب کو بیان کرنے کے بعد آخر میں بیداری اور نیند کے اندر فرق بیان کروں گا۔

خواب دیکھنا

اس خواب سے وہ خواب قطعاً مستثنیٰ ہے جو انبیاء، پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام یا دیگر بزرگ و اولیاء کرام کو ہوا کرتے ہیں۔ یہاں پر خواب کا عام

طریقہ بیان کرتا ہوں۔

آپ نے بار بار دیکھا ہوگا کہ جو لوگ دن کی محنت و مزدوری سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اُن کو شب کے وقت کوئی خواب دکھائی نہیں دیتا۔ پھر نیند کے ابتدائی حصے میں تو کسی کو بھی خواب نہیں دکھائی دیتا۔ لیکن جن لوگوں پر نیند کی بجائے غنودگی طاری ہو اُن کو ضرور خواب دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ لیکن آپ یہ بھی دیکھتے ہوں گے کہ خواب جو دکھائی دیتا ہے وہ بالعموم کہیں کہیں سے غیر مسلسل ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو پہلے اُس کے رنگ و شکل کو ذہن میں محفوظ کرتے ہیں بعد ازاں اُس کی بُو، ذائقہ اور دیگر خصوصیات سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی شے کے ایک جز سے بھی بے خبر رہ جائیں تو جس وقت بھی یہ شے ہمارے سامنے آئے گی تو نامعلوم جز کی ماہیت پر کوئی تبصرہ نہ ہوگا۔ یہی حال ہمارے خواب کا بھی ہے کہ جو مراکز دن بھر زیادہ استعمال ہوتے ہیں وہ تو آرام لینے کے لئے مکمل سکون میں ہوتے ہیں۔ لیکن جو مراکز دن کی محنت سے نہیں تھکے ہیں وہ برابر کام کرتے رہے۔ چنانچہ جب کوئی خواب کا سلسلہ نظر آتا ہے تو بعض واقعات کی کڑی درمیان سے غائب ہو جاتی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں اول تو یہ کہ وہ مرکز ہی کام نہیں کراتا ہے۔ دوم یہ کہ وہ مرکز تو بیدار ہے۔ لیکن اُس سلسلہ کی کڑی محفوظ نہیں رہی۔ چنانچہ اس قسم کا خواب بالعموم ناقص اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ لیکن بعض اشخاص کا خواب بالکل مسلسل ہوتا ہے جو صبح تک یاد رہتا ہے۔ ان میں وہ تمام مراکز بیدار ہوتے ہیں جو خواب میں کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جن کو محنت و مشقت بہت کم کرنی پڑتی ہے۔ بعض خواب میں انھیں چیزوں کو دیکھتے ہیں جو دن بھر دیکھتے یا کرتے سو گئے تھے۔ مثلاً ایک بچہ اپنا سبق پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ بعض لڑائی جھگڑے کے قصوں کو دوہرانے لگتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض کو خواب میں وہی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ جو بیرونی طور پر اُن کے ماحول میں موجود ہیں۔ مثلاً اگر خارج میں باجا بج رہا ہے تو اُن کو بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ بعض وقت ایسا بھی دکھائی دیتا ہے کہ جب بچوں کو پیشاب لگتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اسی جگہ بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں کہ جہاں پر روزانہ پیشاب کیا کرتے ہیں۔ لیکن اُن کا پیشاب خارج نہیں ہوتا حالانکہ خواب میں وہ برابر پیشاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ خواب کا تعلق دماغ سے ہے۔ وہ مرکز ضرور بیدار ہوتا ہے۔ لیکن پیشاب نکالنے پر جن اعصاب کا اقتدار ہے وہ نخاع سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب تک یہ دونوں کڑیاں نہ ملیں پیشاب کا فعل انجام نہیں پا سکتا۔ بعض اشخاص ایسے بھی پائے گئے ہیں کہ جو نیند میں چل کر کہیں سے کہیں نکل گئے۔ یا کسی جگہ سے روانہ ہوئے تو پھر اُن کی آنکھ منزلِ مقصود پر جا کر کھلی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزانہ کسی کام کو کرتے کرتے دماغ اس قدر قابو یافتہ ہو جاتا ہے کہ اُس کو بغیر سوچے سمجھے ادا کرنے لگتا ہے جیسا کہ ہم رات دن چلنے میں قدم سوچ کر نہیں اُٹھاتے۔ بلکہ ہماری رفتار بے اختیارانہ ہوتی ہے۔ یا ایک حافظ کلام پاک بغیر کسی رُکاوٹ کے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی وجہ محض دماغی ملکہ اور قوت ہے جو مشق کرنے سے ہر ایک شخص میں پیدا ہو جاتا ہے۔

نیند اور بیداری میں فرق

نیند کی حالت	بیداری کی حالت
(۱) انسان میں تغذیہ۔ بدل ما یتحلل اور نشو و نما ہوتا ہے۔	(۱) قطعی نہیں ہوتا۔ یا بہت معمولی طریقہ پر۔
(۲) بچوں میں زیادہ سونا وزن و طول کو بڑھاتا ہے۔	(۲) وزن و طول کو گھٹاتا ہے۔
(۳) حرارت بدنی ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔	(۳) ابتدا میں زیادہ اور آخر میں کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔
(۴) حرکاتِ منعکسہ درست و قوی رہتے ہیں۔	(۴) باطل یا کم ہو جاتے ہیں۔
(۵) آنکھ کی بینائی کو قائم رکھتی یا بڑھاتی ہے۔	(۵) رفتہ رفتہ بالکل کم کر دیتی ہے۔
(۶) نخاع فربہ و درست رہتا ہے	(۶) نخاع خشک ہو جاتا ہے۔
(۷) بدن میں خون کی مقدار ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔	(۷) خون بالکل کم یا بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔
(۸) تشریح بعد الوفات میں دماغی جریانِ خون نہیں ملتا۔	(۸) دماغی عروق شعریہ پھٹ جاتی ہیں اور دماغ میں جریان خون ملتا ہے۔
(۹) جسمانی ساختیں اپنی اصلی حالت	(۹) جسمانی ساختیں چربی میں تبدیل

پر رہتی ہیں	ہونی شروع ہوجاتی ہیں۔
(۱۰) بدن سے شوریں اور فاسفورس بہت کم خارج ہوتے ہیں۔	(۱۰) اُن کی مقدار بہت زیادہ خارج ہونی شروع ہوجاتی ہے۔
(۱۱) ہضم نہایت عمدہ ہوتا ہے	(۱۱) ہضم خراب ہوتا ہے۔
(۱۲) تین ہفتے تک فاقہ کرنے سے انسان زندہ رہ سکتا ہے	(۱۲) لیکن پانچ روز مسلسل جاگنے سے زندگی خطرہ میں پڑجاتی ہے۔

(نوٹ) ڈاکٹر گلبرٹ نے نوے گھنٹے تک تین شخصوں کو مسلسل جگایا تو وہ تقریباً موت کے قریب ہوگئے، لیکن جب ان کو متواتر سونے کے لئے چھوڑ دیا گیا تو وہ پہلی حالت پر واپس آ گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں نیند کس قدر نعمتِ غیر مترقبہ شے ہے۔

پیامِ آسودگی

کل صبح صحنِ باغ میں اک شاعرِ صبور | کہتا تھا یوں کہ سینۂ ظلمت ہے گنجِ نور
مرہم کا اہتمام ہے ہر زخم کی خلش | درماں کا ساز و برگ ہے ہر درد کا وفور
ہر آہِ دلخراش ہے ہم رشتۂ نشاط | ہر اشکِ لالہ رنگ ہے سرمایۂ سرور
غربت کے دور میں ہے نہاں موسمِ وطن | غیبت کے ساز میں ہے تپاں نغمۂ حضور
ہر خارزارِ بیم ہے پیغمبرِ امید | ہر وادیٔ سیاہ ہے پروردگارِ طور

بیدادِ زندگی سے اگر دردمند ہے
آسودہ رہ کہ داد ملے گی تجھے ضرور!

جوش ملیح آبادی

رفتارِ وقت

ادارہ

مشترکہ قومی زبان

مشترکہ قومی زبان کے مسئلہ پر گاندھی جی اور "اردو" کے نام سے آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے، جو ڈاکٹر محمد اشرف کا ترتیب دیا ہوا ہے، اس پمفلٹ میں ان غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے جو زبان کے معاملہ میں گاندھی جی کی طرف سے اکثر حضرات کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ہم نے اس پمفلٹ کو نہایت غور سے پڑھا۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے، ڈاکٹر اشرف کو معترضین کے اصل منشا کو سمجھنے میں یا تو غلط فہمی ہوئی ہے یا انھوں نے عمداً اس سے گریز کیا ہے، کیونکہ اس پمفلٹ میں یہ دیکھ کر ہمیں خصوصاً بڑی حیرت ہوئی کہ زبان کے متعلق کانگریس نے جو قرارداد منظور کی ہے اسے قطعی نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ دراصل وہی خاص چیز وجہ معترضین کے اعتراض کی بنیاد ہے۔

قومی زبان کا معاملہ جب چھڑا اور اس میں اختلاف رائے پیدا ہونے لگا تو کانگرس نے نہایت دور اندیشی سے اسے یوں حل کیا کہ "کانگریس کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی اجو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ مشترکہ زبان کی تعمیر کے سلسلہ میں مشترکہ نام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور چونکہ اردو اور ہندی کے ناموں پر مختلف فریقوں کو اختلاف تھا اس لئے کانگریس نے دونوں رسم الخط تسلیم کر کے دونوں نام ترک کر دیئے اور اپنی طرف سے ایک نیا نام "ہندوستانی" تجویز کر دیا۔ اس طرح اگر ایک طرف دونوں رسم الخط تسلیم ہو جانے سے فریقین کا اطمینان ہو گیا، اور ان کے تمام شکوک رفع ہو گئے تو دوسری طرف قومی زبان کو ایک مشترکہ نام بھی مل گیا۔

چنانچہ اس وقت لوگوں کو یہ اعتراض نہیں ہے کہ گاندھی جی ہندی کی ترقی اور ترویج کے لئے کیوں کوشاں ہیں اور اسے ملک کی قومی زبان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟ انفرادی حیثیت سے ان کا انھیں ہمیشہ حق حاصل تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اعتراض یہ ہے کہ کانگریس کی پالیسی کے روح رواں ہوتے ہوئے گاندھی جی نے کانگریس کی قرارداد سے انحراف کیوں کیا اور ہندوستانی نام تجویز ہو جانے کے بعد ایک نیا نام تجویز کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔

ایک طرف تو گاندھی جی کا رویہ اور اس پر دوسرے رہبرانِ قوم مثلاً راجندر بابو یا پنڈت جواہر لال نہرو کی خاموشی یا تائید اور دوسری طرف کانگریس کا طرز عمل شکوک پیدا ہونے کا اصلی سبب ہے، اپریل ۱۹۳۶ء میں کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا، اور مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا کنونشن دہلی میں ہوا، یہ دونوں مقام اردو کے خاص مرکز ہیں، لیکن دونوں جگہ اردو کی ہر قسم کی تحریر سے جس طرح گریز کیا گیا، اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے (خواہ یہ خیال اپنی جگہ پر کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو) کہ کانگریس مسلمانوں کو اردو سے ہندوستانی، ہندوستانی سے ہندی ہندوستانی اور ہندی ہندوستانی سے خالص ہندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور دراصل قومی زبان ہندی کو بنانا چاہتی ہے، جس کا رسم الخط دیوناگری ہوگا

اگر ہندی ہندوستانی سے گاندھی جی کا واقعی یہ منشا ہے کہ یہ زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو اور پنڈت شیام سندر داس کی

فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو؟ تو پھر انھیں کانگریس کا نام بدل کر ایک دوسرا نام رکھنے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ اس نام میں دونوں رسم الخطوں کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اور جزو لاینفک کے طور پر اردو یا ہندی کا لفظ شامل نہیں تھا۔ کیا گاندھی جی کو اس خطرہ کا احساس نہیں ہے کہ قومی زبان کا نام ہندی ہندوستانی رکھنے سے اس کا امکان بھی ہے کہ ایک گروہ قومی زبان کو اردو ہندوستانی کے نام سے تعبیر کرنے لگے، اور مشترکہ زبان کے لئے جو مشترکہ نام تجویز کیا گیا تھا وہ پھر معرض اختلاف میں پڑ جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کے اس رویہ نے اردو کے قوم پرست حامیوں کی پوزیشن کو بڑا نازک کر دیا ہے لیکن ہم ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اب تک انھوں نے اس معاملہ میں بڑی آزاد خیالی اور رواداری کا ثبوت دیا ہے جیسا کہ خود ڈاکٹر اشرف کو اعتراف ہے کہ حال میں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کے شعبہ اردو میں تقریر فرماتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے اسی بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو اردو کا نام ترک کرکے اس زبان کو ہندوستانی کے نام سے پکارنا چاہیئے۔

بہرحال مذکورہ بالا تجزیہ کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر اشرف کو گاندھی جی کے بیانات میں رفو کرنے کے بجائے اس امر کا اعتراف کرنا چاہیئے تھا کہ گاندھی جی نے کانگریس کی تجویز سے بلا وجہ انحراف کیا۔ جو ایک طے شدہ اختلاف کو پھر چھیڑ دینے کا باعث ہوا اور اس کے بعد انھیں کانگریس کے فیصلہ کی تائید کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے کا اطمینان دلانا چاہیئے تھا تاکہ کانگریس کی طرف سے عوام کے دلوں میں اعتماد پیدا ہوتا، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہ صاف بیانی اور حق پسندی اس موقع پر جبکہ وہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کی خاص کوشش کر رہی ہے، بالخصوص مفید ثابت ہوتی۔

جناح اور جواہر

مسٹر محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان عرصے سے اک ذہنی پنجہ کشی جاری ہے! مسٹر جناح کے لئے یہ شغل شاید کیا غالباً خوشگوار ہوگا۔ اس لئے کہ "نزاعِ لفظی" ماشاء اللہ نہ صرف اُن کا فن ہے بلکہ اُن کا پیشہ بھی ہے! یہ اُن کے دماغ کی تفریح ہے، اور اُن کے معدے کی غذا۔

لیکن جواہر لال مدت ہوئی زبانی جمع و خرچ کی کان کنی اور دار الضرب سازی سے پرے نکل چکا ہے! وہ بزبانِ حال جناح سے کہہ رہا ہے کہ ؏

قال را بگزار و مردِ حال شو!

تاہم "حال کی مردانگی" کے مقابلے میں "قال کی زنانیت" اتنی آرام گزین اور حجلہ نشین واقع ہوئی ہے کہ اپنی ساری شرمناکی کے باوجود ہم اسی کے "خانہ زادِ زلف" بنے ہوئے ہیں! ؏

تو وقفِ ناز لیلا، من دیکھا عرش پائے

مگر ہم مسٹر جناح اور پنڈت نہرو کی اس باہم آویزی کو اس کے متوقع، منطقی نتائج کے اعتبار سے اپنے ملک کی سیاسی زندگی کا اک مبارک عمل سمجھتے ہیں، بشرطیکہ ہماری تشخیص غلطی نہ کرتی ہو!

جواہر لال جیسا کہ اظہر من الشمس ہے، اک مردِ کار ہے! "زنانِ قول و غنا" کا اس کو چیلنج کرنا نہ صرف یہ کہ اک حرکت مذبوحی ہے بلکہ آخر الذکر کیلئے خطرہ بھی اس میں مضمر ہے کہ اپنی مزعومہ مردمی کا بھرم رکھنے کے لئے با دلِ ناخواستہ کہیں انھیں بیرونِ زنانخانہ دنیا کے میدانِ کارزار میں نہ آنا پڑے! ہم جانتے ہیں کہ زنانوں کی فوج اس پردہ شکن نقل و حرکت کا کبھی خیر مقدم نہ کرے گی، لیکن ضد وہ بڑی بلا ہے کہ عارضی طور پر اک مختلف جبلتِ ثانیہ پیدا کر دیا کرتی ہے! مسٹر جناح اور اُن کی "سہیلیوں" کے جھرمٹ میں یہ ضد بالکل ممکن ہے کہ اک "تریاہٹ" کی "اختناق الرحمی ادائیں" اختیار کرے، اور وہ "مُوامَردوا" کے نعرۂ جنگ کی پُشت گرمی ہی کے تحت مردوں سے دست و گریباں ہو جائیں! کاش کہ ایسا ہو ؎

غصّے میں اُن کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اُٹھائے عتاب میں!

تاہم اس وقت تک تو سیاسی بزم و رزم کی یہ نشو و نما کا فی مستقبل البعید کی اک تنائے شیریں ہی معلوم ہوتی ہے! پھر بھی ہم رندانہ یہ دعا کرنے پر مجبور ہیں کہ ؎

یارب ایں آرزوے من چہ خوش است + تو بدیں آرزو مرا برساں!

بہرحال لمحۂ موجودہ کا جو نقشہ ہے وہ یہ ہے کہ دولہا فاتحانہ دلہن کے گھر کی ڈیوڑھی تک آ پہنچا ہے اور اُس کے دُوارے کو نوکِ شمشیر سے چھُو رہا ہے جس پر دُلہن کی بعض سہیلیاں زنانہ دست و بازو سے چند لکڑ

اور زنگترے" اُوئی" کی چیخ کے ساتھ اُس کے اار رہی ہیں! ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

پریزیڈینٹ جواہر لال کا مسلمان عامتہ الناس میں کانگریس کا پروپگنڈا کرنے کا اعلان اور نیز اقدام، اور اُس پر مسٹر جناح اور چند ٹوڈیوں کی بیم گرانہ واویلا، بجز مذکورۂ بالا تمثیل کے کس چیز سے عبارت ہو سکتی ہے؟:

تاہم کیا یہ "رنگ محل کی حُرمیں" اس طفلانہ آرزو سے کھیل رہی ہیں کہ باہر کے قلعہ شکن مرد اُنہیں سے ہر ایک کو "چاند بی بی" سمجھ کر محاصرہ اُٹھا لیں گے؟ ہرگز نہیں! ؎

نہ خنجر اُٹھیگا نہ تلوار تم سے یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں!

ان سارے حالات کے علی الرغم ہمارا یہ ایمان بالغیب ہے کہ یہ مُعاملۂ شگفت اپنے نتائج خیرت کے باکل عقیم (بانجھ) نہ ثابت ہو گا! "صِنفِ نازک" کے یہ افراد اگر مردِ بننے سے قاصر رہیں گے، تو کم از کم مردوں کے لئے اپنی جگہ ضرور خالی کر دیں گے: یہ نتیجہ کم سے کم نہ ہوگا، بلکہ اس عمل آویزش کا بھرپور پھل ہو گا! اربابِ کانگریس خود یہ توقع نہیں کرتے کہ "جناح اینڈ کو" دکان "اصلاحات و رعایات، حقوق و مجلس و آئین" کے تاجرانہ سودے کے سوائے کبھی "آہن و خون" کا کھیل کھیلنے کے لئے رزمگاہِ جہاد و انقلاب میں داخل ہو سکیں گے! اُن کا سب سے بڑا احسان یہی ہو گا کہ اپنی زنانہ غیر مصافی آبادی سے رقبۂ جنگ کے "منطقۂ خطرہ" (Danger zone) کا تخلیہ کر دیں، تاکہ اس میدان میں اک آر پار معرکۂ "تخت یا تختہ" لڑا جا سکے! جب جواہر لال یہ کہتا ہے کہ اِس وقت مُلک میں دو ہی پارٹیاں ہیں: یا حکومت یا کانگریس، تو اُس سے اُس کی مُراد یہی ہوتی ہے کہ محفلِ بزم کے سِتر کا، اگرچہ صنفِ لطیف اور صنفِ ثقیل دونوں ہو سکتے ہیں، لیکن جس آن کہ معرکۂ رزم گرم ہو جائے تو عورتیں یقیناً اک "حلقۂ بیرون در" ہو جائیں گی! ؎

"عقل" بہانہ جو" سپر افگندہ ز تُم گرفت
در عرصۂ کہ "عشق" عَلَم کر د رایتے!

(۲)

پنڈت جواہر لال کی زبان کی اِس پوست کندہ حقیقت پر کہ مُسلم لیگ اک فرقہ وارانہ مذہبی تنظیم ہے، مسٹر جناح، قانونی شعبدہ بازی کی داد دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مسلم لیگ اس کے باکل برعکس، اک ہندوستانی اقلیت کا محافظ ادارہ ہے"! ——— فرقہ پرستی اور عوام کالانعام کی دینداری کی اُستخوان فروشی کو سیاست کی متانت میں منقلب کر دینے کی یہ ایسی ہی بازیگری ہے جس سے بہتر اصابتِ فکر و نظر کی اُمید مسٹر جناح سے کی بھی نہیں جا سکتی تھی! لیکن ہمیں خوف ہے کہ جناب "قانون پناہی" نے اِس قول میں کچھ اپنی منطق کا بھی اچھا مظاہرہ نہیں فرمایا! مُسلم لیگ کی "اقلیت" اُس کی "فرقہ واریت" پر مستزاد ہے اُس کا "بدل" نہیں! اگر سوال کیا جائے کہ مُسلم لیگ کا سنگِ بُنیادِ انفرادیت کیا ہے اور اُس کے اور دوسری جماعتوں کے درمیان حدِ فاصل کیا ہے، تو جواب سوائے "اسلام و غیر اسلام" کے کیا ہو گا! اِس میں مشکل کسی سیاسی عنصر کا اختلاط نظر آئے گا! مُسلم لیگ کے زاویۂ نگاہ سے مُسلم لیگ کی راہنمائی و سربراہی کے تحت مسلمانانِ ہند ظاہر ہے کہ اِس وجہ سے تو اک متمائز جماعت ہیں نہیں کہ وہ کوئی خاص مشترک فیما بین سیاسی مجبوریاں، معاشی محرومیاں، اپنی رگوں میں کسی ایک واحد نسلی خون کی روانی، یا مُلک کے کسی مخصوص یکجا و باہم ملحق خطے کی سکونت رکھتے ہیں! اِن میں سے اول الذکر دو چیزیں، بلا شرکتِ غیرے اُن سے تعلق نہیں رکھتیں، ——— وہ عام اہلِ ہند کی ہمہ گیر لعنتیں ہیں! اور آخر الذکر دو چیزوں کے فقدان میں دوسرے ہندوستانی فرقے بھی اُن سے مختلف نہیں! اب اُن کے درمیان لے دے کے جو قدرِ مُشترک رہ جاتی ہے وہ مسلمانوں کا اپنا مذہب ہی ہے! تو پھر بتایئے کہ مُسلم لیگ کے پلّے میں سوائے مذہبیت کے اور کیا رہ جاتا ہے؟!

ہماری گفتگو کا یہ منشا نہیں کہ مذہب، کسی جماعت کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رکھتا یا جانتا دِکھا! لیکن اب صورتِ حال یہی ٹھہری نا کہ مُسلم لیگ کے لئے تحفظ اور خدمت کا عین "مختص بہ جماعت" کام مذہب یا شخصی ثقافت و قانون ہی ہے، کچھ اور نہیں؟! ——— یہاں "مختص بہ جماعت" کے الفاظ مُعاملے کی کلید ہیں! یعنی کسی کا دعویٰ بلا شبہ یہ نہیں کہ مسلمانوں کے مُلک کے اندر کوئی اور مَصالح و مَنافع نہیں ہیں! ہیں، اور ضرور ہیں! لیکن وہ چونکہ سیاسی و معاشی ہونے سے "ہندوستان گیر" (India wide) نوعیت رکھتے ہیں، پس اُن کے لئے کسی محدود فرقہ وارانہ اہتمام والتزام کی ضرورت نہیں! یہ گویا ہندوستانی سیاسی زندگی کے "وفاقی صیغے" (FEDERAL SUBJECTS) ہیں جو قدرتاً اک آل انڈیا عمومی ادارے کا حصہ ہیں! ایسا ادارہ ہماری سرزمین میں روزِ اول سے

کانگریس ہے اور صرف کانگریس! یہاں کسی کو اک وہمی نفسی کوفت نہ ہو! کانگریس کی "ٹھکرائی" کے آگے سر تسلیم خم کر دینا کسی ہندوستانی فرقے کے لئے ذلت ہے نہ مضرت! کانگریس اک جلی عنوان سیاسی حقیقت نفس الامری کا اعتراف چاہتی ہے، اور کچھ نہیں! اس اعتراف کا مطالبہ ہم سے اک حقیقت ہی نہیں کر رہی ہے، بلکہ اک شکریے کا فریضہ بھی ہمیں یاد دلا رہی ہے! "انڈین نیشنل کانگریس" کا یہ زیر بحث منصب اس قدر اک "حق" نہیں جس قدر کہ اک "فرض" ہے! کانگریس اپنی قومی خدمات جلیلہ اور وطنی مساعی حسنہ کو آپ کی خوشنودی مزاج کے لئے آپ کے در قبول تک پہنچانا چاہتی ہے آپ کا سر مذلت اپنے قدموں پر جھکانا نہیں چاہتی! کیا آپ اس آوارۂ دو گھونٹے، رسوا سر بازارے" کی طرف سے اک بے معاوضہ، لیکن بے بہا، پیشکش جلیل بھی سر پائے استحقار سے ٹھکرا دینا چاہتے ہیں؟! ؎

اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا!

ہم کو برائی بھی کرنا چاہیئے تو اس کے حدود ملحوظ رکھ کر! کیا آپ اتنا سا مغمہ تخیل از راہ کرم ہم پہنچا ئیں گے کہ مظلوم و مہجور نادر گانگریس کا یہ نالۂ رنگین سن سکیں کہ ؎

ہر جفائے کہ کنی راحت جان ستم دلے
رسم انصاف مبادا ز جہاں برخیزد!

رہا مذہبی، لسانی، اور عام ثقافتی حقوق کا معاملہ تو کانگریس سالہا سال پیشتر اپنے ہی ارادہ و اقدام پر، اپنے "بنیادی حقوق" کے اعلان میں اس کو اس سے کہیں زیادہ ہمہ گیری و نظربازی دقیق پژوہی کے ساتھ طے کر چکی ہے جتنا کہ کسی کٹر سے کٹر فرقہ پرست، اور کور باطن سے کور باطن متشکک کا مطالبہ ہو سکتا ہے! لیکن یہاں بہشتی و خود فراموشی کا وہ حال ہے کہ ؎

چشمہ پیدا و کاروان تشنہ
بادہ پُر زور و انجمن مخمور!

اس پر لطف دیکھئے کہ مسٹر جناح، لائڈ جارجی تجبر ڈپلومیسی سے، فرماتے ہیں کہ "شکر ہے کہ کانگریس پریزیڈنٹ نے اپنے تازہ ترین بیان میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ و ضمانت کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے!" ؎

کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں!

بیچارہ جواہر لال کس خدا کا شکریہ ادا کرے! اس نعمت غیر مترقبہ پر کہ مسلم لیگ کا "عین حیاتی" صدر و آمر بالآخر اس خواب خرگوش سے جاگ پڑا ہے جس "مرض النوم" کا دورہ اس پر ۱۹۳۱ء میں پڑا تھا جب کہ نیشنل کانگریس نے اپنی میقات کراچی میں پہلی مرتبہ مہتم بالشان پیمانے پر اپنے "منشور حقوق اساسی" کی تدوین و تشہیر کی تھی!

مسٹر جناح فرماتے ہیں کہ "جمہوریت، اکثریت کی آمریت کا دوسرا نام ہے تا آنکہ ملک کی اقلیتوں کا اطمینان و اشتراک عمل حاصل نہ کر لیا جائے!"

آمنا و صدقنا! لیکن کیا اک اقلیت کا بھی یہ انسانی فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر اطمینان پذیری اور توفیق شرکت کار کے مادے کا ثبوت دے؟! ـــــ جب کہ ہر ممکن انسانی وسیلے سے اس اطمینان دہی کے اسباب مہیا کر دیئے جائیں، اور اتحاد عمل کی ہر دعوت کا اتمام حجت کر دیا جائے! اقلیت کو بعض اوقات اک دوسری اقلیت ـــــ سرکاری دفتریت کی اقلیت! ، جو ہر قسم کے اختیار و اقتدار کے اجارے کی بنا پر عملاً اک "اکثریت" ہوا کرتی ہے! ـــــ کے ساتھ یارانہ گانٹھنے سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوا کرتی کہ ملک و وطن کی محروم و مظلوم اکثریت کے اطمینان و اشتراک عمل کو قبول کر سکے! ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے!

اقلیت جس طرح ہمیشہ خواہ مخواہ کمزور نہیں ہوا کرتی، خواہ مخواہ مظلوم بھی نہیں ہوا کرتی! اقلیت کی دادخواہی کا فریب مسٹر جناح عام پبلک کو دینا چاہتے ہیں یا کہ وہ خود بھی اک فریب نفس میں مبتلا ہیں؟!

(۳)

مسٹر جناح نے بعض باتیں بہت "مفرح قلب" کہی ہیں! جواہر لال کے مسلم لیگ پر، بحیثیت اک سیاسی جماعت کے، اس اعتراض پر کہ اگر "وہ مادر سے حرم دینی کوئی سیاسی و معاشی تنظیم ہوتی ـــــ مثل "لبرل فیڈریشن" کے! تو اس کی رکنیت ایسی قطعیت سے مسلمان فرقے کے ساتھ کیوں محدود ہوتی؟ اور مسلمانوں میں بھی امراء اور بالائی طبقہ متوسطہ کے ساتھ!"

مسٹر جناح کیسا منہ چوم لینے کے قابل جواب دیتے ہیں کہ

دوسرے مذہب و ملت کے معدودے چند افراد کو شامل کرکے، جیسا کہ کانگریس کا ڈھکوسلہ ہے، کوئی جماعت قومی نہیں بنجاتی! ایک ابابیل موسمِ بہار کی نقیب نہیں ہوسکتی!"

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ کانگریس کے "معدودے چند" مسلمان ممبر کا معدودے چند ہی ہیں اور "خائن ملت و اسلام فروش" بھی ——— اگرچہ "صدر اول" کے مسلمان کانگریسیوں کی مختصر ترین "فہرستِ اعزاز" کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے خود مسٹر جناح اس وصفِ "ملت فروشی و اسلام فراموشی" کے "السابقون الاولون" میں سے ہیں! ———

لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ سے یہ کس نے کہا کہ آپ برائے نام چند بیرونی لوگوں کو شامل کرکے اپنی مسلم لیگ کو "ہندو کانگریس" کی طرح خود فروش بنائیے؟ کانگریس غریب اگر ایسی سبک انجام رہ گئی تو اس کی وجہ تو بخیال آپ کے اس کی اصولی و فکری تنگ دامانی تھی! لیکن یہ وسیع المشرب، روشناس مشرق و مغرب "آل انڈیا مسلم لیگ" کو کس کی نظر بد کھا گئی کہ اس کے پرچم کے "ظل الٰہی" کے نیچے پورے پورے مسلم صوبوں کے مسلمان بھی نظر نہیں آتے! کانگریس تو اس وجہ سے کنونڈی ہے کہ مسٹر جناح کی سرکار کی مردم شماری کی رو سے اس کے حلقے میں چند ہی باہر کے لوگ دکھائی دیتے ہیں، لیکن کیا مسلم لیگ کا نادر فخر یہی ہے کہ اس کے حرم محترم سے نصف سے زیادہ اسلامی ہندوستان بھی خارج ہے؟

شنیدم کہ مردانِ راہ صفا　　دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام　　کہ با دوستانت خلافست و جنگ

پھر مسٹر جناح اک اور کانگریسی طلسمِ فریب کو بھی توڑتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "عوام الناس کا افلاس اور بیروزگاری کے دفعیہ کا بلند بانگ دعویٰ بھی اک طبلِ تہی ہے، اور چونکہ حکومت غیر ہر دلعزیز ہوگئی ہے، اس لئے اس کے نامۂ اعمال کے اندراجات بنا کر جب ان باتوں کا ڈھول پیٹا جاتا ہے تو قدرۃً عامۂ خلائق کے تخیل پر بآسانی قبضہ حاصل کرلیا جاتا ہے"!

اللہ اللہ! مسٹر جناح "ناکردہ گناہ" حکومت کی ناحق بدنامی پر کتنے خون بجگر ہیں! ع

آسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے:
"تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"!

مسٹر جناح سے ——— خلق ناآشنا و صرف کانجوئی مسٹر جناح سے! ——— ہم کیا کہیں کہ ع

تو چہ دانی کہ چہ سودا و سر است ایشاں را!

آرام کرسی اور "ریوالونگ چیئر" پر بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے ان کی سمجھ میں یہ کیسے آئے کہ خلق اللہ کے ساتھ دل سوزی میں کوئی جذبۂ اخلاص بھی ہوسکتا ہے! آج خلق اللہ خون چوسنے کے لئے بنا ہے یا "پہی خر کان" کے سرشاک آلودہ کرنے کے لئے؟! ع

تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی؟!

(۴)

مسٹر جناح، "آل انڈیا مسلم لیگ" کی "مستقل و غیر متزلزل مسندِ صدارت" پر متمکن ہوکر فرماتے ہیں:

"مسلم لیگ، کانگریس کی ہم نوا اور شریک کار کیسے ہوسکتی ہے جبکہ وہ اپنا اک جداگانہ مسلک و لائحۂ عمل رکھتی ہے جو کانگریس کی پالیسی و پروگرام سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے"!

بلاشبہ! ہنگامِ انتخاب، مجلسِ احرار، جمعیتہ العلماء، اور بکثرت کانگریسی خیال مسلمان سیاسیین سے مل کر اک "پارلیمنٹری بورڈ" بنانا، اور جب لیگ ٹکٹ پر کاونسل کا پاسپورٹ حاصل کرنے والے مسلمان ارکان مجالس قانون ساز کے طرزِ عمل پر احتساب کرنے کا موقع آئے تو بورڈ کو توڑ دینا اور اس طرح زبانِ حال سے انھیں غداری و پیمان شکنی کی شہ دینا، ایگریکلچرل پارٹی کے خلاف انتخابی معرکہ آرائی کرنا، اور بعد انتخاب اسی صفِ منافقین سے بغلگیر ہوجانا تاکہ معشوقۂ وزارت کو کنارگیر کیا جاسکے! ، نیز بذف البلہ فریبی جمعیتہ العلماء کو ایسا محروم جفا بنانا کہ ان کے اجلاس کی شرکت کی دعوت کا جواب بیک وقت "شکریہ" اور "انکار" ہر دو سے دینا! جدید آئین ہند کی تمامی مذمت کے علی الرغم اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کا بہرحال عزم کرنا، انڈیا ایکٹ کی دستاویز غلامی کے یوم احتجاج کا بائیکاٹ کرنا! وغیرہ وغیرہ کانگریس کے ساتھ بنیادی اختلافات ہی کے رسوائی مناظر و مظاہر ہیں! اور نہ!.. کانگریس رجز ، کسے